دہلی
شانِ ہند
جنوری ۱۹۸۷ء

جنوری سنہ ۱۹۸۷ء

جلد نمبر ۴۸ — شمارہ نمبر ۱

چیف ایڈیٹر — سرور تونسوی

معاون ایڈیٹر — مطرب صحرائی

ٹیلیفون ۲۷۵۶۰۲

پرنٹر پبلشر ● ودیا پرکاش سرور تونسوی

پروپرائٹر ● " " " "

طباعت ● خواجہ پریس جامع مسجد دہلی

مقام اشاعت — دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"، فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷

رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی۔ این) ۳۵۳

قیمت فی شمارہ ※ چار روپے
قیمت سالانہ ※ چالیس روپے

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں، نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرّۂ وطن سے ہے دامن مجھکو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں

اس شمارے میں

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی
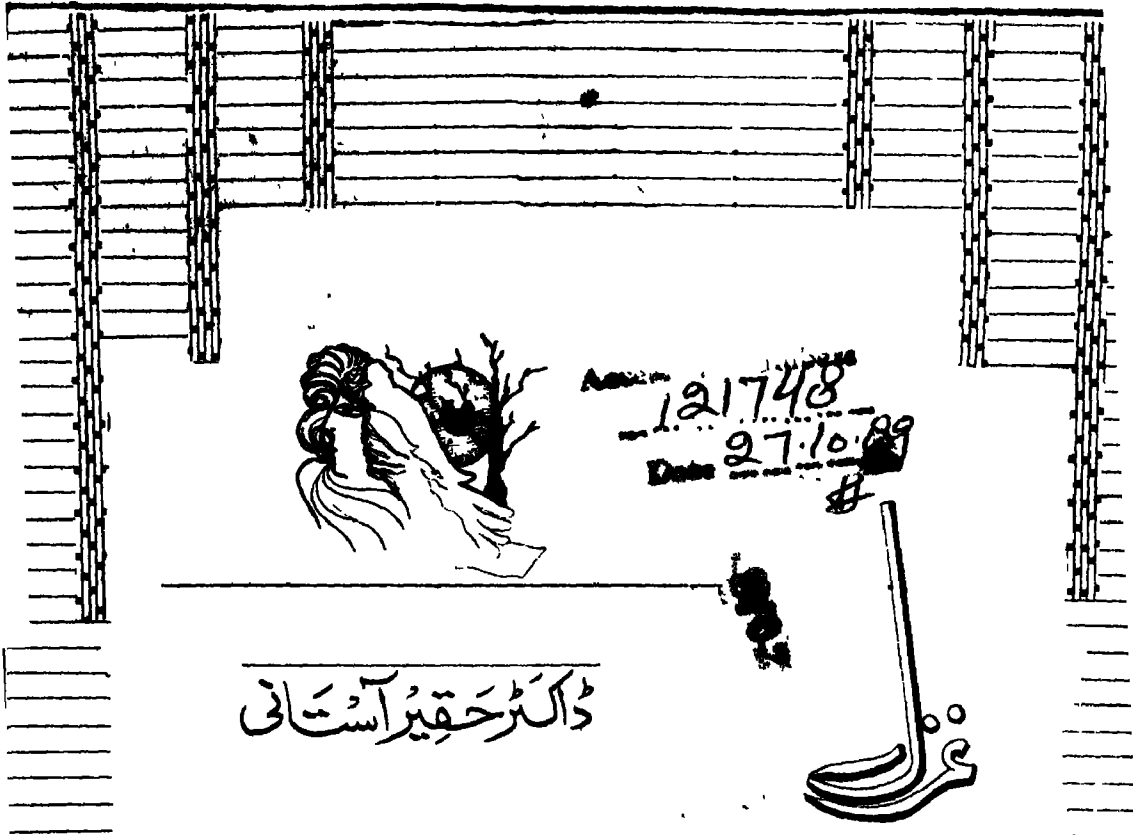
نقشِ بر دیوار ہوں یا پھر خیالِ خام ہوں
ایک عرصہ ہو گیا ہے لرزہ براندام ہوں

جب سرِ تسلیم خم ہے آپ کے آگے تو پھر
جس طرح بھی دیکھئے میں موردِ الزام ہوں

یہ بھی سچ ہے اک خلش سی دل میں رہتی ہے مگر
یہ بھی ہرگز کہہ نہیں سکتا کہ میں ناکام ہوں

کیا العجب ہو گیا پہچاننا میرا محال ہے
آج ہوں صبحِ بشارت، آج غم کی شام ہوں

صاف سا، شفاف سا، کچھ تو نظر آتا نہیں
آئینہ بردارِ احساساتِ خاص و عام ہوں

میری فطرت ہی مرا مقصود بھی، مقدور بھی
گردشِ پیمانہ میں ہوں، میں ہی رقصِ جام ہوں

یہ مزاجِ شاعرانہ کی بدولت ہی تو ہے
آج ہوں بالائے بام اور آج زیرِ دام ہوں

ایک مفلس کی انا، مجبور کی غیرت سہی
اس کا مطلب یہ نہیں ہر موڑ پر نیلام ہوں

اپنی بود و باش کے بارے حقیر اب کیا کہوں
حلقۂ ظلمات میں بھٹکا ہوا سا نام ہوں

زیر نظر شمارہ سے "شانِ ہند" لیتھو پرنٹنگ کو خیر باد کہ کر آفسیٹ طریقِ طباعت کو اپنا رہا ہے۔

مرحوم حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مُدیر "شمع" کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ "شانِ ہند" آفسیٹ میں چھپے اور وہ اس کیلئے ممکنہ طور پر تعاون دینے کو تیار تھے۔ مگر "شانِ ہند" اسکا کفیل نہ ہو سکتا تھا لہذا یہ معاملہ ہمیشہ معرضِ التوا میں رہا۔

"شانِ ہند" کو آفسیٹ طریقِ طباعت سے شائع ہونیکی سب سے زیادہ خوشی میرے محترم و بہی خواہ مرحوم حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی کو ہوتی۔ لہذا میں "شانِ ہند" کا یہ شمارہ مرحوم محمد یوسف صاحب دہلوی کے نامِ نامی سے منسوب کرتا ہوں۔

ودیا پرکاش سرور تونسوی
ایڈیٹر۔

دوردرشن کا
وام سے بھدّا مذاق

ٹی۔وی عوام کی زندگی کا ایک ایسا جزو
گیا ہے کہ غریب سے غریب شخص زندگی کی ضروریات کو
پشت ڈال کر ٹیلی ویژن حاصل کرنے کی کوشش
ہے خواہ اسے اقساط پر حاصل کرے یا قرض لے کر،
ان اقساط کا لالچ دیکر ٹیلی ویژن فروخت
والے شاطر و مکار ۲۲ فیصدی سود پوری
اط کا لگا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر قسطوں پر
ویژن خریدنے والا اگر پانچ صد روپیہ
پہلے دے کر ٹی۔وی اقساط پر حاصل کرتا ہے، اور اس نے باقی اڑھائی ہزار روپیہ بارہ اقساط میں ادا کرنا ہے تو ڈیلر ۲۵۰۰ روپے پر بائیس فیصد سیکڑہ کے حساب سے ساڑھے پانچ صد روپیہ سود بھی اس رقم میں شامل کریگا اور گارنٹی والے ایک سال کے سروس چارجز ڈیڑھ صد روپیہ بھی اس میں شامل کر لیتا ہے۔ اس قدر بھاری سود اور دیگر غیر مناسب شرائط پر غریب لوگ ٹی۔وی۔ محض اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ اس زمانے میں ٹی۔وی سے بہترین تفریح انہیں کہیں اور نہیں مل سکتی، اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹی۔وی پر کئی بہترین تفریحی پروگرام پیش کئے جاتے ہیں، مگر ہر سال ۳۱ دسمبر کی رات کو نئے سال کے استقبال کے لئے جو پروگرام پیش کئے جاتے ہیں اُن کے لئے قریب قریب ہر ٹی۔وی رکھنے والے گھرانے کو شدت سے انتظار ہوتا ہے مگر اس مرتبہ "نیو ایرا یو ایر" جو پروگرام دُور درشن نے پیش کیا ہے اس کے لئے اگر کم سے کم الفاظ میں کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف یہی کہ دُوردرشن نے عوام سے بھدّا مذاق کیا ہے۔

اور اس بھدّے مذاق کے بارے میں عوام نے زبانی، اخبارات کے ذریعہ اور دُوردرشن کو خطوط لکھ کر اظہارِ ناپسندیدگی انتہائی شدت سے کیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عوام یہ کہہ رہے ہیں کہ جب سے شری اجیت پنجہ کو وزراتِ انفارمیشن و براڈکاسٹنگ سونپی گئی ہے۔ دُوردرشن کے پروگرام دن دن غیر دلچسپ ہوتے جا رہے ہیں۔ پروگرام ترتیب دینے والے محض اپنے حواریوں کو فائدہ

پہونچانے کے باعث پروگرام کی افادیت اور مقبولیت کا لحاظ رکھے بغیر ذاتی مفاد کو مدِّنظر رکھتے ہیں۔ ٹی۔ وی سیریل بنانیوالوں سے سُنئے کہ وہ محکمۂ دُوردرشن کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ کوئی ٹی۔ وی سیریل منظور کرالینا جُوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ اس وقت بُنیاد ٹی۔ وی سیریل کے علاوہ دوسرے تمام سیریل پروگرام بس نام کے ہی سیریل پروگرام ہیں، ہاں کچھ دنوں سے "تصویر کا دُوسرا رُخ" مقبولیتِ خاص و عام حاصل کررہا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ اس سیریل میں ٹیلی ویژن کے اربابِ بست و کُشاد کو ان کی کارکردگی کا آئینہ دکھایا جاتا ہے (یہ سیریل بھی بہت جلد ختم کیا جارہا ہے)

اُردو زبان کے تحفظ کیلئے (فروغ کہنا تو لفظِ فروغ کی توہین ہے) حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ کھُلے دل سے روپیہ لُٹا رہی ہے۔ ٹی۔ وی پر اُردو پروگرام "بزم" پیش کیا جاتا ہے۔ اس پروگرام کو پیش کرنے اور ترتیب دینے والے خود اس کے اہل نہیں ہیں۔ لہٰذا اُنہوں نے چند ایسے گھاگ اور شاطر قِسم کے اُردو کے خودساختہ علمبرداروں کا سہارا لے رکھا ہے۔ تاکہ کسی نہ کسی طرح اُن کی ساکھ قائم رہ سکے مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ شاطر لوگ اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ یعنی خود فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اپنے حواریوں کو بھی فائدہ پہونچاتے ہیں۔ اُردو کی بھاڑ میں۔ انہیں تو ایک ٹکٹ میں دو۔ دو مزے آرہے ہیں۔ یعنی ٹی۔ وی پر اپنی اچھی بُری شکلیں دکھاکر شہرت بھی پاتے ہیں اور واہی تباہی بکنے کی فیس بھی وصول کرتے ہیں۔

ٹی۔ وی پر اُردو پروگرام کیلئے صرف تین چار شعرا اور عیّار قسم کے حضرات نے یہ دھاک بٹھا رکھی ہے کہ ان کے بغیر اُردو پروگرام پیش کرنیوالے دُوردرشن کے ذمّہ دار لوگوں نے جو زیادہ تر اُردو سے ناواقف ہیں۔ اور درشنی ہُنڈی کے طور پر ایک مسلمان کا نام اس پروگرام کے ترتیب اور پیش کرنیوالے کے طور پر دیکر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوگئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمان حضرات اس پروگرام کو پیش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے بلکہ ان دھاکو قسم کے حضرات کے اشاروں پر ناچتے ہوئے ان کی مرضی کے پروگرام پیش کرتے پڑتے ہیں اور ان پروگراموں میں حصہ لینے والے حضرات بھی ان دھاکو حضرات کے چیلے جانتے ہی ہوتے ہیں۔

"شانِ ہند" کی گذشتہ اشاعت میں بھی لکھا گیا تھا کہ دُوردرشن کو اُردو پروڈیوسر کے لئے کسی بہتر شخص کا انتخاب کرنے کے لئے اس پوسٹ کے لئے مناسب اُمیدواروں سے درخواستیں طلب کی جانی چاہئیں، ہم پھر اپنے اس مُطالبہ کو دُہراتے ہوئے شری اجیت پنجہ سے اُمید رکھیں گے کہ وہ اُردو پروگرام کے لئے کسی مُناسب شخص کا انتظام کریں، اِس سلسلے میں ہم نے وزیرِ متعلقہ سے مُلاقات کا وقت مانگا ہے تاکہ اُنہیں اُردو پروگرام کے متعلق ان دھاکو حضرات کے بارے میں مُتعارف کراسکیں اور یہ بھی بتاسکیں کہ مسٹر انجم عثمانی محض اَدبی نااہلیت کے باعث ان دھاکو حضرات کے ذریعہ بلیک میل ہونے پر کیوں مجبور ہیں۔

دلّی اُردو اکاڈمی کا ماہنامہ

دلّی اردو اکاڈمی بہت جلد "ایوانِ اُردو" نام سے ایک ماہنامہ جاری کررہی ہے جس کے مُدیر مسؤل جناب مخمور سعیدی مقرر ہُوئے ہیں۔

مجلّہ کا نام "ایوانِ اُردو" ہمارے لفٹننٹ گورنر جناب کپور صاحب کی دین ہے۔ اور جناب مخمور سعیدی کا انتخاب اُردو اکاڈمی کی متعلقہ کمیٹی اور اُردو اکاڈمی کی دوسری کمیٹیوں کے چیرمین حضرات نے کیا ہے مگر اس کا بھی کریڈٹ جناب لفٹننٹ گورنر کو ہی جاتا ہے۔ کیونکہ اُردو اکاڈمی کے ہر فیصلے کو منظور یا نامنظور کرنے کی وہ ہی بااختیار اتھارٹی ہیں۔

ہمارے لفٹننٹ گورنر اُردو اکاڈمی سے کس قدر دلچسپی رکھتے ہیں اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں اکاڈمی کے مجلّہ کے لئے اٹھائیس نام پیش کئے گئے اور اِس طویل فہرست میں سے انہوں نے "ایوانِ اُردو" نام پسند فرماکر نہ صرف اپنے ذوقِ سلیم کا ثبوت دیا بلکہ اس نام سے اُردو زبان کو سرفراز بھی کیا۔

اُمید ہے کہ اکاڈمی کا یہ مجلّہ اُردو کے رسائل میں ایک اچھا اضافہ ہوگا۔

پریزیڈنٹ بیف شاپ

۱۹۳۵ء میں حضور نظام دکن (میر عثمان علی خاں مرحوم) کی سلور جوبلی بڑی شان و شوکت سے منائی گئی۔ اِس تقریب کے موقعہ پر رسالہ "ایجوکیشنل گزٹ" جالندھر کا نظام سلور جوبلی نمبر شائع کیا گیا۔ جسے حضور نظام کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے رسالہ ایجوکیشنل گزٹ کے مالک عبدالرزاق اور راقم الحرُوف بہ حیثیت ایڈیٹر حیدرآباد گئے۔ ہم اپنے ساتھ "نظام سلور جوبلی نمبر" کی ایک صد جلدیں بھی لے گئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے جونہی ہم بلدہ حیدرآباد میں داخل ہونے لگے تو ہمیں نام پلی چونگی ناکہ پر روک لیا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ جب تک سلور جوبلی نمبر پوری طرح سے سنسر نہیں کیا جائے گا آپ

غیر ملکی حضرات بلا حیدر آباد میں داخل نہیں ہوسکتے. چنانچہ نظام سلور جوبلی کی تمام کاپیاں ہم سے لے لی گئیں۔ اور ہمیں کہا گیا کہ ساتھ والی نام پلی سرائے (اس وقت یہ سرکاری سرائے تھی) میں قیام کیجئے جب سنسر والے اجازت دیں گے تو نظام سلور جوبلی کی تمام کاپیاں آپ کو واپس کر دی جائیں گی. اس کے بعد آپ حضرات شہر میں داخل ہوسکتے ہیں۔

دو صد سے زائد ضخامت کا خصوصی "نظام سلور جوبلی نمبر" پڑھنے میں خاصا وقت قدرتی طور پر لگنا تھا. نام پلی سرا میں ہمیں ایک کمرہ مل گیا تھا، لہذا نہا دھو کر کپڑے تبدیل کئے اور سرائے سے باہر ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے گئے ہوٹل مسلمانوں کا تھا۔ چنانچہ عبدالرزاق صاحب نے ہوٹل کے منیجر سے کہا کہ میرے ساتھی غیر مسلم ہیں اگر آپ کے ہاں ایسا گوشت پکتا ہو جو ان کے لئے ممنوع ہے تو بتا دیجئے تاکہ یہ کسی ہندو ریسٹورانٹ میں کھانا کھالیں. مالکِ ہوٹل نے بتایا کہ ریاست حیدر آباد میں گائے کشی اور انسان کشی کو ایک ہی درجہ دیا جاتا ہے. لہذا حضور نظام دکن کے حکم سے اس ریاست میں قانونی طور پر گائے کشی ممنوع ہے. لہذا راقم الحروف نے بھی عبدالرزاق صاحب کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھایا.

کہنے کو تو ہم کہتے ہیں کہ نوابوں اور راجاؤں کی حکومت بری تھی مگر ان حکومتوں میں ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا کس قدر پاس رکھا جاتا تھا کہ حیدر آباد ایسی مسلم حکومت میں قانونی طور پر گائے کشی ممنوع تھی اور یہ محض اس لئے تھا کہ ریاست کی ہندو رعایا کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں.

اور آج جبکہ ہم باہمی رواداری اور قومی یکجہتی کے راگ الاپتے نہیں تھکتے اسی حیدر آباد کے اخبارات میں "بیف شاپ" کے اشتہار دیئے جاتے ہیں، روزنامہ "منصف" میں پریزیڈنٹ بیف شاپ کا اشتہار چھپا ہے جس کا افتتاح صدر کل ہند مجلس اتحاد المسلمین جناب سلطان صلاح الدین اویسی ممبر پارلیمنٹ نے فرمایا اور سابق صدر نشین اسٹینڈنگ کمیٹی بلدیہ محترمہ کوثر رحمان صاحبہ اس تقریب کی مہمانِ خصوصی تھیں

بیف (گائے کا گوشت) قانونی اور مذہبی طور پر مسلمانوں کے لئے ممنوع نہیں ہے مگر اخلاق اور تہذیب کا یہ کہنا ہے کہ مسلمان گائے کا گوشت بغیر اس کی تشہیر کئے یا اپنے ہم وطن غیر مسلموں کے مذہبی جذبات کا خیال رکھتے ہوئے بھی استعمال کر سکتے ہیں.

ہندی کوی سمّیلن

گن تنتر دوس کے شبھ اوسر پر حسب سابق ۲۳ جنوری کو لال قلعہ میں ہندی اکاڈمی کی طرف سے ہندی کوی سمیلن کا آیوجن کیا گیا. جس میں بھارت ورش کے پرسدھ ہندی کویوں اور ہندی کویتریوں کو آمنترت کیا گیا. اس ہندی کوی سمیلن میں کوی نے حب الوطنی، قومی ایکتا اور آپسی بھائی چارہ سے متعلق ایسی دل میں اتر جانے والی کویتائیں سنائیں کہ جن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، اور کویتریوں نے تو خصوصی طور پر دہشت پسندی کے خلاف اور ملک کے ٹکڑے کرنے کے خواب دیکھنے والوں کے وہ لتے لئے کہ انہیں اپنی ماؤں کا دودھ یاد آگیا ہوگا. اور شرم سے ان کے سر جھک گئے ہوں گے. یہ دوسری بات ہے کہ آج کا دہشت پسند اور ملک کے ٹکڑے کرنے کے خواہش مند اپنی ماں کے ٹکڑے کرنے میں بھی کوئی برائی نہیں سمجھتے گن تنتر دوس کے شبھ اوسر پر ہندی کوی سمیلن میں جو وطن پرستانہ کویتائیں سنائی گئی ہیں اس سے اس کوی سمیلن کا اصل مقصد بھرپور طور پر ہر سننے والے دل و دماغ کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہوا،

دلی کی ہندی اکاڈمی اپنے اکثر پروگرام وطن پرستی اور راشٹر کے تئیں اپنا سب کچھ نچھاور کرنے والوں کی یاد منانے پر مبنی رکھتی ہے اور ہر بھارتی کو اپنے ملک کے تئیں وفاداری اور قومی ایکتا کا سبق دیتی ہے اس سلسلے میں ہندی اکاڈمی دہلی کے تمام کارکن مبارکباد کے مستحق ہیں جو اپنے فرض کا احساس رکھتے ہیں. بلا شک و شبہ اس بار ۲۳ جنوری کا ہندی کوی سمیلن اتنا کامیاب تھا کہ وہ اہلِ وطن پر کبھی نہ مٹنے والی چھاپ چھوڑ گیا ہے یہ ہندی کوی سمیلن دلی بھارتیہ پریشد اور دلی اردو اکاڈمی کے اشتراک سے منعقد ہوا.

اُردو اکاڈمی آندھرا پردیش کی گرانٹ میں اضافہ

حکومت آندھرا پردیش نے اردو اکاڈمی آندھرا پردیش کی سالانہ گرانٹ پانچ لاکھ سے بڑھا کر پندرہ لاکھ روپیہ کر دی ہے گرانٹ میں یہ تین گنا اضافہ اسلئے کیا گیا ہے کہ اُردو اکاڈمی مذکورہ نے حال ہی میں کچھ شاندار کارکردگی دکھائی ہے. حکومت کانگریس آئی کی ہو یا تیلگو دیشم کی وہ اُردو زبان کی مخالف نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہر حکومت کو اُردو والوں کے ووٹوں کی ضرورت ہے. مگر اس کے ساتھ ساتھ اگر اُردو والے [illegible] اچھی کارکردگی کا ثبوت دیں تو حکومت کو اُردو کے لئے مزید راحت دینے کیلئے راستے کھل جاتے ہیں. ہم چاہتے ہیں کہ اُردو اکاڈمی آندھرا، دلی اردو اکاڈمی کی طرح فعال ہو اور ایسے معقول کام کرے کہ جو منہ سے بولیں کہ دیکھئے! اسے

کارکردگی کہا جاتا ہے. اگر ایسا ہو تو ہر ریاست کی حکومت مجبور رہو گی کہ اپنے ہاں کی اُردو اکاڈمی کے بجٹ میں اضافہ کرے۔

۳۶ سال بعد سُنی گئی

جشنِ جمہوریت کے موقعہ پر ہر ہندستانی زبان کے ایک ایک شاعر کا انتخاب کیا جاتا ہے. اوران منتخب شعراء کا کلام ۲۵ جنوری کی رات کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتا ہے، ۳۶ سال میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ اُردو کا شاعر ایک غیر مسلم جناب رام پرکاش ساحر ہوشیار پوری کا انتخاب کیا گیا. گو یار لوگوں نے اندر ہی اندر بہت زور لگایا کہ اُردو کا شاعر کسی ہندو کو مُنتخب کر کے مسلمانوں کی توہین نہ کی جائے مگر اس بار آخری فیصلہ ایسے ہاتھ میں تھا جو یہ تسلیم کرتا تھا کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے، اور ساحر صاحب کا مُقام اور کلام ایسا ہے کہ اُن کا انتخاب کیا جانا اُردو زبان اور اُردو شاعری کے ساتھ پُورا پُورا انصاف کرنے کے مترادف ہے.

جناب وی پی نرسمہا راؤ

توجّہ فرمائیں

آپ کے تحت محکمہ ایجوکیشن میں ایک لینگویجز ڈویژن قائم ہے جو ہندوستانی زبانوں اور انگریزی زبان کی کتابیں زیادہ تعداد میں خرید کر ملک کی مختلف لائبریریوں کو بھجواتا ہے، اور یہ کتابیں

(Under the scheme of financial assistance for publication in Indian languages and in English) سکیم کے تحت خریدی جاتی ہیں اور ہر زبان کی کتابیں الگ الگ زبانوں کے ماہرین کی کمیٹیاں انتخاب کرتی ہیں، اور ان کمیٹیوں کی سال بھر میں چار میٹنگیں ہوتی تھیں مگر نہ معلوم کس وجہ سے اب سال میں اُردو کتب کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی کی میٹنگ صرف ایک ہی ہوتی ہے.

کمرہ ۲۱۲ میں مسٹر ڈی. ایس سُندر راجن کے تحت کتابیں وصول کی جاتی ہیں، مگر جب سے یہ صاحب تشریف لائے ہیں انہوں نے اُردو کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا رویّہ اپنا رکھا ہے. اول تو ان تک پہونچنا ہی بڑا مشکل ہے. اگر کسی نہ کسی طرح ان تک پہونچنا ممکن ہو جائے تو یہ اُردو کی کتاب دیکھتے ہی فرمانے لگتے ہیں "جائیے جائیے دو تین ماہ بعد آئیے گا"، دو تین ماہ بعد جانے پر پھر یہی جواب ملتا ہے. اور آخر میں تیسری یا چوتھی بار یہ جواب ملتا ہے کہ اب تو میٹنگ ہو گئی، اب اگلے سال اپریل میں آنا. ہندوستانی بولنا یہ گناہ سمجھتے ہیں. انگریزی میں گھڑا گھڑایا جواب دینے میں ماہر ہیں، اور کسی کی بات سُننا ان کے بس کی بات نہیں ہے.

حکومت اُردو کے لیے ہر ممکن امداد دینے کو تیار ہے مگر آپ کے سُندر راجن صاحب اُردو والوں کو اور اُردو کتابوں کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں.

مسٹر الفریڈ جگت سنگھ کی تصنیف "غذائی مسئلہ کا حل"، باوجود اس کے کہ مسٹر الفریڈ جگت سنگھ نے پچاس چکر اُن کے دفتر کے لگائے ہوں گے پہلے دس چکروں میں تو ریسپشن نے انہیں کمرہ ۲۱۲ تک جانے ہی نہیں دیا، اس کے بعد کتاب یہ کہہ کر نہ لی گئی کہ اس کیٹیگری کی کتابیں لینے کے اس اسکیم میں کوئی مدہی نہیں ہے، حیرت ہے کہ لینگویجز ڈویژن عشقیہ شاعری گھٹیا قسم کے جنسی بے راہ روی کے آئینہ دار افسانوں کے مجموعے وغیرہ تو خرید سکتا ہے مگر غذائی مسئلے کو بہتر طور پر حل کرنے کے طریقے بتانے والی کتاب کو خریدنا تو درکنار اسے متعلقہ کمیٹی تک پہونچنے بھی نہیں دیا جاتا. حالانکہ یہ کتاب تو ہر لائبریری میں سرکاری طور پر بھجوائی جانی چاہئے تھی. تاکہ پڑھنے والے یہ جان سکتے کہ کس طرح آسانی سے اجناس کی بجائے دیگر چیزوں سے پیٹ بخوبی بھرا جا سکتا ہے. اور یہ طریقے حفظانِ صحت کے بھی ضامن ہیں.

اس قسم کی شکایاتِ عام سُننے کے بعد ایڈیٹر "شانِ ہند"، خود مسٹر ایس. ٹی. سُندر راجن کے ہاں ۲۲ جنوری ۱۹۸۷ء کو اُردو کی کتابیں مندرجہ بالا غرض سے جمع کرانے گیا تو اُسے بھی یہی جواب ملا کہ اب اپریل میں آئے گا. حالانکہ اس سے قبل یہ طریقہ رہا ہے کہ کتابیں ہر روز دفتری اوقات میں جمع ہوتی رہی ہیں. اور جب بھی آئندہ میٹنگ متعلقہ کمیٹی کی ہوتی تو اُس نے جمع شدہ کتب میں سے پسندیدہ کتابیں انتخاب کر لیں. مگر نہ معلوم مسٹر سندر راجن کن وجوہات کے باعث اُردو والوں کو تنگ کرنے پر آمادہ ہیں. لہٰذا ہم آپ سے ملتجی ہیں کہ اس سلسلے میں اول تو مسٹر سندر راجن کی جگہ کسی ایسے افسر کو مقرر کیا جائے جو کم از کم ہندی بول سکتا ہو، اور دوسرے یہ کہ کتابیں برائے انتخاب لینے میں انکار نہیں ہونا چاہئے۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلہ میں مُناسب ہدایات جاری کریں گے

هرچرن چاوله اور

دلی اُردو اکاڈمی

مشہور افسانہ نگار ہرچرن چاولہ کا کہنا ہے کہ عرصۂ دراز سے وہ دلی کے رہنے والے ہیں، ان کے ہندوستانی انٹرنیشنل پاسپورٹ پر ان کا مستقل پتہ دلی کا ہے ان کا بینک اکاؤنٹ بھی دلی میں ہی

بقیہ صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

صبحِ بہاراں

بموقع یومِ جمہوریہ

آج کچھ ایسی گل سے بھڑکی دیوانے بھی ہوش میں آئے
راہ کے خار و خس سے گزر کر گلشن کی آغوش میں آئے
ساقئ عہدِ بہاراں اٹھا، پینے والے جوش میں آئے

کیفِ نوائے مرغِ سحر نے سوئے ہوئے جھونکوں کو ٹٹولا
صبح کی پہلی سرخ کرن نے بڑھ کے درِ میخانہ کھولا
جامِ لالہ و گل میں شفق نے اپنے جبیں کا عکس گھولا

کہہ دو ذرا رندانِ وطن سے بڑھ کے چھلکتا جام اٹھائیں
دخترِ رز کے نرم لبوں کو سوکھے ہوئے ہونٹوں سے لگائیں
دامنِ موسمِ گل ہے انھیں کا شیخِ حرم سے مت گھبرائیں

اپنا دیس ہے اپنی جنت، آؤ مل کے خوشیاں منائیں
چھوڑ کے ذکرِ آبِ کوثر بہتی ہوئی گنگا میں نہائیں

ناز مانکپوری

نیا سال نئی دھوپ

یہ سورج کی بندی، شفق کا یہ آنچل
ہواؤں کے گھنگھرو، یہ لہروں کی چھاگل
سہاگن کی زلفیں، سویرے کے بادل
یہ معصوم شوخی، محبت یہ نرمل

اُشا کا یہ سنگار، یہ روپ دیکھو
نئے سال کی یہ نئی دھوپ دیکھو

ہر اک بوند ساگر، ہر اک کن ستارا
ہر آواز میٹھی، ہر اک گیت پیارا
ہر اک موج ایکتا کے سنگم کا دھارا
وطن کے ہیں ہم سب وطن ہے ہمارا

وطن اپنی دھرتی، وطن عرش اپنا
وطن کی محبت ہے آدرش اپنا

محبت کا سندیش سب کو سنائیں
نیا راگ چھیڑیں، نیا گیت گائیں
نئی زندگی کی نئی یوجنائیں
نئے سال میں آؤ مل کر بنائیں

نئی دھڑکنیں ہوں، نئی بھاؤنا ہو
محبت کے دل میں نئی کلپنا ہو

اردو اکادمی، دہلی

گھٹا مسجد روڈ دریا گنج، دلی

اُردو اکادمی دہلی کی گورننگ کونسل کی میٹنگ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۸۶ء میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ ثقافتی پروگرام و سیمینار کمیٹی سال رواں میں پانچ سیمینار منعقد کرے۔ اس سلسلے کا پہلا سیمینار بہ عنوان "اردو ریسرچ اسکالرز سیمینار" ۲۹ اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو دہلی یونیورسٹی میں منعقد ہو چکا ہے۔ باقی چار سیمینار حسب تفصیلِ ذیل منعقد کئے جائیں گے۔

---

(۱) نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس، پر دو روزہ کل ہند سیمینار ۷ اور ۸ فروری ۱۹۸۷ء کو اُردو اکادمی دہلی کے ہال میں منعقد ہوگا۔ اس سیمینار میں دہلی اور بیرون دہلی کے ممتاز ماہرینِ تعلیم اقلیتوں کے درس و تدریس کے آئینی تحفظات اور نئی تعلیمی پالیسی، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر نئی تعلیمی پالیسی اور اُردو، نئی تعلیمی پالیسی اور سہ لسانی فارمولا، اردو داں لوگوں کی ملازمت جیسے موضوعات پر اپنے خیالات پیش کریں گے۔

(۲) ڈاکٹر ذاکر حسین کی قومی و ادبی خدمات پر ایک کل ہند دو روزہ سیمینار ۱۴ اور ۱۵ فروری ۱۹۸۷ء کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں منعقد ہوگا۔ اس سیمینار میں مرحوم ذاکر صاحب کی قومی و ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا جائیگا۔ مرحوم ذاکر صاحب بحیثیت مفکر، دانشور اور ماہرِ تعلیم ہمارے لیے جو ورثہ چھوڑ گئے ہیں اسکی قدر و قیمت اور عصری افادیت پر اسکالرز مقالات پیش کریں گے۔

(۳) اردو اور ہندی کے رشتے کو مزید تقویت دینے کے لئے ایک سہ روزہ سیمینار، اُردو شاعری کی ہندی اصناف، کے زیرِ عنوان ۲۸ فروری، یکم مارچ اور ۲ مارچ ۱۹۸۷ء کو غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں منعقد ہوگا۔ اس سیمینار میں فارسی شاعروں کے یہاں ہندی اصناف، قوالیوں میں ہندی بولیوں کا چلن، اُردو کی عوامی شاعری میں دوہوں کی روایت، اُردو میں بارہ ماسہ کی روایت، گیت نگاری جیسے موضوعات پر علمی اور تحقیقی مقالے پڑھے جائیں گے۔

(۴) اُردو مرثیہ پر ایک کل ہند سہ روزہ سیمینار ۲۱، ۲۲ اور ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں منعقد ہوگا۔ اس سیمینار میں اُردو مرثیے کے آغاز و ارتقا، مرثیے کی اقسام، مرثیے کی عوامی روایت، مرثیے کی ادبی و لسانی اہمیت، اُردو مرثیہ دہلی میں، اُردو مرثیہ لکھنؤ میں، اُردو مرثیہ میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی، سانحۂ کربلا کا علامتی و شعری استعمال جیسے عنوانات پر اسکالرز مقالات پیش کریں گے۔

شریف الحسن نقوی

گھٹا مسجد روڈ

دریا گنج، دلی۔ فون نمبر ۲۷۶۲۱۱

हिन्दी अकादमी, दिल्ली
ए-२६/२७, सनलाइट इंश्योरेंस बिल्डिंग, आसफ अली रोड,
नई दिल्ली-११०००२

ہندی اکادمی دلّی

اکادمی کی اہم خدمات اور نتائج

اعزازات ۔ انعامات ۔ وظائف اور مالی امداد وغیرہ

ادیبوں کو اعزازات: گیارہ ادیبوں کو اعزاز دیا گیا۔
ادبی نگارشات پر انعامات: پچیس تخلیقات پر انعام دیا گیا۔
اُبھرتے ہوئے قلمکاروں کے لئے انعامی مقابلے: ستائیس ابھرتے ہوئے قلمکاروں کو انعام دیا گیا۔
ریسرچ اسکالروں کے لئے وظائف: دلّی کے ادب اور لوک ادب پر دس ہزار روپے ہر سال

ادیبوں کی مالی معاونت: پندرہ ادیبوں یا ان کے پسماندگان کو مالی امداد دی گئی۔
طالب علموں کو انعامات: چودہ طالب علموں کو انعامات دیئے گئے۔
چھوٹے اخبارات و رسائل کو پروتساہن
بچوں کے لئے بال ادب کو پروتساہن
یُوا پرتبھاؤں کی کھوج • پرکاشن سہیوگ: پندرہ تخلیقات پر

ادبی مذاکرے۔ سیمنار، مباحثے کوی سمیلن وغیرہ

تعلیمی سیمنار۔ ترجمہ سیمنار۔ آچاریہ ہزاری پرساد دویدی سیمنار بھارتیندو سیمنار ڈاکٹر راجندر پرساد جنم شتابدی اجلاس ہندی پتر کارکانفرنس سنسکرت سیمنار ہندی زبان کے کارکنوں کی کانفرنس ہندی اور قومی یکجہتی وچار گوشٹھی ساہتیہ اور سوہارد سنگوشٹھی بھاشا بھارتی یوجنا کے تحت لسانی و جذباتی یکجہتی اور سامپر دایک سوہارد کے پرشٹھ اور وکاس کے لئے کاریہ کرموں کا آیوجن ماسک ساہتیک کاریہ کرم ہندی دوکے اور پکھواڑے کا آیوجن ہندی کے بیسویں بسنت (۱۹۹۸ء) سے ۱۹۸۵ء تک کی مدت کے لئے ایک یہ اجلاس کوی سمیلنوں کا آیوجن) یوم جمہوریت پر (قومی کوی سمیلن کے علاوہ راشٹریہ ایکتا و چیتنا کے سلسلے میں ایکتا کے سور چیتنا کے سور اور بندنا کے سور عنوانات پر اہم کوی سمیلن) نئے اور نوجوان پرتبھاوان کویوں کے لئے ابھرتے سور یا کوی منچ راشٹر کوی متعلق شری مَیتھلی شرن گپت جنم شتابدی سماروہ کے موقع پر راشٹر کوی سمیلن انٹرویو اور موضوعاتی مباحثے۔

پستکالیہ و پرکاشن

حوالہ جاتی کتب خانوں اور دارالمطالعوں کا قیام۔ شعری انتخاب "مجیوتی کلش" نوجوان ادیبوں کی انعام یافتہ تخلیق "اگنی کرنیں" ہزاری پرساد دویدی سیمنار کا مجموعہ "ملکاورش سرتی سنکلن" دلّی ساہتیہ کاروں کی ڈائرکٹری "ہندی مینوئل" وغیرہ و دیگر اہم ۔

دیگر مختلف

ہندی کے پرچار پرسار کے لئے میلے کیلے اور معاون پروگراموں کا آیوجن۔ بھاشا کاریہ شالاؤں اور کشادوں کا آیوجن وغیرہ۔

ڈاکٹر نارائن دت پالی وال
سکریٹری ہندی اکیڈمی دلّی

۲۶/۲۷ سنلائٹ انشورنس بلڈنگ۔ آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ ٹیلی فون نمبر ۲۳۹۵۰ے

شانِ ہند، دہلی، جنوری ۱۹۸۶ء

یومِ جمہوریت

اردو شعر و سخن کے آئینہ میں

توصیف علوی عاصمی

ہمارے قومی تہواروں میں "یوم جمہوریت" سب سے اہم اور بلند ترین مقام کا حامل ہے۔ ویسے ہماری آزادی کا تاریخی دن اگرچہ ۱۵ اگست ہے جب ۱۹۴۷ء میں ہم نے سیکڑوں سال پرانی غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کر کے سامراجی طاقتوں کے خلاف فتح پائی تھی ـــــ اس کی حیثیت اس کاغذی دستاویز سے زیادہ نہ تھی۔ ہماری ٹیکنیکی اکا سنگ میل اور اس تاریخ کا پیش لفظ تو ۲۶ جنوری کا یہ دن ہماری قومی جدوجہد کے ایک خاص موڑ اور ایک اہم واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کا ہماری قومی جدوجہد سے ایک بہت بڑا تاریخی رشتہ ہے۔ اور یہی اس دن کی عظمت اور اہمیت کا حقیقی آئینہ دار ہے۔

ہماری جنگ آزادی اور قومی تحریک جس کا سب سے پہلا سنگ میل ۱۸۵۷ء کے جہاد اور خونی ڈرامہ میں نصب کیا گیا تھا۔ مختلف دوروں سے گذرتی ہوئی اور بے شمار نشیب و فراز سے دوچار ہوتی ہوئی پہلی جنگ عظیم کے بعد جب اپنی حقیقی منزلوں کی طرف گامزن ہوئی تو ایک مقام "ہوم رول" کا آیا جو ایک "سحر سامری" تھا۔ مگر ہمارے سربراہانِ قوم اور آزادی کے دیوانوں پر یہ جادو نہ چل سکا اور آخر کار لاہور کے کانگریس کے عظیم اجلاس میں راوی ندی کے کنارے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہم نے مکمل آزادی کا عہد لیا۔ اور یہی ہمارے معماروں کے خوابوں کی تعبیر اور ہماری قومی جدوجہد کی حقیقی منزل ٹھہری، اور اس عہد اور سنکلپ کو ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کے دن ملک بھر میں دہرایا گیا۔ اور ہندوستان کے بچے بچے نے مکمل آزادی کی قسم کھائی اور اسی وقت سے یہ تاریخ آزادی کے عزم و عہد کو دہرانے اور مکمل آزادی کے نصب العین کی طرف پختہ ارادوں کے ساتھ گامزن ہونے کے لئے یادگار بن گئی۔ اور ذہنی فکری اور عملی طور سے یہی ۲۶ جنوری ہمارے لئے "یوم آزادی" بن کر رہ گئی۔ اور آزادی کے علمبردار اور پرستار برابر اس روز عزم و ارادہ کو دہراتے اور آزادی کے عہد کو تازہ کرتے رہے چنانچہ غلامی کی زنجیروں کے پاش پاش ہونے اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کی آئینی اور قانونی منزل پر پہونچنے کے بعد اگرچہ ہم آزاد تھے اور ایک شام غم کے بعد ایک نئی صبح نے جنم لیا تھا۔ تاہم ابھی فضاؤں میں شب تاریک کے سائے باقی رہے تھے اور ابھی غلامی کے دور کا آئینی اور دستوری لبادہ ہمارے کندھوں پر تھا ہمیں اسے اتار کر اپنے دستور اور جمہوری آئین کی زریں چادر زیب تن کرنی تھی، آخر ہماری دستور ساز اسمبلی نے ہمارے لئے اپنا ایک دستور العمل اور لائحہ حیات ترتیب دیا۔ اور جب اس کے نفاذ اور اجراء کا سوال سامنے آیا تو نگاہِ انتخاب اسی آزادی کے عہد سے منسوب ۲۶ جنوری پر پڑی اور ۱۹۵۰ء میں اسی تاریخ کو ہندوستان کا جمہوری آئین لاگو ہوا۔ اور اس وقت سے ۲۶ جنوری ہمارے لئے "یوم جمہوریت" بن گئی اور اسے ہندوستان کے سب سے بڑے اور اہم ترین قومی تہوار اور جشن کا منصب و مقام حاصل ہو گیا۔

"یوم جمہوریت" کے گرانقدر منصب و مرتبہ نے ۲۶ جنوری کی اہمیت اور عظمت ہماری قومی زندگی میں بلند ہو گئی۔ اس لئے کہ آج بین الاقوامی

سطح پر ہمارا جمہوریت صحیح معنوں میں سب سے مکمل اور عظیم جمہوریت ہے۔ یوں تو آج کا دَور اور یگ بھی جمہوری کہلاتا ہے۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں دنیا کا ہر ملک اور ہر سیاسی نظام جمہوریت کا دعویدار ہے۔ حتیٰ کہ جہاں ابھی تک کھلی آمریت اور سامراجیت و نازیزم کا کھلا دور دورہ ہے وہ بھی جمہوریت اور ڈیموکریسی کے علمبردار بنتے ہیں۔ لیکن اگر پر جانیں اور جمہوریت کے حقیقی آئینہ میں جائزہ لیا جائے تو ہمارا عوامی نظام حکومت اس کا سچا آئینہ دار اور غماز ہے دوسرے یہ دستور العمل ہمارے صدیوں کے خوابوں کی تعبیر اور عوامی اقتدار کی سچی تصویر ہے۔ اس جمہوری نظام نے ہمیں سچی اور دستوری آزادی دی ہے۔ ہم اس پر جتنا فخر کریں کم ہے۔ اس لئے آج ہمارا یہ نظام جمہوریت کا بلند ترین اور عظیم ستون اور سرچشمہ کہا جاتا ہے۔

ہمارے یوم جمہوریت ۲۶ جنوری کی عظمت اور اہمیت کے کئی پہلو اور گوشے ہیں۔ اول یہ کہ اس دن کی ایک خاص تاریخی اور قومی اہمیت ہے۔ نیز اس سے ہمارا ایک جذباتی لگاؤ اور اس سے مسرت اور شادمانی کے ہمارے بے حساب احساسات وابستہ ہیں۔ دوسرے اس نظام کی برکتیں اور افادیت اور عالمی سطح پر ہماری جمہوریت کی عظمت و کردار بھی اس کے بڑے نمایاں پہلو ہیں ان کے علاوہ اس دَور کی عوامی اقتدار کی آئینہ داری بھی اس کا قابل فخر عنوان ہے۔ ہماری اردو شاعری چونکہ ایک زندہ و تابندہ شاعری ہے، جو ہماری تاریخی قومی اور سماجی روایتوں اور قدروں کی پوری طرح عکاس اور آئینہ دار ہے۔ اس میں زندگی کے ہر گوشہ اور پہلو کی عکاسی ملتی ہے۔ اسی سے ہماری شاعری اور شعر و سخن کے آئینہ میں ہماری جمہوریت اور عوامی نظام کی بھی ہر پہلو اور گوشہ سے تصویر کشی کی گئی ہے اور ہر عنوان سے اس کی غمازی اور نشاندہی موجود ہے۔ اس موضوع کا خواہ تاریخی پہلو ہو یا اس کی افادیت اور عوامی کردار اس کی عظمت و اہمیت کا گوشہ ہو یا اس کے ساتھ امیدوں اور خوشیوں کا تعلق، ہمارے اردو شعراء نے حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبہ کے ساتھ بڑے پر خلوص انداز اور مختلف پہلوؤں سے اس پر روشنی ڈالی ہے اور فن پارے تراشے ہیں۔

یوم جمہوریت کا سب سے نمایاں پہلو خود ۲۶ جنوری ہے جو اپنے ساتھ بے شمار قومی اقتدار اور عوامی روایات رکھتی ہے۔ اس کی اپنی ایک تاریخی حیثیت ہے اور ملی کردار ہے اس کے جشن کی شان اور آن بان ہے۔ چنانچہ ہمارے بہت سے شعراء نے اسی عنوان سے اس کی عکاسی کی ہے۔ اور بڑے شاعرانہ انداز سے اس کے نقوش ابھارے اور سنوارے ہیں اس کی کچھ نمایاں جھلکیاں پیش کی جاسکتی ہے۔

پیغام دلنواز ہے چھبیس جنوری
صد وجہ فخر و ناز ہے چھبیس جنوری
تکمیل جذب و شوق کی کھائی تھی جب قسم
اُس عہد کی غماز ہے چھبیس جنوری
باپو کا خواب اور جواہر کی فکر نو
آزادی کی آواز ہے چھبیس جنوری
جمہوریت کے باب کا اوراقِ بے بہا
تاریخ کا اعجاز ہے چھبیس جنوری
خاکہ ہے ایک عدل و مساوات کا عامی
آئین دلنواز ہے چھبیس جنوری

اک عزم کی تصویر ہے چھبیس جنوری
اک جذبۂ تعمیر ہے چھبیس جنوری
صدیوں بُنا تھا جن کو کہ اربابِ شوق نے
ان خوابوں کی تعبیر ہے چھبیس جنوری
جمہوریت کی شان و مساوات کے نقوش
آزادی کی تفسیر ہے چھبیس جنوری
عزم و یقیں کے جن سے کہ پرچم ہوئے بلند
ان قدروں کی توقیر ہے چھبیس جنوری
جس نے غزل سنوار دی عاصی حیات کی
وہ مطلعِ تنویر ہے چھبیس جنوری
عاصی کیرانوی۔ "چھبیس جنوری"

اسی عنوان سے ایک اور محب وطن سخنگو فیاض گوالیاری نے بڑے پر خلوص انداز اور یگانہ روی سے ایک نظم میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور اس یوم سعید سے کیا کیا امیدیں وابستہ ہیں ان کی نقاشی کی ہے۔ اس کا ایک بند ہے ؎

چھبیس جنوری میری چھبیس جنوری
اُتری تیری فضاؤں میں جمہور کی پری
انسانیت کی جس سے ہے کھیتی ہری بھری
بھارت کو جس کے دم سے میسر ہے برتری

رہ پائیگی نہ آمریت بے لگام اب
فاضل ججوں کا کام کریں گے عوام اب
لیگا نہ کوئی بھوک کا لالچ کا نام اب
جن کو ضیا ہے عقل سے لیں گے وہ کام اب
جمہوریت کا کیوں نہ کریں احترام اب!
چھلکیں گے پھر خوشی کے ہاتھوں میں جام اب
اونچا اٹھا کے مانگئے بھارت کا نام اب
اس نام کو کرے گا زمانہ سلام اب
آکاش کی فضاؤں سے اتری ہوئی پری
چھبیس جنوری میری چھبیس جنوری
"یوم جمہوریت"، فیاض گوالیاری۔

چھبیس جنوری کا یہ جشن ہو مبارک
ہر سال زندگی کا یہ جشن ہو مبارک
سب کا یہی فسانہ سب کا یہی ترانہ
اپنی ہی چھاؤں میں ہے اب اپنا آشیانہ
سورج وہی ہے لیکن ہے روشنی نئی سی
دنیا وہی ہے لیکن ہے روشنی نئی سی
"یہ جشن ہو مبارک"۔ یوسف تاج

اس کے ساتھ ساتھ ہمارے شعراء اور سخنوروں نے ۲۶ جنوری اور روزِ جمہور کی برکتوں اور بخششوں کی بھی عکاسی کی۔ اور جشنِ جمہور کی شان و شوکت اور خوش کن کیف کا بھی مختلف شاعرانہ اور دلچسپ انداز سے نظم کیا ہے جو ہمارے اہلِ ذوق کی حب الوطنی ا

یش بھگتی کا آئینہ ہے۔
ل کشا ہکہ نہ ہے راز یہ روزِ جمہور
وق سے کیوں نہ منائیں اسے اربابِ شعور
یہ گلی کوچہ و بازار نیا ہے گلزار
دیکھنے نکلے اسے صاحب مال و نادار
عوتیں ہونے لگیں انجمنیں سجنے لگیں
بام اُٹھنے لگے شہنائیاں بجنے لگیں
روز و شب کیوں نہ چمکتا آئے یہ چمن
آفتاب و مہ الفت سے منور ہے وطن
روزِ جمہور۔ راز الہپوری

تھا کل بھی مگر آج ہے کچھ رنگ چمن اور
جمہور کی قدروں سے بڑھی شانِ وطن اور
پانی میں کچھ ایسی روانی تو نہیں تھی
آزاد ہیں دلشاد ہیں کچھ گنگ و جمن اور
گلشن کی فضاؤں کو قرار آگیا آخر
ہر روز نہ بدلے گا اب آئینِ چمن اور
فیاض بہر گام ہیں میرے لئے کب
آئینہ بن گئے ذرات وطن اور

یوم جمہوریت کے جشن کی رنگینیوں اور اس مبارک دن کی برکات کے ساتھ ہمارے سخنکاروں نے اس کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ہمیں یوم جمہوریت کس طرح منانا چاہئے اور اس روز دیش کی خدمت اور وطن کی عظمت کو بڑھانے کے لئے ہمیں کیا کیا کرنا چاہیئے۔ دراصل یوم جمہور کی تقریبات اور جشن منانے کا یہی اصل مقصد بھی ہے کہ اس موقعہ پر ہم دیش کے لئے اپنے فرائض اور خدمات کا جائزہ لیں اور اس میدان میں گامزن ہونے کی تدبیریں سوچیں

چھبیس جنوری ہے یہ بیڑا اُٹھائیں ہم
ہنسا مٹا کے سب کو اہنسا دکھائیں ہم
وہ آدمی نہیں جو رہے آدمی سے دور
نفرت کا بیج اپنے دلوں سے مٹائیں ہم
ٹھکرا کے اونچ نیچ کے ہر بھید بھاؤ کو
بھائی کو بھائی کہہ کے گلے سے لگائیں ہم
یہ رنگ و نسل و قوم یہ فرقے یہ ذات پات
دیواریں ہیں یہ بیچ میں ان کو گرائیں ہم
گٹ بندیاں مٹا کے سبق ایکتا کا دیں!
کوکب پھر اپنے دیش کی طاقت بڑھائیں ہم
جشنِ جمہوریت۔ شاہ کوکب القادری

ذرا رنگِ جمہوریت دیکھئے
شگفتہ ہیں چہرے ہر اک شاد ہے
مسرت ہے چاروں طرف رقص میں
غلامی سے ہر شخص آزاد ہے

آؤ ہم امن و مساوات کا پرچم لے کر
موڑ دیں گردشِ ایام کو آندھی کی طرح
کوئی شکوہ نہ رہے کوئی شکایت نہ رہے
کاش ہو جائیں یہاں ہم سبھی گاندھی کی طرح
"جشنِ جمہوریت کی نذر"
ساغر ساگری

کون کہتا ہے کہ سب کچھ بھول جانا چاہیئے
دیش آخر دیش ہے سب یاد آنا چاہیئے
وہ جنہوں نے دیش ہی کے واسطے
اُن شہیدوں کیلئے سر کو جھکانا چاہیئے
بغض و نفرت کے بھلا کر گیت سارے دوستو
پیار کا جو گیت ہے ہر لب پہ آنا چاہیئے
ہے یہی سندیش اب جمہوریت کا دوستو
آفتوں کے درمیاں بھی مسکرانا چاہیئے
پھر محبت کی فضا گاندھی نے جس سے یہاں
نغمۂ مہر و محبت ایسا گانا چاہیئے

محبت کی شمعیں جلاتے چلیں
تمناؤں کے گیت گاتے چلیں
قدم روز آگے بڑھاتے چلیں
مرادوں کی جنت بناتے چلیں
نئے سال میں ہے فضا نور کی
گھڑی آگئی جشنِ جمہور کی

ہے انسان کا انسان جگانے کا عزم
وطن کو ہے اونچا اٹھانے کا عزم
سبھی رنج و کلفت مٹانے کا عزم
ہے بھارت کو جنت بنانے کا عزم
محبت نے ظلمت جو کا نور کی!!
گھڑی آگئی جشنِ جمہور کی!!
"جشنِ جمہور"
فیاض گوالیاری

ہمارے کچھ سخنوروں نے جمہوری نظام کی عالمی اور بین الاقوامی افادیت اور آجکل جمہوریت کی عام مقبولیت کے سلسلہ میں بھی قلم فرسائی کی ہے۔ اور یہ ظاہر کیا ہے کہ اس دور میں ہر نظام کی بنیاد کسی نہ کسی پہلو سے جمہوریت پر رکھی گئی ہے۔

آج کی دُنیا میں جس کا نام ہے جمہوریت
کچھ نئے فکر و نظر کو جس نے دی ہے تقویت
جس پہ قائم آج ہے ہر ایک جمہوری نظام
جس سے کہ جمہور کی اقدار نے پایا مقام
جو ہر اک دستور کی اس دور میں بنیاد ہے
جو زمانہ کی نئی اقدار کی رُوداد ہے
ہے جہاں کوئی نہ "بندہ" اور نہ "بندہ نواز"
ایک ہی صف میں جہاں ملتے ہوں محمود و ایاز
ہے جہاں پر امن اور قانون کی بالاتری
جس میں ہے دستور کے ہاتھوں میں ہر کی سروری
"جمہوریت"
عاصی کیرانوی

جمہوری نظام کی اصل تعریف اور اس کے بنیادی خطوط اور نقوش کی عکاسی کرتے ہوئے عاصی کیرانوی نے اپنی ایک نظم میں اس طرح اظہار کیا ہے۔

ہو جہاں آئین کا سب کی نظر میں احترام
زندگی کے ہو تقاضوں کا جہاں پر اہتمام
ہو جہاں انصاف کے ہاتھوں میں انساں کی زمام
امن و الفت کا زمانہ کو جہاں پر ہو پیام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام
ترجمانِ دل جہاں جمہور کی آواز ہو

دستِ محنت کش جہاں آئینۂ اعجاز ہو
جذبۂ قومی جہاں ہر فرد کا دمساز ہو
زندگی ہر ایک میداں میں جہاں ہو شادکام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام
دیوتا بن کر جہاں بیٹھیں نہ طاقت کے صنم
ہو جہاں دولت کے ہاتھوں میں نہ قسمت کا علم
سیم و زر کا ہو جہاں انساں ممنونِ کرم !!
ہو جہاں جمہور کے ہاتھوں میں طاقت کی زمام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام

"جمہوری نظام"

اردو شاعری کی حساسی اور جرأت دیدنی ہے
دیکھئے کہ اس میں یومِ جمہور اور جشن جمہور کے صرف ترانے اور نغمہ سرائی نہیں ہے اور جمہوریت کے خطوط اور نقوش کی نشاندہی تک ہی اس کے تخیل کی پرواز نہیں رکتی بلکہ جب جمہوریت کے اصل خوابوں کی تعبیر اس میں نظر نہیں آتی اور اس نظام کے صحیح خاکے نہیں جھلکتے تو ہمارا شاعر تلملا اٹھتا ہے اور اس طرح ماتم کناں ہوتا ہے۔

جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن
ذہنِ انساں میں ہیں الجھے ہوئے افکار ابھی
دل یہ ہے آتشِ اندوہ شرر بار ابھی
زندگی موت سے ہے برسرِ پیکار ابھی
دورِ حاضر کی سیاست ہے فسوں کار ابھی
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن
ہیں وہی محوِ تقدیر کے انداز ابھی !!
خاک کے ذروں کو آتی نہیں پرواز ابھی
خود فریبی پہ ہے محمول تگ و تاز ابھی
اپنے انجام سے بے گانہ ہے آغاز ابھی
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن
جلوۂ شاہدِ مینا بھی ہے مستور ابھی
شامِ رنگیں کے نظارے بھی ہیں بےنور ابھی
چہرۂ صبحِ تمنا بھی ہے بے نور ابھی
مختصر یہ ہے کہ منزل ہے بہت دور ابھی
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن

"جشنِ جمہور" غازی سکروڈی

کیا یہ ممکن ہے بہار آئے چمن میں لیکن
نہ کلی ہی کوئی چٹکے نہ کوئی پھول کھلے
ہم نے یہ بات کسی دور میں دیکھی نہ سنی
عہدِ جمہور میں جمہور کو سرداری نہ ملے

"عہدِ جمہور"
آتش بہاولپوری

کیا گل کھلا دیا ہے چھبیس جنوری نے
کاشانہ بنا دیا ہے چھبیس جنوری نے
دیکھا نہ تھا کبھی جو جنتا نے خواب میں بھی
وہ اب دکھا دیا ہے چھبیس جنوری نے
اخلاقِ ہند جس پر قرباں تھا کل زمانہ
وہ بھی مٹا دیا ہے چھبیس جنوری نے
باپو نے جو دیا تھا سبق اے قابل
وہ بھی بھلا دیا ہے چھبیس جنوری نے

"جشنِ چھبیس جنوری"
قابل دہلوی

اس دور میں جمہوریت کی قدریں اور جمہوری روایات کے جو ستم ظریفیاں چل رہی ہیں اور جس طرح سے ان اقدار کو پامال کیا جا رہا ہے، اس سلسلہ میں ہمارے اہلِ سخن کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ اور ہمارے سخنور کس طرح سوچ رہے ہیں۔ اس کی چند جھلکیاں ہیں۔

ہاں مگر ہے آج کی جمہوریت بھی ساحری !!
اس کے پردہ میں بھی تو ہوتی ہے اک جادوگری
اس میں تو آمریت کا ابھی تک روپ ہے
چاندنی اس کی بھی تو اک چلچلاتی دھوپ ہے
اس میں بھی انساں کے خونِ دل سے جلتے ہیں چراغ
اس میں بھی زر سے ابھی مفلوج ہوتے ہیں دماغ
اس میں بھی تو آج تک انسان کا بہتا ہے خوں
اس میں بھی تو عقل کے پردہ میں ہے رنگِ جنوں
اس میں بھی انسان کے بنتے ہیں انساں دیوتا
ناخدا اس میں بھی تو بنتے ہوئے دیکھے خدا
ہے ابھی اس میں تو کچھ آہنی پنجوں کا زور
اس میں بھی تو ہے دکھی انسان کی آہوں کا شور
ہے ابھی جمہوریت بھی گویا اک رنگین خواب

آبِ حیواں کے نئے پردوں میں ہے یہ بھی سراب

"جمہوریت کے نقوش"
حاکم کیرانوی

جشنِ جمہور کی جو کچھ ہے حقیقت مت پوچھ
جشنِ جمہور بعنوانِ سیاست مت پوچھ
جس کے پہلو میں سسکتی ہیں [illegible] لاشیں
کیوں ہے اس نادرِ گیتی سے محبت مت پوچھ

ایک ہنگامہ ہے سلطانیِ جمہور کی بات
ایک افسانہ ہے آئین کی دستور کی بات
آتشِ گل خس و خاشاک تک آ پہونچی ہے
تم سمجھتے ہوئے اسے ابھی بہت دور کی بات

جلوۂ طور یہی ہے تو الٰہی توبہ
صبح کا نور یہی ہے تو الٰہی توبہ
تم نے ساغر میں انڈیلا ہے غریبوں کا لہو
جشنِ جمہور یہی ہے تو الٰہی توبہ

جشنِ جمہور تو اک نغمۂ بیداری ہے
جشنِ جمہور تو اک جذبۂ خودداری ہے
جشنِ جمہور نہیں طرفہ تماشا یار
جشنِ جمہور تو اخلاص و وفا کار

غازی سکروڈھوی

یہ ہیں شعر و سخن کے آئینہ میں ۲۶ جنوری
اور یومِ جمہوریت کی وہ ادبی اور فکری جھلکیاں
جن سے ہمارے اس عظیم قومی دن کی عظمت
کی بین الاقوامی اور تاریخی اہمیت ہمارے
سماج اور عوام کے دلوں میں اس سے
امنگیں اور ولولے اس دن کی ہمہ گیر
اور اس کا بلند کردار، نیز اس مبارک دن
کے لیے ہمارے فرائض وغیرہ کی بڑے
انداز میں آئینہ داری ہوتی ہے۔ ساتھ ہی
میں اس کی اصل اقدار کی پامالی
کے حقیقی نقوش کی زبوں حالی سے
سخن، اربابِ فکر اور محبانِ وطن

باقی

تروڑی کا کل ہند مشاعرہ

خلیل انجم کامٹی

ناگپور سے ایک سو تیس "۱۳۰" کلو میٹر دور مشرق میں مینگنیز کی چند کھدانیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں ان میں سب سے قابلِ ذکر کھدان تروڑی کی ہے. تروڑی کسی اہم ریلوے لائن پر تو نہیں ہے. لیکن ناگپور سے بذریعہ ٹرین تروڑی تک پہونچنے کیلئے کم از کم اسی کلو میٹر بمبئی، ہوڑہ مین لائن پر تمسر روڈ اسٹیشن پر ایک نمایاں بورڈ لگا ہوا ہے جس پر جلی حرفوں میں تحریر ہے. تروڑی کیلئے راستہ بدلئے (change for tirodi) تمسر روڈ سے تروڑی کا فاصلہ تقریباً پچاس کلو میٹر ہے اور تروڑی اس ریلوے لائن کا آخری اسٹیشن ہے. راستے میں تمسر ٹاؤن کے علاوہ گوبرواہی، ڈونگری بزرگ اور سکل نام کے قابلِ ذکر اسٹیشنوں پر ٹرین کا مختصر قیام ہوتا ہے. یہ اسٹیشن مینگنیز کھدانوں کی ...ہ سے جانے جاتے ہیں، تروڑی بڑا پُر فضا ...م ہے. مینگنیز کی دریافت سے پہلے یہ گھنا جنگلی پہاڑی علاقہ تھا. اس کا احساس آج بھی ہوتا تروڑی کی مجموعی آبادی دس ہزار سے کچھ کم ہوگی. یہاں گرام پنچایتی نظام ہے، اور مدھیہ ...یش کا قابلِ ذکر شہر بالاگھاٹ اس کا ضلع ہے ...ہاں سے بذریعہ بس تقریباً چالیس کلو میٹر ...اقع ہے.

آج ۱۶ نومبر اتوار عید میلاد النبی کی ...سلسلے میں یہاں ایک کل ہند مشاعرے کا ...انجمن اتحاد المسلمین تروڑی کی جانب سے ...ہا ہے. جامع مسجد کے سامنے وسیع و عریض میدان کو چاروں طرف سے خوبصورت پنڈال سے گھیر لیا گیا ہے. اسٹیج کو خوبصورت طریقے سے سجایا گیا ہے جس پر چار پانچ مقامی شعرائے کرام کے علاوہ تقریباً پندرہ بیرونی شعرائے کرام بھی تشریف فرما ہیں.

آبادی کے اعتبار سے اہلِ ذوق سامعین حضرات اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں. اور اتنی ہی تعداد میں خواتین کرام بھی شعر و سخن کی لطافت سے محظوظ ہونے کی امید میں جمع ہیں. مشاعرے کے مہمانِ خصوصی ہیں ایس ایس چکرورتی صاحب جو تروڑی مائنز کے افسرِ اعلیٰ ہیں. مشاعرے کی صدارت محترم عبد الرب سدا صاحب فرما رہے ہیں. سدا صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں مشاعرہ کمیٹی کے سکریٹری امین الدین صدیقی مائک پر ہیں. اور مہمانِ خصوصی، صدرِ محترم، بیرونی و مقامی شعراء کرام کا استقبال گل پوشی کے ذریعہ فرما رہے ہیں

تلاوتِ کلام پاک سے مشاعرہ کا آغاز ہو رہا ہے. جامع مسجد کے پیش امام خوش لحن آواز میں کلام پاک کی تلاوت فرما رہے ہیں. تلاوتِ کلام پاک کے بعد ناگپور کے نوجوان اور مترنم شاعر اختر کبیر سے نعتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سنانے کی درخواست کی جا رہی ہے. اختر کبیر نعتِ پاک سنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں.

اب مشاعرہ کا باقاعدہ آغاز ہو رہا ہے انجمن اتحاد المسلمین تروڑی کا یہ دوسرا سالانہ مشاعرہ ہے. آج کے مشاعرے کے نقیب کی حیثیت سے حمید انصاری ناگپوری کے نام کا اعلان ہوا ہے مگر وہ موجود نہیں ہیں. ان کی غیر موجودگی سے منتظمین اور سامعین کچھ مایوسی سی محسوس کر رہے ہیں تاہم طے کیا گیا کہ محترم راہی بالاگھاٹی اور راقم الحروف حمید انصاری کی خانہ پُری کریں۔۔ مشاعرے کے پہلے دور کی نظامت راہی کے حصہ میں آئی. لیجئے وہ مائک پر آ گئے ہیں. اور آج کے مشاعرے پر اپنے خیالات کا اظہار فرمانے کے بعد راہی صاحب نے مشاعرے کا آغاز کرنے کے لئے مقامی شاعر ریاض احمد ریاض کو آواز دی. ریاض طنز و مزاح کے علاوہ سنجیدہ اشعار بھی ایک ہی غزل میں کہتے ہیں مائک پر آکر ترنم میں اپنا کلام نذرِ سامعین کر رہے ہیں. ؎

کتنی آسانی سے سولی پہ چڑھا دیتے ہیں لوگ
جب بھی اٹھتا ہوں الیکشن میں گرا دیتے ہیں لوگ

مطلع سے ہی پنڈال میں زندگی آ گئی ہے. پورا ماحول قہقہوں میں ڈوب گیا. مطلع بار بار دہرانے کے بعد ریاض اپنے اسی انداز میں فرما رہے ہیں ؎

ایک قرآن، نبی ایک مسلمانوں کا
پھر بھی آپس میں مسلماں کو لڑا دیتے ہیں لوگ
ریت پر کرتے ہیں تعمیر ہوائی قلعے
چند قطروں کو سمندر بھی بنا دیتے ہیں لوگ

ریاض احمد ریاض اپنا کلام سنا کر نہایت کامیابی کے ساتھ مائک سے لوٹ رہے ہیں اور اب جناب شکیل انجم کو دعوتِ سخن دی جا رہی ہے جو مائک پر آکر ترنم میں مختصر سی بحر میں غزل سنا رہے ہیں ؎

جلتی تڑپتی ہے تمنا کا مسکن
برا دل ہے اے دوست دھڑکن ہی دھڑکن

کوئی اچھا ہے تعریف کرنے والا
بس اسی واسطے چپ کو بنائے رکھئے
شہر میں جھکو نصیب ہوں گی ہنگرائے ممتاز
کسی استاد کو استاد بنائے رکھئے

یہ شعر بھی پسند کئے گئے ؎

معروفِ نگار کس کی جبینِ نیاز ہے
ہر شے جو کائنات کی محوِ نیاز ہے
اے بے نیاز تجھ سے خطائیں چھپی نہیں
قادر ہر ایک شے پہ تو دانائے راز ہے

ممتاز غزل ختم کر کے رخصت ہوئے تو قتیل عثمانی کو زحمت سخن دی جا رہی ہے، سامعین کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہے لوگ بڑی توجہ کیساتھ سن رہے ہیں، بڑے مشاعروں میں عموماً بے تکے اور غیر سخن شناس سامعین کا ہجوم رہتا ہے. ترورٹی کا یہ مشاعرہ گرچہ کم بجٹ کا مشاعرہ ہے، مگر اچھی اور صاف ستھری شاعری کو پسند کرنے والے کم تعداد میں مگر سخن فہم حضرات ہیں اور شعرائے کرام بھی جنہیں بیشتر ابھرے ہوئے شعراء ہیں یا وہ شعراء جو صاف اور شگفتہ شاعری کے پیروکار ہیں. قتیل عثمانی کو بھی خوب داد مل رہی ہے اور خوب پڑھ رہے ہیں ؎

تم سے کہہ گئے بات ہی بات میں
یہ کرم اُن کا پہلی ملاقات میں
کس نے لوٹا مجھے کیسے میں لٹ گیا
کوئی بھی تو پرایا نہ تھا ساتھ میں

اب صدر محترم سے پہلے حیدر بھائی حیدر کو زحمت دی جا رہی ہے. حیدر صاحب زیادہ متاثر نہیں کر پائے تاہم ان کے یہ دو شعر بھی سماعت فرمائیں ؎

گر خطا ہو بتا دیجئے	بعد میں ہر سزا دیجئے
میری قسمت سنور جائیگی	بس ذرا مسکرا دیجئے

اب نہایت ادب و احترام کے ساتھ صدر مشاعرہ محترم عبدالرب ستدا صاحب سے گذارش کی رہی ہے کہ وہ اپنے کلام بلاغت سے سامعین کو محظوظ کریں اس وقت رات کا دامن کچھ بھیگ گیا ہے ذوقِ سماعت میں کمی نہیں ہوئی. لوگ ہمہ تن صدر محترم مطلع عنایت کر رہے ہیں ؎

زندگی تو بند گھر میں ایک خمیازہ لگے
کھڑکیوں کو کھول دو تو کچھ ہوا تازہ لگے

واہ کیا مطلع ہے. لوگ مطلع کو بار بار پڑھوا رہے ہیں. داد کا شور کم ہوا تو اس شعر پر پھر ہنگامہ مچا ہوا ہے ؎

وقت نے چھوڑی ہے کشتی میری کس طوفان میں
تم تو ساحل پر کھڑے ہو کیسے اندازہ لگے

غزل ختم کر کے سامعین کی فرمائش پر ایک اور غزل نذر کر رہے ہیں اس غزل میں بھی وہ بہت کامیاب ہیں. غزل کے یہ دو شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

اسے تو آتا ہے چہروں سے انتقام کا فن
وہ آئینوں پہ بھی گرد و غبار رکھ دے گا
الٰہی وقت کو انساں کے ہاتھ مت دینا
بدل کے ورنہ یہ لیل و نہار رکھ دیگا

اِس طرح مشاعرے کا پہلا دَور نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا، دوسرا دَور شروع کیا گیا یہ دَور حسبِ معمول اور بھی کامیاب رہا گرچہ سامعین کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی لیکن شعرائے کرام پوری وجاہت اور خلوص کے ساتھ اپنے کلام سے نوازتے رہے اور داد وصول کرتے رہے. صبح ساڑھے تین بجے مشاعرے کے اختتام کا اعلان کیا گیا مشتاق احمد انصاری، امین الدین صدیقی ظہیر انصاری، محمد احسان، اشفاق احمد خان محمد صادق فیاض انصاری ایاز احمد انصاری، انداز تاج اور بھارتی ساؤنڈ سروس والے بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی انتھک کوششوں سے یہ مشاعرہ نہایت کامیاب ہوا. اور امید ہے آئندہ بھی اپنی کاوشوں کو جاری رکھیں گے.

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائیں

۱۰ اسرار ۳ دہلی، جنوری ۱۹۸۶ء

(ا) ترقی اردو بیورو کی نئی کتابیں

	نام کتاب	مصنف/مترجم	صفحات	قیمت
1 -	فسانۂ آزاد (جلد اول)	رتن ناتھ سرشار	1088	100/-
2 -	فسانۂ آزاد (جلد دوم)	رتن ناتھ سرشار	718	65/-
3 -	فسانۂ آزاد (جلد سوم)	رتن ناتھ سرشار	1888	135/-
4 -	رباعیات انیس	علی جواد زیدی	386	35/-
5 -	تحلیل نفسی کا اجمالی خاکہ	سگمنڈ فرائڈ/ظفر احمد صدیقی	83	10/50
6 -	اسکول لائبریری	سید حسین رضا نقوی	156	20/-
7 -	گوتلمہ	ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی	204	22/-
8 -	ناوابستگی	رشید الدین خاں/سید محمد مہدی	264	37/-
9 -	مسابقتی صنعت کی ساخت	ای۔ اے۔ جی۔ رابنسن	182	27/-
10 -	فرہنگ ادبی اصطلاحات	کلیم الدین احمد	206	27/-
11 -	وسطی جنوبی افریقہ اور ملاگاسی کی مزیدار کہانیاں	مرتب: محمد امین	100	10/-
12 -	عام لسانیات	ڈاکٹر گیان چند جین	910	75/-
13 -	اصطلاحات لسانیات	ترقی اردو بیورو	128	22/-
14 -	ہندو فلسفۂ مذہب اور نظام معاشرت	مولفہ: ڈاکٹر سید حامد حسین	79	9/-
15 -	اردو زبان کی تدریس	معین الدین	147	8/50
16 -	عشری درجہ بندی	میلول ڈیوی/سید محمود حسن قیصر	908	80/-

(ب) چند اور خصوصی مطبوعات

	نام کتاب	مصنف/مترجم	صفحات	قیمت
1 -	چولا راجگان	کے۔ اے۔ نیل کنٹھ شاستری	1115	60/-
2 -	منتخب وساتیر کا تقابلی مطالعہ	شجاع الدین فاروقی	724	/-
۱ -	ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ	ڈی۔ سی۔ سرکار/ملیحہ سمیع الزماں	684	49/-
4 -	نوریات	ایف۔ ڈبلیو۔ سیرس/آر۔ کے۔ رستوگی	569	32/-
5 -	جامع تاریخ ہند	محمد حبیب و خلیق احمد نظامی	1040	58/75
6 -	بین الاقوامی معاشیات	چارلس پی۔ کنڈل برجر/ڈاکٹر لیاقت علی خاں	744	35/-
7 -	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن کا فروغ	رادھے شیام رنگٹا/غلام حیدر	528	21/50
8 -	کلاسیکی برق و مقناطیسیت	ولف گانگ کے۔ ایچ پیلوفسکی/بی۔ پی۔ سکسینہ	654	0/-
9 -	سرطان کیا ہے	محمد برہان حسین	152	/-
10 -	سیر طالبی (سفرنامہ)	ابو طالب اصفہانی/ثروت علی	359	12/-
11 -	ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج	ڈاکٹر رفیق زکریا	740	6/-
12 -	تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ہربرٹ سورنسن/سلامت اللہ	1003	7/-
13 -	تعلیم کی نفسیاتی اساس	عبداللہ ولی بخش قادری	767	5/-
14 -	ہندوستان کا صنعتی ارتقاء	ڈی۔ آر۔ گیڈگل/ایم۔ صدیق	343	1/-

فور
746
158
381

ملنے کا پتہ: شعبہ فروخت و نمائش ترقی اردو بیورو
ویسٹ بلاک 8 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 66

davp 86/405

جیل سے رہا ہونے والے تین مجرموں نے اکٹھے ہو کر ایک نیا منصوبہ بنایا۔

ناشدنی

کلیم رحمانی

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ میں، خورشید اور محی الدین ایک ہی دن رہا ہوئے۔ ہم نے جیل ہی میں طے کر لیا تھا کہ باہر نکل کر ہم مل کر کوئی دھندا جاری رکھیں گے۔ ہفتے بھر کی تلاش کے بعد ہمیں کہیں بھی ملازمت نہ ملی۔ کوئی ایسی چیز ہاتھ نہ لگی جس سے ہم آرام سے گزارہ کر سکتے۔ مہنگائی خود سب سے بڑا مسئلہ بن کر ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

ایک رات ہم تینوں کمرے میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ چند روز سے مسلسل ہونے والی بارش نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا تھا۔ ہمارا مشترکہ سرمایہ صرف پندرہ روپے پر مشتمل تھا۔ خورشید نے بارش کی شدت کا اندازہ لگانے کے لئے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا اور آسمان کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا "یہ رحمت تو ہمارے لئے زحمت بن گئی ہے۔"

محی الدین بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک دم وہ اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھا اور چیخا "نہیں! یہ زحمت نہیں، رحمت ہے۔" پھر وہ پلنگ سے اُترا اور ہمارے پاس آ بیٹھا۔ اُس کا چہرہ کسی انجانے خیال سے تمتما رہا تھا۔ اس نے خورشید کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا "اگر کل بھی اسی طرح بارش ہوئی تو ہماری پریشانی دُور ہو سکتی ہے۔" ہم دونوں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ شاید بھوک نے اُسے پاگل کر دیا تھا۔

"مجھے اس طرح مت دیکھو" اس نے کہا "میں تو ہوش میں ہوں، ایک تجویز ہے۔ اس بارش میں ہم نہایت آسانی سے کسی بینک کو لوٹ سکتے ہیں۔ بارش کی وجہ سے بینک کے عملے کی حاضری اور اکاؤنٹ ہولڈروں کی چہل پہل برائے نام ہی ہوگی۔"

"شہر میں بینک لوٹنا آسان نہیں ہے" خورشید نے مایوسی سے کہا "سنسان سڑکوں پر پولیس کو ہمارے تعاقب میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ ہم بینک سے نکلتے ہی گرفتار کر لئے جائیں گے۔"

"ڈکیتی کے لئے ماڈل ٹاؤن جیسے سنسان علاقے کا انتخاب کیا جا سکتا ہے" محی الدین نے میری جانب دیکھا "وہاں زیادہ تر متمول لوگ رہتے ہیں، عام دنوں میں بھی پانچ دس لاکھ کیش کا ہونا معمولی بات ہے۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں اُس کی بات سمجھ گیا تھا۔ پھر میں نے اور محی الدین نے مل کر خورشید کو بھی قائل کر لیا۔ ہم تینوں رات گئے تک سر جوڑے بینک لوٹنے کے پلان کا جائزہ لیتے رہے۔ منصوبے کی تمام خامیاں دُور کرنے کے بعد ہم تینوں نے کام بانٹ لئے۔ کار کا انتظام خورشید کے ذمہ تھا، اسلحہ محی الدین کو لانا تھا جبکہ مجھے پیٹرول کا بندوبست کرنا تھا۔ طے یہ پایا کہ کامیابی کی صورت میں اپنے حصے کی رقم لے کر ہم علیحدہ علیحدہ علاقے میں کچھ دنوں کے لئے روپوش ہو جائیں گے۔ ہم تینوں تمام رات ایک پل بھی نہ سو سکے۔ بینک لوٹنے کی یہ ہماری پہلی کوشش تھی۔

صبح سات بجے اچانک بارش بند ہو گئی۔ ہمارے دل ایک دم ڈوب گئے۔ سارے انتظامات مکمل ہونے کے باوجود منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ ہماری نگاہیں بیتابی سے آسمان پر جمی تھیں۔ دس بجے تو یکایک تیز آندھی آئی اور اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ قدرت ہم پر پوری طرح مہربان تھی۔ ہم تینوں جلدی کی کار میں بیٹھ کر ماڈل ٹاؤن کی طرف چل دیئے۔ پورا علاقہ سنسان پڑا تھا۔

بینک لوٹنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ خورشید کار کا انجن بند کئے بغیر کار میں بیٹھا رہا۔ ہم دونوں کار سے اتر کر بینک میں داخل ہو گئے۔ وہاں صرف

پیرا ایک اکاؤنٹنٹ اور دو کلرک تھے۔ منیجر ابھی نہیں
۔ محی الدین نے کاؤنٹر کے عقب میں جا کر اپنی جیب سے
نکالا اور بلند آواز میں چیخا "بیٹھ جاؤ سب"! اس سے قبل
ہمارا اس طرف متوجہ ہوتا، میں نے پستول کا دستہ زور
سے اس کے سر پر مارا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور بیہوش
فرش پر گر گیا۔ بندوق اس کے کندھے سے پھسل کر
گر پڑی تھی۔ میں نے بندوق اٹھائی اور پلٹ کر کاؤنٹر
کی طرف دیکھا۔ کیشیئر لرزتے ہاتھوں سے تھیلے کو نوٹوں سے
بھرنے میں محی الدین کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے
ٹیلیفون کا تار اپنی جانب کھینچ کر اسے بیکار کر دیا۔ تھیلا
بھرتے ہی محی الدین نے انھیں مزید خوف زدہ کرنے کے لئے
بارگیر گھڑی کی جانب ایک فائر جھونک دیا۔ پھر ہم دونوں
تھیلا اٹھا کر دوڑتے ہوئے بینک سے نکلے اور کار میں بیٹھ گئے۔
دوسرے ہی لمحہ کار تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔
ہم اس غیر متوقع کامیابی پر بے حد خوش تھے کوئی
دن خرما گئے بغیر خاصی لمبی رقم ہاتھ آ گئی تھی۔ خورشید نے
سڑک سنسان دیکھ کر ایکسیلیٹر دبا دیا۔ کار تیزی سے صدر کی
طرف بڑھی۔ یکایک خورشید چونک پڑا۔ زیب النسا اسٹریٹ
کے موڑ پر ایک ملٹری جیپ موجود تھی اور ایک مسلح فوجی
برساتی پہنے جیپ کے بونٹ سے ٹیک لگائے چوکس کھڑا تھا۔
"مارے گئے" خورشید چلایا۔ ہمارے چہرے یکلخت
فق ہو گئے۔ کار دیکھ کر فوجی چونکا اور اسٹین گن والا ہاتھ اٹھا

کر ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ خورشید نے رفتار کم کئے بغیر کار کو
ذیلی سڑک پر موڑ دیا اور غصہ میں بھر کر مجھ سے بولا "کیا تم
نے فون کی لائن نہیں کاٹی تھی؟
"صرف لائن ہی نہیں کاٹی تھی بلکہ فون بھی توڑ دیا تھا"
میں نے جواب دیتے ہوئے عقبی آئینہ میں جھانکا۔ ملٹری جیپ
ہارن بجاتی کار کے تعاقب میں تیزی سے چلی آ رہی تھی۔
"پھر انھیں اتنی جلدی بینک ڈکیتی کی بھنک کیسے مل
گئی" محی الدین بڑبڑایا۔
ابھی ہم نے نصف سڑک بھی طے نہیں کی تھی کہ سڑک
کے دوسرے موڑ پر ملٹری کا ایک اور ٹرک کھڑا نظر آیا۔ ٹرک
کے قریب ہی بہت سے فوجی جوان موجود تھے جو اب پلٹ
کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ خورشید نے مجبوراً کار روک لی
فرار کی کوشش بے سود تھی۔
فی الفور گرفتاری کے بعد ہمیں ملٹری جیپ میں بٹھا
کر ہیڈکوارٹر بھیج دیا گیا۔ برساتی میں ملبوس فوجی جوان
ہمارے سامنے بیٹھا خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔
آپ کو یہ اطلاع کیسے ملی کہ ہم بینک لوٹ کر اسی طرف
آ رہے ہیں؟ محی الدین نے اس سے پوچھا۔ اس کے ذہن میں
بھی وہی سوال کلبلایا تھا جو میرے ذہن میں تھا۔
"کیسی اطلاع؟" اس نے چونکتے ہوئے کہا "میں نے تو
تمہیں اس لئے روکا تھا کہ بارش کے سبب ایک عمارت
گر جانے کی وجہ سے آگے راستہ بند تھا۔ میں جیپ پر تمہارے

تعاقب میں بھی صرف اسی لئے آیا تھا کہ تمہیں اس مخدوش
راستے پر جانے سے روکوں۔ خدا تم لوگوں کا بھلا کرے کہ مجھے ترقی
کے زینے طے کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔"

غزل

نسیم نیازی

حال پوچھا تو ہنس کے ٹال دیا
اُس نے کس امتحاں میں ڈال دیا

کس لئے اب ہوا کا رُخ دیکھیں
ناؤ کو جب ندی میں ڈال دیا

بارہا ڈوبتے سفینوں کو
موجِ طوفان نے خود اُچھال دیا

نسبتِ راہبر بھی کیا شے ہے
گرتے گرتے ہمیں سنبھال دیا

روشنی بخش دی ستاروں کو
اُس نے سورج کو گرز زوال دیا

اُس کو دشمن کہوں کہ دوست نسیم
جس نے ماضی کو سے کے حال دیا

غزل

جگن ناتھ آزاد

کیا کہوں آنکھوں کے آگے کیا تماشا آگیا
لاکھ جلوے آ گئے جب ایک پردا آگیا

قتل گہ میں لے کے آنا چاہئے تھا جان مجھے
اور میں دل میں لئے ذوقِ تماشا آگیا

ہونٹ تر کرنے میں اپنی آبرو کا تھا سوال
یوں تو آنے کو مرے رستے میں دریا آگیا

کیا کرے گا کوئی تیرے اگر بیزارِ زیست
پھر تیرے ہنگامۂ امروز و فردا آگیا

مجھ سے جہاں کو اٹھنے نہ دریا اور نہ جھیلیں کوئی
میں جہاں سے اے وقارِ زیست پیاسا آگیا
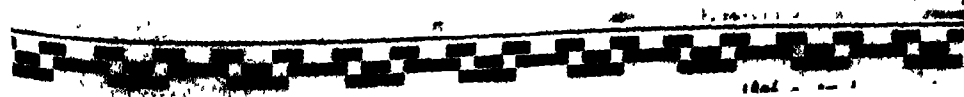
…مضافات میں والا لڑکا آپ کے دروازے پر دستک دے تو؟
…وں پر جمی ہوئی برف سے اس لڑکی کا کیا تعلق تھا؟
…لڑکی کی کہانی جس کی آمد و رفت اِکتیسویں پر موقوف تھی؟

پہاڑوں کی برف

احمد ندیم قاسمی

میں نے قلم کو کاغذ پر جھکایا ہی تھا کہ آواز آئی "اے بی بی! خدا کی راہ میں ایک آنہ دیدے۔ تیرا بچہ جیوے"۔ میں نے قلم کو واپس قلم دان میں رکھدیا۔ اگر اِس قلم کی قیمت چالیس پچاس روپے نہ ہوتی تو میں اُسے یقیناً پٹخ دیتا۔

صبح سے بارہ ایک بجے تک کی سوچ بچار کے بعد مجھے مزے کا ایک فقرہ سوجھا تھا مگر بھکارن کی آواز نے اُسے یوں نوچ لیا جیسے پھونک مارنے سے چراغ کی لَو غائب ہو جاتی ہے۔

کیا بھلا سا فقرہ تھا! میرے افسانے کا یہ پہلا ہی فقرہ قاری کے ذہن کو جکڑ لیتا۔

ملازم مکان کی تیسری منزل پر تھا بھکارن کی آواز اس تک شاید نہ پہونچ سکی تھی، اور میری ہدایت کے مطابق بھکارن کو اس طرف سے دفع ہو جانیکا مشورہ فوراً ملتا۔ بھکارن بھی ایک ہی آواز لگا کر شاید چلدی تھی۔

یکایک کھوئے ہوئے فقرے کے چند الفاظ گڈمڈ صورت میں میرے ذہن میں اُبھرے ایک جلتی ہوئی دیا سلائی بُجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی۔ اُس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا۔ مگر نہیں۔ میں نے برف کے رنگ میں کوئی اور رنگ ملایا تھا۔ لالۂ صحرائی کا رنگ یا شاید شفقِ شام کا رنگ۔ یا ممکن ہے۔

"اے بی بی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دیدے تیرا بچہ جیوے"۔ تو وہ کمبخت ابھی تک وہیں نیچے صدر دروازے میں کھڑی تھی!

دیا سلائی دھوئیں کی ایک منحنی لکیر چھوڑ کر بُجھ گئی۔ اور میں پکارا، "بی بی یہاں گھر میں نہیں ہیں۔"

"بی بی نہیں تو بابو تو ہی خدا کی راہ ایک آنہ دیدے، اے سخی، تیرا بچہ جیوے۔"

میں خاموش رہا۔ بھکاریوں سے زبان لڑانا میرا شیوہ نہیں۔ اُن کے پاس سب سے بڑی دلیل بھوک ہوتی ہے۔ اور مجھے اِس دلیل کا کبھی جواب نہیں سوجھ سکا۔

کچھ دیر کے بعد ذہن کی دُھند میں حرکت پیدا ہوئی۔ اور افسانے کا ابتدائی فقرہ جیسے آنکھیں ملنے لگا۔ اُس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح —

" دے دے نا سخی۔ تو ہی دے دے نا "

اب کے بھکارن کی آواز جیسے عین میرے سر پہ گونجی میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اُس کا پورا دھڑ باہر سیڑھی پر تھا۔ مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ نظر آیا جس سے اُس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا۔ چمکتا ہُوا سفید مگر کہیں کہیں ہلکی سی نیلاہٹ دیتا ہُوا۔ یہ شاید اُس کی رگوں کا رنگ تھا۔ مگر اُس کے ناخنوں نے مجھے زیادہ سوچنے کی مہلت نہ دی۔ یہ ناخن مَیل سے اَٹے ہوئے تھے۔ اور کٹے پھٹے اور دندانے دار تھے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان انگلیوں میں ایک نہایت متوازن حرکت پیدا ہوئی۔ تو یہ ایسی بے فکری بھکارن ہے کہ بھیک ملنے تک کا وقت گذارنے کے لیے کواڑ پر ڈھولک بجانے لگی ہے! کیا ایسوں کو بھیک دینا جائز ہے؟ — مگر کیا ایسے سفید ہاتھوں کو بھیک مانگنے پہ مجبور کر دینا جائز ہے؟ — لیکن کیا ہر مجبوری جائز ہو سکتی ہے؟

میں نے تکیہ کے نیچے سے ایک آنہ اُٹھایا اور بولا " یہ لے "

وہ بولی " اِدھر پھینک دے بابو "۔

نہ جانے مجھے بھکارن کے طرزِ عمل پر غصہ سا کیوں آنے لگا تھا۔ میں نے آنہ پھینکنے کی بجائے پٹخ دیا۔ یہ آنہ کواڑ پر بج کر کمرے کے اندر دہلیز سے کوئی ایک گز کے فاصلے پر رُکا۔ بھکارن نے سیڑھی پر سے ہی جھک کر ہاتھ بڑھایا، یوں اس کے چہرے کا ایک رُخ بھی میرے سامنے آگیا۔ یہ سب کچھ ایک سکینڈ کے تیسرے حصے میں ہُوا۔ یُوں لگا جیسے بجلی سی میرے کمرے میں کوند کر اُٹھ گئی ہے۔ مجھے دروازے تک پہونچنے میں دو سکینڈ لگے ہوں گے مگر سیڑھیاں خالی تھیں۔ میں پلٹ کر تیزی سے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے سامنے آیا۔ وہ گلی کے نکڑ پر جا رہی تھی، پاؤں سے ننگی تھی۔ میلے سرخ رنگ کی شلوار تھی۔ اُس نے سیاہ رنگ کی گھیرے دار قمیض پہن رکھی تھی اور اس کے سر اور پیٹھ پر شلوار ہی کے رنگ کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔

بھکارن کے چہرے کی یک رُخی جھلک نے مجھے اپنے افسانے سے ہٹا کر یونانی صنمیات کی دُنیا میں لا ڈالا۔ وینس اور سائیکی اور افروڈائٹ ہر اساطیری خاتون کے ساتھ یہ چہرہ مماثل ہو جاتا تھا۔ یہ چہرہ جو ایک رُخ سے میرے سامنے آیا تھا اور جتنی دیر میں " سامنے " کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔ غائب ہو گیا تھا۔ اس اڑتے ہوئے ثانئے میں میرے ذہن نے ایک چہرے کی کتنی تفصیلیں محفوظ کر لی تھیں، پتلی اور بے حد سیاہ پلکیں۔ ستواں ناک میں نتھنوں کا بے حد خفیف ابھار بے حد سُرخ ہونٹ۔ بے حد لکیلی ٹھوڑی۔ بے حد سفید گال، بالکل پہاڑوں کی برف کی طرح۔

پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی، در اصل یہ سب کچھ اس ذہنی فضا کا نتیجہ تھا جو میں نے اپنے افسانے کا آغاز کرتے ہوئے قائم کر لی تھی۔ انسان بھی کتنا بے اختیار جانور ہے! اُس پر خود اپنے ذہن کا جبر کتنا شدید ہوتا ہے لاحول ولا قوۃ، میں قلم اٹھا کر افسانے کا پہلا کھویا ہوا فقرہ ڈھونڈنے لگا۔

مگر چراغ کی بجھی ہوئی لَو پہلے کسی کو ملی ہے جو مجھے ملتی! ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہی ایک کھونٹی تھی، جس پر مجھے اپنے خیالوں کا سارا انتشار اٹکانا تھا۔ اور اب یہ کھونٹی ٹوٹ گئی ہے۔ تو میرا ہر خیال پتھر بن گیا ہے اور میں پتھروں کے اس بوجھ تلے دوہرا ہُوا جا رہا ہوں۔

پھر ردّی خریدنے والے نے گلی میں ایک سانس میں کوئی بیس الفاظ کا فقرہ نہایت کرخت آواز میں ادا کیا اور مجھے اس پر غصہ آگیا۔ یہ ردّی والا پچھلے کئی برس سے ہر روز ایک دو بار اس گلی میں سے گزرتا تھا۔ اور میرے مکان کے سامنے ضرور رُکتا۔ وہ جانتا تھا کہ میں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں۔ اور ایسے آدمیوں کے ہاں ردّی بہت عام مل جاتی ہے۔ اس آواز کا عادی تھا۔ افسانہ لکھتے ہوئے بھی میں نے یہ آواز کئی بار سُنی تھی اور میرے افسانے کی روانی میں اس نے کبھی کوئی مداخلت نہیں کی تھی مگر آج مجھے ردّی والے پر اتنا غصہ آیا کہ میں قلم رکھ کر اُٹھا۔ کھڑکی میں نہایت قہر آلود نظروں سے دیکھنا چاہا مگر میری نظر سب سے پہلے گلی کے نکڑ پہ پڑی اور مجھے پہلی بار تجربہ ہُوا کہ تصور ٹھوس بھی ہو سکتا ہے بھکارن دوسری گلی میں مڑ رہی تھی۔

میں جیسے اُس کے تعاقب میں بھاگا میں کتنی گلیوں اور سڑکوں کو طے کرتا ہُوا نہ جانے کہاں جا رہا تھا، نہ جانے میں ٹریفک سے کیسے بچا اور چوراہے کو کیسے پار کیا۔ نہ جانے میں نے کتنے سگریٹ کب جلائے اور کہاں پھینکے پھر جب میں مال روڈ کے ایک چوک میں ٹریفک سگنل کی سرخ بتی دیکھ کر رکا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کہیں جا رہا ہوں، "کیوں بھئی، میں کہاں جا رہا ہوں" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

میں عشق کے سب مرحلوں اور تمام
منزلوں سے آگاہ ہوں، مگر مجھے ایسی وحشت
کا تجربہ کبھی نہیں ہُوا تھا کہ ایک میلی کچیلی، بد
اور اجڈ بھکارن کی صرف ایک نیم رخی
نے میرے خون کو کھولاؤ کے نقطے پر
دیا ہے اور میں وہاں جا رہا ہوں جہاں
اگر واپس نہ آسکوں تو شہر کے بچے
کر دیں تو کیا یہ سچ ہے کہ ہر انسان میں
سا جنون ضرور ہوتا ہے؟ مگر میرا
کیا حکم ہے کہ جب لوگ دونوں ہا
دولت سمیٹ رہے ہوتے ہیں تو میں
لکھ رہا ہوتا ہوں، اور جب میر
شراب پی رہے ہوتے ہیں تو میں

ہوتا ہوں کہ اُن کے لاشعور میں کس قیامت کے رَن پڑ رہے ہوں گے، مجھے جنوُن کی اسی مقدار پر قانع رہنا چاہیئے۔

میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے رات کا ایک بہت بڑا حصّہ اپنے لکھے ہوئے افسانے کا پہلا فقرہ سوچنے میں کاٹا مگر جہاں پہاڑوں کی برف میرے ذہن میں آئی۔ وہیں بھکارن نے سیڑھی پر سے ہاتھ بڑھا کر آنہ اُٹھایا۔ اور کشتِ خیال میں یونانی اجسام کے چہروں کی ندیاں اُمڈ پڑیں۔

میں صبح کو یوں بروقت اُٹھا جیسے رات پوری نیند سویا ہوں، پھر اپنے کمرے میں اس اہتمام سے آ بیٹھا۔ جیسے سورج کے نکلتے ہی دوپہر ہو گئی ہے اور بھکارن اب آتی ہی ہو گی۔ اس مسئلے پر دیر تک میرے اور میرے ذہن کے درمیان خاصی تلخ بحث ہوتی رہی۔ میں کہتا تھا کہ دیکھو تو، میرے ہاتھ میں قلم ہے۔ میں تو افسانہ لکھنے بیٹھا ہوں۔ مگر میرا ذہن کہتا تھا کہ نہیں۔ تم جھوٹے ہو۔ تم تو بھکارن کا انتظار کر رہے ہو اس وقت تو میں نے اُلٹا اپنے ذہن کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا مگر جب دوپہر کو بھکارن نے آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اسی کا منتظر ہوں۔

آواز آئی ”بے سخی۔ خُدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے!“

اور میں نے سوچا کہ کسی شاعر نے کبھی اس سے بہتر شعر بھی کہا ہے؟ عجیب بات ہے کہ میں پلنگ پر سے کوُد کر اُٹھا اور نہ نے قلم کو قلمدان میں رکھا۔ میں نے بڑے بے انداز میں صرف اتنا کہا ”ارے تو بھی آ گئی ؟“

اس پر مجھے لگا جیسے وہ ہنسی ہے۔ نہایت نہایت سُریلی ہنسی۔ جیسے چینی کی پیالی پیالی چھُو جائے۔ پھر وہ میرے کمرے دروازے پر سے بولی ”ہاں تیرا بچہ جیوے“

میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا پورا جسم سیڑھی پر تھا مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ نظر آیا۔ جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کل سے یہیں کھڑی ہے۔ وہ ازل سے یہیں کھڑی ہے۔

یکایک میں ڈرا، کہیں وہ کواڑ پر ڈھولک نہ بجانے لگے، کل میں نے اس کی انگلیوں کی متوازن حرکت سے اپنی شدید ہتک محسوس کی تھی، بھیک اتنی بے نیازی سے نہیں مانگی جاتی۔ بھکارن کو بھیک سامنے آ کر مانگنی چاہیئے۔ طوائفوں تک نے اپنے لئے اخلاق کا ایک معیار مقرر کر رکھا ہے، بھکارنوں کو کم سے کم بھیک مانگنے کا تو سلیقہ آنا چاہیئے۔ سو شاید اس کی بے نیازی کو شکست دینے کے لئے یا گذشتہ لمحے پھر کی بھڑکتی آگ بجھانے کے لئے یا یونہی بے ارادہ میرے منہ سے نکلا ”لے ۔ لے جا۔“

”لا“، وہ بولی ”اللہ تجھے بہت دیوے سخی۔ اللہ تیرا بچہ جیوے سخی۔“

ایک دم وہ ساری اندر آ گئی، میں پہنچ حکم کی بھرپور تعمیل کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے ایک آنہ اتنی تیزی سے اس کی بے حد گلابی ہتھیلی پر گرا دیا جیسے وہ آنے کے انتظار میں ذرا دیر اور اسی طرح میرے سامنے کھڑی رہی تو میں کھڑکی میں سے کوُد جاؤں گا۔

مگر وہ آنہ لے کر اسی طرح کھڑی رہی میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ شیلف پر رکھے ہوئے مٹی کے ایک کھلونے کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے ایک لمحہ میں اس کے سراپا کا اس نظر سے جائزہ لیا کہ کوئی خامی نظر آئے تو اسے اپنے ذہن میں سے نوچ پھینکنے میں آسانی ہو مگر یکایک اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”ہرن ہے؟“

میں نے کہا ”نہیں ہرنی ہے“

وہ بے اختیار چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں جاتی دروازے سے نکل گئی۔

میں تیزی سے کھڑکی میں آیا۔ وہ ایک آنے کو بچوں کی طرح اچھالتی اور پکڑتی ہوئی جا رہی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں گئی۔

عورت فطرت کی نہایت خوبصورت تخلیق ہے۔ اس تخلیق کی داد کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔ نوشگفتہ پھول کو دیکھ کر میرے احساس کو ایک انگڑائی سی آتی ہے اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں خلا میں رینگتے ہوئے بادلوں کو ہم پیار سے دیکھتے ہیں۔ اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ رات کو چھت پر گرتی یا نزدیکی موسیقی چند لمحوں کے لئے ہمیں آسمان سے اُترا ہوا سازینہ معلوم ہوتی ہے اور پھر ہم سو جاتے ہیں، میں نے خوبصورت عورتوں کو بھی ہمیشہ اسی قرینے سے دیکھا ہے۔ حُسن کی طرف ذرا سی زیادہ توجہ دیجیئے تو پھر کسی اور طرف آپ ذرا مشکل ہی سے متوجہ ہو سکیں گے۔ مگر جب کوئی حُسن زبردستی پر اُتر آئے تو زندہ رہنے کی دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یا تو حُسن سے نفرت کرنے لگو اور بھیڑیئے کی طرح مار مار کھاتے ہوئے مر جاؤ۔ یا پھر دُنیا کے دوسرے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لو اور سمندر کے ساحل کی سی زندگی گذار دو کہ وہ فقط ایک کام کرتا ہے۔ وہ سمندر کے مچلتے ہوئے حُسن کو لئے اپنا آغوش ہر لمحہ کھولے رکھتا ہے۔ کبھی کبھار موجیں اسے چند سیپیاں دے جاتی ہیں، مگر پھر ایک اور موج آتی ہے اور ان سیپیوں کو بھی سمیٹ لیجاتی ہے۔ اس کے باوجود ساحل کا آغوش ازل سے کھلا ہے اور ظاہر ہے کہ اس یکطرفہ کاروبار میں کوئی قرینہ نہیں ہے۔

یہ سوچ کر کہ یہ موج مجھے بھی ساحل کی سی افتادگی کی طرف لئے جا رہی ہے، مجھے اپنے آپ پر ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔ مجھے تو یہ سوچ کر قلوپطرہ پر بھی ہنسی آ جاتی ہے، کہ اس کی ناک چھوٹی سی تھی، اتنی بڑی ملکہ اتنی ذرا سی ناک کے ساتھ کیسی عجیب لگتی ہو گی، اور میں تو سپارٹا اور ٹرائے کی فوجوں پر بھی یہ سوچ کر مسکرا دیتا ہوں کہ جب ہیلن کی جوانی ڈھل گئی ہو گی تو اُسے دیکھ کر

طرفین اپنی اپنی حماقت پر کیسے کیسے جھینپتے ہوں گے ہنستے ہوئے میں نے قلم اٹھایا اور یوں لکھنے بیٹھ گیا جیسے آج افسانے کا ایک پہلا فقرہ ہی کیا آخری فقرہ بھی لکھ کر اٹھوں گا۔

" اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا"۔ اس کا رنگ ان پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا جن پر اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا جو "۔ اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح اس حد تک صاف تھا کہ "

اور پھر چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجنے لگیں۔

ایک موج آئی اور ساحل کو اپنی یادوں کی نمی بخش کر پلٹ گئی۔

اتنی گلابی، اس قدر گلابی، اس حد تک گلابی، ہتھیلی پر صرف ایک آنہ چمکا اور میں نے اپنے آپ کو گالی دے دی، کمبخت بڑا بنتا ہے فطرت کے اس شہ کار کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی قیمت کیا صرف ایک آنہ ہے؟ تف ہے تجھ پر اور تیری حسن نوازی پر!

دوسرے دن کی دوپہر تک کا وقت میں نے اس مجرم کی طرح گزارا جو جرم کرنے کے بعد اپنے اندر جھانکے تو اس کا ضمیر اس پر تھوک دے —

[illegible] تو ایک آنے میں ایک [illegible] بھی نہیں [illegible]!

مگر سارے [illegible] نہیں بیا ہوگا سے اس نے ایک آنہ لیا ہو گا، نہ جانے پورے دن میں اس نے کتنوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے؟ تو کیا جس طرح وہ میرے پاس آئی ہے اسی طرح دوسروں کے ہاں بھی جاتی ہوگی؛ سارا شہر مجھے اپنا دشمن نظر آنے لگا اچھا تو ذہن میں نراجیت یوں پیدا ہوتی ہے!

کل رات میری کشت خیال میں صرف یونانی اجسام کے چہروں کی ندیاں امڈتی رہیں، مگر آج رات تو ادھر ایک چہرہ نمودار ہوتا ادھر ایک شعلہ سا بھڑک اٹھتا، پھر دھواں سا چھا جاتا۔

پھر پھر سے برستے۔ پھر ایسی آوازیں سی آتیں جیسے کوئی شیشے کی کرچیاں پیش کر رہا ہے، میں نے فیصلہ کیا کہ کل سارا دن گھر سے باہر رہوں گا، کل کسی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کروں گا۔ کل نماز بھی پڑھوں گا۔ مگر صبح بہت دیر سے آنکھ کھلی، نماز کا وقت نکل چکا تھا، نہانے اور ناشتہ کرنے میں بھی خاصی دیر لگی، اگر پہری کی منزل میں بیٹھا اخبار پڑھنا شروع کیا تو دوپہر تک پڑھتا رہا، جب ملازم نے آکر کہا کہ پڑوسی چند منٹ کے لئے اخبار مانگ رہا ہے، تو میں نے وقت دیکھا، یکایک کسی چیز نے جیسے میرے اندر اچھل کر مجھے کمرے سے باہر دھکیل مارا۔ اور میں سیڑھیوں پر سے اتنی تیزی سے اترا کہ بچے بھی یوں نہیں اترتے ہوں گے۔ اپنا کمرہ کھول کر میں سیدھا کھڑکی کے پاس گیا اور گلی میں جھانکا دو بچے سگریٹ کی ڈبیوں سے مکان بنا رہے تھے۔ اور گلی میں سے ایک بڑھیا گزر رہی تھی، جو ہوا سے بھرے ہو برقعے میں بہت چھوٹی سی لگ رہی تھی۔

میں پھر اوپر کے کمرے کی طرف لپکا، اور ملازم سے پوچھا، "کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا"

وہ بولا، "آپ سو تو نہیں رہے تھے صاحب؟"

دوسرا قرینے سے سوال نہ پوچھ سکا۔ اور ملازم جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "بس بیچ صبح ایک سبزی والا آیا تھا، یا اخبار والا، یا پھر ابھی وہ منگتی آئی تھی"۔ مجھے اپنی طرف گھورتا دیکھ کر وہ بولا — "کوئی بھی تو نہیں آیا صاحب۔ کیا آپ نے کسی کو وقت دے رکھا تھا؟"

میں جواب دیئے بغیر پلٹ آیا، وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی! تو وہ اتنی غیر اہم تھی کہ اس کے آنے کے باوجود کوئی نہیں آیا تھا۔

کیا فرشتوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ آج کے دن کو بھی میری زندگی میں شمار کریں!

سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اترتا ہوا میں گلی میں آ گیا، پھر دوسری گلی سے ہوتا ہوا سڑک پر آیا، اور دور دور نظریں دوڑائیں کہ شاید وہ کسی راہ گیر کا دامن تھامے کھڑی ہو۔ شاید کسی دکان کے سامنے پڑی ہوئی سڑی چیزوں میں سے بہت کم سڑی ہوئی چیزیں چن رہی ہو۔ شاید وہ کسی درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو کہ آج اس کی لگی بندھی آمدنی میں سے ایک آنہ کٹ گیا۔

سڑک پر معمول کی زندگی رواں تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

بقیہ :- بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

ان کی جائے کار ابھی دلی میں ہی ہے۔ وہ محض تجارتی ملازمت کے سلسلہ میں اس وقت نارو ے میں ہیں، ان کی شہریت حسب سابق ہندوستان کی ہی ہے۔ مگر دلی اردو اکاڈمی انہیں دلی والا تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دلی کا راشننگ کارڈ نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ مسلسل دس سال سے دلی میں رہائش رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں ہرچرن چاولہ کا کہنا ہے کہ وہ دلی کا راشننگ کارڈ اس لئے نہیں رکھ سکتے کہ وہ عارضی طور پہ ناروے میں ملازمت کرتے ہیں۔ اور وہ گذشتہ سالوں میں متعدد بار

[illegible] رہے ہیں، اور ہرسینوں یہاں ر[illegible] اس لئے بنیادی طور پر وہ ہند[illegible] شہریت کے ساتھ ساتھ دلی [illegible] ہی ہیں۔

مندرجہ بالا وجو[illegible] دلی اردو اکاڈمی ہرچرن [illegible] کو انعامی مقابلہ میں شریک [illegible] مغربی بنگال اردو اکاڈمی [illegible] اکاڈمی نے چاولہ کی تصا[illegible] ہیں۔ ہرچرن چاولہ چا[illegible] لیکن اس بحث دھری پر [illegible]

زار چہرے زندگی کا ایک چہرہ۔
رتی کا سہاگ۔ مسرت کی خوشبو۔

سیاہ نقطہ

اکرام اللہ

آج تک عورت کو سمجھنے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکا اس کوشش میں بہت کچھ لکھا اور سوچا گیا ہے۔ یہ اچھوتی کہانی بھی عورت کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔

ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے بالمقابل لائن کے پار، دھول اُڑاتے ہوئے چار سوار آ کے رُکے۔ انھوں نے آگ برساتی ہوئی لُو سے بچنے کے لئے اپنے سر اور چہرے پگڑیوں کے لپیٹوں میں اس طرح چھپائے ہوئے تھے کہ محض ان کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ تین سواروں نے پھرتی سے اُتر کر گھوڑے کیکر کے مٹیالے درختوں سے باندھے، پھر اپنے تہمدوں کی کسی ہوئی لانگیں چھوڑتے، کپڑوں سے دھول جھاڑتے، پگڑیاں درست کرتے آہستہ آہستہ چوتھے سوار کی جانب چلے۔ گھوڑا اپنے کف آلود منہ میں آہنی لگام کو کٹاکٹ چبا رہا تھا۔ اُس کے مضطرب پاؤں کسی صورت تھم نہ رہے تھے۔ احمد نے لگام کو مضبوطی سے کھینچے ہوئے اپنے سینے سے ٹیک لگا کے بیٹھی ہوئی زینو سے کہا "چلو اب اُتر بھی جاؤ۔"

زینو نے روہانسی صورت بنالی "اوئی اللہ! کیسے اُتر جاؤں! تمہارا گھوڑا تو کہیں ٹکتا ہی نہیں" زینو کے نازک ہاتھوں نے زین کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

وہ اس کے مہکتے ہوئے سر، اس کی آنسو برساتی آنکھوں، خوف سے زرد ہوتے گالوں اور صدمے سے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کو پاگلوں کی طرح دیکھتا جاتا اور کہتا جاتا۔ "میری زینو! کیوں گھبراتی ہو، گاڑی آئے گی، ضرور آئے گی! وہ آکے رہے گی۔"

"تم ایک مرتبہ حوصلہ کرکے چھلانگ لگا دو۔"
"مجھ سے نہیں لگائی جاتی چھلانگ۔"
اتنے میں تینوں سوار بھی پاس آکے تماشا
نے لگے۔
احمد نے کہا: "اچھا تم ایسے کرو میرے بازو کو
بوطی سے پکڑ کے ہولے ہولے نیچے کھسکتی جاؤ۔"
رحمت نے ٹانگ رکھ کے اپنی خوفناک
یھوں میں سے بیتیسی نکالتے ہوئے اس ریشمی بوجھ
لمس سے لطف اندوز ہونے کے لئے بازو پھیلاتے
ئے کہا: "آؤ میں اُتارے لیتا ہوں تمہیں۔" زینو
نے رحمت کے لوہے کے بٹے ہوئے تاروں سے بنے
دئے کالے بھجنگ بازو اپنی طرف بڑھتے دیکھے
بڑی تیزی سے گھوڑے کی پیٹھ سے الگ ہو کے
ین پہ ربڑ کی رنگ برنگ جاپانی گیند کی طرح
پھلتی ہوئی تینوں سواروں سے ہٹ کے الگ
ھڑی ہو گئی۔
بھیگتی مسوں کے خوبصورت نوجوان احمد
گھوڑے سے اُتر کر باگ حسینے کو دیتے ہوئے کہا
و گھوڑا باندھو۔ بعد میں گھر لے جانا اور بابا سے
ہ دینا، کام سے شہر گیا ہے چند دنوں تک لوٹ
ے گا۔"
زینو ریلوے لائن کے قریب کیکر کے تنے سے
ک لگائے، ٹانگیں پھیلائے اطمینان سے بیٹھی
ر اُدھر بکھرے ہوئے پتھر اُٹھا اُٹھا کے ایک اُفق
دوسرے اُفق تک لیٹی ہوئی اُجاڑ پٹری کو نشانہ
رہی تھی۔ نشانہ چُوک جاتا تو پتھر پھدک کے دوسرے
میں جا گرتا اور کبھی اس اُداس سوئے ہوئے
ں ایک ٹن سی اُجاگر ہو کے دُور تک تیرتی

رحمت اور ممدو کے کندھوں پہ ہاتھ
نے سینے کے قریب کھینچتے ہوئے کہا
وگوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے

ہماری مدد کی ہے ایسے کون کرتا ہے۔"
رحمت نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا: "او چھوڑ
یار! یہ بھی کوئی بات ہے کرنے کی! کوئی اور بات کر۔"
ممدو نے کہا۔ "پیاس سے دم نکل رہا ہے چلو رحمت
وہ پیچھے جو کنواں ہے، وہاں سے پانی پی آئیں۔"
احمد نے کہا: "آتے ہوئے ہمارے لئے بھی
ڈول بھر لانا۔"
"او حسینے! بابو سے گاڑی کا معلوم کر کہ
کب تک آ رہی ہے؟"
ایک ہاتھ سے گھوڑے کا منہ سہلاتا اور
دوسرے ہاتھ سے اپنی ڈب ٹٹولتا ہوا حسینا
احمد کی آواز سُن کے اپنے خیالات سے یوں گھبرا کے
چونکا جیسے چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہو۔ اس نے احمد
کا چہرہ دیکھنے کے لئے نظر اٹھائی کہ کہیں میرے
خیالات کی بھنبھناہٹ اتنی اونچی تو نہ تھی کہ اسکے
کانوں تک پہنچ گئی ہو۔ لیکن وہ کیکر کی چھدری
چھاؤں میں زینو کے پاس بیٹھ رہا تھا۔
"احمد! اگر اب بھی ہم نہ بھاگ سکتے تو آج
اس وقت تمہیں میرا جنازہ اٹھانے کو آنا پڑتا۔"
"کیوں؟"
تمہیں نہیں معلوم کیوں؟ کیا میں کسی اور
کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر چلی جاتی؟ ایسا وقت
آنے سے پہلے زہر نہ کھا لیتی، پھانسی نہ لے لیتی!
تمہارے بغیر تو میں ایک پل زندہ نہیں رہ سکتی۔"
پھر وہ کہنے لگی "میرے مولا! تیرا شکر ہے۔ میرا احمد
مجھے مل گیا۔ کل جہان مل گیا۔"
"تو کیا سمجھتی ہے، تیری ڈولی یونہی آسانی
سے لے جاتے۔ میں برات والوں کے ہاتھوں سے
تجھے چھین کے لے آتا۔"
"احمد! سچ بتانا اگر میں مر جاتی تو تم روتے؟"
ٹن ٹن ٹن! گاڑی کی گھنٹی ہو گئی۔
گھنٹی سوئے ہوئے ماحول کے منہ پر ایک زناٹے دار

تھپیڑ لگا کے پھر خاموش ہو گئی۔ حسینا سُست
قدموں سے چلتا ہوا بابو کے کمرے کے دروازے
تک پہنچا تھا کہ گھنٹی کی آواز سُن کر پلٹ آیا۔ احمد
نے دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا: "دو ٹکٹ
لے آؤ۔"
بند کھڑکی کے سامنے اکیلا حسینا ٹکٹ لینے کے
لئے کھڑا تھا۔ اُس نے ڈب سے چاقو نکالا، یونہی
انگلیوں میں اُسے مسلتا رہا، بٹن دبایا تو کھٹاک سے
چھ انچ لمبا پھل نکل آیا۔ وہ اس کی دھار پر احتیاط
سے انگوٹھا پھیر رہا تھا کہ بابو نے کھڑکی سے پوچھا۔
"کتنے ٹکٹ؟"
"کتنے ٹکٹ... دو ٹکٹ... نہیں نہیں
تین ٹکٹ۔"
کنویں کی منڈیر پہ خالی ڈول رکھتے ہوئے
رحمت نے ایک لمبی آہ بھری "یہ زینو کتنی خوبصورت
ہے! میری تو ہڈیوں تک رچ گئی ہے۔ سالی ہنستی
ہے تو جان نکال لیتی ہے۔"
ممدو نے اپنے چھوٹے سے مٹکے ہوئے سر پر
پانی سے تربتر ٹھنڈے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "خیال
کرتا ہوں یہ زیادہ خوبصورت ہے کہ شیداں زیادہ
خوبصورت تھی۔"
"ابے جا شیداں تو اس کی نوکرانی بھی نہیں
بن سکتی۔ اِن کا اِس سے کیا مقابلہ!"
ممدو نے کہا۔ "تو پھر سوچنا کیا ہے۔ یہ
چھوکرا یوں ایسا لونڈا ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے! پہلے
تیری خاطر شیداں کو اُٹھایا تھا تو دونوں نے اکھٹے
چال چار سال بھگتائی تھی۔ چار چار سال اور سہی!"
رحمت، ممدو کی یہ بات سُن کے ہنسی سے
پھٹ پڑا۔ "بڑا حرامی ہے تو۔"
دُور اُفق پر غبار دیکھ کے رحمت ٹھٹک گیا
"ممدو۔۔ ممدو! وہ دیکھ! یا تو آندھی اُٹھ رہی ہے
یا پھر آدمی پیچھے سے پہنچ رہے ہیں۔"
ممدو نے بھی نظریں اُفق پہ گاڑ دیں۔
رحمت نے کہا۔ "چلو جلدی کرو، واپس چلیں۔"
بڑھتے ہوئے غبار کا سُن کے زینو کو تو جیسے
بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ اُچھل کے کھڑی ہو گئی، پھر

یک نظر آسمان پر مغرب رُکی جانب ڈالی اور دو رکے ریلوے لائن کے درمیان کھڑی ہو کر گاڑی کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دُور اُفق پر لہراتے ہوئے آنچل کی طرح بھُورے رنگ کا دھواں منجمد کھڑا تھا۔

احمد نے ساتھیوں سے کہا: "اللہ کرے آگاڑی ہو، لیکن اگر واقعی آدمی پیچھے سے پہنچ رہے ہوں تو پھر ہمیں ڈانگیں سنبھال کر لڑائی کیلئے تیار ہو جانا چاہئے۔"

زینو گویا اپنے آپ سے کہہ رہی تھی: "ہم تو گاؤں سے آدھی رات کو نکلے تھے۔ میرے بھاگنے کا رات ہی رات میں کیسے پتا چل گیا۔ یا اللہ اب کیا ہوگا!" پھر وہ پلٹ کر ریلوے لائن کے درمیان پہنچی۔ حدِ نظر پر ایک سیاہ نقطہ دکھائی دے رہا تھا۔

رحمت نے کہا: "ممدو! احمد! حسینے! سب لوگ اپنے اپنے جوتے پگڑیوں سے کس کر سروں پر باندھ لو۔"

زینو، احمد سے مخاطب ہوئی: "دیکھو غبار کتنا نزدیک آگیا ہے! آندھی ایسی تو نہیں ہوا کرتی۔ گاڑی خدا جانے کب آئے، کیوں نہ ہم پہلے سے گھوڑوں پر بھاگ چلیں!"

"اب گھوڑوں پر بھاگنے کا وقت نہیں رہا۔ دُھول ہمارا نشان بتائے گی اور وہ جلد ہمارے سروں پر آپہنچیں گے۔ گاڑی سے بھاگنے کا موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

زینو پھر لائن کی طرف مُڑی۔ سیاہ نقطہ ذرا سا پھیل گیا تھا۔

غبار اب واضح طور پر دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے سموں سے اُڑتی ہوئی دُھول کے سوا کچھ نہ تھا۔

ممدو نے ایک آنکھ میچ کر رحمت سے پوچھا: "کہو! کیا خیال ہے؟"

"چل ہٹ۔ کوئی خیال نہیں۔" پھر وہ چھاتی پر ہاتھ مار کر اونچی آواز میں بولا: "دُھول بتاتی ہے، دس سے کم سوار نہ ہوں گے۔ لیکن ہم لڑیں گے۔"

حسینے نے ڈب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کے لرزتی ہوئی آواز میں رحمت سے کہا: "وہ تو زینو اور احمد کے لئے آرہے ہیں۔ ہم ان دونوں کو چھوڑ کے بھاگ جائیں تو وہ ہمارا پیچھا بھی نہیں کریں گے۔"

رحمت نے کہا: "تھو تھو! یہ مردوں کا کام نہیں۔ کیوں ممدو؟"

ممدو نے کہا: "سچ کہتے ہو۔"

زینو نے جا کے دیکھا نقطہ اب چھوٹا انجن بن گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کے ٹکٹکی باندھے رہی۔ معلوم ہوتا تھا انجن چل نہیں رہا بلکہ ایک جگہ کھڑا کھڑا ہے۔ بل کھاتا ہوا سیاہ دھواں دھیرے دھیرے پیچھے کو سرکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ سفید بھاپ کا فوارہ سا ابلا اور کچھ دیر بعد انجن کی وسل اسے اس طرح سُنائی دی جیسے وہ یہ آواز خواب میں سُن رہی ہو۔

وہ قریب آئی تو احمد نے پوچھا: "کیوں گاڑی نظر آئی؟"

زار و قطار روتی ہوئی زینو نے سسکیاں بھرتے ہوئے بتایا۔ "ابھی دُور ہے۔ بہت دُور ہے۔ وہ کبھی نہیں آئے گی۔ ہم اس کا انتظار کرتے کرتے مر جائیں گے، وہ نہیں آئے گی۔"

احمد نے ڈانگ زمین پر پھینک کے زخمی ہرنی کی مانند کانپتی ہوئی زینو کو سہارا دیا۔ وہ اس کے بھکتے ہوئے سر، اس کی آنسو برساتی ہوئی آنکھوں، خوف سے زرد ہوتے گالوں اور صدمے سے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کو پاگلوں کی طرح دیکھتا جاتا اور کہتا جاتا: "میری زینو، کیوں گھبراتی ہو، گاڑی آئے گی، ضرور آئے گی! وہ آکے رہے گی۔"

دفعتہً رحمت کی بھاری بھر کم آواز سے فضا گونج اٹھی۔ "ہوشیار"

ایک دم زینو کو چھوڑ کر احمد نے ڈانگ سنبھال لی۔ سامنے غبار کے گنبد نے گردنیں لمبی کئے زور لگاتے ہوئے گھوڑے سرپٹ دوڑے چلے آرہے تھے۔

رحمت چلّایا: "زینو! اسی کیکر کے تنے سے کمر لگا کے کھڑی رہنا! ہم اس تنے کے ارد گرد پھیل کر تمہاری حفاظت کریں گے۔"

اب انجن کی چھک چھک کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔

رحمت پھر بولا: "ساتھیو! اس تنے سے تیس قدم آگے بڑھ کر کھڑے ہو جاؤ! اور دیکھو ان کا کوئی آدمی اس حلقے کے اندر نہ آنے پائے۔ احمد! تم مناسب موقع پاتے ہی زینو کو لے گاڑی پر سوار ہونے کی کوشش کرنا۔"

گھوڑوں سے چمٹے ہوئے سواروں کے کپڑے ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کی تانبے کی طرح سُرخ اور پسینے سے دمکتی ہوئی پیشانیاں سامنے تھیں۔ گھوڑے رُکے۔ سوار اُتر کر بھوکے بازوں کی طرح اُن کی طرف جھپٹے۔ زینو نے منہ دوسری طرف کر لیا اور کیکر کے تنے پر دونوں بازو رکھ کر اس پر ماتھا ٹیک دیا۔

کلہاڑیاں اُبھریں۔ انہوں نے وار روکنے کی کوشش کی۔ ٹانگیں کٹ کے زمین پر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ زینو نے پلٹ کر دیکھا۔ نیزوں کے پھل سیاہ بادلوں میں چھپی بجلی کی طرح بے قراری سے تڑپتے ہوئے چمکے اور چاروں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

زینو کا باپ اور اس کے تینوں بھائی آ... طرف لپکے۔ وہ زمین پر نظریں گاڑے کھڑی ... کی تصویر کی طرح معصوم ہنسی اس کے ... آرہی تھی۔ قریب پہنچنے پر زینو کے بھائیو... کلہاڑیاں بلند کیں تو وہ روتے ہوئے با... گھٹنوں سے لپٹ گئی۔

"بابا! یہ مجھے زبردستی اٹھا لا... کوئی قصور نہیں۔ بابا! میرا کوئی قصو..."

گاڑی لحظہ بھر کے لئے رُکی ... جیسے کوئی بڑا اژدہا صحرا میں چلتے ... آدھ لقمہ سمیٹنے کے لئے رُکا ہوا ... زینو جو فرش سے تنے سینے پر ... اپنے باپ کی جھکی کمر سے گال ... جا رہی تھی۔

خرِ عیسےٰ بہ مکہ رَوَد۔
چوں باز آید۔ ہنوز خر باشد۔

مستقل کالم

سَرور تونسوی

پبلک لائبریری میں اُردو کی کتابیں سپلائی [...]نے کے لیے۔ شانِ ہند۔ ایک منظور شدہ ادارہ [...] تقریباً بیس سال سے زائد عرصہ ہُوا کہ اس لائبریری [...] ڈائریکٹر کالیہ صاحب ہُوا کرتے تھے۔ دفتری [...]ی کے سلسلے میں اُن سے کچھ کہنے کے لیے ٹیلی فون [...] ملاقات کا وقت لے کر میں وقتِ مقررہ پر اُن [...] دفتر پہونچا۔ اور ان کے کمرہ کے باہر بیٹھے ہوئے چپراسی [...] اپنا وزٹنگ کارڈ دیا۔ چپراسی کارڈ اندر لے گیا [...]ر واپس آکر کہنے لگا کہ صاحب بزی ہیں بیٹھ جائیے [...]درہ منٹ، آدھ گھنٹہ۔ پون گھنٹہ انتظار کیا گیا [...] چپراسی کو یاد دہانی کرائی گئی چپراسی کہنے لگا [...]ب! میں کیا کروں صاحب اندر اپنے کسی [...]دار سے باتیں کر رہے ہیں اور اُن کا حکم ہے [...]ک وہ نہ کہیں کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے [...] مجبوری معقول تھی۔ لہٰذا میں کالیہ صاحب [...]ت کے بغیر ہی واپس چلا آیا۔ اور اپنے دفتر [...]یں خط لکھا کہ آپ نے ملاقات کا وقت [...]ر وقتِ مقررہ پر مجھے انتظار کرایا [...]پنے کسی رشتہ دار سے بات چیت میں

اتنے مصروف تھے کہ آپ کو یہ بھی دھیان نہ رہا کہ آپ بدتمیزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ آپ حال ہی میں ولایت سے لائبریری انتظامیہ کی ٹریننگ لے کر آئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں سے یہ سیکھ کر نہ آئے کہ اگر کوئی شریف آدمی کسی شریف آدمی کو ملاقات کے لیے وقت دیتا ہے تو اسے اس کی پابندی کرنی چاہیئے آپ بیشک ولایت ہو آئے ہیں مگر بقول ”خرِ عیسیٰ بہ مکہ رَوَد، چوں باز آید خر باشد“ یعنی رہے وہی پنجابی کے پنجابی ہی۔

ظاہر ہے کہ ایک ہندوستانی ڈائریکٹر اس قسم کا خط پڑھ کر اپنی کرسی کی توہین محسوس کریگا لہٰذا کالیہ صاحب نے اپنے دل میں ہمارے لیے گانٹھ کی گانٹھ باندھ لی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کے پی اے کا فون آیا کہ کالیہ صاحب نے آپ کو فلاں وقت پر ملاقات کے لیے فرمایا ہے۔

چنانچہ وقتِ مقررہ پر میں پھر اُن کے دفتر پہونچا۔ اب کی مرتبہ ملاقاتی کارڈ اندر جاتے ہی فوراً ہی بُلا لیا گیا۔ علیک سلیک کے بعد گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ کالیہ صاحب فرمانے لگے ”اچھا تو آپ ہمارے وینڈر ہیں!“ اور انھوں نے یہ الفاظ کچھ ایسے حقارت انگیز لہجے میں کہے کہ جیسے وینڈر انسان نہیں ہوتے۔ پنجابی کا پنجابی سے ٹکراو تھا لہٰذا میں فوراً کرسی سے اُٹھا اور ویسے ہی اکھڑ لہجے میں کہا کہ ”اچھا تو آپ حکومتِ ہند کے محکمۂ تعلیم کی لیڈنگ لائبریری کے ڈائریکٹر ہیں۔ جنہیں شریفانہ انداز میں بولنا بھی نہیں آتا“ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا کہ ”سنیئے کالیہ صاحب! میں پہلے ایک معزز شہری ہوں۔ اس کے بعد ایک ایسے اخبار کا ایڈیٹر ہوں جس کی سچائی اور بے باکی کی دھاک ہے اور پھر ایک کُتب فروش ہوں جسے آپ وینڈر کہہ سکتے ہیں، مگر آپ کو کسی طرح یہ حق حاصل نہیں کہ کسی وینڈر کی تو کیا کسی بھی انسان کی توہین کر سکیں۔ اور شریفانہ انداز میں نہ بولیں“

یہ کہہ کر، اور کالیہ صاحب کی ڈائرکٹری پر لعنت بھیجتے ہوئے میں واپس آگیا۔ یہ تھی دوسری گانٹھ جو کالیہ صاحب نے میرے بارے میں اپنے دل میں باندھ لی۔

تقریباً تین چار ماہ بعد شام کے تین بجے کوتوالی چاندنی چوک کا ایک سپاہی عدالتی سمن لایا۔ سمن میں تعزیراتِ ہند کی جس دفعہ کا ذکر تھا اس کے بارے میں اپنے دوست وکیل کرشن گوپال شرما کو فون کر کے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ دفعہ تو فحش نویسی کے بارے میں ہے۔ دوسرے دن کچہری گیا اور شرما صاحب وکیل کے ہمراہ عدالت متعلقہ میں پہونچا۔ پیش کار کو مثل معائنہ کی درخواست دے کر شرما صاحب نے فائیل نکلوائی تو پتہ چلا کہ مقدمہ ایک کتاب کے بارے میں ہے جسے مکتبہ شانِ ہند نے دلّی پبلک لائبریری کو سپلائی کیا تھا اور یہ مقدمہ دلّی پبلک لائبریری کے ڈائریکٹر جناب کالیہ صاحب کی ابتدائی رپورٹ پر قائم کیا گیا ہے چونکہ یہ کتاب ماہنامہ ”شمع“ نے شائع کی تھی لہٰذا مثل دیکھنے پر پتہ چلا کہ شمع بلڈنگ کے مینجر پریس کیپر کتاب کے مصنف

وغیرہ کو ملا کر چھ سات اشخاص کے خلاف یہ مقدمہ تھا۔ اس دوران تمام متعلقہ حضرات کو عدالتی سمن مل چکے تھے۔ کتاب کے مصنف ضلع مظفرپور (بہار) کے ایک ایڈووکیٹ تھے۔ اور چونکہ کتاب "وی پی ایکسپریس سسٹم" سے شائع ہوئی تھی اور وی پی ایکسپریس سسٹم صرف الہ آباد میں ہی ہے لہٰذا ایک ملزم الہ آباد کے بھی تھے۔ ہم سب ملزمان کی ضمانتیں مقدمہ کی پہلی پیشی پر ہوئیں اور میں نے اپنے دفتر کی دہلی پبلک لائبریری کی فائیل دیکھی تو اس کتاب کی چھ جلدیں قریباً ایک سال پہلے اس لائبریری کو سپلائی کی گئی تھیں اور ان کی قیمت کا چیک بھی وصول ہو چکا تھا۔ وکیل ہم سب ملزمان کا ایک ہی تھا، کتاب واقعی انتہائی مخش تھی۔ اور سزا سے بچنا ممکن نہ تھا کیونکہ دنیا کی کوئی دلیل اس فحش نویسی کے حق میں نہیں جا سکتی تھی

مقدمہ چلتا رہا اور میں نے دلی پبلک لائبریری کی کتابوں میں سے پندرہ ایسی کتابیں چھانٹیں جو فحش نویسی کی زد میں آ سکتی تھیں۔ اور یہ کتابیں مختلف پبلشرز کی شائع کردہ تھیں اور لائبریری نے ستار پبلی کیشن اور کئی دوسرے اداروں سے خرید کی ہوئی تھیں، چنانچہ میں نے ان سب کتابوں کی ایک ایک جلد بازار سے خرید کی اور ان تحریروں کو سرخ سیاہی سے نشان زد کر کے جو فحش نویسی کی زد میں آتی تھیں جناب ہوم سکریٹری صاحب دلی حکومت کی خدمت میں پیش کیں اور التجا کی کہ ان سب کتابوں کو کالیہ صاحب نے کیوں چھوڑ دیا ہے جبکہ یہ سب کتابیں بھی دلی پبلک لائبریری میں موجود ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ کتب فروش ہر کتاب کو پڑھ کر کیسے فروخت کر سکتا ہے ہوم سکریٹری صاحب نے اس دلیل کو تو تسلیم فرمایا کہ کتب فروش ہر کتاب کو پڑھ کر فروخت نہیں کر سکتا۔ مگر اس سے اتفاق نہ فرمایا کہ کالیہ صاحب نے دوسرے پبلشرز یا بک سیلرز پر مقدمہ کیوں قائم نہیں کرایا جبکہ ان کی کتابیں بھی فحش نویسی کی زد میں آتی ہیں۔

اس کے بعد میں نے پھر ایک اور درخواست ہوم سکریٹری صاحب کو پیش کی کہ بک سیلرز دلی پبلک لائبریری کو کتاب کی ایک جلد بھیجنے APPROVAL پر بھیجتے ہیں، اور لائبریری کی ایک کمیٹی ہے جس کے چیرمین کالیہ صاحب ہی ہیں جو ان کتابوں کا انتخاب کرتی ہے۔ تب کہیں پانچ چھ ماہ بعد اس کتاب کا آرڈر ملتا ہے اس لئے کمیٹی کے ان ممبران اور ڈائریکٹر صاحب کو بھی ملزمان میں شامل کیا جائے، جنہوں نے یہ فحش کتاب پسند کی اور خریدی۔ کیونکہ فحش کتاب جہاں فروخت کرنا خلاف قانون ہے وہاں فحش کتاب کو پسند کر کے خریدنے والا بجائے ملزم بننے کے متقی بن رہا ہے۔

اس درخواست کے بارے میں ہوم سکریٹری صاحب نے فرمایا کہ وہ سرکاری طور پر قانونی رائے لیں گے کہ اس مقدمہ میں دلی پبلک لائبریری کے وہ لوگ اور ڈائریکٹر بھی ملزم بن سکتے ہیں یا نہیں جنہوں نے اس کتاب کو پسند کرنے کے بعد خریدا۔

میں نے اسی مضمون کی ایک درخواست عدالت متعلقہ میں بھی دے دی تاکہ جب تک ہوم سکریٹری صاحب میرے خلاف مقدمہ واپس نہ لیں عدالت کی کارروائی کو لمبا کیا جا سکے۔ عدالت نے اس درخواست پر کوئی کارروائی نہ فرمائی۔ مگر درخواست فائیل میں لگا لی گئی،

ہوم سکریٹری صاحب کو یہ دلیل پسند آئی کہ بک سیلرز کا کام کتاب سپلائی کرنا ہے، اور جب کہ کتاب خریدنے والو نے پسند کر کے اسے خریدا ہے تو ایسے مقدمات میں بک سیلرز کو ملزموں میں شریک نہیں کیا جانا چاہیئے،

ہوتے ہوتے مجسٹریٹ نے مقدمہ کے فیصلے کی تاریخ لگا دی۔ اور میری پریشانی کا یہ عالم کہ بس کچھ نہ پوچھیے کیونکہ کتاب سراسر فحش تھی۔ اور سزا ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر ہوم سکریٹری صاحب کے ہاں پھر یہ درخواست پیش کی کہ عدالتِ متعلقہ نے فیصلے کی تاریخ لگا دی ہے۔ اگر حضور والا نے بک سیلر کے خلاف یہ مقدمہ واپس لینا ہے تو براہِ کرم فیصلے کی تاریخ سے پہلے پہلے عدالتِ متعلقہ کو اطلاع بھجوا دیجیے ورنہ عدالت کا فیصلہ صادر ہوتے ہی میرے لئے مشکل کا سامنا کرنا ہوگا،

عین فیصلے کے دن جونہی ہم لوگوں کو آواز لگی تو عدالت میں پیش ہوتے ہی مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگوں کے خلاف مقدمہ سرکار نے واپس لے لیا ہے، لہٰذا آپ لوگ جائیے، تب سے میں خاص طور پر اس امر پر دھیان دیتا ہوں کہ جب بھی کوئی ناول یا افسانوں کی کتاب آتی ہے تو اسے بغور پڑھتا ہوں کہ کہیں پھر نہ فحش کتاب فروخت کرنے میں مقدمہ قائم ہو جائے۔ بلکہ عام طور پر افسانوں کے مجموعے اور ناول میرے ہاں فروخت ہی نہیں کیے جاتے۔ کیونکہ اب حال یہ ہو گیا ہے کہ جب تک ناولوں میں فحش نویسی کا سہارا نہ لیا جائے وہ فروخت ہی نہیں ہوتا

بقیہ: یومِ جمہوریت شعر و سخن کے آئینے میں

اور احساسات کو جو ٹھیس پہونچ رہی ہے۔ اس کے صاف و شفاف عکس بھی ان شعری اور فکری آئینوں میں جھلک رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم وقت کی نبضوں کو پہچانیں، دیش کی عظمت کے پرچم کو بلند سے بلند تر کریں اور اپنے

اس عظیم ترین قومی دن کے پیغام کو دلوں پر اُتاریں اور اس کے کردار اور وقار کو وہ تابانیاں دیں جو اس کا حق اور حصہ ہے۔ چھبیس جنوری ہے جن عظمتوں کا عنوان آؤ کہ خونِ دل سے ان کو بنائیں تابار

بابِ انتقاد
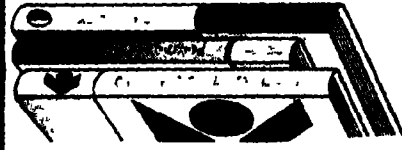
گفتارِ غالب۔
اشاعت سنہ ۱۹۸۶ء۔
مالک رام ایم۔ اے۔
صفحات:۔ ۲۶۷، سائز ڈیمائی۔
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵۔۱۱۰۰
قیمت:۔ ۴۸/- روپے۔

ہندوستان اور پاکستان میں غالبیات کے واحد ماہر جناب مالک رام کی یہ تازہ تصنیف مرزا غالب کی زندگی اور شاعری کے کئی ایسے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جو مرزا غالب کی موت سے ایک سو سال بعد تک افشا نہ ہوسکے تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کوائف و حالات کے تفحص و تجسس میں کافی سرمایہ اور وقت صرف کیا ہے تاکہ غالب کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات مہیا کی جاسکیں۔ اوّل تو انہوں نے غالب کے اس وہم کا ازالہ کیا ہے کہ غالب کو اپنی زندگی میں مناسب قدر شناسی حاصل نہیں ہوئی۔ فاضل مصنف نے اس وقت کے تمام شعراء سے مقابلہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ سب سے زیادہ مقبولیت غالب کے اردو دیوان کو حاصل ہوئی جو شاعر کی عین حیات ہی پانچ مرتبہ شائع ہوا۔ فارسی کی قدر شناسی کا یہ عالم تھا کہ دلی کالج میں فارسی کے مدرس کیلئے انگریز وزیر کو ان کا نام تجویز کرنے والے مفتی صدرالدین ہی تھے، جن کی ان سے ہمیشہ چشمک رہتی تھی، ایسے ہی حالات پر مشتمل ہے — فاضل مصنف کے یہ مضامین جو نصف صدی قبل ہند و پاکستان کے جرائد (جو اس وقت میں ہندوستان ہی میں تھے) میں شائع ہوئے تھے ان کو مناسب تصحیح و تشریح کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

میر اور غالب نیز ذوق اور غالب کا تقابلی مطالعہ، کلامِ غالب کے معاشرتی عناصر، انسان کی خلافتِ الٰہیہ، دیوانِ اردو کی کہانی، گلِ رعنا اردو اور فارسی غالب کی فارسی تصانیف، نیز اُن کے خطوط جو اردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی کے نام سے مشہور ہیں ان سب پر بڑی وضاحت سے بحث کی گئی ہے۔

ان مضامین کو یکجا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ کون کون سی فکری اور فنی فتوحات ہیں جن پر غالب کی عظمت اور شہرت کا قصرِ رفیع تعمیر ہوا ہے اور دو طرح کے مضامین سے واضح کیا گیا ہے۔ اوّل وہ جن میں کسی خاص موضوع سے متعلق غالب نے جستہ جستہ کوئی رائے یا توضیح پیش کی ہے، دوسرے غالب کی مختلف تصنیفات کی تفاصیل جن پر آج تک کسی نے روشنی نہیں ڈالی اِن کو لکھ۔ مالک رام صاحب نے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے، جو اِن کے سوائے اور کوئی کر بھی نہیں سکتا تھا۔

غالب کے بہت سے اشعار کی شانِ نزول اس کی زندگی کے اکثر اہم واقعات کی آئینہ دار ہے جو نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے غالب کی زندگی اور عہد کا ایک نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جو اردو ادب کا ایک عہدِ زرّیں تھا۔ مصنف اس کتاب کے لکھنے کے لیے مبارکباد کا مستحق ہے۔ اردو کے طالب علم اور بالخصوص غالب کے عاشقوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ہیرالال چوپڑہ
ایم اے ڈی لٹ

پنجاب کی تقسیم — انگریزی
۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء تک۔
ڈاکٹر پریم وتی تھمی۔
۲۰۸ صفحات۔ ڈیمائی سائز
ناشر: منشی رام منوہر لال پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ،
رانی جھانسی روڈ، نئی دہلی ۵۵۔۱۱۰۰
قیمت ۱۲۰/- روپے

یہ کتاب فاضل مصنف کا وہ مقالہ ہے جو انہوں نے پی ایچ ڈی کے طور پر گڑھوال یونیورسٹی میں پیش کیا تھا اور جسے منظور کرتے ہوئے یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ، ڈی کی ڈگری عطا کی۔ شریمتی پریم وتی اس وقت ۶۹ سال کی ہیں اور انہوں نے اپنے گرہست کی زندگی سے فارغ ہو کر یعنی بچوں کی شادی وغیرہ کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کی طرف دھیان دیا اور کوئی ۳۰-۳۱ سال وقفے کے بعد اس شوق کو پایہ تکمیل تک پہونچایا جس کے لیے اُن کے عزم و استقلال قابلِ تعریف ہیں۔

شانِ ہند دہلی، جنوری ۱۹۸۶ء

مقالہ ہذا میں انہوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے فسادات کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ اور کس طرح جان لارنس اور ہنری لارنس نے سکھوں کو اپنے حلقہ اقتدار میں لے کر انگریزوں کا شیدا بنا لیا یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی ہوئی، تو اس میں نہ صرف یہ کہ سکھوں نے ہندوستانیوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ الٹا انگریزوں کی حمایت میں ہندوستانی فوجوں کا مقابلہ کیا اور برطانوی حکومت کی بنیادوں کو پختہ کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ انگریزی حکومت سارے ملک پر قابض ہو گئی۔

فاضل مصنف نے مستند حوالجات سے یہ ثابت کیا ہے کہ کس طرح انگریزی حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرتی رہی تاکہ ان کا اپنا قبضہ مضبوط رہے۔ اس کے بعد ۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء تک پنجاب ہی نہیں بلکہ سارے ملک میں جو تحریکیں چلیں ان کا بھی حوالجات کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور مختصراً سارے ملک کی ۹۰ سالہ تاریخ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ قومی تحریک کے سلسلے میں پنجاب کو از سر نو بیدار کرنے کا سہرا جلیانوالہ باغ کے ۱۹۱۹ء کے سانحہ کو ہے جس سے پنجاب میں مارشل لا لگا۔ اور نئی بیداری رونما ہوئی۔ اور جس نے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سب کو اکٹھا کر دیا۔

بعد میں نان کوآپریشن، خلافت وغیرہ کی تحریکیں بھی چلیں اور ان میں پنجاب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ کانگریس کی مکمل آزادی کی قرارداد بھی ۱۹۲۹ء والے لاہور کے اجلاس میں ہی پاس ہوئی۔ اسی دوران کیبنٹ مشن، کرپس مشن، سائمن کمیشن، مِنٹو مارلے اسکیم، ریڈکلف ایوارڈ اور دو تین گول میز کانفرنسیں بھی ہوئیں جن کے نتیجے کے طور پر ہندوستان کے بٹوارے کے ساتھ پنجاب کا بھی بٹوارہ ہوا۔ اور کروڑوں کی تعداد میں لوگ ریفیوجی بنے، ہزاروں مارے گئے، اور ہزاروں عورتوں کی عزت لوٹی گئی۔

تمام واقعات کو مصدقہ حوالہ جات کے ساتھ کتاب ہذا میں دیا گیا ہے۔ (تصاویر کتاب کی زینت میں اضافہ ہیں)

شریمتی گھمی ان تمام حالات کو دنیا کے سامنے رکھنے کے لئے مبارکباد کی مستحق ہیں۔ پرانے زمانے میں جیسے مائیں بچوں کو پرانی کہانیاں سنا کر انہیں مستقبل کے لئے تیار کرتی تھیں ویسے ہی یہاں بھی ایک ماں آئندہ کی نسلوں کو ملک کی خدمت کیلئے تیار کرتی ہے جو عمل قابل تعریف ہے۔

——— ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ

ایم۔ اے ڈی لٹ۔

شانِ ہند ۵ تا ۱۱ جنوری ۱۹۸۷ء

مجی سرور صاحب!

آپ کا گرامی نامہ اور ڈاکٹر حقیر آستانی
مجموعۂ کلام "افکارِ گریزاں" موصول ہوئے
شکر گذار ہوں۔

آجکل اُردو شاعری غزل کے مترادف بنی
ہی ہے، کبھی تو یہ خیال آتا ہے کہ ہمارے شاعر
نظم نگاری سے توبہ کر چکے ہیں۔ ممکن ہے اُردو
غزل کی حد درجہ مقبولیت نظم گوئی سے گریز
کا سبب ہو بہر کیف ڈاکٹر حقیر آستانی مبارکباد
کے مستحق ہیں کہ وہ غزل کی اس مقبولیت سے ہراساں
نہیں ہوئے۔ اور برابر نظمیں لکھ رہے ہیں جو
اعلیٰ درجہ کی ہیں، نظموں کے علاوہ اُن کی غزلیں
بھی اُن کے جوہرِ طبع کی آئینہ دار ہیں۔

الغرض نغمگی، شیرینی اور شگفتگی معنوی
اور صوری حسن سے مزین "افکارِ گریزاں" ایک
گرانقدر مرقع ہے

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ میرے بزرگ
ہیں اور بڑے کرم فرما ہیں۔ اللہ اُن کو تادیر
زندہ، صحت مند اور سلامت رکھے۔

آپ کا مخلص
سید مظفر حسین برنی
(گورنر ہریانہ)

مکرمی سرور صاحب!

آداب و خلوص!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس
طویل بیماری نے بہت کچھ چھین
لیا ہے اور جو باقی بچا ہے "
ریگِ شیشہ ساعت کی طرح
آہستہ آہستہ چھن رہا ہے۔

یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ
آپ سالگرہ کی طباعت میں تبدیلیاں
لا رہے ہیں۔ میری رائے ہے کہ تسکین
نظر کے ساتھ اگر باطن کی تسکین
ذہنی کا سامان بھی ہو جائے تو
بہتر ہوگا یعنی صفحات میں اضافے
کی سبیل بھی فرمائیے۔

آپ کا خیر اندیش
گنگا لال گردھر

پیارے وِدّیا پرکاش!

اچانک زندگی کے جس عذاب میں مبتلا ہو گیا ہوں میں اسے
کرموں کا پھل نہیں کہتا۔ کرموں سے اپنے تعلقات مدت ہوئی
چھوٹ چکے ہیں۔ میری اس ہڈی کی طرح جو بائیں ٹانگ میں ٹوٹی ہے۔
پورے پلستر میں قید کر دیا گیا ہوں۔ کہتے ہیں، آزادی ڈیڑھ مہینے
بعد ملے گی۔

آپ نے اس مصیبت میں یاد کیا۔ شکریہ، شاید اس کی بدولت
آزادی چند دن پہلے مل جائے۔

آپ کا اسپیشل مضمون پڑھتا ہوں تو خوش ہو جاتا ہوں۔ آفسیٹ
پر چھپا تو اور زیادہ خوش ہوؤں گا۔

یہ م۔م راجندر کون ہے؟ سنا ہے اُسے ڈرامے لکھنے پر
غالب ایوارڈ ملا ہے۔ کیا وہ ڈرامہ نگار ہے؟

فکر تونسوی
گل مہر پارک، نئی دہلی ۴۹۔۱۱۰۰

محترم و مکرم سرور تونسوی صاحب!

سلام و رحمت۔ آج مدت کے انتظار
کے بعد آپ کا بھیجا ہوا لفافہ ملا جس میں شانِ
ہند کا وہ پرچہ بھی تھا جو آپ کے پُرخلوص
و محبت بھرے اداریہ سے آراستہ ہے۔

آپ کا خط پڑھنے کے بعد ایڈیٹوریل
پڑھا تو حقیقت میں دل میں طوفانِ گریہ امنڈ
آیا آپ کی محبت کا بہت ممنون ہوں۔ شکریہ کیسے
ادا کروں الفاظ نہیں ملتے۔ ہاں آپ سے دیرینہ
برادرانہ تعلقات کی بنا پر آپ کی طرف سے آج
تک کوئی خط نہ آیا تو مجھکو دلی ملال رہا، اور
شکوہ بھی پیدا ہوا جو اپنوں سے ہی ہوتا ہے
مگر جب آپ نے اپنی علالت کا حال لکھا تو بات ختم
ہو گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب آپ صحت مند ہیں۔ خدا
آپ کو تندرست و خوشحال رکھے۔

آپ کا خیر اندیش
محمد عثمان عارف نقشبندی
(گورنر اتر پردیش)

سرور کریم۔ بندہ نواز!
خلوص و نیاز۔ مزاج گرامی؟

آپ کا صحیفۂ اخلاص "شانِ ہند" کا دسمبر کا
تازہ شمارہ نظر نواز ہو گیا۔ یاد آوری اور ذرہ نوازی
کا شکریہ اس میں آپ نے اس نیاز مند کے ایک شعری
نذرانہ وقت کی آواز کو بڑے اہتمام سے جگہ عنایت
فرمائی ہے۔ اس کے لئے مزید تشکر و امتنان پیش
قدم ہے۔۔ شکریہ۔ اور کوئی خدمت؟

جواب کا منتظر ہوں، تاکہ تاثرات عالیہ سے
مستفید ہو سکوں، آپ کا رہینِ کرم
توصیف علوی عاصی
کیرانوی

فروری ۱۹۸۷ء

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
رجسٹرار آف نیوز پیپرز انڈیا
رجسٹریشن نمبر ۵۰ ۶۴۴
رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۲۵۳
ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۶۰۲
فروری
دہلی
شانِ ہند
بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرد
بہ کوئے عبارت اندر محرمانہ گرد
شانِ اعتقاد ۳
مکتوب الیہ ۳۱
کلامِ احقر — احقر بہاری ۲
غزل — ڈاکٹر حقیر آستانی ۹
عہد — وقار حود جھری ۱۱
غزل — فراق گورکھپوری ۱۲
کویت میں طرحی مشاعرہ — کویت بزم سخن کویت ۱۳
نئی تعلیمی پالیسی اور اردو زندگی — کل ہند سمینار ۱۵
بزمِ ادب اٹھیرا کا کل ہند مشاعرہ — آصف مسعود صدیقی ۱۷
غزلیں ۱۹
سیڑھیاں (افسانہ) — الیاس احمد گدی ۲۲
انصاف — ترکی کہانی ۲۶
چیف ایڈیٹر — سرور تونسوی
معاون ایڈیٹر — مطرب صحرائی
حسن کار — مصطفیٰ آرٹسٹ
خطاط — محمد عمران اعظمی
جلد ۴۸
شمارہ ۲
پرنٹر پبلشر پروپرائٹر
وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ ”شانِ ہند“
ملنے کا پتہ انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
قیمت فی شمارہ — چار روپے
قیمت سالانہ — چالیس روپے
ممالک غیر میں بذریعہ سمندری ڈاک Rs 80.00
بذریعہ ہوائی ڈاک سعودی عرب
متحدہ عرب امارات اور کویت Rs 150.00
انگلینڈ، ناروے، سوئٹزرلینڈ Rs 200.00
کناڈا۔ امریکہ Rs 250.00

کلامِ احقر

حضرت احقر بہاری مرحوم

سُرمہ آنکھوں میں دہن میں پان ہے
کہیے کس کے قتل کا سامان ہے؟

جب کہا تو حور ہے غلمان ہے
ہنسکے بولے سب خدا کی شان ہے

الحذر اے نالۂ دل! الحذر
کون سوتا ہے؟ ارے کچھ دھیان ہے

مِل گیا کعبہ میں مجھکو وہ صنم
شکر ہے اللہ کا احسان ہے

میں انھیں چاہوں وہ چاہیں غیر کو
اے مرے خالق تری کیا شان ہے

صدمے سہنا عشق کے دشوار ہیں
جان دے دینا بہت آسان ہے

کوئی دل دیتا ہے لیتا ہے کوئی
کوئی دانا ہے کوئی نادان ہے

مصحفِ رُخ کا کہاں بوسہ لیا
دیکھیے یہ ہاتھ میں قرآن ہے

غیر کو بلوائیے ، یا ، جائیے
ہر طرح سے آپ کا نقصان ہے

اے صنم دیر و حرم میں سب تجھے
ڈھونڈتے ہیں جس قدر امکان ہے

اس کو ملنے کی عدو سے آرزو
جس کے ملنے کا مجھے، ارمان ہے

بخشدو احقر کو اب بندہ نواز
ہوگئی اُس سے خطا انسان ہے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالاتِ حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اڈیٹوریل

شہاب الدین دائیں سے تیسرے اور دیگر۔

مسلمانوں کے نادان دوست یا ----

رام جنم بھومی اور بابری مسجد کا متنازع
موضوع اس وقت ملک بھر میں زیرِ بحث ہے۔
...ین کے دلائل بڑی کثرت سے اخبارات میں
...وں سے گذرتے ہیں۔ مگر خدا لگتی یہی ہے
...دونوں فریق اپنا اپنا نقطۂ نظر جس طرح پیش کر رہے
... وہ صاف دلی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اس میں
...ی تعصّب، خبثِ باطن، اور بدنیتی کا اِس
...بروافر عنصر موجود ہے کہ فریقین ایک دوسرے
...حقوق پر غاصبانہ انداز میں جھپٹ رہے
...اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ہر دو فریق بھگوان
...ا کو اُن کے غصب شدہ حقوق نیز قبضہ
ملکیت دلانے کے نیک فرائض ادا کرنے کے
دعوے دار ہیں۔

اِس متنازعہ مسئلے کا حل اگر دونوں
فریق نیک نیتی سے چاہتے تو سلاطینِ اَوَدھ کے
عہد کی تاریخ سے انہیں بہت کچھ صحیح راہ
کا علم ہو سکتا تھا۔ تاریخ اَوَدھ میں رام
جنم بھومی یا بابری مسجد کے بارے میں
تفصیل سے ذکر موجود ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی عہد
میں ہماری تاریخ میں بہت کچھ غلط سلط
مواد جمع کر دیا گیا ہے جس سے کئی اہم امور
کے بارے میں اصلیت کا پتہ چلانا مشکل ہو گیا
ہے مگر ابھی ہندوستان میں ایسے ہندو
اور مسلمان موجود ہیں جو دودھ کو دودھ
اور پانی کو پانی کہنے کی جرأت رکھتے ہیں،

مگر کس قدر ملک دشمنی ہے کہ ایک
خالص عبادتی جگہ کے تنازع کی آڑ لے کر
دونوں فریقوں کے کچھ چالاک اور مفاد پرست
حضرات اپنی لیڈری چمکانے اور عوام کو
بے وقوف بنانے میں لگے ہوئے ہیں،

اِس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت
میں ہر کسی کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے

آواز بلند کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ مگر جب اِس حق کا غلط استعمال محض اپنی ذاتی غرض کے لئے کیا جائے تو پھر جمہوریت دَم توڑنے لگتی ہے اور فرقہ وارانہ طاقتیں سَر اُٹھانے لگتی ہیں جو ملک۔۔ کی سالمیت اور قومی یک جہتی کے لئے سمّ قاتل کا اثر رکھتی ہیں۔

سید شہاب الدین صاحب ایک زیرک اور باشعور شخصیت ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جشن جمہوریت کا بائیکاٹ بابری مسجد کا حل نہیں ہے مگر اُنہوں نے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے اور اُن کا لیڈر بننے کے لئے ایسی راہ اختیار کی جو مسلمانوں کو ملک کے قومی دھارے سے الگ کرنے کے مترادف تھی۔ اور دراڑ کو اور بھی نمایاں کرنے کی موجب ہوتی۔ سید شہاب الدین بخوبی واقف تھے کہ یہ معاملہ عدالت میں ہے چنانچہ حکومت کسی ایسے معاملہ میں دخل اندازی نہیں کرسکتی جو عدالت میں زیر سماعت ہو۔ مگر اُنہوں نے مسلمانوں کو ایسے راستے پر ڈالنے کی مکروہ کوشش کی جس سے ملک کی وفاداری اور غیر وفاداری میں محض ایک قدم کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ سید صاحب اپنی ضد پر قائم رہتے اور جشنِ جمہوریت کے بائیکاٹ۔۔۔ کی تحریک واپس نہ لیتے تو ظاہر ہے کہ جشنِ جمہوریت تو بدستور منایا ہی جاتا مگر ملک بھر کے مسلمانوں کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ وہ قومی دھارے سے الگ ہوکر ان طاقتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں جو ملک۔۔۔ کی سالمیت اور قومی یک جہتی کو برقرار دیکھنا نہیں چاہتے۔

اگر سید شہاب الدین ہندوستان کے مسلمانوں کے واقعی خیر خواہ ہوتے تو وہ یہ صدائے حق بلند کرتے کہ ہندوستان کے مسلمانو! تم پر صد ہزار آفریں کہ جب سے ملک آزاد ہوا ہے حکومت کسی ایک مسلمان کو بھی قومی یا ملکی غداری میں ماخوذ نہیں کرسکی جبکہ تمہارے ہم وطنوں میں سینکڑوں افراد اس کمینگی کے مرتکب ثابت ہوتے۔ شہاب الدین صاحب ببانگ دہل کہہ سکتے تھے کہ پاکستان کے ساتھ ہر جنگ میں ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ برابر کا حصّہ لیا اور ملک کی سالمیت کو قائم رکھا بلکہ عبدالحمید ایسے جانباز مسلمانوں نے ملک کے تحفظ کے لئے اپنے آپ کو خوشی خوشی قربان کردیا۔ جبکہ مدِمقابل ہندوستانی مسلمانوں کا ہم مذہب تھا۔

شہاب الدین

شہاب الدین اِس پر ناز کرسکتے تھے کہ ہندی مسلمانوں کو صدارت وزارت سفارت غرضیکہ جو بھی کلیدی ذمہ داری سونپی گئی تو مسلمانوں نے اپنے فرائض کو ملکی وفاداری کے عہد کے مطابق سرانجام دیا۔ اور آج تک اُن کے کردار پر کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکا۔

سید شہاب الدین کا یہ فرض تھا کہ وہ مسلم عوام سے کہتے کہ وہ حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ اُنہیں محکمہ پولیس اور فوج میں زیادہ نمائندگی دی جائے۔ اُن کے لئے روزگار کے دروازے کھولے جائیں، اُن کے بچوں کے لئے پڑھائی کا بہتر انتظام کیا جائے۔ اور اُردو پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کو سرکاری اداروں میں ملازمت دی جائے، اور فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کرایا جائے۔

مگر سید شہاب الدین تو ایک نیا جنت ہیں دوسرا محمد علی جناح بننے کے خواب دیکھنے لگے اور مسلمانوں کو یکدم قومی دھارے سے الگ کرکے اُن کیلئے مزید شکوک ہم وطنوں میں پیدا کرنے کے اسباب مہیا کرنے لگے۔

یاد رکھیئے! کہ رام جنم بھومی اور بابری مسجد کا معاملہ دو ہی طرح سلجھ سکتا ہے۔ اوّلیں عدالتی فیصلہ جس کے لئے حکومت سے کہا جانا چاہئے کہ وہ ایسے انتظامات کرے کہ یہ عدالتی فیصلہ جلد از جلد صادر ہو۔ اور اگر اس فیصلے۔۔۔ سے فریقین کی تسلّی نہ ہو تو پھر دونوں فریقین سے ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا جائے جو بھگوان اور خدا سے خوف کھاتی ہوں اور سچائی کے اظہار کے لئے کسی سے نہ ڈرتی ہوں، نیز اُن کی ایمانداری اور حق گوئی پر دونوں فریقوں کو یقین ہو، اور یہ معزز شخصیتیں سر جوڑ کر بیٹھیں، اور ایک دوسرے کے دلائل سُننے کے بعد ایسا فیصلہ کریں جو ہر کسی کو منظور ہو۔

ہم تمام ہندوستانی مسلمانوں سے مؤدبانہ التماس کریں گے کہ وہ اپنے لئے ایسی لیڈرشپ تلاش کریں جو صحیح طور پر اُن کی رہنمائی کرسکے۔ اور یہ لیڈر مسلم عوام کو صحیح طور پر اسلام کی خوبیوں سے روشناس کرائیں تاکہ اُن کے دل و دماغ روشن ہوں اور یہ اپنے اچھے بُرے کا خود فیصلہ کرسکیں۔

آخر میں ہم ہر ہندوستانی سے خواہ وہ کسی بھی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہ[illegible] مؤدبانہ التجا کریں گے کہ وہ اپنے آپ کو مذ[illegible] تعصّب سے پاک رکھے کیونکہ تعصب ان[illegible] کی جملہ صلاحیتوں کو زنگ لگا دیتا ہے۔ م[illegible] رواداری، حقوقِ ہمسایہ، شرافت او[illegible] کے تقاضوں پر نظر رکھنے والا انسان ہ[illegible] رہیگا اور کسی کے ساتھ ناانصافی ن[illegible]

دبی
امردی

گمنام صاحب کا کارنامہ

●●●●●●●●●●

ہندوؤں کی یک نفری نمائندگی پر اظہارِ رائے

●●●●●●●●●●

کنگ فاروق کا محل اُردو گھر

●●●●●●●●●●

کسی "گمنام" صاحب نے "ہماری زبان"
شمارہ ۸، فروری ۸۰ء کے دو تراشے
انڈیا اُردو کانفرنس کلکتہ" اور "آندھرا پردیش
دو اکاڈمی کے انعامات کا اعلان" اس غرض
ے ہمیں بھجوائے ہیں کہ "مشرکار، آل انڈیا اُردو
انفرنس کلکتہ اور انعام یافتگان آندھرا پردیش
اردو اکاڈمی میں ہندوؤں کی یک نفری
نمائندگی پر اظہارِ رائے کریں،

یعنی یہ صاحب اپنی بندوق ایڈیٹر
شانِ ہند" کے کندھوں پر رکھ چلانا چاہتے
ہیں، اور ہماری نظر میں ان "گمنام" صاحب
کا یہ کارنامہ "ادبی نامردی" ہے۔ اگر ان کے
دل میں ہندوؤں کے لئے اتنی ہی ہمدردی
ہے تو پھر انہیں سینہ ٹھونک کر اپنے نام سے
مضمون لکھ کر بھجوانا چاہیئے تھا۔ ویسے ان
"گمنام" صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے
کہ اگر وہ اپنی اس "ادبی نامردی کا مُظاہرہ نہ
بھی فرماتے تو بھی ہم آل انڈیا اُردو کانفرنس
کلکتہ کے سلسلے میں یہ لکھنا چاہتے تھے کہ جن
دنوں مشرقی پاکستان کی جنگ زوروں
پر تھی تو اُن دنوں پریس انفارمیشن بیورو
کا کوئی بھی افسر کلکتہ میں پریس آفیسر اُردو
کی حیثیت سے جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اُن
دنوں ایک تو نکسل وادیوں کا کلکتہ میں ہوا
تھا اور دوسرے بنگلہ دیش کا قضیہ زوروں
پر تھا، چنانچہ ایڈیٹر "شانِ ہند" کے بڑے
بیٹے ہربنس لال کو اُردو پریس آفیسر کے
طور پر کلکتہ بھجوایا گیا، دو سال کے بعد
جب مسٹر ہربنس لال کو جناب محمد شفیع قریشی
نے اپنی وزارتِ ریلوے میں (بوجہ ریلوے
ہڑتال) وزارتِ نشریات و اطلاعات
سے ڈیپوٹیشن پر نئی دہلی بُلا لیا تو کلکتہ
کوئی بھی افسر بطور اُردو پریس آفیسر
جانے کو تیار نہ تھا تو حکومت نے سوچا کہ
کیوں نہ کسی بنگالی کو جو اُردو جانتا ہو
... سالوں کے لئے یہ ذمہ داری سونپی جائے۔ شانتی رنجن
بھٹاچاریہ اُن دنوں کسی سرکاری دفتر میں
معمولی مُلازم تھے۔ لہٰذا حکومت کی ضرورت
اور مجبوری نیز شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی
تقدیر نے اُنہیں اُردو پریس آفیسر کی کُرسی
پر لا بٹھایا،

خلیق انجم صاحب نے ہمیشہ ایسے لوگوں
کو اپنے ارد گرد جمع رکھنے کی کوشش کی ہے
جو اُن کو کنگ فاروق کے محل (اُردو گھر)
پر قابض رکھنے میں مُعاون ثابت ہو سکیں۔
کیا خلیق انجم یا مغربی بنگال انجمن ترقی اُردو
کے کارکنان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کلکتہ میں
ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ ایسی ہستی بھی موجود
ہے جو ہندوستان میں اُردو، فارسی، پنجابی
انگریزی، ہندی زبانوں کے تحفظ کی ضامن
ہے جب یہ لوگ اپنی من پسند کار روائی چاہتے
ہیں تو انہیں شانتی رنجن بھٹاچاریہ ایسے
صدر کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ ہیرالال چوپڑہ
صاحب ایسی قابلِ تعظیم اور صاحب فہم و زکا

اب تو یار لوگ اپنے سر پر
اُردو کا ہاتھ لئے پھرتے ہیں
تاکہ اُن کے سر پر کوئی اُفتاد
پڑے تو اُردو ہیلمٹ کا کام
دے۔

کلکتہ میں ڈاکٹر ہیرالال
چوپڑہ ایسی ہستی بھی موجود
ہے جو ہندوستان میں اُردو
فارسی، پنجابی، انگریزی، ہندی
زبانوں کے تحفظ کی
ضامن ہے۔

کی ضرورت نہیں ہوتی،
اور تو اور انہی تاریخوں میں ایڈیٹر "شانِ ہند" کو کلکتہ میں ہی ہونا تھا جس پر خلیق انجم صاحب نے بڑے انہماک اور خوشی سے فرمایا تھا کہ ہم آپ کو ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے اس کانفرنس میں مدعو کریں گے اور آپ کی کلکتہ روانگی سے بہت پہلے آپ کو ڈیلی گیٹ کا دعوت نامہ وغیرہ پہونچ جائے گا، مگر یہ سب کہنے کی باتیں تھیں۔ عملاً کچھ نہیں، جبکہ کانفرنس کے داعیان کو ایڈیٹر "شانِ ہند" کے لئے کسی قسم کے مالی بوجھ کے اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں تھی، حالانکہ ایڈیٹر "شانِ ہند" کو علم تھا کہ خلیق انجم صاحب اپنے کسی دشمن مسلمان کو تو اس کانفرنس میں مدعو کر سکتے ہیں۔ مگر اسے نہیں.... تو گمنام صاحب اسے کبھی مت بھولئے گا، کہ یہاں سوال صرف کنگ فاروق کے محل (اُردو گھر) پر قابض رہنے کا ہے۔ اُردو بیچاری تو مدّ دریا گنج ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں ہی اپنی سدا بہار شان و شوکت میں رہتی بستی تھی، جبکہ بابائے اُردو مولانا عبدالحق کا اس کے سر پہ ہاتھ تھا، اب تو یار لوگ اپنے سر پہ اُردو کا ہاتھ لئے پھرتے ہیں تاکہ اُن کے سر پر کوئی اُفتاد پڑے تو اُردو ہیلمٹ کا کام دے،

۱۳ فروری ۸۷ء کو پروفیسر گوپی چند نارنگ عالمی امن کے موضوع پر ہونے والی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے رُوس روانہ ہوئے اور انہوں نے پہلے تاشقند اور پھر ماسکو میں اس کانفرنس کی دونوں نشستوں میں شرکت فرمائی۔ اس کانفرنس میں دُنیا کی موجودہ صورتِ حال اور کرۂ ارض پہ انسانی بقا کے مسائل پر غور و خوض کیا گیا سوویت رُوس کے صدر اور مرکزی کمیٹی کے جنرل سکریٹری میخائل گورباچیف نے بھی اس اجتماع میں خطاب فرمایا،
پروفیسر گوپی چند نارنگ کے علاوہ پنجابی ادیبہ محترمہ امرتا پریتم، ہندی ادیب بھیشم ساہنی اور فلسفی پروفیسر سچدانند مورتی نے بھی شرکت فرمائی، ماسکو کے بعد یہ وفد لینن گراڈ اور کیو بھی گیا، ماسکو سے واپسی پر پروفیسر نارنگ لندن سے ہوتے ہوئے نئی دہلی واپس تشریف لے آئے ہیں، پروفیسر نارنگ کی اس عزت افزائی پر اُن کے بہی خواہوں نے دِلی مبارک باد دی۔ اور اُن کی اِس شہرت، مقبولیت اور عزت آفزائی سے جلنے والوں کے دلوں میں مایوسی اور حسد کی مزید تاریکی چھا گئی، مگر کسی نے کیا سچ فرمایا ہے،
ع آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدارا،

ممتاز شعراء

۱۱ فروری ۱۹۸۷ء کو آندھرا پردیش بھون نئی دہلی میں برِّ صغیر کے مشہور شاعر جناب ساحر ہوشیار پوری کے اعزاز میں اُن کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ساہتیہ منچ جالندھر کی طرف سے ایک پُر رونق تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ لوک سبھا کے اسپیکر عالی جناب بلرام جاکھڑ نے صدارت فرمائی۔ اور نظامت کے فرائض مدیر "ایوانِ اُردو" جناب مخمور سعیدی نے انجام دیئے، ڈاکٹر عنوان چشتی نے ساحر ہوشیار پوری پر مقالہ پڑھا، مجتبیٰ حسین صاحب نے ساحر ہوشیار پوری پر ایک خاکہ پیش کیا جس کی وجہ سے سامعین بار بار قہقہے لگانے پر مجبور ہوئے، کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر ہسپتال سے ساحر صاحب کو دُعائیں دینے کے لئے تشریف لائے، عالی جناب بلرام جاکھڑ صاحب نے نہایت رواں دواں، فصیح و بلیغ اُردو میں ساحر صاحب کی شاعری پر اظہارِ خیال فرمایا۔ جاکھڑ صاحب کا تلفظ، اندازِ بیان، اور روانی زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ ہماری پارلیمنٹ نے اسپیکر کا انتخاب کس قدر صحیح کیا ہے، نذرِ ساحر کتاب جس میں مُلک بھر کے شعراء اور ادیبوں نے ساحر صاحب کو خراج پیش کیا ہے، کا اجراء بھی جناب جاکھڑ صاحب نے فرمایا۔ بعد میں محترمہ شمن دیوگن نے ساحر صاحب کا کلام لحنِ داؤدی میں پیش کیا، ادارہ شانِ ہند، ساحر صاحب کو اُن کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر دِلی مبارک باد پیش کرتا ہے، اور دُعا گو ہے کہ ساحر صاحب کا جشنِ صد سالہ دیکھنے کا ہمیں فخر حاصل ہو،

اندازِ جگر کی رسمِ اجراء

۲۷ فروری کو راشٹرپتی بھون میں، جناب جگر جالندھری کے پانچویں مجموعۂ کلام "اندازِ جگر (دیوناگری لپی)" کا اجراء،

...نے فرمایا۔ جگر صاحب پٹیالہ (پنجاب) ...نے والے ہیں۔ اِس لیئے پٹیالہ کے معززین ...بڑی تعداد میں تشریف لائے ہُوئے ...راشٹرپتی جی نے فرمایا کہ آپ لوگوں ...نے پٹیالہ کیوں نہیں بُلایا، آپ سب ...ہیں کہ میں پٹیالہ کے نزدیک ہی ایک ...ں کا رہنے والا ہوں، اور پھر پنجاب ...صُوصًا پٹیالہ سے میرا جو تعلق ہے اس ...پیشِ نظر مجھے پٹیالہ آکر یقینًا خوشی محسوس ...، مگر آپ نے مجھے دعوت نامہ ہی نہیں ...کہ میں وہاں آؤں، راشٹرپتی نے ...حیہ انداز میں فرمایا کہ بے شک حالات ...تقاضے کے باعث آپ نے ایسا نہیں کیا۔

معلوم کتنی کتابوں کا اجرا رکیا ہوگا مگر انہوں نے "انداز جگر" کے اجرا کے وقت جو تقریر کھلے دِل بلکہ دِل کی گہرائیوں سے کی اُس کی مثال ہی نہیں، اُردو سے جس والہانہ انداز میں راشٹرپتی نے اپنی وابستگی کا ذکر فرمایا وہ اُردو کے لیئے یقینًا فخر کا باعث ہے جناب جگر جالندھری اُردو کے مُلک گیر شُہرت رکھنے والے شاعر ہیں اور اُن کے چار مجموعہ ہائے کلام اُردو میں شائع ہو چکے ہیں مگر انہوں نے اندازِ جگر کو دیوناگری لِپی میں شائع فرما کر اُردو ہندی سنگم کی ایک مثال پیش کی ہے، ہم جگر صاحب کو اِس قابلِ مُبارکباد عزت افزائی پر پیش کرتے ہیں۔

اُردو کے بُزرگ اور مشہور شاعر جناب عروج زیدی صاحب جو ایک عرصہ سے علیل تھے ۲۴ فروری کی رات دس بجکر ۲۵ منٹ پر اُن کا اِنتقال رام پور میں اُن کی رہائش گاہ پر ہُوا، مرحُوم کئی کتابوں کے مُصنّف تھے اور انہیں کئی ایوارڈ بھی ملے، مرحُوم نہایت وضع دار، خلیق، سنجیدہ طبع اور منکسر المزاج انسان تھے، مُدیر شانِ ہند سے اُن کے برادرانہ تعلقات تھے ۔

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

علاج اب مرضِ مہلک کا چلو آخر کیا جائے
چلو زہراب کو زہراب کہہ کر ہی پیا جائے

خرد پہلے ہی گریاں تھی جنوں بھی آج نالاں ہے
گریباں چاک ہے تو چاک ہی رہنے دیا جائے

یہ سچ رکھا ہے اوروں کیلئے جینا ہی جینا ہے
ادھر کچھ دیر یارو اپنی خاطر بھی جیا جائے

مبادا خونچکاں ہو جائے احساسِ رواداری
ہمارے زخمِ دل کو نوکِ مژگاں سے سیا جائے

پرانے ہیں اگر تو کیا قوافی بھی ردیفیں بھی
انھیں پھر سے غزل کے گیسوؤں میں [illegible] دیا جائے

حقیرِ بے نوا یہ لوگ ہیں مجبورِ عادت سے
انھیں کہنے دیا جائے انھیں بھی سن لیا جائے

حقیر آستانی شاعری کے آسمان پر آندھی کی طرح نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے طوفان کی صورت اختیار کر گئے، اور آج ان کا نام اُردو شاعری کی آبرو کا ضامن ہے

——— ادارہ

تازہ کرنے والا واقعہ

بہ سال تک صرف قرآنی آیات میں گفتگو کرنے والی خاتون

تحریر:- وقار چودھری

عرب کی ایک بزرگ خاتون نے چالیس برس
صرف قرآنی آیات میں ہی گفتگو کی مبادا کہیں
ن کے منہ سے کوئی ناجائز بات نہ نکل جائے، یہ
تقویٰ کی انتہا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے
شاگرد خاص اور مشہور بزرگ عبداللہ بن مبارکؒ
ج سے فارغ ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد اور
روضہ کی زیارت کے قصد سے رخت سفر باندھ
رہے تھے کہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ اور آپؒ اکیلے
تھے لہٰذا خدا کا نام لے کر تنہا ہی روانہ ہو گئے۔
راستے اور خود ہی ساربان۔
تا ہی صحرائی سلسلہ ہواؤں کی خوفناک
بچے سے قدم قدم پر راہزن بدوؤں کا
سنسان اور ہو کا عالم تھا۔ کہ اچانک
نحیف و ناتواں خاتون پر پڑی جو چادر میں
تھی۔ عبداللہ بن مبارکؒ ایسے ویرانے میں

تنہا و ناتواں خاتون کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور بجائے
و گھبراہٹ قریب جا کر سلام عرض کیا تو اس خاتون
نے "سلام قولا من رب رحیم" (سورۃ یٰسین) جواب دیا۔
یعنی رب رحیم کی طرف سے اہل جنت کو سلام پہنچایا
جائے گا۔

تب عبداللہ بن مبارک پر یہ حقیقت
منکشف ہوئی کہ خاتون اُن کے ہر سوال کا جواب
یہاں تک کہ دیگر گفتگو بھی آیات قرآنی ہی میں
کرتی ہیں۔ عبداللہ نے پھر سوال کیا۔

عبداللہ .... آپ اس ویرانے
میں کیوں پھر رہی ہیں۔

خاتون ... جسے اللہ تعالیٰ گم کردہ راہ کر دے
اُسے کوئی راہ پر نہیں لا سکتا۔
(پ ۹ رکوع ۱۳)

عبداللہ سمجھ گئے کہ خاتون اپنے قافلے سے
بچھڑ کر راہ بھول گئی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے دریافت

خاتون ... کہ پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے
بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے
مسجد الاقصیٰ تک
(پ ۱۵ ع ۱)

حضرت عبداللہؒ خاتون کے جواب سے سمجھ گئے
کہ حج سے فارغ ہو کر اب بیت المقدس جانا چاہتی
ہیں۔ آپؒ نے پوچھا خاتون آپ اس بیابان میں
کب سے سرگرداں ہیں۔

خاتون ... یعنی ... تین راتوں سے پھر رہی
ہوں۔ (پ ۱۶ ع ۴)

عبداللہ ... آپ کے پاس کھانے پینے کیلئے
کچھ نہیں؟

خاتون ... یعنی اللہ تعالیٰ ہی مجھ کو کھانے پینے
کو دیتا ہے۔ (پ ۱۹ ع ۹)

عبداللہ ... آپ وضو کس چیز سے کرتی ہیں؟

خاتون ... اگر تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم
کر لو۔ (پ ۵ ع ۹)

عبداللہ ... میرے پاس کھانا ہے اگر خواہش
ہو تو پیش کر دوں؟

خاتون ... شام تک روزہ کو پورا کرو۔ (یعنی
خاتون روزہ سے تھیں) (پ ۲ ع ۷)

عبداللہ ... اب تو رمضان نہیں ہے۔

خاتون ... یعنی خوشی سے کوئی نیک کام کرے
تو اللہ تعالیٰ اُس کی قدر دانی کرتے ہیں۔
(پ ۲ ع ۳)

عبداللہ ... سفر میں تو روزہ نہ رکھنے کی اجازت
ہے۔

خاتون ... یعنی اگر تم (سفر میں) روزہ رکھو تو تمہارے
لیے روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے۔
(پ ۲ ع ۷)

عبداللہ ... آپ کس قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں؟

خاتون ... اور جس بات کی تحقیق نہ ہو اُس پر عمل
نہ کرو کیونکہ قیامت کے روز کان آنکھ
دل سب سے پرسش ہوگی (پ ۱۵ ع ۴)

عبداللہ اس جواب سے پریشان ہو گئے اور کہنے

لگے محترمہ مجھ سے غلطی ہوئی مجھے معاف فرمائیں
خاتون میرے پاس سواری کے لئے اونٹ ہے
اگر آپ اپنے قافلہ کے ساتھ شامل ہونا چاہیں تو
یہ اونٹ حاضر ہے۔

خاتون... تم جو نیکی کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے
کو جانتا ہے۔ (پ ۲ ع ۹)

عبداللہ بن مبارک نے ان سے سوار ہونے
کی درخواست کی، خاتون سوار ہونے کے لئے چہرے
سے نقاب اٹھاتے ہوئے گویا ہوئیں۔

مومنو سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی کرلیں
(پ ۱۸ ع ۱۰) تو عبداللہ نے اپنا چہرہ پھیر لیا تاکہ بے
پردگی نہ ہو۔ خاتون سوار ہوگئیں۔ تو عبداللہ تیزی
سے اونٹ کی نکیل پکڑے اور اشعار پڑھتے ہوئے
چل پڑے۔ خاتون کو تیز رفتاری سے تکلیف ہوئی تو فرمانے لگیں

خاتون... اپنی رفتار میں اعتدال رکھو اور آواز کو
پست رکھو۔ (پ ۲۱ ع ۱۱)

خاتون نے آپ کو اشعار پڑھنے سے منع
فرمایا اور کہا جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھو۔ (پ ۲۹ مزمل)
یوں ہی چلتے چلتے قافلے کے نزدیک پہنچ گئے
اور عبداللہ نے پوچھا کہ خاتون آپ کا کوئی عزیز قافلے
میں ہے تو جواب ملا۔

خاتون... مال اور اولاد تو دنیا کی زینت ہیں۔
(پ ۱۵ ع ۱۸)

عبداللہ سمجھ گئے کہ قافلے میں خاتون کے
فرزند ہیں۔ خاتون سے دریافت کیا کہ میں آپ کے بیٹوں
کو کس نام سے پکاروں یا معلوم کروں۔

خاتون... "اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ اسلام کو بنا
لیا خاص دوست (پ ۵ ع ۱۵) پھر دوسری
آیت پڑھی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ اسلام سے خاص
طور پر کلام کیا پھر تیسری آیت پڑھی یا ان تینوں آیتوں
سے حضرت عبداللہ سمجھ گئے کہ خاتون کے تین لڑکے
ہیں ابراہیم موسیٰ یحییٰ آپ نے نام لے کر پکارا تو تین
حسین جوان دوڑے آئے۔

اس کے بعد جب سب کھانا کھانے لگے
تو عبداللہ بن مبارک کہنے لگے کہ میں اس وقت
تک کھانے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا جب تک آپ یہ

اپنی والدہ محترمہ کے حالات سے آگاہ نہ کریں گے۔
تو خاتون کا بیٹا بولا محترم یہ ہماری والدہ ہیں جنھوں
نے صرف اس ڈر سے کہ ان کی زبان سے کوئی غلط کلمہ
نہ نکل جائے چالیس سال سے آیاتِ قرآنی کے سوا ہر
قسم کی گفتگو سے اجتناب کیا ہوا ہے اور آج تک اسی

عہد پر قائم ہیں۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں
یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اور میری زبان سے صرف اتنا نکلا

اللہ اکبر

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

غزل
فراق گورکھپوری

رُکی رُکی سی شبِ ہجر ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہ گزر آئی

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے شباب کی دوشیزگی نکھر آئی
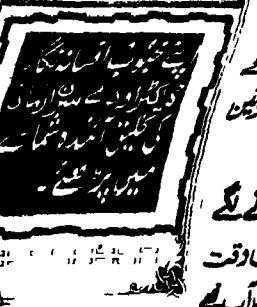
مرحوم نازش حیدری کی یاد میں
...م سخن کویت کے اہتمام میں ایک طرحی مشاعرہ
...صرعِ طرح بھی نازش حیدری صاحب کا ہی تھا
...۔ ڈی۔ خان صاحب کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا
...ں کی صدارت کویت کے صحافی محمد یوسف صاحب
...فرمائی اور اسٹیج سیکریٹری کے فرائض پروفیسر
...ید قریشی صاحب سحر اکبرآبادی نے انجام دیئے
...فارت خانہ پاکستان کے لیبر اتاشی جناب جہانگیر
...ز اِس شعری تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے۔

تقریب کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے
...دا۔ اور نازش حیدری مرحوم کی نعتِ رسول
...یت کے مشہور نعت گو غلام نبی قادری صاحب
...ے اپنے مخصوص انداز میں پیش کی۔ نازش حیدری مرحوم
...ی نعت اور قادری صاحب کے لحن داؤدی نے
...امعین پر وجد طاری کر دیا۔

نازش حیدری کی شخصیت اور فنِ شعر پر
...طلاب صاحب آرزم نے مقالہ پڑھا جس میں انہوں
...ش مرحوم کی شاعری سے متعلق تحقیق کا حق
...یا۔ مقالہ بہت پسند کیا گیا۔ اور آرزم صاحب
کو خوب خوب سراہا گیا۔

نازش حیدری مرحوم کے مایہ ناز شاگرد پروفیسر فرید قریشی سحر صاحب نے اپنے مرحوم استاد کے کچھ ایسے خصوصی واقعات بیان کیے جو ابھی تک احاطۂ تحریر میں نہیں آئے تھے۔ سحر صاحب نے اپنے استاد کے متعدد بہترین اشعار بھی سنائے اور فرمایا کہ اُن کی موجودگی میں نازش حیدری سے اُن کے دو اشعار سن کر میرے دادا استاد خیام الہند حیدری دہلوی نے فرمایا تھا کہ جس کا جانشیں اُس کی زندگی میں ایسے استادی کے اشعار کہتا ہو۔ اُس کا استاد کیسے مر سکتا ہے۔ یہ دو اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

فریبِ وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے
وہاں بھی شمع جلا دو جہاں اُجالا ہے
میری نظر میں دھواں چشمِ سحر فن میں چراغ
نہ انجمن میں اندھیرا نہ انجمن میں چراغ

سحر صاحب فرمانے لگے کہ ایسے اشعار کہنے والے نازش حیدری بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

مشاعرے کے اختتام پر صدرِ مشاعرہ نے فرمایا کہ میں اخبار "جنگ" سے منسلک ہوں اور استاد نازش حیدری بھی "جنگ" کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم اپنے ایک ایسے ساتھی کی یاد تازہ کر رہے ہیں جو آج ہمارے درمیان نہیں ہے۔ آج کا یہ طرحی مشاعرہ حقیقتاً کویت کا بہترین یادگاری مشاعرہ ہے جس میں بہت ہی اشعار سننے کو ملے۔

مہمانِ خصوصی جناب جہانگیر آذر نے فرمایا کہ مجھے مرحوم نازش حیدری کا کلام خصوصی نشستوں اور کراچی کے مشاعروں میں سننے کا موقع ملا اور میرے اُن سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ مرحوم نیک طینت انسان تھے اور ہر ایک سے پیار، خلوص اور سادگی سے ملتے تھے۔ اپنے ہم عصروں کی قدر کرتے تھے۔ اُنہیں اس پر کبھی فخر نہیں ہوا کہ وہ ہند و پاک کے ایک مشہور اور بڑے شاعر ہیں۔ "صدیوں کا سفر" اُن کا مجموعۂ کلام قبولِ عام و خاص حاصل کر چکا ہے۔ مرحوم نے اپنی شاعری میں شاعری کے قدیم اور جدید تقاضوں کو بہتر انداز سے پورا کیا ہے۔

آخر میں ایم۔ ڈی۔ خان صاحبِ خانہ نے سامعین اور شعراء حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ جن کی

بہت اچھا کامیاب طرحی مشاعرہ کامیاب رہا اور کوبٹ
ں برسوں یاد رہے گا۔

طرحی مشاعرہ میں جن شعرا کرام نے طرحی
م سُنایا اُن کے اسمائے گرامی حسب ذیل
ب -

اُستاد قاسم امروہی عبدالمجید
ش. طاہر کیفی. عمر خطاب اِرم. باقی
مد پوری. عبدالستار عاصی. فرید
ریشی سحر اکبرآبادی. حامد کرتار پوری.
سرت جبیں زیبا. محمد حسین صدیقی.
یدار ناتھ کیدار. کمال اظہر.
نتر ساقی. خورشید ضیا.
نید میواتی. صلاح الدین عنبر فتحپوری.
ئد المجید نجم. فیاض درگ.
جسم عکاس. یعقوب ناز.
یش حیدرآبادی. رفیق راز.
طاف گوھری. افتخار شہزاد اعظمی.
باس قمر فتحپوری. عبدالحمید پروانہ.
ر. قیصر عالم صدیقی.

ہندوستان
کی
تاریخ میں
پہلی بار

دو روزہ کُل ہند سیمینار دلی اُردو اکادمی کے دفتر میں منعقد ہوا

۸/۷ فروری ۱۹۸۷ء کو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار "نئی تعلیمی پالیسی اور اُردو تدریس" کے موضوع پر دو روزہ کُل ہند سیمینار دلی اُردو اکاڈمی کے دفتر میں منعقد ہُوا جس میں مُلک کے نامور ماہرین تعلیم اور ادیبوں نے شرکت کی۔ اِس سیمینار کا مقصد نئی تعلیمی پالیسی میں اُردو اور اُردو تدریس کے مسائل پر غور و خوض اور اُردو کے جائز مقام کے یقین کی نشاندہی کرنا تھا۔

سیمینار کا پہلا اور اِفتتاحی اجلاس جناب سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں ساڑھے دس بجے شروع ہوا سیمینار کمیٹی کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سیمینار کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہُوئے کہا کہ اُردو والوں نے نئی تعلیمی پالیسی کا اپنے مطالبات کی روشنی میں اِحتساب نہیں کیا اور یہ سیمینار اِس لحاظ سے اہم ہے کہ ہم اپنے مطالبات کا احتساب کریں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہندوستانی سماج کثیر لسانی سماج ہے۔ ضروری ہے کہ شمالی ہندوستان میں سہ لسانی فارمولے کی تعبیر میں اب ہندی اور انگریزی کے بعد جنوبی ہند کی زبانوں کو جگہ دی جا رہی ہے۔ اُردو والے اِس کے بارے میں غور کریں۔ اُردو والوں کے لئے جنوبی ہند کی زبان کی شرط نہیں ہونی چاہیئے۔ اِس لئے کہ اُردو تو قومی یک جہتی کی زبان ہے۔ نوادوے اِسکولوں میں تیسری زبان شمالی ہند میں اُردو ہونی چاہیئے اُنہوں نے اُردو والوں سے یہ بھی کہا کہ دُوسری ریاستوں کی صوبائی اور علاقائی زبانیں بھی سیکھیں۔

جناب مُشتاق احمد نے "تعلیم بالغان اور اُردو" جناب ظفر پیامی نے "نئی تعلیمی پالیسی" پروفیسر باقر مہدی نے "تعلیمی پالیسی میں اُردو کی

بقیہ: بزمِ ادب اکبرا

ں طور پر یہ شعر لوگوں کو بیحد پسند آیا ؎
شام ڈھلے یہ سوچ کے بیٹھے ہم اپنی تصویر کے پاس
ساری غزلیں بیٹھی ہوں گی اپنے میر کے پاس
مُشاعرے کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر اختر
ری نے انتہائی باوقار انداز میں اپنا کلام پیش
موصوف نے کچھ قطعات سُنائے۔ اور دو
ں پڑھیں۔ اُن کے ہر ہر شعر پر غلغلۂ تحسین
ا رہا۔ خصوصًا اِس شعر پر تو اتنی داد ملی کہ
، اگر حاصلِ مُشاعرہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا ؎
محلوں جب بھی حُسن کی قیمت لکھی گئی
خونِ وفا سے مانگ کسی کی بھری گئی

پر۔ اور مسز ڈی۔ آر۔ یونیتھن نے "اُردو اسکول اور نظمِ تعلیمات" کے عنوانات پر اپنے خصوصی مقالے پیش کیے۔ جن میں مختلف تجاویز بھی تھیں اور حکومت سے کچھ مطالبات بھی۔

صدرِ جلسہ جناب سید حامد نے اقلیتوں کے لیے درس و تدریس کے آئینی تحفظات اور نئی تعلیمی پالیسی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ گرچہ نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کو تمام آئینی تحفظات فراہم کیے گئے ہیں، لیکن اُردو کو نظر انداز کرکے بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔

دوسرا اجلاس سہ پہر تین بجے سید حسین علی جعفری کی صدارت میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر ساجدہ زیدی نے "نئی تعلیمی پالیسی پس منظر اور پیش منظر"، جناب ابوالفیض سحر نے "نئی قومی تعلیمی پالیسی اور اقلیتیں"، اور "نئی تعلیمی پالیسی کا نفاذ اور اُردو اساتذہ کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے جناب صفدر نقوی نے مقالات پیش کیے اور کئی مفید مشورے دیے۔

۸ فروری کو تیسرا اجلاس جناب سید ہاشم علی وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں شروع ہوا۔ جناب سید ذیشان ہدایتی نے "نئی تعلیمی پالیسی اور اخلاقی قدریں" جناب آر۔ کے۔ شبیر وانی نے "سکنڈری اور سینیئر سکنڈری سطح پر نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اُردو کا مقام"، عنوانات سے اپنے بیش بہا مقالات پیش کیے۔

اور فہمیدہ بیگم ڈائریکٹر ترقی اُردو بورڈ نے "نئی تعلیمی پالیسی میں ترقی اُردو بورڈ کی ذمہ داریاں اور کردار" میں بورڈ کی کارگذاریوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا اور کہا کہ بورڈ وہ واحد ادارہ ہے جس نے مختلف مضامین کی کتابیں اُردو میں شائع کیں، بچوں کے ادب کا بھی بڑا ذخیرہ اُس نے شائع کیا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت عنوانِ ادب کی اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

کلمات میں تمام مقالوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ایک مشورہ دیا کہ اگر تمام مذاہب کی اخلاقی قدروں کو اُردو میں ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو قومی یکجہتی کو مزید مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔

چوتھا اور آخری اجلاس جناب آئی۔ کے۔ گجرال کی صدارت میں شروع ہوا۔ پروفیسر عبدالغنی نے "اُردو میں تعلیم پائے ہوئے اُمیدواروں کی ملازمت کا مسئلہ" جناب سید ہاشم علی نے "کالج اور یونیورسٹیوں کی سطح پر نئی تعلیمی پالیسی اور اُردو"، ڈاکٹر قاسم صدیقی نے "ٹیچرس ٹریننگ کالجوں میں اُردو زبان و ادب اور اُردو میڈیم اساتذہ کی ٹریننگ" اور ڈاکٹر محمد صابر نے "نئی تعلیمی پالیسی میں اُردو کی درسی کتب بشمول میڈیکل انجینیرنگ" کے عنوانات کے تحت اپنے قیمتی خیالات پیش کیے۔

آخر میں چند اہم تجاویز ایوان کی منظوری کے لیے پیش کی گئیں۔ نو تجویزیں مرکزی اور ریاستی سرکاروں کو عملی اقدام کے لیے ... بھیجی گئیں۔ اور پانچ قرار دادوں کا رُخ خود اُردو والوں کی طرف ہے کہ اپنی زبان کے تحفظ و بقا کے لیے اُن پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور نئی تعلیمی پالیسی سے وہ کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔

حکومت کو بھیجی جانے والی قرار دادوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ "نئی تعلیمی پالیسی" میں سب سے بڑی اقلیتی زبان اُردو کا ذکر ہونا چاہیے اور تیسری زبان کے طور پر مغربی ہندوستان کی زبانوں کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ دراصل اُردو کی قسمت پر ہے۔ ہندی علاقوں میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ اُردو کے لیے گنجائش نکالنی چاہیے تھی جبکہ وہاں مغربی ہندوستان کی زبانوں کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ سیمینار کی عام رائے یہ تھی کہ پہلے تیسری زبان کے طور پر کلاسیکی زبان کو شامل کرکے اُردو کے ساتھ بے انصافی کی جاتی رہی ہے اور اب جنوبی ہندوستان کی زبانوں کا تذکرہ کرکے اُردو کا راستہ بند کر دیا جائیگا اُردو والے تو جنوبی زبانوں کو آندھرا، کرناٹک وغیرہ میں پڑھیں گے ہی۔ نئی تعلیمی پالیسی اور نواودے اسکولوں میں ہندی علاقوں میں اُردو کی تعلیم کا خصوصی انتظام بہت ضروری ہے۔ جناب سید شریف الحسن نقوی سکریٹری اُردو اکادمی دلی کے شکریہ پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

> سیمینار کی عام رائے یہ تھی کہ پہلے تیسری زبان کے طور پر کلاسیکی زبان کو شامل کرکے اُردو کے ساتھ بے انصافی کی جاتی رہی ہے۔ اور اب جنوبی ہندوستان کی زبانوں کا تذکرہ کرکے اُردو کا راستہ بند کردیا جائے گا۔

بزمِ ادب اوبرا کی

کُل ہند مشاعرہ

آصف مسعود صدیقی

اوبرا (مرزاپور۔ یو۔پی) "بزم
دب" کے زیرِ اہتمام کلب نمبر ۲ کے سبزہ زار
دُلہن کی طرح آراستہ و پیراستہ وسیع و
ریض پنڈال میں تیسرا شاندار آل انڈیا مشاعرہ
نعقد ہُوا جس میں مُلک کے گوشے گوشے سے تشریف
ائے ہوئے اٹھارہ شعراء نے تیس ہزار سے زائد
سامعین کے ہجوم میں زبردست داد و تحسین کے
رمیان اپنا کلام سُنایا۔ مشاعرے کی صدارت
پی جنرل منیجر شری آر۔ سی۔ شرما نے فرمائی۔
وصوف نے اسٹیج کے وسط میں رکھی ہوئی ایک
ڑی سی رنگین شمع کو روشن کر کے مشاعرہ کی

کارروائی کا آغاز کیا۔ اُنہوں نے اپنی مختصر تقریر
میں اوبرا آئے ہوئے شعراء کا استقبال کیا
اور "بزمِ ادب" کو مشاعرے کے انعقاد کیلئے
مبارکباد دی۔ مشاعرے کا افتتاح مُلک کے نامور
شاعر ڈاکٹر اختر بستوی (لکچرر شعبۂ اُردو
گورکھپور یونیورسٹی) نے فرمایا۔ موصوف نے
جامع و بلیغ افتتاحی تقریر میں کہا کہ مشاعروں

کو اگر تفریح کا ذریعہ تسلیم کر لیا جائے تو اِس
حیثیت سے یہ آج کے دور میں ایک طرح کی سماجی
خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا کہ
تفریح کا معیار آج نہ صرف یہ کہ انتہائی پست
ہو چکا ہے بلکہ تفریح کے لئے ایسی صورتیں فروغ
پا رہی ہیں، جو ہلاکت آفرینی کا سبب ہیں۔ ایسے
ماحول میں مشاعرے صحت مند تفریح فراہم کر کے
معاشرے کی خدمت کر رہے ہیں ڈاکٹر اختر
بستوی نے مشاعروں کی ایک اور اہمیت یہ قرار
دی کہ آج جب کہ اُردو زبان کی تعلیم کے سوتے
خشک ہو رہے ہیں۔ اور معاش سے اس کا رشتہ
کٹ جانے کی وجہ سے اس کا چلن روز بروز کم ہوتا
جا رہا ہے۔ مشاعرے اُردو شاعری کی نغمگی و شیرینی
اور اُردو زبان کی خوبصورتی اور دلنواز الفاظ
عوام تک پہونچا کر اُردو کی بقا کے باب میں بھی
ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اختر
بستوی کی بصیرت افروز افتتاحی تقریر کے بعد
ہندوستان کے مشہور و معروف اناؤنسر
عمر قریشی صاحب نے مائکروفون سنبھالا
اور انتہائی دلربا انداز میں شعرائے کرام کو دعوتِ
سخن دینے کے سلسلے شروعات کی۔ انجم بارہ بنکوی
مائک پر تشریف لائے تو اُن کی غزل کا یہ شعر معنوی
طور پر مشاعرے کا بہت ہی خوبصورت آغاز
ثابت ہوا ؎

اپنے ہر ایک درد کو لفظوں میں ڈھال کر
کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر

نوجوان شاعر شکیل فراز نے دلنواز
ترنم کے ساتھ ایک دلکش غزل پیش کی جس کا یہ شعر
لوگوں کے دلوں کو چھو گیا ؎

دیوتا کی طرح پہلے خود تو بنو
پوجنے کے لئے دیویاں آئیں گی

سحر داندوی کی غزل بھی پسند کی گئی
اور اُن کے اِس شعر نے سامعین سے خاصی داد
وصول کی ؎

زندگی کو لوگوں نے کیا سے کیا بنا ڈالا
روپ ہے طوائف کا رنگ ہے دُلہن جیسے

مشاعروں کو اگر تفریح کا ذریعہ تسلیم کرلیا جائے تو اس حیثیت سے یہ آج کے دور میں ایک طرح کی سماجی خدمت انجام دے رہے ہیں تفریح کا معیار آج نہ صرف یہ کہ انتہائی پست ہو چکا ہے بلکہ [illegible]

مشاعرے صحت مند تفریح فراہم کرکے معاشرے کی خدمت کرتے ہیں

دہلی سے تشریف لائے ہوئے مشہور مزاحیہ شاعر ساغر خیامی نے کئی قطعات پڑھے اور کئی نظمیں پیش کیں۔ سامعین نے اُنہیں بھرپور داد سے نوازا۔ اُن کا یہ قطعہ بار بار پڑھوا گیا ؎

ہو رہٹ میر کوئی شعر نکالے یارب
مسندِ غالب و اقبال بچالے یارب
ایسی لگتی ہیں یہ جدت بھری غزلیں مجھ کو
جیسے لڑکی کوئی سر اپنا منڈالے یارب

مشہور نظم گو شاعر کامل شفیقی مائکروفون پر آئے تو پرزور تالیوں سے ان کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ اُنہوں نے مُلک کے موجودہ حالات کی عکاسی کرتے ہوئے کچھ قطعات سُنائے اور ایک نظم بعنوان "اکیسویں صدی" پڑھی۔ اُن کی نظم کا ایک بند پیش خدمت ہے ؎

جب امن کے محافظ خود بانٹتے ہوں خنجر
لہرائے کیوں نہ ہر سو پھر خون کا سمندر
نفرت کا بیج بو کر!
پردے میں شاخِ گل کے سویا ہے پھر کا
ہم خواب دیکھتے ہیں اکیسویں صدی کا

محترمہ انجم رہبر نعرہائے تحسین کے درمیان اپنا کلام پیش کرنے کے لیے سامعین کے رُوبرو تشریف لائیں۔ موصوفہ نے کئی غزلیں پڑھیں اور دو گیت سُنائے۔ ان کا سحر انگیز ترنم بھی لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا اور ان کے اشعار بھی سامعین کو مسحور کر گئے۔ درج ذیل شعر پر تو سُننے والے جھوم جھوم اُٹھے ؎

وہ آکے میرے گاؤں سے واپس بھی جاچکا!
مَیں تھی کہ اپنے گھر کو سجانے میں رہ گئی

مقبول و معروف مزاحیہ شاعر عادل لکھنوی نے کئی نظمیں سنائیں اور کافی دیر تک محفل کو قہقہہ زار بنائے رکھا۔ اُن کی نظمیں "نیا سال" اور "فاصلے" خصوصیت کے ساتھ پسند کی گئیں۔ حق کانپوری نے دو غزلیں پیش کیں اُن کے ترنم نے لوگوں کو بے خود کر دیا۔ موصوف کا یہ شعر بار بار پڑھوایا گیا ؎

ڈوب کر اُبھرنا تو آدمی کی فطرت ہے
اک چراغِ دل ہے جو بجھ کے جل نہیں سکتا

گگن بھارتی نے گرجدار آواز میں کچھ قطعات پڑھے اور ایک نظم "رام راج" سُنائی۔ اُردو کے متعلق اُن کا یہ قطعہ سامعین کو بیحد پسند آیا ؎

دعویٰ غلط نہیں ہے اُردو کے حامیوں کا
ہر سمت حکمراں ہے سحرِ زباں ہمارا
راکیش بھی خلا سے آواز دے رہا ہے
"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

محترمہ نسیم نکہت نے تحت اللفظ میں بھی متعدد اشعار سُنائے۔ اور ترنم سے بھی کئی غزلیں پڑھیں اُن کے درج ذیل شعر پر سُننے والوں نے خوب داد دی ؎

جواں بیٹی کو ڈولی نہ دے سکا مفلس
سرہانے قبر کے مہندی کی پتیاں رکھ کر

کمال جانشی نے ایک رنگین غزل کے ساتھ ترنم کا جادو جگایا۔ ان کی غزل کے اشعار نوجوانوں کو بہت پسند آئے۔ خصوصاً اس شعر پر انہوں نے کافی داد سمیٹی ؎

ڈوب جائے دل کی دھڑکن چھوٹ جائے شانترا
تیری آنکھوں کے دریا میں آج بڑی طغیانی ہے

موسیٰ مجروح نے بہت ہی ٹھہری ٹھہری آواز میں پہلے کچھ متفرق اشعار پڑھے اور پھر ایک غزل سُنائی۔ یہ شعر خاص طور پر پسند کیا گیا ؎

مَیں بکنے والی کوئی شے نہ تھا مگر پھر بھی
خرید لے گئی معصوم سی نظر کوئی

بشیر فاروقی نے شائستہ ترنم کے ساتھ ایک خوبصورت غزل پیش کی۔ مندرجہ ذیل شعر کی لوگوں نے جی کھول کر تعریف کی ؎

یہ ہمیں اہلِ محبت کا جگر ہے لوگو!
زخم کھا کر بھی جو قاتل کو دُعا دیتے ہیں

شاعر جمالی نے بہت سے متفرق اشعار سُنائے۔ اُنہیں ہر شعر پر داد ملی۔ بالخصوص یہ شعر بیحد سراہا گیا ؎

تم آسماں کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے

معراج فیض آبادی نے پہلے۔ کچھ اشعار تحت اللفظ پڑھے اور پھر ایک غزل ترنم سے پیش کی۔ اُن کے درج ذیل شعر نے سامعین سے زبردست خراجِ تحسین حاصل کیا ؎

ہماری نفرتوں کی آگ میں سب کچھ نہ جل جائے
کہ اس بستی میں ہم دونوں کو آئندہ بھی رہنا ہے

ڈاکٹر ساغر اعظمی مائکروفون پر تشریف لائے تو سامعین نے اُنہیں کم و بیش ایک گھنٹے تک واپس جانے نہیں دیا۔ "اور۔ اور" کا شور بلند ہوتا رہا اور وہ سحر انگیز ترنم کے ساتھ اشعار پڑھتے رہے۔ اُنہوں نے متعدد مطلع پڑھے کئی کئی غزلیں سُنائیں اور ایک گیت بھی نذرِ سامعین کیا اُن کے شعروں پر مسلسل داد و تحسین کی بارش ہوتی رہی

بقیہ ص ۱۵ پر

غزلیں

کام اکام تاریکی اور یہ سفر تنہا
میں پہنچ نہ پاؤں گا آج اپنے گھر تنہا
کس مکاں سے نکلی تھی میری صدا کی آواز
کوچہ کوچہ پھرتا ہوں اور در بدر تنہا
جرم خود نگاہی پر فیصلہ یہی ٹھہرا
بارِ زندگی ڈھونا اور عمر بھر تنہا
تیز دھوپ میں حالی سایہ سایہ اس کی یاد
زندگی گزرتی ہے جس کے نام پر تنہا

علیم اللہ حالی

تو مرا کوئی نہیں ہے تو پھر ایسا کیوں ہے
دل مرے نام سے آخر یہ دھڑکتا کیوں ہے
کیا ضروری ہے کہ ہر موڑ پہ تو مل جائے
ہم نے ہر راہ گزر پر تجھے ڈھونڈا کیوں ہے
کتنے رستے ہیں، کہ منزل کی طرف جاتے ہیں
میرے قدموں کے لئے ایک ہی رستہ کیوں ہے
ہم نے اک شخص کو سو طرح بھلانا چاہا
دل ابھی تک اسے بھولا نہیں ایسا کیوں ہے
کیا نسیم اپنے خدوخال بھلا بیٹھا ہے
آئینہ اس نے بسرے سامنے رکھا کیوں ہے

نسیم نیازی

سنگ رسوائی کے سہ کر وار ہنستے کھیلتے
آگیا دیوانہ سوئے دار ہنستے کھیلتے
سر پہ تھا گو، زندگی کے کرب کا بارِ گراں
طے کر آئے ہم رہِ دشوار ہنستے کھیلتے
نیند راتوں کی گئی، دن کی فراغت بھی گئی
لگ گیا یہ دل کو کیا آزار ہنستے کھیلتے
دل میں حسرت ہی رہی، وہ کاش ہم سے بھی کبھی
کھل کے ملتے، کرتے آنکھیں چار ہنستے کھیلتے
لگ گئی ہونٹوں پہ چپ کیوں ہوگئے دلتنگ وہ
کیوں نہیں اب مل کے باہم یار ہنستے کھیلتے
پھول تو گردھر بہاروں میں بھی اب کھلتے نہیں
رہتے ہیں ہر رت میں لیکن خار ہنستے کھیلتے

کندن لعل گردھر

طرف ہے اک مسلسل بے حسی
سنائیں داستانِ زندگی
ہزنوں سے مل گئے رہبر تو پھر
یسے رہبر اور کیسی رہبری
یسے تاریکی میں ڈوبیں کشتیاں
ہے ایسی کیفیت میں مفلسی
دل اب زندگی کی راہ میں
ہے ہیں دھجیاں اخلاص کی
یکھ کر چوروں کے ہاتھوں میں دیئے
آئی شاعرِ شیراز کی
زمانہ آئے گا آزاد پھر
ہر میں تسلیم ہوگی شاعری

آزاد بہادل پوری

हिन्दी अकादमी, दिल्ली

ए-२६/२७, सनलाइट इंश्योरेंस बिल्डिंग, आसफ अली रोड,
नई दिल्ली-११०००२

ہندی اکادمی دلّی

اکادمی کی اہم خدمات اور نتائج

اعزازات ۔ انعامات ۔ وظائف اور مالی امداد وغیرہ وغیرہ

ادیبوں کو اعزازات: گیارہ ادیبوں کو اعزاز دیا گیا۔

ادبی نگارشات پر انعامات: پچیس تخلیقات پر انعام دیا گیا۔

ابھرتے ہوئے قلمکاروں: ستائیس ابھرتے ہوئے قلمکاروں کے لئے انعامی مقابلے ناؤ کو انعام دیا گیا۔

وظائف: ریسرچ اسکالروں کے لئے { دلّی کے ادب / لوک ادب پر دس ہزار روپے ہر سال }

ادیبوں کی مالی معاونت: پندرہ ادیبوں یا ان کے پسماندگان کو مالی امداد دی گئی۔

طالب علموں کو انعامات: چوراہ طالب علموں کو انعامات دیئے گئے۔

چھوٹے اخبارات ورسائل کو پروتساہن

بچوں کے لئے دلکش ادب کو پروتساہن

یُوا پرتبھاؤں کی کھوج ● پرکاشن سہیوگ: پندرہ تخلیقات پر

ادبی مذاکرے۔ سیمنار، مباحثے کوی سمیلن وغیرہ

تعلیمی سیمنار۔ ترجمہ سیمنار۔ آچاریہ ہزاری پرساد دویدی سیمنار بھارتیندو سیمنار ڈاکٹر راجندر پرساد جنم شتابدی اجلاس ہندی ٹیچرس کانفرنس سنسکرت سیمنار ہندی زبان کے کارکنوں کی کانفرنس ہندی اور قومی یکجہتی وچار گوشٹھی ساہتیہ اور سوہارد سنگوشٹھی بھاشا بھارتی یوجنا کے تحت لسانی وجذباتی یکجہتی اور ساہیرد ایک سوہارد کے پوشن اور وکاس کے لئے کاریہ کرموں کا آیوجن ماسک ساہتکی کاریہ کرم ہندی دوسے اور پکھواڑے کا آیوجن ہندی کے بیس بسنت (۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۵ء تک کی مدّت کے لئے ۲ یومیہ اجلاس کوی سمیلنوں کا آیوجن) یوم جمہوریت پر (قومی کوی سمیلن کے علاوہ راشٹریہ ایکتا وچیتنا کے سلسلے میں ایکتا کے سور چیتنا کے سور اور بند نل کے سور عنوانات پر اہم کوی سمیلن) نئے اور نوجوان پرتبھاوان کویوں کے لئے ابھرتے سور کوی پنج راشٹر کوی میتھلی شرن گپت جنم شتابدی سمارہ کے موقع پر راشٹر کوی سمیلن سے انٹرویو اور موضوعاتی مباحثے۔

پستکالیہ و پرکاشن

حوالہ جاتی کتب خانوں اور دار المطالعوں کا قیام۔ شعری انتخاب "سمپوتی کلش" نوجوان ادیبوں کی انعام یافتہ تخلیق "آگتی کرنیں" ہزاری پرساد دویدی سیمنار کا مجموعہ "ملوا درشن سمرتی سنکلن" دلّی ساہتیہ کاروں کی ڈائرکٹری "ہندی مینوئل" وغیرہ دیگر اہم۔

دیگر مختلف

ہندی کے پرچار پرسار کے لئے میلے ٹھیلے اور معاون پروگراموں کا آیوجن۔ بھاشا کاریہ شالاؤں (ورک شاپوں) کا آیوجن وغیرہ۔

ــــــــــــــــــــــــــ ڈاکٹر نارائن دت پالی وال

سکریٹری ہندی اکیڈمی دلّی

۲۶/۲۷ سن لائٹ انشورنس بلڈنگ۔ آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ ٹیلیفون نمبر ۳۳۹۵۰۔

ہم جس تہذیب میں سانس لیتے ہیں اُسکے اُوپر کچھ اور اندر کچھ ہے یہ صورتِ حال مشرق میں بھی ہے اور مغرب میں بھی فرق فقط مختلف معاشروں کا ہے جنکی اقدار مختلف ہیں اس بار ان صفحات پر جو کہانی شائع کی جارہی ہے اُسکا تعلق مشرق سے ہے ہماری اطراف حقیقتاً ایسے کردار موجود ہیں اس کہانی میں ظاہر و باطن کے اسی فرق کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔

وہ اپنے خوابوں کی راکھ کرید رہی تھی کہ ایک چنگاری نے اسے جلا دیا

پہلی دلگداز تحریر اُردو ادب سے

الیاس احمد گدی

"وہ تمہیں مارتا تھا؟"

"پہلے مارتا پیٹتا تھا بی بی، پر بعد میں تو اتنا پیار کرتا تھا۔ اتنے آرام سے رکھتا تھا جیسے... جیسے"

مسز گپتا کے پاؤں دباتے دباتے کسی اچھی تشبیہ کی کھوج میں اُس کا غریب اور جاہل ذہن بھٹکنے لگا تو مسز گپتا نے سہارا دیا۔ "جیسے تمہارے صاحب اپنے کوٹ کے کالر میں پھول رکھتے ہیں"

دونوں عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

اُن کی بلوریں ہنسی سے جیسے پانی بھرے کانچ کے کٹورے بج اُٹھے۔ جون کی دہکتی دوپہر بڑی سہانی لگی۔ ویسے بھی گرم دوپہر میں جب ساری خلقت دھوپ اور لو سے پریشان حال اپنے ڈربوں میں دبکی ہوئی ہو۔ تو کوئی سرد کمرہ، کوئی آرام دہ بستر، کوئی ٹھنڈی ہوا اُگلتا ہوا پنکھا۔ اور سب سے بڑھ کر کوئی بے ضرر رفیق بڑا اچھا

لگتا ہے۔ یوں اُن کا آپس میں کوئی جوڑ نہ تھا مگر مسز گپتا رشیم بھی تو وہ ملکا دی۔

"لیکن اُس نے تمہیں چھوڑ کیوں دیا؟"

"اے بی بی، اُس نے کہاں چھوڑا، چھوڑا تو میں نے اُسے"

مسز گپتا ہنسیں۔

"بات ایک ہی ہے، آجکل تو یہ دستور سا ہو گیا ہے۔ کہ جب کوئی نوکری سے نکالا جانے لگتا ہے اور اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب برطرفی یقینی ہے تو اس سے پہلے وہ استعفیٰ دے دیتا ہے"

مگر یہ بات چندر بدن کی سمجھ سے اونچی تھی اس لئے چپ ہی۔۔۔ چندر بدن۔۔۔۔ پتہ نہیں یہ نام کس نے رکھا تھا لیکن اگر اس کی ماں نے رکھا ہوتا تو سنیچری یا انواری کے علاوہ کچھ نہ رکھتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ سوچ ہی نہ سکتی تھی، ہو سکتا ہے اُس آدمی نے یہ حسین نام اُسے بخشا ہو جس کے یہاں اُس کی ماں نوکر تھی۔ یہ بات بھی اُس نے سُنی تھی، کوئی ٹھیک نہیں کہ یہ بھی غلط ہو اور وہ ایک کے سے اُس کا باپ ہو ہی نہیں۔

چندر بدن۔۔۔۔ وہ سچ مچ چندر بدن تھی اگر ان روز روز کے سائنسی انکشافوں سے ذرا سی چشم پوشی کی جا سکے تو یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ چاند کے ایک ٹکڑے کو عورت کے روپ میں ڈھال کر اُسے پیدا کیا گیا تھا۔ مگر یہ بات اُس دور کی ہے جب اُس کا بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اب تو وہ ایسی لگتی ہے جیسے دہکتے ہوئے انگارے بجھنے کے بعد بدرنگ راکھ رہ جاتی ہے۔ راکھ جو اُس کے چہرے پر اُڑ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اور سارے بدن پر بکھر گئی تھی۔

لیکن چندر بدن کو نہ پہلے کا احساس ہے کہ وہ کتنی سُندر تھی۔ نہ اب کا کہ وہ کیا ہو گئی ہے اُسے تو صرف مسز گپتا پر رشک آتا ہے۔ کیا بدن ہے ہاتھ لگاؤ تو معلوم ہو کہ مکھن کی بنی ہے۔ چہرہ ایسا کہ بڑے کمرے میں جتنے کلینڈر لگے ہیں سب اُس کے آگے مات ہیں۔ دوپہر میں نہا کر بڑے تکیے پر بال بکھیر کر سوتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ساون بھادوں آگیا ہو۔ پھر بول چال کی اتنی اچھی کہ کسی سے ناک چڑھا کر نہیں بولتی۔ خود وہ کبھی کبھی بھول جاتی ہے کہ وہ اس گھر کی نوکرانی ہے، ہر دم یوں ہنستی رہتی ہے جیسے سرسوتی کا اوتار ہو، پتہ نہیں اُس کے ماں باپ نے کون سے کرم کئے تھے کہ پتی بھی ایسا ملا کہ پاؤں دھو کر پیو تو تینوں لوک تر جائیں کبھی دونوں کو جھگڑتے نہیں دیکھا۔۔۔ سیتا رام کی جوڑی۔۔۔۔۔

"خیر اب بات تو ہے بی بی۔ کون کلنکی چاہے گی کہ اپنے بیاہتا کو چھوڑ دے۔ پر وہ بڑا بد ذات تھا"

"اور تمہاری ذات؟" مسز گپتا نے کسی قدر طنز سے کہا۔

"میری ذات جو بھی ہے بی بی۔ پر میرا دھرم بھی تو ہے"

دھرم۔۔۔۔ دھرم۔۔۔۔ دھرم۔۔۔۔

عقل مند لوگوں نے بے وقوف لوگوں کے دروازوں پر لکشمن ریکھائیں کھینچ دی ہیں۔ کہ کوئی اس حد سے آگے نہ جائے۔ الفاظ گھڑے گئے ہیں جو سرکس کے رنگ ماسٹر کے ہنٹر کی طرح الیکٹرک کرنٹ سے لیس ہیں کہ ذرا سا آگے کر دو تو بڑے بڑے خوں خوار شیر مُنہ پھیر کر پالتو کتوں کی طرح دُم ہلانے لگیں۔

گرم دوپہر کی کسلمندی، جوڑ جوڑ کا میٹھا درد کہ جس کے بارے میں ایک دور اُفتادہ گاؤں کے لوک گیت کا ایک مصرعہ اُس کے ذہن میں بار بار اُٹھتا ہے۔

"رس رس دُکھے بدلوا ہے ننادی۔
اپنے سیّاں کے بلاوا۔۔۔۔"

رس رس بدن دُکھنا، جیسے جسم کی ایک ایک رگ، ایک ایک ریشہ اپنے دُکھتے ہوئے وجود کے چھوئے جانے کا منتظر ہو، لیکن ننّد کا وہ بھائی کمبخت ایس، کے، گپتا۔۔۔۔ اُسے تو کچھ بھی نہیں معلوم، اُسے دُنیا میں صرف ایک چیز چاہیے۔۔۔۔ دولت چاہیے جس طرح آئے، جس راستے سے آئے۔ جس قیمت پر آئے۔ اُسے تو وہ اتنا ہی سمجھتا ہے۔ جتنا اپنے کوٹ کے کالر میں لگے پھول کو، ایک ایسی چیز جو اُس کی آرائش یا امارت کا ایک جز ہو۔۔۔۔ جب کوئی کہتا ہے "او مسٹر گپتا! تمہاری بیوی تو اتنی خوبصورت ہے کہ زمین پر ایسی خوبصورتی کے امکان پر مشکل سے یقین آتا ہے"۔ تو وہ خوش ہو جاتا ہے، انگریزی شرابوں سے بہکے ہوئے چہرے پر ایکدم سے سُرخی جھلکنے لگتی ہے۔ "ہاں صاحب وہ تو بھگوان کا انعام ہے"، وہ خوش اخلاقی سے کہتا ہے۔

جب وہ چھوٹی سی تھی تو سانپ اور سیڑھی کا لوڈو کھیلا کرتی تھی، یہاں بھی وہی بساط بچھی ہوئی ہے، مسٹر گپتا چاہتا ہے کہ وہ جلد سے جلد سیڑھی پر چڑھتا جائے۔ اُسے اِن سانپوں کا بھی احساس ہے جو لگل کر وہیں نشیب میں پھر پہنچا دیتے ہیں۔ اسی لئے ایسے سانپوں سے وہ بچتا ہے۔ اور کبھی کبھی ان کو خوش کر کے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔

سانپ۔۔۔۔ سانپ۔۔۔۔ سانپ۔۔۔

اسے سانپوں سے بڑا ڈر لگتا ہے کبھی کبھی وہ محسوس کرتی ہے جیسے اس کے چاروں طرف اَن گنت سانپ بکھرے پڑے ہیں۔ جو اس کے سارے جسم کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ اور ان کا زہر اس کے رگ وپے میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اور یہ اس کا شوہر مسٹر گپتا ہے جو اُس کو سانپوں کے نرغے میں پھنسا دیکھ کر بھی محض سیڑھیوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

"سُنا ہے تو نے تم نے اپنے لئے پسند کیا تھا۔ شادی سے پہلے دیکھا بھی تھا۔۔۔؟" وہ تمام سانپوں کو جھٹک کر پھر اُسی گھر کی خاموشی اور پُرسکون دوپہر میں لوٹ آئی۔

"یہی تو مجھ سے بھول ہوئی، اُس کی چمک دمک دیکھ کر سمجھی کہ سونا ہے۔ مگر جب وہ ہاتھ آیا تو پتہ چلا کہ وہ پیتل ہے"

"ہاں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے چندر ڈارلنگ۔۔۔" وہ کسی قدر طعن سے مذاق اُڑانے کے انداز میں بولی "عشق کا انجام ہمیشہ ایسا ہی دردناک بلکہ ہولناک ہوتا ہے۔ صبر کرو!۔۔۔"

"بی بی! وہ آیا تو ایسا چھیل چھبیلا لگتا تھا جیسے کوئی بڑا بابو ہو۔ وہ چمچم سوٹ بوٹ کسے بُو چھوٹ مت۔ مجھے دیکھا تو لٹو ہو گیا۔ دو چار بار پھیرے چھالڑ کی، مگر میں نے گھاس نہ ڈالی، اس لئے اُس نے ماں سے کہا۔ میری ماں نے جو پہلے کئی برس سے مجھے دُنیا کا سب سے بڑا بوجھ سمجھ رہی تھی، فوراً ہامی بھر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری شادی ہو گئی۔"

غریب آدمی کی شادی کا کیا، جیسے گڈے گڑیا کا بیاہ، آٹھ دس آدمیوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ پنڈتوں نے چند اشلوک پڑھے اور بس بیاہ ہو گیا۔" اُس نے سوچا لیکن اُس کے اپنے بیاہ میں تو کافی ہنگامے ہوئے تھے، ڈھول باجے گاجے۔ دُور دراز کے مہمان، شہر کے معززین کی دعوت۔ آتش بازیاں، بے شمار رنگ برنگے بلب، اَن گنت ٹیوب لائٹیں۔

نہیں، وہ بہت بڑے گھرانے کی لڑکی نہیں تھی۔ بلکہ متوسط طبقے سے متعلق تھی جہاں ہوتا کچھ نہیں ہے ... صرف بھرم ہوتا ہے۔ اسی بھرم کو قائم رکھنے کے لئے اتنے اہتمام کئے گئے تھے۔ کیونکہ اس کا شوہر بہت بڑا ٹھیکیدار تھا، لاکھوں کا آدمی تھا۔ اس کی سطح تک پہونچنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ حالانکہ اس کچھ نہ کچھ کرنے کی دیوانگی نے بعد میں بہت رُسوا کیا، قرض کا کھیل آخر رنگ لایا، سود کے سانپ نے اُس کے باپ کو نگل کر بہت نیچے پھینک دیا ... اتنا نیچے کہ آخر اُس کو بیٹی کے یہاں پناہ لینی پڑی، وہ بھائی کبھی جو اُس کی شادی کے موقعہ پر اس طرح چھاتی پھلائے پھر رہا تھا جیسے اسی کی کمائی سے یہ سب کچھ ہو رہا ہو، آخر اُسی کے یہاں چھوٹے چھوٹے ٹھیکوں کا انتظام سنبھالنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"ہوا یہ بی بی کہ بیاہ کے بعد جب میں اُس کے گھر گئی تو دیکھا کہ کچھ نہیں ہے۔" چندر بدن نے جو اُس کے خیالوں سے ناواقف تھی، اپنی بات کا سلسلہ جوڑا۔ "میاں جی کوئی کام دھندا کرتے نہیں تھے وہ دن بھر چارپائی توڑتے، شام ہوتی تو اپنے اکلوتے کپڑوں کو سجا کر بازار نکل پڑتے۔ رات گئے لوٹتے، آنکھیں چڑھی ہوئی، سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آتے۔ شروع شروع میں تو مجھے پتہ ہی نہ چلا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نشہ بھی کرتے ہیں۔ ان ہی دنوں اُن کا ایک دوست کمل بابو ہمارے یہاں بہت زیادہ آنے جانے لگا، وہ جب بھی آتا کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتا .... پیسے والا تھا ... صورت شکل کا بھی اچھا تھا، پر اُس کے لچھن اچھے نہیں تھے۔ دیکھتا ایسا تھا جیسے کھا جائے گا، پھر کبھی کبھی کوئی چیز لیتے دیتے ہاتھ پکڑ لیتا۔ ایک آدھ بار ہنسی مذاق میں دھر پکڑ بھی کر لی، ایک رات جب میں نے اُن سے کہا تو وہ اُلٹا مجھے ڈانٹنے لگے۔ "بڑی آئی سیتا ساوتری، وہاں اپنے مالک کے ٹکڑے سے نہیں چھپی ہوئی تھی!"

میں ایکدم اَنگارہ سی دَہک گئی

"منہ سنبھال کر بات کرو، اپنی ماں بہنوں کی طرح مجھے بھی سمجھا ہے۔"

میری بات پر وہ تاؤ کھا گیا۔ لے کے مجھے مارنا شروع کیا، تو اتنا مارا، اتنا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔"

"اور تو نے کچھ نہیں کہا۔" مسز گپتا نے کروٹ بدل کر کہا۔

"میں کیا کرتی ... مرد کے آگے بس چلتا ہے؟"

مرد کے آگے بس چلتا ہے ... عورت کی اَزلی مجبوری اور مرد کی جابرانہ فطرت ...... صدیوں کو اپنے اندر سمیٹ کر بھی خونیں لمحہ اپنی جگہ آج بھی موجود ہے۔ ہزاروں، لاکھوں سال کا سفر کر کے بھی عورت اُسی مقام پر کھڑی ہے۔ اور جبر و تشدد پر صرف رو سکتی ہے، اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا سکتی ہے، پھر نہیں سکتی۔

"بی بی! اسی بے ہوشی میں میری عزت لُٹ گئی۔"

مسز گپتا کو جھٹکا سا لگا، جیسے بجلی کا ننگا تار ہاتھ سے چھو گیا ہو، ایک لمحے کے لئے وہ مضطرب ہو گئی، بے چینی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور اپنا ایک نازک بازو اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔

وہ سنگ مرمر سے تراشے ہوئے اُس نرم نازک بازو کو دھیرے دھیرے دبانے لگی، بھگوان بھی بڑا ظالم ہے، کسی کو اتنا بھی نہیں دیتا کہ وہ جی سکے خود یہ اُس کی مالکن مسز گپتا ..... کیا نہیں ہے اُس کے پاس؟ روپے پیسے کی وہ ریل پیل، کہ سات پشت نہ کمائے جب بھی بیٹھ کر نہ کھائے۔ گاڑی، بنگلہ، سینکڑوں ساڑیاں، کہ دیکھو تو آنکھ نہیں ٹھہرے، قیمت اِتنی کہ ایک ساڑی میں میری جیسی عورت کی ساری زندگی کی ساڑیوں کا حساب برابر ہو جائے۔ بی بی! اگر کسی کو اشارہ کر دیں تو اپنے پیروں چل کر چلی آئے۔ پھر پتی دیکھو تو دیوتا سمان کیا ساری خوشی بھگوان کو ایک ہی آدمی کو دینی تھی۔ میں نے ایسا کون سا پاپ کیا تھا، یا اُس نے ایسا کون سا پُن کیا ہے ... لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بھاگوں کی بات ہے، مگر میں پوچھتی ہوں یہ بھاگ کون لکھتا ہے؟

"پھر کیا اُسے چھوڑ دیا؟" مسز گپتا نے اُسے بہت دیر تک چپ دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں بی بی ... اُس کے بعد وہ ہر ہفتے دس روز میں ایک آدمی کو پکڑے آتا، شروع شروع میں میں نے بہت فیل مچایا، تب وہ مجھے روز مارتا گالیاں دیتا، تین تین دن گھر میں بند کر دیتا اور نہ کھانا دیتا نہ پانی۔ آخر تھک کر ہار مان لی۔"

تو گویا ... تو گویا ..... وہ ...

چھناک سے جیسے کوئی شیشے کا برتن کسی کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جائے اور وہ سکتے میں کھڑا رہ جائے، ویسے ہی مسز گپتا چونک سی گئی ...

"پیشہ ..."

یہ کیسا انجانا اور عجیب لفظ ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟

کس نے اسے پیدا کیا؟ پھر کس نے سب سے پہلے استعمال کیا؟ دُنیا کی کتنی عورتیں ہیں جو اس لفظ کے سہارے زندہ ہیں اور کتنی عورتیں ہیں جو اس لفظ کی صلیب پر ٹھونکی

ہیں۔ میں اِن تمام سوالوں کے جواب کس سے
مانگوں ؟
گھبرا کر اُس نے اپنا دُوسرا بازُو اُس کے
اندھے پر رکھ دیا جیسے وہ اسی میکانکی انداز سے
بانے لگی۔
" عجیب عجیب مرد آتے بی بی۔ کسی کے منہ
سے سڑاند نکل رہی ہوتی۔ کوئی ٹی بی دِق کے مریض
طرح پھونک دو تو اُڑ جائے۔ کوئی اِتنی بڑی
وندلے کر آتا کہ جی چاہتا اِسی پر سر رکھ کر سو جاؤں "
وہ ہنسی تو مسز گپتا بھی ہنس دی۔
" چلو اچھا دِن کٹ جاتا ہوگا" مسز گپتا
نے کہا:
" اچھا دِن بی بی ؟ میرے پر ہوتے تو میں
اُڑ جاتی۔ ہمیشہ ہر وقت ایسا لگتا ہے جیسے کوئی
گندگی میرے کپڑوں میں لگی ہوئی ہے۔ جس سے
بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے ہیں ... حالانکہ میرے کپڑے
پڑے رِیشم کے تھے "
" پھر تو نے کیا کیا ؟ بھائی، کہانی کو تُو نے
ایسی جگہ لاکر کھڑا کر دیا ہے کہ اُلجھن سی ہونے لگی "
" اُلجھن کاہے کی بی بی۔ سیدھی سی بات ہے
میں اپنے گاہکوں کو خوش کر کے روپیہ دو روپیہ
لے لیتی تھی، یہی روپیہ میں سنبھال کر رکھتی گئی جب
میرے پاس ڈھیر سے پیسے ہو گئے تو ایک رات
میں نے اُس کے منہ پر تھوک دیا اور بھاگ آئی "
سہ پہر ڈھل گئی تھی، لُو کا زور کم ہوا تو
سڑک کا ٹریفک بھی بڑھ گیا، اِس ٹریفک کے شور
سے اندازہ کر کے مسز گپتا اُٹھ گئی، اُس نے اپنے بکھرے
ہوئے بالوں کو یکجا کیا اور غسل کرنے چل دی۔
ٹھنڈے پانی میں آدھ گھنٹہ غسل کرنے کے
بعد دوپہر کی کسلمندی جیسے بہہ سی گئی .... مسٹر
گپتا پچھلے چار دِن سے ایک بہت بڑے ٹھیکے کیلئے
سرگرداں تھے۔ زیادہ تر باہر رہتے، چند منٹ
کے لئے گھر آتے، پھر چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتے
اسی لئے وہ فی الحال فرصت سے تھی، وہ ویسے ہی
بال بکھیرے دوبارہ اپنی خوابگاہ میں آکر لیٹ
گئی، اور ایک فلمی میگزین اُٹھا کر تصویریں دیکھنے
لگی .... چندر بدن کی کہانی کا ہلکا سا سرور ابھی تک
قائم تھا۔
شام کو مسٹر گپتا آئے تو اس کو تیار رہنے
کے لئے کہہ کر پھر کسی کام سے باہر چلے گئے۔
رات کے کوئی نو بجے مسٹر گپتا پھر واپس
ہوئے اور اُس کے بکھرے ہوئے بالوں کو پیار
سے چھو کر بولے ! ڈارلنگ تم ابھی تک تیار نہیں
ہوئیں ؟" "کہیں چلنا ہے .؟" اُس نے سر گھما کر اپنے
شوہر سے پوچھا۔
" ہاں ! بہت لمبا ہاتھ ہے، کام قریب قریب
ہو ہی چکا ہے۔ صرف ایک آدمی کو رام کرنا ہے "
رام کرنے کی بات پر وہ چونکی اُسے ایکدم
چندر بدن یاد آگئی،
" ہم رات کا کھانا وہیں کھائیں گے "
اور میں تمہارے لئے سیڑھی فراہم کروں
گی .... اُس نے تلخی سے سوچا، اور اچانک آپ سے
آپ ایکدم برہم ہو گئی .... "میں نہیں جاؤں گی"
اُس نے کہا۔
" کیوں !.... مسٹر گپتا کو آج اُمید کے خلاف
بات سُن کر حیرت ہوئی۔
" تم نے مجھے کیا سمجھا ہے میں تمہاری
بیوی ہوں "
اِس سے کس کمبخت نے اِنکار کیا ہے۔ مگر
ڈارلنگ سنو جو بڑا لمبا ہاتھ ہے "
" میں نہیں جاؤں گی "
" کیوں نہیں جاؤ گی ؟ میرے یہاں
کیا لنگر کھلا ہے کہ تمہارے بھائی بھتیجوں کو بھات
بٹ رہا ہے، اور تمہارے پتا جو نواب بنے پھرتے
ہیں .... کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ سب کچھ آسمان سے
ٹپکتا ہے یا میں نے روپے کا کوئی درخت
لگا رکھا ہے۔
اِس طرح جیسے کوئی بلیڈ اندر ہی اندر
دِل کے پرخچے اُڑاتا ہوا گزر جائے۔ یا جیسے ایک
چھناکے سے دِماغ کی تمام رگیں ٹوٹ جائیں، یا
جیسے کوئی لمحہ کسی دُوسرے لمحے کے ہاتھوں قتل
ہو جائے، یا جیسے کوئی اَبابیل کسی باز کی جھپٹ میں
آجائے۔ یا جیسے ....
اُس نے کوئی جواب نہیں دیا نفرت سے
غصّے سے اور اہانت سے وہ اِس آدمی کی طرف
دیکھتی رہی جو دراصل اُس کا شوہر تھا پھر اُس نے
ایسا محسوس کیا جیسے وہ ایک ذرا سی چڑیا ہو۔
جس کا ایک ایک پر رِیشمی دھاگوں سے کَسا ہوا ہو
کہ وہ ذرا سا بھی اُڑنا چاہے تو اُڑ نہ سکے...
اور چندر بدن ....!!!

بقیہ :- مُرَبّیِ بیار و مُرَبّہ بہ خور

کے پاس ہی کو اثر بنے تھے اُن میں ایک کو اشرالات
کر کے ضروری کاغذات میں دے دیئے۔ تو ڈپٹی
کمشنر کے ہیڈ کلرک کا فرمان یاد آگیا "مرّبی بیار و
مربّہ بخور" فرداً فرداً اگر اس مرّبی اعظم کے احسانات
کا ذکر کیا جائے تو کم و بیش ایک حد سے زائد ایسے
واقعات ہیں جن میں محض کنور مہندر سنگھ بیدی
سحر کی مربّیانہ کرم فرمائیوں کے دخل کے باعث
ہی مطلب براری ہوئی۔
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی یہ شانِ
مربّیانہ ہر کسی کے لئے بلا تخصیص مذہب و ملت
ہر وقت رواں دواں رہتی ہے ڈھونڈے
سے بھی کسی ایسے ایک شخص کو بھی تلاش نہیں
کر سکتے جو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے
یہاں کسی غرض سے گیا اور وہ بے نیل و مرام
آیا ہو۔ اکثر اوقات کنور صاحب نے اپنی اِس
شانِ مربّیانہ کو بروئے کار لاکر کمال کر دیا حالانکہ
وہ معاملہ اُن کے اپنے احاطۂ اختیار میں نہیں
ہوتا تھا۔
خدا اِس مربّیِ اعظم کو مدتوں ہم سب پر
سایہ فگن رکھے

ایتھوپیا کی لوک کہانی

انصاف

اپنی چند آوارہ بکریوں کو گلے میں واپس لانے کے لئے ایک عورت اُن کی تلاش میں نکلی بہت ڈھونڈا مگر کوئی بکری نظر نہ آئی۔ چلتے چلتے وہ سڑک کے کنارے آ پہنچی جہاں ایک بہرے آدمی نے آگ کا الاؤ روشن کر رکھا تھا اور اس کے قریب بیٹھا کافی کے کپ کی چسکیاں لے رہا تھا۔ عورت کو اس کی کیا خبر تھی کہ وہ بہرہ ہے پوچھنے لگی۔ "آپ نے میری بکریوں کو تو نہیں دیکھا ؟"۔ بہرے آدمی نے سوچا شاید وہ پانی کے بارے میں پوچھ رہی ہے، اس لئے دریا کی طرف اشارہ کر دیا۔ عورت نے شکریہ ادا کیا اور دریا کی جانب ہولی۔ وہاں خوش قسمتی سے اُسے ساری بکریاں مل گئیں۔ البتہ ایک میمنہ چٹانوں سے گر کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا تھا اس نے میمنے کو گود میں بھر لیا اور بکریوں کو ہانکتی ہوئی واپس ہولی۔ سڑک کے کنارے پہنچ کر اس نے بہرے آدمی کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور زخمی میمنہ تحفتاً پیش کرنا چاہا مگر بہرا آدمی اُس کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا بلکہ جب عورت نے زخمی میمنہ اُس کی طرف بڑھایا تو وہ سمجھا کہ وہ اُسے اُس کے زخمی ہونے کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہے۔ اِس خیال سے وہ طیش میں آگیا — "مجھے کیا پتہ اسے کیا ہوا ہے؟" عورت نے جواب دیا۔ "لیکن آپ نے مجھے صحیح جگہ دکھائی تھی"۔ بہرہ آدمی کہنے لگا . . .

"بکریوں کے ساتھ تو ایسے حادثے پیش آتے ہی رہتے ہیں۔" عورت کہنے لگی"۔ میں نے اپنی تمام بکریاں وہیں پائیں جس طرف آپ نے اشارہ کیا تھا — "بہرہ آدمی چیخ پڑا۔ اس اثنا میں سڑک پر آنے جانے والے کچھ لوگ ان کا جھگڑا سُننے کے لئے کھڑے ہو گئے عورت انھیں بتانے لگی۔ "میں اپنی بکریاں ڈھونڈ رہی تھی۔ اس شخص نے صحیح جگہ کی نشاندہی کی۔ اب یہ میمنہ اسے تحفے کے طور پر دینا چاہتی ہوں"۔

بہرے آدمی کا اشتعال بڑھ گیا۔ وہ عورت کے چہرے پر تھپڑ جماتے ہوئے چیخا "تم میری توہین کر رہی ہو۔ میں نے اُس کی ٹانگ نہیں توڑی"۔ عورت حیران رہ گئی۔ اُس نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اب تم میرے گواہ رہنا اُس نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ میں اُسے منصف کے روبرو لے کر جاؤں گی"۔ اور پھر میمنے کو بازوؤں میں سمیٹے عورت، بہرہ آدمی اور تماشائی منصف کے گھر پہنچے۔ منصف اُن کی بات سُننے کے لئے اپنے گھر سے باہر آیا۔ پہلے عورت نے اپنا قصّہ بیان کیا پھر بہرے آدمی نے . . . اور پھر فرداً فرداً عینی شاہدوں نے بیانات دیئے۔ اِس تمام عرصے میں منصف پُرخیال انداز میں سر ہلاتا رہا کیونکہ وہ نہ صرف بہرے آدمی کے مقابلے میں بھی کچھ زیادہ بہرہ تھا بلکہ اُس کی بصارت بھی کمزور تھی۔

بالآخر اُس نے اپنا ہاتھ بلند کیا خاموشی چھا گئی اور اُس نے اپنا فیصلہ دیا۔

"ایسے لوگ شہنشاہ اور مذہب کے لئے باعثِ ننگ ہیں۔" اُس نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا۔ پھر بہرے مرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم اسی وقت سے اپنی بیوی کے ساتھ اپنا رویہ درست کر لو"۔ پھر عورت کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ جو بازوؤں میں زخمی میمنہ لئے ہوئے تھی"۔ اور تم سست روی اور کاہلی چھوڑ دو اور اپنے شوہر کے کھانے پینے میں غفلت اور درست کرو"۔ پھر بڑی نرمی سے میمنے پر نظریں جما دیں"۔ جہاں تک اِس معصوم بچے کا تعلق ہے! کرے یہ بڑا ہو کر تم دونوں کے لئے باعث رحمت ثابت ہو"۔ مجمع چھٹ گیا اور اپنی اپنی راہوں پر ہو لئے!

"آہ! کیا خوب فیصلہ ہوا۔" دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ اگر نہ ہوتا تو ہم یہ کیسے اندازہ لگا سکتے ہمارے ساتھ انصاف کیا گیا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ملک کے بعد جب
لی کو اپنا مسکن بنالیا تو "شانِ ہند" کی حیات
نیہ کی فکر دامن گیر ہوئی چنانچہ ڈسٹرکٹ
سٹریٹ کے دفتر سے معلومات حاصل کیں کہ
ہیں کسی اخبار یا رسالہ کا ڈیکلریشن داخل
نے کا کیا طریقہ ہے۔

آپ کو سب کارروائی نئے سرے سے کرنی
ہوگی۔ اور جب آپ کو اشاعت کی باقاعدہ
اجازت مل جائے تب ہی آپ یہاں سے اخبا
کی اشاعت شروع کر سکتے ہیں۔
ہیڈ کلرک نے کافی تیز رفتاری سے وہ
طریقے بتائے، جن کی تکمیل کے بعد ہی مطلب

مطلب جاؤں کہ اگر مربہ کھانا ہے تو کسی
مربی کو لاؤ۔ ہیڈ کلرک نے "مربی بیار و مربہ
بخور" کچھ اس ادائے کافرانہ سے کہا کہ میری
زبان کو بہ یک وقت کئی قسم کے مربہ جات کی خوشبو
بھری مٹھاس کا احساس ہونے لگا۔ اور فوری
طور پر دماغ میں یہ خیال آیا کہ ملتان میں دلی کے

مُربّی بیار و مُربّہ بخور

شخصیات، واقعات، تأثرات،

دفتر کے ہیڈ کلرک جو کافی تجربہ کار اور
س دلی والے تھے، فرمانے لگے صاحب
وجی صاحبان کے لئے جہاں حکومت
سہولتیں دے رکھی ہیں۔ وہاں
کے اجرا کے سلسلے میں ڈیکلریشن
نے کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں
شک آپ کا اخبار ملتان (پاکستان
یم ملک کے وقت شائع ہوتا تھا (اس
ان ہند ہفت روزہ تھا۔) مگر اب
دوسرے ملک میں ہیں اور یہاں

باری ہو سکتی تھی۔ پھر گذارش کی کہ سی۔ آئی۔
ڈی کی رپورٹ کیسے ہو سکے گی۔ کیونکہ مجھے
بہ حیثیت رفیوجی آس پاس کا کوئی مقامی یا
غیر مقامی شخص جانتا ہی نہیں تو وہ میرے
بابت کسی سے کیا پوچھ سکیں گے اور میری بابت
کیا تصدیق کر سکیں گے۔ ہیڈ کلرک زیرِ لب
مسکراتے ہوئے کہنے لگے بھائی اس کے دو
طریقے ہیں، پولیس کو نذرانہ پیش کیجیے اور یا
پھر "مربی بیار و مربہ بخور" اس کے ساتھ ہی
کہنے لگے شاید تمہیں فارسی نہ آتی ہو تو اس کا

بٹی مجسٹریٹ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی بہت
تعریف سنی تھی کہ وہ ہر کسی کی مدد کرتے ہیں۔
لہٰذا ان تک رسائی کا کوئی وسیلا تلاش کیا جائے
اور اگر وہ درخواست پر تصدیق فرمادیں تو پھر
سی۔ آئی۔ ڈی کی تحقیقات سے نجات مل جائے
گی۔ چنانچہ ہیڈ کلرک سے احتیاطاً دریافت
کیا کہ اگر دلی کے سٹی مجسٹریٹ کنور مہندر سنگھ
بیدی سحر درخواست پر تصدیق فرمادیں تو کیا
سی۔ آئی۔ ڈی۔ کی تحقیقات کی پھر بھی ضرورت
رہے گی؟ ہیڈ کلرک نے یقین دلاتے ہوئے

کہا کہ اگر کنور صاحب آپ کی تصدیق فرما دیں گے۔ تو پھر ایک ہفتہ میں آپ کو اخبار جاری کرنے کی اجازت مل جائے گی۔

میں ذاتی طور پر کسی طرح بھی کنور صاحب سے واقفیت نہ رکھتا تھا۔ چاندنی چوک سے کوئی ہندو وکیل ایک ماہنامہ شائع کرتے تھے۔ اُس ماہنامہ میں سحر صاحب کی غزل اور تصویر میری نظر سے گزری تھی۔

چنانچہ دوسرے دن درخواست جیب میں رکھ کر پوچھتا پوچھتا بیلے ورڈ پر واقع کنور صاحب کی سرکاری رہائش گاہ تلاش کی تو وہاں ہجوم غفیر تھا زیادہ تر تعداد اُن مسلمانوں کی تھی جو ہمایوں کے مقبرے میں مقیم تھے۔ اور پاکستان جانا چاہتے تھے۔ کنور صاحب کی کوٹھی پر موجود کئی حضرات آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ حالیہ افراتفری اور غارت گری میں کنور صاحب نے مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے۔ اگر اللہ میاں کے ہاں اس کا کوئی حساب کتاب ہے تو پھر اس معاملے میں شاید ہی کوئی ان کا ہم پلہ ہو سکے گا۔ اور ایسی حالت میں جب کہ تقسیم ملک کے ہڑبونگ میں پاکستانی مسلمانوں نے وہاں کے سکھوں کو اور ہندوستانی پنجاب کے سکھوں نے مسلمانوں کو اپنا اپنا شکار سمجھا۔ اور مذہبی جنون کا پورا پورا حیوانی ثبوت دیا۔ مگر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بابا گورو نانک دیو جی مہاراج کی اولاد ہونے کا ثبوت دیا کہ جو بھی مسلمان اُن کی پناہ میں آیا یا جس نے جو بھی مدد طلب کی کنور صاحب نے ایک صحیح گورو کا سکھ ہونے کے ناطے اپنے فرض کو خوب نبھایا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کنور صاحب کی ان خدمات نیز ان کا مذہبی تعصب سے لاکھوں کوس دور ہونے کے باعث ہندوستان اور پاکستان کا ہر مسلمان انھیں اپنا مربی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ ڈھاکہ فال کے موقع پر پاکستانی فوج کے نوّے ہزار افراد جب جنگی قیدی بنا کے مختلف ملٹری کیمپوں میں رکھے گئے تو ہماری حکومت نے کچھ مقررین کو ان ملٹری کیمپوں میں تقاریر کے لئے بھجوایا تو ان پاکستانی مسلمان جنگی قیدیوں نے ہماری حکومت کے افسران سے کہا کہ ہمارے ہاں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو تقاریر کے لئے بھجوائیے کیونکہ ہم سب اُن کو اپنا مربی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان ملٹری کیمپوں میں کنور صاحب متعدد بار تشریف لے گئے اور ان جنگی ملٹری کیمپوں کے مقیم پاکستانی مسلمان کنور صاحب کا خیر مقدم ایسے ڈھنگ سے کرتے تھے کہ جیسے اُن کا واقعی کوئی ہم وطن مربی اُن کی مزاج پرسی کو آیا ہو۔

اس افراتفری کے زمانے میں بھی کنور صاحب کی کوٹھی پر کبوتر بازوں۔ مرغ بازوں اور تیتر لڑانے والوں کی موجودگی اس امر کی مظہر تھی کہ جہاں کنور صاحب موصوف ادب اور شاعری کا ذوق جنون کی حد تک رکھتے تھے وہاں اس شئے لطیف کے ساتھ ساتھ ان رنگیلی روایات کو بھی جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔

ایک صاحب نے غرض سے پوچھا کہ کنور صاحب سے ملاقات کیسے ہو فرمانے لگے وہ دیکھئے سامنے کرسی پر بیٹھے مرغوں کی لڑائی دیکھ رہے ہیں۔ کیسی اشنان کے باعث کنور صاحب سر کے بالوں کو بکھرائے ہوئے تھے اور فسانۂ آزاد کے ان روایتی کرداروں کا مظاہرہ بھی ملاحظہ فرما رہے تھے۔

دو گھنٹے تک میں اسی ہجوم غفیر میں کھڑا کنور صاحب کی مصروفیات کا جائزہ لیتا رہا اور جونہی موقع غنیمت سمجھا کنور صاحب کو آداب کہتے ہوئے اور اپنا مدعا ظاہر کرتے ہوئے درخواست اُن کے سامنے کر دی۔ درخواست کو پڑھے بغیر آواز لگائی ارے کوئی ہے۔ (حالانکہ وہاں کوئی تو کیا بہت سے تھے) ایک منشی جی صاحب دوڑے ہوئے آئے اور کنور صاحب نے انھیں حکم دیا کہ اندر سے قلم لے آؤ۔ قلم آتے ہی فرمانے لگے اس پر کیا لکھ دوں۔ عرض کیا کہ ایسا لکھ دیجئے کہ ڈیکلریشن بغیر سی۔ آئی۔ ڈی کی تحقیقات کے مل جائے۔ چنانچہ کنور صاحب نے انگریزی میں چار پانچ سطریں درخواست پر لکھ کر فرمایا کہ کل صبح میری کچہری میں آکر پیش کار سے میری عدالت کی مہر لگوا لیجئے اور درخواست ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں دے دیجئے اگر کوئی دقت پیش آئے تو میری کچہری میں آجایئے گا۔

دوسرے دن درخواست کی ہر طرح سے تکمیل کے بعد جونہی ہیڈ کلرک صاحب کو پیش کی گئی تو کنور صاحب کی تحریر پڑھ کر کہنے لگے اسے کہتے ہیں "مربی بیار و مرتبہ بجو" اب آپ جائیے اور جمعہ کے روز آجایئے گا۔ اور ڈیکلریشن داخل کر جایئے گا۔

میرے بہنوئی شری لوک ناتھ مع اہل و عیال کشمیری گیٹ کی درمیانی فصیل کی ایک محراب میں خیمہ زن تھے۔ فصیل کی محرابوں میں خیمہ زن رفیوجیوں کو جب کوارٹرز الاٹ کئے گئے تو میرے بہنوئی کو مالویہ نگر میں کوارٹر الاٹ کیا گیا۔ الاٹ کردہ کوارٹروں میں پناہ گزینوں کو لے جانے کے لئے سرکاری ٹرکوں کا انتظام تھا تاکہ ان پناہ گزینوں سے فصیل خالی کرائی جائے۔ میرے بہنوئی نے سرکاری کارندوں سے کہا کہ انھیں اسی علاقہ میں ایک فرم میں کام مل گیا ہے۔ لہٰذا مالویہ نگر سے یہاں آنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ اُن دنوں مالویہ نگر سے کوئی بس بھی دہلی نہیں آتی تھی۔ لہٰذا انھیں کسی نزدیک جگہ پر کوارٹر دیا جائے تو کارندوں نے کہا کہ ایک ہزار روپیہ دو ہیڈ کلرک ابھی تمہارا کام کرا دیں گے۔ میرے بہنوئی نے ہزار روپیہ دینے سے معذوری ظاہر کی تو سرکاری کارندوں نے انھیں مع اہل و عیال اور معمولی سامان کے ٹرک میں بٹھا اور مالویہ نگر لے جا کر ایک ایسے کوارٹر میں چھوڑ آئے۔ جس میں نہ تو پانی کا انتظام تھا اور نہ ہی روشنی کا۔

دوسرے دن میرے بہنوئی میرے ہاں سوئی والان میں آئے اور سارا ماجرہ سنایا۔ ڈپٹی کمشنر کے ہیڈ کلرک کسی حد تک شناسا ہو چکے تھے میں بہنوئی صاحب کو ہمراہ لے کر کشمیری گیٹ کی کچہری میں گیا اور مذکورہ ہیڈ کلرک سے ملا اور سارا واقعہ انھیں سنایا تو وہ فرمانے لگے۔ بھائی الاٹ منٹ والوں

نہیں دے سکتے تو پھر وہی نسخہ استعمال کیجئے "مرتی بیار و مرتبہ بجد" اس کے ساتھ ہی مسکراتے ہوئے فرمانے لگے میاں تمہارے وہی سینٹر بجیسٹر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر آج کل محکمہ الاٹ مینٹ کے افسر اعلیٰ ہیں ان سے یہ سارا ماجرا کہیے ہاتھ کے ہاتھ کام ہو جائے گا۔

ہم دونوں ریلوے اسٹیشن کے سامنے دفتر الاٹ مینٹ (اب یہ بلڈنگ دلی پبلک لائبریری ہے) پہنچے تو یہاں بھی اتنی بھیڑ تھی کہ کھوے سے کھوا چلتا تھا۔ ہر شخص تار تھی کنور صاحب تک پہنچنا چاہتا تھا چپراسی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ لائن لگائیے ایک ایک آدمی اندر جائیے، اس دھکم پیل میں نرلیش کمار شاد نظر پڑے۔ وہ ایک کمرہ میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ میں نے انھیں آواز دے کر متوجہ کیا۔ فرمانے لگے۔ آپ یہاں کیسے؟ مدعا بیان کیا تو فرمانے لگے آئیے میرے ساتھ میں آپ کو کنور صاحب کے پاس لے چلتا ہوں۔ چپراسی نے نرلیش کمار شاد کو نہیں روکا اور میں بھی ان کے ساتھ کنور صاحب کے کمرہ میں گیا تو وہاں بھی تیس چالیس حضرات شور مچا رہے تھے، کنور صاحب نے حکم دیا کہ آپ لوگ سب باہر چلے جائیں اور ایک ایک کرکے میرے پاس آؤ تو میں آپ کی بات سن سکوں گا۔ وگرنہ نہیں۔ چنانچہ چپراسی نے بڑی مشکل سے غرض مندوں کو باہر نکالا۔ شاد صاحب نے میرا تعارف کرایا تو کنور صاحب فرمانے لگے انھیں کہیں دیکھا ہے۔ اس پر میں نے ان کے احسان کا تذکرہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ کی کوٹھی پر ڈیکلیریشن کی درخواست پر تصدیق کرانے حاضر ہوا تھا۔ شاد صاحب نے کنور صاحب سے سارا معاملہ بیان کیا تو کنور صاحب نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی اور چپراسی کو حکم دیا کہ فلاں صاحب کو بلا لاؤ، یہ صاحب آئے تو کنور صاحب نے پوری افسرانہ شان میں حکم دیا کہ انھیں ساتھ لے جائیے اور جہاں بھی یہ کوارٹر چاہتے ہیں وہیں کا الاٹ مینٹ کر دیا جائے اور مالویہ نگر والا کوارٹر کینسل کرکے ان کا سامان وغیرہ سرکاری ٹرک میں منگا کر نئی الاٹ مینٹ کا قبضہ دلا دیں۔ کنور صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان صاحب کے ساتھ باہر آیا تو پانچ منٹ میں انھوں نے ہماری مرضی کے مطابق کشمیری گیٹ اور اجمیری گیٹ کی فصیل والی سڑک پر حسن بلڈنگ

بقیہ صفحہ ۲۵ پر

حرف ونوا ۔
جنید حزین لاری ۔
۳۰۰ صفحات ۔
بیس روپے ۔
لاری پبلی کیشنز وارانسی (اتر پردیش)

یہ بات اہم نہیں ہے کہ کوئی شخص شاعر مانتا ہے یا نہیں۔ وصلہ شرط ہے۔ اپنے آپ کو بنانے کی مخلصانہ جد وجہد ہو تو اللہ امیابی بھی عطا کرتا ہے۔ جنید حزیں کا دیوان چھپ کر مشتہر ہو گیا۔ لام میں اتنی جان ہے کہ وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ یہ بات نید حزین کے خوش آئند مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔

•حرف ونوا• میں غزلوں کے علاوہ چند نظمیں بھی شامل یں۔ چار آزاد نظموں کو چھوڑ کر ساری نظمیں اپنی نوعیت میں غزلیں ہیں۔ مجموعے کے آخر میں کچھ قطعے بھی شامل ہیں۔ اِس تفصیل کی بنیاد کہا جاسکتا ہے کہ جنید حزیں بنیادی طور سے غزل گو شاعر ہیں۔

غزل اور تک بندی بظاہر نظر میں ایک دوسرے کے بہت قریب یں۔ اکثر لوگ جو شاعر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، بڑی آسانی سے ملا کر لمبی لمبی غزلیں تیار کرتے رہتے ہیں۔ ایسے تک بندوں کی کسی بھی زمانے میں کمی نہیں رہی ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ جنید حزیں اُن میں سے نہیں ہیں۔ اُنہیں قافیہ پیمائی یا تک بندی کا شوق نہیں ہے جو واقعات نگاہوں کے سامنے گزرتے ہیں۔ یا جو معاملات دل کو متاثر کرتے ہیں بس اُن کو معنی خیز انداز میں شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ اُن کے مجموعے میں ایک غزل بھی ایسی نہیں ہے جس پر "طویل" کا اطلاق ہو۔ بیشتر غزلیں مختصر ہیں۔ پانچ پانچ چھ چھ شعر کی بھی کئی غزلیں ہیں...... بسیار گوئی سے مشاقی کا ثبوت تو ملتا ہے۔ لیکن اس کی ایک صورت یاوہ گوئی بھی ہے۔ انسان کو اپنے اور دوسرے کے وقت کی قدر کرنی چاہیئے محض اُستاد کہلانے کے لئے دوسروں کی سمع خراشی کرنا ظلم نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

جنید حزیں اپنی بات اپنے مخصوص انداز سے کہہ دینا چاہتے ہیں۔ اِس معاملے میں وہ تصنّع سے کام نہیں لیتے۔ نمود و نمائش کو اُن کے مزاج سے مطابقت نہیں ہے۔ اُن کے کلام میں سادگی کا وصف پایا جاتا ہے، اثر آفرینی اسی کا نتیجہ ہے۔

جنید حزیں کے مجموعۂ کلام میں نصف درجن کے قریب غزلیں غیر مردّف ہیں۔ بیشتر غزلوں میں ایک لفظی یا دو لفظی ردیفیں اختیار کی ہیں۔ اُن کو نہ تو مشاقی کا زعم ہے اور نہ خود نمائی کا شوق، لمبی لمبی ردیفیں اختیار کر کے اُنہوں نے خود کو شاہ نصیر کا جانشیں ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ وہ مشکل زمینوں اور طویل ردیفوں میں غزل نہیں کہہ سکتے۔

اِس قسم کی چند غزلیں اور بھی ہیں جن میں طویل اور مشکل ردیف اختیار کی گئی ہے۔ طبیعت کو اگر اصول و ضوابط یا خیال و نظر یکا پابند نہ کر دیا جائے۔ تو اُس کے جوہر ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ جنید حزیں فطری شاعر ہیں۔ اُنہوں نے خود کو نقالی یا فیشن پرستی میں مبتلا نہیں کیا ہے۔ اُن کا مجموعۂ کلام اُن کی خداداد صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔

ایک مدت کی مشق نے اُن کے کلام میں پختگی پیدا کر دی ہے۔ ان کے یہاں اچھے شعروں کی کمی نہیں ہے۔ ایسا اِس لئے ہے کہ وہ جو کہتے ہیں سوچ سمجھ کر، غور و تامل کے بعد کہتے ہیں۔ اُن کے ذاتی تاثرات میں بھی عمومی انداز پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہی غزل کی سب سے بڑی خوبی ہے

——— ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔

مَن کہ مکتوبُ الیہ

پیارے سرور بھائی! آداب۔

آپ میرے ان دوستوں میں سے ہیں جو مجھے یقین کامل ہے کہ میری طویل خموشی سے بدگمان نہ ہوں گے۔

ایک عرصہ کے بعد یہ پہلا خط آپ کے نام لکھ رہا ہوں وہ بھی Full scape کاغذ پر کہئے کچھ تو میرے تغافل کی تلافی ہوئی۔ آپ کو ایک دوبار ٹرنک کال کی نمبر نہ مل سکا۔ دوستوں کے ہاتھ پیغام بھیجے (ساقی صاحب کا بھلا ہو) وہ پیغام آپ کو مل گیا، شکر ہے کہ آپ بخیریت ہیں۔ یہاں ادھر کا یہ حال ہے کہ کاہلی، سستی، بے خوابی اور بیماریوں نے مار ڈالا۔ کارِ خدمت لائق سے یاد فرمایئے گا۔

آپ کا بھائی

راجندر کرشن

بمبئی

سرورِ کرم بندہ نواز

خلوص و نیاز۔

آپ نے تو پرچے کی کایا ہی پلٹ دی، بہترین اور دلکش سرورق حسین اور خوبصورت چھپائی ترتیب تدوین نظر نواز، گویا شانِ ہند کو آفسیٹ کی دُنیا میں لا کر اسے نیا حسن و جمال عطا کیا ہے۔ مرحبا، مرحبا، آفریں آفریں،

اس سعیٔ جمیلہ کے لئے دلی مُبارکباد، اور نذرانہ ہائے داد و تحسین قبول فرمایئے۔

—— توصیف علوی عاصی

محترم سرور تونسوی صاحب

آپ کی ہستی مُبارک ہے۔ آپ کا وجود ایک نعمت ہے اور آپ کا یہ پرچہ صرف ہندوستان ہی کی شان نہیں اور فقط اُردو دوستی ہی کا علمبردار نہیں بلکہ انسانی اقدار اور مہر و آشتی اور خلوص کاری کی دلیل ہے، ثبوت ہے اس بات کا کہ آوازِ حق بلند ہے اور رہے گی جب تک آپ ہیں، آپ کی سرکردگی اِس پرچے کو میسّر ہے۔

ڈاکٹر حقیر بستانی

مکرمی سرور تونسوی صاحب!

سلام و احترام۔ خدا کرے آپ خوش و خرم ہوں آپ کی پختہ اور قیمتی تحریروں کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ اس بار آپ نے حنیف نقوی کی دریدہ دہنی کا جو مثبت اور پُر زور جواب دیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ نے ذرا رعایت سے کام لیا ہے۔

الٰہ آباد میں بھی ایسے ہی بد نفس دانشور ...ہیں اور مَیں ان کی بے داد کا شکار ہوں۔ ...وقت ان کی شر پسندی اور کمینگی کا جواب ...کے لئے تیار رہتا ہوں، ایسے لوگ ایماندار ...اور سچے اُردو دوستوں کے خلاف بہتان تراشتے ...ہیں مگر خود یہ لوگ ذہنی، علمی اور سماجی طور پر اتنے کمزور ناکارہ اور بزدل ہوتے ہیں کہ مضبوط اور باکردار افراد کو زک نہیں پہونچا سکتے ہیں۔ ان کی حیثیت ہی کیا ۔ محترم مالک رام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور آپ ایسی قد آور شخصیتیں ہیں کہ معترضین خود منہ کی کھاتے ہیں ۔ جہاں کردار بھی سلامت ہو، خلوص ہو، ایقان ہو، اسے ہمیشہ سربلندی حاصل رہی ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ اچھا رکھے اور قلم یونہی ترو تازہ رہے (آمین)

اور ہاں، شانِ ہند میں کب تک تبصرہ چھپے گا میری کتابوں پر،

آپ کا

ساحل احمد

شعبۂ اُردو ایوننگ کرسچین کالج

الہ آباد

مکرمی سرور صاحب!

حنیف نقوی صاحب بہت اچھے اور پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مَیں سارا ہندوستان گھوما ...... اتنا اچھا اُستاد ابھی تک تو نہیں دیکھا۔ آئندہ کی توقع کرنا بے کار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے جوشِ جہاد میں حُبِّ علی سے زیادہ بغضِ معاویہ سے کام لیا ہے۔ ایسی بے سر پا تحریریں ہمارے وقار کو نقصان پہونچاتی ہیں۔ مجھے آپ کا مضمون پڑھ کر جو تکلیف ہوئی ہے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

—— ڈاکٹر حکم چند نیّر

● تازہ شمارہ دیکھ کر
ت ہی مسرت ہوئی۔ میری
ی مبارک باد قبول فرمائیے
بن سرورق سے مجھے
ایوسی ہوئی۔ رنگ بہت
گہرے ہوگئے ہیں۔ اگر
پہلا اسٹائل ہی قائم
عیں تو بہتر ہوگا۔ کچھ
ضخامت بھی بڑھائی
ہیے، کم از کم ۶۰ صفحے کا
و جائے۔ تو مزہ آجائے
پ زرِ سالانہ ۲۰ روپے
کھیے، اہلِ نظر، اہلِ قلم
اہلِ جود وسخا ہمیشہ
تعاون کے لئے تیار
ملیں گے، امید ہے
میری تجویز پر غور
فرمائیں گے،
—— شوق جالندھری

● آپ جیسے بیباک
صحافی کو کبھی فراموش
نہیں کیا جا سکتا، شانِ
ہند کے نو رسیدہ آپ نے
خراجِ تحسین کے طور پر اپنے
خیالات و افکار کا اظہار

● پہلی نظر میں ہی طبیعت لہرا اٹھی، اور بے اختیار
زبان پر آگیا، ع

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!

اس تخریہ نذرانہ کے لئے آپ کو نہیں بلکہ شانِ ہند
کے اہلِ ذوق قارئین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں جن کی چاہی
مراد سے بھی سوا مل گیا ہے۔ یعنی شانِ ہند نے پروازِ تخیل
کی سبھی بلندیوں کو ایک ہی بار اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔
اسی عالمِ کیف میں چند اشعار ہو گئے، پیش ہیں ؎

الٰہی زشکرِ تو شیریں دہن باد
ز نورِ تو روشن دل و جان و تن باد
ز فضلِ تو مطبوعِ شد ایں جریدہ
ز فیضِ تو مقبولِ طبعِ زمن باد
شود زینت افزائے دستِ خلائق
بنظرِ قدرداں چوں دُرِ عدن باد
نسیمش معطر کند جان و دل را
ضیائش منور کنِ روح و تن باد

آپ کی توجہ کے لئے مزید لکھ رہا ہوں کہ آئندہ کے لئے
کالم "بکوئے یار ....." بجائے آخری صفحات کے حسبِ سابق
پہلے صفحات پر ہی رکھیے، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو سب سے پہلے نگاہِ شوق
کا مرکز ہوتی ہے۔
اور ہاں انتظار تھا کہ آپ ۲۶ جنوری کے لال قلعہ مشاعرہ
کی رُوداد سے آشنا کرائیں گے، لیکن نگاہِ شوق تشنہ ہی رہی۔
—— کندن لال گردھر

● تازہ شمارہ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔
تبدیلی مبارک ہو، امید ہے کہ قارئینِ "شانِ
ہند" اس مرتبہ بے حد خوش ہوئے ہوں گے۔
—— اختر شاہجہاں پوری

جنوری کا شمارہ آج ہی حاصل ہوا
ہے۔ سرورق دیکھ کر دل خوش ہوگیا، رسالہ
کا گیٹ اپ بالکل تبدیل ہو کر جاذبِ نظر
ہوگیا ہے۔
—— زیڈ۔ اے۔ ہلال

● آفسیٹ کی چھپائی سے رسالہ کی
خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے ہیں
اس بار مضامین بھی معیاری ہیں، ڈاکٹر
حقیر آستانی صاحب کی غزل بھی بہت اچھی
ہے اور آپ نے اُسے شائع بھی بڑے اہتمام
سے کیا ہے۔
—— یوسف گوہر شاہجہاں پوری

● "شانِ ہند" حسبِ معمول ہمدست
ہوا، مگر اس بار سرورق پر کسی ملکۂ حسن
کی تصویر جہاں نظر نواز ہوئی وہیں پر
صفحہ اُلٹتے ہی دل آویز ترتیب و تزئین اور
جاذبِ نظر نے من موہ لیا۔
—— خادم یوسف ثانی سُلیمانی

● "شانِ ہند" کا نیا شمارہ ہاتھوں
میں آیا، تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس جدوجہد
میں آپ نے کامیابی حاصل کرکے آفسیٹ
پرنٹنگ کے درجہ میں شانِ ہند کو لاکر
ایک نمایاں کام انجام دیا ہے، آپ کی کوشش
اور محنت کیلئے صد آفریں
—— رام ناتھ پرنکی

● بہت نیا پن ملا، خوشی
افسانوں کی تعداد زیادہ کریں
پڑھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔
—— زرین

اپنی بیباکی، بے لوث اور بے ریا صحافت پر
خود غرضی اور ریاکاری کا داغ نہیں لگنے
دیا۔ اس دورِ پُر فتن میں یہ کارنامہ عظیم
انجام دے کر اُردو صحافت کا معیار بلند
کرکے اس کے وقار میں چار چاند
لگا دیئے ہیں،
—— نسیم شاہجہانپوری

مکرمی سرور صاحب! تسلیم
کچھ عرصہ سے شانِ ہند نے دلی اُردو اکادمی کے سلسلہ میں
زبان بند کر رکھی ہے، کیا یہ اس سلسلہ میں تو نہیں کہ اکادمی
نے اس سال آپکو صحافت کا ایوارڈ دینا منظور کیا ہے؟
یہ یقین تو نہیں کہ آپ نے اس قسم کا ناپاک اتحاد اکادمی
کے ساتھ کر رکھا ہو تاہم شانِ ہند کے ایسے
قارئین جو آپ کی سچائی پسند اور بے باک قلم کے
مداح ہیں انہیں شانِ ہند کی اس تبدیلیِ روش کا احساس ہے، اُمید ہے کہ اس سلسلے میں آپ
اپنے قارئین کے جذبات کا خیال کریں گے۔ —— جمیل مہرت نور، گجری ہوسٹل، دہلی

۱۹۔ دسمبر سے کامیابی سے دکھائی جا

دہلی

ہندو پرست ہُوں نہ مسلماں پرست ہُوں
دامن پرست ہُوں نہ گریباں پرست ہُوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہُوں انساں پرست ہُوں

شانِ ہند
دہلی

مارچ ۱۹۸۷ء

چیف ایڈیٹر ـــ سرور تونسوی
معاون ایڈیٹر ـــ مُطرب صحرائی

حُسن کار ـــ مصطفٰے آرٹسٹ
خطاط ـــ محمد عمران اعظمی

جلد ۴۸
شمارہ ۳

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر
وِدّیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"
فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت فی شمارہ ـــ چار روپے
قیمت سالانہ ـــ چالیس روپے

ممالک غیر میں بذریعہ سمندری ڈاک Rs 80.00
بذریعہ ہوائی ڈاک سعودی عرب
متحدہ عرب امارات اور کویت Rs. 150.00
انگلینڈ، ناروے، سوئٹزرلینڈ Rs. 200.00
کناڈا۔ امریکہ Rs. 250.00

مقالاتِ نازش

نازش حیدری دہلوی

جسے اک دل ملا ہو درد زا دل واژگوں وہ بھی
سکوں کا مستحق ہے کیا سرِ دنیائے دوں وہ بھی

پسِ بیداد دیکھ حال پر ہے سرنگوں وہ بھی
علی قدرِ مراتب آج میں بھی ہوں زبوں وہ بھی

کہاں کی سرفروشی اور ذوقِ سجدہ کیا معنی
جہاں اک سر ہو زیبِ تن بمقصودِ جنوں وہ بھی

گذشتہ دور پھر پھر گردشِ ایام آجائے
تمنا ہے کہ پائے مجھ سا بختِ واژگوں وہ بھی

مہ و انجم کو چشمِ سرمگیں سے تیری چشمک تھی
مگر اوڑھے رہے دن بھر ردائے نیلگوں وہ بھی

جو نظریں منتشر ہوتی رہیں اس روئے زیبا سے
بالآخر بن گئیں میرے لئے وجہِ سکوں وہ بھی

کبھی جانِ حزیں قلب و جگر سے بے تعلق تھی
ہوئی جاتی ہے اب لذت کشِ دردِ دروں وہ بھی

شفق کا عکس پیمانے پہ پڑ رہا ہے نہیں ساقی
اسی صہبائے احمر کی ہے موجِ لالہ گوں وہ بھی

نویدِ شوق دے پیغامِ اجل اس کی نظر لائی
مری قسمت میں ہے نازش کہ میں ہی سرنگوں وہ بھی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالاتِ حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اڈیٹوریل

ریلی اور

۔۔۔ مسلمانوں ۔۔۔ امن منظم ۔۔۔ خاموش

ریلی کے سربراہوں کا غیر مصالحانہ رویّہ

۔۔۔سجد کے تنازعے کے فوری حل ۔۔۔ توجہ مبذول کرانے کے لئے ۔۔۔ں (جماعتِ اسلامی کے ۔۔۔ات کے علاوہ) نے ۳۰ مارچ کو دِلّی میں ایک ریلی نکالی۔ جس میں ملک بھر کے ہر حصّہ سے مسلمانوں نے شرکت کی اور بوٹ کلب نئی دہلی پر لاکھوں کے اجتماع میں اس ریلی کے سربراہوں نے تقاریر کیں اور کچھ مطالبات حکومت کے سامنے رکھے۔

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے۔ یہاں تقریر و تحریر کی پوری آزادی ہے اور ہر قسم کا مطالبہ کرنے کا بھی ہر کسی کو حق ہے۔ مگر مطالبہ

اگر شائستہ اور مؤثر انداز میں اور مہذبانہ اور اصول پسندانہ زبان میں پیش کیا جائے تو غیر متعلقہ عوام کی ہمدردی قدرتی طور پر حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اگر مطالبہ بھدّے اور کافی حد تک غیر مہذبانہ طور پر پیش کیا جائے تو غیر متعلقہ عوام تو درکنار اپنوں میں سے بھی کچھ ذوقِ سلیم رکھنے والے حضرات پر گراں گذرتا ہے۔

یہ دہلی جس قدر منظم اور پُرامن طور پر اپنے دِلی جذبات کا اظہار زبان بند رکھتے ہوئے کر رہی تھی افسوس ہے کہ ریلی کے کچھ سربراہوں نے اپنی تقاریر میں کافی حد تک غیر ذمہ داری کا مظاہرہ بھی کر کیا اور ریلی میں شریک ۹۰ فیصدی نوجوانوں کو تشدد کی راہ اختیار کرنے کے لئے اکسایا گیا۔ جسے اکثر و بیشتر مسلم نوجوانوں نے پسند نہیں کیا اور ہم ایسے نوجوانوں کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں جنھوں نے امام صاحب جامع مسجد کی اشتعال انگیز تقریر کو محض "دیوانے کی بڑ" سمجھا۔

مسلمان وزیروں، ممبرانِ پارلیمنٹ اور ممبرانِ صوبائی اسمبلی کو یہ دھمکی دینا کہ اگر انھوں نے بابری مسجد کے مطالبہ میں امام جامع مسجد کی ہمنوائی نہ کی اور ناکام رہنے میں انھوں نے اپنے اپنے استعفے نہ دیئے تو ان کے مکانوں اور کوٹھیوں کو آگ لگا دی جائے گی اور اس کے فوراً بعد کہا کہ اگر میں ابھی اسی ریلی کو کہوں کہ ایسا کریں تو انہیں دُنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی بے شک اگر امام جامع مسجد ایسا حکم نافذ فرماتے تو ریلی میں ایسے سرپھروں کی کمی نہیں تھی جو اس خالص احمقانہ حکم کی تعمیل کرنے سے گریز نہ کرتے۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ یہی نہ کہ کئی نوجوان بے موت مارے جاتے اور امام صاحب جامع مسجد کے حجرے میں آرام کر رہے ہوتے۔

پڑھا لکھا مسلمان اور خصوصاً امام صاحب اور سید شہاب الدین بخوبی جانتے ہیں کہ مسلمان وزیروں اور ممبرانِ پارلیمنٹ یا ممبرانِ اسمبلی کے ہاں آگ لگا دینے سے نہ تو بابری مسجد مل سکتی ہے اور نہ ہی حکومت اِس قسم کی بدامنی کو برداشت کر سکتی ہے۔ مگر اگر کھوں مسلمانوں کے دلی جذبات کو اشتعال دلا کر واہ واہ اور مقبولیت حاصل کرنے کی غرض سے نوجوان مسلمانوں کو تشدد کا راستہ دکھانے کا حق دار ہونا قابلِ تعریف ہے۔

ہم نے "شانِ ہند" کی سابقہ اشاعت ... بھی یہی گذارش کی تھی کہ تنگ نظری سے دونوں ... کے صحیح انتہا ہو مذہبی تعصب سے پاک اور ... بھگوان کا خون کھانے والے، سچائی پسند ...

ہم —— بابری مسجد یا رام جنم بھومی سے متعلق کسی قسم کی ذاتی رائے پیش کرنا قانون کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔

بے شک۔ اگر —— امام جامع مسجد ایسا حکم صادر فرماتے تو ریلی میں ایسے سرپھروں کی کمی نہیں تھی جو اس خالص احمقانہ حکم کی تعمیل سے گریز نہ کرتے۔ مگر —— اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟

ہم بابری مسجد یا رام جنم بھومی سے متعلق کسی قسم کی ذاتی رائے پیش کرنا قانون کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ معاملہ عدالتِ عالیہ میں ہے۔ اور ایسی حالت میں کسی قسم کی رائے کا اظہار کرنا توہینِ عدالت ہے۔ ہاں اپنے ہم وطن مسلمانوں کی خدمت میں یہ گذارش ضرور کر سکتے ہیں کہ وہ حالات کا مقابلہ تشدد، افراتفری یا فرقہ وارانہ بیزاری سے نہ کریں بلکہ انتہائی اطمینان اور یکسوئی سے قانونی حدود میں رہ کر مہذبانہ انداز اور باوثوق گفتار سے کریں۔ اگر ان کا مطالبہ صحیح ہے تو غیر متعلقہ عوام کی ہمدردی ان کو اسی طور مل سکے گی، نہ کہ نفرت اور تشدد کی راہ سے۔

اور بھگوان کے گھر کے تقدس کو صحیح معنو... والے کچھ حضرات کا انتخاب کیا جائے ... فریقین کے مطالبہ کے دلائل کو سنیں ... کو بھی پیش نظر رکھیں اور جو کچھ اصلیت ... آئے اُس کا اعلان بغیر رُو رعایت کر ... فیصلہ ہر دو فریقین کے لئے لازمی طور ... مانا جائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ مسلم ... ریلی کے بعد پارلیمنٹ میں اِس کی گو... حکومت نے بھی یہی مناسب سمجھا ... فرقوں کے باصلاحیت دانشوروں کو ا... لئے مناسب راہ ڈھونڈنے کے لئے ...

ایک سال میں پچاس لاکھ روپیہ کی بربادی

پنجابی کی تعلیم پر ایک لاکھ روپیہ
اور بھنگڑے، گِدّا، ناچ اور گانوں پر
بارہ لاکھ روپیہ

پنجابی اکادمی کے سیکریٹری
سردار من جیت سنگھ کی فرعونیت

دِلی اِنتظامیہ ہندی، اُردو اور پنجابی
یوں کو پچاس پچاس لاکھ روپیہ سالانہ کی
ی دے رہی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو روپیہ
متِ ہند دِلی کی ترقی اور عوام کی بہبود کے لئے
نتظامیہ کو دیتی ہے۔ یہ ڈیڑھ کروڑ روپیہ اسی
میں سے دیا جاتا ہے۔ اور حکومتِ ہند یہ روپیہ
روپیہ میں سے دہلی اِنتظامیہ کو دیتی ہے جو
کے عوام سے مختلف ٹیکسوں سے وصول کیا جاتا ہے،
مگر کیا یہ ڈیڑھ کروڑ روپیہ عوام کی بہبود،
ی کے لئے اُردو ہندی نیز گورمکھی (پنجابی) کی
اور ترویج پر خرچ کیا جاتا ہے یا محض اِلّلوں،
ں پر اُجاڑا جا رہا ہے۔ آئیے آج ہم سب سے پہلے
بی اکادمی دِلی کا محاسبہ کریں۔ آئندہ شماروں
ُردو اکادمی دِلی اور ہندی اکادمی دِلی کے
دو اربعہ کی پیمائش کی جائے گی۔

ہندی اکادمی دلی کے ناظم سیکریٹری سردار
جیت سنگھ ہیں جو ایک سرکاری افسر ہیں اور انھیں
لٹ میں یہ ڈیوٹی بھی دے دی گئی ہے۔ اور اگر
، اور صاف الفاظ میں کہا جائے تو یہ کہنے میں
ئی خدشہ نہیں کہ ہندی اکادمی کی بربادی اور

جملہ فضول خرچیاں جن کی تفصیل آپ اسی مضمون میں دیکھ سکیں گے، اس کے ذمہ دار صرف اور صرف سردار منجیت سنگھ ہی ہیں۔ یہ صاحب دفتر میں شاید عید بقر عید پر کبھی آئے ہوں تو آئے ہوں ورنہ یہ اکادمی کے دفتر میں آنا اپنی توہین سمجھتے ہیں آپ لاکھ جتن کر لیجئے یہ نہ تو کسی سے فون پر بات کریں گے اور نہ ہی ملاقات کا وقت دیں گے جب انہوں نے فون پر کسی سے بات ہی نہیں کرنی تو آپ ملاقات کا وقت کیسے لے سکتے ہیں۔ خط لکھئے یا اُن کے ڈپٹی سکریٹری کو اُن کے نام خط دے آئیے قطعاً جواب نہیں ملے گا۔ ایڈیٹر شان ہند نے تقریباً دو مرتبہ فون اُن کے سرکاری دفتر اور گھر پر کئے مگر سردار منجیت سنگھ نے پردوں پر پاتی نہیں پڑنے دیا کہ ان سے بات ہو سکے۔ انھیں کئی خطوط لکھے جواب نہیں ملا۔ آخر کار پنجابی اکادمی دِلی کے ڈپٹی سیکریٹری مسٹر گپتا کو اُن کے نام دستی خط دیا گیا اور اُنھوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ اس خط کا جواب ضرور ملے گا۔ مگر وہ سردار منجیت سنگھ ہی کیا ہوئے جو خط کا جواب دے دیں۔

ایڈیٹر شان ہند تو بیچارہ ایک معمولی آدمی ہے، مگر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر تو ایک موقر،

نامور اور برگزیدہ ہستی ہیں اور سردار منجیت سنگھ سے کہیں بڑے افسر رہے ہیں اور پھر رئیس ابن رئیس، وہ بھی شاکی تھے کہ اُنھوں نے سردار منجیت سنگھ کو متعدد بار اُن کے دفتر اور گھر پر فون کئے تو بھدے طریقہ سے ٹال دیا گیا۔ اِس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ کہ یا تو سردار منجیت سنگھ کے دماغ میں کوئی ایسا کیڑا ہے جو انھیں اپنے آپ کو سپر مین سمجھنے کی انگیخت کرتا ہے۔ اور یہ پھر منجیت سنگھ صرف نام کے ہی منجیت ہیں، دراصل احساس کمتری میں بُری طرح مبتلا ہیں۔

پنجابی اکادمی کے نام نہاد سکریٹری سردار منجیت سنگھ نے اکادمی کا تمام کام اپنے ماتحت گپتا صاحب پر ڈال رکھا ہے۔ اور اگر گپتا صاحب میں اکادمی کی تمام ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی اہلیت ہوتی تو پھر سرکار نے انھیں ہی منجیت سنگھ کی جگہ مقرر کرنا چاہئے تھا۔

جب سکریٹری صاحب اکادمی کے دفتر میں آنا باعث توہین سمجھتے ہوں تو پھر دفتر والوں کو کسی کا ڈر کیوں رہے گا۔ لہٰذا جو کچھ بھی ہوتا رہے اور جو بھی کچھ کرتا رہے اس کو دیکھنے والا ہی کون ہے۔ لہٰذا پنجابی اکادمی کے دفتر میں بدنظمی کا یہ حال ہے کہ منیجر شان ہند نے پنجابی

اکادمی کے دفتر میں ایک درخواست دی جس کے جواب میں گپتا جی نے فرمایا کہ اِس درخواست کے ساتھ فلاں فلاں کاغذات بھی منسلک کیجئے لہٰذا درخواست کی مکمل خانہ پُری کرکے دفتر میں ایک محترمہ کو دی گئی اور اُنھوں نے اس امر کی رسید بھی دی کہ درخواست مع فلاں، فلاں کاغذات وُصول پائی۔ مگر ایک ماہ بعد جب اِس درخواست کے نتیجہ کے بارے میں دریافت کیا تو جواب مِلا کہ آپ نے درخواست مکمل کرکے ہی نہیں دی تو دفتر کارروائی کیا کرتا۔ گپتا صاحب کو وہ رسید دکھائی گئی جس میں ایک محترمہ نے یہ درخواست معہ متعلقہ کاغذات وُصول کی تھی، تو گپتا صاحب نے اُن محترمہ کو بلایا۔ اُس نے دانت نکالتے ہوئے کہا" آہو جی، ایہہ درخواست میں ایں وصول کیتی سی، پر اے کتھے گئی اے کُجھ پتہ ہی نہیں چلدا:"

پنجابی اکادمی میں بدنظمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کام بالکل کم ہے اور ملازم لڑکیوں کی "ہیڑ" (یہ پنجابی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں ریوڑ) لگا رکھی ہے۔ اگر پبلک کا کوئی فرد پنجابی اکادمی کے دفتر میں جائے تو وہ جس بھی متعلقہ لڑکی سے بات کرے گا وہ لڑکی ہاتھوں سے سوئیٹر کی سلائیوں کے گھیرے ڈالے جا رہی ہوگی اور منہ سے بات کرتے وقت جلدی سے جلدی ٹالنے کی کوشش کرے گی۔

اِس سلسلہ میں ایک تجربہ کی بات سُن لیجئے۔ مشہور مولانا محمد علی کے اخبار کے دفتر میں بڑی بدنظمی تھی اور اخبار وقت پر شائع نہیں ہوتا تھا۔ اس بدنظمی کے اسباب جاننے کے لئے مولینا محمد علی صاحب مرحوم نے بھیا احسان الحق کو مقرر کیا تو اُنھوں نے جو رپورٹ دی وہ یہ تھی کہ "اشٹاف آدھا کر دیا جائے بدنظمی ختم ہو جائے گی"۔ اِسی طرح اگر پنجابی اکادمی میں تین چوتھائی اشٹاف کو جواب دے دیا جائے تو ایک چوتھائی اشٹاف سے بخوبی کام چل سکتا ہے۔ اگر سردار من جیت سنگھ چاہیں تو ایڈیٹر 'شانِ ہند' اس کا

اگر — پنجابی اکادمی میں تین چوتھائی اسٹاف کو جواب دے دیا جائے تو ایک چوتھائی اسٹاف سے بخوبی کام چل سکتا ہے۔

ٹھیکہ لینے کو تیار ہے کہ پنجابی اکادمی کا جو موجودہ اشٹاف ہے اس کے صرف ایک چوتھائی اشٹاف سے کام پہلے سے بہتر طور پر انجام پائے گا۔ اگر وہ چاہیں تو اکادمی کے چیئرمین سے اس کی اجازت لے لیں۔ ہم موجودہ اشٹاف کے مقابلہ میں اس سے صرف ایک چوتھائی اشٹاف سے کام کے نتائج بہترین طور پر دینے کے ذمہ دار ہیں۔

پنجابی اکادمی کو جو پچاس لاکھ کی گرانٹ دلی سرکار سے ملتی ہے اس کا نصف یعنی ۲۵ لاکھ روپیہ تو اشٹاف کی تنخواہوں اور دفتری ضروریات وغیرہ پر صرف کیا گیا ہے اور باقی نصف ۲۵ لاکھ روپیہ میں قریباً ۱۲ لاکھ روپیہ بھنگڑہ، ناچ اور ریڈیو اسٹیشن سے پنجابی دُرشن پروگرام پیش کرنے پر صرف کیا گیا ہے۔ سرکاری طور پر کسی بھی آرٹسٹ کو پندرہ صد روپیہ سے زیادہ نہیں دیا جا سکتا مگر پنجابی اکادمی دِلّی نے اِس سرکاری گرانٹ یا دوسرے الفاظ میں دِلّی کے عوام کے زرِ پیہ کو "چوروں کا مال لاٹھیوں کے گز" کے مصداق پانچ پانچ ہزار روپیہ تک آرٹسٹوں کو مُعاوضہ دیا ہے۔ اگر ہمارے لیفٹننٹ گورنر صاحب انکوائری بٹھائیں تو اُنھیں معلوم ہو سکے گا کہ آرٹسٹوں کا انتخاب کرنے والے وِچولوں نے اپنا دانہ پانی کس قدر بچایا ہوگا اور دفتر کے لئے جو الماریاں

پنجابی دُرشن پروگرام میں اکثر ایک گو
"باجرے دا سٹّا نی میں تلی
تے مروڑیا" سُنوایا جاتا ہے۔
ہمارے ایل۔ جی۔ صاحب پنجابی ہیں، وہ
بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ "باجرے کے سٹے
سے کیا مُراد ہے اور تلی پر مروڑنے کے
معنی کیا ہیں؟
اس قدر لچر اور گندے گانے آکاشوانی
والی سے پنجابی دُرشن پروگرام میں سُنوا
کر پنجابی زبان کے بارے میں نفرت
پھیلائی جا رہی ہے۔

وغیرہ خریدی گئیں اگر ان سب کی بھی ج[...]
کرائی جائے تو کئی انکشافات ہوں گے او[...]
گورمکھی یعنی پنجابی زبان سر پیٹ کر رہ ج[...]
کہ اُس کی ترقی تو نہ ہوئی، ہاں اُس کے
دوسروں کی ترقی ہو گئی۔
اور پھر پنجابی دُرشن پروگرام میں [...]
طور پر ایسے گھٹیا، لچر اور مخربِ اخلاق گا[...]
کئے جاتے ہیں کہ جس کو گھر میں بچوں اور خوا[...]
موجودگی میں سُن کر اپنے آپ پر نفرین بھیجنے[...]
کرتا ہے۔ پنجابی دُرشن پروگرام میں اکثر ایک
"باجرے دا سٹّا نی میں تلی تے مروڑیا" سُنو[...]
ہے۔ ہمارے ایل۔ جی۔ صاحب پنجابی ہ[...]
بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ باجرے کے سِٹے سے کیا
اور تلی پر مروڑنے کے معنی کیا ہیں۔ اس [...]
لچر اور گندے گانے آکاشوانی سے پنجا[...]
پروگرام میں سُنوا کر پنجابی زُبان کے بارے
نفرت پھیلائی جا رہی ہے۔ حالانکہ پنجابی ز[...]
ایسی شیریں اور دل میں اُتر جانے والی ز[...]
اُردو اور فارسی بھی نہیں اور پنجابی میں ا[...]
ایسے گانے ہیں کہ جن کا مقابلہ دُوسری زبا[...]
گا نے کر ہی نہیں سکتے۔ پنجابی کے محض [...]
ایک مصرعہ "رن تاہ کے چھتے دچوں نکل
دی لاٹ ورگی" پر دُنیا بھر کی تمام ز[...]

ا قربان کی جا سکتی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے
ا کی کسی بھی زبان میں عورت کی خوبصورتی کے
میں ایسی تشبیہ موجود نہیں ہے۔ اور ایک ہماری
بی اکادمی ہے جو لاکھوں روپیہ برباد کر کے
، اور پاٹ دار آواز والی اناؤنسر کے ذریعہ عجیب
قسم کے پنجابی گانے سنوا کر پنجابیوں کا منہ
ہی ہے۔

داد دیجئے سردار من جیت سنگھ کو کہ دِلّی
یہ نے جس نیک مقصد یعنی پنجابی زبان کی
تحفظ اور ترویج کے لئے پچاس لاکھ روپیہ
ں اصل مقصد پر انھوں نے صرف ایک لاکھ
زار روپیہ صرف کیا ہے۔ اور اس کے مقابلہ
بنگڑے۔ گِدّا' اور پنجابی گانوں پر بارہ لاکھ
ے زیادہ۔ اگر سردار من جیت سنگھ چاہتے
کے ہر گوردوارے میں پنجابی کلاسز کھلوا
تے۔ ہر گوردوارے کے منتظمین بڑی خوشی
س نیک مقصد کے لئے ایک دو کمرے بغیر کسی
دغیرہ کے دے سکتے تھے صرف پنجابی پڑھانے
ٹیچرز اکادمی کی طرف سے مقرر کئے جاتے۔ اور
، اسی دلی میں کئی سنگھ صاحبان بغیر کسی کرا
کے اپنی کوٹھیوں اور مکانات میں اس
کام کے لئے جگہ دے سکتے ہیں اور جہاں تک
ی معلومات کا تعلق ہے ایک سردار جی نے
ی کو ایسی پیش کش کی بھی ہے۔

مگر انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ
ہے کہ سردار من جیت سنگھ نے اپنے فرائض کی
دھیان نہیں دیا اور عوام کے ٹیکسوں سے
ل شدہ سرکاری پچاس لاکھ روپیہ برباد کر کے
یا ہے۔ دلی میں بسنے والے پنجابیوں خصوصاً
صاحبان کو لیفٹننٹ گورنر سے یہ مطالبہ کرنا چاہیئے
ردار من جیت سنگھ کی جگہ کسی ایسے آدمی کو
بی اکادمی کا سکریٹری مقرر کیا جائے جو واقعی
بی زبان کے لئے اپنے دِل میں درد رکھتا ہو اور
کے پاس وقت بھی ہو کہ وہ اس فریضہ کو بطریق
نجام دے سکے۔ یعنی سکریٹری پنجابی اکادمی
پورے اوقات میں دفتر میں موجود رہے اور

ہر کام پر اس کی نظر رہے۔ اِس کے علاوہ پنجابی
اکادمی کے نامزد ممبران بھی ایسے ہوں جو دِل سے
پنجابی زبان کے شیدائی ہوں۔

پنجاب میں ہو رہی دہشت گردی' لوٹ مار'
اور قتل و غارت کے باعث پچھلے دِنوں کچھ ہندو
خاندان شرنارتھی بن کر دِلّی آئے جس کی وجہ سے
فرقہ وارانہ فضا میں کچھ تکدّر آگیا تھا۔ تو ایڈیٹر
'شانِ ہند' نے سردار من جیت سنگھ کو خط لکھا کہ
ان حالات میں پنجابی اکادمی کا فرض ہے کہ دِلّی
کی فضا کو بہتر رکھنے کے لئے ہندو اور سکھوں میں صدیوں
سے چلے آ رہے بھائی چارہ' جنمی رشتہ اور فرقہ
وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لئے دِلّی کے اُن
حسّاس علاقوں میں جہاں پنجاب سے آئے ہوئے
شرنارتھی خاندانوں نے بسیرا کیا ہے' پنجابی اکادمی
کی طرف سے ایسے جلسے کرائے جائیں اور کلچرل
پروگرام کرائے جائیں جن سے اُن علاقوں میں
فرقہ وارانہ فضا مکدّر نہ ہو سکے اور پنجاب سے آنے

والے شرنارتھیوں کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکے
مگر سردار من جیت سنگھ نے اس تجویز پر یہ مذاق
کیا کہ آکاش وانی سے ہر رات کو پنجابی دربار'
نام سے اپنے ریڈیو مائنڈیڈ ذہن کی تسکین کے لئے پنجابی
گانوں کی بھرمار شروع کر دی۔ اور اپنے اس اقدام
کو پنجابی زبان کی بہترین خدمت قرار دیا۔ اور ان
الٹوں تلٹوں پر بارہ لاکھ سے زائد رقم خطیر ہوا میں
اُڑا دی۔ ہمارے لفٹیننٹ گورنر جناب کپور صاحب
پنجابی ہیں اور اُنھیں پنجابی زبان سے بھی اتنا ہی
لگاؤ ہے جتنا کہ ہندی اور اردو سے یا دوسری
ہندوستانی بھاشاؤں سے۔ اس لئے ہم اُن کی
خدمت میں یہ تجویز رکھیں گے کہ وہ پنجابی اکادمی
دِلّی کے حسابات کی آڈیٹرز رپورٹ کو بہ غور ملاحظہ
فرمائیں تاکہ اُنھیں اُن اصل حالات کا پوری طرح
علم ہو سکے جن کے پیشِ نظر عوام کا پچاس لاکھ روپیہ
اِس پنجاب اکادمی نے قریب قریب اپنی من مانیوں
کی خاطر ضائع کر دیا ہے۔

کیا

آپ "شانِ ہند" کے باقاعدہ خریدار ہیں؟
اگر نہیں تو پھر کیوں
آپ کا نیوز پیپر ایجنٹ "شانِ ہند" منگاتا ہے؟
آپ اُسے مطالبہ کیجئے۔
آپ کی لائبریری۔ اسکول یا کالج میں "شانِ ہند" آتا ہے؟
یہ آپ ہی کا کام ہے آپ اسے وہاں لگوائیں۔
اپنے احباب میں "شانِ ہند" کا تعارف کرائیں۔
اپنے اثر و رسوخ سے اسے اشتہار دلوائیں۔
ہمیں آپ سے بڑی توقعات ہیں۔
"شانِ ہند" آپ کا محبوب ماہنامہ ہے۔
اسے آگے بڑھائیں۔

سرکولیشن مینجر

جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے

● اداکار سنجے دت اور ان کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۵۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور ان کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اسے ممتاز بنا لیا ہے، آپ یہاں تشریف لا کر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نور محمدّی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

غزلیں

شخص کون ہے اور کس نگر میں رہتا ہے
ہی خیال ہمہ وقت اُس میں رہتا ہے

نق شفق ہیں اسی سے یہ ہجر کی راتیں
خواب بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے

ں چھوڑ کر تری ہمسائگی کہاں جاؤں؟
سایہ اپنے ہی دیوار و در میں رہتا ہے!

شہرِ سنگ سہی، آئینہ بدست نکلو
وں ہو جس کو، وہ کب بند گھر میں رہتا ہے

ناعِ ہوش بنی، اہلِ دل کی بے خبری
اس ادا دلِ بے خبر میں رہتا ہے!

ا ہی راس نہ آئے تو کیا کھلیں غنچے
و کا زور تو شاخ و شجر میں رہتا ہے

زیںؔ! یہ کون سی منزل پہ جا کے ٹھہرے گا
مارا ذہن مسلسل سفر میں رہتا ہے!

جنید حزیںؔ لاری

کچھ تاثر نہیں کیسی ہے رفاقت تیری
سب کی نظروں میں ہے مشکوک محبت تیری

پیشِ آئینہ میں بیٹھا ہوں نہ جانے کب سے
میری آنکھوں میں ابھر آئی ہے صورت تیری

ذہن و دل پر ہیں تری مہر و وفا کے پرتو
پھر بھلا کیسے عیاں ہوگی عداوت تیری

جس کے غم میں تری آنکھوں نے لہو رویا ہے
اس کے دل میں بھی تو کچھ ہوگی محبت تیری

میں نے ہر معرکہ سر کر لیا تیری خاطر
میرے حق میں تو دعا بن گئی نفرت تیری

سب ترے طرزِ تکلم پہ مٹے بیٹھے ہیں
ہم نے پہلے ہی سمجھ لی تھی شرارت تیری

تو غزل لکھ کہ لکھے کوئی قصیدہ اخترؔ
ایک اک حرف سے ظاہر ہے کرامت تیری

اختر شاہجہانپوری

ہمارا گھر سے نکلنا بہت ضروری تھا
دل و دماغ بدلنا بہت ضروری تھا

زمانہ سخت مخالف تھا آسماں کی طرح
تمہارے ساتھ بھی چلنا بہت ضروری تھا

رفیقِ راہ خوشی کو بنا لیا میں نے
حصارِ غم سے نکلنا بہت ضروری تھا

سرورِ عہدِ محبت ارے خدا کی پناہ
قدم قدم پہ سنبھلنا بہت ضروری تھا

ہزار کانٹے بچھے تھے نوکیلے پتھر بھی
وفا کی راہ میں چلنا بہت ضروری تھا

یہ ایک فرض تھا اس کا صلہ ملے نہ ملے
پرائی آگ میں جلنا بہت ضروری تھا

چراغ گھی کے جلاتے یہ امن کے دشمن
بلائے جنگ کا ٹلنا بہت ضروری تھا

تم آفتاب سہی اپنے گھر کے اے انجمؔ
مزاجِ یار میں ڈھلنا بہت ضروری تھا

خلیل انجم

ہندوستان کی متعدد آرڈننس ـــ
وں میں شاہجہاں پور کی کپڑا بنانے والی
ایک اہم خصوصیت کی حامل ہے تقریباً
ہزار نفوس کی روزی روٹی کا بندوبست
والی یہ قدیم فیکٹری نہ صرف دفاعی ضروریات
فوقتاً پورا کرنے میں اپنا اہم رول
رہی ہے بلکہ سماجی اور زندگی کے دیگر
شعبوں میں بھی ایک مثالی کردار ادا کرنے
پیش پیش ہے۔ ہمالیہ کے دامن میں
واقع اس فیکٹری کے تاریخی پہلوؤں پر اگر
سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو اس میں دو
رائے نہیں ہو سکتی کہ اس فیکٹری کے مزدوروں
اور اسٹاف ممبران نے ہنگامی حالات میں
شب و روز اپنا پسینہ بہا کر فوجی اور ملکی
ضروریات کو نہ صرف پورا کیا۔ بلکہ ضرورت
سے زیادہ پیداوار میں اضافہ کیا ہے۔
شاہجہاں پور کی اسی سرزمین کی آغوش
میں جری اور عظیم جاں نثار اشفاق اللہ خاں
بسمل نے پرورش پائی اور شہادت کا بلند
درجہ پانے کے بعد یہی سرزمین ان کی آخری
آرام گاہ ہے۔ علم و ادب کے میدان میں
بھی شاہجہاں پور مقبولیت کا درجہ رکھتا ہے
علم و ادب کی تحریک کو تیز سے تیز تر کرنے
کیلئے یہاں کی مختلف ادبی انجمنوں نے
کلیدی کردار ادا کیا ہے، ماضی میں ملکی
اور حال میں بھی ـــ قومی یکجہتی آج ہمارے
ملک کا سلگتا ہوا موضوع بن گیا ہے
قومی یکجہتی کے فروغ نے ہمیں بدیشی حکمرانوں
سے آزادی دلائی۔ مگر آزادی ملنے کے
بعد ہم اپنے ملی اور قومی مفاد کو چھوڑ کر
اپنے ذاتی مفاد کی طرف زیادہ دھیان
دینے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بنیاد جس پر
ہماری آزادی اور سلامتی کی عمارت کھڑی
تھی، ہلنے لگی ہے۔ آج اسی بنیاد کو مستحکم
اور پائیدار بنانے کیلئے ہم جدوجہد کر رہے
ہیں۔ مشاعرے اور کوی سمیلن قوم
کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کر
ہیں۔ اسی مقصد کو لیکر شاہجہاں پور
آرڈننس کلودنگ فیکٹری کی بزم ادب

ب سے ہر سال ایک عظیم الشان مشاعرہ
نقد کیا جاتا ہے مشاعرے کے ایک
رپہلے اکھل بھارتیہ کوی سمیلن بھی
نقد ہوتا ہے۔ حالات کے پیش نظر
یعنی مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۸۶ء کی شب
مشاعرہ اور کوی سمیلن ایک ساتھ
ہی اسٹیج پر منعقد کیا جا رہا ہے
ناعرے کے روز پہلے اکھل بھارتیہ
ں سمیلن بھی منعقد ہوتا ہے
لات کے پیش نظر آج یعنی مورخہ
ر اکتوبر ۸۶ء کی شب میں
ناعرہ اور کوی سمیلن ایک
تھ ایک ہی اسٹیج پر منعقد کیا
رہا ہے۔ اُردو اور ہندی یعنی
بہنوں کا یہ ملا جلا پروگرام محض
مقصد کی ترویج و اشاعت
لئے کیا جا رہا ہے کہ زبان
ہے اُردو ہو یا ہندی ہمارے
لک کی زبان ہے اور دونوں
جو رشتہ ہے اس کے پیش نظر
نوں کو ایک دوسرے سے
نہیں کیا جا سکتا۔
کٹری اسٹیٹ میں واقع رام لیلا
تاریخی میدان کو خوبصورت
ڈال سے گھیر دیا گیا ہے
ٹیج کو خوبصورت طریقے سے
اکر دُلہن بنا دیا گیا ہے
سامعین کی کثیر تعداد اپنے
اعروں اور کویوں کو سُننے
لیلئے اُمڈ آئی ہے۔ خواتین نے
بھی اچھی خاصی تعداد میں جمع ہیں
پروگرام کی صدارت فیکٹری کے
ئم مقام جنرل منیجر جناب ایس پی
مشرا صاحب انجام دے رہے
ں اور نظامت ہندی کے

مشہور کوی جناب وجیندر ادستھی جی فرما رہے
ہیں۔ گل پوشی اور افتتاحی رسُومات کے
بعد صدرِ محترم صدارتی خطاب سے سامعین
کو نواز رہے ہیں۔ مشرا صاحب اپنی ہر دل
عزیزی اور مخلصانہ رسم و راہ کی بدولت
فیکٹری کے ملازمین میں بہت مقبول ہیں
سامعین ان کی بات بڑے غور اور فکر

کے ساتھ سماعت فرما رہے ہیں
اب وجیندر ادستھی مائک پر ہیں اور مشاعرے
اور کوی سمیلن کی نوعیت اور قومی یکجہتی پر مختصر
مگر سلجھی ہوئی تقریر کر رہے ہیں اور اس
سے پہلے کہ مشاعرہ اور کوی سمیلن کا آغاز ہو
کماری اُرملا سرلا استو سے ایک پُوجا یا پرارتھنا
کا گیت پیش کرنے کیلئے درخواست کر رہے

یں۔ کماری اُرملا مائک پر آکر اپنی سُریلی آواز
یں "ماں شاردا ماں شاردا ور دے مجھے۔
سُنا رہی ہیں۔ سامعین پر وجد طاری ہونے
لگا ہے۔ کماری اُرملا کا ترنم بہت پیارا ہے
بہت سُنا کر تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں ہاتھ
جوڑتے ہوئے مائک سے رخصت ہو گئیں
نقیب مشاعرہ نے فتح پور کے نوجوان
در مترنم شاعر عرفان فتح پوری کو آواز دی
عرفان کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ ابھی اپنی
تعلیمی منزلوں میں ہیں۔ ان کی آواز میں بلا کی
کشش ہے اشعار بھی موزوں ہیں مگر "
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"
کا گمان ہو رہا ہے۔ بہرحال! سامعین انہیں
داد سے نواز رہے ہیں۔ ان کا ترنم اور انداز
کسی قدر ڈاکٹر آفاق فاخری سے ملتا جلتا ہے
تاہم ڈاکٹر آفاق فاخری کی بات ہی کچھ اور ہے
عرفان کے اس شعر پر خاص طور سے سامعین
نے خوب داد دی ؎

لگ نہ جائے کسی کی نظر اسلئے
بن سنور کے نہ گھر سے چلا کیجئے

تاہم عرفان فتح پوری کو گرم کر کے رخصت
ہو رہے ہیں۔ اور اب ہندی کے کوی پیاسا
مظفر نگری کی باری ہے۔ پیاسا صاحب
سامعین کی توقع پر پورے نہیں اُترے
ان کا یہ شعر مجھے اچھا لگا ؎

آدمی کھوکھلے ہو گئے
اس لئے دوغلے ہو گئے

نقیب مُشاعرہ حضرت وجیندر راد ستھی ایک
شاعر اور ایک کوی کی راہ پر چل رہے ہیں
مشاعرہ اور کوی سمیلن کے کنوینر جناب
اختر شاہجہاں پوری ادستھی جی کی بغل میں بیٹھ کر
شعراء و کویوں کی ترتیب میں ادستھی کی مدد فرما
رہے ہیں۔ اب بریلی کے نوجوان
شاعر آصف بریلوی کو آواز دی جا رہی ہے
مائک پر آکر پہلے چند قطعات اُردو زبان سے
متعلق سُنانے کے بعد غزل سُنا رہے ہیں ؎

خموش ایک بھی لمحہ رہا نہیں جاتا
ترے بغیر تو مجھ سے ہنسا نہیں جاتا
روایتوں کی صفیں توڑ دیں سبھی ہم نے
مگر دلوں کا ابھی فاصلہ نہیں جاتا
ڈگر ڈگر میں لڑائی گلی گلی میں لہو
لہو کے چھینٹوں سے اب تو بچا نہیں جاتا
میں گھر سے سوچ کے نکلا ہوں آج یہ آصف
شریف بن کے تو مجھ سے رہا نہیں جاتا

آصف اپنی غزل ختم کر کے مائیک سے کامیاب
لوٹ رہے ہیں۔ اور اب ہندی کے کوی شری پال
بھاردواج کو آواز دی گئی ہے۔
شری پال بھاردواج طنز و مزاح کے اچھے کوی
ہیں۔ مگر میں ان کا کلام نوٹ کرنے میں کامیاب
نہیں ہو سکا اور اب گگن بھارتی کو آواز دی
جا رہی ہے میں نے دیکھا ہے کہ گگن بھارتی
اپنی وہی نظمیں سُناتے ہیں جو ہم مشاعروں
میں اُن سے ایک عرصہ سے سنتے ہوئے آئے
ہیں۔ "شان ہند" میں شائع شدہ مشاعروں
کی تفصیلی روداد میں بار بار انہیں نظموں
کے بند درج کرنا قارئین کا وقت ضائع
کرنے کے برابر ہوگا۔ اب کماری اُرملا سریواستو
کو آواز دی جا رہی ہے۔ محترمہ بڑے اعتماد
کے ساتھ پڑھتی ہیں مشاعرے کے آغاز
سے قبل "ماں شاردا ماں شاردا ور دے
مجھے" سُنا کر وہ کامیاب تھیں اس وقت بھی
ایک خوبصورت گیت سُنا کر کامیاب ہیں
مگر افسوس کہ میں کچھ بھی نوٹ نہیں کر سکا
مشاعرہ کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے
اب کفیل بسوانی کو زحمت سخن دی جا رہی ہے
کفیل بسوانی خوشگوار ترنم میں غزل پیش
کر رہے ہیں مطلع اچھا ہے مگر خلافِ
توقع انہیں داد نہیں ملی سامعین خاموش
ہیں ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی موذن
قبرستان میں اذان دے رہا ہے تاہم
دو شعر سامعین نے پسند فرمائے ؎

اک ترے روٹھنے سے یہ کیا ہو گیا
مستقل حادثہ بن گئی زندگی
ہم تو پتھر کی مورت نہیں تھے مگر
وقت کی دھوپ میں کٹ گئی زندگی

کفیل بسوانی مائیک سے کھسکے تو مزاحیہ
کوی سردار رتن میرٹھی کو آواز دی گئی
ان کا نام سُنتے ہی محفل میں ہنگامہ مچ گیا
اور سردار رتن مائیک پر آکر اپنی گھڑی سے
دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت رات کے سوا بارہ
بجے ہیں سردار رتن اپنی رچناؤں سے کم
مگر اپنے ایکشن اور مسخرے پن کی بدولت
سامعین کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر رہے
ہیں۔ مشاعرہ بالکل ہنسی مذاق کی نذر ہو گیا
ہے۔ سردار رتن تقریباً چالیس منٹ
تک سامعین کو اپنے "کرتب" دکھلاتے رہے
اب ان کے بعد جو بھی شاعر یا کوی آتا محض
قربانی کا بکرا ہی بنتا۔ اور پیچھے دوڑ در شن
لکھنؤ کے سیلانی سیوتے کو زحمت
دی جا رہی ہے۔ سیوتے صاحب جمنے کی
کوشش کر رہے ہیں مگر ماحول کچھ ایسا
بن گیا ہے کہ وہ اپنے داؤ پیچ میں کامیاب
نہ ہو سکے۔ بہرحال! کسی طرح اپنی نظم اور
غزل کے چند شعر سُنا کر رخصت ہوئے
طنز و مزاح کے مشہور شاعر ہلال سیوہاروی
سے درخواست کی جا رہی ہے۔ ہلال
سیوہاروی منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ سا
سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہلال اپنے مخ
انداز میں ایک نظم سنا رہے ہیں جس
عنوان ہے "ابھی ٹھہرا بھی اکیسویں
میں نہ جا"۔ طنز سے بھرپور اس نظم پر
خوب داد ملی۔
سامعین سننے کے موڈ میں آ
ایک اور نظم "ہم تو اکیسویں صدی
سُنا رہے ہیں جو پہلی نظم کے جواب
پڑھی گئی۔ اس میں بھی ہلال سیوہا
بہت بہت کامیاب ہیں۔ ہلال سیو
تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں مائیک

لوٹے تو وبھا مشرا صاحبہ کو آواز دی گئی جب وہ مائیک پر آئیں تو ئیں ہی نہیں تمام سامعین متوجہ ہو گئے۔ وبھا ترنم سے پڑھتی ہیں۔ ایک گیت سُنا رہی ہیں سامعین جھُوم رہے ہیں۔ وبھا مشرا کامیاب ہو کر مائک سے لوٹ رہی ہیں ــــــ اور اب طاہر رامپوری کو دعوت دی گئی ہے۔ طاہر ترنم میں چھوٹی بحر کی غزل سنا رہے ہیں۔ کچھ آپ بھی سنئے ؎

جب بھی ظلمت سوا ہو گئی
روشنی حادثہ ہو گئی
ایک تجھے دیکھنے کیلئے
زیست خود آئینہ ہو گئی
جرم طاہر نگاہوں کا تھا
اور دل کو سزا ہو گئی

طاہر صاحب رخصت ہوئے تو نہایت ادب و احترام کے ساتھ رامپور کے مقبول و معروف شاعر حضرت رئیس رامپوری سے کلام سُنانے کی درخواست کی جارہی ہے رئیس رامپوری ہلکے ترنم میں بڑی پیاری غزل سُنا رہے ہیں۔ چند شعر تبرکاً پیش کئے جا رہے ہیں ؎

تیرے لب پہ پیار کا پیغام ہونا چاہیئے
زندگی تیرا محبت نام ہونا چاہیئے
آرزو کافی نہیں اونچی اڑانوں کیلئے
بازوؤں میں بھی تو استحکام ہونا چاہیئے

رئیس صاحب واپس ہوئے تو ہندی کے مزاحیہ شاعر مظفر بجنوری مائک پر آگئے ہیں اور ماحول پھر ہنسی اور قہقہوں والا بن گیا ہے جب وہ پڑھ رہے تھے تو اختر صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ میں تیار رہوں لہذا میرا سارا دھیان اپنے آپ کو تیار کرنے میں لگ گیا۔ جب راقم الحروف کو آواز دی گئی تو اس وقت رات کے ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ماحول کا جائزہ لیکر پہلے کچھ شعر تحت میں سناتے پھر ترنم میں غزل سُنا رہا ہوں ؎

راحت طلبی کا ہم الزام نہیں لیں گے
منزل پہ پہونچ کر بھی آرام نہیں لیں گے
جس جام کے پینے سے تفریق کی بُو پھیلے
ساقی ترے ہاتھوں سے وہ جام نہیں لیں گے

غزل ختم کر کے رخصت ہوا تو نقیب مشاعرہ اظہر عنایتی رامپوری سے درخواست کر رہے ہیں۔ اظہر عنایتی غزل کے عمدہ شاعر ہیں۔ ترنم سے خوب پڑھتے ہیں۔ مائیک پر آ کر مطلع ارشاد کر رہے ہیں ؎

خطا اس کا اپنے ہاتھ کا آتا نہیں کوئی
کیا حادثہ ہوا ہے بتاتا نہیں کوئی

مطلع داد کا حقدار ہے۔ سامعین بڑا لُطف آ رہا ہے۔ مطلع دو ہرانے کے بعد فرما رہے ہیں ؎

گڑیا جوان کیا ہوئی میرے پڑوس کی
آنچل میں جگنوؤں کو چھپاتا نہیں کوئی

داد پھر اپنے شباب پر ہے۔ شعر دہرانے کے بعد پھر محفل کو یوں لوٹنے چلے ہیں ؎

دیکھا ہے جب سے خود کو مجھے دیکھتے ہوئے
آئینہ سامنے سے ہٹاتا نہیں کوئی

اظہر عنایتی بہت کامیاب ہو کر مائیک سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اب ہندی کے نوجوان کوی راجندر راجن کو زحمت دی جا رہی ہے۔ راجندر راجن وبھا مشرا کے شوہر ہیں۔ اور دونوں کی جوڑی خوب ہے۔ راجندر راجن ترنم میں گیت سُنا رہے ہیں اور محفل کو گرم رکھنے کی کوشش میں کامیاب ہیں اب مشاعرہ کے کنوینر اختر شاہجہاں پوری کو آواز دی جا رہی ہے۔ اختر شاہجہاں پوری اپنی وضع قطع سے بھی شاعر لگتے ہیں۔ مائیک پر آ کر اپنی مرصع غزل سُنا رہے ہیں چند شعر آپ بھی سنئے ؎

احساسِ گناہ کی سازش نہیں ہوئی
مدت سے میری آپ سے رنجش نہیں ہوئی
کچے مکان والے بھی خوش خوش ہیں ان دنوں
اس بار وہ تو کھُل کر بارش نہیں ہوئی
پردیس میں وہ پیار ملا ہے نہ پوچھئے
اپنے بھی گھر کو جانے کی خواہش نہیں ہوئی

اختر نے اپنے دل کا لہو بھی جلا دیا
کچھ یوں ہی اس کے فن کی ستائش نہیں ہوئی

اختر شاہجہاں پوری سامعین کی فرمائش پر چند شعر اور سُنا کر کامیاب لوٹ رہے ہیں اب ایک اور مقامی شاعر تبسم شاہجہاں پوری کو دعوت دی جا رہی ہے تبسم صاحب بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ شاعری بھی خوب کر لیتے ہیں اور بڑے اچھے اور بلند ترنم سے کلام سُناتے ہیں مائیک پر آکر غزل سرا ہیں ؎

تری یادوں نے مجھے بخشے اجالے کتنے
راہِ ہستی میں دگرنہ تھے اندھیرے کتنے
فرضِ احساس و تمنائی محبت یا دیں
میں اٹھائے ہوئے پھرتا ہوں جنازے کتنے
یاد جب مجھ کو ترا عہدِ وفا آتا ہے
طنز کرتے ہیں یہ رنگین لفافے کتنے
تم تبسم در و دیوار سے دُکھ شکوہ کہہ لو
حالِ دل رہ گئے اب پوچھنے والے کتنے

تبسم صاحب مائیک سے رخصت ہوئے تو وجیندر اَدستی خود اپنی کویتا سُنا رہے ہیں۔ وجیندر ادستی ہندی کے جانے پہچانے کوی ہیں سامعین انہیں توجہ سے سُن رہے ہیں اور داد و تحسین سے نواز رہے ہیں ــــ اس طرح مشاعرہ و کوی سمیلن کا پہلا دَور تقریباً ڈھائی بجے ختم ہوا۔ سامعین کی ابھی خاصی تعداد اب بھی موجود ہے۔ لہذا مشاعرے اور کوی سمیلن کا دوسرا دَور شروع کیا جا رہا ہے۔ دوسرا دَور بھی بہت کامیاب رہا ــــــ
اور اس طرح قومی یکجہتی کا ہلا جُلا یہ مشاعرہ و کوی سمیلن پانچ بجے صبح تک چلتا رہا۔ اس مشاعرے اور کوی سمیلن کو کامیابی کی منزل سے ہم کنار کرنے میں اختر شاہجہاں پوری ڈاکٹر یوسُف گوہر مہیش سکسینہ مہیش۔ قیصر شکیل۔ ذاکر علی حسرتؔ۔ محبوب شاہجہاں پوری۔ اور کماری ارمیلا سریواستو وغیرہ تو بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں

بقیہ ص۲۴ پر

تضمین بر غزل صادق اندوری

جو لوحِ محفوظ پر لکھا ہے وہ نام میرے سپرد کر دو
یہ چاند سورج یہ باد و باراں تمام میرے سپرد کر دو
نہاں ہیں اہلِ اس کے عقل و دانش یہ کام میرے سپرد کر دو
نیابتِ حق کا آئین امین ہوں نظام میرے سپرد کر دو
یہ صبح میرے سپرد کر دو یہ شام میرے سپرد کر دو

میں وہ ہوں جس کو بنا کے بھیجا خدائے برتر نے اپنا نائب
یہ حور غلماں یہ جن و حیواں جھکے ہیں میرے حضور میں سب
مجھی سے واضح ہوا جہاں پر فرازِ وحدانیت کا مطلب
ازل سے بخشا گیا ہے مجھ کو شعورِ انسانیت کا منصب
زمانہ جس سے گریز پا ہو وہ کام میرے سپرد کر دو

ہے میری آمد سے بدلا بدلا یہ فرشِ گیتی کا سارا نقشا
مٹایا میں نے ہی آ کے آخر یہ کفر و ظلمت کا سارا خدشا
ہر ایک بالغ نظر کو میں نے شعورِ عرفاں سے نواز بخشا
جو انتشار اب ہے زندگی میں ہے قلبِ ماہیت آ کا منشا
وجودِ آدم کے سلسلے کا پیام میرے سپرد کر دو

یہ ذاتِ حق کا ہے مجھ پہ احساں کہ مجھ کو انساں کیا ہے پیدا
بچشمِ الطاف نورِ ایماں وجودِ خاکی کو میرے بخشا
جو راز جبریل سے تھے مخفی کئے ہیں مجھ پر وہ سب ہویدا
بروزِ تخلیق دی گئی ہے مجھے کمندِ صعود پیما
جہاں تجلی ہو مسند آرا وہ بام میرے سپرد کر دو

کوئی بتائے کہ کیا ہے آخر ظہورِ شمس و قمر کا باعث
زمیں پہ گلریزیوں کا مقصد فلک پہ رقصِ شرر کا باعث
فرشتے مطلق سمجھ نہ پائے فروغِ شام و سحر کا باعث
اطاعتِ حق میں کیا کمی تھی بنا جو خلقِ بشر کا باعث
وہ دردِ دل کا بلند و بالا مقام میرے سپرد کر دو

نہ مجھ کو دنیا سے کوئی مطلب نہ مجھ کو پیاری ہے زر نہ داری
ہے خدمتِ خلق میرا شیوہ ہے میری فطرت میں خاکساری
مرا خدا عشق ہے ازل سے مری عبادت ہے انکساری
نزاعِ شرع و طریق کیا ہو ہے میرا مذہب وفا گاری
سجود میرے سپرد کر دو قیام میرے سپرد کر دو

تمہارے سینوں میں پل رہا ہے ازل سے بغض و عناد لوگو
تمہارے ذہنوں سے آ رہی ہے ہنوز بوئے تضاد لوگو
اسی لئے کہہ رہا ہے بسمل یہ تم سے بے اعتماد لوگو
تحفظ اس کا نہ کر سکو گے سنو تم اے کم سواد لوگو
جنابِ صادق کا منفرد یہ کلام میرے سپرد کر دو

از بسمل نقشبندی

شانِ ہند دہلی مارچ ۱۹۸۶ء

اردو شاعری کی ہندی اصناف

سہ روزہ کُل ہند سیمینار اُردُو اکادمی دلّی کے زیرِ اہتمام غالب اکیڈمی نئی دہلی میں منعقد ہُوا

۲۸ فروری تا ۲ مارچ ۱۹۸۷ء کو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار "اردو شاعری کی ہندی اصناف" کے موضوع پر غور و فکر کے لیے ایک سہ روزہ کُل ہند سیمینار اردو اکادمی دلی کے زیرِ اہتمام "غالب اکیڈمی" میں منعقد ہوا۔ یہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا، جس کا مقصد اردو اور ہندی کے باہمی رشتے، اور رشتوں کی اُن بنیادوں کی نشاندہی کرنا تھا جس سے یہ دو زبانیں اپنے وجود سے لے کر اب تک ایک دوسرے کی بقا اور ترقی میں معاون و مددگار رہی ہیں، تاکہ ان زبانوں میں جو فاصلہ ہے وہ کم ہوسکے اور ملکی اتحاد و سالمیت کو مزید مستحکم بنایا جاسکے۔

سمینار کا افتتاحی اجلاس پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں صبح ساڑھے دس بجے شروع ہوا۔

سمینار کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس سمینار کا مقصد صرف دو زبانوں کے لسانی رشتوں کی نشاندہی کرنا ہی نہیں بلکہ تخلیقی روایتوں اور شعری سرچشموں کا بھی جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ عوامی رواجوں کا فیضان کہاں تک پہنچا ہے۔ انہوں نے علم لسانیات کی روشنی میں اردو اور ہندی کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کے بیشتر مصادر، افعال، امدادی افعال اور اسماء وہی ہیں جو ہندی میں بھی موجود اور مروّج ہیں۔ نارنگ صاحب نے ان تخلیقی سرچشموں کی بھی نشاندہی کی جن سے دونوں زبانوں کے فن کاروں نے مشترکہ طور پر فیض اٹھایا ہے۔

اجلاس کے مہمان خصوصی اور دلی یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے سابق صدر وجیندر سناتک نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو اور ہندی کے باہمی رشتوں کو بہتر سے اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا، تاکہ وحدت قائم ہوسکے۔

خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے کہا کہ اردو ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی زبان ہے، اردو کا نقصان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نقصان ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے شکریہ کے ساتھ یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

سمینار کا پہلا اجلاس پروفیسر نذیر احمد کی صدارت میں ہوا، جس میں دو مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں نے "اردو کے آئینۂ شعر و سخن میں ہندی خد و خال کی جلوہ گری" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے قدیم شعراء مثلاً میر، انشاء کے شعری سرمائے میں ہندی الفاظ کی جلوہ گری دکھائی اور کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں ہندی کا ایک لفظ لائے بغیر کوئی جملہ مکمل نہیں ہوسکتا۔

"اردو میں بارہ ماسے کی روایت" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا کہ بارہ ماسے کی روایت کا آغاز راسو گرنتھیوں سے ہوا۔ اردو بارہ ماسے کی روایت بھی انہیں روایات سے جڑی ہوئی ہے جو چار سو سال پرانی ہیں۔

دوسرا اجلاس پروفیسر مغنی تبسم کی

صدارت اور اختر الواسع کی نظامت میں ہوا۔

"اردو میں گیت اور نعت کی روایت" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے کہا کہ ہندوستان میں گیت کو مذہبی تقدس حاصل رہا ہے۔

پروفیسر شہاب سرمدی نے "اردو اور ہندی کا اشتراک عمل" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور ہندی قومی زبان کی حیثیت سے برابر کا درجہ رکھتی ہیں اور آج کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دونوں کو اشتراک عمل کا اپنا وہ تاریخی رول ادا کرنا ہے جو شروع سے ان کا اپنا رہا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے "دکنی و گجری شاعری میں ہندی اصناف" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دوہا، کبت، جھولنا اور گیت کی روایت ان دونوں زبانوں کی شاعری میں ملتی ہے۔

پروفیسر نذیر احمد نے "مسعود سعد سلمان اور بارہ ماسہ" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ گرچہ فارسی ادب میں بارہ ماسہ کا وجود نہیں، لیکن مسعود سعد کے یہاں ایسے قطعات اور نظمیں پائی جاتی ہیں جو بارہ ماسہ کے ضمن میں آتی ہیں اور جن میں الگ الگ بارہ مہینوں کا ذکر ملتا ہے۔

یکم مارچ کو تیسرا اجلاس ظ۔ انصاری کی صدارت میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر محمود صابرین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ اجلاس لوک گیتوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس میں پانچ مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر ماجدہ اسد نے "اردو کے قدیم لوک گیت" پر اظہار خیال کرتے ہوئے قدیم شعری سرمائے میں لوک گیتوں کی نشاندہی کی اور کہا کہ لوک گیتوں کا رواج قدیم زمانے میں بھی مختلف سماجی، سیاسی اور مذہبی رسومات میں ہوتا تھا اور یہ ہماری زندگی اور ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

جناب مہیشور دیال نے "دلی کے لوک گیت" پر اپنا مبسوط مقالہ پیش کیا۔

کاظم علی خاں نے "اتر پردیش کے لوک گیتوں کی روایت" پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں گیت کی روایت کا آغاز امیر خسرو سے ہوتا ہے جو اتر پردیش کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مختلف مواقع پر گائے جانے والے لوک گیتوں کے ناموں کی نشاندہی کرتے ہوئے امانت، واجد علی شاہ اور حشر کے ڈراموں میں لوک گیتوں کی دریافت کی۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے "جدید اردو شاعری میں گیت" کے موضوع پر اپنا مبسوط مقالہ پیش کیا۔

> اردو اور ہندی قومی زبان کی حیثیت سے برابر کا درجہ رکھتی ہیں اور آج کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دونوں کو اشتراک عمل کا اپنا وہ تاریخی رول ادا کرنا ہے جو شروع سے اُن کا اپنا رہا ہے۔

چوتھا اجلاس پروفیسر مسعود حسین خاں کی صدارت میں ہوا۔ حبیب خاں نے "اردو میں دوہے کی روایت" پر گفتگو کرتے ہوئے دوہے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

شمس الرحمان فاروقی نے "میر کی ہندی بحریں" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میر نے اپنی غزلوں میں جو بحریں استعمال کی ہیں وہ نہ ہندی ہیں نہ فارسی بلکہ میر کی خاص ایجاد ہیں اور انھیں بحر میر کہنا درست ہوگا۔ ممکن ہے کہ ان بحروں کی ایجاد میں میر نے ہندی سے استفادہ کیا ہو۔

پروفیسر عابد پشاوری نے "کلام انشا" میں ہندی اصناف کی نشاندہی کرتے ہوئے رانی کیتکی کی کہانی کو پہلی ہندی صنف قرار دیا۔ اور انشا کے کلام میں چھ بولا، چوکھٹے، دوہے اور پہیلیاں وغیرہ اصناف کی بھی نشاندہی کی۔

پروفیسر جعفر رضا نے "نظیر کی شاعری پر برج بھاشا کے اثرات" پر مقالہ پیش کرتے ہوئے نظیر کو کرشن بھگتی یعنی برج بھاشا کا شاعر قرار دیا اور کہا کہ نظیر کے یہاں بھگتی ورژن کے ساتھ ساتھ وحدہ ورژن بھی ملتا ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے دوہے کی اقسام، اس کے فنی لوازم اور فکری میلانات پر روشنی ڈالی۔

۲ مارچ ۱۹۸۸ء کو سمینار کا پانچواں اجلاس پروفیسر جعفر رضا کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے "سودا کے کلام میں ہندی پنجابی اصناف کی جھلک" پر اظہار خیال کرتے ہوئے سودا کے شعر میں ہندی اصناف کی نشاندہی کی اور کہا کہ سودا کے یہاں دوہرا بند مرثیہ، چوپائی، دوہا اور پہیلیاں ملتی ہیں۔ مرثیوں میں گیت کا آہنگ ٹیپ کے بند میں ملتا ہے۔

قیصر جہاں کا مقالہ "قدیم اردو شاعری میں گیت کی روایت" پر تھا۔

"اردو عروض پر ہندی پنگل کا اثر" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی نے کہا کہ متقدمین سے متاخرین تک تمام شعرا نے ہندی پنگل کے اوزان میں شاعری کی ہے۔ اردو کے بہتر اوزان ایسے جو ہندی پنگل سے مماثل ہیں۔ بحر اور چھند میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمود حسن نے "ایہام گوئی پر ریتی کال کی ہندی شاعری کا اثر" پر

...رتے ہوئے کہا کہ ابتدائی دور سے ہی غزلوں پر ...یت کا رنگ غالب رہا ہے اور یہ عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے اور آج بھی جذبات ...نگاری میں گیت کے پیرایوں سے بھرپور استفادہ ...لیا جا رہا ہے۔

رشید حسن خاں نے "اردو میں کبت ...کی روایت" سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ باغ و بہار ...ور نوطرزِ مرصع کے علاوہ اردو کی قدیم کتابوں ...میں کبت ملتے ہیں۔ انھوں نے کلام سودا میں کبت ...کی نشاندہی کی۔

ظ۔ انصاری نے اردو شاعری اور ...ہندوستانی موسیقی کے رشتوں پر چند خیالات ...اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ابتدا ہی سے اردو شاعری ...اور موسیقی کا اٹوٹ رشتہ رہا ہے جس کو فراموش کر دیا گیا ہے اس رشتے کو پھر تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سمینار کے محرک پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "امیر خسرو کے ہندی کلام" پر اپنا مبسوط اور عالمانہ مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خسرو کے یہاں تین طرح کا ہندی کلام پایا جاتا ہے اور سبھی کی اہمیت مسلّم ہے البتہ اسناد میں فرق ضرور ہے۔

سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈی۔ پی۔ پٹنائک نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے اردو اور ہندی کے رشتوں کے کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔

صدرِ جلسہ پروفیسر نامور سنگھ نے اپنی عالمانہ صدارتی تقریر میں گنگا جمنی تہذیب کی ان بنیادوں کی تلاش پر زور دیا جس سے مشترکہ کلچر پھر سے وجود میں آسکے اور قومی اتحاد و سالمیت کی فضا کو مزید سازگار بنایا جا سکے۔ انھوں نے اس سلسلے میں اس سمینار کو بہت اہم قرار دیا۔

...مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ برج کے دوہوں سے الفاظ و معنی کی تہ داریاں اردو میں آئی ہیں۔

چھٹا اور آخری اجلاس ہندی کے نامور ادیب پروفیسر نامور سنگھ کی صدارت میں ہوا۔ پروفیسر مغنی تبسم نے "اردو غزل اور گیت" پر اظہارِ خیال

تین دن سے جاری یہ سمینار جو اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے بہت اہم تھا بہت کامیاب رہا۔ اجلاس سید شریف الحسن نقوی سکریٹری اردو اکادمی دہلی کے مخصوص شکریہ پر ختم ہوا۔

ہوا کا رُخ

نجمہ مودی

بیٹیوں والوں کے لئے بطورِ خاص ایک راہنما تحریر

آج کے دَور کی کہانی بیان کرنے کے لئے مُحترمہ نجمہ مودی نے قدیم داستانی طرزِ نگارش کا سہارا لیا ہے۔ سپنوں کے دیس سے آنے والے شہزادوں کا انتظار کرنے والوں کے لئے ایک راہ نُما تحریر

مغربی بنگال کی ایک چھوٹی سی بستی میں سری لال نامی ایک برہمن رہتا تھا۔ دولت اور حسب نسب کے اعتبار سے وہ بستی کا سب سے معزز پنڈت تھا۔ اس کے علاوہ ذہانت اور دور اندیشی کی بنا پر بھی اسے بستی میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل تھا۔ اس کے ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام شیاما تھا

شیاما جوان ہو چکی تھی اور بہاری لال اس کی شادی کے سلسلے میں خاصا فکرمند تھا یوں تو بستی میں موجود دو ایک برہمن گھرانوں میں مناسب بَر موجود تھے لیکن نہ جانے کیوں بہاری لال نے ان سے سلسلۂ جنبانی نہیں چھیڑا تھا

اُس زمانے میں رواج تھا کہ رشتہ کا پیغام لڑکی والوں کی طرف سے جاتا تھا اور بات پکی ہونے پر لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کو چاندی کا ایک روپیہ دیا جاتا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی سمجھی جاتی تھی کہ لڑکی اس کی امانت ہو چکی ہے۔ ایک روز بہاری لال نے ایک نائی کو طلب کیا اور مُدعا بیان کرتے ہوئے کہا "یہ دو روپے رکھ لو اور دکن کی طرف واقع تمام بستیوں کا سفر کر کے ہماری لاڈلی بیٹی شیاما کے لئے اچھے سے اچھا بَر تلاش کرو..... لیکن ایک بات کا خیال رکھنا"

"وہ کیا مہاراج؟" نائی نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا۔

"جب بھی تمہیں بر دکھوے کے لئے لڑکے سے ملوایا جائے لڑکے سے یہ ضرور پوچھنا کہ وہ ہوا کا رخ پہچانتا

ہے یا نہیں ؟

نائی جو رشتہ ڈھونڈنے اور جہاں دیدہ
لوں کی باتیں سمجھنے میں گھاگ تھا، فوراً سر ہلاتے ہوئے
بلایہ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا مہاراج، بالکل چنتا نہ
یں۔میں بالکل آپ کی آشا کے مطابق بر تلاش کروں گا۔"

نائی اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔پہلے وہ جس بستی میں
نچا وہاں اُسے ایک آسودہ حال برہمن گھرانے کا کھوج
ا۔ وہ ان کے ہاں پہنچا، مدعا معلوم ہونے پر نائی کی خوب
ذیرائی ہوئی اور اسے لڑکے سے ملوایا گیا۔

نائی نے لڑکے سے پہلا سوال یہی کیا "بیٹا ہوا
ا رخ پہچانتے ہو؟"

لڑکے نے فوراً جواب دیا "کیوں نہیں
ج پُروا ہوا چل رہی ہے۔"

نائی مایوس ہوگیا۔ یہ اس کے مطلب کا نوجوان
ہیں تھا۔حالانکہ گھرانہ بڑا خوش حال تھا۔ ندی کے
ارے ان کی دو پن چکیاں تھیں۔ بازار میں دُکانیں
ی تھیں اور ان کا حویلی نما مکان بستی میں سب سے
چھا تھا۔نائی نے معذرت کی اور آگے چل دیا

اس کے بعد وہ منزل بہ منزل مسافرت کی صعوبتیں
اٹھاتا کئی بستیوں میں گیا لیکن کہیں بھی اسے مطلب
کا بَر نہ مل سکا۔بہت سے آسودہ حال گھرانوں میں اس کا
جانا ہوا۔جہاں لکشمی اور روپ، دونوں کی بہتات تھی۔
بڑے بڑے خوش شکل نوجوانوں سے اس کی ملاقات ہوئی
مگر جب وہ اپنا سوال دہراتا تو اسے اسی قسم کا جواب ملتا:

"جی آج دکنی چل رہی ہے۔"

"آج ہوا کا رخ اتری ہے۔"

"آج ہوا پچھمی چل رہی ہے۔"

نائی کی منشا کے مطابق یا یوں کہیئے کہ بہاری لال کی
منشا کے مطابق غالباً ان میں سے کوئی جواب نہیں تھا۔نائی
کافی حد تک مایوس ہو چلا تھا کہ اُس کا گذر ایک چھوٹی
سی بستی سے ہوا۔حسب سابق اس نے وہاں برہمن گھرانوں
کا پتہ کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ پوری بستی میں ایک ہی برہمن
نوجوان ہے جو اعلیٰ درجہ کا جوتشی ہے اور علم جوتش ہی اس
کا ذریعہ معاش ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں اور وہ
اکیلا ہی اپنے کچے مکان میں رہتا ہے۔ نائی کو وہ مکان
ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کیونکہ بستی کے لوگوں کو قسمت
کا حال بتانے کی وجہ سے وہ خاصا معروف تھا۔

نائی کو اس کا معمولی سا مکان دیکھ کر کچھ مایوسی
ہوئی۔ وہ بہاری لال کی بیٹی کے لئے بر تلاش کرتا پھر رہا تھا
اور بہاری لال کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔تاہم نائی نے
قسمت آزمائی کے لئے دستک دے ہی دی۔

کھدر کی دھوتی اور واسکٹ پہنے ایک دبلا پتلا
گورا نوجوان مکان سے برآمد ہوا جس کے ہاتھوں میں گیلا
آٹا لگا ہوا تھا۔نائی کو نمسکار کر کے وہ اسے اپنے ساتھ
اندر لے گیا۔ تو نائی نے دیکھا کہ وہ روٹیاں پکا کر فارغ
ہوا تھا۔ نوجوان نے نائی کی آمد کا مقصد پوچھے بغیر
بھجیا اور چپاتیوں پر مشتمل سادہ کھانا، اُس کے سامنے
رکھ دیا۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوا۔ تب نوجوان
نے بڑے ادب سے نائی کی آمد کا مقصد دریافت کیا
نائی نے اسے بتا دیا کہ وہ کس لئے آیا ہے۔

نوجوان بولا "مہاراج! آپ دیکھ رہے ہیں کہ
میں بالکل اکیلا اور غریب آدمی ہوں۔ لوگوں کی قسمت
کا حال بتا کر گھر میں دانہ لے آتا ہوں۔ اگر آپ مجھے
اس قابل سمجھتے ہیں تو ....."

نائی اس کی بات کاٹ کر بولا "وہ سب
ٹھیک ہے بیٹا! لیکن یہ بتاؤ، تم ہوا کا رُخ پہچانتے
ہو؟"

نوجوان کی آنکھوں میں چمک آگئی اور وہ لفظوں
پر زور دیتے ہوئے معنی خیز سی مسکراہٹ کے ساتھ
بولا "خوب اچھی طرح۔"

نائی کی زمانہ شناس نظروں نے پرکھ لیا
کہ یہی وہ نوجوان ہے جس کی اُسے تلاش تھی۔اُس نے
خلافِ توقع ہوا کا رُخ پورب، پچھم، اتر یا دکن نہیں
بتایا تھا۔ نائی نے فوراً چاندی کا روپیہ نکال کر اس کے
ہاتھ پر رکھا اور کہا اگلے چاند کی ۲۰ تاریخ کو بیاہ
کے لئے آجانا۔کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں۔"

نائی اپنی بستی واپس پہنچا اور بہاری لال کو
پورے سفر کا احوال سنایا۔ بہاری لال نے اس کے
انتخاب پر اطمینان کا اظہار کیا۔

اگلے چاند کی ۲۰ تاریخ کو وہ نوجوان جس کا
نام شانتی لال تھا، اپنی بستی کے چار چھ آدمیوں کے
ساتھ بہاری لال کی لڑکی شیاما کے پھیرے انجام پاگئے

اگلی صبح شانتی لال اپنی بیوی کو لے کر روانہ ہوا اور خاصے
طویل سفر کے بعد اپنی بستی پہنچ گیا۔

ایک سال بیت گیا۔اُن کی ازدواجی زندگی بڑی
پُر سکون تھی۔

قدرت کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ بنگال میں قحط پڑ گیا
دریاؤں کی سرزمین خشک ہوگئی، کیا شہر، کیا دیہات،
سبھی اس کی لپیٹ میں آگئے اور بستیوں میں اناج کے
دام آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ شانتی لال کی بستی میں
بھی غریب لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ ایسے میں کسے اپنی
قسمت کا حال معلوم کرنے کا ہوش رہتا۔سب کو اپنے
ہاتھ کی لکیروں میں بھوک صاف نظر آرہی تھی۔کون
شانتی لال کے گھر مفت اناج پہنچاتا؟ کئی کئی دن
گذر جاتے اور کوئی شانتی لال کے ہاں قسمت کا
حال پوچھنے نہ آتا۔ گھر میں چولہا ٹھنڈا رہنے لگا

ایک روز شانتی لال کچھ سوچ کر گھر سے
نکل کھڑا ہوا۔ جب وہ شام کو واپس آیا تو اس کے
پاس اناج کی گٹھری موجود تھی۔ دراصل شانتی لال
کچھ چھوٹے موٹے اوزار خرید کر بستی سے دور اُس
سڑک پر جا بیٹھا تھا جہاں سے تجارتی قافلے اخیار
وغیرہ لے کر گذرتے تھے۔ وہ وہاں قافلے والوں کے
ٹوٹے پھوٹے جوتے مرمت کرنے لگا تھا۔اس کے عوض
اسے کچھ گندم مل جاتی تھی۔ یہ کام چونکہ برہمنوں کی شان
کے خلاف تھا۔اس لئے اس نے اپنی بیوی کو بے خبر
رکھا۔ وہ آتے وقت اوزار ایک جگہ چھپا کر رکھ جاتا
بیوی کو اس نے یہ کہہ کر مطمئن رکھا کہ اس نے ایک
برہمن ساہوکار کے ہاں نوکری کر لی ہے۔

وقت گذرتا گیا۔ بڑے بڑے گھروں کے چولہے
ٹھنڈے پڑ گئے۔ بڑے بڑے آسودہ حال گھرانوں
کا سونا، چاندی، اناج خریدنے میں خرچ ہو چکا تھا
لوگ اپنی ہر متاعِ عزیز کے بدلے اناج خریدنے کو
تیار رہتے تھے۔ سفید پوشوں کا بھرم تو کب کا ٹوٹ
چکا تھا...... لیکن شانتی لال کے گھر کے روز و شب
وہی تھے۔ ان کے ہاں چولہا باقاعدگی سے روشن ہوتا
اور انہوں نے کبھی فاقہ نہیں کیا..... کیونکہ اس
سڑک سے اب بھی اکا دکا قافلہ ایسا ضرور گذرتا
تھا جس کے پاس تھوڑا بہت اناج موجود ہوتا

تھا جیسے وہ کسی ایسے دُور دراز علاقے کی طرف سے جاتے تھے جہاں اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ملنے کی توقع ہوتی تھی اور ٹوٹے ہوئے جوتے بہرحال ان کے لئے تکلیف دہ ہوتے تھے۔ اُن کی مرمت تو انہیں کرانا ہی پڑتی تھی۔

ایک دن اتفاق سے ایک عورت نے شانتی لال کو سڑک پر جوتے گانٹھتے ہوئے دیکھ لیا وہ حیرت زدہ رہ گئی اور اُس نے بستی میں آکر انتہائی طنزیہ لہجہ میں شانتی لال کی بیوی شیاما سے کہا "تم بڑی پنچی برہمنی بنی پھرتی ہو۔ تمہارا پتی تو چمار ہے، چمار .... جوتے گانٹھتا ہے۔ ہمیں تو آج پتہ چلا کہ وہ اصل میں جوتشی نہیں بلکہ چمار ہے۔ ہم خواہ مخواہ اسے اپنا ہاتھ دکھاکے اپنا شریر اور دھرم دونوں ہی بھرشٹ کرتے رہے ہیں۔"

شیاما بڑی سیخ پا ہوئی اور اس عورت کو جھٹلانے لگی۔ عورت بولی "چلو میں بھی دکھائے دیتی ہوں، وہ جوتے گانٹھتا نہیں۔"

شیاما نے چادر لپیٹی اور اُس کے ساتھ ...پھر اُس نے دُور ہی سے دیکھ لیا کہ شانتی لال واقعی ...ے گانٹھ رہا ہے۔ تنک مزاج شیاما نے آؤ دیکھا ...نہ، پاؤں سے جوتی اتاری اور اپنے دھرم پتی کے ...پہنچ کر اس کے سر پر رسید کی اور چلائی "کیوں ...چمار زادے؟"

وہاں قافلے والے اپنی جوتیاں ٹھیک ہونے ...طر تھے شانتی لال فوراً اٹھا اور شیاما کی بات ...ہاتھ باندھتے ہوئے بولا "دیوی جی! اگر آپ ...ی ٹھیک سے مرمت نہیں ہوئی تو چنتا نہ کریں، ...دوبارہ مرمت کر کے آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔ ...یں غصّے کی آخر کیا بات ہے۔ آپ گھر چلیں...." ...ے ہوئے وہ اسے سمجھاتا بجھاتا ایک طرف لے گیا ...دوسری عورت سے استدعا کی کہ وہ اس کی ...کو گھر لے جائے۔

شیاما بھی جھینکتی گھر چلی گئی۔ شانتی لال کی بُرد ...اور تحمل مزاجی نے قافلے والوں کو بھی متاثر دیا کہ اس عورت نے جوتی مرمت کرائی ہوگی اور وہ خراب ہوگئی ہوگی۔ کسی کو علم نہ ہوسکا کہ وہ شانتی لال کی بیوی تھی۔

شام کو شانتی لال گھر پہنچا تو شیاما بھری بیٹھی تھی اندر سے چیخ کر بولی "خبردار جو تمہارے چرن اندر آئے چمار کہیں کے.... تم نے مجھ پوتر کا بھی دھرم نشٹ کر دیا۔"

شانتی لال نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ ایک امیر برہمن کی سرچڑھی بیٹی تھی۔ اُس نے شانتی لال کو گھر میں قدم رکھنے نہیں دیا۔ باہر ہی ایک الگ برتن میں اُسے کھانا دے دیا جو شانتی لال نے باہر ہی بیٹھے بیٹھے کھا لیا۔ وہ کھانا کھا کر فارغ ہُوا تو شیاما جو اپنا سامان باندھ چکی تھی، بولی "مجھے میرے میکے چھوڑ آؤ۔ میں کسی چمار کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

شانتی لال نے ایک بار پھر اُسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانی۔ آخر شانتی لال بولا "اچھا بھاگوان! اب تو رات ہوگئی ہے۔ کل صبح تجھے چھوڑنے چلوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ڈیوڑھی ہی میں چادر بچھا کر سوگیا۔

اگلی صبح وہ روانہ ہوئے۔ شانتی لال کے سر پر گٹھری تھی اور اس کے آگے غصّے میں بھری شیاما تیز تیز چل رہی تھی۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر وہ کرائے کے یکے میں بیٹھے اور پھر روانہ ہوگئے۔ سفر خاصا طویل تھا۔ راہ میں ایک بستی میں ستانے کے لئے ایک جگہ یکے والے نے یکہ روک لیا۔ وہاں قریب ہی عورتوں اور مردوں کا ہجوم تھا۔ شانتی لال تو افسردہ سا یکے سے اُتر کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ شیاما تجسّس سے مجبور ہوکر اور کسی دلچسپ تماشے کی توقع لے کر ہجوم کی طرف چل دی۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان جگہ بناتی ہوئی وہ کافی آگے تک چلی گئی تاکہ ٹھیک سے تماشہ دیکھ سکے۔ مگر وہ دوسرے ہی لمحے بجلی کی سی تیزی سے واپس آگئی اور شانتی لال یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ شانتی لال کا بازو تھام کر بولی "چلو، واپس چلو پتی جی! میں میکے نہیں جاؤں گی۔"

شانتی لال حیران سا اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں اسی یکے میں واپس روانہ ہوگئے۔ راستے میں شیاما نے اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہا "شما کر دیجئے جی! تم کتنے اچھے ہو، تم نے خود جو بھی پیشہ اختیار کیا مگر میرا قدم گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ وہاں تو مجمع میں میری ماں ناچ رہی تھی اور میرا باپ ڈھول بجا رہا تھا۔ اس طرح وہ دونوں اناج جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

شانتی لال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ دھیمے لہجے میں بولا "تمہارے پتا جی بھی ہوا کا رُخ پہچانتے ہیں۔"

بیانِ حقوقِ ملکیت و دیگر تفصیلات بابت ماہنامہ "شانِ ہند" نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲ بموجب فارم نمبر ۴ حسب قاعدہ نمبر ۸

مقامِ اشاعت:- فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

وقفۂ اشاعت:- ماہنامہ

نام طابع، ناشر و ایڈیٹر:- وِدیا پرکاش سرور

قومیت:- ہندوستانی

مقامِ سکونت:- فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

حقوقِ ملکیت:- وِدیا پرکاش سرور

مَیں وِدیا پرکاش سرور ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی بذریعہ ہٰذا اعلان کرتا ہوں کہ متذکرہ صدر تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق صحیح اور درست ہیں۔

دستخط
وِدیا پرکاش سرور تونسوی
یکم مارچ ۱۹۸۶ء

ایس۔ تیواری

بابا بوڑھ شاہ

بابا بوڑھ شاہ نے چندھیائی ہوئی نظروں سے فقیر چند کی طرف دیکھا اور ڈپٹ کر کہا "ایک سگریٹ نکال بے۔"

فقیر چند نے جلدی سے ریڈلمپ کی ڈبیا نکالی اور بڑے ادب کے ساتھ ایک سگریٹ بابو بوڑھ شاہ کو پیش کیا مگر بابا بوڑھ شاہ نے ڈبیا اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ ایک ایک سگریٹ نکال کر ڈبیا اس نے پاس ہی جلنے کے ڈھیر پر پھینک دی فقیر چند مسرت بھری نظروں سے ڈبیا کی طرف دیکھنے لگا بابا بوڑھ شاہ نے کڑک کر کہا۔ "اس میں صرف پانچ سگریٹ تھے اور ہم ——— تیرے ماتھے پر تقدیر کا یہ لیکھ پڑھ رہے ہیں کہ دو دن بعد تو دس ہزار روپے کا مالک ہوگا ——"

"دس ہزار ——!" فقیر چند نے بابا بوڑھ شاہ کے گرد سے اٹے پاؤں چوم لئے ———

بابا بوڑھ شاہ نے اپنے قریب رکھی ہوئی لاٹھی اٹھائی اور فقیر چند کی پیٹھ پر دھڑا دھڑ برسانا شروع کر دیا۔

فقیر چند چپ چاپ پٹتا رہا۔ بوڑھ شاہ نے لاٹھی ایک طرف رکھ دی سگریٹ کو لعاب سے تر کرتے ہوئے بولا "دیکھا؟"

"دیکھ لیں ——" فقیر چند کے منہ سے کراہ

"ماچس دے!" بابا ڈپٹ کر بولا۔
" فقیر چند نے ماچس نکال کر دے دی ۔
بانے ایک تیلی جلائی۔ پھر پھونک مار کر اسے
ھا دیا ۔۔۔ دوسری جلائی اسے بھی پھونک مار
بجھا دیا۔ تیسری تیلی سے سگریٹ جلا کر ماچس
الپس فقیر چند کو دیتا ہوا بولا۔ " اسے حفاظت
سے اپنے پاس رکھ۔ کھونا نہیں ۔۔"
فقیر چند نے ماچس کو سوتی کوٹ کی اندر
جیب میں رکھ لیا۔ اور پھر بابا کے پیر پکڑ لئے۔
" اب کیا مانگتا ہے؟" فقیر چند نے گڑگڑا
تے پوچھا ۔۔ اور پھر ریڑھ کی ہڈی پر ہاتھ رکھ
کراہا ۔۔
جتنا تیرے پاس ہوگا" بابا نے سگریٹ کا
ردار کش لیا اور کھانستے کھانستے بے دم ہو گیا۔
" بھاگ جا اب" کھانسیوں پر قابو پانے
ناکام کوشش کرتے ہوئے بابا بوڑھ شاہ نے
یر چند سے کہا ۔۔
فقیر چند نے ایک بار پھر بابا کے قدم
ے اور سر جھکائے خیالوں میں ڈوبا سور اسی
اسٹیشن کی طرف بڑھ چلا۔
جیٹھ کا سورج مغربی اُفق میں جھکتا چلا جا
ا تھا ۔۔ زمین گویا آگ اُگل رہی تھی ۔۔۔
بعد حبس فقیر چند نے سوتی کوٹ کے بٹن
ہوئے تو اسے جیب میں رکھی ماچس کا خیال
۔۔ ٹاہلی کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر
نے ماچس میں سے تیلیاں نکال کر گنیں ۔
لیس تھیں ۔۔۔
"چھیالیس" وہ ہونٹوں میں بدبدایا۔
نے دو تیلیاں جلا کر بجھا دی تھیں ۔ چھیالیس
دو ۔۔۔ دو دونے چار دو تیا چھ تینتیس
"تینتیس ۔۔۔" اس نے زور سے نعرہ
اور پھر خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے
جیسے ڈر ہو کہ کوئی سُن نہ لے ۔ لیکن
دُور تک کسی آدم زاد کا پتہ نہ تھا ۔۔۔
بند نے مطمئن ہو کر ماچس میں تیلیاں بھریں
بہایت احتیاط سے ماچس کو کوٹ کی اندر

کی جیب میں رکھ لیا ۔۔۔
اس کے دل کی عجیب حالت تھی ۔۔
دو دن کے بعد وہ دس ہزار روپے کا مالک
ہوگا ۔۔ تصور میں اپنی بیوی کو مخاطب کر کے
اس نے کہا " دھنّو کی ماں لے اپنے دن
پھر گئے ۔۔ دھنّو کے ہاتھ پیلے کر دوں سے
اب جلدی سے پھر ۔۔۔" اور پھر ۔۔"
اُسے سگریٹ کی طلب ستا رہی تھی۔
جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ٹکڑ بیا تو بابا بوڑھ شاہ
نے پھینک دی تھی ۔۔ کتنے سگریٹ تھے بھلا
اس میں؟ ۔۔ پانچ ۔۔ اِتنیس کے تین اور
اور دو ملا کر کتنے ہوئے ۔۔ پانچ ۔۔ پانچ۔
جے بابا ۔۔ بوڑھ شاہ کی ۔۔!
اسٹیشن پہنچ کر اس نے ٹکٹ خریدا ہی
تھا کہ گاڑی آ گئی ۔۔ وہ لپک کر تھرڈ کلاس کے ڈبے
میں چڑھ لیا ۔۔ ڈبے میں بس دو تین آدمی ہی تھے
وہ ایک برتھ پر لمبا لیٹ گیا ۔۔ سامنے کی برتھ پر
منحنی سا شخص بیڑی پی رہا تھا ۔ فقیر چند کو سگریٹ
کی طلب اور زیادہ ستانے لگی ۔ مگر گاڑی چل چکی تھی
اس نے آنکھیں موند لیں تاکہ وہ اس شخص کو بیڑی
پیتے ہوئے نہ دیکھے ۔
" دس ہزار روپے ۔۔۔ اس کے دل کے
کسی گوشے سے آواز آئی ۔۔ اور وہ مسکرا دیا۔
" ہے بھگوان، تو سچ مچ چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے ۔۔
نہ جانے کتنے لوگ بابا بوڑھ شاہ کے در پر ۔۔۔
ٹھوکریں کھاتے پھرے ۔۔۔ ہیرو اور بدھو اور
جیلا ۔۔۔ سبھی تو جا چکے تھے ۔۔۔ بابا بوڑھ شاہ
نے کسی کو گالی تک نہ دی ۔۔۔ اور اسے فقیر چند
کو لاٹھی لے کر پیٹا ۔۔۔ جب بھگوان مہربان ہوتا
ہے تو ایسے ہی ہوتا ہے ۔۔ تینتیس لاٹھیاں ۔۔"
فقیر چند کو جھرجھری آئی ۔ مگر یہ وقت کہاں چوٹوں پر دھیان
دینے کا تھا ۔۔ " ارے ہاں اب وہ گھسیٹا سُنار
دھنّو کی ماں کی کنٹھی کا سو روپیہ دے دے تو
بات ہے ۔۔"
" دے گا۔ ضرور دے گا" فقیر چند نے خشک
ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری ۔۔ بابا بوڑھ

شاہ کا بول کبھی اکارت نہیں جاتا ۔۔ گھسیٹا نہ
دے گا تو منی لعل دے گا۔
گاڑی سے اتر کر جب فقیر چند گھر پہنچا
تو اس کی بیوی ہمیشہ کی طرح مشین لئے بیٹھی
تھی ۔۔۔ فقیر چند کو آتا دیکھ کر وہ اٹھی ۔۔۔ اسے
کھانا دیا اور پھر کپڑے سینے میں مشغول ہو گئی ۔۔۔
فقیر چند روٹی ہاتھ میں لئے اُسے مشین
چلاتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ کتنی کمزور ہو گئی تھی۔
وہ فقیر چند نے روٹی کے ٹکڑے میں سالن لپیٹا
اور منہ میں ڈال کر اسے چباتے ہوئے سوچنے لگا
کہ بیوی کو خوش خبری سنائے یا نہیں ۔
اس کا دل تو نہیں مانتا تھا ۔۔ مگر ضبط
کر کے اس نے یہی فیصلہ کیا کہ ابھی کسی کو کچھ نہیں
بتائے گا ۔۔۔ " مگر کنٹھی تو مانگنا ہی ہوگی ۔
خیر دیکھا جائے گا ۔۔ کل چپکے سے نکال
لوں گا اور پھر پرسوں تو دس ہزار روپے میرے
ہوں گے ہی ۔۔"
رات بھر اسے اسی طرح خواب دکھائی
دیتے رہے ۔ اس نے دیکھا کہ وہ روپوں کے
ڈھیر پر بیٹھا قہقہے لگا رہا ہے ۔۔۔ پھر اس نے
دیکھا کہ دھنّو کی شادی ہو رہی ہے اور وہ کیسری
پگڑی سر پر باندھے براتیوں کی آؤ بھگت
کر رہا ہے ۔۔۔ پھر اچانک اس نے دیکھا کہ وہ
بابا بوڑھ شاہ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے اور ۔
بابا بوڑھ شاہ زمین پر ایک دائرہ کھینچتے ہوئے
کہہ رہا ہے " یہ ایک اسکول ہے ۔۔۔ دو لڑکے
اس طرف سے آتے ہیں اور بغیر اسکول میں داخل
ہوئے نکل جاتے ہیں ۔۔۔" بابا نے دائرہ
کے اوپر لکیر کھینچی " تین اور لڑکے آتے ہیں
اور اس راستے سے ہو کر گزرتے ہیں ۔۔ بس
سمجھ گئے نہ ۔۔۔ اسکول میں سب کچھ اُلٹا
لٹک رہا ہے ۔۔۔ سمجھ گئے نہ؟
اس کی آنکھ کھل گئی ۔۔ صبح ہونے
والی تھی ۔۔۔ " صبح کا خواب ضرور سچ ہوگا"
اس نے سوچا ۔ دو لڑکے ۔۔۔ سیدھے
گزر گئے ۔۔ تین لڑکے بیچ میں سے سیدھے،

یعنی دو کا ہندسہ سیدھی طرف اور تین کا ہندسہ بائیں طرف ــــ بنے تیئس ۔ سب کچھ اُلٹا لٹک رہا ہے ۔ ہندسے اُلٹ دو بنے تیئس ــــ بالکل ٹھیک ــــ تیئس ہی تو بنے ہیں ــــ

دھنو کی ماں صبح جلدی اٹھ جاتی ہے مشین چلاتے چلاتے وہ خود بھی گویا مشین بن گئی تھی ــــ چائے بنا کر لائی تو چائے کا گلاس پکڑتے وقت فقیر چند کو اپنی وفا شعار بیوی پر بے ساختہ پیار آ گیا ۔ دس ہزار روپے کی بات سے اس کے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے ۔ بانہہ پکڑ کر بیوی کو چارپائی پر بٹھاتا ہوا بولا "بس اب تو چرخا چھوڑ بھاگوان ــــ اپنے دن پھرے کہ پھرے ــــ"

بھاگوان مسکرائی اور کچھ بولی نہیں ــــ

فقیر چند ایک عجیب نشے سے سرشار تھا ۔ اس نے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا "بس اب تو لا دوں گا تجھے ساتھ ہی اسے خیال آگیا کہ اسے آج کسی طرح اپنی بیوی سے کنٹھی لینا ہے ــــ گھر میں لے دے کر بس یہی ایک زیور بچا تھا ۔ بے کاری کے چار سو برسوں میں گھر تباہ ہو گیا تھا ۔ بیوی بھلا کتنا کما سکتی تھی ۔ برکت تو مرد کی کمائی میں ہوتی ہے ۔ اور فقیر چند کی نوکری ایک بار چھوٹی تو پھر وہ کسی بھی دھندے میں ٹک نہ پایا تھا ۔

فقیر چند کی آنکھوں میں غم کے بادل اتر آئے لیکن پھر اسے بابا بوڑھے شاہ کی بات یاد آگئی اور اس کا دل امنگ سے بھر گیا ۔

دھنو کی ماں اٹھ کر گئی تو وہ دل ہی دل میں منصوبے بنانے لگا ۔ پھر کسی طرح سے بیوی کی نظروں بچا کر وہ کنٹھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ بیوی کو بتانا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا ۔ وہ ضرور احتجاج کرتی ۔ بعد میں خواہ ہمیشہ کی طرح جھک ہی کیوں نہ جاتی ۔ فقیر چند نے اس شبھ کام میں الجھن پالنا مناسب نہ سمجھا ۔ پھر دس ہزار ملنے والے تھے ہی ــــ

دوپہر کا کھانا کھا کر جب اس کی بیوی سو گئی اور اس کی بیٹی سلے ہوئے کپڑوں میں بٹن ٹانکنے بیٹھ گئی تو فقیر چند نے کنٹھی احتیاط سے جیب میں ڈالی اور گھسیٹے کی دکان کی طرف نکل لیا ۔

قسمت واقعی مہربان تھی ۔ گھسیٹا سو روپے دینے کو راضی ہو گیا ۔ فقیر چند نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دس دس کے دس نوٹ لئے ــــ ذہن میں خیالات کا ہجوم لئے وہ آہستہ قدموں سے نانک استاد کے اڈے کی طرف بڑھ چلا ۔

اب تو سارے دکھ ٹل گئے ۔ دھنو کی ماں کو اب کبھی مشین نہیں چلانا پڑے گی ۔ دھنو اپنے گھر جائے ۔ پھر کیا ہے ایک دکان کھول لے گا وہ اور چین کی بنسی بجائے گا ۔ اور پھر کبھی نانک استاد کے اڈے کی جانب اس کے قدم نہ اٹھیں گے ۔

نانک استاد کے اڈے پر اس کے یاروں نے اسے گھیر لیا ۔ اور اس سے پوچھنے لگے کہ اسے وہ نمبر کس نے بتایا ۔ اس نے انھیں ادھر اُدھر کی باتیں بنا کر ٹال دیا ۔ پھر بھی اس کی دیکھا دیکھی چیلے بیرو اور جوالے نے تیئس نمبر پر لگا ہی دیئے ۔ فقیر چند کو یہ بات بری لگی مگر اس کا علاج بھی کیا تھا ۔

اڈے سے چلا تو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے ۔ اب اسے دس ہزار روپے کا مالک بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا ۔ پھر تصور میں اس نے ایک دکان بھی کھول لی اور وہ دکان خوب چل نکلی اور وہ فقیرے سے لالہ فقیر چند بن گیا اور اس کی بیوی کے گلے میں دس تولے کی کنٹھی آگئی ۔ اور کلائیاں چوڑیوں سے لد گئیں اور خود اس کی قمیض میں سونے کے بٹن لگ گئے اور جیب میں سونے کی جیبی گھڑی آگئی اور ــــ

اور اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے ۔ وہ صرف کسی موٹر کے بریک لگنے کی آواز سن پایا ۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا گیا ۔

اس کی آنکھ قصبے کے اسپتال میں کھلی ۔ ہسپتال کا چھوٹا سا وارڈ آدمیوں سے بھرا ہوا تھا ۔ دھنو کی ماں تھی اور بیرو تھا اور خوشیا تھا اور جوالا تھا ۔ اور ہسپتال کا ڈاکٹر تھا ۔

رات ہو چکی تھی ۔

اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا ۔ نقاہت کچھ اس قدر تھی کہ وہ بولنے سے معذور تھا ۔ اس نے بیرو کو اپنے پاس بلا کر اشاروں سے کچھ سمجھایا نہیں ۔ بہر حال اس نے جھک کر اس کے کان میں وہ بات کہہ دی جو خود اس کے ذہن پر بری طرح سوار تھی ۔

"موٹر کا نمبر ۷۵۹۴ تھا اور اس ٹرک کا جس سے تم ٹکرا گئے تھے ۷۵۷۱ ۔ دوسرے نمبر کو پہلے نمبر سے تفریق کرنے پر تیئس آتے ہیں بس یہ نمبر لگا ہی سمجھو ۔" بیرو نے اپنے زخمی دوست کو دلاسا دیا ۔

فقیر چند کے چہرے پر صرف ایک لمحے کو سرخی دوڑی ۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر بے ہوش ہو گیا اور دوسرے روز شام کو جب فقیر چند کی بیوہ کو اس کے خاندان کے وفادار دوست بیرو نے سو سو کے نوٹوں کی گڈی لا کر دی تو اس کی یہ فکر دور ہو گئی کہ وہ اپنے خاوند کی ارتھی اٹھانے کے لئے پیسے کہاں سے لائے گی ۔

بقیہ :۔ **شاہجہاں پور** جن کی مسلسل دوڑ دھوپ اور جانفشانی سے شاہجہاں پور اور اطراف کے علم و فن کو اردو اور ہندی کی ملی جلی شاعری سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ۔ تاہم فیکٹری کے قائم مقام جنرل مینیجر محترم ایس پی مشرا بھی بجا طور پر مبارکباد کے حق دار ہیں ۔

غالباً ۱۹۶۲ء کی کوئی تاریخ تھی کہ سردار
بیگم اختر کا فون آیا کہ وہ حافظ محمد ابراہیم صاحب
مرکزی وزیر حکومتِ ہند کے ہاں قیام فرما ہیں لہٰذا
فوری طور پر حافظ صاحب کی رہائش گاہ پر اُن سے
ملوں۔ مرحومہ سردار بیگم اختر شہرت کی بڑی بھوکی
تھیں اور وہ آئے دن کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ

سلیک ہو جائے گی۔ ابھی میں حافظ صاحب کی
کوٹھی پر جانے کے لئے تیار ہو ہی رہا تھا کہ اتنے
میں پھر ٹیلی فون پر بیگم صاحبہ بول رہی تھیں کہ
آپ ابھی تک آئے نہیں، حافظ محمد ابراہیم صاحب
آپ کا انتظار کر رہے ہیں کیوں کہ انھیں آپ سے
کچھ کہنا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے دفتر جانے
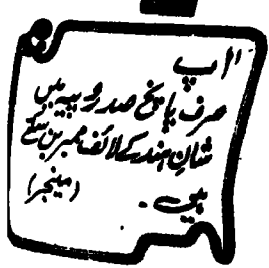
شرکت کریں اور مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال
لکھیں"۔

حافظ ابراہیم صاحب کے اس حُکم یا
خواہش کی تکمیل میرا فرض تھا۔ بلکہ یہ ان کی سرود
نوازی تھی کہ اُنھوں نے اس خدمت کے لئے میرا
انتخاب کیا۔ لہٰذا میں نے بخوشی یہ خدمت انجام

مُلزم اصالتاً حاضر ہے

شخصیات، واقعات، تأثرات،

نکالتی تھیں جس سے ان کا نام اخبارات میں آسکے۔
چنانچہ ان کی اس یاد فرمائی کا بھی یہی مطلب سمجھا
تھا کہ وہ محض یہ دکھانا چاہتی ہیں کہ ان کا قیام
حافظ محمد ابراہیم (مرحوم) ایسے سینئر مرکزی
وزیر کے ہاں ہے۔

ایڈیٹر "شانِ ہند" حافظ محمد ابراہیم صاحب
نیازمندوں میں سے تھا اور "شانِ ہند" کی حق گوئی،
... کی اور اُردو پرستی سے حافظ صاحب بڑے
... تھے۔ سوچا کہ سردار بیگم اختر صاحبہ سے
... کے بہانے حافظ صاحب سے بھی علیک

سے پہلے ہی میں ان کے ہاں پہنچ جاؤں۔ پندرہ
منٹ بعد ہی میں حافظ صاحب کی رہائش گاہ پر
پہنچا تو حافظ صاحب اور سردار بیگم اختر ناشتہ
فرما رہے تھے۔ صبح کے نو ہی بجے تھے۔ حافظ صاحب
نے ازراہِ نوازش مجھے بھی ناشتہ میں شریک
ہونے کا حُکم دیا اور فرمانے لگے "سرور صاحب،
میں نے آپ کو یوں تکلیف دی ہے کہ بنارس
میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بڑے پیمانے پر ہو رہا
ہے۔ اور اس مشاعرہ کی صدارت مجھے کرنی ہے
میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس مشاعرہ میں

دینے کے لئے حامی بھر لی۔ حافظ صاحب نے مشاعرہ
میں شرکت کا دعوت نامہ دیا اور فرمایا کہ آپ کے
جملہ اخراجات منتظمین مشاعرہ ادا کریں گے۔
جونہی میں نے مشاعرہ کی تاریخ دیکھی تو وہ عین
وہی تاریخ تھی جو کہ دہلی میں میرے خلاف چل
رہے ایک فوجداری مقدمہ میں پیشی کی تھی۔ میں
نے حافظ صاحب سے گذارش کی کہ میرے پڑوسی
ڈاکٹر ملہوترہ نے میرے خلاف فوجداری عدالت
میں نقضِ امن کا یہ مقدمہ دائر کر رکھا ہے کہ اُسے
سرور تونسوی سے جان کا خطرہ ہے۔ اس مقدمہ

میں پیشی کی وہی تاریخ ہے جو کہ مشاعرہ کی ہے ایسی صورت میں میرا جانا شاید مشکل ہو۔ حافظ صاحب فرمانے لگے "آپ آج ہی عدالتِ متعلقہ میں درخواست دے دیں کہ حافظ محمد ابراہیم مرکزی وزیر کے فرمان پر مجھے اس روز بنارس میں ایک مشاعرہ میں شرکت کرنی ہے لہٰذا مقدمہ میں پیشی کی تاریخ پر میری حاضری معاف فرمائی جائے اور دوسری مقرر کردہ تاریخ پر میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

عدالتی قاعدہ قانون کے مطابق یہ درخواست متعلقہ عدالت میں پیش کی گئی تو مجسٹریٹ درخواست کو پڑھ کر فرمانے لگے کہ آپ بنارس چلے جائیے اور یہ درخواست پیشی کے دن پیش کرنے کے لئے کسی کی ڈیوٹی لگا جائیے تاکہ جس روز مقدمہ کی فائیل میرے سامنے پیش ہو تو یہ درخواست اسی وقت ہی دی جائے میں آپ کی حاضری معاف کر دوں گا اور کوئی دوسری تاریخ دے دوں گا۔

میں نے اپنے لڑکے رام لال کے ذمہ یہ کام لگایا کہ وہ تاریخ مقررہ پر عدالت کے باہر حاضر رہے، جونہی میرے نام کی آواز لگے تو فوراً عدالت کے کمرے میں جا کر یہ درخواست مجسٹریٹ کی خدمت میں پیش کر دے اور زبانی یہ کہہ دے کہ آپ نے اس درخواست کے بارے میں حکم دیا تھا کہ مقدمہ کی فائیل جب آپ کے سامنے آئے تو یہ درخواست پیش کی جائے۔

مگر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ جونہی مقدمہ پیش ہونے کا وقت آیا، اور پیش کار نے فائیل مجسٹریٹ کے سامنے رکھی تو انہیں میری درخواست والی بات یاد آگئی اور انھوں نے پیش کار سے فرمایا کہ انہیں تاریخ دے دیجئے۔ چپڑاسی نے ودیا پرکاش سرورؔ کی آواز لگائی اور میرا لڑکا رام لال فوراً کمرۂ عدالت میں گیا تو جب تک پیش کار فائیل پر لکھ چکا تھا کہ ملزم اصالتاً حاضر ہے، فلاں تاریخ آئندہ پیشی کے لئے دی گئی، اور میرے لڑکے سے درخواست لئے بغیر کہا کہ فلاں تاریخ کو آجائیے گا۔ بیچارہ پیش کار رام لال کو ہی ودیا پرکاش سرورؔ سمجھا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

میں بنارس کے اس مشاعرہ میں شریک ہوا اور مشاعرہ کی رُوداد لکھتے وقت مشاعرہ کے اناؤنسر جناب ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے بارے میں کچھ ایسے الفاظ لکھے گئے کہ جو ملک زادہ کی شہرت کے لئے ضرر رساں تھے لہٰذا شبلی کالج اعظم گڑھ کی مینجنگ کمیٹی نے ملک زادہ منظور احمد کو نوٹس دے دیا کہ یا تو ملازمت (ملک زادہ ان دنوں شبلی کالج میں لیکچرار تھے) ترک کر دیجئے یا پھر ایڈیٹر "شانِ ہند" کے خلاف مقدمہ دائر کر کے ان الزامات کو غلط ثابت کیجئے جو آپ پر شانِ ہند میں لگائے گئے ہیں۔

ملک زادہ منظور احمد نے اعظم گڑھ کی عدالت میں میرے اور ایڈیٹر "ساقی" بنارس کے خلاف ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ زیر دفعہ ۵۰۰۔ ۵۰۱ دائر کر دیا۔ ایڈیٹر "ساقی" کو شریکِ مقدمہ اس لئے کیا گیا کہ وہ مشاعرہ کے کنوینر تھے۔

ایڈیٹر "ساقی" کو شریکِ مقدمہ کرنا میرے لئے "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا" والا معاملہ تھا۔ کیونکہ ایڈیٹر "ساقی" بنارس کے خسر انچارج کوتوالی اعظم گڑھ تھے لہٰذا دورانِ مقدمہ ایڈیٹر "شانِ ہند" کا قیام بھی ایڈیٹر "ساقی" بنارس کے ساتھ اعظم گڑھ کی کوتوالی میں انچارج کوتوالی کے گھر میں ہوتا۔

پہلی پیشی پر ملک زادہ منظور احمد ایڈیٹر شانِ ہند کو اپنے وکیل فیضان شاہ کے دولت کدہ پر لے گئے اور وکیل مذکور نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور آخر میں فرمانے لگے کہ سرورؔ صاحب آپ اتنی دُور مقدمہ لڑنے کہاں آیا کریں گے، کل صبح عدالت میں یہ لکھ کر دے دیجئے کہ میں نے جو کچھ شانِ ہند میں ملک زادہ صاحب کے بارے میں لکھا ہے وہ غلط فہمی کی بنا پر لکھا گیا جس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں لہٰذا یہ مقدمہ داخلِ دفتر کیا جائے۔

معافی نامہ کا نام سُن کر میری پنجابیت جلال میں آگئی اور میں نے کسی حد تک تلخی کے ساتھ وکیل صاحب اور ملک زادہ سے رخصت چاہی اور صبح جب عدالت میں پیش ہوئے تو مجسٹریٹ صاحب نے ہم دونوں ملزمان سے کہا کہ ضمانت داخل کرائیے اور ضمانت بھی ایسے اشخاص کی ہو جو چار چار بیل رکھتے ہوں یعنی موٹے زمیندار ہوں۔

گورکھپور میں قزلباش فیملی بڑی ... اور باعزت فیملی ہے۔ سید کاظم علی قزلباش ... بیگم صاحبہ نے اعظم گڑھ کے ایک وکیل کے نام ... لکھ دیا کہ سرورؔ میرے بھائی ہیں انھیں اعظم گڑھ ... میں کوئی تکلیف نہ ہو اور ان کی ضمانت وغیرہ کا ... کر دیا جائے۔ چنانچہ جس وکیل صاحب کے نام یہ ... تھا ایک تو انھوں نے میری طرف سے مقدمہ کی پیروی ... منظور فرمائی اور مجھ سے محنتانہ ایک پیسہ بھی نہ ... اور دوسرے اعظم گڑھ کے سب سے بڑے فوجداری ... وکیل کو دس روپیہ فی پیشی پر میری پیروی کے ... لئے مقرر فرما دیا۔

میرے عزیز عدیل عباسی چڑیا کوٹی ... مولانا کیفی چڑیا کوٹی اعظم گڑھ میں پلیننگ آفیسر ... میں اچھے عہدہ پر ملازم ہیں۔ انھوں نے ضلع ... اعظم گڑھ کے دو موٹے زمیندار جو عدالت میں اپنے ... کام سے آئے ہوئے تھے میری ضمانت میں پیش ... کئے اور ضمانت منظور ہو گئی۔ ایڈیٹر "ساقی" بنارس ... کے خسر نے کسی زمیندار سے کہہ کر ان کی بھی ... ضمانت کرا دی اور عدالت نے آئندہ پیشی کی ... تاریخ ڈال دی۔

دوسری پیشی پر جب ہم حاضر ہوئے تو ... مجسٹریٹ کے سامنے فائیل رکھتے ہوئے پیش کار ... نے بتایا کہ صاحب ان دونوں ملزمان کی ضمانتوں کی ... پٹواری نے تصدیق نہیں کی ہے لہٰذا ان سے اور ... ضمانت طلب کی جائے یا ملزمان کو جیل بھجوا دیا ... جائے۔

میرے وکیل نے فائیل دیکھی تو واقعی ... پٹواری نے ضامنوں کی تصدیق نہیں کی تھی۔ ... در اصل ملک زادہ منظور احمد اور ان کے ... حواریوں نے پٹواری کو خوش کر کے ضامنوں کی ... تصدیق نہ ہونے دی تھی۔ ہمارے وکیل نے کہا ... صاحب امپیریل بنک (ان دنوں اسٹیٹ بنک کا ... نام امپیریل بنک ہوا کرتا تھا) میں میرا ایک لاکھ ... روپیہ فکسڈ ڈیپازٹ میں پڑا ہے میں ابھی بینک ... سے اس کی تصدیق کرا کے لے آتا ہوں اور ان ...

ن ملزموں کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ مگر اس
ن تک عدیل عباسی چڑیا کوٹی نئی ضمانتوں کا
ام کر چکے تھے اور مجسٹریٹ نے نئی ضمانتیں لینے
عد مقدمہ کی اگلی پیشی ڈال دی
تیسری پیشی پر اعظم گڈھ جانا ہوا تو عدیل
ی صاحب کی زبانی پتہ چلا کہ ماسٹر صاحب
زادہ منظور احمد) نے کالج کے کچھ لڑکوں کو غنڈہ
ی کرنے کے لئے تیار کر رکھا ہے اور عین ممکن ہے
الج کے لڑکے کچھ شرارت کریں اور معاملہ مار پیٹ
پہنچے۔ اس پر کوتوالی انچارج نے فرمایا کہ آپ
رائیے نہیں، آپ دونوں یعنی میں اور ان کا داماد
رخواست لکھ کر دیں کہ ہمیں فوری خطرہ ہے۔
پولیس کے دو چار آدمی آپ کے ساتھ حفاظت
لے بھجوا دوں گا۔ مگر عدیل عباسی صاحب فرمانے
کہ آپ قطعاً نہ گھبرائیے، میں نے کالج یونین کے
ر اور سیکریٹری دونوں کو اصل معاملہ سے آگاہ
یا ہے لہٰذا وہ کل عدالت کے احاطہ میں موجود
ں گے اور کالج کے کسی بھی طالب علم کو کسی قسم
شرارت نہیں کرنے دیں گے۔ لہٰذا جب ہم دوسرے
عدالت کے احاطہ میں پہنچے تو کالج یونین کے صدر
سکریٹری دونوں موجود تھے (ان میں سے ایک
حب آج کل جون پور میں مشہور ایڈوکیٹ ہیں)
انھوں نے ہم دونوں ملزمان سے کہا کہ آپ
ا بے فکر رہیے کالج کے لڑکے آپ کو سلام کریں
اور کہیے تو یہی لڑکے ماسٹر جی کو پیٹ ڈالیں۔
بہر کیف مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی
چھ سات ماہ گزر جانے کے بعد جب استغاثہ نے
گواہان پیش کر لئے اور ہمیں صفائی کا موقع
یا تو میں نے اپنے دونوں وکیلوں کی خدمت
گزارش کی کہ مجھ پر ہتک عزت کے ایک درجن
زائد مقدمات دائر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ان مقدمات
میں نے جو کچھ ہتک عزت کے مقدمہ سے باعزت
ی ہونے کے لئے کچھ پوائنٹ اخذ کئے ہیں اگر آپ
ں تفصیل سے سن لیں تو شاید آپ کسی پوائنٹ
س مقدمہ میں ہمارے لئے بہتر پائیں۔ چنانچہ
ریٹ سے کہہ کر دوسرے دن کی تاریخ لے لی گئی

اور یہ طے ہوا کہ آج عدالت بند ہونے کے بعد بڑے
وکیل صفائی کے گھر دونوں ملزمان اور دونوں وکیل
صاحبان کی میٹنگ ہوگی اور صفائی کے لئے مناسب
راستہ تجویز کیا جائے گا۔
شام کو بڑے وکیل صاحب کے ہاں میٹنگ
میں میں نے ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمات میں اپنے
تجربات کی روشنی میں حسب ذیل پوائنٹس پر روشنی
ڈالی۔
ؔ۱۔ استغاثہ کو چاہئے کہ وہ ڈسٹرکٹ
مجسٹریٹ کے پریس کلرک کو بہ طور گواہ طلب کرے
اور اخبار یا رسالہ کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر کی شناخت
کرائے کہ جس رسالہ یا اخبار میں قابلِ اعتراض
مضمون شائع ہوا ہے اس اخبار یا رسالہ کا
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر وہی ہے جسے کہ ملزم قرار دیا گیا
ہے۔ چونکہ ملک زادہ صاحب نے دہلی کے ڈسٹرکٹ
مجسٹریٹ کے پریس کلرک کو بطور گواہ طلب نہیں
کیا تھا اِس لئے یہ بات ملزم کے حق میں جاتی تھی
اور وہ اس سے انکار کر سکتا ہے کہ یہ متنازعہ
رسالہ یا اخبار اس نے شائع کیا۔
ؔ۲۔ ازالۂ حیثیت عرفی کے مقدمہ میں یہ
ضروری ہے کہ اگر وہ رسالہ یا اخبار دفترِ اخبار یا
رسالہ سے مقامِ مقدمہ پر یا اُس ضلع بھر میں کسی کو
نہ بھجوایا گیا ہو جس میں کہ مدعی کو بے عزت کیا گیا
ہے تو یہ مقدمہ وہاں نہیں چل سکتا۔ یعنی مدعی کو
یہ ثابت کرنا ہوگا کہ دفترِ رسالہ یا اخبار نے رسالہ
یا اخبار کا وہ شمارہ اُسے، یا اُس کے شہر یا اُس کے
ضلع میں کسی نہ کسی کو دفترِ رسالہ یا اخبار نے بھجوایا۔
ملک زادہ صاحب نے "شانِ ہند" کا جو
متنازعہ شمارہ جس میں کہ انھیں بے عزت کیا گیا
تھا مقدمہ دائر کرتے وقت داخلِ عدالت کیا تھا
وہ کسی کو مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ میں بھجوایا گیا
بتایا تھا۔
مگر "شانِ ہند" کے اُس شمارہ پر ایک مُہر
ڈاک خانہ دہلی جی پی او کی لگی ہوئی تھی، جو کہ
ڈیلیوری کی تھی یعنی مُہر میں DLY بھی چھپا ہوا
تھا اور صبح نو بجے کا ٹائم بھی چھپا ہوا تھا۔ یعنی یہ

رسالہ دہلی میں ڈیلیور ہوا۔ اور جو دوسری مُہر لگی
ہوئی تھی وہ مئو ناتھ بھنجن کی تھی جس میں نہ تو
DLY چھپا تھا اور نہ ڈیلیوری کا ٹائم چھپا ہوا
تھا۔ یعنی یہ رسالہ مئو ناتھ بھنجن سے پوسٹ کیا
گیا اور دہلی میں ڈیلیور ہوا۔ مئو ناتھ بھنجن والی
مُہر پر ڈاک خانہ کی تاریخ بھی پڑھی نہ جا سکتی تھی
دراصل مُہر کا کچھ حصّہ رسالے کے ریپر پر اور کچھ حصّہ
رسالے پر چھپا۔ لہٰذا بڑے وثوق سے کہا جا سکتا
تھا کہ یہ رسالہ ملک زادہ نے از خود شائع کرایا اور
مئو ناتھ بھنجن سے دہلی اپنے کسی واقف کار دوست
کے نام پوسٹ کرایا اور پھر یہی پرچہ مقدمہ دائر
کرنے کے لئے عدالت میں داخل کرایا۔
ؔ۳۔ اِس کے بعد میں نے دونوں وکیل
صاحبان کے سامنے اُس فوجداری مقدمہ کی
مکمل کارروائی کی مصدقہ نقل پیش کی جو میرے
خلاف دہلی میں اُس وقت چل رہا تھا جبکہ بنارس
کا مشاعرہ ہوا تھا۔ نقلِ کارروائی مقدمہ میں صاف
الفاظ میں درج تھا کہ جس دن یہ مشاعرہ بنارس
میں تھا اس روز "ملزم اصالتاً حاضرِ عدالت تھا"
اور پیش کار کے لکھے ہوئے یہ چند الفاظ جن کی تصدیق
عدالت کی مُہر اور مجسٹریٹ کے دستخط فرما رہے تھے
سپریم کورٹ تک بھی صحیح سمجھے جاتے۔
دونوں وکیل صاحبان میری اس تفصیل
پر بہت ہی خوش تھے اور چونکہ عدالت میں داخل
"شانِ ہند" کا متنازعہ شمارہ دونوں وکیل صاحبان
نے ڈاک خانہ کی مہروں کے چھاپوں کی چھان بین
کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا لہٰذا یہ طے پایا کہ کل
عدالت کھلتے ہی مِثل مقدمہ ملاحظہ کرنے کی درخواست
دی جائے اور جب وکیل صاحبان ڈاک خانہ کی
مُہروں کے چھاپوں کے بارے میں تسلی فرما لیںگے
تو پھر صفائی کے بارے میں اگلا قدم اٹھایا جائیگا
دوسرے دن جب ہم سب مِثل مقدمہ ملاحظہ
کرنے کے لئے عدالت میں درخواست دینے گئے، تو
مجسٹریٹ صاحب فرمانے لگے "کیا آپ نے صفائی کے
گواہان کی فہرست داخل کر دی ہے؟ اِس پر میرے
بڑے وکیل کہنے لگے "جناب مِثل ملاحظہ کرنے کے بعد

صفائی کے گواہان کی فہرست داخل کردی جائے گی۔

مِثل ملاحظہ فرمانے کے بعد دونوں وکیل حضرات نے بتایا کہ مقدمہ میں اِستغاثہ نے جو شہادتیں پیش کی ہیں وہ جرم کے ثبوت کے لئے کافی ہیں لہٰذا ہم صفائی کے لئے گواہان کی فہرست داخل نہیں کریں گے اور یہ درخواست دیں گے کہ عدالت اس مقدمہ کی سماعت کا اختیار ہی نہیں رکھتی۔ کیوں کہ "شانِ ہند" کے متنازعہ شمارہ پر ڈاک خانہ کی مُہر دہلی میں ڈلیور کرنے کی موجود ہے اور مئوناتھ بھنجن ڈاک خانہ کی مُہر اِس شمارہ کو پوسٹ کرنے کی۔ لہٰذا یہ مقدمہ دہلی میں چلنا چاہیئے نہ کہ اعظم گڈھ میں۔

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے گا کہ شانِ ہند کا یہ شمارہ ہمارا ہے ہی نہیں اور اس کے ساتھ ہی دہلی کی عدالت کی کارروائی مقدمہ کی نقل دکھائی جائے گی جس میں وقوعہ کے روز ملزم دہلی کی عدالت میں اصالتاً حاضر تھا۔ چونکہ ملک زادہ منظور احمد کے وکیل نے کوئی ایسا گواہ پیش نہیں کیا تھا جو اِس امر کا چشم دید گواہ ہوتا کہ ملزم بنارس کے مشاعرہ میں موجود تھا اور مشاعرہ کی کارروائی نوٹ کر رہا تھا۔ مُدّعی نے اِس پریس کیپر کو بھی گواہ کے طور پر پیش نہیں کیا تھا جس پریس میں کہ "شانِ ہند" کا یہ متنازعہ شمارہ چھپا تھا۔

دوپہر بعد جب مقدمہ مجسٹریٹ صاحب کے سامنے پیش ہوا تو ہمارے بڑے وکیل عدالت سے گذارش کی کہ ہم صفائی کے گواہان کی فہرست پیش نہیں کر رہے بلکہ یہ درخواست پیش کر رہے ہیں کہ اِس مقدمہ کی سماعت یہ عدالت نہیں کر سکتی۔ وکیل صاحب نے مندرجہ بالا تمام پوائنٹس کا ذکر درخواست میں تفصیلی طور پر کیا ہوا تھا لہٰذا فریقین کے وکلا نے اِس درخواست پر بحث شروع کی۔ جب ڈاک خانہ کی مُہر کا معاملہ آیا تو مجسٹریٹ صاحب نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا جو انھیں اسی روز ڈلیور ہوا تھا۔ اِس لفافہ پر اعظم گڈھ کے ڈاک خانہ کی مُہر لگی ہوئی تھی جس میں DLY - بھی چھپا ہوا تھا اور وقت بھی درج تھا مجسٹریٹ بار بار "شانِ ہند" کے متنازعہ شمارہ پر ڈاک خانہ کی چھپی ہوئی مُہروں کو ملاحظہ فرماتے رہے اور اُن کا چہرہ یہ غمازی کر رہا تھا کہ وہ اِس انکشاف سے کسی حد تک پریشان ہیں اور واقعی مقدمہ کی سماعت اُن کی عدالت کے اختیار میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ہمارے جملہ اعتراضات اِتنے قدر وزن دار تھے کہ اگر عدالت اُن میں سے کسی بھی پوائنٹ کو تسلیم نہ کرتی تو ہم سیشن جج کے ہاں ریویژن کر سکتے تھے۔ کافی بحث مباحثہ کے بعد مجسٹریٹ صاحب فرمانے لگے کہ ہم کل اِن اعتراضات کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔

دوسرے دن دس بجے جب میں عدالت کے سامنے ایک درخت کی چھاؤں میں کھڑا تھا تو عدالت کا چپراسی آیا اور کہنے لگا کہ آپ کو صاحب بُلا رہے ہیں۔ میں نے مجسٹریٹ کے ہاں پیش ہو کر کہا کہ جناب میں اپنے وکیلوں کو بُلا لاؤں تو وہ کہنے لگے کہ میں آپ سے وکیلوں کی عدم موجودگی میں ہی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ حضور فرمائیے کیا حکم ہے۔ مجسٹریٹ صاحب فرمانے لگے کہ میں اس مقدمہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں، مگر ایک وعدہ آپ سے لینا چاہتا ہوں کہ اس کے بعد آپ ماسٹر صاحب سے اِنتقام لینے کے لئے کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ کیوں کہ وہ اس سے بہت زیادہ خائف ہیں کہ آپ انھیں کسی نہ کسی طرح دہلی کی عدالتوں کی سَیر کرائیں گے۔ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے وعدہ کیا کہ میں کوئی اِنتقامی کارروائی نہیں کروں گا۔ اِس پر مجھے مجسٹریٹ صاحب کہنے لگے کہ اب آپ باہر چلے جائیں میں مقدمہ آج ہی ختم کر دوں گا۔ بارہ بجے کے قریب پیشی ہوئی۔ اندر جاتے ہی مجسٹریٹ صاحب ملک زادہ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ ماسٹر جی آپ یہ لکھ کر دیجئے کہ چونکہ ملزمان کا بیان ہے کہ انھوں نے شان ہند کا یہ متنازعہ شمارہ شائع نہیں کیا ہے لہٰذا اس صورت میں میں اپنا مقدمہ واپس لیتا ہوں۔ ملک زادہ صاحب نے یہ درخواست لکھ کر مجسٹریٹ کے سامنے رکھی اور انھوں نے اسے منظور کرتے ہوئے ہمیں فرمایا کہ آپ [illegible] جا سکتے ہیں۔

اِس مقدمہ میں جو داؤ پیچ اپنے بچاؤ کے لئے کھیلنے پڑے اُن کی کامیابی کا دار و مدار ملک زادہ صاحب کی نیلیشن اور مقدمہ کی پیروی میں کمزوریوں کے علاوہ اُن کے وکیل فیضان شاہ صاحب (مرحوم) کا پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اِزالہ حیثیت عرفی کا کیس لڑا تھا اس لئے وہ ایسے مقدمہ میں کامیابی حاصل کرنے کے گُر نہیں جانتے تھے۔

یہ بھی قدرتی مدد تھی کہ ملک زادہ صاحب نے شانِ ہند کے جس متنازعہ شمارہ کو داخل [illegible] کیا تھا اُس پر دہلی کے جنرل پوسٹ آفس کے ذریعہ اُسے دہلی میں ڈلیور کئے جانے کی مُہر لگی ہوئی تھی اور یہ یوں ہوا کہ کسی وجہ سے شانِ ہند کا یہ [illegible] نہیں واپس مِلا لہٰذا اس پر دہلی جنرل پوسٹ آفس کی مُہر لگ گئی اور جب مئوناتھ بھنجن سے کسی نے "شانِ ہند" کا نمونہ با وی پی طلب کیا تو یہی واپس آیا ہوا رسالہ بھجوا دیا گیا اور جب یہ رسالہ مئوناتھ بھنجن کے ڈاک خانہ میں پہنچا تو ڈاک خانہ مئوناتھ بھنجن میں [illegible] مُہر اِس پر لگائی گئی اُس کا کچھ حصّہ ریپر پر لگا اور کچھ حصّہ رِسالہ پر چھپا اور اس عجیب اتفاق سے "شانِ ہند" کا یہ شمارہ اِس کا موجب بنا کہ مقدمہ اعظم گڈھ کی عدالت میں نہیں چل سکتا۔

اِس مقدمہ کے بعد ملک زادہ منظور احمد صاحب سے اب تک دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔ اِس مقدمہ میں مجھے چھتیس بار اعظم گڈھ جانا پڑا۔ ۲۴ گھنٹے ریل کا سفر جانے کا، اور اِتنا ہی آنے کا، یعنی ایک ماہ اور بارہ دن میں نے ٹرین میں گذارے اور چھتیس دن اعظم گڈھ میں قیام کرنا پڑا۔ اخراجات کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا، کیونکہ مقدمہ بازی اور عشق میں جس نے کنجوسی کی وہ مارا گیا۔

ایڈز
خود کو کیسے بچائیں

یڈز انتہائی خطرناک بیماری ہے اور ابھی تک اس کا کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں بے پناہ
فواہیں گردش کر رہی ہیں۔ لیکن خود کو اس سے بچانا مشکل نہیں ہے بشرطیکہ اس سے متعلق آپ چند حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

یڈز کیا ہے ؟

یڈز انگریزی کے چار الفاظ ایکوائرڈ امیونو ڈیفی شنسی سنڈروم کے
بتدائی حروف کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک ایسے وائرس کے سبب ہوتا ہے
و انسانی جسم کے خود حفاظتی نظام کو تباہ کر دیتا ہے۔

یہ کیسے پھیلتا ہے

صحت مند آدمی ایڈز کے وائرس کا شکار اس وقت ہی ہوتا ہے جب اس کے
جسم میں ایڈز کے مریض کا خون یا مادہ منویہ داخل ہو جائے۔ زیادہ تر افراد ایڈز
کے مریض کے ساتھ جنسی اختلاط کے نتیجے میں ہی ایڈز وائرس کا نشانہ بنتے ہیں۔
بعض لوگ متاثرہ مریض کی استعمال شدہ انجکشن سوئی کو استعمال کرنے سے اس
خطرناک مرض کا نشانہ بن جاتے ہیں اور ایسے واقعات زیادہ تر نشیلی دوائیوں
کے عادی افراد میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ ایڈز کے کسی مریض کا خون دیا جانا ایڈز
کے پھیلاؤ کے لئے بہت کم ذمہ دار ہے۔
لازمی نہیں ہے کہ ہر وہ آدمی جس میں ایڈز کا وائرس موجود ہے اس مرض کا شکار
بھی ہو جائے۔ درحقیقت زیادہ تر معاملات میں ایسا نہیں ہوتا ہے لیکن کوئی بھی آدمی
جس میں یہ وائرس موجود ہے اس وائرس کو دوسرے شخص کو منتقل کر سکتا ہے
چاہے وہ خود کو مکمل طور پر صحتمند محسوس کرتا ہو اور دیکھنے میں بھی ایسا ہی نظر آتا ہو۔

آپ ان چیزوں سے ایڈز کا شکار نہیں ہو سکتے :

- عمومی سماجی تعلقات جیسے ہاتھ ملانا، چھونا اور بغل گیر ہونا۔
- سوئمنگ پول، ریستوران اور دیگر عوامی مقامات پر۔
- کھانسی، چھینک، تھوک۔
- کپڑوں کے استعمال سے۔
- ٹوائیلیٹ سیٹ، دروازوں کے ہینڈل وغیرہ، کھانا، عینک اور پیالیاں

آپ ایڈز وائرس کا شکار نہیں ہو سکتے جب :

آپ خون کا عطیہ کرتے ہیں۔
آپ ڈاکٹر، ڈینٹسٹ یا کسی دوسرے ہیلتھ کیر ورکر سے انجکشن لگواتے یا
علاج کرواتے ہیں۔

ان چیزوں سے بچیں :

- اجنبی افراد کے ساتھ جنسی اختلاط۔ یہ ہمیشہ ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اجنبی فرد کے بارے میں آپ نہیں جانتے کہ وہ اس مرض سے متاثر ہے یا نہیں۔
- غیر فطری جنسی اختلاط۔ اس میں بہت زیادہ خطرہ ہے اور اس سے ہر حال میں بچنا چاہئے۔
- جتنے زیادہ افراد کے ساتھ جنسی اختلاط ہوگا خطرہ اتنا ہی زیادہ بڑھ جائے گا۔
- نشیلی دواؤں کے عادی لوگوں کی استعمال شدہ انجکشن سوئی استعمال کریں

یاد رکھئے

ایڈز ایسی بیماری نہیں ہے جس کے خطرے کو محض خوش فہمی میں نظر انداز کیا جا سکے۔
کیونکہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ایڈز کا کنٹرول لوگوں کے رویے اور انسدادی
تدابیر پر منحصر ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے لکھیں :
اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل (ایڈز)
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف ہیلتھ سروسز، نرمان بھون
نئی دہلی 110011

ایڈز کا علاج نہیں
لیکن آپ اس سے بچ سکتے ہیں

جاری کردہ : سنٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو
ڈی جی ایچ ایس، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی۔ 110002

اقبال۔ شاعر اور محبِّ وطن (انگریزی)

اشاعت ۱۹۸۶ء

سیّد مظفر حسین برنی

گوسنر ھریانہ۔

صفحات۔ ۱۳۶ سائز ڈیمائی

ناشر۔ وکاس پبلشنگ ھاؤس پرائیویٹ لمیٹڈ

۵۔ انصاری روڈ۔ نئی دھلی ۲؁

قیمت۔ ۱۲۵/۔ روپے

۲۴ نومبر ۱۹۸۶ء کو راشٹرپتی بھون میں صدرِ جمہوریہ نے اس کتاب کی رسمِ اجرا کرتے ہوئے کہا تھا کہ عوام میں پھیلی ہوئی اس غلط فہمی کا ازالہ جناب برنی نے اس کتاب کے ذریعہ کیا ہے کہ علامہ اقبال جو موجودہ زمانے کا ہندوستان کا اور اردو اور فارسی زبانوں کا چوٹی کا شاعر تھا۔ پاکستان کا محرک تھا اگرچہ اُس نے اپنی حیات ہی میں اکثر اپنے خطوط سے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ ہرگز ہرگز مسلمانوں کے کسی علیحدہ ملک کا مُتمنّی نہیں ہے بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کا شمال میں ایک ایسا صوبہ وضع کیا جائے جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور وہ ہندوستان ہی کا ایک حصہ ہو۔ اقبال کی شاعری کی تاریخ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر ہندوستان کی تہذیب و ثقافت یہاں کے مذہبی رہنماؤں اور ہندوستان کے ہی گُن گاتا رہا ہے تو پھر وہ کیسے یکدم اس کی ساری ادبی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی خوبیوں سے منحرف ہو کر ایک نئے ملک کی تاسیس کا دعویدار ہو سکتا تھا۔

یہی امر اس کی تصدیق کے لئے کافی ہو سکتا ہے کہ اقبال نے اُردو شاعری کے اپنے پہلے دور میں لاہور میں کئی مشہور نظمیں لکھیں اور عام اجتماعات میں پڑھیں۔ لیکن جب ۱۹۲۴ء میں اُس نے پہلی اُردو کلیات "بانگِ درا" کو شائع کیا تو اُس کی پہلی نظم ہمالہ ہے جس میں ہندوستان کے تاریخی اور جغرافیائی کوائف کے گُن گائے گئے ہیں۔ یہی نہیں جہاں بھی اقبال کو موقع میسر آتا ہے وہ ہندوستان کی تعریف میں رطب اللسان ہے ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ ایک برہمن زادہ ہونے پر وہ بجا طور پر جا بجا افتخار کرتا ہے اور ہندوستانی سادھوؤں، سنتوں، فقیروں، فلاسفروں کے گُن گاتا ہے رام چندر، گایتری منتر، گورو نانک۔ بُدھ۔ سوامی رام تیرتھ وغیرہ پر اظہار کردہ اُس کے خیالات اُس کے ہندوستانی ہونے پر فخر کرنے کے مُظہر ہیں۔

کتاب ہٰذا میں فاضل مصنّف نے ہر حاصل حوالہ جات سے یہ ثابت کیا ہے کہ علامہ شروع سے آخر تک ہندوستانی رہے اور اُن کے دل میں ہمیشہ ہندوستان کی عظمت منقّش رہی اُنہوں نے سینکڑوں اشعار رُومن میں دے کر اور انگریزی میں اس کا بہت ہی خوبصورت ترجمہ پیش کر کے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ علامہ پکے ہندوستانی تھے اُن کے اشعار کے انگریزی ترجمے کا سہرا ڈاکٹر سیّدہ سیّدین حمید کے سر ہے۔

ڈاکٹر سیّدہ ہندوستان کے ایک چوٹی کے عالم ڈاکٹر سیدین مرحوم کی دُختر نیک اختر ہیں اور ڈاکٹر کے۔ جی سیدین خود مولانا حالی کے نواسے تھے اور بعد از حصولِ آزادی ڈاکٹر سیدین نے تعلیمی نصاب کو مناسب شکل دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ڈاکٹر سیدین نے بھی علامہ مرحوم کی تعلیمی فلاسفی پر ایک کتاب لکھی تھی جو آج تک مستند مانی جاتی ہے باپ بیٹی نے مل کر علامہ کو ہندوستان میں اُس کا صحیح اور مناسب درجہ دلانے میں بہت کام کیا ہے۔

شاعری کے علاوہ بھی فاضل مصنف نے علامہ کے دیگر مذاہب کے ہندوستانی لیڈروں اور علما کے تعلقات نیز علامہ کی نجی زندگی کے واقعات کی روشنی میں بھی اِس دعوے کو اُستوار تر کیا ہے کہ علامہ کے نزدیک کوئی تنگ نظری یا فرقہ پرستی جیسی کوئی چیز نہ تھی۔ اُن کا مذہب بنی نوعِ انسان کی بہتری اور بہبودی تھا اور سیاست میں وہ شروع سے ہی ہندوستان کی آزادی کے خواہاں تھے۔

۱۹۰۴ء میں لکھا ہوا قومی ترانہ "ہندوستان ہمارا" اِس امر کی بیّن دلیل ہے کہ اُن کو ہندوستان سے والہانہ عشق تھا اِس ایک ترانے نے گاندھی جیسی عظیم شخصیتوں کو زندگی بھر مسحور کئے رکھا اور آج تک اِس ترانے کا جادو ہندوستانی عوام کو سر دُھننے پر مجبور کر دیتا ہے نیز یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اگر عوام کی کوئی زبان سارے ہندوستان کی قومی زبان ہو کر رائج ہو سکتی ہے تو وہ زبان اقبال کے قومی ترانے والی اُردو زبان ہی ہو سکتی

یں نہ ثقیل عربی فارسی کے الفاظ ہیں اور نہ ہی سنسکرت کے
ظ ہیں بلکہ وہ عوام کی زبان ہے۔ اقبال نے قومی ترانہ لکھ کر آج
برس قبل ہندوستانیوں پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ہندوستان کی
نت بھی اگر کوئی عام زبان ہو سکتی ہے تو اس کا نمونہ قومی ترانہ کی
اور ہندوستانی تہذیب بآواز بلند یہ صدا دیتی ہے کہ مذہب کا
انسان کا نجی معاملہ ہے قومی مسائل سے اُس کا کوئی واسطہ نہیں
نہوں نے کہا تھا ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس کتاب کے پڑھنے سے انگریزی جاننے والی دُنیا اقبال کے
سے آشنا ہوگی اور اُس کے متعلق پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے
کو جان لے گی فاضل مصنف نے ہندوستانی ادب پر یہ بہت
ان کیا ہے جو اقبال کو اُس کے اصلی روپ میں پیش کرنے کی

مدلل طور پر جسارت کی ہے جس کے لئے وہ ہر ہندوستانی کے شکریے کا
بجا طور پر مستحق ہے

—— ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ

من کہ مکتوب الیہ

برادرِ محترم! سرور صاحب!

تسلیم و نیاز

ترودڑی مشاعرہ کی رپورٹ میں آپ کے ریمارکس (Remarks) قارئین کو بہت پسند آئے اِس سلسلے کو جاری وساری رکھیں۔

آفسیٹ پر "شانِ ہند" کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ لوگ اسے بہت پسند کر رہے ہیں۔ توقع ہے اب "شانِ ہند" اور بھی مقبول ہوگا۔ بس خدا آپ کی صحت کی طرف دھیان دے۔ آمین۔ تاہم "شانِ ہند" کو نئی شکل میں دیکھ کر اس کے قارئین کا کیا ردِ عمل ہوا مجھے بھی بتائیں۔

روحی بھابی اور محترم مطرب صحرائی کی خدمت میں سلام عرض کریں۔

آپ کا اپنا

—— خلیل انجم

جناب سرور تونسوی صاحب!

آداب

شانِ ہند اب آفسیٹ سے چھپنے لگا ہے اس سے آپ کے مرحوم دوست یوسف دہلوی کی روح تو خیر جو مسرور ہوگی وہ ہوگی لیکن اس سے ہم لوگوں کو بھی کچھ کم مسرت نہیں ملی ہے۔ یوں تو آپ کے "شانِ ہند" کا ایک اچھا تاثر ہمیشہ میرے ذہن میں رہا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ صرف یہی رہی ہے کہ آپ اس میں اپنے دو مستقل شذرات "بلبل چہ گفت" اور "بہ کوئے یار" لکھتے رہے ہیں اب یہ صوری حیثیت سے بھی حسین ہو گیا ہے۔

محتاجِ دعا و دعاگزار

—— علیم اللہ حالی

برادرِ عزیزم سرور تونسوی!

سلامِ شوق اور بے شمار دعائیں

محبت نامہ ملا۔ کس طرح سے آپ کی توجہ کا شکریہ ادا کروں۔

دہلی آپ کو گلے لگانے اور پیار کرنے کے لئے حاضر ہوں گا۔ شانِ ہند کے وسائل محدود سہی لیکن آپ کے شذرات آپ کے ادارتی نوٹ، اردو کے محروم ادیبوں اور نظرانداز کردہ شاعروں کے کاز کی ترجمانی یہ چیزیں ایسی ہیں کہ شانِ ہند کو اردو کے تمام رسائل میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔

بھائی سرور صاحب! آپ کے قلم نے زبان اور اردو کی ادبی صحافت کی جو خدمت کی ہے اُس کا تذکرہ اور اعتراف نہ کرنا، ناشکر گذاری اور ناحق شناسی ہے۔ خدا آپ کو صحت و شادمانی کے بعد عمرِ طویل عطا فرمائے

دعاگو

—— رئیس امروہوی

برادرِ محترم سرور تونسوی

تسلیم۔

آفسیٹ پر طبع شدہ "شانِ ہند" کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہو۔ خدا کرے یہ نیا حسن "شانِ ہند" کی شان اور وقار میں مزید اضافے کرے۔

آپ کا بھائی

—— انجم رومانی

● "شانِ ہند" شمارہ فروری ملا طبیعت کھل اٹھی اور مضامین و کلام نے ذہن و دل مہکا دے۔ خدا نظرِ بد سے محفوظ رکھے آمین

—— منصور عثمانی

● خدا نظرِ بد سے بچائے۔ پرچہ اب واقعی ہر لحاظ سے شاندار ہو گیا ہے۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ بے ساختہ لب پہ یہ دعا آ گئی ؎

خدمتِ علم و ادب کرتے ہیں
زندگی بھر کاش سرور تونسوی
پاسدارِ ارتقائے شانِ ہند
دِ دیا پر کاس سرور تونسوی

خیر اندیش

—— عشرت صدیقی

● شانِ ہند تو ن[illegible] آب و تاب۔ آرائش و زیبائش، حسن و خوبصورتی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ خدا کر[illegible] مزید اور ترقی ہو۔ واقعی آپ کی جدوجہ[illegible] قابلِ تحسین و مبارکباد ہے۔ آپ کی [illegible] لوث خدمات، اُنس و محبت اور لگ[illegible] کا میں قائل ہوں،

—— محمد لطیف[illegible]

● "شانِ ہند" کا نیا روپ بہت[illegible] ہے۔ توجہ کش ہے۔

—— احمد عثما[illegible]

کامیابی سے دکھائی جا رہی ہے

ایک عظیم اور منفرد فلم جو بھارت سے شروع ہوتی ہے اور بھارت پر ختم ہوتی ہے

فوٹوگرافی	ایڈیٹنگ	موسیقی:	منظرنامہ:
ایس ایم انور	ایم ایس شنڈے	جے دیو	سریندر پرکاش

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہندوستاں سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

اپریل ۱۹۸۷ء

ماہنامہ شانِ ہند

جلد ۴۸
شمارہ ۴

چیف ایڈیٹر ——— سرور تونسوی
معاون ایڈیٹر ——— مطرب عراقی
خطاط ——— محمد عمران، سبطین حیدر

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر
وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقامِ اشاعت دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"
فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت فی شمارہ ——— چار روپے
قیمت سالانہ ——— چالیس روپے
لائف ممبری ——— پانچ سو روپے

ممالک غیر میں بذریعہ سمندری ڈاک Rs. 80.00
بذریعہ ہوائی ڈاک سعودی عرب متحدہ عرب امارات اور کویت Rs. 150.00
انگلینڈ، ناروے، سوئٹزرلینڈ Rs. 200.00
کناڈا، امریکہ Rs. 250.00

جذباتِ عالیہ!

اعتبار الملک حکیم الشعر حضرت دل شاہجہان پوری

شیدائے ارم جس کی ہے نظر پہنچے وہ کبھی میخانے تک ۔۔۔ زاہد کا تقدس اے ساقی، کھینچ آئے ترے میخانے تک

اے حسن تری شوخی سمجھوں، یا عشق کو خود جانسوز کہوں ۔۔۔ جو شمع کی لو میں شعلہ تھا، پہنچا ہے وہی پروانے تک

روداد جفا یا حالِ وفا جو کچھ بھی کہوں سنتے رہنا ۔۔۔ اے اہلِ نظر ہر محفل میں، گرمی ہے مرے افسانے تک

اب شوق کہاں، ارمان کہاں، ہر حسرتِ دل پامال ہوئی ۔۔۔ برباد کیا اک دنیا کو، تم نے تو مرے مٹ جانے تک

پیمانہ بکف ہر کشش ہے، جنت کا کہیں بھی ذکر نہیں ۔۔۔ واعظ کی صدا گونجی اکثر، پہونچی نہ کبھی میخانے تک

آشفتہ نظر آغازِ جنوں، انجامِ جنوں کو کیا کہئے ۔۔۔ خود اس نے گریباں چاک کیا آیا جو ترے دیوانے تک

اے بیخبرِ تاثیرِ فغاں، جس حال میں ہوں رہنے دے مجھے ۔۔۔ غافل ہے فنائے عالم سے اک حشر مرے ہوش آنے تک

اک جام مئے عرفاں کا پلا، میں جھک کے کہوں پیارے ساقی ۔۔۔ رحمت کی گھٹا کعبہ سے اٹھے برسے وہ ترے میخانے تک

وہ میں کہ مری بیتابی نے ایک ایک بشر کو تڑپایا ۔۔۔ اپنے تو پھر اپنے ہوتے ہیں ہمدرد بنے بیگانے تک

جب قیدِ سلاسل ٹوٹ گئی، زنداں کا کوئی خطرہ ہی نہیں ۔۔۔ اے جوشِ جنوں تو نے مجھکو پہنچا ہی دیا ویرانے تک

جل جل کے بجھا، بجھ بجھ کے جلا، مٹ مٹ کے ہوئی پھر بربادی ۔۔۔ دنیائے وفا کی ہر منزل محدود رہی پروانے تک

کعبے کے تغیر پر بھی نظر، وہ فخرِ جہاں وہ پیغمبر ۔۔۔ توحید کی شمع تاباں تھا، جس کی تھی ضیا بتخانے تک

یہ کیا کہ جگر کے ٹکڑے ہوں، روداد الم سن کر اے دل
یہ کیا کہ تڑپ اٹھے دنیا، افسانہ رہے افسانے تک

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالاتِ حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اداریہ

بھگوان رام تو مریادا پرشوتم تھے۔ مگر.....؟

دلّی میں رام نومی کے دونوں جلوسوں
ں شرکت کرنے والے لاکھوں افراد نے لال قلعہ
کے سامنے میدان میں یہ حلف لیا کہ وہ رام جنم
وُمی کو بابری مسجد میں تبدیل نہیں ہونے دیں گے ،
ور نہ ہی اُسے کسی قسم کی قومی یادگار بنائے جانے پر
ضامند ہوں گے اور اِسی طرح سہونڈی کے کنارے

ایودھیا جی میں بھی کم از کم دو کروڑ افراد نے اسی قسم
کے حلف اُٹھائے ۔

ہم پہلے بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ اِس متنازعہ مسئلے
سے متعلق ہم کسی قسم کی رائے زنی نہیں کرسکتے کیونکہ
یہ معاملہ الٰہ آباد ہائی کورٹ میں ہے۔ مگر یہ تو کہہ سکتے
ہیں کہ فریقین اگر اِس متنازعہ مسئلے کو نفرت کے

جذبات اپنے اپنے دلوں سے نکال کر صرف محبت
اور ہم وطنی کے ناطے آپس میں کوئی ایسا فیصلہ کریں
جو دونوں فریقین کو منظور ہو اور کسی کے ساتھ زیادتی
بھی نہ ہو تو اِس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے۔ کیا ہی
اچھا ہو تا کہ بابری مسجد کی ریلی میں جمع ہونے والے مسلمان
اور رام نومی کے جلوسوں میں شرکت کرنے والے ہندو

یہ نعرے لگاتے کہ ہم اپنے ملک کی حفاظت اپنی جان پر کھیل کر بھی کریں گے۔ ہم سب اتفاق و محبت سے رہیں گے۔ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوں گے۔ ملک کے دشمنوں کا مِل کر مقابلہ کریں گے۔ کیونکہ اِن ریلیوں اور رام نومی کے جلوسوں میں شرکت کرنے والوں کی اکثریت کو یہ علم ہی نہیں ہے کہ مندروں اور مسجدوں کے جھگڑوں سے کہیں اہم فرض ملک کی حفاظت کرنا۔ اور آپس میں مِل جُل کر رہنا، کیونکہ اگر ملک ہی نہ رہا تو پھر آپ کے مندر اور مسجدیں کہاں رہیں گی؟

نفرت کیسے دُور کی جاتی ہے' اِس ضمن میں ہم ایک معمولی سا واقعہ بیان کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

جب ۱۹۴۷ء میں مہاجرین پاکستان سے یہاں آئے تو اُن دِنوں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (خدا اُن کی قبر کو نور سے بھر دے) جامعہ ملیہ کے امیرِ جامعہ تھے۔ اُنھوں نے کچھ غیر نارمل طلبا، کو جامعہ ملیہ میں داخلہ دیا اور ان مہاجر طلبا، کے کُل اخراجات تعلیم کے خاتمہ تک کے معاف فرمائے۔ ان طالبعلموں میں ایک لڑکا امریک سنگھ بھی تھا جس کا بایاں ہاتھ پاکستان میں کسی مسلمان نے کاٹ دیا تھا۔ امریک سنگھ کے دِل میں مسلمانوں کے خِلاف ایسا جذبہ تھا کہ اگر اُس کے اختیار میں ہوتا تو تنِ تنہا کئی مسلمانوں کو قتل کر دیتا۔ مگر جب اُس نے جامعہ ملیہ میں مسلمان ساتھیوں اور خصوصاً ڈاکٹر ذاکر حسین کا محبت بھرا سلوک دیکھا تو وہ اپنے دل میں شرمندہ ہوا کہ اُس نے سب مسلمانوں کو ہی بُرا سمجھ لیا تھا۔ اور ہوتے ہوتے یہ امریک سنگھ مسلمان لڑکوں کو اپنا بھائی سمجھنے لگا۔ امریک سنگھ نے جامعہ ملیہ سے بی۔ اے کیا اور آج ٹھیکیداری کرتا ہے۔ جامعہ ملیہ سے بھی کئی قسم کے ٹھیکے لیتا ہے۔ اُس کے دل میں مسلمانوں کے لئے عزت و احترام ہے۔

ایڈیٹر ہندوستان ہند'

دہلی میں چالیس سال سے مقیم ہے۔ ہر سال رام نومی کا تہوار آتا ہے اور خاصی گہما گہمی کے ساتھ منایا جاتا ہے مگر اِس سال ۷ر اپریل کو رام نومی کا تہوار جس ڈھنگ سے منایا گیا وہ مظہر تھا اس اعلان کا کہ اگر مسلمانوں نے ۳۰ر مارچ کو بوٹ کلب پر جمِ غفیر کا مظاہرہ کرتے ہوئے بابری مسجد کے حق میں کچھ مطالبات پیش کئے ہیں' تو ہندو ایک نہیں دو ریلیاں یا رام نومی کے جلوس نکال کر رام جنم بھومی کا اپنا مذہبی حق ثابت کرنے میں اُن سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہیں۔ اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ رام نومی کے دونوں جلوسوں میں بابری مسجد سے کہیں زیادہ تعداد میں ہندوؤں نے شرکت کی۔

دونوں جلوسوں میں تقریباً ڈیڑھ صد جھانکیاں تھیں جن میں بھگوان رام اور اُن سے متعلق واقعات کو بڑی خوبصورتی سے دکھایا گیا تھا۔

دونوں جلوسوں میں شرکت کرنے والے جہاں بھگوان رام سے متعلق خالص مذہبی طور پر اُن کی جے جے کار کر رہے تھے وہاں یہ نعرہ بھی لگایا جا رہا تھا" کان کھول کر سن لو سب' تالہ نہیں لگے گا اب"۔

فرقہ وارانہ فساد کو جنم دینے کا باعث بنتی ہیں۔

یہ ہر کسی کا جمہوری حق ہے کہ وہ اپنا مطالبہ پیش کرے اور جلوس یا ریلی سے اپنے مطالبہ میں زور پیدا کرنے یا اُس کی صداقت کا لوہا منوانے کے لئے استعمال کرے مگر اس کی اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہئے کہ ان ریلیوں یا جلوسوں سے کسی طور بھی امنِ عامّہ کو خطرہ پیدا ہو۔ بھگوان رام نے زندگی کے جو سُنہری اُصول عوام کے سامنے رکھے یا ایک راجہ کے اپنی پرجا کے تئیں کیا فرائض ہوتے ہیں اس کی زندہ مثالیں پیش کی ہیں جو ہم سب عوام اور حکمرانوں

ہم اپنے ہندو بھائیوں سے بھی یہی کہیں گے کہ وہ اپنے ایسے دکھاوے کے بہی خواہوں کے زہریلے اثر سے اپنے آپ کو بچائیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمان نہ رہیں ایسے احمقوں یا بہت ہوشیار سیاستدانوں نے ہندوؤں کو یہ غلط اُمیدیں دلا رکھی ہیں کہ ہندوستان سے مسلمان نکل جائیں گے، ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔

ہندوستان میں لاکھوں مندر ہیں اور لاکھوں مسجدیں ہیں۔ آپ کو کوئی مندر ویران نظر نہیں آئے گا۔ اور اس کے مقابلہ میں مسجدوں کے بارے میں کیا عرض کیا جائے۔

اوّل تو یہ ریلیاں یا جمِ غفیر اِس لحاظ سے بھی خطرناک ہیں کہ اِن سے امنِ عامّہ میں خلل پڑنے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے اور پھر ایسے وقت میں جبکہ فریقین میں تناؤ ہو تو اِس قسم کے جلوس یا ریلیاں ہی

حکمرانوں کے لئے قابلِ تقلید ہیں۔ بھگوان رام۔ راون سے لڑائی لڑی تو یہ لڑائی نہ تو ہوسِ ملک کے لئے تھی اور نہ ہی کسی دوسرے کے مذہبی عقیدہ کے خلاف، بلکہ اُنھوں نے ہر بُرائی کے خلاف لڑا

۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک دوسرے کے مذہبی
وں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ خدا کے گھر مسجد
بھگوان کے گھر مندر کے لئے مرنے مارنے کو تیار ہیں۔
دفتر شانِ ہند کے قریب ہی مسجد روشن الدولہ
۔ اس مسجد کے تحت کئی دوکانیں ہیں اور بمبئی
ائل کو آپریٹیو بینک لمیٹڈ" بھی اسی مسجد کا
دار ہے۔ یعنی اس مسجد سے ہزار ہا روپیہ
رکی آمدنی ہے مگر اس مسجد کا ٹوٹا ہوا گنبد ایڈیٹر
ہند گذشتہ چالیس سال سے دیکھ رہا ہے۔ مگر
کے کسی مسلمان کو خدا نے یہ ہمت نہیں دی کہ وہ
بورڈ سے دریافت کرنے کہ آپ لوگ ہر ماہ
دل روپیہ اس مسجد کی جائیداد سے وصول
ہے ہیں تو پھر کونسی اڑچن ہے کہ آپ اس مسجد
نبد کی مرمت تک نہیں کراتے۔

اسی دریا گنج میں دفتر شانِ ہند سے چند
کے فاصلہ پر ہندی پارک میں مسجد ہے۔ وقف
نے غالباً ایک مسلمان کو اس مسجد میں رہنے
جازت دے رکھی ہے مگر ایڈیٹر شانِ ہند نے
تہ چالیس سالوں میں اس مسجد سے اذان بلند
نہیں سنی۔ جبکہ دلی کا کوئی ہندو بچہ نہ تو وقف
کو منع کرتا ہے کہ وہ روشن الدولہ مسجد کے گنبد
رمت نہ کرائیں اور نہ ہی ہندی پارک کی مسجد
ذان دینے سے منع کرتا ہے۔ دلی کے مسلمان

بابری مسجد کے لئے تڑپ رہے ہیں مگر انھوں نے
اپنی دلی کی ان دو مسجدوں کے علاوہ دیگر کئی مسجدوں
کی کوئی فکر نہیں کی۔ کیونکہ دریا گنج کی اِن دونوں
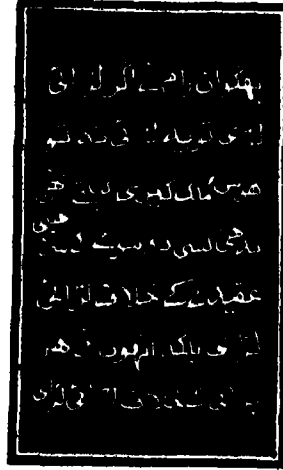
مسجدوں کے لئے انھیں کسی شہاب الدین نے یا
کسی شاہی امام نے احتجاج کرنے کے لئے نہیں کہا۔
کیونکہ اِن مسجدوں کے خلاف وقف بورڈ سے ٹکر لینے
میں انھیں آج کا مسلمان لیڈر تسلیم نہیں کرتا۔ اور
بابری مسجد کے لئے واویلا کرنے سے انھیں لیڈری
ہی نہیں، قائد ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے کیونکہ
اس بابری مسجد کے نام کے ساتھ رام جنم بھومی
کا نام جڑا ہوا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائی
اپنے حقوق کا مطالبہ پُرزور طور پر کریں، مگر وہ شاہی
امام ایسے جلد باز اور شہاب الدین ایسے اوور کلیور
جو محض ذاتی شہرت کے بھوکے اور مسلمانوں کے
قائد بننے کے مرض مند ہیں' کے جھانسوں میں نہ آئیں
کیوں کہ انھیں بابری مسجد کی بازیابی کی نسبت اپنی
شہرت، لیڈری اور ذاتی مفاد زیادہ عزیز ہیں۔

اور ہم اپنے ہندو بھائیوں سے بھی یہی کہیں گے
کہ وہ اپنے ایسے دکھاوے کے ہی خواہوں کے زہریلے
اثر سے اپنے آپ کو بچائیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان
میں مسلمان نہ رہیں۔ ایسے احمقوں یا زہریلے ہوشیار
سانپوں نے ہندوؤں کو یہ غلط اُمیدیں دلا رکھی ہیں
کہ ہندوستان سے مسلمان نکل جائیں گے۔ ایسا ہونا
ممکن ہی نہیں۔ بلکہ ضرورت یہ ہے کہ ہندو مسلمان
بھائیوں کی طرح رہیں اور اپنے ملک کے تحفظ کے
لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہیں اور دونوں
ہی رام جنم بھومی یا بابری مسجد کے سلسلے میں حق و
انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور جو بھی اصلیت
ہو اُسے دونوں فریق قبول کریں اور امن و امان سے
رہیں کیوں کہ رام جنم بھومی یا بابری مسجد کا قضیہ اب
اِس سطح پر آگیا ہے کہ جس سے ملک کا امن تباہ ہو سکتا ہے
جو ہر ہندو یا مسلمان کیلئے یقیناً نقصان کا باعث ہوگا۔

میرٹھ کی جو تاریخی حیثیت ہے وہ کسی سے
پوشیدہ نہیں ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ
آئے دن میرٹھ میں فرقہ وارانہ فساد ہوتے رہتے ہیں
فرقہ وارانہ فساد کرنے والے عناصر سے نہ تو حکومت ہی
ناواقف ہے اور نہ ہی مقامی افسران۔ پھر کیا سبب ہے
کہ حکومت اور مقامی افسران ایسے عناصر کی کارگزاریوں
پر کڑی نظر نہیں رکھتے؟۔

کیا غضب ہے کہ شب برات کے پٹاخوں کا
معاملہ ہے اور فساد ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق
شروع کیا جاتا ہے۔ اسی طرح احمد آباد میں معاملہ
کرکٹ میچ کا ہوتا ہے اور یکایک دکانوں میں آگ لگنی
شروع ہو جاتی ہے اور جیب بازی کی وارداتیں عمل

میرٹھ میں کرفیو کا ایک منظر

اگر حکومت اور مقامی افسران صدق دلی سے یہ چاہیں کہ فساد نہیں ہونے دیں تو فسادی عناصر کے باپ دادا بھی اگر قبروں سے اٹھ کر آ جائیں تو فساد نہیں ہو سکتا۔

کارندے اپنی مطلب براری کے لئے ایسے فسادات کے بانی مبانی ہوتے ہیں۔ اور مرتے ہیں بے چارے بے قصور ایسے لوگ جو فرقہ وارانہ فساد کی الف ب سے بھی ناواقف ہوتے ہیں اور فساد کرانے والے اپنے اپنے محفوظ گھروں میں آرام فرما رہے ہوتے ہیں
اہل میرٹھ اور اہل احمد آباد کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کے آپسی جھگڑے میں فائدہ فساد کرانے والوں کا ہی ہے اور نقصان اُن لوگوں کا ہے جو دوسروں کے آلۂ کار بن کر وجہ فساد بنتے ہیں۔

ہاپیر گیٹ کا پر رونق علاقہ۔ چاروں طرف ویرانی کا راج

میں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔
ہر مذہب و ملت کے دانشوروں کا یہ پختہ یقین ہے کہ اگر حکومت اور مقامی افسران صدق دلی سے یہ چاہیں کہ فساد نہیں ہونے دیں تو فسادی عناصر کے باپ دادا بھی اگر قبروں سے اٹھ کر آ جائیں تو فساد نہیں ہو سکتا
اخلاقی، قانونی اور سماجی طور پر بھی تمام تر ذمہ داری حکومت کی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کی بیخ کنی کرے مگر سیاسی چال چلنے والے حکومت کے

سال ۱۹۸۶ء کی مطبوعات پر مہاراشٹر اردو اکادمی نے مہاراشٹر کے اردو شعراء، اُدباء اور تنقید نگار مصنفین کو جو ایوارڈ دیئے ہیں اُن میں ایک بھی غیر مسلم اردو مصنف کو اِس قابل قرار نہیں دیا گیا کہ اُس کی تصنیف کو ایوارڈ کا حقدار سمجھا جائے جبکہ ڈاکٹر کیشو چند حقیر آستانی کا شعری مجموعہ "افکار گریزاں" نہ صرف مہاراشٹر بلکہ ملک بھر میں سال ۱۹۸۶ء میں شائع ہونے والی اُردو کتابوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

حالانکہ یہی مجموعۂ کلام ایک صد کی تعداد میں خرید کر مہاراشٹر اردو اکادمی نے دبے لفظوں میں یہ اقرار کیا ہے کہ "افکارِ گریزاں" ہر لحاظ سے ایک قابلِ قدر مجموعۂ شاعری ہے۔ مگر مصنف کے ایوارڈ کے حق کو غصب کرنے کے لئے اس کتاب کا آرڈر براہِ راست مصنف کو دیا گیا جب کہ مصنف نے اپنا مجموعہ ایوارڈ کے لئے پیش کیا تھا، بلک پرچیز کے لئے نہیں، بلک پرچیز کے لئے یہ مجموعہ ناشر نے مہاراشٹر اکادمی کو پیش کیا، جس کی باقاعدہ رسید موجود ہے مہاراشٹر اردو اکادمی کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی مصنف سے اس کی تصنیف کی کچھ جلدیں خرید لی جائیں تو اُس کے ایوارڈ کا حق از خود ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر کیشو چندر سین حقیر آستانی کے ساتھ یہ فریب کرنے کے لئے ناشر کی بجائے براہ راست مصنف کو کتاب کا بلک آرڈر دیا گیا جبکہ مصنف نے اپنی کتاب محض ایوارڈ کے لئے پیش کی۔

مہاراشٹر اردو اکادمی میں جناب خواجہ احمد عباس، جناب مجروح سلطان پوری، جناب علی سردار جعفری ایسے حضرات معزز ممبران کی حیثیت سے شامل ہیں۔ اِن حضرات کا جو سیاسی نظریہ ہے اُس کے پیش نظر تعصب کی کہیں گنجائش نہیں ہے اور تو اور اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر انصاری صاحب خود بھی اِس نظریہ کے حامی ہیں، پھر نہ معلوم ڈاکٹر حقیر آستانی کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں کر روا رکھی گئی جبکہ ہم سب یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ اُردو محض مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ کیا مہاراشٹر اُردو اکادمی اپنے ماتھے پر یہ کلنک لگا کر اپنے آپ کو محض مسلمانوں کی ظاہر کرنا چاہتی ہے؟"

●●

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

کوئی درد آشنا ہے؟
کوئی مشکل کشا ہے؟

دھواں سا اُٹھ رہا ہے
اِدھر کچھ تو جلا ہے

بھٹکتے پھر رہے ہیں
ہماری ہی خطا ہے

اُلجھ کر رہ گئے ہیں
خِرد کیسی بلا ہے

بھروسہ ہے جنوں پر
جنوں کا آسرا ہے

خِرد وحشت بہ رقصی
جنوں نغمہ سرا ہے

جسے تم جانتے ہو
یقیناً دوسرا ہے

کسے اُس کی خبر تھی
جو اندر مر رہا ہے

اَنا سے کوئی پوچھے
یہ کیا اُدھم مچا ہے

زباں ہے چل رہی ہے
عمل سے بولتا ہے

اسیرِ بے نوائی
ہمارا ہمنوا ہے

بہار آئے گی اِک دِن
یہ ہم نے بھی سُنا ہے

چلے چلتے ہیں چلئے
وہاں دیکھیں تو کیا ہے

دُہائی مانگو یا رو!
چلی بادِ صبا ہے

خودی نے خود سے پوچھا
تمہارے بس میں کیا ہے

اُف اُس کی سخت جانی
بنا جو موم کا ہے

بُتِ کافر کا چرچا
جو سانچے میں ڈھلا ہے!

گئی ہے جان جس کی
یہ کس کا خون بہا ہے؟

بہانوں کا بہانہ
ترا عہدِ وفا ہے

کوئی یوسف کہیں تو
ابھی تک بِک رہا ہے

بدل کس کا ہے آخر
جسے تو بیچتا ہے؟

ابھی پیوند کم ہیں
یہ مُفلس کی قبا ہے

ابھی تک دم بخود ہیں
کرم یہ آپ کا ہے

دِلِ ناداں سنبھل جا
تجھے کیا ہو گیا ہے

کوئی اُمید رکھنا
جفا اندر جفا ہے

اِدھر سب اجنبی ہیں
اِدھر سب کچھ نیا ہے

بسا یا جس کو دل میں
وُہ نِکلا غیر کا ہے

وفا ممکن نہیں تھی
کہ عالم بیوفا ہے

کوئی تریاق لائے
کسی نے ڈس لیا ہے

اُتر جائے نہ دل سے
جگر جس پر فدا ہے

حقیر اب چھوڑیئے بھی
یہاں سب کچھ روا ہے

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے،
اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے، صاف ستھرا گرد و پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا ہے،
ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر
ان جگہوں کو صاف و شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم سب استعمال کرتے ہیں۔
ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور درحقیقت اُن تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد
میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔

گرد و پیش کو صاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے

جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں، اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں، لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں
کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، ہم زیادہ صفائی کیلئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں

آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف و شفاف حالت میں رہے، اس طرح
اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں، اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات
سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہ صرف آپ کی — خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں،

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے۔ اسے صاف و شفاف رکھئے

ناردن ریلوے

شانِ ہند دہلی ، اپریل

روح کو سرشار اور ایمان کو
تازہ کرنے والے واقعات

جلیل القدر

وہی صفات، وہی خصوصیات اور ویسی ہی کرامات جیسی ان کے جدِّ اعلیٰ
حضرت غوث الاعظم میں پائی جاتی تھیں۔

ایک مردِ حق آگاہ کی سیرت و سوانح۔

مشہور صوفی ابواسحاق نے اپنے بھانجے
صفی الدین کو ایک عرصہ تک تعلیم و تربیت دی اور
ہری و باطنی علوم سے نوازدیا۔ بھانجے نے اپنے
ں سے پوچھا" اب مجھے کیا کرنا ہے اور میرے
ے کیا حکم ہے"؟

ابواسحاق نے جواب دیا" میں نے تمہیں
ں لئے تیار کیا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک خیر کی
ی تعمیر کرانا ہے، تم سے ایک بڑا کام لینا ہے،
ے عظیم الشان کام"

صفی الدین نے سرِ اطاعت خم کردیا اور پوچھا۔
رشاد! یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں کوئی بڑا کام
نام دوں"

یہ بات یہیں پر ختم ہوگئی اور صفی الدین
ں دن کا انتظار کرنے لگے جب اُن سے کوئی
لیم الشان کام لیا جائے۔

ایک دن ابواسحاق دوڑے ہوئے آئے
ر اپنے بھانجے کو حکم دیا" صفی الدین! ابھی ابھی مجھے
یا گیا ہے کہ اُس عظیم الشان کام کا وقت آگیا ہے
ر اب ہمیں اُس پر عمل درآمد شروع کردینا چاہیئے"

صفی الدین کو کیا انکار ہوسکتا تھا۔ یہ تعمیل
شاد کے لئے بالکل تیار تھے۔ ماموں نے اپنے بھانجے
کو سمجھانا شروع کردیا" بھانجے! سُنتِ نبوی پر عمل
کرنے کا ایک بہترین موقعہ، ایک اچھا وقت آگیا ہے۔
اللہ کا حکم ہے کہ ایک نیا شہر آباد کیا جائے۔ ایک
خیر و برکت کا شہر، کیونکہ اُس شہر میں تو اتر اور تسلسل
سے اللہ کے نیک بندے پیدا ہوں گے۔ اللہ کے پیارے
بندوں سے اس شہر کو آباد کیا جائے گا"

صفی الدین بے حد خوش تھے۔ وہ اپنے ماموں
کے پاس بیٹھ گئے اور نیازمندانہ باتیں کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد ماموں ابواسحاق نے انھیں
زادِ راہ دیا اور ایک اونٹ کی طرف لے جاتے ہوئے
کہا" صفی الدین! تم اپنے زادِ راہ کے ساتھ اس
اونٹ پر بیٹھ جاؤ، اس کی مہار ڈھیلی چھوڑ دو، اور
اونٹ کو اُس کی مرضی پر چلنے دو، دیکھو یہ تمہیں کہاں
لے جاتا ہے۔ پھر یہ جہاں بیٹھ جائے وہیں تم اُتر جانا
اور ایک نئے شہر کی بُنیاد ڈال دینا"

صفی الدین نے پوچھا" اگر یہ چلتا ہی رہے تو؟"

ابواسحاق نے جواب دیا" چلنے کی بھی ایک
حد ہوتی ہے، آخر کہیں نہ کہیں یہ بیٹھے گا ضرور"

صفی الدین نے زادِ راہ کی پوٹلی اپنی کمر سے
باندھ لی اور اونٹ پر بیٹھ کر اُس کی مہار ڈھیلی چھوڑ دی
اونٹ چلتا رہا، چھوٹی چھوٹی بستیوں اور گھنے جنگلوں
کو عبور کرتا ہوا وہ بہت دور نکل گیا۔

صفی الدین حیران تھے کہ اونٹ اس طرح
چل رہا تھا گویا اُس کی کوئی راہبری کررہا ہے۔ پھر وہ
ایک جنگل کے کنارے اچانک بیٹھ گیا۔ آپ نے کوشش
کی کہ وہ دوبارہ کھڑا ہوکر چلنے لگے، مگر وہ نہیں کھڑا ہوا۔
آپ اللہ کا نام لے کر اونٹ سے اُتر پڑے اور اُس
کی گردن پر ہاتھ رکھ کر پوچھا" کیا بات ہے، کیا یہی وہ
جگہ ہے جس کی ماموں ابواسحاق بڑی تعریف کررہے تھے"

اونٹ نے کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن اُسکے
مستقلاً بیٹھ جانے کا انداز بتا رہا تھا کہ ابواسحاق کی
مذکورہ جگہ یہی ہے۔

آپ اونٹ سے اُتر کر اِدھر اُدھر گئے، لیکن
وہاں قرب و جوار میں کوئی بھی بستی نہیں تھی۔ آپ نے
یہاں پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی ڈال لی اور رہنے لگے۔
جب لوگ اُدھر سے گزرتے اور اُس ویرانے میں ایک
شخص کو جھونپڑی میں مقیم دیکھتے تو انھیں بڑی حیرت
ہوتی۔ لوگ یہاں آنے لگے اور جب انھیں صفی الدین
کی بزرگی کا علم ہوا تو انھوں نے یہاں گھر بنانے شروع
کردیئے، مکانات کی تعمیر شروع ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے
یہ جگہ ایک شاندار بستی میں تبدیل ہوگئی اور اس کا نام
"اُچھ" قرار پایا۔

صفی الدین مدتوں انسانوں کی خدمت کرتے
ور اللہ کی مخلوق نے آپ سے بڑا فیض اٹھایا۔
اندان کے ایک بزرگ شیخ ابوالفتح کی پوتی کی
شیخ محمد حسنی جیلانی سے ہوگئی۔ شیخ محمد حسنی
پیر دستگیر شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ کے
دے سے تعلق رکھتے تھے اور شیخ محمد حسنی جیلانی
سب سے بڑا التعارُف تھا۔ شیخ صاحب بادشاہ
ربار سے وابستہ تھے۔ اللہ نے انھیں کئی اولاد
یں اور یہ سب بادشاہ کے دربار سے وابستہ
۔ اپنی اولادیں سے ایک کا نام اپنے جدِّ اعلیٰ
پیر دستگیر شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے نام پر
القادر رکھا تھا۔ یہ بچہ جب سنِ بلوغ کو پہنچا تو بادشاہ نے
بھی ملازمانِ شاہی میں شامل کر لیا۔

مال و زر کی کوئی کمی نہ تھی، دولت کی ریل پیل تھی
نے بادشاہ کے دربار میں ساز و آواز کا طوفان برپا
دیکھا تھا۔ خوش آواز مغنی جب مزامیر کی سنگت
پنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے تو پورے ماحول میں
گ سی لگ جاتی۔ دلوں میں ہلچل مچ جاتی، اور
یں رس گھلنے لگتا۔

بادشاہ کی خاص محفلوں میں یہ بھی شریک
اور جب تک یہ محفلِ ساز و آواز جمی رہتی، یہ وہیں
رہتے۔ بعد میں سب کے ساتھ انھیں بھی اٹھنا
ا۔ یہ گھر آتے تو ان کے دل و دماغ پر اسی ساز و
کا قبضہ رہتا۔ ایسا لگتا جیسے مزامیر ان کے وجود
ز گئے ہیں اور وہ نشتر بن کر پورے وجود کو سرشار
ہیں۔ گانے والوں کی خوش الحانیاں ان کی رگ
نس نس میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔

ان کا ایک حلقۂ احباب تھا مخصوص حلقۂ احباب
بھی ان مخصوص محفلوں سے متأثر ہوتا تھا لیکن ان
سے کم۔ ایک دن یہ لوگ شاہی محفل سے اٹھ کر آئے
تو عبد القادر نے دوستوں سے کہا "افسوس کہ میرا
دل تو نہیں چاہتا تھا کہ یہ خوش الحانی کی محفل برخاست
ہو لیکن کیا کرتا، بادشاہ کی مرضی، محفل برخاست ہوئی
اور مجھے مجبوراً وہاں سے آنا پڑ گیا"۔

دوستوں نے پوچھا "لیکن وہ تو بہت دیر بعد
برخاست ہوئی تھی۔ کیا اتنی دیر تک لطف اندوز ہونے

کے بعد بھی آپ مزید کے خواہش مند تھے؟"
انھوں نے جواب دیا "ہاں، معلوم نہیں کیا

اللہ کا حکم ہے کہ ایک نیا شہر آباد
کیا جائے۔ ایک خیر و برکت کا شہر
کیونکہ اس شہر میں تواتر اور
تسلسل سے اللہ کے نیک بندے
پیدا ہوں گے۔
اللہ کے پیارے بندوں سے
اس شہر کو آباد کیا جائے گا۔

بات ہے کہ میری سیری نہیں ہوتی، یہی جی چاہتا ہے
کہ ساز بجتے رہیں، خوش الحانیاں ہوتی رہیں اور میں
بیٹھا لطف اندوز ہوتا رہوں"

دوستوں نے کہا "تو اس کا انتظام
ہو سکتا ہے اگر آپ چاہیں تو"۔

انھوں نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

ایک دوست نے جواب دیا "وہ اس
طرح کہ آپ اس مد میں کچھ صرف فرمائیں، یہ مزامیر،
یہ خوش الحان لوگ، انھیں مال و زر کے بل پر جمع
کیا جاتا ہے، آپ بادشاہ تو نہیں ہیں لیکن دولت
والے ضرور ہیں۔ آپ کو جو گوئیے اور مزامیر پسند ہوں،
انھیں ملازم رکھ لیں اور مزامیر بازار سے خرید لائیں"۔

شیخ عبد القادر کی سمجھ میں یہ باتیں آگئیں اور وہ
دوسرے دن بازار گئے اور انھیں جو جو ساز پسند آئے

خرید لئے، پھر اپنے پسندیدہ گویّوں سے باتیں کیں اور انھیں
معقول مشاہرے پر ملازم رکھ لیا۔

صوفی منش باپ اپنے بیٹے کی یہ ساری باتیں
برداشت کر رہے تھے لیکن زبان سے کچھ نہ کہتے تھے انھیں
اپنے بیٹے کی یہ باتیں پسند نہیں تھیں۔

کچھ دنوں بعد شیخ عبد القادر کو کسی کام سے
باہر جانا پڑا تو انھوں نے سفر کی تیاری کے سلسلے میں جو
سامان ضروری سمجھا اس کو بندھوا لیا۔ کئی اونٹ دروازہ
پر کھڑے تھے اور ان پر شیخ کے مزامیر لادے جا رہے تھے
ان کے لئے بھی اونٹوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

ان کے والد کو جب یہ ساری خبریں پہنچائی
گئیں تو وہ بے چین ہو گئے اور انھوں نے اپنے بیٹے کو
اپنے پاس بلا کر پوچھا "بیٹے عبد القادر! یہ میں کیا سن
رہا ہوں"

شیخ نے پوچھا "کیا سن رہے ہیں آپ؟"

والد نے کہا "میں نے سنا ہے کہ تم کہیں باہر
جا رہے ہو، اور سامانِ سفر میں اونٹوں پر مزامیر بار
کرائے ہیں اور گویّوں کو اونٹوں پر سوار کرا رہے ہو کیا
یہ صحیح خبر ہے؟"

شیخ نے جواب دیا "ہاں یہ خبر درست ہے، مگر
اس پر آپ کو کیوں اعتراض ہے؟"

باپ نے کہا "مجھے اعتراض تو کوئی نہیں۔ میں
تو یہ کہتا ہوں کہ تم ان خرافات میں کہاں پڑ گئے! بیٹے، یہ
اچھی چیزیں نہیں ہیں"۔

شیخ نے پھر وہی جواب دیا "میں یہ جاننا
چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر کیوں اعتراض ہے؟"

باپ نے کہا "بیٹے! ہمارا جس خانوادے سے
تعلق ہے اس میں یہ چیزیں معیوب بلکہ شرمناک
سمجھی جاتی ہیں"۔

شیخ نے جواب دیا "لیکن خود مجھ کو یہ چیزیں
نہ تو معیوب لگتی ہیں اور نہ شرمناک"۔

باپ نے مایوسی سے کہا "تب پھر تم جاؤ،
بات ہی ختم ہو گئی، اب کیا بات کروں تم سے"۔

شیخ اونٹوں پر مزامیر لدوا کر اور گویّوں کو بٹھا
کر سفر پر روانہ ہو گئے۔ وہ جہاں بھی ٹھہرے وہ جگہ ساز و
آواز سے گونجنے لگی۔ وہ خود بھی محظوظ ہوئے اور جن لوگوں

نے سُنا وہ بھی خوش ہوئے۔

مزامیر اور گویّے بھی ان کا دل نہ بہلا سکے' اداسی اور کسی نامعلوم شئے کی کمی کے احساس نے انھیں خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ دوستوں سے پوچھا: "دوستو کیا بات ہے کہ اب مزامیر اور گویّے بھی زیادہ اچھے نہیں لگ رہے اور ہر وقت کسی شئے کی کمی کا احساس پریشان کرتا رہتا ہے؟"

کسی دوست نے جواب دیا "یکسانیت انسان کو پریشان کر دیتی ہے۔ چنانچہ مزامیر اور گویّوں کی ہر وقت موجودگی نے یکسانیت پیدا کر دی ہے اسی لئے آپ وقتی طور پر ان چیزوں سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں لیکن اب وہ وقتی اور عارضی تاثر بھی گیا۔"

آپ نے پوچھا۔ "پھر اب کیا ہونا چاہیئے؟"

دوست نے جواب دیا "ساز و آواز کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جو آپ کا دل بہلا سکتی ہے' آپ کو خوش رکھ سکتی ہے۔"

آپ نے پوچھا "وہ کیا چیز ہے؟"

دوست نے جواب دیا "شکار' سارے ہی امراء اور حکمراں شکار کھیل کر جی بہلاتے ہیں' آپ بھی شکار کھیلا کریں۔"

انھیں سکون اور مزے کی تلاش تھی۔ انھوں نے سوچا اگر شکار سے جی بہل سکتا ہے تو شکار کھیلنا چاہیئے۔ دوستوں سے کہا" اب ہم شکار کھیلیں گے اب ہم شکاری کہلائیں گے' اب شکار کا سامان تیار کیا جائے۔"

شکار کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے اُن میں شکاری کتّے بہت اہم ہوتے ہیں۔ جب دوستوں نے انھیں بتایا کہ شکار کے لئے کتّے ضروری ہوتے ہیں تو آپ ذرا پریشان ہو گئے اور پوچھا "کیا شکاری کتّے بہت ضروری ہیں؟"

دوستوں نے جواب دیا" بہت ضروری۔ ان کے بغیر شکار کا نہ تو مزہ آئے گا نہ بھرپور شکار کھیلا جا سکے گا۔"

آپ نے کہا" تب پھر شکاری کتوں کا انتظام کیا جائے۔"

دوستوں اور خدمتگاروں کو شکاری کتوں کا انتظام کرنا پڑا۔ گو کہ اس مد میں خرچہ بہت آیا۔

جب شکاری کتّے آگئے تو اُن کے رہنے کی جگہ کا انتظام کیا گیا۔ اُن کے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔

شیخ کے باپ ان کارروائیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ شکاری کتوں کی آمد سے خوش نہیں تھے انھوں نے ایک بار پھر اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"بیٹے عبدالقادر! کیا بات ہے! اب تو کتوں میں دلچسپی لینے لگا ہے! آخر کیوں؟"۔

شیخ قادر نے جواب دیا" پدرِ بزرگوار! میں اپنی ذات میں کسی کمی کو محسوس کر رہا ہوں۔ کمی کا یہ احساس مجھ کو ہر وقت پریشان رکھتا ہے۔ چنانچہ جب میرے دوستوں نے مجھ کو یہ بتایا کہ یہ بے لطفی اور کسی شئے کی کمی کا احساس شکار سے دور کیا جا سکتا ہے اور شکار کے لئے شکاری کتے ناگزیر ہیں تو میں نے شکاری کتوں کا انتظام کیا۔ آپ کو معلوم نہیں اس پر کیوں اعتراض ہے؟"

متقی باپ نے جواب دیا" مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے' بلکہ مسلمان کتّے نہیں پالتے۔ کتّے پالنے کو اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے اور مجھ کو اسلام دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

بیٹے نے کہا" آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن بتائیے میں کیا کروں؟ میں اپنا دل کس طرح بہلاؤں؟

باپ نے سختی نہیں کی' بیٹے سے زیادہ بحث بھی نہیں کی۔ کیوں کہ انھیں خوب معلوم تھا کہ زیادہ سختی بیٹے پر بُرا اثر ڈالے گی۔ شیخ زادے نے وہاں سے ہٹ کر دوستوں سے کہا" شکار کی تیاری کی جائے۔"

شکار کی تیاری کر لی گئی۔ اور کتوں کو ساتھ لے کر شکارگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سارا دن شکار کے پیچھے دوڑ بھاگ کرنے میں انھیں بڑا مزا آیا۔ شیخ عبدالقادر نے اقرار کیا کہ ساز و آواز کے بعد پہلی بار لطف اندوز ہوئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "کسی شے کی کمی کا احساس اب بھی باقی ہے!"

شکار کا سلسلہ جاری رہا اور اس میں اتنا وقت ضائع کیا کہ اس کا مزہ بھی جاتا رہا۔

انہی دنوں اُن کے والد کے پاس مخمل کا ایک تھان آیا' یہ تھان اُن کے کسی عقیدتمند نے بھیجا تھا۔ انھوں نے یہ تھان اپنے بیٹے عبدالقادر کے حوالے کر دیا اور کہا" بیٹے! یہ نہایت قیمتی کپڑا ہے۔ اس سے اپنا لباس بنوا لو۔"

باقی آئندہ

استغنا کے پیکر بادشاہ انکی نظر میں معمولی انسان تھا۔ بادشاہ ان سے ڈرتا تھا اور یہ خدا سے ڈرتے تھے۔ آپ کی ابتداء مایوس کن تھی۔ باپ کو شکایت اللہ والے دوستوں کو شکایت تھی کہ یہ عبدالقادر کو آخر ہو کیا گیا ہے کہ ہر وقت لہو لعب میں پڑے رہتے ہیں آخر غیب سے اشارہ ملا اور یہ اتنے بلند پایہ بزرگ قرار پائے کہ ان کے ہمعصروں میں ایک بھی ایسا نہیں نظر آتا جو تصوف میں آپ کا مدِمقابل قرار پائے۔ آپ جب تک جیے یکتا رہے۔ وفات پائی تب بھی یکتا ہی قرار پائے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی مومن کی وفات ہوتی ہے تو قبرستان کا گوشہ گوشہ اس کے لیے بناؤ سنگار کرتا ہے اور ہر گوشہ یہی آرزو کرتا ہے کہ یہ میرے پاس دفن ہو لیکن جب کسی کافر کی موت ہوتی ہے تو قبرستان میں تاریکی پیدا ہو جاتی ہے اور قبر کا گوشہ گوشہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ کر فریاد کرتا ہے کہ یہ میت میرے پاس دفن نہ کیا جائے

جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے

● اداکار سنیل دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لُطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نُورمحمّدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجّب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنایا ہے۔ آپ یہاں تشریف لاکر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نُورمحمّدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 183/181 ای۔آر۔روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل۔ 8511008 فون دفتر: 8516115

وگ ہنستے ہوئے کل دہر سے گزرے تھے
رجھکائے ہوئے اس نگر سے گزرے تھے

ب گئے ہیں کچھ ایسے ذہن کے پردوں سے
حادثات جو میری نظر سے گزرے تھے

ے خبر تھی کہ طوفان آٹھ کھڑے ہونگے
ہنستے کھیلتے ہر اک لہر سے گزرے تھے

ام جسم ہے زخمی لہو لہان ہے سر
یہ کیسے بتائیں کدھر سے گزرے تھے

اسی لہر نے بیڑے تباہ کر ڈالے
نہ سینکڑوں سیلاب سر سے گزرے تھے

م کے رہ گئے خاروں میں اور چھالوں میں
ورات بھی کس رہگزر سے گزرے تھے

کے موڑ پہ اب دیکھئے ہو کیا مجبور
ے حسین مسافر ادھر سے گزرے تھے

مجبور جالندھری

دلِ حریفِ ستم رہے نہ رہے
پھر میری شامِ غم رہے نہ رہے

دولتِ ضبط دل میں کر لیں جمع
اُن کی نظرِ کرم رہے نہ رہے

وقت ہے سن لے داستانِ الم
کیا بھروسہ کے دم رہے نہ رہے

گردشِ وقت اب سنوار چلی
زلفِ جاناں میں خم رہے نہ رہے

کر لیں آئینِ محبت تحریر
ہاتھ میں کل قلم رہے نہ رہے

وقت توبہ تو آئے گا زاہد
محفلِ جام و جم رہے نہ رہے

اُن کے جلوؤں کو اے ہلال اکثر
یہ بھرم ہے کہ ہم رہے نہ رہے

زیڈ۔ اے ہلال

ہنس دئے ہم کو دونوں جہاں دیکھ کر
چپ رہے ہم تجھے بدگماں دیکھ کر

آس نشیمن کی عظمت نہ پوچھے کوئی
سر جھکا دیں جسے بجلیاں دیکھ کر

اپنی مجبوریاں ہم بتاتے کسے
رہ گئے جانبِ آسماں دیکھ کر

آسمان نے ہمیں اتنی مہلت نہ دی
آشیاں دیکھتے بجلیاں دیکھ کر

گردشِ وقت بھی مجھ سے کترا گئی
میری راہوں کی دشواریاں دیکھ کر

میری غیرت نے ساحل کو ٹھکرا دیا
موجِ طوفاں کی بیتابیاں دیکھ کر

اُن کا دامن بھی اے یاد نم ہو گیا
میری آنکھوں سے آنسو رواں دیکھ کر

یاد دہلوی

آج جنوری سنہ ۱۹۶۰ء کی ۲۳ر تاریخ ہے۔
ات کے پَونے نَو بجے ہیں۔ لال قلعہ بجلی کے قمقموں
ے نقعۂ نور بنا ہُوا ہے۔ ہندوستان کے گیارھویں
بشن جمہوریت کا آغاز کل یہاں کوی دربار سے ہوا
ور آج نو بجے مُشاعرہ ہونے والا ہے۔ قلعۂ معلّیٰ کے
ساتھ اُردو کو جو تعلق ہے اُس کو بیان کرنیکی ضرورت

نہیں ہے۔ لیکن آج کا دِن آزاد ہند فوج کے بانی اور آزادئ ہندوستان کے بہادُر اور نڈر سپوت نیتاجی سُبھاش چندر بوس کا جنم دن بھی ہے۔ جمہوریت، لال قلعہ، اُردو، اِس تثلیث نے مل کر آج کے مُشاعرہ کو خاص طور پر اہم بنا دیا ہے

نو بجے ہیں، جنرل شاہنواز اور جناب دی شنکر تشریف لائے ہیں۔ حاضری بہت کم ہے، عظیم

پنڈال خاموش ہے۔ شاید اُردو والوں کی قدرشناسی کا پرتو استغراق ہے۔ اسٹیج بڑی خوبصورتی سے سجا ہوا ہے۔ پسِ منظر میں ایک محل دکھایا گیا ہے جس میں گاندھی جی کی چرخی تصویر ایک عجیب حُسن پیدا کر رہی ہے۔ اسٹیج پر معدودے چند شُعرا نظر آ رہے ہیں۔ قبلہ جوشؔ ملسیانی بزرگانہ جلالت کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔

افتتاح کے اِس اعزاز کو ذرّہ نوازی قرار دیتے ہوئے اس بزم کے نظامُ المُلک، جناب گوپی ناتھ امنؔ نے تالیوں کے ساتھ مُشاعرے کے افتتاح کے لئے نیتاجی کے دستِ راست جناب جنرل شاہنواز خاں، اور صدارت کے لئے سردار پٹیل کے دستِ راست جناب دی۔ شنکر کا نام نامی پیش کیا ہے۔ جنرل شاہنواز نے نیتاجی، لال قلعہ اور اُردو کی تثلیث پر زور دیتے ہوئے مُشاعرے کا افتتاح کر دیا ہے۔ اور اب صدرِ مشاعرہ جناب دی شنکر صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ کالی شیروانی اور سفید چوڑی دار پائجامہ زیبِ تن ہے۔ بھاری اور گرجدار آواز میں مُرصّع اور مُسجّع اُردو میں فرما رہے ہیں:۔

"اچھے کام میں تمہید سُترہ انسانیت بنتی جا رہی ہے۔ شعر و شاعری کے دربار میں نثر کی نذر خاموشی سے ادا کرنے کی رسم ہو گئی ہے۔ کچھ رسم کے ہی حلقہ میں مَیں بھی گرفتار ہوں اور آپ بھی۔ اور اِس کے بجا لانے کے لئے آپ کی سمع خراشی کروں گا۔ اُمید کرتا ہوں آپ درگذر فرمائیں گے۔ جنابِ نواز کی یہاں موجودگی ذرّہ نوازی بلکہ شاہی میدان میں شاہ نواز کی بندہ نوازی ہے۔

اُردو اس جائے مقدس کے گذشتہ تاریخی سلسلے سے پیوستہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو کا گہوارہ دلّی ہے، دکن نہیں۔ اُردو کو شاہی سرپرستی کا فخر لیکن عام فہم ہونے پر بھی ناز تھا۔ اُسے تقویت دی اُس شاعرِ گوشہ نشین نے جو رات بھر جاگ جاگ کر بیٹھا تو کہیں جا کر ایک ایک شعر ایسا ستارہ چمکا کہ نویدِ عید ہوا۔ اُردو اُنھیں موتیوں کی وجہ سے ترقی پاتی رہی۔ کونے کونے میں سمجھی جاتی رہی۔ اور آج اُردو ستر نارکتی کی طرح دربدر بھٹکتی پھر رہی ہے۔ چھوٹے

بڑے کے دل میں دل نشین تھی، آوارگی کے غبار سے آلودہ ہے۔ آج آپ اسے یہاں بیٹھے سالانہ خراج ادا کر رہے ہیں۔ گزارش ہے کہ آپ اس کے روز بینے کو مت بھولئے گا۔ اُردو کے لئے پہلے جو انتظام تھے اُن کی وجہ سے وہ ایک ایسی کشتی تھی جو بڑے بڑے بندرگاہوں پر قبول ہوئی اور اب جس جگہ پر جا لگی تو وہی کنارہ ہوگیا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب محض دلّی اور لکھنؤ میں کیا سب جگہ اردو والوں کی جو مہمانی ہوتی تھی وہ ایک تاریخی واقعہ بن جاتی تھی۔ آج اُردو اس طرح سے پکارتی ہے:۔

جو آئے مہماں ہمارے بنکر وہ ظلم کرنے لگے ہمیں پر
غضب تو یہ ہے مکاں سے باہر مکان والے پڑے ہوئے ہیں

اس حسین وجمیل، مرصّع و مسجّع نثری نظم کے بعد صدرِ مشاعرہ نے تالیوں کے شور میں بزمِ مشاعرہ کے نظام الملک سے مشاعرہ شروع کرنے کی درخواست کی اور امنؔ صاحب نے جمیل تاباںؔ سے کلام سنانے کی فرمائش کی ہے۔ پنڈال میں مکمل سناٹا چھایا ہوا ہے۔ وی۔ شنکر صاحب نے ماحول مشاعرہ کے لئے آدرش بنادیا ہے۔ حاضری کوئی پندرہ سو تک ہے جو اُردو والوں کی ناقدر شناسی کی زندہ مثال ہے۔ اُردو داں "ہائے اُردو" "وائے اُردو" تو کرتے رہتے ہیں لیکن اُردو کی ترقی و بہبودگی کے لئے کوئی عملی ثبوت دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ کل ہندی کوی سمیلن میں پندرہ ہزار سامعین تھے اور آج کل پندرہ سو۔

جمیل تاباںؔ صاحب نے ایک نظم "صبحِ بہار" اُستادانہ ترنم سے سُنانی شروع کی ہے۔ نظم منظریہ شاعری ایک اچھا نمونہ ہے۔ الفاظ کی ترتیب، زبان کی سلاست اور فصاحت، اسلوبِ بیان کی پختگی سے جمیلؔ صاحب فطرت کے حسین مناظر کی تصویر کشی کر رہے ہیں اور سامعین ہیں کہ ہر بند کو مکمل خاموشی سے سُنتے ہیں اور بند کے آخری مصرعہ پر واہ واہ، سُبحان اللہ، کا شور بپا ہوجاتا ہے۔ دیکھئے جمیلؔ صاحب پوری محفل میں کیسی رنگا رنگ مہک پھیلا رہے ہیں:۔

"ہے موتیا کہیں کہیں گیندا کھلا ہوا

ہلکا سا منگا لو اک خنجر، تلوار نہ لو کہنا مانو!
سرکار کلائی نازک ہے، مُڑ جائے گی بل پڑ جائیگا

نرگس کہیں ہے اور کہیں سوسن ہے جلوہ زا
نکھرا ہوا ہے رنگ خوشی سے گلاب کا
گلہائے رنگ رنگ کی نکہت ہے جانفزا"

جمیل تاباںؔ صاحب کی اس کامیاب نظم سے مشاعرہ جم گیا ہے۔ اِس ذکرِ بہاراں میں امنؔ صاحب جو خود کچھ فرما کر گلوخلاصی کرانا چاہتے تھے، لیکن عرشؔ ملسیانی نے اِسے تصرّفِ بے جا قرار دیا اور اسٹیج پر دوسرے شعراء کے احتجاج پر امنؔ صاحب مُطلق العنان نظام الملک نہ بن سکے۔ اور انھیں سپر ڈالنی پڑی۔ اب کاملؔ نظامی مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

" گُلوں کا ذکر کریں نسترن کی بات کریں
چمن میں رہ کے بہارِ چمن کی بات کریں
نیا ہے دَور، نیا جام اور نئی صہبا
نئے نظام، نئی انجمن کی بات کریں "

اِن کے کلام میں نئی زندگی کی علامت ہے۔ اور آج کے دن کی اہمیّت کا احساس بھی، زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے، اس لئے داد ملی ہے۔ اب امنؔ صاحب نے محشرؔ امروہوی کا نام پکارا تو پیچھے سے آواز آئی" اچھا گاندا اے" (اچھا گاتا ہے) کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اردو شاعری اب ترنم کی مرہونِ منت ہوکر رہ گئی ہے۔

محشرؔ صاحب نے اپنے اُستادانہ ترنم سے غزل شروع کی اور صرف اتنا ہی کہا تھا:۔

"جب ان کی جوانی آئے گی۔۔"

کہ پوری محفل میں شور بپا ہوگیا۔ محشرؔ صاحب اپنی لمبی داڑھی اور شکل وصورت سے زاہدِ خشک نظر آتے ہیں۔ لیکن جب انھوں نے "اُن" کی جوانی کا ذکر چھیڑا تو حاضرین "بُڈّے او بُڈھیا" (واہ رے بوڑھے) کہہ کر خوب ہنسے اور قہقہوں کے شور میں محشرؔ صاحب فرما رہے ہیں:۔

" جب اُن کی جوانی آئے گی اور زلف میں بل پڑ جائیگا
اُس روز تو ساری دُنیا کے سجدوں میں خلل پڑ جائے گا
گر ہاتھ لگا یا زلفوں کو تقدیر میں بل پڑ جائے گا
ہوجائیں گے دن دھندلے دھندلے راتوں میں خلل پڑ جائیگا "

محشرؔ صاحب کی ڈاڑھی اور عاشقانہ موضوع، اس پر پڑھنے کے ہلکے پھلکے الفاظ کا موسیقارانہ استعمال اور اُن کا اُستادانہ ترنم، سامعین ہیں کہ جھولیاں بھر بھر کر داد دے رہے ہیں۔ دیکھئے اس شعر میں داغؔ کا اچھوتا پن بھی مل گیا ہے ؎

" ہلکا سا منگا لو اک خنجر، تلوار نہ لو کہنا مانو
سرکار کلائی نازک ہے، مُڑ جائے گی بل پڑ جائیگا "

داد وتحسین کے شور میں محشرؔ صاحب اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو امنؔ صاحب نے چٹکی لگائی "حضرت بظاہر مولوی معلوم ہوتے تھے لیکن کلام رنگین تھا، اس پر قہقہے لگے ہیں اور امنؔ صاحب فرما رہے ہیں کہ اب ایک ایسا شاعر پیش کر رہا ہوں جو صُوری اور معنوی دونوں لحاظ سے رنگین ہے۔ لیجئے مُشیرؔ جھنجھانوی مائک پر تشریف لائے ہیں اور قطعہ فرمایا ہے:۔

" جو بھی یوں تجھ کو دیکھ پاتا ہے
چُپکے چُپکے وہ مُسکراتا ہے
رازداں اس قدر اُداس نہ ہو
رازداری پہ حرف آتا ہے "

قطعہ پر اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شعراء سے داد مل رہی ہے اور مشیرؔ صاحب نے غزل شروع کی ہے

" خوفِ شب نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے

میں نے دل ہی سے چراغوں کو جلا رکھا ہے
میں تلاطم میں بھی ساحل کی خبر رکھتا ہوں
میں نے ہر موج کو ساحل سے ملا رکھا ہے۔ "

اِن پُر معنیٰ اشعار پر صاحبِ ذوق حضرات داد دے رہے ہیں۔ دیکھئے مُشیر صاحب کتنا اچھا شعر فرما رہے ہیں ؎

" اب میں اک جلوۂ بے رنگ کا شیدائی ہوں
ہر جگہ باغِ حرم و دَیر بچھا رکھا ہے۔ "

اس شعر پر خوب داد ملی ہے۔ مشیر صاحب پختہ گو شاعر ہیں اور تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ وہ تمام شاعروں کی طرح سامعین کے سطحی مطالبے سے متأثر ہو کر ترنم سے نہیں پڑھتے۔ کلام میں جان ہو تو وہ ترنم کا محتاج نہیں رہتا اور داد لے ہی لیتا ہے۔ اب امن صاحب کہہ رہے ہیں کہ اب میں ایک بہت بُلند یعنی اونچے شاعر کو پیش کر رہا ہوں اور اُنھوں نے جناب رعنا جگّی کا نام پُکارا تو مسخر لکھوڑوی کی آواز آئی کہ رعنا صاحب قامت و قیمت دونوں اعتبار سے بلند ہیں۔ رعنا بھی تحت اللفظ پڑھتے ہیں اور دہلی کے نوجوان شعرا میں پختہ گو ہیں۔ اِن کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے دیکھیے کتنا حسبِ حال شعر فرما رہے ہیں ؎

" ابھی بہار مکمل نہیں تو کیا غم ہے
خزاں کا دَورِ چمن سے گیا یہ کیا کم ہے۔ "

اِس شعر پر خوب داد ملی ہے اور رعنا صاحب فرما رہے ہیں ؎

" اُداس اُداس ہے چہرہ مزاج برہم ہے
یہ سُن لیا ہے کہ پھولوں کی زندگی کم ہے
یہ کس کے رنگِ تبسم کا روپ ہیں غنچے
یہ کس کے اشکِ مسلسل کا نام شبنم ہے "

رعنا کی شاعری محض لفظی بازیگری نہیں، ان کے ایک ایک شعر کے پیچھے ایک سوچ ہوتی ہے۔ زبان سلیس ہوتی ہے اس لئے کامیاب رہتے ہیں۔ اب شوق لکھنوی صاحب تشریف لائے ہیں اور آزادی پر ایک قطعہ تحت اللفظ فرمایا ہے۔ اس کے بعد بڑے نفیس ترنم میں، جو لکھنؤ کے شعرا کا خاصہ ہے یہ غزل چھیڑی ہے ؎

" نمی آنکھوں کی دل کی چوٹ بھی دیکھی نہیں جاتی
یہ دُنیا ہے یہاں بیچارگی دیکھی نہیں جاتی "

پہلے ہی شعر سے حضرت مخمورؔ دہلوی مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی۔ پُر درد کلام، دل گداز انداز اور دل سوز ترنم، ایک شعر پر سامعین جھوم رہے ہیں فرماتے ہیں ؎

" نشیمن خاک ہونے سے وہ صدمہ دل کو پہنچا ہے
کہ اب ہم سے کوئی بھی روشنی دیکھی نہیں جاتی
بہت کچھ سوچتا ہوں میں سمجھ میں کچھ نہیں آتا

اچھے مزاحیہ اشعار کہنا مشکل ہوتا ہے مزاح کے ساتھ فنِ شاعری کا دامن سنبھالنا ایک فنکار کا ہی کام ہوتا ہے لیکن فُرقت صاحب ایسے فنکار نہیں ہیں۔ فنِ شاعری کے ساتھ ساتھ حدِ اخلاق کو بھی پہچانتے ہیں۔
ہاں اگر مزاحیہ شاعری کا مقصد صرف سننے والوں سے قہقہے لگوانا ہے تو فرقت صاحب کی بچہ کشی کامیاب ترین نمونہ

کسی سے کیوں کسی کی دوستی دیکھی نہیں جاتی
بہا دو ایک آنسو دولتِ کونین مِل جائے
اگر تم سے مری بے مائیگی دیکھی نہیں جاتی۔ "

داد کا شور ہے کہ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ہر شعر کئی کئی بار پڑھوایا جا رہا ہے۔ شوق صاحب نے واقعی ایک ایک شعر میں دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ یہ شعر دل سے نکلے ہیں اور دل میں اُترتے چلے جا رہے ہیں۔ آسان زبان، ہلکا دل گداز ترنم، طرزِ ادا میں لکھنوی نفاست، اور پھر میر تقی میرؔ اور مخمورؔ دہلوی کا رنگ، شوق صاحب تالیوں کے شور میں اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور اب امن صاحب نے لکھنؤ کے پڑوس کے جناب فُرقت کاکوروی صاحب کو بُلایا ہے۔ فُرقت صاحب مزاحیہ کلام کہتے ہیں۔ "بعد کے مشاغل" کے عنوان سے فرما رہے ہیں ؎

" تعلیم کی تمام تو کالج سے یوں چھٹے
جیسے کہ کوئی سانڈ کو کھونٹے سے کھول دے "

اچھے مزاحیہ اشعار کہنا مشکل ہوتا ہے۔ مزاح کے ساتھ فنِ شاعری کا دامن سنبھالنا ایک فنکار کا ہی کام ہے۔ لیکن فُرقت صاحب ایسے فن کار نہیں ہیں فنِ شاعری کے ساتھ ساتھ وہ حدِ اخلاق کو بھی پہچانتے ہیں۔ ہاں اگر مزاحیہ شاعری کا مقصد صرف سُننے والوں سے قہقہے لگوانا ہے تو فُرقت صاحب کی "بچہ کشی" کامیاب ترین نمونہ ہے اس قسم کی شاعری کا۔ "بعد کے مشاغل" سے فُرقت صاحب کا رنگ نہیں جما۔ اس لئے "بچہ کشی" سُنائی ہے۔ اس کی پُرزور فرمائش کی گئی ہے۔ "بچہ کشی" نے مشاعرے میں جان ڈال دی ہے۔ عورتیں گلا پھاڑ پھاڑ کر ہنس رہی ہیں۔ تالیاں، ہنسی، قہقہے ہیں کہ محفل میں ہر سُو بکھر گئے ..... ہیں۔ اِس شور و غل کے بعد کسی شاعر کا داد لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ امن صاحب کو بھی اِس نازک موقع کا احساس ہے اور فُرقت صاحب نے جو فضا پیدا کر دی ہے اُس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور کمال ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے جناب بسمل شاہجہاں پوری کو زحمت دی ہے۔ بسمل صاحب نے اپنے پاٹ دار ترنم سے محفل کو سنبھال لیا ہے۔ اس شعر پر تو داد اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور انھیں یہ شعر تین بار پڑھنا پڑا ہے ؎

" جن کو اوراقِ زمانہ سے مٹاتا ہے جنوں
وہ نظر آتے ہیں تاریخ کا عنواں ہو کر "

اب واقف مراد آبادی صاحب مائک پر تشریف لائے ہیں۔ واقف صاحب بھی مزاح نگار ہیں لیکن آپ اپنے چند مخصوص قطعات سُنا کر ہی محفل پر چھا جاتے ہیں۔ معنوی طور پر مزاح کم ہوتا ہے، لیکن اُن کے طرزِ ادا، زبان اور بولنے کے ڈھنگ میں جو نیاپن ہے، وہ انھیں داد لے ہی دیتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے ہند اور چین کی حالیہ کشمکش کے متعلق ایک نظم "بھارتی جنتا کا سندیش چو۔ این لائی کے نام" سُنائی ہے جس میں اُن کی منفرد خصوصیات نُمایاں ہیں۔ خوب داد ملی ہے، اِس شعر پر تو خوب داد ملی ہے ؎

" ہم نے ہی لاما کے غصے کو دبا رکھا ہے
ٹھنڈا کرنے کو مسوری میں بٹھا رکھا ہے "

آج کے مشاعرے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ نئے اور قدیم دونوں رنگ کے اشعار سننے کو مل رہے ہیں۔ اردو شعراء کو احساس ہو چلا ہے کہ انھیں اُردو شاعری کی حُسن و عشق کی دُنیا سے نکل کر وقت کے نئے تقاضوں پر کان دینا چاہئے۔ یہ رُجحان صحتمند ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کا اُردو شاعر اس قدر راسخ عقیدے والا نہیں ہے کہ وہ مُشاعرے میں سامعین کی آوازوں سے کان بند کر کے نئی زندگی کی حامل شاعری پیش کر سکے۔ وہ داد و تحسین کی ہوس میں اُردو شاعری کی محدود عشقیہ دُنیا میں پناہ لیتا ہے اُس میں عوام کا ذائقہ بدلنے کی قوت نہیں ہے۔ اُردو شاعری کے اور اُس کے ساتھ ہی اُردو کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے اس قوت کی سخت ضرورت ہے۔

اب امن صاحب نے ایک ایسے شاعر کو بُلایا ہے جس نے جدّوجہد آزادی میں عملی حصّہ لیا تھا۔ جناب حکیم خلیل الرحمٰن نازؔ کو اِس شعر پر کچھ داد ملی ہے ۔

"دورِ خزاں چمن سے گیا نازؔ شکر ہے
اب آگئی سواری نسیم بہار کی۔"

ایک حکیم کا کلام سُنانے کے بعد امن صاحب نے عزیز وارثی صاحب کو بُلایا ہے جو ہمدرد دواخانہ میں کام کرتے ہیں۔ عزیز صاحب مُردہ ترنّم میں فرما رہے ہیں:۔

"رقص کرتا، جھومتا، ابرِ بہار آ ہی گیا
میکشو اُٹھو کہ دورِ خوشگوار آ ہی گیا۔"

پنڈال میں مکمل خاموشی چھا گئی ہے۔ ایک طرف سے آواز آئی ہے کہ "دوائی میں اثر نہیں رہا" اور واقعی عزیز نے مُشاعرہ ڈبا دیا ہے۔ لوگ ہُوٹنگ کر رہے ہیں اور عزیز صاحب بوکھلا گئے ہیں۔ اِس لئے دوسری غزل سُنانی شروع کر دی ہے اور دو شعر سُنا کر مائک سے ہٹ گئے ہیں۔

عزیز صاحب کافی عرصہ سے شعر کہہ رہے ہیں لیکن ابھی تک سمجھ نہیں پائے کہ کیوں کہتے ہیں۔ کس مقصد سے کہتے ہیں۔ اُن کے ہاں کوئی بات نہیں ہے صُوری اور معنوی دونوں اعتبار سے۔

اب بزمِ مُشاعرہ کے نظام الملک کو حکم دے کر مائک کے سامنے دورِ حاضر کی اُردو شاعری کے شہنشاہ خود تشریف لائے ہیں۔ فراقؔ گورکھپوری اُردو شاعری میں ایک نئے رُجحان کے علمبردار ہیں۔ ہندی اور اُردو کے درمیان خلیج کو پاٹنے کا کام وہ بہ حسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی رُباعیوں کا تو جواب ہی نہیں دو تین پرانی اور مشہور رباعیاں سُنانے کے بعد ایک تازہ غزل فرما رہے ہیں۔ اُن کے الفاظ میں' اسے سمجھنے کے لئے اُردو کلاس میں جانے کی ضرورت نہیں اِسے سُن کر تو واقعی آج سے دو سو برس پہلے میرؔ کی اُردو کا مزہ آگیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

"ہم کو تُم کو پھیر سمے کا لے آئی یہ حیات کہاں
ہم بھی وہی ہیں تم بھی وہی ہو لیکن اب وہ بات کہاں
موتی کے دو تھال سجائے آج ہماری آنکھوں نے
تم جانے کس دیس سدھارے بھیجیں یہ سوغات کہاں
یوں تو وہ بازی جیت چُکا تھا ایک چال تھی چلنے کی
اُف وہ اچانک شہ پر جانا عشق نے کھائی مات کہاں"

داد ہے کہ فراقؔ صاحب کی جھولیاں بھری جا رہی ہیں' دیکھئے فراقؔ کیا غضب ڈھا رہے ہیں ؎

بن پُور چِت چور تو تھے ہی کیا تم سے کچھ چور بھی ہو
یہ تو بتاؤ لئے جاتے ہو ساتھ یہ اپنے رات کہاں"

اس شعر نے تو داد و تحسین کا طوفان بپا کر دیا ہے۔ فراقؔ صاحب اُردو زبان کی لُغت میں اضافہ کر کے اُردو کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ دوسرے شعراء کو بھی دعوتِ تقلید دے رہی ہے اور یہی وقت کا تقاضا ہے جناب فراقؔ کا ایک اور شعر سُنئے ؎

"تُو نے کن نظروں سے دیکھا آنکھوں سے تارے ٹوٹے
کہاں ٹپاٹپ گرتے آنسو اور مرد کی ذات کہاں"

تالیوں کے شور میں فراقؔ صاحب تشریف لے گئے ہیں اور پنڈال میں پھر مکمل سناٹا چھا گیا ہے۔ پھر نازک موقع جسے اب امن صاحب بھاری موقع کا نام دے رہے ہیں' آگیا ہے۔ اِس لئے امن صاحب نے ایک بھاری شاعر انورؔ صابری کو بُلایا ہے اور انورؔ صاحب نے امن کے اس مبین اعلان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اس نوک جھونک کے بعد پھر مکمل..... سناٹا چھا گیا۔ لیکن شاید یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔ انورؔ صاحب کا اُستادانہ کلام اور لحن داؤدی مل کر ایک طوفان بپا کر رہے ہیں۔ دیکھئے کتنے حسبِ موقع اشعار فرما رہے ہیں۔

"شمعِ اخلاص و وفا سے دل کو نورانی کرو
عام خورشیدِ محبت کی درخشانی کرو
آج کے دن قلعۂ دہلی کے سبزہ زار پر
آسمانوں کی بلندی سے گل افشانی کرو
غالبؔ و ذوقؔ و ظفرؔ کی روح بھی بھیجے سلام
محفلِ شعر و ادب میں یوں غزل خوانی کرو
کل کئے آزادیٔ جمہور کے وقفِ جہاد
اب بنامِ عظمتِ جمہور قربانی کرو"

اس قطعہ پر خوب داد ملی ہے۔ انورؔ صاحب کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔ اُستاد شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ شعر محض شعر کے لئے نہیں کہتے' سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ قطعہ کے بعد غزل کے چند شعر عطا کئے ہیں' فرماتے ہیں ؎

"ہمیں کو سونپ دیا ہے نظامِ میخانہ
جنابِ شیخ تو دامن بچا کے لوٹ آئے"

اُن کے آخری شعر میں شمعیں بجھانے کا ذکر تھا اِس پر امن صاحب فرمانے لگے کہ تخلّص تو انورؔ تھا لیکن بجھانے کا ذکر کر کے چل دیئے اِس لئے ضروری ہے کہ ایک اور انورؔ کو زحمت دی جائے۔ آج امن صاحب کے تعارفی جملے مُشاعرے میں نئی جان ڈال رہے ہیں' سورگیہ ہری چند اخترؔ کے بعد آج پہلی بار اُن کی جگہ پُر ہوتی نظر آ رہی ہے۔ آج ثابت ہو گیا ہے کہ امن صاحب بھی مشاعرہ سنبھالنا جانتے ہیں۔

چھوٹی بحر میں سلیس اور پُر معنی شعر کہنا آسان کام نہیں۔ لیکن انورؔ مرزا پوری کو اس پر عبور حاصل ہے سُنئے' کیا فرما رہے ہیں ؎

"ایک بھی آنسو کام نہ آیا اُن کا کوئی پیغام نہ آیا"

مطلع کا دوسرا مصرع مخمورؔ دہلوی مرحوم کا مصرع ہے' اُن کا شعر ہے ؎

"اُن کا کوئی پیغام نہ آیا دل کا تڑپنا کام نہ آیا"

انورؔ صاحب فرما رہے ہیں ؎

"سو گیا ساقی اُٹھا گئی محفل میرے لبوں تک جام نہ آیا
تُو نہ ملا تو درد ملا ہے در سے ترے ناکام نہ آیا
ان کے لبوں پر دیوانے کا ذکر تو آیا' نام نہ آیا
مر گیا کچھ یوں مرنے والا موت پہ بھی الزام نہ آیا"

پُر درد کلام' میٹھا ترنّم' شستہ و سلیس زبان'

ایک ایک شعر داد لے رہا ہے اور سامعین و شعرا جھوم رہے ہیں۔ انور صاحب جانے لگے تو "ونس مور، ونس مور" کا شور برپا ہو گیا۔ لیکن احسن صاحب نے مضطر گکوڑی کو بلایا ہے۔

مضطر گکوڑی صاحب بھی ایک عرصہ سے شاعری کر رہے ہیں لیکن ابھی تک منزل تو منزل راہ منزل سے بھی بے خبر ہیں۔ خاموشی سے غزل سنا کر چلے گئے ہیں۔ اب پٹنہ کے جناب کلیم صاحب مائک پر تشریف لائے ہیں۔ اُن کا ایک شعر سنیئے جس پر اُن کو خاصی داد ملی ہے ؎

" ہے مشورہ دوستوں کو میرا کہ کم نہ ہو گرمیٔ تمنا
چراغ خلوت میں ہی جلاؤ اگر کوئی انجمن نہیں ہے۔"

کلیم صاحب کے کلام میں پختگی ہے اِس لئے داد لے کر جا رہے ہیں۔ اب جناب دھرم پال گپتا وفا ایڈیٹر 'تیج' جواہر لال نہرو پر قصیدہ سنا رہے ہیں۔ لیکن ہوٹنگ شروع ہو گئی ہے۔ تعجب ہے اِن دنوں جب اُردو کی جان پر بنی ہے اور اُسے زندہ رہنے کے لئے نئے خون کی ضرورت ہے' وفا صاحب اُسے انوری و خاقانی کے دَور کی درباری شاعری کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ موقعہ شناسی کا ثبوت دے کر مائک سے ہٹ گئے ہیں۔ مشاعرہ پھر ڈوب رہا ہے لیکن احسن صاحب کی تجربہ کار نظریں بھی تو یہ بھانپ گئی ہیں اور اُنھوں نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو زحمت دی ہے۔ آزادی کے بعد جو شعرا اُردو شاعری میں اپنا مقام حاصل کر چکے ہیں اُن میں سحر صاحب صفِ اوّل میں کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری ایک خاص اور منفرد مقام کی حامل ہے۔ ان کے قطعات اپنا جواب نہیں رکھتے شاعری اور مفلسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے' لیکن سحر کی شاعری اس روایت کا منہ چڑا رہی ہے۔ آسودہ حالی میں فنی اور معنوی لحاظ سے اتنے اچھے اشعار کہنا خدائی عطیہ ہی ہو سکتا ہے۔ اُن کے اشعار میں سیاست کم ہوتی ہے لیکن دیکھیئے حکومت اور نہرو پر نکتہ چینی کرنے والوں کی خدمت میں کیا عرض کیا ہے ؎

" یہ بجا کہ گردشِ وقت نے ابھی تیز گردشِ جام ہے
ترے رند پھر بھی ہیں مطمئن ترے میکدہ کے نظام سے "

افسوس ہے سحر صاحب کا دوسرا مصرعہ بھی مخمور دہلوی کے مصرعہ سے ٹکرا گیا ہے۔ مخمور دہلوی صاحب کا شعر ملاحظہ ہو ؎

" کوئی تم کے غم سے پیئے ہوئے کوئی ایک جام کا منتظر
ترے رند پھر بھی ہیں مطمئن ترے میکدے کے نظام سے "

سحر صاحب کا فوٹو لیا گیا ہے، اور اب وہ ایک تازہ غزل سنا رہے ہیں ؎

" یہ عشق ہی خواہ دل و جاں تو نہیں ہے
لیکن بخدا دشمن ایماں تو نہیں ہے
شبنم ہے چمن میں کہ کوئی غنچۂ نورس
اندیشۂ انجام سے گریاں تو نہیں ہے
ہم اہلِ جنوں اور طوافِ حرم و دیر
یہ مشغلۂ جیب و گریباں تو نہیں ہے
کہتے ہیں شبِ ہجر جسے عشق کے مارے
تیری ہی کہیں زلفِ پریشاں تو نہیں ہے
اے چارہ گرو تم بھی ذرا دیکھ تو لینا
یہ درد ہی خود درد کا درماں تو نہیں ہے
سمجھے ہیں جسے قلتِ اربابِ کرم ہم
اپنی ہی کہیں تنگیٔ داماں تو نہیں ہے "

ایک ایک شعر پر داد سے جھولیاں بھری جا رہی ہیں۔ اِس غزل کے بعد سحر صاحب نے کچھ مشہور و معروف رُباعیاں سنائیں۔ اور قابلِ رشک داد پائی ہے۔ ان رُباعیوں میں شراب اور رند کا ذکر عام ہے۔ اس پر احسن صاحب فرما رہے ہیں کہ کنور صاحب نے رندانہ انداز میں شعر فرمائے ہیں معلوم نہیں وہ رند ہیں کہ نہیں!

لیجئے اب واقعی رند مائک پر تشریف لائے ہیں۔ ساحر ہوشیارپوری عشق و مستی کے میدان کے شہسوار ہیں۔ ان کی ایک سب سے اہم خصوصیت سادگی و پُرکاری ہے۔ چھوٹی بحر سلیس و عام فہم زبان اور دل سے نکلے ہوئے شعر' داد تو اُن کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

" وہ آئے' وہ آئیں' وہ آ جائیں گے
یہی بات ہر رات ہوتی رہی
کبھو شوخیوں سے بغاوت کریں
حیا کو بہت مات ہوتی رہی
وہی عمر ہے حاصلِ زندگی
جو نذرِ خرابات ہوتی رہی "

اس فرمائشی مرصّع غزل کے بعد تازہ غزل سنا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

" حشر میں کس سے کروں کس کی شکایت اے دل
سب اُسی بُت کے طرفدار نظر آتے ہیں۔ "

ایک ایک شعر پر داد پانے کے بعد چلے گئے ہیں۔ اور اب جگن ناتھ آزاد "آزادی کے بعد" نظم خاموشی سے سنا کر چلے گئے ہیں اور چونکہ فراق صاحب جانا چاہتے ہیں اِس لئے آزاد صاحب اور محروم صاحب کو بھی ساتھ جانا ہے کیوں کہ فراق صاحب انہیں کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اِس لئے محروم صاحب کو بھی زحمت دی گئی ہے۔ انھوں نے رُباعیاں سنائی ہیں۔ اب جناب بیکل اُتساہی سے گیت سنانے کو کہا ہے گیت کا عنوان ہے "مشورہ" بیکل صاحب ہلکے ہلکے سُروں میں فرما رہے ہیں ؎

" رات سنسان ہے راہ ویران ہے
ٹھہرو ٹھہرو اکیلے کہاں جاؤ گے۔ "

داد کا شور اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ بیکل صاحب کے گیت اُردو شاعری کے شاندار مستقبل کے امین ہیں۔ خالصتاً ہندوستانی ہیں۔ اُردو کو ہندوستان میں جنم لینے کا فخر حاصل ہے لیکن اِس کے شاعر جسم و فارس سے وجدان حاصل کرتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات بھی ایران سے لیتے ہیں لیکن بیکل کے گیتوں میں ہندوستانیت ہے۔ اُردو شاعری کو اس ہندوستانیت کی سخت ضرورت ہے۔ گیت کا ایک بند سنیئے ؎

" اجنبی کی سسکتی ہوئی وہ چِتا
پاس اس کے سسکتی ہوئی ماتا
آگ ہے بے دھواں حادثہ ہو گیا
زیست کا آخری فیصلہ ہو گیا۔
آگے شمشان ہے
قیمتی جان ہے
ٹھہرو' ٹھہرو' اکیلے کہاں جاؤ گے "

گیت کے بعد ونس مور' ونس مور کا شور اُٹھا۔ بیکل صاحب تالیوں کے شور میں دوبارہ مائک پر تشریف لائے ہیں۔ سادہ ترنم میں دیکھئے کتنی پُر معنی غزل فرما رہے ہیں ؎

" لغزشِ زندگی نہیں معلوم سانس کیسے رکی نہیں معلوم

دڑ جب جب اٹھا ہوا کوس — چوٹ کب کب لگی نہیں معلوم
میری جانب وہ دیکھ کر بولے — ہے کوئی اجنبی نہیں معلوم
ہم بھٹکتے رہے اندھیرے میں — کب ہوئی روشنی نہیں معلوم
کب وہ گزرے قریب دل کے — نیند کب آگئی نہیں معلوم
بے بسی جس کی زیست ہو اُسکو — زیست کی بے بسی نہیں معلوم
دورِ حاضر کی بزم میں بیکل — کون ہے آدمی نہیں معلوم "

اِس مُرصّع غزل پر بیکلؔ صاحب کو اتنی داد ملی ہے کہ اب کسی اور شاعر کو شاید نہ ملے۔ آج کے مُشاعرے کا سہرا بیکلؔ کے سر ہی بندھنا چاہیئے۔ اور اب جناب کرشن بہاری نورؔ لکھنوی تشریف لائے ہیں۔ قطعہ فرما رہے ہیں ؎

" اتنی ترمیم چاہتا ہوں مَیں — یہ نہیں کہتا عام کر دو شراب
غم کے ماروں کو چھوڑ کر یارب — جس پہ چاہے حرام کر دو شراب "

داد ہے کہ سامعین پر جیسے شاید دورہ پڑ گیا ہے۔ یہ اُردو شاعری کی نئی زندگی کی علامتیں ہیں۔ شور داد و تحسین میں نورؔ صاحب نے غزل چھیڑی ہے اور ہر شعر دو دو تین تین بار پڑھوایا جا رہا ہے۔ اس کامیاب غزل کے چند اشعار آپ بھی سنیئے ؎

" ہزار غم سہی دل میں مگر خوشی یہ ہے
ہمارے ہونٹوں پہ مانگی ہوئی ہنسی تو نہیں
غمِ حبیب کہاں اور کہاں غمِ دوراں
مُشابہت ہے یقیناً برابری تو نہیں
نہ جانے کیا ہے مسافر بھٹک ہی جاتے ہیں
رہِ حیات میں نورؔ ایسی تیرگی تو نہیں "

ایک ایک شعر پر سامعین جھوم رہے ہیں۔ نورؔ لکھنوی تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ شعر میں جان ہے معنی ہیں اور زبان و بیان کی چاشنی ہے اس لئے ترنم کا محتاج ہونا کیا ضروری ہے۔ سامعین کی پُرزور فرمائش پر نورؔ لکھنوی نے ایک اور اچھی غزل سنائی ہے۔ لیکن اس اس بار ترنم سے۔ افسوس ہے کہ اُن کے ترنم میں اچھے شعر تباہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ نورؔ صاحب کو اس ترنم کو خیرباد کہہ کر تحت اللفظ ہی پڑھنا چاہیئے۔ دیکھیئے کتنے اچھے شعر فرما رہے ہیں ؎

" میں تیری دُھن میں رکا نہ سکا راہِ زیست میں
کتنے ہی آس پاس سے سائے نکل گئے
اے نورؔ جتنے اشک گرے اُن کی یاد میں

اُتنے چراغ راہِ محبت میں جل گئے۔ "

داد و تحسین کے شور میں نورؔ صاحب تشریف لے گئے ہیں اور اب جناب سلامؔ مچھلی شہری مائک پر آئے ہیں۔ سلامؔ کافی عرصہ سے شاعری کا شوق فرما رہے ہیں اور اُن کا ایک خاص انداز اور مقام ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ سامعین کے سطحی مُطالبہ کے آگے خاموشی سے سپر ڈال دیتے ہیں۔ سستی شہرت اور داد کی ہوس میں وہ اب صرف "مشورہ" کے ہی شاعر ہو کر رہ گئے ہیں۔ گذشتہ برس اِسی مشاعرے میں اُنھوں نے "جمہوریت" پر ایک نظم سُنانی شروع ہی کی تھی کہ سامعین نے ہوٹنگ شروع کر دی اور اُنھوں نے جھٹ سے "مشورہ" سُنا دی اور داد لے لی۔ یہی حال آج بھی ہوا۔ سامعین اُن سے "مشورہ" سُننے کی فرمائش کرتے ہیں اور اُن میں انکار کی جُرأت نہیں یا شاید اُن کی شاعری میں اب وہ دم خم نہیں کہ وہ سامعین سے داد حاصل کریں۔ پہلے چند شعر سُنائے اور "مشورہ" سُنا کر پست مذاق سامعین سے داد لے کر جا رہے ہیں۔ صاحبِ ذوق حضرات اور شعراء حیران ہیں۔ سلامؔ کو ہو کیا گیا ہے۔ اب شور اُٹھ رہا ہے "بیکلؔ کو بلاؤ" تو احسنؔ صاحب فرمانے لگے کہ آپ صبح تک بیٹھے رہیئے۔ پہلا دَور ختم ہونے پر آپ کی فرمائشیں پوری کی جائیں گی اور اُنھوں نے ماچسؔ لکھنوی کو مائک پر بُلایا۔ لفظِ ماچس پر شور اُٹھا ہے۔ ایک صاحب کہنے لگے ذرا اِدھر بھی جلا دینا۔ ماچسؔ مزاحیہ رنگ کے اشعار کہتے ہیں۔ اُن کے مزاح میں بھی وہی چیز کھٹکتی ہے جو آج کے مزاحیہ شاعروں کا خاصہ ہے۔ سطحی چیزوں سے مذاق پیدا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

" آرزوئیں ہیں جس قدر اے دل — سب ہیں بیکار اس سوال کے بعد
عشق پر آئے گی بہار اب تو — اُن کے والد کے انتقال کے بعد "

"والد کے انتقال" نے قیامت کا شور بپا کر دیا۔ ایسی چیزیں اُن کے مزاح کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ماچسؔ نے ماچس لگا دی ہے اور ہر طرف شور اور ہنسی کی آگ پھیل گئی ہے فرماتے ہیں ؎

" تعداد میں ہیں عورتیں مردوں سے زیادہ
قوالیاں موجود ہیں، قوال ندارد
اللہ رے جس سال کا تھا وصل کا وعدہ
وہ ہوگئے دُنیا سے اُسی سال ندارد "

سامعین ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں اور ماچسؔ صاحب کو دوبارہ بُلایا گیا ہے۔ کس قدر پھکّا نہ مذاق کا نمونہ ہے یہ شعر ان کا ؎

" کبھی تیری گلی میں دل جو بہلانے چلے گئے
ترے پاسی پڑوسی لاٹھیاں تانے چلے آئے۔ "

اِس محفل میں کئی ایسے شعراء آ چکے ہیں جو اپنے اپنے رنگ میں کامل ہیں۔ لیکن اب احسنؔ صاحب نے ایک ایسی ہستی کو زحمت دی ہے جن کے آگے ماہرینِ فن کی گردنیں بھی جھک جاتی ہیں۔ حضرت قبلہ جوشؔ ملسیانی مائک پر تشریف لائے تو کسی نے آواز دی "ترنم سے سنائیے جی" اس پر قبلہ فرما رہے ہیں "بڑے افسوس کی بات ہے ترنم کی یہ عمر ہے کیا؟" قبلہ جوشؔ صاحب کا ایک ایک شعر سامعین نے بڑے غور سے سُنا ہے اُن کے بعد جناب کاشفؔ اندوری تشریف لائے ہیں۔ کاشفؔ صاحب اپنی سہل نگاری، طویل بحر اور دل گدازی و پُرسوزی کی وجہ سے مقبول ہیں۔ اُن کی غزل میں گیت کا سُریلا پن ہے۔ فرماتے ہیں ؎

" اہلِ کشتی عبث مجھ سے تھے بدگماں
میری ہمت کے بیڑے ہیں اب بھی رواں
اب بھی موجیں ہیں لرزاں مرے نام سے
ڈوب کر بھی مَیں طوفاں سے ہارا نہیں "

یہ ہمت و جذبہ جو سلگی اور یہ دم خم اِس شعر میں اور بھی شدید ہو گئے ہیں ؎

" موج در موج طوفان اُٹھے ہیں تو کیا
دُور ساحل بھی حدِ نظر سے سہی
اِس ارادے سے لنگر اٹھانا خدا
آج طوفاں نہیں یا کنارا نہیں "

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ مکرّر مکرّر کے شور میں کاشفؔ صاحب تشریف لے گئے ہیں اور اب حضرت جوشؔ ملسیانی کے فرزند اور ادارہ "آج کل" میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے جانشین جناب عرشؔ ملسیانی کو آواز دی گئی ہے۔ عرشؔ صاحب کا فوٹو لیا جا رہا ہے۔ تعجب ہے اِس محفل میں کامیاب ترین شاعروں کا فوٹو نہیں لیا گیا لیکن سب سرکاری شعراء کا ہی فوٹو لیا گیا ہے۔ کیا یہ سب ایک متعین کردہ پروگرام کے تحت تو نہیں ہو رہا ہے۔ عرشؔ صاحب فرما رہے تھا

" سب دیکھنے والے اُنھیں غش کھائے ہوئے ہیں
اس پر بھی تعجب ہے وہ شرمائے ہوئے ہیں "

تقسیم وطن کے بعد اُردو شا ی کو سنبھالا
نے والوں میں عرشؔ کا اپنا مقام ہے۔ ان کے کلام
پختگی بھی ہے۔ لیکن تعجب ہے وہ خود کو اُستاد تو سمجھے
لیکن ان کا کوئی منفرد انداز نہیں ہے۔ دہی گھسی پٹی
ں ہیں۔ دیکھئے ؎

" ہے دیکھنے والوں کو سنبھلنے کا اشارہ
تھوڑی سی نقاب آج وہ سرکائے ہوئے ہیں "

عرشؔ صاحب بھی سطحی داد کی ہوس میں ایسے
وار کرنے لگے ہیں۔ مشاعرہ میں مُردنی چھا رہی ہے اور
قت یہ ہے کہ عرشؔ صاحب کے ساتھ ہی بوریت زدہ
عاز ہو چکا ہے۔ اِس زون میں احسنؔ صاحب کے
در حقیقی ادیبؔ لکھنوی، غلام ربّانی تاباںؔ احسن لکھنوی،
ر لکھنوی، مزید اضافہ کا باعث بنے ہیں۔ روشنؔ
رسی کا ترنم بھی بوریت زدہ کی حدوں کو نہ پھاند سکا
ے میں نشورؔ واحدی پورے اعتماد سے مائیک پر
ریف لائے ہیں۔ اُن کو اِس شعر پر داد ملی ہے ؎

زندگی قریب ہے کس قدر جمال سے
جب کوئی سنور گیا، زندگی سنور گئی۔

دوسری غزل کے اس شعر پر بھی داد ملی ہے ؎

حُسن بے حجاب پر، کوئی پردہ ڈال لو
تم اُسے صنم کہو، میں اُسے خدا لکھوں

نشورؔ واحدی کے بعد جناب رفعت سروشؔ
نے کچھ رباعیاں سُنائی ہیں۔ اُن کے بعد مختلف آوازیں
معین کی طرف سے اُٹھ اُٹھ کر ٹکراتی ہیں اور محلول ہو
جاتی ہیں۔ سامعین اب بوریت زدہ سے تنگ
ر اپنی پسند کے شُعراء کو سُننا چاہتے ہیں۔ لیکن بزم
سلام الملک کو اپنی ذمّہ داریوں کا احساس ہے
اس لئے وہ ان آوازوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک
ش گو شاعر جناب شعری بھوپالی کو پیش کر رہے ہیں
ری بھوپالی بھی مشاعرے میں جان نہیں ڈال سکے۔ ان
غزل کو خاموشی سے سُن لیا گیا۔ نہ معلوم شعری صاحب
ا کے ہی نقشے، اُن کی ہی باتوں میں کیوں کھو کر رہ گئے
اب جناب ماہرؔ صاحب تشریف لائے اور اُن کی غزل
مشاعرے میں پھر جان ڈال دی ہے۔ ایک ایک

شعر پر داد مل رہی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

" جو اپنی بلندی پر خوش ہو کے لچکتی ہے
گلچیں کی نگاہوں میں وہ شاخ کھٹکتی ہے
اک نور نشیں ہے، اک قہر نشیمن ہے
جگنو بھی چمکتا ہے، بجلی بھی چمکتی ہے "

پُر معنی اشعار موسیقی کی ہلکی ہلکی مترنم لہروں کی
طرح دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں اور داد خود بخود شور
بن کر نکل رہی ہے۔

جناب ماہرؔ کے بعد جناب شمیمؔ کرہانی کو بلایا گیا ہے
اِس وقت جناب وی شنکر صاحب تشریف لے جا رہے ہیں
اور کُرسیٔ صدارت علامہ انورؔ صابری کو سونپ دی گئی
ہے۔ شمیمؔ صاحب کے اشعار میں شعریت کم اور خشکی
اور بوجھ زیادہ ہوتا ہے، اس لئے سامعین شاید
سُن ہی نہیں رہے ہیں۔ اور اب جناب مُعین احسن
جذبیؔ صاحب تشریف لائے ہیں۔ احسنؔ صاحب نے
اُن کا تعارف کچھ اِس طرح کرایا ہے کہ سامعین پر

رُعب بیٹھ گیا ہے۔ ۲۴ جنوری کے کل بھارتی لسانی
مشاعرہ میں جذبیؔ صاحب اُردو کی نمائندگی کر رہے
ہیں۔ اس احترام کی وجہ سے بھی سامعین نے انھیں
خاموشی سے سُن لیا ہے۔ جذبیؔ صاحب کے بعد وامقؔ
جونپوری تشریف لائے۔ اُن کی نظم "جاڑے کی چاندنی"
میں "چاندنی تو نہیں، ہاں "جاڑا ہی جاڑا ہے اس لئے
وہ سامعین کو گرما نہیں سکے ہیں۔ اور اب دورِ اوّل کے
مقطع، مشہور غزل گو اُستاد ماہرِ فن جناب بسملؔ سعیدی
صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ مطلع فرماتے ہیں ؎

" وہی ہوتی ہے رہبر جو تمنّا دل میں ہوتی ہے
بقدرِ ہمتِ رہبر کشش منزل میں ہوتی ہے "

بسملؔ صاحب کے ساتھ ہی اس یادگار بزم
مشاعرہ کا پہلا دَور ختم ہو گیا ہے۔ اِس وقت رات
کے پونے دو بجے ہیں اور دوسرا دَور یعنی فرمائشی
دور شروع ہونے کو ہے۔ بجلی فیل ہو گئی ہے اور میں
مشاعرہ سے اُٹھ کر آ گیا ہوں۔ ●●

سیّاح

شرون کمار ورما

اِک ہمی کب ہیں تِرے شہر میں بیزار بہت
جو بھی مِلتا ہے وہ اندر سے ہے بیمار بہت

مرکزِ نگاہ بننے والے کو یقیناً خوشی ہوتی ہے شرط ہے استحقاق ہو

وہ تنہا بیٹھا ہوا اپنے دوست کا انتظار کر رہا تھا' جس کے ہمراہ وہ کلب میں آیا تھا۔ اُس کا دوست اپنی ایک جان پہچان کی لڑکی کے ساتھ اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا اور مُسکرا کر اُسے انتظار کرنے کے لئے کہہ گیا تھا۔ بیرا آکر اُسے ایک چِٹ دے گیا' وہ پڑھ کر مُسکرا دیا' لکھا تھا" کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر" نیچے اُس کے دوست کے دستخط تھے۔

اُس نے نوٹ بُک نکال کر کچھ لکھا' اور وولڈ اسمگلرز کا گلاس اُٹھا کر ایک گھونٹ بھر لیا۔ آنکھوں کے ڈوروں کے ساتھ ماحول بھی گلابی ہونے لگا تھا۔ تالاب گلابی ہو گیا تھا۔ سفید بدن' جیسے گلاب کے پھول کِھل گئے ہے۔

"ہے"! اُسے نعرہ سُنائی دیا' اُس نے اِدھر دیکھا۔ ایک نوجوان نے جام لبوں سے لگا کر گلاس ہوا میں اسپرنگ بورڈ پر کھڑی دوشیزہ کی طرف بُلند کر دیا۔ لڑکی کھِلکھِلا کر ہنس دی' جیسے اجنتا کا کوئی بُت ہنس دیا ہو۔ اُس نے سگاریوں میں دبا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے پُورنما شی کے چاند کی گولائی اور قوسِ قزح کا خم' اسپرنگ بورڈ پر آ گئے ہوں۔ وہ اُدھر ہی دیکھتا رہا۔ دو سفید سفید باہیں ہوا میں اُٹھیں' جسم پنجوں کے بل پر اُٹھا... پھر ہلکا سا جھٹکا... ہوا میں قلابازی ... اور چھپاک.... تالیاں' قہقہے' خوشی کی چیخیں۔ پھر دوسری لڑکی' تیسری' چوتھی... قلابازیاں' پانی کے چھینٹے' نیلے پانی میں چاندی کے بدن!

اُس نے نوٹ بُک میں لکھا" شام ہوتے ہی پیرس اور نیویارک دبے پاؤں دہلی کے کلبوں اور ہوٹلوں میں آجاتے ہیں"۔

بید کی کُرسی پر بیٹھے ہوئے مسٹر قندھاری' گورنمنٹ کنٹریکٹر نے اپنے دوست مسٹر جھن جھن والا کا ہاتھ دبایا اور اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا شخص جو سگار پی رہا ہے جانتے ہو کون ہے!

"نہیں تو!" مسٹر جھن جھن والا نے کہا او سے مسٹر قندھاری کی طرف دیکھا۔

"صوبے کے چیف منسٹر کا لڑکا ہے"۔

"اِز اٹ؟"

"یس!"

اس نے سگار ایش ٹرے میں رکھ د اپنے اِرد گِرد دیکھا۔ مسٹر قندھاری اپنا جام اُس کے پاس پہنچے اور مُسکرا کر نہایت آہستہ سے کہا جیسے پھول تو ہوں" میں آپ کی تنہائی میں مخل تو نہیں ہوا؟"

"اجی صاحب کیا کہہ رہے ہیں آپ! تشریف رکھیئے"! اُس نے ہاتھ ملا کر اُنھیں بیٹھ دعوت دی۔

"آپ لوگ تو ہوتے ہی تنہائی پسن ہی ہی ہی! میں نے سوچا' نیاز حاصل کروں۔

ں ابھی مجھے ویٹر نے بتایا کہ آپ آچکے ہیں، کیا
مت کروں آپ کی؟"
" جی میرے بارے میں ویٹر نے بتایا تھا؟..
سمجھا، مسٹر ترپاٹھی کہہ گئے ہوں گے، حالانکہ میں
، اُن سے کہہ دیا تھا کہ کسی سے کچھ نہ کہیں... خیر،
لمحہ بھر خاموشی رہی، پھر مسٹر قندھاری بولے
پ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو جانتا ہوں
ہی ہی، مجھے ایس۔ آر۔ قندھاری کہتے ہیں معمولی
ٹھیکیدار ہوں، گورنمنٹ کنٹریکٹر۔"
وہ مُسکرایا "بہت خُوب"! اُس نے سِگار رکھا
ں لیا۔ سگار بجھ چکا تھا، وہ جیب میں ماچس تلاش
نے لگا۔
مسٹر قندھاری نے جیب سے لائٹر نکالا اور
گار سُلگانے میں مدد دی۔
" شُکریہ"!
" اِٹز آل رائٹ!" مسٹر قندھاری مُسکراتے ہوئے
رہَولے سے بولے " آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں
اہیں۔"
" مَیں حاضر ہوں، کہئے!"
" یہاں نہیں، یہاں تو آپ انجوائے کرنے
ئے ہیں۔ کل ڈِنر آپ میرے ہاں کھا لیجئے، وعدہ
نا" قندھاری صاحب نے خود ہی بات پکّی بھی کرلی۔
" ڈِنر؛ وعدہ؛ دیکھیے..."
" مَیں سمجھتا ہوں" مسٹر قندھاری بولے " آپ
ے آدمی ہیں، ہمیں کب خاطر میں لاتے ہیں لیکن
ب آپ وعدہ کر چکے ہیں، دیکھئے دِل نہ توڑیے گا اور
ں کل تو مسز قندھاری بھی کلکتہ سے لَوٹ رہی ہیں
ب اُن سے مِل کر بہت خوش ہوں گے۔ تو بھولئے گا
ں یہ رہا میرا ایڈریس۔" اُنھوں نے اپنا کارڈ اُسے
ادیا اور اُٹھ کر ہاتھ مِلایا۔" وعدہ رہا" اور ہنستے ہُوئے
ے گئے۔
مسٹر جھن جھن والا نہایت بےصبری سے مسٹر
دھاری کا انتظار کر رہے تھے۔ کُرسی میں پہلو
لتے بدلتے اُن کی کمر بھی دُکھنے لگی تھی۔ وہ اندر ہی
ر پیچ وتاب کھا رہے تھے کہ یہ قندھاری کا بچّہ
ر بات میں پہل کر جاتا ہے۔ پچھلے دنوں اِسی طرح

گورنر سے مُلاقات کر آیا تھا۔ کم بخت کی بیوی نہایت
حسین ہے"
" پھانس لیا!" آتے ہی مسٹر قندھاری نے
بم پھینکا۔
مسٹر جھُن جھُن والا جل کر رہ گئے، پھر بھی
مُسکرا کر بولے " کیا مطلب؟"

" مطلب یہ کہ کل وہ میرے ساتھ ڈنر کھا رہا
ہے، اب یہ پانچ لاکھ کا ٹھیکہ اپنا ہی سمجھو۔ اپنا کاٹا
پانی نہیں مانگتا" وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔
مسٹر جھن جھن والا کے سینے میں حسد وبُغض کی
آگ بھڑک اُٹھی۔ اُٹھ کر اُنھوں نے مسٹر قندھاری سے
ہاتھ مِلایا اور اُدھر چلے گئے جہاں اُن کی بیوی اور لڑکی
بیٹھی تھیں۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اُنھوں نے اپنی بیوی اور
بیٹی کو مخاطب کیا" آج ایک گریٹ شخص سے مُلاقات
کراؤں تمہاری! وہ شخص صُوبے میں جو چاہے کر سکتا
ہے، یہاں کے سیاہ وسفید کا مالک ہے، اُدھر دیکھو۔"
مسٹر جھن جھن والا نے مُسکرا کر اُس کی طرف اشارہ کیا۔
وہ میز پر جھکا نوٹ بک پر کچھ لکھ رہا تھا۔
" یونہی ہے کوئی!" مِس جھُن جھُن والا نے اُس
کی طرف دیکھ کر کہا" گھٹیا سُوٹ پہنے ہے۔"
" تم بوجھو۔" مسٹر جھن جھن والا نے بیوی سے
کہا اور مُسکرا دیے۔
" مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی" مسز
جھُن جھُن والا اُس کی طرف تنقیدی نظروں سے دیکھ کر
بولیں۔" موٹے بھدّے سے ہونٹ ہیں، بکھرے بکھرے

جھاڑ سے بال ہیں، کچھ اِمپریس نہیں کرتا۔"
" اور ممی" مِس جھُن جھُن والا چہکی" مجھے تو کوئی
کتابی کیڑا معلوم ہوتا ہے۔ کلب میں بھی نوٹ بک
ساتھ لے آیا ہے عینک لگا کر اسکول ماسٹر لگتا ہے
۔ اُونہہ۔"
" بس اتنی ہی گہری نظر ہے" مسٹر جھُن جھُن والا
مُسکرائے۔" یہاں کے چیف منسٹر کا لڑکا ہے، ڈکارتے
ہیں۔ فِلم ڈسٹری بیوشن کا بڑا چلا ہوا کام ہے۔ اب
ایک سائیکلوں کا کارخانہ لگانے والا ہے۔"
" اوہ مائی گاڈ!" مِسز جھُن جھُن والا نے اِس
طرح کہا جیسے گُناہ بخشوانے جا رہی ہوں۔" مجھے کبھی عقل
نہیں آئے گی۔" اُنھوں نے غَور سے اُس کی طرف
دیکھا۔" کتنا سنجیدہ اور ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ مجھے
تو کوئی بہت بڑا فلاسفر لگتا ہے۔ کپڑوں اور بالوں
کی ایسے آدمی پروا ہی کب کرتے ہیں۔ یہ ضرور کوئی
گریٹ آدمی ہے لیکن ..." اُنھوں نے خاوند سے پوچھا۔
" تمہیں یقین ہے نا؟"
" بالکُل! ابھی ابھی قندھاری اُس سے مِل کر
آیا ہے۔ کل وہ قندھاری کے ساتھ ڈِنر کھا رہا ہے۔"
" تم نے کیوں نہیں اِنوائٹ کیا!" مِسز جھُن جھُن
والا ناراض ہوگئیں۔" تم ہمیشہ مَوقع گنوا دیتے ہو۔"
" ممّی تو وہ کوئی بہت بڑا آرٹسٹ دکھائی دیتا
ہے۔ شاید نوٹ بک پر اسکیچ لے رہا ہے۔ ڈیڈی آپ
ہمیشہ بھُول جاتے ہیں۔" مِس جھُن جھُن والا بھی ناراض
ہوگئیں۔
" ہاں مَیں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ وہ کوئی معمولی
آدمی نہیں، مجھے تو گنوارا ہی لگتا ہے۔ لیکن افسوس
اس بات کا ہے کہ تم نے اُسے مدعو نہیں کیا اب وہ
کمبخت قندھاری کی بیوی اُسے ہڑپ کر جائے گی
مَیں اُس کا ماضی جانتی ہوں۔"
" ڈیڈی! وہ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔
ہائے کتنی رومانٹک آنکھیں ہیں۔" مِس جھُن جھُن والا
نے بڑی رومانٹک آواز میں کہا۔ ممی! میں ابھی
آئی۔ خُدا.... اور وہ مُسکراتی ہوئی اُس طرف چلی گئی۔
" ہیلو!" مِس جھُن جھُن والا نے نہایت میٹھی
آواز سے کہا اور اُس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اُس نے سِگار لبوں سے علیحدہ کر کے جس جھن جھن والا کی طرف دیکھا۔ پھر اُٹھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا "ہیلو! ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

"ہاؤ ڈو یو ڈو؟" یہ کہہ کر وہ اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ کچھ لکھ رہے تھے۔"

"یہ تو میرا کام ٹھہرا۔"

"میرا دل بھی یہی کہتا تھا کہ آپ یا تو کوئی بڑے مصوّر ہیں یا پھر بہت بڑے شاعر! دراصل یہی چیز مجھے آپ تک کھینچ لائی۔ مجھے بھی لٹریچر کا بہت شوق ہے، دِن بھر پڑھتی رہتی ہوں، ممّی کہتی ہیں آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔ پھر آپ تو عینک لگا کر فلاسفر دِکھتے ہیں۔ میں نے شوق شوق میں کئی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ موپساں کی نظمیں اور شیکسپیئر کے ناول مجھے بہت پسند ہیں۔"

"شیکسپیئر کے ناول آپ کو بے حد پسند ہیں" وہ مُسکرایا۔

"آپ شاعر ہیں نا! اور مجھے پوئٹری کا بہت شوق ہے۔" وہ بولی۔

"آپ تو خود ایک نظم ہیں۔"

"آپ بڑے نائس ہیں۔"

"آپ کی مہربانی ہے۔"

"پھر کب ملاقات ہوگی، میں کل تو اِن آفٹر نُون دیکھ رہی ہوں۔"

"ضرور دیکھئے! میں آپ سے پرسوں مِل سکوں گا۔"

"پرامِس؟" اُس نے ہاتھ بڑھایا اور مُسکرا دی۔

"پرامِس!" اُس نے بھی ہاتھ ملایا۔

آناً فاناً سارے کلب میں خبر پھیل گئی کہ چیف منسٹر کا لڑکا وہاں موجود ہے۔ سب کی نظریں اُسی پر مرکوز ہو گئیں، ہر شخص اُسے احترام کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ لوگ اُس کے سامنے سے گزرتے ہوئے قدرے جھک کر مُسکرانے کی کوشش کرتے، اُس کی طرف اِس طرح دیکھتے جیسے بات کرنے کی اجازت چاہتے ہوں۔

مسٹر سہگل نے اُسے تنہا دیکھا تو آ کر قریب بیٹھ گئے، فوراً تعارف کرایا۔

مجھے سہگل کہتے ہیں، آپ نے میرے بارے میں اخباروں میں پڑھا ہو گا سہگل ڈی۔ ایس پی۔ کے بارے میں۔"

"جی جی، یاد آیا! وہ رشوت والا کیس۔" وہ مسکرایا۔

"جی وہی، وہی، لیکن یہ رشوت والی بات سرے سے غلط ہے۔ دشمنوں نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے بدنام کرنے کے لئے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک دوست اور سَو دشمن ہوتے ہیں آدمی کے! میں تو خود رشوت وغیرہ کے سخت خلاف ہوں، لیکن مجھے معطّل کر دیا گیا ہے میری نوکری اور عزّت کا معاملہ ہے آپ کچھ... میرا مطلب ہے... آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"میں!" وہ حیران سا رہ گیا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں! میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"آپ چاہیں تو فائیل بند ہو سکتی ہے۔ آپ نے بندرا کے کیس کو ختم کر دیا تھا۔ دیکھئے میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ مفت میں یہ مصیبت مول لیں۔ میں آپ کو پانچ ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ بس یہ فائیل گُم ہو جائے۔"

اُسے مذاق سوجھا۔ "آپ خود تو رشوت کے سخت خِلاف ہیں اور مجھے رِشوت دے رہے ہیں۔" وہ مُسکرایا۔

"وہ بات یہ ہے ... دراصل یوں سمجھ لیجئے۔ ... میرا مطلب ہے... اب آپ سے کیا چھپانا، آپ تو جانتے ہی ہیں ہم پولیس والوں کا چور ڈاکوؤں سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ لوگ خود تو بدمعاش، بے ایمان ہوتے ہی ہیں، ہمارا اخلاق بھی خراب کر دیتے ہیں۔"

"ہیلو!" ایک دوشیزہ نے بیڈنگ کوسٹیوم میں آ کر کہا۔

سہگل صاحب ایک دم خاموش ہو گئے۔ قہر آلود نظروں سے دوشیزہ کی طرف دیکھا اور بولے "اچھا میں آپ کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر عرض کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

"میں بیٹھ سکتی ہوں۔"

"سر آنکھوں پر۔"

"ابھی آپ کرسی ہی پر بٹھا لیجئے۔" وہ بیٹھ کر بولی۔ "میرے لئے آپ کچھ نہیں منگوا رہے ہیں؟" لڑکی نے نشیلی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"سوچتا ہوں، اب جام بھی پھینک دوں۔"

وہ اپنی آنکھوں کی اِس درپردہ تعریف پر مُسکرا دی "کل آپ نے میرا رقص دیکھا تھا، سپرؤ ہال میں؟"

"سارا شہر چرچا کر رہا ہے۔"

"آپ اِتنی دیر سے اِس نوٹ بُک میں کیا لکھ رہے ہیں؟" اُس نے ہاتھ میز پر اُس کی طرف بڑھا دیا

"آپ کی تعریف۔" اُس نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں پڑھ سکتی ہوں؟" اُس نے اپنا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"کل اخبار میں پڑھ لیجئے گا۔"

"اخبار میں؟... کیا مطلب؟... میں سمجھی نہیں۔"

"میں اپنے اخبار کے لئے آرٹیکل لکھ رہا ہوں۔"

"تو آپ....." اُس نے حیران سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"جی پریس رپورٹر ہوں، اسپیشل کارسپانڈینٹ۔"

"چیف منسٹر کے لڑکے نہیں، مذاق مت کیجئے گا۔"

"نہیں تو! آپ سے کس نے کہا؟" وہ حیران رہ گیا

اُس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور تیزی سے اُٹھ کر چلی گئی۔ جھٹ خبر پھیل گئی کہ وہ چیف منسٹر کا لڑکا نہیں، ایک معمولی پریس رپورٹر ہے۔ تمام نظریں اُسے گھورنے لگیں جیسے اُس نے اُن کا کچھ چُرا لیا ہو چھین لیا ہو۔ "میں نہ کہتی تھی کوئی معمولی سا آدمی ہے۔" مسز جھن جھن والا نے ڈیڈی سے کہا۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا۔" مسز جھن جھن والا نے نفرت سے کہا۔ ●●

پہل

یونس انصاری

پیڑ گھروں سے اکتا کر شہر سے باہر نکلے ہیں

ابھی مغرب میں بھی ایسے لوگ باقی ہیں جو اپنی چھاؤں اپنے ہی گھروں میں رکھنا چاہتے ہیں

نوجوان مسز سوئی نے گھر میں داخل ہو کر کہا" ممی، میں یہاں ہوں۔"

چند ہی لمحوں بعد سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر سیڑھیوں پر سے مسز ایلزبیتھ نے جھانک کر نیچے دیکھا۔"شکر ہے تم آگئیں۔ کیا تم اپنی لپ اِسٹک مجھے دو گی ڈیر؟ نہ معلوم میری لپ اِسٹک کہاں کھو گئی ہے۔"

سوئی تقریباً دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے پاس گئی اور پرس میں سے لپ اِسٹک نکال کر دیتے ہوئے کہا" یہ میں نے آپ کے لئے ایک جنرل اسٹور سے خریدی ہے۔"

" شاندار، بہت شاندار! لیکن تمہیں میرے لئے لپ اِسٹک نہیں خریدنا چاہئے۔"

سوئی نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا" ہاں ہاں ٹھیک ہے، لیکن جنگ میں سپاہی کو بغیر ہتھیار نہیں بھیجنا چاہئیے۔"

" جنگ" مسز ایلزبیتھ مسکرائیں۔" جو وقت میرے پاس فالتو ہے میں اُسے کسی مصرف میں لانا چاہتی ہوں، اور پھر کوئی سوچ سکتا ہے کہ.... مسز ایلزبیتھ نے ٹرین کی آواز سُن کر جملہ اَدھورا چھوڑ دیا۔ دونوں ماں اور بیٹی نے خواب گاہ کے پردے ہٹا کر ٹرین کو دیکھا۔ وہ نو بج کر پانچ منٹ والی ٹرین تھی جو اُن کے باغ سے کچھ دُور گزر رہی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد ٹرین وہاں سے روانہ ہو گئی دونوں نے چند لمحوں تک ایک دُوسرے کو دیکھا۔

" اب ڈیڈی اپنے کام پر جا چکے ہیں" سوئی نے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔" ڈیڈی کو اُس وقت کتنی حیرت سے دوچار ہونا پڑے گا جب اُنھیں یہ پتہ چلے گا کہ ممی اُن کے جانے کے بعد دوسری ٹرین میں سوار ہو کر جا رہی ہیں۔"

" پھر بھی ممی آپ اُنھیں یہ کیوں نہیں بتا دیتیں کہ آپ سروس کرنے جا رہی ہیں۔"

" نہیں میں اُسے نہیں بتا سکتی۔" مسز ایلزبیتھ نے جواب دیا۔

ممی! میرا خیال ہے کہ آپ تھوڑی بہت مالی پریشانی سے دوچار ہیں۔"

" ہاں یہ ٹھیک ہے کہ مجھے آج کل تھوڑی بہت مالی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں آفس میں کام کرنے پر مجبور ہوئی ہوں ورنہ اِس سے پہلے میں نے کبھی دفتر میں کام نہیں کیا۔"

آخر کار وہ اپنا نیا کوٹ پہن کر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

" میں ٹھیک چار بجے گھر لَوٹ آؤں گی، اِس سے پہلے کہ تمہارے ڈیڈی کی چائے کا وقت ہو جائے۔" مسز ایلزبیتھ نے چلتے ہوئے سوئی سے کہا۔

مینجر نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر اُسے" صبح بخیر" کہا، پھر بولا" آپ آج سے ہمارے دفتر کی نئی اسسٹنٹ ہیں، میں آپ کا تعارُف آپ کی سُپروائزر مسز گلاٹن سے کرا دوں"۔ مینجر نے شیشے کا دروازہ کھول کر ایک جانب اشارہ کیا" وہاں آپ کی سُپروائزر ہیں"

وہ ایک بڑا سا ہال تھا جو تین حِصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہر حِصّے میں الگ الگ کلرک بیٹھے ہوئے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

مسز گلاٹن کا انداز بالکل دوستانہ تھا۔ مسز گلاٹن کی آنکھوں پر سیاہ فریموں کی عینک تھی۔ انگلیوں میں اُس نے بڑی بڑی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔

مسز ایلزبیتھ کو وقت کا بالکل احساس نہیں ہوا۔ دفتر کا پورا عملہ اِس نئی آنے والی کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا تھا۔ کھانے کے وقفہ کے وقت وہ مسز گلاٹن کے ساتھ قریبی ہوٹل میں کھانا کھانے گئی۔

کھانے کے بعد مسز گلاٹن نے تجویز پیش کی

"ابھی ہمارے پاس دس منٹ اور ہیں، کیوں نہ ہم ملبوسات کی دکان میں کچھ کپڑے دیکھ لیں!"

سہ پہر کا وقت بھی خلافِ توقع بڑی تیزی سے گزر گیا۔ یہ ملازمت جو اُس نے مختلف قسموں کے بلوں کی ادائیگی کے لیے کی تھی، اب اُسے زیادہ بوجھ نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں اُسے ہفتہ میں سات ڈالر ملتے تھے۔

مسز ایلزبیتھ دفتر میں بالکل مطمئن اور پُرسکون انداز میں کام کر رہی تھی۔ اُسے صرف ایک بات کا خدشہ تھا کہ کہیں اُس کے شوہر جوَن کو اِس بات کا علم نہ ہو جائے کیوں کہ اُس کا خیال تھا کہ اگر جوَن کو معلوم ہو گیا تو وہ بہت ناراض ہوگا۔ پھر اُس نے سوچا کہ تھوڑی بہت ہمّت کر کے اُسے جوَن کو ملازمت کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ یہ بات نہیں تھی کہ جوَن کو عورتوں کا ملازمت کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔

ایلزبیتھ سوچ رہی تھی کہ آج یا کل اُس کے شوہر کو اِس بات کا علم ضرور ہو جائے گا، مگر وہ خود میں اتنی ہمت محسوس نہیں کر رہی تھی کہ اپنے شوہر کو یہ بات بتا دے۔ ایلزبیتھ کا خیال تھا کہ شوہر ہونے کی حیثیت سے جوَن کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے اور اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اُس کی بیوی کی کیا مصروفیات ہیں۔ اور وہ اپنا باقی وقت کس طرح گزارتی ہے۔

ایلزبیتھ نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو خیالات کی قید سے آزاد کیا اور پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اپنے کام میں وہ اِس قدر محو تھی کہ اُسے بالکل احساس نہیں ہوا کہ مینجر اور ایک شخص اُس کے پیچھے کھڑے اُس کے کام کا جائزہ لے رہے ہیں۔

مینجر نے مسز ایلزبیتھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ساتھ کھڑے ہوئے شخص سے کہا "یہ ہمارے

دفتر کی نئی اسسٹنٹ مسز ایلزبیتھ ہیں۔ بہت اچھا کام کرتی ہیں اور اِنھیں ترقی کے مواقع بھی فراہم کیے جائیں گے"

"مواقع"! ساتھ کھڑے ہوئے شخص نے، جو دفتر کے مُعائنہ پر آیا تھا زیرِ لب دُہرایا۔ "شادی کے بعد یہ ہمیشہ مجھ سے ایک قدم آگے رہی ہے۔ اب یہی دیکھو، یہاں بھی یہ مجھ سے پہلے پہنچ کر کام میں مصروف ہے،

یہ میری بیوی ہے..."

●●

بہ حکمِ یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

"شانِ ہند" کا موجودہ دفتر فلیٹ ۸ الفاری مارکیٹ۔ دریا گنج، ۱۹۵۳ء میں دِلی انتظامیہ کے محکمۂ بحالیات نے الاٹ کیا۔ فلیٹ ۷ جناب خوشتر گرامی مالک و ایڈیٹر "بیسویں صدی" کو الاٹ کیا گیا۔ چونکہ اُن دِنوں "شانِ ہند" کا کام بہت ہی معمولی تھا یعنی "دَن مین شو" والا معاملہ تھا اور دفتر نے اپنا دفتر ماہنامہ "بیسویں صدی" کو سب لیٹ کر رکھا ہے۔ اِس شکایتی درخواست کی تحقیقات ہوتی رہی اور مجھے اس کا کچھ بھی علم نہ تھا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سرکاری طور پر حکم ہو گیا کہ "شانِ ہند" کی الاٹمنٹ منسوخ کر کے یہ فلیٹ سرکار اپنے قبضہ میں لے لے۔

محکمۂ بحالیات کے ایک صاحب نے ازراہِ ہمدردی رات کے آٹھ بجے اطلاع دی کہ کل صبح دس صبح نو بجے جب دفتر بیسویں صدی کے چپڑاسی اپنے دفتر میں آئے تو انھوں نے سارا نقشہ ہی الٹا ہوا دیکھا۔ رفتہ رفتہ دس پندرہ منٹ میں بیسویں صدی کا سارا اسٹاف بھی آگیا۔ مسٹر شرما منیجر بیسویں صدی نے خوشتر صاحب کو بستی نظام الدین اُن کے مکان پر فون کر کے ساری صورتِ حال سے اُنھیں آگاہ کیا تو وہ بھی دس بجے تک تشریف لے آئے اور مجھ سے تلخ کلامی سے

خوشتر گرامی کی غدّاری

شخصیات، واقعات، تأثرات،

بیسویں صدی میں چودہ، پندرہ ملازم کام کرتے تھے، لہٰذا خوشتر گرامی کی درخواست پر میں نے اُن کے ملازمین کو دفتر شانِ ہند میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ "شانِ ہند" کا کام حسبِ سابق میرے رہائشی مکان واقع محلہ چاندنی محل میں ہی ہوتا رہا۔ اُس وقت اس فلیٹ کا ماہوار کرایہ چھتیس روپیہ سرکار کو ادا کیا جاتا تھا۔ بجلی پانی کے کنکشن میرے نام سے تھے۔ خوشتر صاحب میرے فلیٹ کا کرایہ بھی ادا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کچھ ماہ تک بخیر و خوبی چلتا رہا مگر خوشتر صاحب نے دوستی میں غدّاری کو داخل کرتے ہوئے اپنے کسی آدمی سے محکمۂ بحالیات میں گمنام شکایت کرادی کہ سرور تونسوی بجے سرکاری کارندے آپ کے دفتر میں آئیں گے اور اس پر سرکاری قبضہ کریں گے۔ کیونکہ آپ وہاں پر کام نہیں کرتے بلکہ بیسویں صدی کا سٹاف کام کرتا ہے اس لئے اگر آپ اپنا کوئی انتظام کر سکتے ہیں تو کر لیجئے ورنہ کل صبح دس بجے یہ فلیٹ آپ کے ہاتھ سے نکل جائیگا۔"

ظاہر ہے کہ یہ اطلاع میرے لئے سوہانِ روح سے کم نہ تھی مگر میں نے حوصلہ برقرار رکھا۔ اپنے تین بڑے لڑکوں کو ساتھ لیا اور رات کے نو بجے فلیٹ ۸ کے دونوں کمروں کے تالے توڑ دیئے اور سارا سامان نکال کر خوشتر صاحب کے فلیٹ ۷ میں رکھ دیا۔ ٹیلیفون رہنے دیا کیوں کہ اس کے تار وغیرہ اکھاڑنا جرم تھا۔ کہنے لگے کہ یہ کیا کیا ہے؟ اُسی انداز میں جواب دیا گیا کہ آپ نے غدّاری کی اور میں نے اپنا فلیٹ بچانے کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ ابھی گرما گرمی ہو ہی رہی تھی کہ ساڑھے دس بجے کے قریب محکمۂ بحالیات کے ایک افسر معہ دو کارندے تشریف لے آئے اور اُنھوں نے دیکھا کہ فلیٹ ۸ میں سرور تونسوی اپنی میز کرسی لگائے بیٹھے ہیں۔ میز پر ڈاک رکھی ہے، کاغذات پڑے ہیں۔ راتوں رات میں نے "شانِ ہند" کی پرانی فائلیں اور فرد خشکی والی کتابوں کا اسٹاک بھی لا پھینکا تھا۔

محکمۂ بحالیات کے افسر اور اسٹاف کے دوسرے دونوں حضرات کہنے لگے کہ آپ کے فلیٹ کی تو الاٹمنٹ

کینسل ہو گئی ہے اور ہم آپ سے فلیٹ کا قبضہ لینے آئے ہیں۔ میں نے بیسویں صدی کے فون سے ہی مسز سیٹھ' جو کہ چیف کمشنر کے سکریٹری تھے (اور دونوں جناب ششنکر پرشاد صاحب آئی۔ سی۔ ایس دِلّی کے چیف کمشنر تھے) سے یہ واقعہ بیان کیا کہ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا ہوں اور محکمۂ بجالیات کے کوئی آفیسر مجھ سے فلیٹ کا قبضہ لینے آئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ فلیٹ کی الاٹمنٹ کینسل کر دی گئی ہے۔

مسٹر سیٹھ نے محکمۂ بجالیات کے افسر کو فون پر بات کرنے کے لئے فرمایا اور میں نے فون کا ریسیور افسرِ متعلقہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے عرض کیا کہ مسٹر سیٹھ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ مسز سیٹھ کو اُس افسر نے ساری صورت حال بیان کی کہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ مسٹر ورقو نسوی نے اپنا فلیٹ بیسویں صدی کے مالک کو سبلیٹ کر رکھا ہے اِس لئے یہ الاٹمنٹ کینسل کی گئی مگر اب ہم جب قبضہ لینے آئے ہیں تو فلیٹ ۹ میں 'شانِ ہند' کا دفتر ہے اور مسٹر ورقو نسوی کام کر رہے ہیں۔ جناب سیٹھ صاحب نے اُس افسر کو حکم دیا کہ تم یہی رپورٹ اپنے افسران کو کر دو اور وہاں سے چلے آؤ مگر خوشتر گرامی صاحب کے یہ کہنے پر کہ اُن کا فون فلیٹ ۸ میں لگا ہوا ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا دفتر یہیں تھا۔ اس پر بجالیات کا افسر ذرا شیر ہوا اور افسرانہ لہجے میں کہنے لگا کہ ہاں صاحب اس ثبوت پر تو ہم قبضہ ہی لیں گے۔

اس پر افسر مذکور کو بڑی نرمی سے سمجھایا گیا کہ یہ معاملہ محکمۂ ٹیلی فون کا ہے۔ آپ کا اِس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں یہ پوچھنے والے کہ فلیٹ نمبر ۸ میں فون کس کا لگا ہوا ہے۔ آپ کو کیا علم کہ خوشتر گرامی نے اپنا فون مجھے سب لیٹ کر رکھا ہو لہٰذا یہ محکمۂ ٹیلیفون کا کام ہے کہ وہ اس کا نوٹس لے اور بیسویں صدی کا فون غلط استعمال ہونے پر کاٹ دے۔ یہ سنتے ہی افسر مذکور تو کان لپیٹ کر چلا گیا اور خوشتر گرامی صاحب کو یہ فکر دامن گیر ہوا کہ اُن کا ٹیلی فون نہ کٹ جائے لہٰذا فور نے فوراً اپنے مینجر کو دوڑایا کہ کسی طرح لے دے کر فور آن کے کمرے میں آج ہی منتقل ہو جائے اور ایسا ہی کہ شام تک بیسویں صدی کا فون فلیٹ ۸ سے فلیٹ میں منتقل ہو گیا اور دفتر شانِ ہند کا فلیٹ شانِ ہند کا نام ہی رہ سکا۔

دوستی کے پردے میں خوشتر گرامی کی یہ غدار طویل عرصہ تک دِلّی کے ادبی حلقوں میں باعث موضوع گمر خوشتر گرامی پر ایسی باتوں کا اثر کبھی نہ ہو سکا اور احباب کے ساتھ غداری کر کے تکلف آتا تھا۔ ●●

بابِ انتقاد

سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ
(اُردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان)
گوپی چند نارنگ
اشاعت ـــــ ۱۹۸۶ء
مطبوعہ صفحات ۱۲۲ سائز ۳۶ × ۲۳ / ۱۶
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
قیمت ۳۵/- روپے

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ہر علمی تصنیف اور تالیف اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ نارنگ صاحب کی ہر شائع ہونے والی کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے نہ صرف منفرد ہوتی ہے بلکہ اُردو ادب میں ایک جاندار اضافہ کا موجب بھی ہوتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب وہ مقالہ ہے جو نارنگ صاحب نے دو برس پہلے پاکستان کی ایک انجمن کی فرمائش پر لکھنا شروع کیا تھا۔ گو یہ مقالہ جس بین الاقوامی سمپوزیم میں پڑھا جانا تھا وہ منعقد نہ ہو سکا۔ چونکہ یہ موضوع نارنگ صاحب کا اپنا انتخاب کردہ تھا۔ اس لئے ان کی دلی وابستگی اس موضوع کے ساتھ بڑھتی گئی اور وقت کے ساتھ ساتھ مقالے میں اضافے کا سلسلہ جاری رہا۔

اپنی موجودہ شکل میں اس تحریر کو ایک آزاد علمی کاوش سمجھا جا سکتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نارنگ صاحب کو اپنے اس مقالے کے موضوع سے متعلق کس قدر محنتِ شاقہ کرنی پڑی ہوگی۔ جن شعراء کی نظمیں یا اشعار دیئے گئے ہیں ان پر بھی نارنگ صاحب نے سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ نارنگ صاحب کے انتخاب کردہ اشعار ایک درجہ کے نہیں، تمام اشعار ایک درجے کے ہو بھی نہیں سکتے لیکن بعض اشعار یقیناً اس طرح کے ہیں کہ تحیّر کی کیفیت سے دوچار کرتے ہیں، اور پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نارنگ صاحب نے مثالیں ضرورت سے زیادہ دی ہیں، بے شک مُعاملہ کئی دہائیوں کے شعری عمل کا ہے مگر مثالوں اور حوالوں میں کسی حد تک کمی کی جا سکتی تھی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی اِس تصنیف نما تالیف میں زبان کافی حد تک مُشکل استعمال کی ہے، جبکہ ضرورت اِس امر کی ہے کہ اُردو کو آسان زبان بنایا جائے۔

تاہم یہ کتاب مقام ضرور رکھتی ہے کہ اسے عوامی لائبریریوں کے علاوہ ہر ذوقِ سلیم کی ذاتی لائبریری کی زینت بھی بنایا جائے۔ ●

ایوانِ اُردو
ماہنامہ
مُرتبین، شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی
پہلی اشاعت: مئی ۱۹۸۷ء
مطبوعہ صفحات ۸۰ سائز ۳۰ × ۲۰ / ۸
ناشر: دہلی اُردو اکادمی گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، د
قیمت ۲/۵۰ فی شمارہ

اُردو اکادمی دلی کے ترجمان "ایوانِ اُردو" کا پہلا شمارہ شائع ہوا ہے جس کا اجراء دلی کے لفٹیننٹ گورنر جناب کپور صاحب نے اُردو اکادمی دلی کے ہال میں فرمایا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ مُلک بھر کی اکادمیوں کے شائع ہونے والے رسالوں میں "ایوانِ اُردو" ہر لحاظ سے اوّلین ہے، اور اسے قبولیتِ خاص حاصل ہوئی ہے۔ اکادمی کے سیکریٹری جناب شریف الحسن نقوی اور جناب مخمور سعیدی

اُردو" کی عنانِ ادارت سنبھالے ہوئے ہیں، اور جائز طور پر اُمید کی جاسکتی ہے کہ یہ ماہنامہ ترقی کی منازل جلد سے جلد تر طے کرے گا، اور جہاں یہ اپنے قارئین کرام کو بہترین ادب پیش کرے گا وہاں دلّی اُردو اکادمی کی سرگرمیوں سے بھی واقف رکھے گا۔ سرکاری رسائل چونکہ لکھنے والوں کو مُعاوضہ ادا کرتے ہیں اس لئے ایسے رسائل کے اِردگِرد پیشہ ور لکھنے والے منڈلاتے رہتے ہیں، چنانچہ اِس اَمر کی اشد ضرورت ہوگی کہ "ایوانِ اُردو" کے صفحات پر سفارشی قسم کے ادیبوں اور شعرا کی تخلیقات دکھائی نہ دیں، جیسا کہ زیرِ نظر شمارہ میں کچھ تخلیقات ایسی دکھائی دے رہی ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے "ایوانِ اُردو" کا معیار گِر جائے گا۔ ●

نذرِ اعجاز

حکیم مُحمّد شکیل جعفری/حکیم ابوالنّصر

اشاعت: ۱۹۸۷ء

مطبُوعہ صفحات: ۲۱۶ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

ناشر: حکیم مُحمّد شکیل۔ میاں سرائے سنبھل (مرادآباد)

قیمت: ۲۰/- روپے

حضرت اعجاز وارثی سنبھلی ایک مشہور اور کُہنہ مشق شاعر ہیں، جہاں یہ سنجیدہ شاعری میں اپنا ایک مَقام رکھتے ہیں، وہاں طنزیہ شاعری میں اپنا جواب آپ ہیں۔ خُدا کے فضل سے حال ہی میں ان کی ۶۷ویں سالگرہ منائی گئی اور اس موقع پر ان کے تلامذہ ارشد جناب حکیم مُحمّد شکیل جعفری، شکیل آنولوی (سنبھل) اور حکیم ابوالنصر (کندرکی) نے ایک کتاب "نذرِ اعجاز" پیش کی۔

موصوف کی ادبی خدمات کا اعتراف بڑی شدومد سے کیا گیا ہے ملک کی مشہور ادبی ہستیوں، مُلک بھر کے رسائل و جرائد، موصوف کے تلامذہ اور دیگر بہی خواہوں نے اعجاز صاحب کو جو خراجِ عقیدت گذشتہ پچاس سال میں پیش کیا، وہ سب اِس کتاب میں شائع کر دیا گیا ہے، حکیم محمد شکیل جعفری شکیل صاحب یقیناً مُبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے اپنے اُستادِ محترم کی ادبی خدمات کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے یہ کتاب شائع کرائی۔ ●

—— سرور تونسوی

تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدیں فقط اور بے داغ بھجوائیے
جس کتاب پر برائے تبصرہ لکھا ہوگا اُس پر تبصرہ نہیں ہوگا

ترنّم

جانے اُس رات کی موہوم گھنی چھاؤں تلے
[illegible]

★

[illegible]

★

شام ہوتے ہی تیری یادوں کے جلتے ہیں چراغ
[illegible]

★

[illegible]

★

صبحِ صادق بھی بہت دور نہیں ہے لیکن
ایسی حالت میں چراغوں کو بجھا مت دینا

★

من کہ مکتوب الیہ

محترم سرور صاحب!

تسلیم و نیاز!

اُمید کہ آپ بعافیت ہوں گے، فروری ۱۹۸۵ء کا "شانِ ہند" نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ سابقہ شماروں سے بھی کہیں زیادہ جاذبِ نظر اور معیاری ہے۔ غیاث احمد گدی صاحب کی کہانی سیڑھیاں نے بیحد متاثر کیا۔ آپ نے خوب سوچ سمجھ کر اس کہانی کا انتخاب کیا ہے آپ کی پرکھ قابلِ احترام ہے۔

وقار چودھری صاحب کا مضمون عہد بڑا ایمان افروز ہے، دل خوش ہو گیا۔ میرے پاس تعریف کیلئے الفاظ نہیں ہیں، یہ مضمون اس شمارے کی جان ہے۔

محترم گندن لعل گردھر صاحب کی اس تجویز سے مجھے اختلاف ہے کہ کالم "بکو سے یار" شروع میں دیا کریں، اس مضمون کو آپ نے جو اب جگہ دی ہے وہی مناسب ہے۔ اس بار حصّۂ نظم کمزور لگا، میرے خیال میں آپ اس سے متفق ہوں گے، اور آئندہ خیال رکھیں گے۔ رسالے کے صفحات کب تک بڑھا رہے ہیں۔

نیاز مند

—— راشد حسین خان

شاہجہاں پور

جناب سرور تونسوی صاحب!

سلام و رحمت

جناب کا شانِ ہند پہلے بھی کچھ کم قیامت نہیں تھا، اور جب سے اس نے سنگی طباعت کو طلاق دے کر آفسیٹ سے نکاح کر لیا ہے اور بھی قیامت ہو گیا ہے۔

ترے سروِ قامت سے یک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ٹائیٹل پیج کی تصویر انہیں مخلوقات میں سے ایک ہے۔ جن کے متعلق مہاتما غالب نے بنارس میں قیام کے دوران اپنی مثنوی "چراغِ دیر" میں فرمایا تھا "بہارِ بستر و نوروز آغوش" اور "قیامت قامتاں مژگاں درازاں" پھر آپ کے جادو رقم قلم سے لکھے ہوئے ع

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

نیز "خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود۔ چوں بیاید ہنوز خر باشد" خدا لگتی اور کھری کھری باتیں ہیں۔ — اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر حقیر آستانی کی غزل بہت خوب ہے باقی حصّۂ نظم ویسا ہی ہے جیسا پروفیسر صاحب کا ہوا کرتا ہے۔ افسانوں میں احمد ندیم قاسمی کی کہانی "پہاڑوں کی برف" ظالم نے عجیب انوکھے طرز سے لکھی ہے، کلیم رحمانی کی "نا..." اور اکرام اختر نے "سیاہ نقطہ" میں عورت کی فطرت کو خوب پینٹ کیا ہے، غرض پورا البم خوب اور بہت خوب ہے۔

—— انور بھوپالی

مہاتما صاحب! نمسکار

اب جو شانِ ہند چھپ رہا ہے وہ کبھی ہو... عروسِ نازنیں کی طرح ہے۔ —— ارمان ...

مکرمی و محترمی سرور صاحب! تسلیم!

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، آپ کے خلوص کا شکریہ، لیکن مجموعی خدمات کے لئے اُتر پردیش اُردو اکادمی سے مجھے نہیں بلکہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی صاحب کو دس ہزار کا انعام ملا ہے۔ وہ میرے عزیز نہیں صرف ہم وطن ہیں۔

"افکارِ گریزاں" ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے۔ اُتر پردیش اکادمی میں ۸۰ فی صد انعامات صرف صوبے کے رہنے والے ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف پر دیئے جاتے اور باقی ۲۰ فی صد دوسری ریاستوں کے مصنفین کی کتابوں پر اس اصول سے اکثر دوسری ریاستوں کے مصنفین کی بہت اچھی کتابیں بھی انعامات سے محروم رہ جاتی ہیں۔ ایسا اوقات اپنی ریاست کے مصنفین سے کہیں زیادہ باہر کی ریاستوں کے مصنفین کی کتابیں آئی ہیں، اور ان کے درمیان انعام کے معیار کا بہت فرق ہو جاتا ہے۔ پھر انعامات میں موضوعات کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ میں کسی رازِ درونِ پردہ کا انکشاف نہیں کر رہا ہوں بلکہ کچھ بالکل سامنے کی حقیقتوں کو بیان کر رہا ہوں۔

انعام ملنے یا نہ ملنے سے کسی کتاب کی واقعی قدر و قیمت میں میرے خیال سے کوئی فرق نہیں آتا، کیونکہ انعام کی بہت سی پابندیاں ہیں، آپ اتنی خوبصورت کتاب چھاپتے ہیں کہ بس ـ کیا تعریف کی جائے۔ کاش میری بھی کوئی کتاب آپ کے ہاتھوں چھپتی! میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

—— راقم:- وجاہت علی سندیلوی

Regd. with the Registrar of Newspapers

کامیابی سے دکھائی جا رہی ہے

شانِ ہند
مئی ۱۹۸۷ء

شانِ ہند

دہلی

مئی سنہ ۱۹۸۷ء

جیف ایڈیٹر سرور تونسوی
معاون ایڈیٹر مطرب صحرائی

جلد ۴۸
شمارہ ۵

پرنٹر پبلشر پرو پرائٹر
وِدّیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"
...۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲ "

دلی میں کرفیو لگنے کے باعث زیرِ نظر
شمارہ پچیس روز دیر سے شائع ہوا ہے
اور یہ مجبوری ایسی تھی کہ جس پر قابو پانا
ہمارے بس میں نہ تھا (ادارہ)

شاہجہاں مالویا ... بننے والوں کا اس زمانے میں کوئی ... تھا مگر واہ ری شاہجہاں مالویا! کیا ... کسی کو ساز کے پتر کو بھی ہاتھ لگانے دیا ہو ... شاعر یا کسی سامع کو، یا کسی منتظمِ مشاعرہ کو یہ ... کر شاہجہاں مالویا سے اظہارِ محبت کرے۔
غزل، موسیقی اور حسن کی یہ تثلیث جب مشاعرے کے اسٹیج پر نمودار ہوتی ہے تو ...... دیکھئے کیا فرماتے ہیں سرور صاحب، "کوئے یار رہ اندار رحمانہ گُرد" میں پڑھیئے "ما حولات" صفحہ ۲۵ پر۔

جب اندرا گاندھی کے قتل کے بعد صدرِ مملکت گیانی ذیل سنگھ نے راجیو گاندھی کو حلف دلا کر وزارتِ عظمیٰ انہیں سونپ دی تو دسمبر سنہ ۱۹۸۴ء کے شمارہ شانِ ہند میں راجیو گاندھی کے نام کھلا خط شائع کیا گیا تھا کہ
حضورِ والا خوشامد ایک میٹھا زہر ہے۔ خوشامد نے کئی تاجداروں کے سفینے ڈبو دیئے ہیں۔ خوشامد آمریت کی علیند کوکھ سے نکلی، ملوکیت اور آمریت کے محلوں میں جہاں انسانیت کی بربادی کے لئے اور جو سازشیں پرورش پاتی رہیں اُن میں ایک یہ بھی تھی۔
اندر پڑھیئے: "حالیہ ملکی سیاسی بحران اور راجیو گاندھی" پر پُرمغز جامع اور سیر حاصل تبصرہ۔ صفحہ ۳ پر

غازی آباد کے کسی بدنصیب عبدالرشید نے نہ معلوم کن حالات میں قرآنِ مجید کو نذرِ آتش کرنے کی حماقتِ عظیم کی۔ عبدالرشید یہ ذلیل حرکت کرتے وقت شراب کے نشے میں ہوش و حواس سے بیگانہ تھا۔ عبدالرشید کے قتل کا واقعہ تو خالص قانونی معاملہ ہے۔ مگر عبدالرشید کے قتل کو جو سیاسی موڑ دیا گیا ہے وہ اور بھی قابلِ نفرین ہے تفصیل اس اجمال کی پڑھیئے صفحہ ۷ پر

خوشنویس
سبطین حیدر
محمد عمران اعظمی

تزئین کار
مصطفیٰ آرٹسٹ

قیمت فی شمارہ	چار روپے
قیمت سالانہ	چالیس روپے
لائف ممبری	پانچ سو روپے

ممالک غیر میں بذریعہ سمندری ڈاک Rs. 80.00
بذریعہ ہوائی ڈاک سعودی عرب
متحدہ عرب امارات اور کویت Rs. 150.00
انگلینڈ، ناروے، سوئیٹزرلینڈ Rs. 200.00
کناڈا۔ امریکہ Rs. 250.00

عید مبارک

حقایق

رشحاتِ قلم نواب اختر یار جنگ اختر مینائی!

جان ہوتے ہوتے رخصت رہ گئی ‏— مفت قاتل سے خجالت رہ گئی

چال میں تجھ کو پہونچتا ہے کوئی ‏— منزلوں پیچھے قیامت رہ گئی

ہائے دنیا کیا تھی اک تصویر تھی ‏— مٹ گئی تصویر حیرت رہ گئی

چھوڑ کر نکلے تھے ہم سب کو مگر ‏— ساتھ اک کمبخت وحشت رہ گئی

ساتھ لے لینا تھا میری جان کو ‏— تم سے اتنی وقتِ رخصت رہ گئی

ہو گیا اُس کی طرف سارا جہاں ‏— میں رہا اور میری قسمت رہ گئی

دیدنی تھی وہ اُداسی کی بہار ‏— ہو کے گُل جب شمعِ تربت رہ گئی

اب کہاں وہ اختلاطِ باہمی ‏— دُور کی صاحب سلامت، رہ گئی

یہ بھی ہے اختر کوئی فکرِ سخن

چار شعروں میں طبیعت رہ گئی

شانِ ہند دہلی مئی ۱۹۸ء

سیاسی بحران اور راجیو گاندھی

ایک ماہ کے اندر ہی اندر تین سینئر وزیروں کا استعفیٰ، دستوری جواز کے مسئلے پر وزیر اعظم اور صدرِ مملکت کے درمیان تصادم، رشوت کے دو بڑے بینہ رُسوا کُن معاملات کا منظرِ عام پر آنا اور دو ریاستی حکومتوں کا حزبِ اختلاف کے ہاتھوں میں چلے جانا یہ ایسے واقعات ہیں جو عام حالات میں کسی بھی حکومت کو ہلا دینے کے لئے کافی ہیں اور اس سیاسی بحران میں ہمارے وزیرِ اعظم راجیو گاندھی کے مضبوط قدم بھی بہت بری طرح ڈگمگا گئے۔

یہ دوسری بات ہے کہ پارلیمنٹ میں وزیر اعظم کے ساتھ ممبرانِ پارلیمنٹ کی بہت بڑی اکثریت (کیونکہ ان میں سے ۹۵ فیصد ممبران کو پارلیمنٹ کے ایوان میں داخلہ ہی راجیو گاندھی کی مقبولیت کے باعث نصیب ہوا) صدرِ مملکت کی وزیر اعظم کی ساتھ دلی وفاداری (دستوری اور آئینی اختلافات کے باوجود) عوام کے دلوں میں راجیو کی معصوم اور بھولی بھالی شکل اور ان کی دائمی مسکراہٹ کے باعث دلی ہمدردی، نیز ملک پر قربان ہونے والی شریمتی اندرا گاندھی کے فرزندِ ارجمند ہونے اور اپوزیشن پر عوام کا عدم اعتماد، ایسی ٹھوس وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے راجیو گاندھی اس وقت کافی حد تک اس سیاسی بحران سے اپنے آپ کو بچا سکے ہیں۔ مگر اس سچائی سے رُوگردانی کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے کہ جمہوری اقدار کو برقرار رکھنے یا اُن میں مضبوطی لانے کے لئے راجیو گاندھی کی اہلیت پر عوام کا اعتماد متزلزل ہی نہیں ہُوا بلکہ گھٹتا ہوا صاف دکھائی دینے لگا ہے۔ اور دانشوروں کو یہ یقین سا ہونے لگا ہے کہ راجیو گاندھی مشکلات میں پھنس گئے ہیں۔

کانگریس (آئی) کا وجود ہی اس لئے عمل میں آیا تھا کہ مرحومہ اندرا گاندھی کی ذاتی اغراض کی تکمیل کا ہی واحد راستہ تھا۔

شروع شروع میں راجیو گاندھی نے اپنی والدہ محترمہ کی کانگریس (آئی) کی ڈگر سے ہٹ کر جو اقدام اُٹھائے ان کی وجہ سے عوام راجیو گاندھی پر والہانہ طور پر فدا ہونے لگے۔ اور عوام نے یہ سمجھا کہ ان کی دلی آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے والا مسیحا آگیا ہے اور اب ہندوستان واقعی جنت نشان کہلا سکے گا اندرا جی کے قتل کے بعد، وزیر اعظم بننے سے پیشتر راجیو گاندھی کو حکومت چلانے کا تجربہ قطعاً نہیں تھا

مگر انھوں نے پنجاب اور آسام کے بحرانوں پر قابو پانے میں کافی اہلیت کا مظاہرہ کیا۔ گو ان میں کامیابی نصیب نہ ہوئی مگر پھر بھی عوام اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ انھیں ایک ایسا وزیر اعظم ملا ہے جو ایمانداری اور دیانتداری میں آپ اپنا جواب ہے اور اسی لئے انھیں "مسٹر کلین" کہا جانے لگا مگر یہ کانگریس (آئی) میں صرف یہ کمی لاسکے کہ کانگریس کے دیرینہ خدمت گذاروں کی اہمیت کو دن دن گھٹایا جانے لگا۔ اور مطلب پرستوں، خودغرضوں اور خوشامدیوں کا ایک طائفہ ان کے گرد جمع ہی نہیں، بلکہ ان پر چھا گیا اور انھیں مجبور کر دیا گیا کہ یہ کانگریس آئی میں صحت مند تبدیلیاں لانے کی بجائے اپنی والدۂ محترمہ کی طرح اس پر اپنے قبضہ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کریں اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ عوام کی نظروں میں وہ ناپسندیدہ، خود غرض، مطلب پرست اور خوشامدی افراد جو وزیر اعظم کے مشیر تھے، انھیں ایک گہری دلدل میں دھکیلنے کا موجب بنے۔

وزیر اعظم تو حکومت کا سربراہ ہوتا ہے یہاں تو حالت یہ ہے کہ نائب تحصیلدار تک انگریزی اخبارات کو ہی اخبار سمجھتے ہیں۔ دیگر زبانوں کے اخبارات کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، مگر اُردو اخبارات کے بارے میں ہر سرکاری عہدیدار، حتیٰ کہ وزیر اعظم تک یہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی کوئی اخبار ہیں! کیوں کہ بدقسمتی سے ۹۹ فی صدی سرکاری اہل کار اور وزیر اعظم اُردو زبان سے بے بہرہ ہیں۔ بیشک حکومت نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ دیگر زبانوں کے اخبارات میں شائع شدہ عوام کے جذبات، ان کی تکالیف، حکومت کی کارگزاری پر تبصرہ وغیرہ کی رپورٹ انگریزی میں حکومت کے ذمہ دار ارکان تک پہنچائی جائے۔ اوّل تو ایسی رپورٹیں تیار ہی بہت کم کی جاتی ہیں، اور اگر کہیں فرض شناسی ہوئی بھی تو ہماری حکومت کے ذمہ دار ارکان اور خود وزیر اعظم کو یہ کب گوارا ہے کہ وہ ورنیکلر اخبارات کے تبصروں پر دھیان دے، یا ان کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے کہ وہ ان لغویات کو پڑھ سکیں۔ حالانکہ عوام کے صحیح ترجمان یہی ورنیکلر اخبارات ہیں۔

جب اندرا گاندھی کے قتل کے بعد صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے راجیو گاندھی کو حلف دلا کر وزارت عظمیٰ انھیں سونپ دی تو نومبر ۱۹۸۴ء کے شمارۂ "شانِ ہند" میں "راجیو گاندھی کے نام کھلا خط" شائع کیا گیا تھا، جس میں اُن سے نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کیا گیا تھا کہ

> اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا یہ نیاز مند محض اُردو ادب کا طالب علم ہے مگر آپ نے تو انگریزی ادب کا بغور مطالعہ فرمایا ہوگا "خوشامد" کے بارے میں مجھے کچھ بھی علم نہیں کہ انگریزی مفکرین نے اس "میٹھے زہر" کے بارے میں کیا گہر افشانی کی ہوگی۔ مگر "خوشامد" کے بارے میں اُردو، فارسی اور عربی ادب میں جو تفصیل سے لکھا گیا ہے اُس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ خوشامد نے کئی تاجداروں کے سفینے ڈبو دیئے۔

خوشامد بادشاہ کو رعایا سے آخر کو مزدور سے اور رہنما کو عوام سے دُور رکھتی ہے خوشامد ایسا زہر ہے جو کسی کے جسم میں سرایت کر جائے تو خود ستائی اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ یہی انسانی کمزوری ہے کہ وہ اپنی تعریفیں کرانے اور سننے سے خوش ہوتا ہے۔ جیسے عورت اپنی پسند کا زیور پہن کر شاداں و فرحاں ہوتی ہے خوشامد کے معنیٰ چاپلوسی یا چاپلوسی سے مخاطب کو مسرور کرنا ہے، خوشامد آمریت کی غلیظ کوکھ سے نکلی۔ ملوکیت اور آمریت کے محلوں میں جہاں انسانیت کی بربادی کے لئے اور خباثتیں پرورش پاتی رہیں، اُن میں ایک یہ بھی تھی۔ ملوکیتی درباروں میں موقع پرستی اور شخصیت پرستی بلکہ جی حضوریوں کا ماحول اُسے راس آیا۔ اور یہ بتدریج پروان چڑھتی رہی۔

قسلم پیر یڈ کے بعد جب کچھ دیوانِ سلاطین کا خوں میں تبدیل ہوئیں اور بادردی مسلح دربان ڈیوڑھیوں کی زینت بنے تو خوشامد درباریوں، نورتنوں، مصاحبوں اور قصیدہ خوانوں کے روپ میں درباری زندگی کا جُزو بن کر جوڑ تقدیر کے موتبہ جباری و قہاری شان والے محلوں کی زینت بن گئے ایسے دربار خوشامد کے بغیر اپنے اندر شدید کمی محسوس کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ملوکیت اور خوشامد لازم و ملزوم بن گئے۔ تاریخ ماضیہ کے اوراق گواہ ہیں کہ رعونت اور خشونت سے بھرپور آمرِ مطلق کا شاید ہی کوئی دربار اس خباثت سے مُبرّا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تخت و سلطنت کے سلطانی محلوں کے اندر زمین و آسمان کے قلابے ملا کر آمرِ مطلق کی جب تک مدح سرائی نہ کی جاتی اور خوشامد کا پُر بہار نشہ آور جام مصاحبوں اور قصیدہ خوانوں کے ہاتھوں آفرین و تحسین کے مُرکب میں حل کرکے پلایا نہ جاتا اس وقت تک وہ امورِ سلطنت میں دلچسپی نہ لیتا۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مغل شہنشاہ شاہجہاں کے دَور میں جب ایرانی وفد ہندوستان آیا تو ایک ایرانی نمائندے نے شاہ سے سوال کیا کہ آپ شہنشاہِ ہند ہیں پر لقب شاہجہاں ہے۔ شاہ جہاں اس کا جواب دے سکتے ہی نہیں تھے مگر نواب سعداللہ خاں چینیوٹی نے جو انتہائی زیرک وزیر تھا برجستہ کہا کہ ظلِ الٰہی شہنشاہِ ہند تو ضرور ہیں، مگر شاہجہاں اور شہنشاہِ ہند کے الفاظ کے اعداد میں یکسانیت ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں ایک مردِ حق کو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے للکار کر کہا تھا کہ میں دربار میں ایسے ہی داخل ہوں گا جیسے میرا مذہب مجھے اجازت دیتا ہے۔ معلوم ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور نواب سعداللہ خاں ہم درس تھے اور دونوں کی لعبات

کا فرق اپنی اپنی جگہ نمایاں ہے۔

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سرداری آخری ہچکی لے رہی تھی تب بھی نام کے بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ جن کی فرماں روائی صرف لال قلعہ دہلی کے حصار میں تھی 'ظلِ الٰہی اور ظلِ سبحانی' کے القابات سے نوازا جاتا جبکہ اس کی چار دیواری کے باہر گورا آقا 'بمعہ افسر شاہی' کالے آدمی کو دجل و فریب دے کر اپنے دامِ تزویر میں پھانس کر' جور و استبداد کے ڈنڈے کے ساتھ' غیرتِ ملی اور قومی غیرت کو ختم کر کے کالے آدمی اور گورے صاحب بہادر کے درمیان امتیازی فرق کو نمایاں کر رہا تھا۔ آخر صاحب بہادر کے استبداد و ظلم سے نجات پانے کے لئے ہر کس و ناکس نے خوشامد کو اپنایا۔ جھوٹ اور سچ میں تمیز ختم ہو گئی اور صاحب بہادر کی خوشنودی کے لئے دن کو رات اور رات کو دن کہنا معمول ہو گیا۔ یہاں تک کہ مادی ترقی کے منزل پانے کے لئے مکر و فریب کے دروازے سے گزر کر چاپلوسی کا زینہ استعمال کیا جانے لگا۔

عالیجاہا! آپ مجھ نیازمند سے کہیں بہتر طور پر جانتے ہیں کہ موجودہ وقت میں وطنِ عزیز کا کوئی محکمہ یا شعبہ ایسا نہیں جہاں اس مضغۂ کثیف (خوشامد) کا زہر سرایت نہ کر چکا ہو۔ اس روشن دور میں تقریباً ہر شخص اس سیاہ بختی کا شکار ہے اور اب تو یہ فن کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ مختار ہو یا مجبور' آجر ہو یا مزدور' حاجت مند ہو یا بند دروازوں والے ائرکنڈیشن کمرے میں بیٹھنے والے کے درمیان رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ صرف اور صرف خوشامد کا ہے۔ سیاسی بحران ہو یا سماجی و معاشرتی' ہر جگہ خوشامد کا عمل دخل ہے مریض تو در کنار معالج بھی اسی کا آسیب زدہ ہے۔ جو معاشرہ ایسی نفسیاتی الجھنوں کے علاج سے عاری ہو وہ تحقیق و انکشافِ حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی گراں مایہ مخلوق وطنِ عزیز میں کمیاب ہے' بلکہ سابقین میں چلی گئی ہے۔ ایسی آسیب زدہ معاشرت' خوددار مخلوق کے لئے' امتحان گاہ اور بے وسیلہ مخلوق کے لئے جہنم بن جاتی ہے' جبکہ انسانیت انسانیت کی پہچان سے یکسر عاری ہو جاتی ہے۔ خوشامد انسانی سوچ اور فکر کو خود غرضی تک محدود کر کے اجتماعیت پر مبنی قوتِ مدرکہ کو سلب کر لیتی ہے۔ مشرک اور خوشامد پرست میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اول الذکر میں ایمان نہیں ہوتا اور مؤخر الذکر میں ضمیر نہیں۔ خوشامد پرست سے آشنا ہوتے ہوئے بھی مادی وسائل پورا کرنے والا ایک لاقنوط ڈھانچے کو مجازی خدا تصور کر کے التجا اور التفات کی صدائے جرس سننے کا متمنی ہوتا ہے۔ تو حضورِ والا۔ یہ ہے 'خوشامد' اور خوشامدی کی کہانی جسے کافی اختصار سے پیش کیا گیا ہے ورنہ اس موضوع پر صفحات کے صفحات لکھے جا سکتے ہیں کہ خوشامد نے کیا کیا غضب ڈھائے ہیں۔

کانگریس آئی نے وطن پرست' محبِ وطن اور ملک پر قربان ہونے والے بہت کم پیدا کئے۔ مگر خوشامدیوں' مطلب پرستوں اور خود غرضوں کی اس نباتات سے پیداوار کی کہ ملک بھر میں ان لوگوں کی منڈیاں لگ گئیں اور وطن دشمنی کی یہ فصل خود بخود دساور کو زیادہ ہونے لگی اور دفاعی سودوں تک کو اس گندگی نے ناپاک کر دیا۔ جس کے باعث آج راجیو گاندھی ایک گہری دلدل میں دھنستے اور پھنستے ہی چلے جا رہے ہیں اور انھیں سطح پر ابھرنے کیلئے نہ معلوم کس قدر کوشش کرنی ہو گی۔

راجیو جی غالباً اس واقعہ کو بھول گئے کہ جب وہ پائیلٹ تھے تو اس وقت حیدرآباد کے ہوائی اڈے پر آندھرا پردیش کے چیف منسٹر اور ایک دوسرے صنعت کار نے انھیں میس تک پہنچانے کے لئے اپنی اپنی کاریں پیش کیں مگر راجیو جی نے ان خوشامدیوں کا منہ توڑ جواب دیا اور سختی سے یہ پیشکش نامنظور کرتے ہوئے ایک عمری ویلر سکوٹر پر میس تشریف لے گئے اسی سے انھیں خود اندازہ لگا لینا چاہئے تھا کہ جب آپ صرف ہندوستان کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے فرزندِ ارجمند تھے اور ایک سرکاری ملازم' مگر خوشامدیوں نے آپ کو رجھانے میں اس وقت اپنی کوششوں کو بروئے کار لانے میں سلسلہ جنبانی شروع کر دی تھی اور اب جب کہ آپ ملک کے وزیر اعظم ہیں تو ازلی خوشامدی کس کس طرح کی خوشامد میں زمین و آسمان تک کو ایک نہ کر دیں گے

مگر انتہائی افسوس ہے کہ راجیو گاندھی نے

چند ہلکے پھلکے آئینی اختلافات تھے ــــــــــ راجیو

شناسی سے کام نہ لیا یا دوسرے معنوں میں
خوشامدیوں نے انھیں اپنے جال میں ایسے پھانس
آپ نے سمجھ لیا کہ ان کے ہمدرد اور بہی خواہ محض
خوشامدی ہی ہیں اور آپ نے عوام سے اپنا
کافی حد تک توڑ لیا۔ بڑے بڑے الیکشنی جلسوں
موں کے دوروں کے وقت لاکھوں عوام کے
ں سے بھی آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ حالانکہ یہ عوام
اپنے سدا بہار مسکراہٹ والے وزیراعظم کو ایک
جھلک دیکھنے آتے تھے۔ غریبوں اور آدی واسیوں
جھونپڑیوں میں جا کر ان کی تکالیف دریافت کرنے
عوام نے الیکشنی پروپیگنڈہ اور محض دکھاوا سمجھا۔
ہم دل سے چاہتے ہیں کہ راجیو گاندھی اپنے
فکر میں تبدیلی لائیں اور ملک کی صحیح رہنمائی کریں
کیونکہ اس وقت ہمارے پاس راجیو گاندھی
قطعاً موجود نہیں ہے اور نہ ہی یہ ہوسکتا ہے کہ

اب میں صرف کانگریس کا ممبر ہوں ـــــ وشوناتھ پرتاپ سنگھ

راجیو اپنے آپ کو مسٹر کلین ثابت کرکے عوام سے رابطہ قائم کریں، ملک کی خدمت کا جذبہ رکھنے والوں کو آگے لائیں اور عوام کے دلوں میں جو شکوک دفاعی سودوں کے بارے میں صحیح یا غلط طور پر بیٹھ گئے ہیں

انھیں دور کرنے کے لئے مناسب اور واضح طریقے استعمال کئے جائیں۔ کیونکہ راجیو گاندھی اگر وزیراعظم ہیں تو انہیں عوام کی وجہ سے نہ کہ ان ازلی خوشامدیوں کے باعث جو کہ ان کی اِمیج کو خراب کر رہے ہیں۔

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

کمیونسٹ دھرم اور ایمان کے رکھوالے بہت آگے ہیں اور یہ حقیقت ہے جس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج تک کسی بھی کمیونسٹ ملک میں کسی بھی مذہبی کتاب کی توہین نہیں کی گئی

غازی آباد کے کسی بدنصیب عبدالرشید نے نہ معلوم کن حالات میں قرآن مجید کو نذرِ آتش کرنے کی حماقتِ عظیم کی کہ عوام کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ کر اخباروں کو مقبول بنانے کے گُر سے واقف ننگِ صحافت لوگوں کو ایک ایسا بہانہ مل گیا کہ وہ اپنی کمینہ فطرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھولے بھالے عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عبدالرشید یہ ذلیل حرکت کرتے وقت شراب کے نشہ میں ہوش و حواس سے بیگانہ تھا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے خانگی حالات ناگفتہ بہ تھے۔ اس کی بیوی نے اس واقعۂ فاجعہ سے دو تین روز پہلے اس راندۂ درگاہ سے طلاق لے لی تھی جس کی وجہ سے اس نے اسلام اور قرآن سے متعلق اپنی ناراضگی کا اظہار اس بدترین حرکت سے کیا۔ عبدالرشید کا یہ گناہ کبیرہ

اخلاقی، سماجی، مذہبی اور دنیاوی طور پر ناقابلِ معافی ہے اور ملکی قانون میں بھی کسی مذہبی صحیفہ کو نذرِ آتش کرنے کی سزا موجود ہے مگر اسے مسلم عوام نے فوری طور پر قتل کر کے جو سزا دی ہے وہ قانونی طور پر بیشک قابلِ گرفت ہے مگر مسلم عوام نے جس مذہبی ذمہ داری بلکہ برق رفتاری اور اپنے مذہبی عقائد کی مضبوطی کے پیشِ نظر یہ قدم اٹھایا ہے وہ ملکی قانون کی قطعی خلاف ورزی ہے اور اسلامی شریعت کے مطابق بھی اس کی سزا صرف اسلامی حکمراں یا اس کا خلیفہ ہی دے سکتا ہے اور اگر عوام قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر از خود ایسے نابکار کو سزائے قتل دیتے ہیں تو اس کے جواز میں صرف یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ عوام نے اشتعال میں آکر ایسا کیا مگر کسی بھی ملکی قانون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ کسی کو اشتعال میں قتل کردیا جائے۔

ویسے اس قسم کے راندۂ درگاہ فرد کو جب عوامی اشتعال کے تحت قتل کر دیا جاتا ہے تو پولیس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی فرد یا افراد کو بغیر ثبوت اور چشم دید گواہان کے گرفتار کر سکے اور ایسے حالات میں گواہی تو درکنار، عام مسلمان تو اگر اپنی زبان سے یہ اعتراف بھی کرے کہ قرآن کریم کو آگ لگانے والے کو اس کے سامنے

قتل کیا گیا تو وہ بھی کافر گردانا جائے گا۔

بہرکیف عبدالرشید کے قتل کا واقعہ تو خالص قانونی معاملہ ہے، مگر عبدالرشید کے اس اقدام کو جو سیاسی موڑ دیا گیا ہے وہ اور بھی قابلِ نفرین ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ کچھ ایسے اخبارات جو مسلمانوں کو بے وقوف بنانے میں اپنی نظیر آپ ہیں انھوں نے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ عبدالرشید کا یہ فعلِ قبیح کمیونسٹوں کی سازش ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ کمیونسٹ غیر کمیونسٹوں کی طرح دھرم اور ایمان پر یقین نہیں رکھتے مگر جہاں تک انسانیت، باہمی اتحاد و اتفاق، ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کرنا اور مل جل کر رہنا، نیز باہمی مساوات کی اقدار کا سوال ہے کمیونسٹ دھرم اور ایمان کے رکھوالوں سے بہت آگے ہیں اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج تک کسی بھی کمیونسٹ ملک میں کسی بھی مذہبی کتاب کی توہین نہیں کی گئی اور نہ ہی کسی انسان سے اس لئے نفرت کی گئی کہ وہ ہندو، مسلمان، یا عیسائی ہے۔ کمیونسٹوں نے خواہ وہ کسی بھی ملک میں ہوں، آج تک کسی بھی مذہب کے معبد یا اس کے پیروکاروں پر حملہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ کمیونسٹ نہیں ہے، ہاں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ اپنا یہ پرچار ضرور کرتے ہیں کہ مذہب کچھ بھی نہیں ہے۔

اور ــــ مذہبی تقسیم بھی فراڈ ہے
ہر انسان کا مذہب ہے عزت سے مساوات کے ساتھ روزی روٹی حاصل کرنا۔
ہم میں کوئی بڑا نہیں ہے اور کوئی چھوٹا نہیں ہے۔

اور ــــ سب کے لئے روزی، روٹی اور مکان کا انتظام گورنمنٹ کا فرض ہے۔

کمیونسٹوں نے آج تک کسی کو اس لئے منع نہیں کیا کہ وہ مندروں، مسجدوں، گوردواروں یا گرجاؤں میں نہ جائیں۔ ہاں وہ نظامِ قدرت کو کسی خدا یا بھگوان کے تحت نہیں مانتے بلکہ نظامِ فلکی، حرکتِ ارضی اور آفاتِ سماوی و ارضی کو صرف اور صرف سائنسی اقدار کے تحت ایک قدرتی نظام قرار دیتے ہیں۔ اور انسان انسان میں فرق نہیں سمجھتے بلکہ دُنیا کے ہر انسان کو انسانی برادری کا ایک فرد سمجھتے ہیں جسے روئے زمین پر عزت و مساوات کے ساتھ جینے کا حق ہے۔

اس نظریۂ کمیونزم سے ہر کسی کو اختلاف رکھنے کا حق ہے مگر ہر بُرائی اور ہر عیب کو کمیونزم کے ساتھ منسلک کرنا نہ تو انصاف ہے اور نہ صحیح۔

غازی آباد کے مسلمانوں نے عبدالرشید کی لاش کو کسی بھی قبرستان میں دفن کرنے پر پابندی لگا دی نہ معلوم پولیس نے اس لاوارث لاش کو ٹھکانے لگانے کے لئے کس مصیبت کا سامنا کیا ہوگا۔

دہلی کے مسلم روزنامے اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جو دساور سے آئے ہیں اور یہ دساوری لوگ اپنے اپنے اخبار کی اشاعت میں اضافہ کے لئے ہر وہ طریقہ استعمال کرنے میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے میں لگے ہوئے ہیں جس سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ بیوقوف بنایا جا سکے۔ اور آج کا مسلمان جس قدر آسانی سے مذہب کے نام پر سادہ لوحی کا شکار ہو سکتا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

قانونِ شریعت مٹ جائے ممکن ہی نہیں ممکن ہی نہیں — اللہ تعالیٰ کرتا ہے لاریب حفاظت قرآن کی

نیک مثال

جناب ہیم وتی نندن بہوگنا نے اپنے فرزندِ ارجمند کی شادی خانہ آبادی کے دعوت نامے اُردو میں پرنٹ کرائے تو اُردو پرست ہندو مسلمانوں نے بہوگنا جی کے اس اقدام کو جہاں اُردو پرستی سمجھا وہاں اسے ہندو مسلم یکجہتی کا اچھا نمونہ قرار دیا تھا۔ حالانکہ یہ محض بہوگنا کا ایک سیاسی اسٹنٹ تھا جو محض مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے رچا گیا۔

مگر اسی ہفتہ حیدر آباد (آندھرا پردیش) کی کائستھ برادری کے ممتاز بزرگ رائے تلجا پرشاد سریواستو نے اپنے فرزند جناب شمبھو پرشاد سابق

میری ام پور چشمی سشنیتا سنگھا

عقدِ مسعود

آپ کی

شرکت محفلِ عقد و تناولِ طعام موجبِ شادمانی

رائے تلجا پرشاد سریواستو

یہ ہے وہ دعوت نامہ

ایم۔ایل۔اے مہاراج گنج کی صاحبزادی مس سیتا کی شادی کے دعوت نامے نہ صرف اردو میں پرنٹ کرائے بلکہ دعوت نامے کی پیشانی کو "بسم اللہ" سے مُزیّن کیا ہے
ہم رائے تلجا پرشاد سریواستو کو مبارکباد دیتے ہیں۔ انھوں نے واقعی ہندو مُسلم بھائی چارے کی مثال پیش کی ہے اور اس کا عملی ثبوت دیا ہے کہ خدا

ہم رائے تلجا پرشاد شریواستو کو مُبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے واقعی ہندو مسلم بھائی چارے کی مثال پیش کی ہے اور اس کا عملی ثبوت دیا ہے کہ خدا کا نام کسی بھی زبان میں لیا جائے وہ موجب برکت ہے

کا نام کسی بھی زبان میں لیا جائے وہ موجب برکت ہے چونکہ یہ تقریب سعید ماہِ رمضان المبارک میں ہے اس لئے اُنھوں نے تمام مہمانوں کے روزہ افطار کے فوری بعد کھانے کا انتظام رکھا ہے
اس مبارک دعوت نامے کا عکس ملاحظہ فرمایئے۔

ہندوستان میں اس وقت جتنی اُردو اکادمیاں ہیں ان سب میں کارکردگی کے لحاظ سے اُردو اکادمی دلی اپنی مثال آپ ہے۔

سیمنار کے ڈائرکٹر صاحبان کا ذاتی معاملہ

دیکھا دیکھی اُردو اکادمی دلّی کے کچھ با اثر اور جوڑ توڑ میں ماہر ممبران نے بھی اُردو اکادمی سے اپنی ذاتی آمدنی کے ذرائع تلاش کر لئے ہیں۔

ایڈیٹر 'شانِ ہند' کو اُردو صحافت کا ایوارڈ ملنے سے روزنامہ انقلاب اور ماہنامہ 'مستانہ جوگی' کو دِلی تکلیف۔
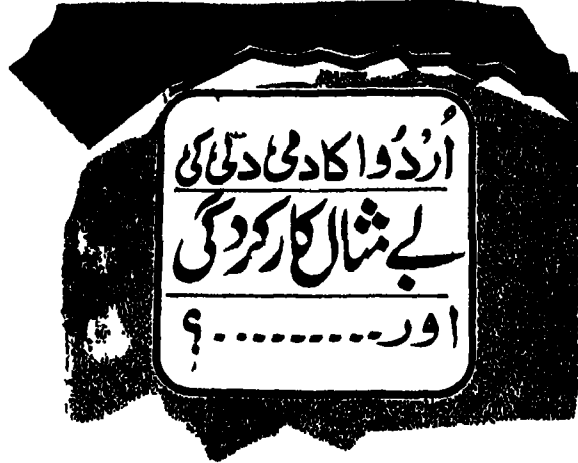
دہلی اُردو اکادمی میں یقیناً کچھ کمیاں ہیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں اس وقت جتنی اُردو اکادمیاں ہیں اُن سب میں کارکردگی کے لحاظ سے دِلی اُردو اکادمی اپنی مثال آپ ہے۔ سال ۱۹۸۶-۸۷ء میں اکادمی کے تحت جس قدر سیمینار منعقد کئے گئے وہ نہایت ضروری موضوعات پر تھے اور اپنی نوعیت، افادیت اور مقبولیت کے لحاظ سے یقیناً کامیاب تھے۔ بے شک یہ سیمینار عام لوگوں کے لئے غیر دلچسپ تھے مگر عصری ضرورت کا تقاضا تھا کہ یہ سیمینار منعقد کئے جاتے۔ اس سال "دِلی والے" سیمینار منعقد نہیں کیا گیا اور یہ غالباً اس لئے کہ اس کے کرتا دھرتا ڈاکٹر صلاح الدین صاحب ہوا کرتے تھے۔ حالانکہ یہی ایک ایسا سیمینار تھا جو عوامی دلچسپی کا حامل تھا اور اس سیمینار میں ڈاکٹر صلاح الدین اکثر ایسے حضرات کے لئے بھی کچھ مالی انتظام کر دیتے تھے جنھیں اچکن سلوانے یا بیوی کے لئے چاندی کی پازیب بنوانے، بیمار بیوی یا بچوں کے لئے دوا خریدنے یا کچھ دنوں کے لئے بوتل اسکاٹ شراب خریدنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب انور دہلوی نے اپنی نگرانی میں ہونے والے سیمیناروں میں صدارت اور نظامت کے فرائض بھی ایسے لوگوں کو سونپے جنھیں قدرت نے دانشور رکھا ہے اور انھیں ممنون کرنا بھی ایک مقصد تھا۔ رہے مقالے پڑھنے والے حضرات تو وہ متعلقہ موضوع پر بے شک بہتر انداز میں مقالے لکھنے میں کامیاب رہے مگر ان میں بھی اکثریت ایسے اصحاب کی تھی جنھیں کئی وجوہ پر زیر بار احسان کرنا سیمینار کے ڈائریکٹر صاحبان کا ذاتی معاملہ تھا۔ تعلیم سے متعلقہ کمیٹی کی کارگزاری بہت اچھی رہی۔ اُردو میڈیم اسکولوں میں اُردو پڑھنے اور اُردو پڑھانے والوں کی دیکھ ریکھ کے علاوہ بالغوں کے لئے اُردو پڑھانے کا انتظام قابلِ تعریف رہا۔ اُردو پڑھانے والوں کی تقرری میں پہلے سے کم سفارشی لوگوں کو لیا گیا۔ اُردو میڈیم اسکولوں کی لائبریریوں میں اُردو کُتب اور اُردو رسائل کی بہم رسانی سے متعلق جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُردو کے ایسے رسائل جنھیں پڑھنے کے لئے اسکولوں کے اساتذہ اور طلبا کو دلچسپی ہے اُنھیں یہ کہہ کر کم تعداد میں خریدا جاتا ہے کہ وہ اسکول کے اساتذہ اور طلبا کی علمی قابلیت کے مطابق ہی کسی رسالے کی تعداد خریداری کا تعین کیا جاتا ہے۔ مگر شاید ڈاکٹر محمد حسن کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ "عصری ادب" ہر اسکول کے لئے خریدنا اس لئے ضروری ہے کہ یہ اُردو اکادمی کے ایک ممبر کا رسالہ ہے۔ وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ ہائر سیکنڈری کے اسکولوں کے اُردو طلبا "عصری" کے لفظی معنوں سے بھی نا آشنا ہیں۔ نہ معلوم "ستارے" ہر اسکول میں جاتا ہے یا نہیں، کیونکہ اسکول کے اساتذہ اور طلبا سب سے زیادہ فلمی رسالے

پسند کرتے ہیں۔ ہمارے کرم فرما حاجی انیس صاحب مالک وایڈیٹر فلمی ستارے بھی اُردو اکادمی کے ممبر ہیں۔ اگر فلمی ستارے اسکولوں کے لئے انہیں خریدا جاتا تو انہیں احتجاج کرنا چاہئے کیوں کہ آج کثرت ایسے اُستادوں اور طلبار کی ہے جو مذہبی یا تعلیمی معلومات کے بجائے فلمی معلومات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ "رہنمائے تعلیم" جیسا ماہنامہ جو کچھ سالوں سے تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے اُسے صرف ۳۰۔ ۳۱ رکی تعداد میں خریدا جاتا ہے جبکہ تعلیم سے غیر متعلقہ عصری ادب وغیرہ کی ۵۸۔ ۵۸ کاپیاں خریدی جاتی ہیں۔

میونسپل کمیٹی، میٹروپالیٹن کے ممبران، ممبرانِ اسمبلی، ممبرانِ پارلیمنٹ کے بارے میں عام طور پر یہ رائے پائی جاتی ہے کہ اکثر ممبران ذاتی آمدنی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی اُردو اکادمی دلی کے کچھ با اثر اور جوڑ توڑ میں ماہر ممبران نے بھی اُردو اکادمی سے اپنی ذاتی آمدنی کے ذرائع تلاش کر لئے ہیں کیا غضب ہے کہ جو حضرات اکادمی کی ممبری سے پہلے اچھے بھلے عام انسانوں کی طرح تھے اُردو اکادمی کے ممبر بنتے ہی ان میں دُنیا بھر کی خوبیاں عود کر آئیں یہ ایک الگ موضوع ہے انشاء اللہ ہم بہت جلد اس سلسلے میں تفصیلی طور پر روشنی ڈالیں گے۔

پبلی کیشن کمیٹی نے اچھی خاصی کتابیں شائع کی ہیں ان میں سے اکثر وہ کتابیں ہیں جن میں اکادمی کے تحت ہوئے سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کو جمع کر دیا گیا ہے تاکہ ڈائرکٹران سمینار کو اُن کتابوں کی فروختگی سے بھی رائلٹی ملتی رہے کیونکہ یہ کتابیں انہی ڈائرکٹر صاحبان نے ہی ترتیب دی ہیں۔ کچھ کتابیں ایسی ہیں جو دلی سے متعلق تھیں اور عرصہ سے نایاب تھیں مگر ان کتابوں کے مرتبین بھی اکادمی کے ممبران ہی ہیں تاکہ انھیں دوسروں کی محنت کا پھل کھانے کو مل سکے۔ ایک دو حضرات کو اکادمی کے ممبران کے علاوہ بھی لیا گیا ہے وہ بھی اسی جذبہ کے تحت کہ انہیں فائدہ پہنچانا مطلوب ہے کتابوں کی چھپائی وغیرہ کے بارے میں جو عوام کو شکایات ہیں اُن کی تفصیل پر بھی بہت جلد بحث کی جائے گی۔

اس بات سے انکار نہیں ہے کہ خواہ ساہتیہ اکادمی ہو یا غالب انسٹی ٹیوٹ یا کوئی اور ادارہ، اردو ایوارڈ دیئے جانے میں سفارشی تانے بانے کچھ اس انداز سے بُنے جاتے ہیں کہ عوام بڑی آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایوارڈز کا فیصلہ کن کن شاطر حضرات کی شاطرانہ چالوں کا رہینِ منت ہے مگر یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ امسال دلی اُردو اکادمی نے ایوارڈز کا فیصلہ کرنے میں کسی رُو رعایت کو درمیان میں نہیں آنے دیا۔ یہ مت سمجھئے کہ اس سال راقم السطور کو اُردو صحافت کا ایوارڈ دیا گیا ہے تو اس لئے اکادمی کے ایوارڈز کے فیصلہ کو صحیح کہا جا رہا ہے، ہرگز نہیں اگر کوئی مائی کا لال یہ ثابت کر دے کہ دلی میں کوئی اور ایسا اُردو صحافی تھا جس کی اُردو خدمات مدیرِ "شانِ ہند" سے بہتر تھیں اور اس کا حق تلف کر کے یہ ایوارڈ مدیرِ "شانِ ہند" کو دیا گیا ہے تو راقم السطور یہ ایوارڈ بخوشی واپس کر کے لیفٹننٹ گورنر سے التجا کرے گا کہ یہ ایوارڈ اس صحافی کو دیا جائے جس کی حق تلفی ہوئی ہے۔ ویسے دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے مگر ایڈیٹر "شانِ ہند" کو اُردو صحافت کا ایوارڈ ملنے سے روزنامہ "انقلاب" اور ماہنامہ "مستانہ جوگی" کو دلی تکلیف ہوئی ہے۔ مدیرِ "شانِ ہند" مجبور ہے کہ ان دونوں موقر ہم عصروں کی اس تکلیف کا مداوا اس کے پاس نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی انہیں صبر عطا کر سکتا ہے کیونکہ اللہ کا ہی یہ فرمان ہے کہ حاسدوں کو نہ اس دُنیا میں اور نہ اُس دنیا میں چین نصیب ہوگا۔

اُردو اکادمی نے اس سال کلچرل پروگراموں میں خاصی کمی کا مظاہرہ کیا ہے گذشتہ دو سالوں میں اکادمی نے کلچرل پروگراموں اور مشاعروں کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ جس سے ذوقِ سلیم رکھنے والوں کو کافی گرانی محسوس ہو رہی تھی۔ سُننے میں آیا تھا کہ اکاڈمی کے چیئرمین جناب لیفٹننٹ گورنر نے بھی اس پر خفیف سی ناگواری کا اظہار فرمایا تھا۔ بہر کیف چار بیت کا پروگرام اکادمی کو ضرور کرانا چاہئے اور اس کے لئے ٹونک کی ٹیموں کا مدعو کرنا اس پروگرام کی کامیابی کی دلیل ہوگا۔

ہم بلا خوفِ تردید یہ کہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں کہ دلی اُردو اکادمی نے بحیثیتِ مجموعی قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ یہاں تک کہ گورنر اُتر پردیش جناب محمد عثمان عارف صاحب نے دو مرتبہ بالمشافہ ایڈیٹر "شانِ ہند" سے فرمایا کہ اُن کا یہ تہنیتی پیغام جناب لیفٹننٹ گورنر تک پہنچا دیا جائے کہ اُن کے زیرِ نگرانی دلی اُردو اکادمی جو بہترین کام کر رہی ہے اس کی مثال ہندوستان بھر کی اُردو اکادمیوں میں نہیں مل سکتی۔ گورنر صاحب یو۔پی نے یہ بھی فرمایا کہ انھوں نے مسٹر اطہر نبی ممبر اردو اکادمی اتر پردیش سے فرمایا کہ وہ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے خرچہ پر کچھ دنوں کے لئے دلی جائیں اور جناب شریف الحسن نقوی مشیر اُردو اکادمی دلی سے سیکھیں کہ اکادمی اُردو کی خدمت کس طرح کر سکتی ہے۔ اور جو کچھ دلی اُردو اکادمی خدمتِ اُردو کر رہی ہے اس کے نقشِ قدم پر اُتر پردیش اُردو اکادمی کو چلایا جائے۔

مگر افسوس ہے کہ ہمارے لیفٹننٹ گورنر کے سکریٹریٹ میں نہ معلوم کون سا ایسا اُردو دشمن براجمان ہے کہ جو اس قسم کے خطوط جناب لیفٹننٹ

ہمارے لیفٹننٹ گورنر کے سکریٹریٹ میں نہ معلوم کون سا ایسا اُردو دشمن ہے کہ جو اس قسم کے خطوط جناب لیفٹننٹ گورنر تک پہنچنے ہی نہیں دیتا۔
ایک خاص انتظامی سلسلے میں ایک عرضداشت ایل جی کی خدمت میں رجسٹرڈ بھجوائی گئی تھی۔ نہ معلوم ایل جی صاحب کو مل سکی یا نہ مگر اُن لوگوں کو چوتھے روز ہی خبر مل گئی جن کے بارے میں یہ عرضداشت بھجوائی گئی تھی۔ جبکہ یہ عرضداشت ترجمہ سیکشن کے چکر کاٹ رہی تھی

گورنر تک پہنچنے ہی نہیں دیتا۔ اُردو اکادمی کی مختلف کمیٹیوں کی رپورٹ جو ایل۔ جی صاحب کو بھجوائی جاتی ہے اس کی بازگشت اُسی شام کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سنائی دینے لگتی ہے مگر ایسے خطوط جن میں ایل۔ جی۔ سے خصوصی طور پر کسی مسئلہ کے بارے میں گذارش کی جاتی ہے وہ اُن کی نظروں تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ کیا غضب ہے کہ ایسے خطوط کے نفسِ مضمون کا چرچہ عام لوگوں کی زبانی سُننے کو مل جاتا، مگر ایل جی صاحب کے ہاں سے اس کا جواب موصول نہیں ہوتا۔ اگر ایل جی صاحب چاہیں تو ہم اس کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ ایک خاص انتظامی سلسلے میں ایل۔ جی کی خدمت میں ایک عرضداشت رجسٹرڈ بھجوائی گئی۔ نہ معلوم ایل۔ جی صاحب کو مل سکی یا نہ مگر ان لوگوں کو چھٹے روز ہی خبر مل گئی جن کے بارے میں یہ عرضداشت بھجوائی گئی تھی۔ جبکہ یہ عرضداشت ترجمہ سیکشن کے چکر کاٹ رہی تھی۔ ہمارے ایل۔ جی صاحب اُردو بہتر طور پر لکھ پڑھ سکتے ہیں پھر اسے تمام اُردو میں لکھی گئی عرضداشت کو ترجمہ سیکشن میں بھجوانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسی طرح ہم نے گورنر اُترپردیش کے تہنیتی پیغامات کی اطلاع ایل۔ جی صاحب کی خدمت میں بذریعہ ڈاک بھجوائی اور یقیناً وہ اُن تک نہیں پہنچی۔ محض اس لئے کہ یہ اُردو اکادمی کی تعریف تھی۔

ہندی اکادمی دلی روشن مستقبل کی طرف

دِلی ہندی اکادمی جہاں ہندی زبان کی ترویج اور اشاعت میں اپنا فرضِ منصبی پورا کر رہی ہے وہاں وہ عوام کو اُن مہان ہستیوں کی بھی یاد تازہ رکھنے کے اسباب مُہیا کرتی ہے جنھوں نے ملک کی خدمت کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کو نہ صرف زندہ رکھا، بلکہ اسے عوامی زبان بنانے میں اپنا جیون تک نثار کر دیا۔ ہندی اکادمی دلی نے تعلیمی سمینار، ترجمہ سمینار، اچاریہ ہزاری پرساد دویدی سمینار، بھارتیندو سمینار، ڈاکٹر راجندر پرساد جنم شتابدی اجلاس، ہندی ٹیچرز کانفرنس، سنسکرت سمینار، ہندی زبان کے کارکنوں کی کانفرنس، ہندی اور قومی یکجہتی وچار گوشٹھی، ساہتیہ اور سوہارد سنگوشٹھی، بھاشا بھارتی یوجنا کے تحت لسانی و جذباتی یکجہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کی ترقی کے لئے قابلِ قدر کوششیں، ہندی کے بیس بسنت کا دو دن کا اجلاس اور کوی سمیلنوں کا انعقاد یوم جمہوریت پر قومی کوی سمیلن کے علاوہ درجنوں ایسے بہترین پروگراموں کے باعث ہندی اکادمی نے نہ صرف دِلی بلکہ ملک بھر کے ہندی پریمیوں کے دل موہ لئے ہیں۔

ہندی ادیبوں کو اعزازات، ہندی ادبی نگارشات پر انعامات، اُم[illegible] ہوئے قلم کاروں کے لئے انعامی مقابلے، ریسرچ اسکالروں کے لئے وظائف، ہندی ادیبوں کی مالی معاونت، ہندی کے طالب علموں کو انعامات کیساتھ ساتھ چھوٹے اخبارات و رسائل کی حوصلہ افزائی، بچوں کے لئے دلکش ادب کے لئے ہر ممکن کوشش، بیسیوں طریقوں سے ہندی کو مقبول و عوامی زبان بنانے کے لئے ہندی اکادمی کی مخلصانہ کوششوں کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے

ڈاکٹر نارائن دت پالی وال کی خدمات کی تعریف کرنا ایک ہندی کے خادم اور ہندی پرست کی تعریف کرنے کے مترادف ہے۔ ہندی اکادمی کی یہ ادا قابلِ تعریف ہے کہ اسے سفارشی اور بھائی بھتیجہ واد کی روزی روٹی کا ذریعہ نہیں بنایا گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا اسٹاف پنجابی اکادمی کے مقابلہ میں ۷۵ فیصدی اور اُردو اکادمی کے مقابلہ میں چالیس فیصدی کم ہے۔ دوسرے معنوں میں دِلی انتظامیہ ہندی اکادمی کو جو پچاس لاکھ یا اس سے زائد روپیہ دیتی ہے وہ واقعی اس کام پر ہی صرف کیا جاتا ہے جس کے لئے یہ دیا گیا ہے یعنی خالص ہندی کی ترویج اور اشاعت پر۔ اور اسکے لئے بھی ڈاکٹر نارائن دت پالی وال عوامی مُبارکباد کے مستحق ہیں۔

کویت بزمِ سخنؔ نے 'شانِ ہند دہلی' (اردو ماہنامہ) کے تعاون سے حال ہی میں جوشؔ اور ساحرؔ ایوارڈ کی تقریب اور آل انڈیا مشاعرہ کا اہتمام آگرہ کے مشہور ہال سور سدن میں کیا۔ تقریب کی صدارت کے فرائض عالی جناب ایم۔ اے خان' اڈیشنل سیشن جج آگرہ نے انجام دیئے۔ اور ایس۔ ایم۔ نقوی ڈائریکٹر ایمپلائمنٹ آگرہ' ایسی ادبی شخصیت مہمانِ خصوصی تھی۔ پروگرام کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے کیا گیا۔ کویت سے آئے ہوئے بزم کے جنرل سکریٹری پروفیسر فریدؔ قریشی سحرؔ اکبرآبادی نے صدر' مہمانِ خصوصی اور تمام شعرا حضرات کا زری اور پھولوں کے خوبصورت ہاروں سے استقبال کیا۔ بزم کی جانب سے نایاب شیلڈ بطور اعزاز و یادگار تمام شاعروں کو عطا کی گئی۔ سحرؔ اکبرآبادی نے اِس انعامی تقریب کا اہتمام آگرہ میں اس لئے کیا کہ وہ اکبرآباد میں پیدا ہوئے اور تقریباً چالیس سال کے بعد آگرہ کی سرزمین پر قدم رکھ رہے تھے جہاں اُن کا اسکول اور کالج کا زمانہ گذرا ہے۔ پُرانے ساتھیوں سے بھی ملاقاتیں متوقع تھیں۔ سحرؔ اکبرآبادی نے تقریب کے صدر جناب خان صاحب سے گذارش کی کہ وہ اپنے مُبارک ہاتھوں سے جوشؔ اور ساحرؔ ایوارڈ پانے والے شاعروں کو ایوارڈ دیں۔ چنانچہ جوشؔ ایوارڈ کا پہلا انعام قمرؔ مرادآبادی' دوسرا انعام ابدؔ سرہندی اور تیسرا انعام فہیم انورؔ بھوپالی کو دیا گیا۔ اور ساحرؔ ایوارڈ کا پہلا انعام شری جیون سرن نازؔ مانک پوری' دوسرا انعام آبدؔ سرہندی اور تیسرا انعام نسیمؔ جیرتی کو دیا گیا۔ یہ تمام انعام ایک ہزار ڈالر کے تھے جو اِن چھ شاعروں میں تقسیم کر دیئے گئے

سامعین نے ہر شاعر کا تالیاں بجا کر استقبال کیا اور مُبارکباد دی۔

آگرہ کی ایک ممتاز اور اعلیٰ فنکارہ ڈاکٹر محترمہ چترا سچان سے گذارش کی گئی کہ وہ "گلدستۂ غزل" کا اِجرا کریں۔ یہ گلدستۂ غزل جوشؔ اور ساحرؔ کے طرحی مصارع پر طرحی غزلیات کہنے والے ۱۴۴ شاعروں کی ۲۲۸ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس خوبصورت تحفہ کو سحرؔ اکبرآبادی نے اپنی جانب سے اس تقریب میں حصّہ لینے والے تمام شاعروں کو بغیر کسی قیمت کے پیش کیا۔ سحرؔ صاحب نے آگرہ کی تین ادبی انجمنوں کو اعزازی شیلڈ دینے کا اعلان کیا۔ آگرہ کی ممتاز شخصیت پروفیسر مرغوبُ الزّماں چیرمین استقبالیہ کمیٹی نے سحرؔ صاحب کی درخواست پر بزمِ نظیرؔ' بزمِ اقبالؔ اور انجمن چراسی کو اعزازی شیلڈ سے نوازا۔ اور ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ مرزا شمیم بیگ سکریٹری استقبالیہ کمیٹی کو ایک خصوصی اِنعام "ٹرانسسٹر" پروگرام کے مرتب کرنے پر دیا گیا۔ مضطرؔ صحرائی کو ایک ہزار روپیہ کا نقد انعام سحرؔ صاحب کی جانب سے دیا گیا کیونکہ اُنھوں نے "گلدستۂ غزل" ترتیب دینے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ پروگرام کے کنوینر جناب سرورؔ تونسوی کا استقبال عزیز الدّین وارثی اکبرآبادی نے کیا۔ سرورؔ تونسوی نے بزم کے جنرل سکریٹری پروفیسر فرید قریشی سحرؔ اکبرآبادی کا شکریہ ادا کیا اور اُنھوں نے کہا کہ 'کویت بزمِ سخن' کے وعدے کو نبھانے میں سحرؔ اکبرآبادی نے جس فراخدلی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے وہ واقعی ایک مثالی کردار ہے۔ اُن کا یہ کردار اُردو ادب کی تاریخ میں ایک سنہری باب کی حیثیت رکھتا ہے اور اُن کی ادب نوازی کو ہندوستان والے کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نظامت کے فرائض سحرؔ اکبرآبادی نے انجام دیتے ہوئے مُشاعرے کا آغاز کیا ہے۔ سب سے پہلے مقامی شاعرہ افروز جہاں افروزؔ کو زحمتِ کلام دی گئی۔ ان کو سامعین نے نہایت خاموشی سے سُنا اور اس شعر پر اُن کو اچھی خاصی داد ملی ؎

یہاں ہے جس زباں میں آوازِ انقلاب
دُنیا یہ جانتی ہے وہ اُردو زبان ہے

تالیوں کی گونج میں مرادآباد کے نوجوان شاعر جناب کشورؔ عثمانی کو مائیک پر مدعو کیا گیا۔ اُن کا اندازِ تخاطب

اور اشعار پڑھنے کا انداز بہت اچھا تھا۔ لوگوں نے دل کھول کر اُن کے اشعار پر داد دی اور یہ قطعہ اُن سے بار بار پڑھوایا گیا ؎

غنچوں کی طرح تم بھی چٹکنا سیکھو
ڈالی کی طرح تم بھی لچکنا سیکھو
اِس باغِ محبت میں رہو مثلِ نسیم
پھولوں کی طرح تم بھی مہکنا سیکھو

مائیک سے آواز آئی کہ کشور عثمانی کے بعد ہم ایک اور نوجوان شاعر شاہد انور دہلوی کو زحمتِ کلام دے رہے ہیں۔ اُن کا ترنم منجھا ہُوا اور اشعار اتنے عمدہ تھے کہ سامعین ہر شعر پر تالیوں سے داد دے رہے تھے۔ مکرر ارشاد کی آوازیں ہال میں گونج رہی تھیں۔ یہ اشعار سامعین کو بہت پسند آئے، ملاحظہ فرمائیں ؎

" قید میں رہ کے بھی اُڑ جاتے ہیں اُڑنے والے
اُن پہ ناکام ہیں صیّاد کی تدبیریں بھی
خود بخود ٹوٹنے لگتی ہیں بکھر جاتی ہیں
موسمِ گل کا پتہ دیتی ہیں زنجیریں بھی "

داد و ستائش کی تالیوں کی گونج ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اکبر آباد کے معروف شاعر اقبال رامپوری کا نام مائیک سے پکارا گیا۔ یہ شاعر نئے جوش اور ولولے سے اپنا کلام سناتا رہا اور داد پاتا رہا۔ انھوں نے کہا کہ جناب کے لوگوں کی زبوں حالی ملاحظہ فرمائیں ؎

" پھول سب سُرخ آندھی اڑا لے گئی
ہاتھ ملتے ہوئے باغباں رہ گئے "

اِس کے بعد دہلی کے صاحبِ دیوان شاعر جناب چرخ چینوٹی کو دعوتِ کلام دی گئی۔ یہ بزرگ شاعر، روایتی شاعری کا قائل، قدرت سے شعر کہتا ہے ملاحظہ فرمائیں ؎

" برگ و باراں کی طرح ہم سے تعلق رکھو
پردہ داری بھی رہے آنکھ مچولی بھی رہے
قتل کرنا ہے تو مہندی بھرے ہاتھوں سے کرو
رنگِ اُلفت بھی رہے خون کی ہولی بھی رہے "

سامعین نے چرخ چینوٹی کو بھرپور داد دیتے ہوئے رخصت کیا۔ اِس کے بعد اکبر آباد کے ایک اور اچھے شاعر جناب حسن تاج گلی کو زحمتِ کلام دی گئی۔ وہ دیوانہ وار آئے اور فرزانہ وار یہ کہتے ہوئے مائک سے رخصت ہوئے ؎

" دیوانہ اُسے آخر کیوں مان لیا جائے
جو عام طریقے سے پہچان لیا جائے "

مائیک سے اسٹیج سکریٹری نے بیرونی شاعر جناب اقبال بھارتی کا نام پکارا۔ اقبال بھارتی کا پڑھنے کا انداز نرالا تھا اور اشعار بھی زوردار تھے۔ سامعین کو اُن کا یہ شعر بہت پسند آیا ؎

" کیسے سجے ہیں کوچہ و بازار دیکھنا
مایوس پھر رہے ہیں خریدار دیکھنا "

ابھی لوگ اس شعر کا مزہ لے رہے تھے کہ مائیک سے آواز آئی " ہم شاہجہاں پور کے معروف شاعر جناب اختر شاہجہاں پوری کو زحمتِ کلام دیتے ہیں۔ انھوں نے محفل پر ایک خاص اثر چھوڑا اور سامعین چند لمحے اُن کا یہ شعر گنگناتے رہے ؎

" اختر اُس آدمی کی پرستش کیا کرو
جو دوسروں کے پاؤں کا کانٹا نکال دے "

بات بڑی پیاری تھی، انسانیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اختر صاحب مسرور و شادماں مائیک سے واپس لوٹے۔

سحر اکبر آبادی نے سامعین کی توجہ اِس طرف مبذول کرائی کہ لیجئے ہم اکبر آباد کی ادبی محفلوں کی جان اور " عکس ریز" کے خالق جناب اسرار اکبر آبادی کو زحمتِ کلام دیتے ہیں۔ اسرار صاحب مائک کی طرف آرہے ہیں۔ تالیوں کی گونج سے اُن کی آمد کا استقبال کیا گیا۔ اُنھوں نے اپنی آواز کا جادو جگایا کیونکہ اُن کے اشعار خود بخود لوگوں کے دلوں کی زینت بنتے جا رہے تھے۔ اسرار اکبر آبادی کا یہ پیغام بہت پسند آیا ؎

" اک دُوسرے کو دیکھیں وعدہ بھی کوئی کر لیں
محفل کے بعد ہم کو تنہائیاں ملیں گی "

ابھی اِس اچھے شاعر کے اشعار سامعین کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ مائیک سے آواز آئی کہ قمر مرادآبادی کے صاحبزادے جناب کاشف مرادآبادی سے التماس ہے کہ وہ مائیک پر تشریف لائیں اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمائیں۔ کاشف مرادآبادی نے اپنے خوبصورت ترنم سے، اپنے اشعار سے محفل میں کیف بھر دیا۔ ہال میں چاروں طرف سے واہ واہ کی آوازیں سُننے میں آرہی تھیں۔ ہر شعر پر مکرر ارشاد کے قہقہے ہال میں گونج رہے تھے۔ سامعین سے انھیں بہت پسند کیا۔ ایسا لگا جیسے اُنھوں نے آج کا مشاعرہ لوٹ لیا ہو۔ ان کے چند شعر چھوٹی بحر کے ملاحظہ فرمائیں ؎

" ایک مغرور انسان کو	ڈھلتا سورج دکھا دیجئے
میرا قاتل نہ دیکھے کوئی	ساری شمعیں بجھا دیجئے
دورِ پتھر کا پھر آگیا	کس کو کاشف صدا دیجئے "

اب مشاعرہ اپنے شباب پر تھا کہ ڈاکٹر محترمہ ششی تیواری کو زحمتِ کلام دی گئی۔ سامعین کے کانوں میں ابھی کاشف مرادآبادی کی میٹھی آواز رس گھول رہی تھی کہ محترمہ ششی تیواری نے اپنے خوبصورت ترنم سے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اُنھوں نے اپنے کلام کا آغاز یوں کیا ؎

" زندگی پیار ہوئی جاتی ہے	پھول سے خار ہوئی جاتی ہے
شرط یہ کیسی لگائی تُو نے	جیت بھی ہار ہوئی جاتی ہے "

سامعین کی فرمائش پر اُنھوں نے گیت اور نغمے بھی سُنائے اور ایک خوبصورت غزل۔ پھر ہال میں ہر سُو کیف کے بادل چھائے ہوئے تھے کہ مائک سے ایک آواز اور اُبھری کہ اب ہم خوش گلو شاعر جناب تعلق اکبرآبادی کو زحمتِ کلام دیتے ہیں۔ اُن کا رنگِ تغزل پرانا تھا، مگر پھر بھی داد لے گئے۔ فرماتے ہیں ؎

" بے ارادہ وہ جب سامنے آگئے
یوں لگا جام سے جام ٹکرا گئے "

اِس کے بعد سحر صاحب نے مائیک پر تشریف لانے والے دُوسرے شاعر جناب شاہد رتلامی کا خوبصورت تعارُف کرایا۔ اس سے اپنی کویت کی قربتوں کا اظہار کیا اور کہا کہ رتلام کا یہ مشہور معروف شاعر اپنا جواب نہیں رکھتا، جدید رنگ میں شاعری کرتا ہے۔

سحر صاحب کے تعارف نے سامعین کو بے حد متأثر کر دیا۔ سامعین نے بڑے انہماک سے شاہد رتلامی کا کلام سُنا اور ہر شعر پر اُن کو داد ملتی رہی۔ اُن کے یہ دو اشعار خوب تھے ؎

" آگ سے ربطِ محبت کا بڑھاتے کیوں ہو
موم کا جسم لئے دھوپ میں جاتے کیوں ہو
چھین لو وقت کے ہاتھوں سے مسرت کے چراغ
زندگی غم کے اندھیروں میں گنواتے کیوں ہو "

ہال میں شاہد رتلامی کے اشعار کافی دیر تک گونجتے رہے۔ وہ آئے اور لوگوں کو تڑپا کے چلے گئے۔ کبھی کبھی ایسے اچھے اشعار سُننے کو ملتے ہیں جو ہر دل کو تڑپا دیں۔ ہم اُن کے ممنون ہیں۔ اجازت ہو تو یہ شام اُن کے نام کر دی جائے۔

اسٹیج سکریٹری نے کہا اب ہم انعام یافتہ شاعر جناب فہیم انور بھوپالی کو زحمت کلام دیتے ہیں مگر وہ کوئی خاص رنگ نہ جما سکے اور سامعین کو شک ہونے لگا کہ انعامی غزل اس نوجوان نے خود کہی بھی ہوگی؟ جوش ایوارڈ کے انعام یافتہ یہ کہتے ہوئے مائک سے رخصت ہوئے ؎

زندگی تو ہی بتا تجھ کو کہاں پھینک آئیں
تو نے تو ہم کو کسی کام کا رہنے نہ دیا۔
اپنی کم مائگی جرأت و ہمت نے فہیم
روبرو دوست کے اک حرف بھی کہنے نہ دیا "

فہیم انور بھوپالی مائیک سے رخصت ہوئے۔ رتلام کے معروف اور بزرگ شاعر "روحانی آبشار" کے خالق جناب بسمل نقشبندی کا اسم گرامی نہایت ادب و خلوص کے ساتھ پکارا گیا۔ ان کا دیوان ہندوستان میں کافی مقبول ہو رہا ہے۔ یہ شاعر نت نئے انداز اور ندرت و جدّت سے شعر کہتا ہے۔ وقت کے رِستے ہوئے زخموں پر نشتر لگاتا ہے ملاحظہ فرمائیں اُن کے یہ اشعار جو سامعین کی توجہ کا مرکز بنے ؎

" پھول کیسے مرجھائے ڈالیاں بتائیں گی
یا یہ سوکھی سوکھی سی کیاریاں بتائیں گی
فرض ہیں کہ لعنت ہیں یہ جہیز کی رسمیں
یہ غریب لوگوں کی لڑکیاں بتائیں گی "

شاعر سامعین کو سکتہ کے عالم میں گہری سوچ میں چھوڑ کر مائیک سے رخصت ہوئے اور لوگ تالیاں بجانا بھول گئے۔ یہ داد کا انداز بھی نرالا تھا۔ ابھی ہال میں خاموشی تھی کہ جودھپور کے مشہور شاعر نظام جودھپوری کو زحمت کلام دی گئی۔ یہ منچلا اور زود گو شاعر اپنی خوبصورت اور زوردار آواز میں خوبصورت اشعار کے ساتھ مائیک پر گرجا اور سامعین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔ خوب آواز ہے، خوب شعر کہتا ہے اور پڑھنے کا انداز بھی کافی زوردار ہے۔ سامعین نے اس شاعر کو خوب اچھی طرح سُنا اور واہ واہ کی آوازوں سے شاعر کا دل خوش کر دیا۔ یہ اشعار سامعین کو بہت پسند آئے ؎

جانے کیسی پندار رکھتا ہے — اپنی پلکوں کو بند رکھتا ہے
ساتھ والے خفا خفا سے ہے — کیوں ارادے بلند رکھتا ہے
کہاں جاتی ہیں بارش کی پھواریں — شجر پر ایک پتہ بھی نہیں ہے

یہ شاعر سامعین پر چھا گیا اور خوب داد لے کر مائیک سے رخصت ہوا۔ اس مُراد آباد کے ایک اور صاحب دیوان شاعر "اعتراف" کے خالق، اپنی آب و تاب کے ساتھ مائیک پر نمودار ہوئے۔ آتے ہی محفل میں ہلچل مچا دی اور واہ واہ کی آوازوں سے ہال گونج گیا۔ یہ اشعار سامعین کو بہت پسند آئے اور بار بار، مکرّر ارشاد کی آوازیں آتی رہیں

کھنڈر دیارِ وفا کے کُرید کر دیکھو
ہمارے نام کا پتھر ضرور نکلے گا
کیسے پتہ چلے کہ گنہ گار کون ہے
سب بے قصور ہیں تو خطاوار کون ہے
آئینہ ءِ ن کے وقت نے یہ بھی دکھا دیا
کم ظرف کون، صاحب کردار کون ہے۔ "

ابھی لوگ گوہر عثمانی کے اشعار کا مزہ لے رہے تھے کہ مائیک سے آواز آئی " اب ہم بیرونی شاعر ہیرا نند سوز فرید آبادی کو زحمتِ کلام دیتے ہیں۔ حالانکہ اُن کی غزل عمدہ تھی مگر سامعین کی دلچسپی کا سامان نہ بن سکی اُن کا یہ شعر قدرے سامعین کی توجہ کا باعث بنا ؎

" کسی کے سر پہ کوئی سائباں نہیں ہر شخص
خود اپنی چھاؤں میں بیٹھا دکھائی دیتا ہے "

اس کے بعد ڈاکٹر محترمہ شبنم سری واستوا تشریف لائی ہیں۔ سامعین ان کی آمد پر تالیاں بجا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں " ارشاد... محترمہ شبنم۔

اپنے خوبصورت ترنم سے انھوں نے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ رائیگاں گئی۔ اس لئے کہ سامعین اُن کے اشعار سننے کے موڈ میں نہ تھے۔ اُن کو غزل کے مقطع پر ہی داد ملی ؎

" مرحبا، فلک تستم سے رلانے والا
ہائے کتنا فنکار تھا جانے والا "

سامعین ایک آواز ہو کر بولے " محترمہ تشریف لے جائیے، اور شکریہ کہہ کر محترمہ مائیک سے رخصت ہوئیں اسٹیج سکریٹری نے سامعین سے درخواست کی کہ براہِ

ایک بھائی افغانستان گئے [illegible]
[illegible] سے ایک بھائی [illegible]
[illegible]
" کہنے لگے [illegible]
[illegible]

کرم مشاعرے میں ادب کا خاص طور پر خیال رکھیں ہمیں آپ سے یہی اُمید ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہ کریں گے

اکبر آباد کی ایک اور مشہور شاعرہ ڈاکٹر بی بی شرما کو زحمتِ کلام دی گئی۔ اُن کی خوبصورت آواز نے اُن کے اشعار کو سہارا دیا۔ کیونکہ اشعار کچھ اچھے تھے انھوں نے سامعین پر رنگ جما دیا۔ یہ اشعار سامعین کو پسند آئے ؎

" اب تک نہ سمجھ پائی میں کیسی پہیلی ہوں
ہے ساتھ بھی سارا جگ تن بھر بھی اکیلی ہوں "
شہر احساس میں اک شور بپا لگتا ہے
شب کا سناٹا بھی چیخوں کی صدا لگتا ہے "

مائیک سے بارہ بنکی (لکھنؤ) کے مشہور شاعر ڈاکٹر شمیم قدوائی کا نام پکارا گیا کہ وہ اپنا کلام سامعین کی خدمت میں پیش کریں۔ " موجِ غم " کے خالق شمیم قدوائی اپنا پختہ رنگ تغزل لئے سامعین سے مخاطب ہوئے۔ بزرگ شاعر عمر کے آخری مراحل سے گزر رہا ہے وہ اس کے سوا اور کیا کہتا ؎

" اک زمانہ ہوا جب چوٹ لگی تھی دل پر
مدتیں بیت گئیں ٹیس مگر باقی ہے "

لیجئے اب ایک اور بیرونی شاعر جناب اعتماد کانوری تشریف لائے ہیں، پُرانے روایتی انداز میں اپنی غزل سنا کر مائیک سے رخصت ہوئے۔ غالبؔ کی زمین میں غزل سنائی، اور اُس کا مطلع سامعین کی توجہ کا باعث رہا۔

" بارہا التجا کرے کوئی — وہ نہ مانے تو کیا کرے کوئی "

" رہبرِ اعظم " کے خالق اور ساحر ایوارڈ میں اوّل انعام پانے والے شاعر جناب چندن سرن ناز مانک پوری

کو اب دعوتِ کلام دی جا رہی ہے جس غزل پر آزاد صاحب نے انعام حاصل کیا تھا وہی غزل سامعین کی نذر کی۔ سامعین بڑی توجہ سے اُن کے اشعار سنتے رہے اور خاموش داد دیتے رہے کیونکہ احترام ملحوظِ خاطر تھا اُن کا مطلع پسند کیا گیا ؎

" سکونِ شب ڈگیا شورشِ سحر آئی
چمن کی گریۂ شبنم سے آنکھ بھر آئی "

مائیک سے آواز آئی" اب ہم بھوپال کے ایک اور نامور شاعر جناب عابد راشدی کو تکلیف دے رہے ہیں۔ شاعرانہ ترنم کے ساتھ عابد راشدی نے اپنی غزل سنائی۔ پختہ مشق شاعر کے زوردار کلام پر سامعین واہ' واہ کہتے رہے۔ اُن کا رنگِ تغزل ملاحظہ فرمائیں ؎

" جن کی جانب اٹھ گئی ــــ اُن کی نظر
دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہر ویراں ہو گئے "

کیونکہ مائیک سحر اکبر آبادی کے ہاتھ میں تھا انھوں نے کہا" صاحبِ صدر اگر اجازت ہو تو میں بھی اپنے چند اشعار سناؤں۔ آواز آئی اجازت ہے۔ سحر صاحب نے اپنی زوردار آواز میں چند قطعات سنائے اور محفل میں ایک شور برپا کر دیا۔ اُن کی غزل نے محفل میں خوب کیف چھوڑا اور سامعین بار بار اُن کا یہ شعر سنتے رہے اور واہ واہ کرتے رہے ؎

" تیرے کرم کی بات تھی گھر میرا جل گیا
ورنہ میں جانتا ہوں مرے گھر میں کچھ نہ تھا "

اس کے بعد اکبر آباد کے بزرگ اور اُستاد شاعر جناب اُستاد طفار اکبر آبادی سے گزارش کی گئی کہ وہ اپنا کلام پیش کریں۔ اُنھوں نے نہایت خوبصورت غزل سامعین کی نذر کی جو بہت پسند کی گئی۔ نہایت احترام اور ادب کے ساتھ اس اُستاد شاعر کو مائیک سے رخصت کیا گیا۔ رنگِ تغزل اس شاعر کا ملاحظہ فرمائیں ؎

اب آپ کی گلی کی کوئی آبرو نہیں
اب آپ کی گلی سے گزرنے لگے ہیں لوگ "

جیسے ہی اُستاد طفار اکبر آبادی مائیک سے رخصت ہوئے تو مائیک سے آواز آئی کہ اب ہم ایک اور بیرونی شاعر تحیف دہلوی کو دعوتِ کلام دے رہے ہیں۔ تحیف دہلوی آئے اور اپنی خوبصورت غزل سُنا کر چلے گئے۔ اُن کے اس شعر پر بڑا زوردار قہقہہ لگا ؎

غزل

مجروح سلطانپوری

آبلہ پا کوئی گذرا تھا جو پچھلے سن میں
سُرخ کانٹوں کی بہار آئی ہے اُسکے بن میں

دیکھنا رنگِ بدن یار کے پیراہن میں
چاندنی دودھ سی چھٹکی ہے مرے آنگن میں

میں ہم آغوشِ صنم تھا مگر اے پیرِ حرم
یہ شکن کیسے پڑی آپ کے پیراہن میں

کچھ کچھ آج اسیروں نے کہا تو ہے ضرور
ایک اک گل سے لپٹتی ہے صبا گلشن میں

دیکھنا دیدۂ تر و آمدِ طوفاں تو نہیں
ٹپکی ہے درد کی اک بوند مرے دامن میں

سہل اتنے بھی نہیں اے ستم ایجاد کہ ہم
تھام لیتے ہیں گریبان دِوانے بن میں

حرفِ تسلیم نہیں بازوئے قاتل کا جواب
آخرش مارے گئے خود بھی مسیحا رن میں

ارے ہو تو ذرا دیکھنا تم بھی مجروح
میری آنکھیں وہیں زنداں کے کسی روزن میں

" میکشی اچھی نہیں' لوگوں کو سمجھانے گئے
شیخ جی مسجد سے نکلے سیدھے میخانے گئے "

جس شاعر کو سُننے کے لئے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں ان کا اسمِ گرامی جناب عالم فتحپوری ہے۔ اُستاد شاعر ہیں۔ ان کا باقاعدہ تعارف 'شانِ ہند' کے ایڈیٹر جناب سرور تونسوی نے کرایا' اس کے بعد عالم فتحپوری مائیک پر تشریف لائے۔ جیسے ہی مائیک پر وہ تشریف لائے ہال تالیوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ ان کی شاعری کی دھوم پورے ہندوستان میں ہے۔ عالم صاحب فرماتے ہیں کہ میں تو سمجھا تھا کہ خالص ادبی محفل ہے' سیاست کو یہاں کچھ دخل نہیں مگر جب میں نے گوہر عثمانی صاحب کا یہ مصرعہ سُنا تو میرے دل میں گدگدی ہوئی کہ میں بھی کچھ کہوں اُن کا مصرعہ تھا ؎ تاریخ خود بتائے گی غدار کون ہے "

سامعین ملاحظہ فرمائیں۔ گرج کر بولے ؎

" اب تو چہرے سے حقیقت کی نقابیں اٹھ گئیں
اب بتا اے دوست غدارِ وطن تو ہے کہ میں "

یہ شعر سُننا تھا کہ ہال میں واہ واہ کا شور گونج اُ[ٹھا]
سامعین کی فرمائش پر اُنھوں نے رنگِ تغزل سے بھرپور ا[یک] غزل سامعین کی نذر کی' جسے سامعین نے بہت پسند ک[یا] اُن کے اُستادانہ کلام کو لوگ خاموشی اور احترام سے سُن[تے] رہے۔ رنگِ تغزل ملاحظہ فرمائیں ؎

" یہ بات ترکِ تعلق کے بعد ہم سمجھے
کسی سے ترکِ تعلق بھی اک تعلق ہے "

محترم عالم فتحپوری کو تالیوں کی گونج میں رخصت کیا گیا۔ اس کے بعد مشاعرے کے آخری شاعر اُست[اد] مشیر جھنجھانوی کو دعوتِ کلام دی گئی جن کے سُننے کے سامعین بے چین بیٹھے تھے۔ مشیر جھنجھانوی نے دو رنگ تغزل پیش کیا کہ محفل جھوم جھوم اٹھی۔ مائیک پر آتے فرماتے ہیں کہ یہ شعر میں کویت سے آئے ہوئے سحر اکبر آبادی کی نذر کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

" تم وہاں تنویرِ کعبہ سے جبیں روشن کرو
ہم یہاں ہیں بُت کدہ کی پاسبانی کے لئے "

[illegible]

گئیں سامعین کی فرمائش پر انھوں نے اپنی کئی غزلیں سنائیں لوگوں کو رات کے تین بجنے کا ذرا بھی احساس نہ تھا وہ نشتر صاحب سے فرمائش پر فرمائش کرتے جاتے تھے اور وہ محفل میں کیف برساتے رہے۔ لوگوں کا جی تو یہی کرتا تھا کہ صبح کر دی جائے، مگر نشتر صاحب نے کہا اب یہ میری آخری غزل ہے' حالاتِ حاضرہ سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے لوگوں نے ہر شعر پر اُن کو بھرپور داد دی مگر اُن کا یہ شعر دلوں میں جم کر رہ گیا ؎

ممکن ہے کہ زبان و قلم پر ہوں بندشیں
آنکھوں کو گفتگو کا سلیقہ سکھا لیے "

یہ تقریب آل انڈیا مشاعرہ نہایت خوبصورتی' کامیابی اور کیف کے عالم میں رات تین بجے اختتام پذیر ہوئی۔ صدرِ مشاعرہ جناب ایم۔ اے۔ خان صاحب اڈیشنل سیشن جج آگرہ سے درخواست کی گئی کہ وہ آج کی تقریب پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ انھوں نے سحر اکبرآبادی اور سرور تونسوی کا سب سے پہلے شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے آگرہ میں جوش اور ساحر ایوارڈ کی تقریب اور آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کر کے اکبرآباد کے لوگوں کو بڑی عزت بخشی۔ گو کہ میں نے بہت سی ادبی محفلیں دیکھی ہیں مگر آج کی محفل اس قدر عمدہ اور کامیاب محفل تھی کہ جس کا اظہار لفظوں میں کرنا مشکل ہے رات کے تین بج گئے اور وقت کے گزرنے کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ یہ تقریب کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے میں سحر اکبرآبادی کو جوش اور ساحر ایوارڈ کی جامع اور کامیاب تقریب پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اتنی بڑی تقریب جس میں بیرونی اُنیس شاعر اور دس مقامی شاعر شامل ہوں کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ کوئی معمولی تقریب نہیں تھی اس کے لئے جو کچھ بھی کہا جائے کم ہے۔ سحر صاحب نے کویت سے آ کر آگرہ میں اتنی بڑی تقریب کا اہتمام کیا بہت بڑی بات ہے۔ اس تقریب میں اُن کا خلوص اور ادبی جذبہ کارفرما ہے کہ اُن کے ایک اشارے پر ہندوستان کے کونے کونے سے شاعر آگرہ تشریف لے آئے اور تقریب کو رونق بخشی۔ ہندوستان کے لوگ اور خاص طور پر آگرہ کے لوگ سحر اکبرآبادی کی ادبی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ پروفیسر سحر نے چالیس سال

گزر جانے کے بعد بھی [illegible] اکبرآباد کا نام جو زندہ رکھا ہے مجھی [illegible] کہ انھیں ہم سے بے حد پیار ہے اور وہ چالیس سال کے بعد بھی اکبرآباد کو نہ بھلا سکے۔ میں اہلِ آگرہ کی طرف سے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ ان کو طویل عمر دے اور وہ آگرہ میں ایسی محفلیں سجاتے رہیں"۔

سرور تونسوی ایڈیٹر 'شانِ ہند دہلی' سے اس تقریب پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اس عظیم تقریب کا سہرا سحر اکبرآبادی کے سر ہے۔ انھوں نے یہاں آ کر یہ ثابت کر دیا کہ ادب میں دیواریں نہیں ہوتیں۔ ہم اُن کی ادبی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

اس تقریب کے مہمانِ خصوصی جناب نقوی صاحب مائیک پر تشریف لائے۔ انھوں نے کہا کہ پچیس سال کے اندر اندر آگرہ میں اتنا اچھا اتنا بڑا مشاعرہ ابھی تک نہیں ہوا۔ سحر صاحب نے آگرہ میں یہ مشاعرہ کرا کے اکبرآباد کے لوگوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے۔ جوش اور ساحر ایوارڈ کی تقریب اور آل انڈیا مشاعرہ کا اہتمام آگرہ میں پروفیسر سحر اکبرآبادی کا ایک عظیم کارنامہ ہے جس کو ہم لوگ کبھی بھی نہ بھلا سکیں گے۔ سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ۱۶۴ شاعروں کی دو دو غزلیں خوبصورت "گلدستۂ غزل" میں شائع کرا کے اس دور کے معروف اور نامعروف شاعروں کا ریکارڈ مرتب کر دیا ہے جو مستقبل میں جب کہ تاریخ اُردو ادب لکھی جائیگی تو ان شعراء حضرات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکے گا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی تقریر کا اختتام کروں' میں استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین جناب پروفیسر مرغوب الزماں اور سکریٹری جناب مرزا شمیم بیگ ایڈوکیٹ آگرہ کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں کہ انھوں نے آج کی شب میری کوتاہیوں کو درگزر کر کے مجھے مہمانِ خصوصی بنایا اور مجھے یہ عزت بخشی جس کا میں اہل نہ تھا۔

آخر میں پروفیسر فرید قریشی سحر اکبرآبادی نے صدر صاحب' مہمانِ خصوصی' تمام شعرا حضرات' تمام پروگرام کے منتظمین اور خاص طور پر پروفیسر مرغوب الزماں' مرزا شمیم بیگ' سرور تونسوی اور عزیز الدین وارثی اکبرآبادی کا شکریہ ادا کیا' جن کے تعاون کے بغیر یہ تقریب کامیاب نہیں ہو سکتی تھی جس میں سامعین کا بھی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ یہ مشاعرہ سنا اور مجھے یہ حوصلہ دیا کہ ایسی تقریب پھر آگرہ میں اسی شان سے منعقد کر سکوں۔ جو مان اور پیار آپ لوگوں نے مجھے دیا ہے وہ پیار اور مان میں لیکر کویت واپس جا رہا ہوں"۔

سامعین نے سحر صاحب کو تالیوں کی گونج میں خدا حافظ کہا۔

غزل

مجھے یاد آ رہا ہے وہ شباب کا زمانہ
کبھی عہدِ گل پہ جب تھیں مری نظریں شاہانہ

یہ ستم فراقِ یاراں ذرا تم ہی آ کے پوچھو
کبھی اِک نظر تو دیکھو یہ مرا فراق خانہ

نہ تو کوئی ہمسفر ہے نہ تو ہم رکاب اپنا
نہ کہیں پہ اپنی منزل نہ کہیں رہا ٹھکانہ

نہ وہ سازِ عیش و عشرت نہ تو ناز و ہوش و ہوسے
نہ تو وہ دِل میں ولولے ہیں نہ تو عشقِ والہانہ

وہ جو نغمہ گیں رہا ہو سرِ شاخِ گل چمن میں
اُسے کیا سمجھ میں آئے غمِ ترکِ آشیانہ

یہ عجیب ماجرا ہے تجھے کھو کے کھو گئے ہم
نہ وہ بانکپن نہ لہجہ نہ جھجک کے مسکرانہ

وہی روز و شب ہیں لیکن بخدا دیوان صاحب
نہ وہ شاعری ہے باقی نہ مزاجِ عاشقانہ

ڈاکٹر سید المحمود دیوان
لندن

ہڑک مہلک ہوتا ہے
مگر آپ اسے
روک سکتے ہیں
یہ ہوتا کیسے ہے؟
— ہڑک، پاگل جانور، زیادہ تر کتے کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔
— ہڑک ہوجائے تو موت ہوجاتی ہے۔
کیونکہ اس سے شفا کا کوئی علاج نہیں ہے۔
احتیاطی تدابیر
— ہڑک سے بچا جاسکتا ہے، اپنے تمام پالتو کتوں کو ہڑک کا ٹیکہ لگوائیں۔
— آوارہ کتوں کو پکڑنے اور ختم کرنے میں محکمے کی امداد کریں کیونکہ آوارہ
کتوں کو ہڑک (پاگل پن) لاحق ہوتا ہے اور وہ پالتو کتوں کو کاٹ کر
انہیں بھی اس مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں۔
— اگر آپ کو کتا کاٹ لے تو زخم صابن اور پانی سے اچھی طرح دھو ڈالیں اور
فوراً نزدیکی اسپتال یا شفاخانے میں جائیں۔
ہڑک سے بچاؤ کا ٹیکہ
— ڈاکٹر کے مشورے سے ہڑک سے بچاؤ کا ٹیکہ لگوائیے۔
سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو،
ڈی جی ایچ ایس، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی
davp 87/72

• چلتے پھرتے بازار کی ۳۵ چلتی پھرتی دکانوں نے مارچ ۱۹۸۷ء تک ۷ کروڑ روپے سے زائد قیمت کی روزانہ کام میں آنے والی چیزیں فروخت کی ہیں۔ یہ بازار اکتوبر ۱۹۸۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ پچھلے تین برسوں میں اس بازار کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اور صارفین میں ایک نئی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ اس بازار سے دور دراز کی کالونیوں کے خاص کر جہاں کمزور طبقوں کے لوگ رہتے ہیں ۲۶ لاکھ سے زیادہ خاندانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

یہ چلتی پھرتی گاڑیاں روزانہ ۱۰۰ سے زیادہ مقامات پر روزمرہ کے کام میں آنے والی چیزیں مناسب داموں پر لوگوں کو ان کے گھر کے پاس دستیاب کراتی ہیں۔

انتظامیہ اس بازار کے لئے گاڑیوں کی تعداد میں اور فروخت کے لئے روزمرہ کام میں آنے والی چیزوں کی تعداد میں اضافہ کر کے اسے اور مضبوط بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انتظامیہ کا نشانہ ہے کہ یہ انتظام دلی کے سبھی علاقوں کے لئے دستیاب ہو۔

دلی انتظامیہ نے امور صارفین کے محکمے کی بھی تشکیل کی ہے۔ جو سرکاری اور رضاکار تنظیموں کی کوششوں میں تال میل رکھ کر صارفین کے فائدہ کے لئے تقسیم عامہ کے نظام کو مضبوط بنانے کا کام کر رہا ہے۔ تحریک صارفین کو مضبوط کرنے کے لئے اگر آپ کے پاس کوئی تجویز ہو تو تحریر کیجئے۔

جگ پرویش چندر

چیف ایگزیکٹو کونسلر دلی
اولڈ سیکریٹریٹ دلی ۱۱۰۰۵۴

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و اشاعت،
دلی انتظامیہ دلی

کرائے دار

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

یہ مری گلیاں' یہ مرے کوچے' یہ مرے شہر کے پیارے لوگ
میرے نام جو بادل آئیں بستی پر برسا دینا

اُردو کے صاحبِ طرز ادیب اور آپ کے محبوب افسانہ نگار کے مخصوص انداز میں ایک خوبصورت تحریر

بال مُکند اپنے مرحوم ماں باپ کے دیوار پر لٹکتے فوٹو کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دبے پاؤں پیچھے سے آکر پنّا لال نے اس کے کندھے ہلا کر پوچھا "کیا سوچ رہے ہو!"

"کچھ نہیں' یوں ہی ماتا پتا کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ کہیے' کیسے تکلیف کی؟" بال مُکند نے کرسی پنّا لال کی طرف سرکاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "یار ایک بات سمجھ میں نہیں آئی' — میرے پتا کو شیونگ کرتے وقت ذرا سا بلیڈ لگ گیا تھا اور اُن کو ٹیٹنس ہو گیا اور وہ اس دُنیا سے چلے گئے۔ مگر روزانہ کتنے ہی مسلمان بچوں کی مُسلمانی ہوتی ہے اور اس کام میں کوئی میڈیکل احتیاط بھی نہیں برتی جاتی' پھر بھی کسی کو ٹیٹنس نہیں ہوتا"

"وہ بھگوان کی مایا ہے"۔ پنّا لال نے بے ساختہ کہا۔ بال مُکند نے کسی حد تک بحث کے انداز میں کہا "یہ کوئی جواب نہ ہُوا" مگر پنّا لال نے موضوعِ بحث بدلتے ہوئے کہا کہ مَیں تو اس لئے حاضر ہوا تھا کہ چلو' ذرا اسپتال میں مدھو سودن کے لڑکے کو دیکھ آئیں۔

بال مُکند نے چونکتے ہوئے کہا "کیوں! اسے کیا ہُوا؟"

"وہ بے ٹکٹ تھا! گاڑی دھیمی ہوتے ہی اسٹیشن سے کچھ دُور آؤٹر کے پاس اُتر گیا' سنبھل نہ سکا اور کھونٹیوں سے ٹکرا گیا۔ ایسی شدید چوٹ لگی ہے کہ بچنا مُحال ہے"

"اتنے مالدار آدمی کا لڑکا جو بی۔ اے کا طالبعلم ہے' وہ بے ٹکٹ سفر کر رہا تھا' کتنی شرم کی بات ہے'

بال مُکند اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ایک نوجوان عورت ایک بچے کی اُنگلی پکڑے ہوئے آئی' جس کے ساتھ اس کا شوہر بھی تھا۔ نوجوان عورت نے بال مکند کی بیوی کے پیر چھوئے اور بال مُکند کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا اور اس کے شوہر نے بھی ادب کے ساتھ سب کو نمستے کی اور دونوں میاں بیوی بچے کو ساتھ لئے باہر چلے گئے۔ بال مُکند اور اس کی بیوی نے انھیں اس طرح دُعائیں دیں جیسے اپنے بہو بیٹے کو دیتے ہیں۔ پنّا لال یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اس نے بڑی حیرت سے پوچھا "بال مُکند' یہ کون لوگ ہیں؟"

"میرے کرائے دار"۔ بال مُکند نے فخریہ انداز میں کہا۔

"بہت ہی مہذّب لوگ ہیں"

"آپ یہی دیکھ کر متعجب ہو گئے؟ اگر صبح سے رات تک کا ان کا برتاؤ دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے"

"اچھا!... ایسی کیا بات ہے کہ یہ کرائے دار آپ کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں"

"ہم ویش ہیں... اور یہ برہمن! مگر انھیں اس بات کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ بہو روز میری بیوی کو پیر چھو کر پرنام کرتی ہے۔ جب کبھی رسوئی میں کوئی نئی چیز بناتی ہے تو ہمارے ہاں ضرور پہنچاتی ہے ایک دن میری بیوی کو بُخار آ گیا تو دن بھر سر اور پیر دباتی رہی۔ اپنی بہو بھی اتنی سیوا نہیں کر سکتی بھی نہیں کام کی کیا جُستجو ہے اپنا اسٹوو لے آئی اور یہیں کھانا بنا لیا۔ بچے کو بھی کھلاتی رہی اور بیوی کی دیکھ بھال بھی کرتی رہی۔ مَیں اس روز لکھنؤ گیا ہُوا تھا۔ اتنے اچھے کرائے دار اس زمانے میں کہاں ملتے ہیں۔ اس کا شوہر بھی بہت شریف' ملنسار اور پُر خلوص انسان ہے"

"یہ سب کچھ' بال مُکند' بہروپیا پن ہے۔ تم

نہیں پہنچ سکتے۔ مگر یہ لوگ تمہاری سادہ لوحی کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں اور تمہارے پیٹ میں گھس کر اس کا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ سب کچھ پتہ چل چکا ہے کہ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق اب تمہارے ہاں اولاد تو ہونا ممکن نہیں ہے' اس لئے یہ لوگ تمہارا دل جیتنے کا ناٹک کھیل رہے ہیں' تا کہ آپ ان سے خوش ہوکر اپنی ساری جائیداد ان کو سونپ دیں اور یہی اُن کا نشانہ ہے۔ اور جائیداد کے وارث بنتے ہی دیکھ لینا کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ تب تمہیں عقل آئے گی اور تم کچھ نہ کر سکو گے"

"تو تمہارا یہ کہنا ہے کہ یہ لوگ بناوٹی ہمدردی دکھا رہے ہیں؟ ہوسکتا ہے تمہاری بات صحیح ہو!" بال مکند نے سنجیدگی سے کہا۔

"ابھی میری بات سو فی صدی صحیح ثابت ہو گی۔ میں نے ایسے بہت سے کیس دیکھے ہیں' آجکل بےغرض لوگ کہاں ملتے ہیں"

پنا لال کی بات سن کر بال مکند نے کہا "تین سال ہوئے جب انھوں نے یہ مکان کرائے پر لیا تھا تو یہ وعدہ کیا تھا کہ جب بھی آپ کو مکان کی ضرورت ہو' ایک دن پہلے کہہ دیجئے گا' ہم مکان خالی کر کے چلے جائیں گے"

"بھائی صاحب جس طرح الیکشن کے وقت نیتا وعدے کرتے ہیں اسی طرح کرائے دار مکان کرائے پر لیتے وقت ایسے ہی وعدے کیا کرتے ہیں"

"نہیں! یہ کرائے دار ایسا نہیں ہے" بال مکند نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"یہی تو بہروپئے کی خوبی ہے کہ وہ اصل اور نقل کی تمیز ہی نہ ہونے دے۔ اس کا تجربہ کرنا ہو تو انہیں ایک دو دن بعد مکان خالی کرنے کے لئے کہہ کر دیکھ لو' اپنے آپ ان کی شرافت اور خلوص کا تمہیں تجربہ ہو جائیگا" چلو اب جلدی سے سپتال ہو آئیں"

"اچھا پنا لال! تمہاری بات بھی آزماؤں گا"

ایک ہفتہ بعد کرائے دار جب واپس آئے تو بال مکند نے پنا لال کی انگیخت پر کرایہ دار کے قول کا امتحان لیتے ہوئے اس سے کہا "شری موتی سروپ جی! آپ جب سسرال گئے ہوئے تھے تو میری بہن کا پیغام

کرایہ دار سے مکان خالی کرا لینا۔ بس پرسوں ہی اُس نے یہاں اپنی نوکری پر حاضر ہونا ہے۔ لہٰذا اچھا ہے آپ کل شام تک مکان خالی کردو تو اچھا ہے"

موتی سروپ مالک مکان کا یہ فوری نوٹس ملنے پر ذرا فکرمند تو ہوا' مگر اُسے اپنا وعدہ یاد آیا اور اُس نے نہایت نیازمندی سے کہا "شریمان جی! آپ کا مکان ہے' مالک مکان کرایہ دار سے اپنا مکان کبھی بھی خالی کرا سکتا ہے' یہ اس کا حق ہے۔ ہم تو آپ کے احسان مند ہیں جو تین سال آپ کے زیرِ سایہ رہ کر گھر جیسا آرام پایا۔ آپ مطمئن رہیں' کل آپ کا مکان خالی ہوجائے گا"

موتی سروپ نے دوسرے دن مکان خالی کردیا اتنی جلدی دوسرا مکان تو ملنا تھا نہیں' پھر بھی اس نے اپنا وعدہ نبھایا اور ایک دھرم شالہ میں عارضی طور پر رہائش کا انتظام کر کے اپنا سامان اور بیوی بچوں کو لے کر چلا گیا اور جاتے وقت نہایت شرافت اور خلوص سے رخصت چاہی جس سے بال مکند کے دل و دماغ میں موتی سروپ کی شرافت' قول کی صداقت اور ہمدردی نے اور بھی اعتماد پیدا کیا۔

کرایہ دار کے جانے کے بعد بال مکند اور اس کی بیوی کو گھر ویرانہ نظر آنے لگا۔ بال مکند کی بیوی اپنے شوہر کے اس یک طرفہ فیصلہ سے ایسی دل برداشتہ ہوئی کہ اندر ہی اندر اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور وہ ہر وقت اُداس اور پریشان سی رہنے لگی۔

بال مکند بیوی کی اُداسی کی وجہ بخوبی جانتے تھے' مگر "کردۂ خود را علاجے نیست" وہ دل ہی دل میں پنا لال کو بُرا بھلا بھی کہتے تھے۔ بال مکند نے بیوی کا من رکھنے کے لئے اپنے گھر میں ۲۴ گھنٹے کے اکھنڈ کیرتن کا پروگرام بنایا اور کیرتن میں شریک ہونے کے لئے پنا لال کو بھی نمنترن دینے کے لئے گئے تو باتوں باتوں میں اُن کے منہ سے نکل گیا "پنا لال! ہمارے کرایہ دار تو امتحان میں پاس ہوگئے مگر ہم فیل ہو گئے"

"وہ کیسے بھائی صاحب؟" کیرتن کا دعوتی کارڈ پڑھتے ہوئے پنا لال نے کہا۔ بال مکند نے ساری کیفیت کی تفصیل بتائی تو پنا لال کہنے لگے:-

"آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی فیل ہو گیا اور

کے دھنی ایسے کرایہ دار بھی ہوتے ہیں۔ میری وجہ سے بال مکند جی آپ کو جو نقصان پہنچا' اس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں"

"پنا لال جی کیسی معافی اور کیسا نقصان' مگر میرا جو دماغی سکون برباد ہوا ہے اور میری بیوی کو جو شاک پہنچا ہے' وہ اچھے بھلے گھر کو ویرانہ بنا چکا ہے اب بھگوان کا کیرتن کرا رہا ہوں شاید اس سے گھر میں کچھ شانتی آسکے۔ آپ کیرتن میں ضرور آنا۔ ویسے لاؤڈ اسپیکر سے بھی دور دور تک آواز جائے گی' مگر آپ جیسے عزیز بھائیوں کا کیرتن میں موجود ہونا میری عزت افزائی ہو گی"

"بال مکند! ۲۴ گھنٹوں کے مسلسل کیرتن کی لاؤڈ اسپیکر کے باعث بلند آواز سے کچھ لوگوں کو پریشانی بھی ہو گی"

"ہاں کیوں نہیں ہو گی! طالب علموں' بیماروں' لکھنے پڑھنے والوں اور دوسرے کئی لوگوں کو تین دن رات مسلسل کیرتن کی بلند آواز ضرور متأثر کرے گی' مگر بھائی پنا لال جی۔ الیکشن کے زمانے میں مہینوں' دن رات لاؤڈ اسپیکروں پر شور مچایا جاتا ہے اور کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تو کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور بھگوان کا نام سننے سے تکلیف ہوتی ہے" بال مکند کے لہجہ میں تلخی محسوس کرتے ہوئے پنا لال نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

بال مکند جب کیرتن کے دعوتی کارڈ بانٹ کر گھر آئے تو بیوی کو روتے ہوئے پایا۔ بال مکند نے گھبراتے ہوئے پوچھا "تم رو کیوں رہی ہو؟"

"موتی سروپ کو یاد کر کے رو رہی ہوں۔ کیرتن میں ہمارا وہ کرایہ دار بھی ہونا چاہئے۔ چاہے ہزار آدمی آئیں مگر اُس کے بغیر مجھے سب کچھ روکھا پھیکا سا لگے گا"

"تم نے تو میرے من کی بات کہہ دی' مگر یہ ہوگا کیسے۔ مجھے تو اُس کے گھر کا پتہ بھی معلوم نہیں لیکن بقول تلسی داس کے' جس سے کسی کو سچی لگن ہوتی ہے وہ اس کو ضرور مل جاتا ہے۔ اس لئے کبھی نہ کبھی وہ لوگ ہمیں ضرور مل جائیں گے" بال مکند نے

خود اسعادی کے ساتھ کہا اور بھا بھی کے ساتھ کیرتن کی تیاری ہونے لگی۔ کیرتن کا دن بھی آگیا۔ مہمان لوگ آنے لگے۔ چہل پہل بڑھ گئی۔ ریکارڈنگ شروع ہوگئی

" ساقیا آج مجھے نیند نہیں آئے گی۔ سُنا ہے تیری محفل میں رت جگا ہے" گانا فضا میں عجیب رس گھول رہا تھا۔ حاجی قمرالدین کیرتن کی مُبارکباد دینے آئے تو بال مُکند نے ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا "آئیے دادا جی! آپ نے بڑا کرم کیا"

جیتے رہو بیٹے! مُرادیں پوری ہوں۔ کیرتن مُبارک ہو۔ بیٹا کیرتن کے سلسلے میں اگر کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بتاؤ۔ مجھے خوشی ہوگی کہ میں اِس نیک کام میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں!"

"حاجی جی' سب آپ کی مہربانی ہے۔ آپ کیرتن شروع ہونے کی تقریب میں تشریف لائے اگر آپ کے مذہبی عقائد کے خلاف نہ ہو تو کیرتن میں تشریف رکھیئے" بال مُکند نے بڑی نیازمندی اور عاجزی سے کہا۔

"کیرتن کے تو ہم قطعی خلاف نہیں ہیں۔ عظیم مُقدس ہستیوں اور خدارسیدہ لوگوں کا جہاں ذکر ہو' وہاں جانا ہمارے مذہب کے خلاف نہیں ہے

بات یہ ہے کہ میرا لڑکا چھت پر پتنگ اُڑاتے ہوئے نیچے گر گیا تھا۔ اُس کی حالت بہت خراب ہے اس لئے میں کیرتن جیسی اچھی تقریب میں کچھ دیر تک نہ بیٹھ سکوں گا۔ اس لئے میں کیرتن کی تقریب شروع ہوتے وقت تمہیں مُبارکباد دینے آیا ہوں تاکہ تُم کو میری عدم شرکت کا گلہ نہ رہے اور میری مجبوری کے پیشِ نظر معاف کریں گے۔

ریکارڈنگ بند ہوچکی تھی اور رامائن شروع ہوگئی تھی۔ مدھر سُر فضا میں رس گھول رہے تھے حاجی جی کی بات سُنتے ہی بال مکند کا چہرہ اُتر گیا' اور وہ سارا کام عزیزوں کی نگرانی میں چھوڑ کر حاجی جی کے لڑکے کو دیکھنے اُنہیں کے ساتھ چل دیا۔ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ بچے کو چوٹ اس قدر شدید آئی ہے کہ بچنے کی اُمید کم ہے۔ یہ سُنتے ہی گھر کی بُرقعہ پوش خواتین پھپھک پھپھک کر رونے لگیں اور حاجی جی کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلکنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب بال مُکند کیرتن میں واپس آئے تو وہاں اپنے کرایہ دار موتی سروپ کو دیکھ کر اُن کی حیرت کی حد نہ رہی اور وہ چلّا کر کہنے لگے" ارے موتی سروپ' تُم آگئے۔ بہت اچھا ہوا۔ میرا کیرتن سپھل ہوگیا۔ ارے موتی سروپ کیرتن کا تمھیں کیسے پتہ چلا؟ کیا بہو اور بچے کو بھی ساتھ لائے ہو یا نہیں؟"

"میرے دفتر کے ایک کلرک کا پنّا لال سے ملنا جُلنا ہے۔ اسی کلرک نے مجھے بتایا کہ پنّالال جی کہہ رہے تھے کہ تمہارے سابقہ مالک شری بال مُکند کے ہاں اکھنڈ کیرتن ہے اور میں یہ سُن کر بن بُلائے آگیا' کیوں کہ رام نام میں دعوت نامہ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی"

"تُم نے بہت اچھا کیا بیٹا! اس کے بعد بال مکند نے لاؤڈ اسپیکر سے سب مدعوئین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے بُزرگ حاجی صاحب کے فرزندِ ارجمند کی حالت تشویشناک ہے۔ رام نام ہر وقت لیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میں اپنے بزرگ کے دُکھ میں برابر کا شریک ہوں اور کیرتن کا پروگرام مُلتوی کر رہا ہوں۔ کچھ دنوں میں کیرتن کا پروگرام پھر رکھا جائے گا۔ کیرتن کے پروگرام میں آپ لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں۔ میں سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بھگوان کے حضور اپنے دِل کی بات کہہ کر اپنا من ہلکا کرنا چاہتا ہوں کہ شری موتی سروپ کو میں اپنا بیٹا مانتا ہوں' اور میں یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ میری تمام جائیداد کا مالک بھی موتی سروپ ہی ہوگا اور میں کل کورٹ میں جا کر تمام کاغذی کارروائی مکمل کردوں گا۔ یہ سُنتے ہی بال مکند کی پتنی نے کھڑے ہو کر کہا کہ میرے پتی نے جو فیصلہ کیا ہے وہ میری مرضی کے مُطابق ہے اور نہ صرف یہ مجھے منظور ہی ہے بلکہ آج ہی میں اپنے بیٹے' اپنی بہو اور اپنے پوتے کو اُن کے اپنے گھر میں لا رہی ہوں۔

پنّالال بھونچکا رہ گیا اور نیم دیوانگی کے عالم میں کہنے لگا" بال مُکند! یہ کیا کر رہے ہو؟"

"یہ میرے دل کا فیصلہ ہے! تمہارے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے پنّالال"۔ یہ سُنتے ہی سب نے تالیاں بجائیں مگر۔۔۔ کچھ لوگوں پر اوس سی پڑ گئی

لطیفہ / با ہنس / ہنسائیے

ایک پارٹی میں کسی نے ایک نوجوان لڑکی سے پوچھا: "ایکس کیوزمی۔ ماچس ہوگی آپ کے پاس؟"

صحافت کی اعلیٰ اقدار اور فرائضِ منصبی اس کی نگاہ میں یہ ہیں کہ صحیح رہنمائی کے ساتھ متجسس ذہنوں کی تسکین کی جائے انسانی فکر و خیال کو ہنگامے کر کے دبا دینا اس کا طریقِ عمل نہیں ——— وہ بربنائے مصلحت نہیں دیکھتا۔

جھکنا نہیں جانتا ———

شکست تسلیم نہیں کرتا ———

جاوداں، پیہم رواں اور ہر دم جواں نظر آتا ہے ———

خوفِ جان سے رُو پوشی اختیار نہیں کرتا ———

اعلائے حق کی آخری منزل تو دار و رسن ہے۔ اور وہ شانِ مومنانہ کے ساتھ حق کا داعی ہے۔ 'شانِ ہند' کے مدیرِ اعلیٰ سرور تونسوی کو اس سال اردو جرنلزم کا ایوارڈ ملا ——— دوستوں کو خوشی ہوئی ——— حق پرستوں نے لبّیک کہا ——— مبارکبادیں دیں ——— اُردو اکادمی دہلی کے اس عمل کو داد و تحسین سے نوازا اور کہا، سرورؔ صاحب کو یہ اعزاز بہت پہلے ملنا چاہئے تھا مگر دیر آید دُرست آید، حق بہ حقدار رسید۔

وہیں ذہنی و عقلی دیوالیوں نے اپنے کافر و زندیق ہونے کا ناکام مظاہرہ کیا اور سر پیٹ لیا۔ اس تعصب و پراگندگی میں ایک دو صحافی بھی زبردست مغالطے کا شکار ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' کے ٹرانسلیٹر اور ماہنامہ 'مستانہ جوگی' نے بھی اپنی مُنافقانہ روش کا استعمال اس موقعہ پر مُفید اور کار آمد خیال کیا۔

میری عقل عاجز ہے کہ اس مُنافقانہ روش پر کیا کہا جائے۔

سرورؔ صاحب نے اُردو صحافت کی جو خدمت کی، ملک، قوم اور وطن کیلئے اتحاد، یکجہتی اور وطن دوستی کی جو فضا تیار کی، حُریت، اخوت اور مساوات کا جو درس دیا، محبت، مُروت، خلوص و آشتی کی جن روایات کی تبلیغ کی، راست گوئی، سچائی اور بے خوفی کی جو تعلیم دی، ابنائے وطن کو گمراہی، جہالت اور عصبیت کے دَلدَل سے جس طرح باہر نکالا اور قوم و وطن کو روشن خیالی اور پاکیزہ ذہنی کی جو دولتِ بے بہا عطا کی۔ اپنی تحریروں سے، اپنی عبارتوں سے، اپنے شذرات سے، اپنے اداریوں سے۔ وہ جگ بیتی سنائیں یا آپ بیتی، تذکرہ چاہے باغبان کے ظلم کا ہو یا گلچیں کے جور و ستم کا، متذکرہ بالا اوصاف اُن کے شعور، لاشعور یا تحت الشعور میں ہمہ وقت موجود ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ یہ بھی کہتے سُنے گئے کہ دِلّی اُردو اکادمی کا ایوارڈ 'شانِ ہند' کے مدیرِ اعلیٰ سرورؔ تونسوی کا اعزاز نہیں، انکی پچاس سال سے زائد صحافتی خدمات کا اعتراف نہیں، ان کی نیک نیتی، راست گوئی اور وطن پرستی کو خراجِ عقیدت نہیں، بلکہ شاید یہ مدیرِ اعلیٰ، 'شانِ ہند' کی زبان بندی کی ایک چال ہے اور .... !

اس گمراہ کُن نظریہ پر غور و فکر کرنے کی ہمیں چنداں ضرورت نہیں۔ 'شانِ ہند' اور اس کا مدیرِ اعلیٰ سماجی نا انصافیوں سے چشم پوشی کرنا ملک، قوم اور وطن کے حق میں نہ پہلے صحیح سمجھتا تھا اور اگر ضرورت ہوئی تو اب بھی وہ اپنی اس دیرینہ روایت سے گریز نہیں کرے گا

یہاں یہ جملہ معترضہ بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ 'شانِ ہند' اور اسکے مدیرِ اعلیٰ نے جہاں اجتماعی مفادات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تخریبی کارروائیوں کی تکذیب کی ہے وہاں تعمیری کوششوں کو داد و تحسین کے کلمات سے بھی نوازا ہے اور کھُلے دل سے اُن کی تعریف کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ———

ہماری قوم میں ایسی ہستیاں بڑی متبرک ہیں ———

ہم سرورؔ صاحب کی صحافتی عظمت کو سلام کرتے ہیں ———

ادارہ 'شانِ ہند' اور اس کے بے شمار قارئین کی جانب سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

——— مُضطرب صحرائی

معاون ایڈیٹر ماہنامہ 'شانِ ہند'

نئی دہلی۔

آج کل کے مشاعروں اور تہائی صدی قبل کے مشاعروں میں بڑا فرق تھا۔ اس وقت مشاعروں میں شاعرات بہت کم شرکت کرتی تھیں، مگر جو بھی گنی چنی شاعرات مشاعروں میں مدعو کی جاتی تھیں، وہ ہوتی واقعی شاعرہ تھیں۔ آج کل کی طرح نہیں کہ فعلن فعولن کی صحیح املا تک نہ جاننے والی چھوکریاں محض ظاہری نمائش کے بل بوتے چاہتے تھے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ شاہجہاں بانو یاد سے ہی شاعرات کی وافر تعداد نے مشاعروں میں شریک ہونے کی ترغیب پائی۔

چونکہ شاہجہاں بانو یاد اپنے زمانے کی ایک مشہور گلوکارہ تھیں (اور آج بھی بحیثیت آل انڈیا ریڈیو کی ایک معتزز گلوکارہ ہیں) اس لئے مشاعروں میں اُن کے ان کے اس لئے گرویدہ تھے کہ علم مجلسی میں یہ اپنا جواب آپ تھیں۔ لہٰذا ان کی شہرت دُنیائے شاعری میں اس طرح پھیلی کہ ان کے بغیر مشاعرہ کامیابی کی سند حاصل ہی نہ کر سکتا تھا۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار کرنا ممکن ہے کہ جس قدر مشاعرے شاہجہاں بانو نے پڑھے اتنے کسی دوسری شاعرہ نے نہیں پڑھے۔

نا عورت

شخصیات، واقعات، تاثرات،

اور سا رے گا ما پا کی ابتدائی مشق کے بعد ترنم میں دو چار غزلیں جو کسی جنسی بھوک کے مارے ہوئے اُستاد یا کسی عاشق شاعر کا عطیہ ہوتی ہیں یعنی میں باندھ کر مشاعروں میں دندنانے لگتی ہیں اور زیادہ تر تو ایسی شاعرات مشاعروں کو لُوٹنے میں کامیاب ہوتی ہیں جو کسی کی عطا کردہ غزل ہندی رسم الخط میں لکھی ہوئی سُناتی ہیں۔

اُن دنوں خال خال مشاعروں میں شاہجہاں بانو یاد کو مدعو کیا جاتا تھا۔ مگر غزل، موسیقی اور حسن کی یہ تثلیث جب مشاعرے کے اسٹیج پر نمودار ہوتی تو سامعین، منتظمین اور اسٹیج پر بیٹھے شعرائے کرام پھٹے پھٹے دیدوں سے اس چلتی پھرتی قیامت کو اپنی آنکھوں میں سمو لینا کلام سنانے کا انداز شاعرانہ ترنم اور موسیقی کا سنگم ہوتا تھا اور ان کے بھاری بھرکم ترنم میں بڑے بڑے مشہور شاعر اپنے بہترین اور اُستادانہ کلام سمیت دب کر رہ جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ شاہجہاں بانو یاد نے اپنے تجربات و مشاہدات کو بروئے کار لاتے ہوئے مشاعروں کے منتظمین اور مشاعروں میں مدعو شعرائے کرام سے خالص ادیبانہ اور شاعرانہ انداز میں لاجواب حاضر جوابی کا مظاہرہ اس دلربایانہ انداز میں کیا کہ نوجوان پیشہ ور شاعروں نے اُن کی ہمرکابی میں مشاعرے پڑھنا اپنے لئے باعثِ فخر اور مقبولیت میں اضافہ کا موجب سمجھا اور منتظمینِ مشاعرہ

آج کل کی شاعرات کی اکثریت تو ایسی ہے کہ کلام سناتے سُناتے ہی اپنے عاشقانِ زار کو سرِ مشاعرہ کنایوں اور اشاروں سے "لائن کلیر" دے دیتی ہیں اور مشاعرے کے بعد منتظمینِ مشاعرہ سے حساب کتاب چکتا کرنے کے بعد اپنے ان چاہنے والوں کی مہمانی کا لطف اٹھاتی ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ منتظمینِ مشاعرہ ہی اُن کے پرستار ہوتے ہیں اور وہ ہی مشاعرے کے بعد "انھیں" اور "ٹائم" لگا نیکے لئے "انگیج" کر لیتے ہیں۔

شاہجہاں بانو یاد کے چاہنے والوں کا اُس زمانے میں کوئی شمار ہی نہ تھا۔ مگر واہ ری شاہجہاں بانو یاد کیا مجال کہ کسی کو ساڑھی کے پلّو کو بھی ہاتھ لگانے

دیا ہو۔ بڑے بڑے پارسا شاعروں نے مشاعروں کے دوران ہوٹلوں یا جہاں بھی شاعروں کو ٹھہرایا گیا ہوتا، شاہجہاں بانو یاد کے کمرے میں بیٹھ کر شراب نوشی کی، مگر اِس خدا کی بندی نے اُن کے نام آج تک کسی کو نہیں بتائے۔ کسی شاعر کو یا کسی سامع کو یا کسی منتظم مشاعرہ کو یہ ہمت نہ ہو سکی کہ شاہجہاں بانو یاد سے اظہار محبت کر سکے، یا اُسے کسی طور بھی اپنا آلۂ کار بنا سکے۔ کوئی مائی کا لال یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے یاد کو شراب پیتے ہوئے دیکھا ہے۔

شکیل بدایونی نے بمبئی میں مشاعرہ کرایا، شاعروں کے قیام کے لئے ایک ہال میں انتظام کیا گیا تھا۔ فراق گورکھپوری کا پلنگ دروازے کے قریب تھا اور شاہجہاں بانو کا پلنگ اُن سے تین چار پائیاں چھوڑ کر تھا۔ بمبئی کے ایک نوعمر اور خوبصورت صنعت کار شاعروں کی اُس قیام گاہ پر تشریف لائے۔ ہال میں داخل ہوئے ہی تھے کہ فراق صاحب فرمانے لگے "کہو صاحبزادے! کیسے آنا ہوا" کوئی نوعمر اور خوبصورت لڑکا فراق صاحب کے سامنے سے گزرے تو یہ ناممکن تھا کہ وہ اس سے مخاطب نہ ہوں۔ اُس نوعمر صنعت کار نے کہا کہ مجھے یاد صاحبہ سے ملنا ہے۔ فراق صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ بیٹھی ہیں" یہ صاحب یاد صاحبہ کے پاس آئے اور علیک سلیک کے بعد کہنے لگے کہ آپ بمبئی پہلی مرتبہ تشریف لائی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج دوپہر کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں اور میں آپ کو بمبئی گھما دوں۔ یاد صاحبہ نے بڑی سنجیدگی سے اُس نوجوان کو ٹرخا دیا۔ اور جب یہ نوجوان ہال سے نکلتے وقت فراق صاحب کے قریب سے گزرا تو فراق صاحب نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو اور بھی پھیلا کر زوردار آواز سے کہا "صاحبزادے، شاید کام بنا نہیں" اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ عزیزمی تم تو کیا ملک الموت بھی اسے جُل دے کر نہیں لے جا سکتا اور یاد سے کہا کہ دن کا وقت تھا کیا ہوتا جو ذرا سا چال چلن خراب ہو جاتا

عرصہ ہوا ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد شبلی کالج اعظم گڑھ میں لیکچرار تھے۔ شبلی کالج نے آل انڈیا مشاعرہ کرایا۔ ملک زادہ اپنے دل کی گہرائیوں میں یاد صاحبہ سے متعلق ہمدردی کا گوشہ رکھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس مشاعرے میں یاد صاحبہ کو بھی مدعو کرایا۔ مولانا حیر بجوری نہ معلوم یاد صاحبہ سے کیوں نالاں تھے۔ انھوں نے مشاعرے کے روز یہ شوشہ چھوڑا کہ مولانا شبلی کی یادگار شبلی کالج میں مشاعرہ ہو رہا ہے اور اس میں ایک طوائف شاعرہ کی حیثیت سے شرکت کر رہی ہے۔ یہ مولانا شبلی کی توہین ہے۔ مولانا حیر بجوری کے اِس شوشے کی حمایت مولانا انور صابری نے پُرزور طور پر کی۔ کیونکہ مولانا انور صابری کے نزدیک کوئی دوسرا معاملہ شریعت کے خلاف ہو یا نہ ہو کسی لڑکی کا مشاعرہ میں پڑھنا شریعت کے خلاف تھا۔ کالج کے طلباء بضد کہ اگر یاد صاحبہ کو مشاعرہ میں پڑھنے نہ دیا تو ہم کالج کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ کالج کی مینجنگ کمیٹی کے سربراہ بضد کہ ہم مولانا شبلی کی روح کو بیزار نہ ہونے دیں گے۔ اِدھر یاد نئی نئی مشاعروں میں آنے لگی تھیں۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال سے بڑی گھبراہٹ کا اظہار کر رہی تھیں۔ ملک زادہ صاحب الگ اعلان کر رہے تھے کہ اگر یاد کو مشاعرہ میں پڑھوایا نہ گیا تو وہ استعفےٰ دے دیں گے۔ سننے میں شکیل بدایونی نے یاد صاحبہ کو پٹی پڑھائی کہ تم کالج کی مینجنگ کمیٹی کے سربراہ سے اتنا کہہ دو کہ حضور عطیہ فیضی بھی تو عورت ہی تھیں۔ میں تو صرف مشاعرہ میں کلام سناؤں گی مگر لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ عطیہ فیضی سے مولانا شبلی کی یاد اللہ تھی۔ یاد نے ایسا ہی کیا۔ ساری مینجنگ کمیٹی، مولانا حیر بجوری اور مولانا انور صابری شبلی کی رُوح کو تڑپتا یا سرشار چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔ اور یاد نے یہ مشاعرہ پڑھا اور ایسا پڑھا کہ اہلِ اعظم گڑھ آج تک یاد کو نہ بھول سکے۔

ایڈیٹر "شانِ ہند" اور یاد کا اَن گنت مشاعروں میں ساتھ رہا۔ یاد اسٹیج پر، خصوصی نشستوں اور شاعروں کی قیام گاہ پر جس بے تکلفی اور حاضر جوابی سے گفتگو کرتی تھی اس سے بڑے بڑے چرب زبان اور پھنّے خاں قسم کے شاعروں کی بھی بولتی بند ہو جاتی تھی اور یاد کی اس بے باکی اور صاف گوئی سے متاثر ہو کر سلام مچھلی شہری نے کہا تھا کہ جس طرح مرد کے ساتھ "نا" لگایا جا سکتا ہے (نامرد) اسی طرح یاد کے ساتھ "نا" لگایا جانا چاہیئے یعنی "ناعورت" کیونکہ اس کے ساتھ گھنٹوں بے تکلفی سے باتیں کرتے رہیئے، جنسی امرد پرستی اور دیگر جنسی خرافات پر بے تکان گپ مارتے رہیئے مگر کیا مجال کہ یاد ہر موضوع پر مردوں سے زیادہ واقفیت کا اظہار کرتے ہوئے بھی اپنے آپ میں کسی قسم کا جھول آنے دے۔ اِس لئے میں تو اسے "ناعورت" ہی سمجھتا ہوں

سلام مچھلی شہری نے کہا تھا کہ جس طرح مرد کے ساتھ 'نا' لگایا جا سکتا ہے (نامرد) اُسی طرح یاد کے ساتھ 'نا' لگایا جا سکتا ہے یعنی "ناعورت"

شاعروں کی قیام گاہ پر عام طور پر شاعر، برج وغیرہ کھیلتے ہیں اور جو کچھ مشاعرے سے ملا ہوتا ہے وہ تاش کے پتّوں پر ہار جیت میں برباد کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت جگر بھی کچھ کم نہ تھے اور تاش پر پیسے لگانا انہیں بہت زیادہ مرغوب تھا۔ مگر جب کسی مشاعرے میں یاد صاحبہ بھی مدعو ہوتیں تو جناب جگر دیگر شاعروں سے فرماتے تھے کہ بھائی یاد کے آنے سے پہلے پہلے تاش کھیل لو۔ اُس کے آنے کے بعد ایسا نہ ہو سکے گا کیونکہ اِس سلسلہ میں میں یاد سے گھبراتا ہوں اس لئے کہ وہ تاش پر روپیہ لگا کر کھیلنا بُرا سمجھتی ہے۔

فراق گورکھپوری یاد کے بڑے معترف تھے۔ اِس لئے بھی کہ یاد اُن سے اُن کے ذوق و شوق پر بے تکان بول سکتی تھی بلکہ اکثر مرتبہ تو فراق ایسا زیرک اور باغ و بہار شخص حاضر جوابی میں یاد سے مات کھا جاتا تھا۔ فراق، یاد کے علم مجلسی کے بارے میں اکثر تعریف فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہندوستان کے تمام شاعروں کو کسی ویرانے میں پھینک دیا جائے تو اکیلی یاد اُس راندۂ درگاہ گروہ کو

اپنے علمِ مجلسی کے جادُو سے زندہ اور شاد کام رکھ سکتی ہے
یادؔ نے مشاعروں سے خوب روپیہ کمایا مگر روپیہ
کو برباد نہیں کیا۔ اپنی بہنوں کی شادی کی، اپنی بیٹی کی
شادی بڑے اہتمام سے کی اور عزت و احترام سے زندگی
بسر کر رہی ہیں۔ اُن کا گھر اکثر و بیشتر شاعروں کا مہمان خانہ
بنا رہتا ہے۔ یادؔ نے نازشؔ پرتاپ گڑھی کی خدمت مقدور
بھر کی، یہاں تک کہ نازشؔ صاحب نے یادؔ صاحبہ کے مکان پر
ہی فرشتۂ موت کو لبیک کہا۔

پچھلے دنوں یادؔ صاحبہ تشویش ناک حد تک علیل
رہیں۔ یار لوگوں نے مشہور کر دیا کہ اب وہ مشاعروں میں
نہ آ سکے گی۔ مگر اس خدا کی بندی نے اپنی طویل علالت
میں بھی اپنی غیرت کو قائم رکھا اور اپنی آن شان میں
کسی قسم کا فرق نہ آنے دیا اور خدا کے فضل و کرم سے
دو سال ہوئے کہ پھر سے مشاعروں، ریڈیو اور ٹی وی
پر اپنا سکہ جما لیا ہے۔

شاہجہاں بانو یادؔ نے مشاعروں ..... دل پھینک
شاعروں .... اوباش سامعین .... بھولی بھالی شکل
والے مخلوق اور جنسی بھوک کے مارے ہوئے منتظمین
مشاعرہ پر شاہجہاں کی طرح حکومت کی ہے اور اپنے
دورِ شاہجہانی میں کسی بڑے سے بڑے جغادری اور
پھنّے خاں کو گستاخی، نافرمانی یا کمینہ پن کی جرأت نہیں
ہونے دی۔

فراقؔ فرماتے تھے کہ یادؔ تو اُمّ الشعراء ہے۔
شاعرو! اس کا احترام کرو، مشاعرہ سننے والو! تم
خوش نصیب ہو کہ تم نے اپنی آنکھوں سے یادؔ ایسی
بلبلِ ہزار داستاں شاعرہ کو دیکھا۔ اور آنے والے
دور میں مشاعروں کے منتظمین ترسا کریں گے کہ یادؔ
ایسی شاعرہ کو کہاں سے لائیں۔

الٰہ آباد میں فراقؔ صاحب کے ہاں کچھ شعرائے
کرام تشریف فرما تھے کہ باتوں باتوں میں یادؔ صاحبہ کا
ذکر آ گیا۔ خدا کا کرنا کہ عین اُسی وقت یادؔ صاحبہ بھی
فراقؔ صاحب کے ہاں آ گئیں۔ یادؔ کو دیکھتے ہی فراقؔ
فرمانے لگے ؎

"کچھ لوگ ابھی ذکر ترا کر ہی رہے تھے
اے زُلفِ سیہ رنگ تری عُمر بڑی ہے"

فراقؔ صاحب کی اِس دُعا میں راقم الحروف
بھی شریک ہے اور چاہتا ہے کہ خدا یادؔ کو عمرِ طویل دے
اور یہ با صحت، شاد اور خوش و خرّم رہیں اور خدا ان
کی یہ دلی خواہش پوری کرے کہ انھیں درِ حبیب کی
زیارت کا شرف حاصل ہو۔ آمین۔ ●

باب انتقاد

یادوں کا جشن — کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
۱۹۸۶ء — ۴۹۶ صفحات — اسی روپے
جشن کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کمیٹی نئی دہلی

۲۰ نومبر ۱۹۲۸ء کو لالہ لاجپت رائے کی شہادت کے تین دن بعد لاہور میں منعقدہ چوتھی آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے زیر اہتمام شعبۂ اردو کی طرف سے حیدر آباد کے نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے زیر صدارت بریڈلا ہال میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں مصرعِ طرح تھا "کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی"۔

اُس وقت مشاعرے میں علامہ اقبال، سر عبدالقادر، ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ وغیرہ بہت سے بزرگ موجود تھے۔ ابھی تک حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، ساحر ہوشیارپوری، ہری چند اختر وغیرہ کو اردو شاعری میں وہ درجہ حاصل نہ تھا جو بعد میں اُن کو ملا اور ترقی پسند تحریک بھی معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی۔ مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی مشاعرہ کے منتظمین میں تھے۔ اس میں فانی بدایونی یا کسی اور بڑے اُستاد نے جب طرح پر کہی گئی غزل کا یہ شعر پڑھا تو ہال تالیوں سے لگاتار کئی منٹ تک گونجتا رہا اور شعر کو کئی مرتبہ پڑھوایا گیا۔

"مرکز سخن کا اب تو ہے لاہور ہو گیا
دہلی و لکھنؤ کو پکارا کرے کوئی۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ اُس وقت لاہور اُردو ادب کا ایک اہم مرکز تھا کیونکہ وہیں سے اچھے جرائد اور اخبارات شائع ہوتے تھے اور شعراء میں علامہ اقبال، لعظمت علیخاں اور میلارام وفاؔ کا طوطی بولتا تھا لیکن تقسیم ہند اور بالخصوص تقسیم پنجاب نے اُردو ادب کے اس شیرازہ کو اس طرح منتشر کر دیا کہ خود ہندوستان میں اُردو کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کی تصنیف "یادوں کا جشن" کے مطالعہ سے یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ تقسیم شدہ ہندوستان میں بیدی جی جیسے اُردو کے متوالوں نے اُردو کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا فرض سمجھ کر جابجا اُردو مشاعروں کا انعقاد کر کے اور گمنام گوشوں میں سے اُردو کے شعراء کو نکال کر اُن کے کلام کو سُنوا کر لوگوں کو اُن کا ہی نہیں اُردو کا والہ و شیدا کر دیا۔ بیدی جی کا یہ اقدام اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

زیر نظر کتاب میں پہلے تو بیدی جی نے اپنی سوانح عمری سے روشناس کرایا ہے اور سکھ مذہب کے بانی اور پہلے گورو شری گورو نانک دیو جی سے اپنے براہِ راست تعلق کا ذکر کرنے کے بعد اپنے گرد دُوں جی والدین کے فرزند ہونے کے ناطے ان کو اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی نیک کوششوں کا وضاحت سے ذکر کیا ہے۔ بعد میں ملازمت اختیار کرنے پر بیدی جی نے اُردو ادب کی اشاعت کے لئے مشاعروں کی نظامت، نقابت، صدارت یعنی ہر ممکن وسیلہ سے کوشش کی۔ یہ بیدی جی کی ہی محنت شاقہ کا نتیجہ تھا کہ عوام کے اندر اُردو شعر کا ذوق فروغ حاصل کر سکا اور ہری چند اختر، جوش ملیح آبادی، جوش ملسیانی، ساحر ہوشیارپوری، عرش ملسیانی، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، فراق گورکھپوری، نریش کمار شاد، شیوک رتن رنباوی اور دیگر بہت سے شعراء نے اپنا جائز مقام حاصل کیا۔

بیدی جی کی یہ سرگزشتِ حیات نہایت دلچسپ انداز میں اُردو ادب کی گزشتہ پچاس سالوں کی مصدقہ تاریخ کا درجہ رکھتی ہے جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کر سکتی ہیں اور اُردو کو اُس کی گزشتہ عظمت واپس دلانے میں کوشاں ہو سکتی ہیں۔ کتاب کے عنوانات میں انہوں نے اپنے بزرگوں کے حالات کے بعد اپنے لڑکپن اور عقائد کا ذکر کیا ہے۔ اُن کا عقیدہ خدا پرستی کے ساتھ انسانی خدمت کو لازم سمجھتا ہے اور اُنھوں نے ذکر کیا ہے کہ کس طرح اپنی مسافتِ زندگی میں اُنھوں نے ہر ہر قدم حاجتمندوں، شاعروں اور دوستوں کی ہر ممکن طریقہ سے امداد کی اور کئی دفعہ دوستوں کی خاطر زندگی کے اُصولوں کو بھی قربان کر دیا بہت سی برگزیدہ شخصیتوں کا تذکرہ اور اُن سے وابستہ دلچسپ واقعات اور ادبی لطیفے کتاب کے بار بار مطالعہ کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اِس کتاب نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہاں بیدی صاحب ایک اوّل درجہ کے شاعر ہیں، وہاں اوّل درجہ کے نثر نویس بھی ہیں۔ شری کے۔ ایل نارنگ، ناشر کتاب، اعلیٰ درجہ کی کتابت، طباعت، جلد اور ہیئت کذائی کی خوبصورتی کیلئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب کو ایک مرتبہ پڑھنا شروع کر دیا جائے تو بغیر ختم کئے اُسے چھوڑنا محال ہے۔

ہیرا لال چوپڑہ

ہمارے کنور صاحب — کے۔ ایل نارنگ ساقی
۱۹۸۶ء — ۲۲۸ صفحات — پچاس روپے
جشن کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کمیٹی نئی دہلی

کنور مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت محض سرکاری حیثیت سے ہی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اُس کی ادبی معاونت اس سے کہیں بیشتر و برتر ہے۔ "یادوں کے جشن" پہلے پاکستان میں شائع ہوئی تھی بعد میں شری کے ایل نارنگ ساقی اور دیگر بیدی جی کے چاہنے والوں نے اسے ہندوستان میں پوری آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ بیدی صاحب کی پہلی منزل کی یادگار میں کتاب زیر نظر ظہور میں آئی جس میں بیدی جی کے متعلق ان کے رفقائے کار شعراء اور اُدباء نے اپنی اپنی طرف سے اُن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ طالبیات کے ماہر مشہور اُردو مصنف مالک رام نے اُن کی زندگی کا پورا پورا خاکہ کھینچا ہے۔ کرنل بشیر

حسین زیدی، رام لال، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر جمیل جالبی، عابد علی خاں، خواجہ محمد شفیع، رئیس امروہوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ساحر ہوشیارپوری، جوگندر پال، گوپی ناتھ امن، ڈاکٹر عتیق انجم، خواجہ حسن ثانی نظامی، نریندر لوتھر، کشمیری لال ذاکر، سید شریف الحسن نقوی، یوسف ناظم، مظفر بیابانی، قمر رئیس، عنوان چشتی، کامل قریشی، فکر تونسوی، ذہین نقوی، شارب ردولوی، صاحبزادہ شوکت علی خاں، جمیلہ بانو، انیس دہلوی، نفیس بانو شمع، سردار تونسوی، ڈاکٹر راہی، حیات لکھنوی، رعنا سحری اور کے ایل نارنگ ساقی نے بیدی جی کی شخصیت، انسانیت، ہمہ گیر محبت، انسانی خدمت اور ادب پرستی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ بیدی جی اپنی ذات میں ایک ایسی انجمن ہیں جس سے ہر شخص کو ذہنی، قلبی، دُنیاوی اور رُوحانی فائدہ پہنچتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی کو بھی انکار کرنا نہیں جانتے حتیٰ کہ اُن لوگوں کو بھی اپنی مرحمت سے نوازتے ہیں جنھوں نے خود اُن سے کبھی اچھا سلوک نہ کیا ہو۔ شعروں میں بیدی جی کو عقیدت پیش کرنے والوں میں جوش ملیح آبادی، گوپی ناتھ امن، کلیل شفائی، عزیز وارثی، محمود سعیدی، راہی شہابی، راز لائل پوری، ولیب باول اور متین امروہوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اِن تمام اصحاب نے بیدی صاحب کی شخصیت کی گوناگوں صلاحیتوں پر روشنی ڈالی ہے اور واضح کیا ہے کہ کس طرح اُن کے نیک کاموں اور مشکلوں میں بیدی جی اُن کے مددگار و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے بیدی جی کی ساحری شخصیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور دل بے اختیار والہ و شیدا ہو کر یہ دُعا دینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ؎

"تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

کتابت، طباعت، جلد، مضامین کی ترتیب، نارنگ صاحب کی خوبصورتیوں کو پیش کرنے کی صلاحیتوں کی دلالت کرتی ہے جس کے لئے وہ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہیرالال چوپڑہ

مالک رام ایک مطالعہ — علی جواد زیدی

۱۹۸۶ء — ۳۳۶ صفحات — پچاس روپے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

مالک رام صاحب اُردو کے ایک ایسے مصنف ہیں جنھوں نے ادبی تنقید و تحقیق کو ایک باقاعدہ فن کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ کیوں کہ اُن سے پہلے محض ادیبوں کی سوانحِ حیات کو یکجا کرنا یا اُن کی تصنیفات کی فراہمی ہی تحقیق کا مواد گردانا جاتا تھا۔ مالک رام صاحب نے نہ صرف غالب کی شاعری پر ہی کام کیا ہے بلکہ اُس کی سوانحِ حیات، اُس کے تلامذہ اور اُس کی تصنیفات کے متعلق تفاصیل مہیا کی ہیں جس سے اُن کو ماہرِ غالبیات کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے لیکن غالبیات کے علاوہ اُنھوں نے اُردو ادب میں اسلامیات، تذکرہ نگاری، تحقیق، مرقع نگاری، نثر نگاری، مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین کی تدوین پر بھی ٹھوس کام کر کے ادب کے دائرے کو بہت وسیع کیا ہے۔ اسلامیات پر اُنھوں نے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ کیونکہ ایک غیر مسلم ہوتے ہوئے اُنھوں نے اسلامی عقائد کو قابلِ قبول اور صحیح ڈھنگ میں پیش کیا ہے تاکہ وہ عقائد آج کل کے سائنسی اور فلسفیانہ دَور میں ہر امتحان میں پورے اُتر سکیں۔ گزشتہ ایک صدی میں اہلِ مغرب نے اسلام کی غلط توضیح و تشریح کر کے اُسے کافی بدنام کر دیا تھا لیکن مالک رام صاحب کی کوشش اسلام کی صحیح ترجمانی کی دعویدار ہے۔

کتاب زیرِ نظر میں مالک رام صاحب کی خدمات ادبی نیز اُن کی زندگی بھر کی گوناگوں دلچسپیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور مُلک کے تمام نامور ادیبوں نے اُنکی سرگرمی کے کسی نہ کسی پہلو کو لے کر اُس پر وضاحت کرتے ہوئے اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ غالبیات کے بارے میں اُن کی کوششوں پر پروفیسر گیان چند، شمس الرحمان فاروقی، کالی داس گپتا رضا، پروفیسر مختار الدین احمد، اوم پرکاش بجاج، پروفیسر گوپی چند نارنگ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر شمیم حنفی نے اُن کو سراہا ہے اور اسلامیات پر مولانا اسلم جیراجپوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، جسٹس محمد ہدایت اللہ، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا محمد عبدالسلام خاں، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر اختر الواسع نے اُن کے دلائل کی تائید کی ہے۔

تذکرہ نگاری پر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، تحقیق پر سید مشتاق شارق، مرقع نگاری پر اسلوب احمد انصاری، نورالحسن نقوی، سید محمد مشتاق شارق، نثر نگاری پر جگن ناتھ آزاد اور ضیا فتح آبادی اور تدوینِ ابوالکلام آزاد پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری اور پروفیسر عبدالقوی نقوی نے مالک رام صاحب کے مضامین پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اِن مضامین کے مطالعہ سے مالک رام صاحب کی ادبی صلاحیت واضح ہو جاتی ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتبِ کتاب جناب علی جواد زیدی صاحب کا پیش لفظ اُردو ادب میں تنقید و تحقیق کی مستقل تاریخ ہے اور اِس سے ادب کے شائقین بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آخر میں اُنھوں نے تمام مضمون نگاروں کی مختصر سوانحِ حیات بھی دی ہے نیز حبیبہ خاتون نے "توقیتِ مالک رام" کے عنوان سے مالک رام صاحب کی تمام سوانح عمری دی ہے، نیز اُن کے خاندانی حالات پر بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ تمام کتاب جاذب اور پُرکشش ہے اور اُردو ادب کے شائقین، محققین اور ناقدین اِس سے بہت سے نئے زاویوں سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ علی جواد زیدی صاحب کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے اور تمام ادبی دُنیا میں مالک رام صاحب کو اُن کے اصلی رنگ میں پیش کرے گی۔ مالک رام صاحب نے جتنا اُردو ادب کے فروغ میں مستحسن کام کیا ہے اُس کے لئے اُن کی جتنی بھی قدرشناسی کی جائے کم ہے۔ بالخصوص سرکاری ملازمتوں میں مصروف رہتے ہوئے اُنھوں نے اگر ان کاموں کو کیا تو محض دل کی لگن کے لئے ہی کیا اور اُن کا کام اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔
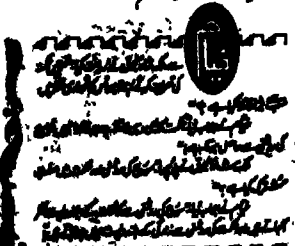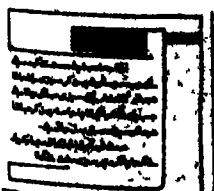
ہیرالال چوپڑہ

من کہ مکتوب الیہ

برادرِ محترم سرورؔ صاحب ۔ تسلیم و نیاز!

اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے ۔ "شانِ ہند" نئے رنگ و روغن کے ساتھ موصول ہوا۔ جیسا مَیں نے سوچا تھا یہ بالکل ویسا ہی ہے۔ آپ مُبارکباد کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ مَیں نے اس کی قیمت پر غور نہیں کیا تھا۔ آپ نے خط میں لکھا تھا کہ آفسیٹ پر آنے کے بعد 'شانِ ہند' کی قیمت فی شمارہ تین روپئے ہو گی۔ ذہن میں یہ بات ضرور تھی مگر جب شمارہ ہاتھ میں آیا تو محسوس ہوا کہ تین روپیہ بہت کم ہے مگر جب معلوم کرنا چاہا کہ اسکی قیمت کیا ہے تو یہ پڑھکر اطمینان ہوا کہ چار روپے مناسب ہے۔ بہرحال شمارے کے متعلق اور کچھ کہنا آپکے وقت کو ضائع کرنیکے برابر ہوگا لہٰذا غالبؔ کا یہ شعر لکھ کر حساب کتاب پورا کر رہا ہوں ؎

بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات — عبارت کیا ' اشارت کیا ' ادا کیا

آپ نے اس شمارے میں کچھ نامور اور شہرت یافتہ فنکاروں کو بھی نہ صرف جمع کیا ہے بلکہ ان کیساتھ انصاف بھی کیا ہے۔ "پہاڑوں کی برف" (احمد ندیم قاسمی) "سیاہ نقطہ" (اکرام اللہ) اور "ناشُدنی" (علیم عثمانی) اچھے اور معیاری افسانے ہیں۔ ڈاکٹر حقیر آستانی، جگن ناتھ آزاد اور نسیم نیازی کی شعری تخلیقات پسند آئیں اور آپ اپنے مخصوص کالموں میں حسبِ معمول کامیاب ہیں — یہ نسیم نیازی کون ہیں؟۔

مشاعرے کی رُوداد کی اشاعت کے لئے ممنون ہوں —

نئے اور کچھ پرانے اور ناتجربہ کار فنکاروں کے انٹرویوز میرے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ اگر حکم ہو تو "شانِ ہند" کے لئے ارسال کر دوں!— فی الحال ایک تازہ غزل ارسال کر رہا ہوں، اگر اچھی لگے تو جگہ دے دیجئے۔ رُوحی بھابی اور مُطلب صحرائی کو میرا اسلام عرض کریں۔

آپ کا اپنا ۔۔ خلیل انجم

برادرِ محترم جناب سرورؔ صاحب!

خلوص و نیاز!

ایک شکریہ اور دو مُبارکبادیں! شکریہ اس ذرہ نوازی کا کہ آپ نے "ارفروری ۱۹۸۷ء کو آندھرا پردیش بھون میں منعقدہ تقریب میں شرکت فرمائی اور راقم السطور کو "ممتاز الشعراء" کا خطاب ملنے پر اپنے موقر جریدے میں ادارتی نوٹ لکھ کر اظہارِ مسرت فرمایا۔ پہلی مبارکباد 'شانِ ہند' کے نئے رنگ رُوپ اور اس کی نکھری سُتھری تزئین و ترتیب کے لئے پیش کرتا ہوں۔ اور دوسری مُبارکباد دلی اُردو اکادمی کے صحافتی ایوارڈ کے لئے آپ کے انتخاب پر! یہ ایوارڈ آپ کو بہت پہلے مل جانا چاہئے تھا۔ لیکن یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور بے لوث خدمتِ ادب و صحافت کا ثبوت ہے کہ آپ اپنے محترم رفیقوں کے حق میں دستبردار ہوتے رہے، خیر دیر آید درست آید بلکہ یوں کہ حق بہ حقدار رسید!

'شانِ ہند' شمارہ فروری ۱۹۸۷ء میں "ہندوؤں کی یک نفری نمائندگی" پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے آپ نے جو انکشاف کیا ہے اور حقائق بیان کئے ہیں ان سے اس نظریے کی تصدیق ہوتی ہے کہ غیر مسلم خصوصاً ہندو شاعر و ادیب ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ سالِ رواں کے دلی اُردو اکادمی کے انعام یافتگان کی فہرست پر ہی غور فرما لیجئے۔ یہاں بھی ایک نفری نمائندگی ہی کا فرمولا بروئے کار لایا گیا ہے۔ معتبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ یہ نمائندگی دو نفری ہونے جا رہی تھی کہ زبانِ غیب نے ... تو یہ بھی گئی۔ دلی اُردو اکادمی کے کل ہند سمینار "اُردو شاعری کی ہندی اصناف" منعقدہ ۲۸ فروری تا ۲ مارچ میں مدعوئین کی تعداد تیس ہے، ان میں صرف تین ہندو ہیں اور سہ روزہ "اُردو مرثیہ سمینار" منعقدہ ۲۸ تا ۳۰ مارچ کے ۵۴ مقالہ نگاروں میں صرف دو ہندو (صدرِ جلسہ سمیت) شامل کئے گئے ہیں۔ اکادمی کے مشاعروں میں شریک ہونے والے شاعروں کے تناسب میں بھی کم و بیش ایسی ہی صورت دکھائی دیتی ہے۔ آج کل اُردو ادب میں "مابعد گردیت" کے موضوع پر بھی رسائل میں لکھا جا رہا ہے۔ اللہ اُردو کو نظرِ بد سے بچائے، کہیں یہ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" کی نذر نہ ہو جائے۔

ایک تازہ خبر کے مطابق "اُردو نے تنگ نظری، تشدّد اور بنیاد پرستی کے خلاف آواز اٹھانے کی ٹھان لی ہے" یہ سُرخی ہے اُس اشتہار کی جو "ہندوستان ٹائمز" کے ۵ اپریل کے شمارہ میں چھپا ہے۔ عالمی اُردو کانفرنس کے زیرِ اہتمام ۲ جون ۱۹۸۷ء کو پرگتی میدان میں عالمی اُردو مشاعرہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ جس میں امریکہ سے لیکر نیپال تک کے شعرائے کرام (باستثنائے روس) کی شرکت متوقع ہے۔ مشتہر ہوئے "الاقوامی" عالمی اس کی بنا اور دعویٰ کرنے کے لئے یہ مشاعرہ اُردو ادب کی ایک نئی تاریخ

ترتیب دے گا اور اس کی صدارت موسیقارِ اعظم نوشاد علی فرمائیں گے۔ گویا اس مشاعرے میں ادب کم اور موسیقی زیادہ ہونے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ مشاعرے تو عموماً ہوتے ہی رہتے ہیں، اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ اس "عالمی اردو کانفرنس" کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ کیا یہ ادارہ باقاعدہ رجسٹرڈ ہے؟ اس کا صدر کون ہے؟ سیکریٹری کون ہے؟ مجلسِ عاملہ میں کون کون اصحاب شامل ہیں؟ کیا اسے حکومتِ ہند کی سرپرستی اور انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نیز مختلف اداروں اور تنظیموں کا تعاون حاصل ہے۔ کیا اس مشاعرے میں صرف انہی شاعروں کو شریک کیا جائے گا جو حقیقتاً اور عملاً امنِ عالم کی بقا اور قومی یکجہتی کے لئے جدوجہد میں مصروف ہیں؟ کیا منتخب اور مدعو شعراء کے اعمال ناموں کی جانچ کر لی گئی ہے

لاکھوں روپے کے اخراجات کی کفالت کا کیا انتظام کیا گیا ہے۔ غیر ملکی شعراء کے لئے زرِ مبادلہ کا کیا بنے گا؟ اردو کی بقا، ترقی اور فروغ کے علاوہ امن، صلح اور آشتی کے لئے یہ مشاعرہ کہاں تک سود مند ثابت ہوگا، اس کا علم تو اس مشاعرہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، لیکن داعیان یعنی "عالمی اردو کانفرنس" کے اربابِ حل و عقد کو کھل کر سامنے آنا چاہئے۔ تاکہ عوام و خواص میں اعتماد کا ماحول پیدا ہو اور یہ تقریب بخیر و خوبی انجام پائے۔ کوئی چار برس قبل اتر پردیش میں بھی ایک ایسی ہی تحریک شروع کی گئی تھی اور عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد و انتظام کے سلسلے میں کافی پیش رفت بھی ہوئی تھی لیکن بوجوہ یہ تحریک سرے نہ چڑھ سکی۔ خیر سوال تو ہندوؤں کی 'ایک نفری' و 'دو نفری نمائندگی' کا تھا بیچ میں یہ عالمی اردو مشاعرہ آ ٹپکا۔ غالباً اس میں بھی ہندوؤں کو "پنج نفری" نمائندگی تو حاصل ہو ہی جائے گی۔ مجوزہ عالمی مشاعرے میں شرکاء کی تعداد کسی طور بھی ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہو سکتی۔ ڈیڑھ سو میں پانچ ہندو شاعر ہوں تو کیا تناسب بیٹھتا ہے، یہ سوال ریاضی سے تعلق رکھتا ہے۔ اردو سے نہیں۔

خط بہت طویل ہو گیا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ اسے 'شانِ ہند' میں شائع کر دیں گے اور اپنے تاثرات سے بھی قارئین کو محروم نہ رکھیں گے۔

امید کہ آپ شاداں و فرحاں ہوں گے۔

نیک خواہشات کے ساتھ۔ آپ کا مخلص

خیر طلب

ساحر ہوشیارپوری

مائی ڈیئر سرور صاحب!

تسلیمات

'شانِ ہند' کا جنوری کا شمارہ سامنے ہے۔ اس بات سے خوشی ہوئی کہ آپ اسے لیتھو سے آفسیٹ پر لے آئے، اور بھی زیادہ خوشی ہوتی اگر آپ اسے اردو ٹائپ سے چھاپنے کی ہمت کرتے۔ پاکستان میں نوری نستعلیق سے اخبار چھپ رہے ہیں لیکن تین وجوہ سے یہ عمل اپنی موجودہ صورت میں بہت خوب نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بہت مہنگا سودا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عبارت چھدری چھدری رہتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ جو لفظ کمپیوٹر کی "یادداشت" میں نہ ہوں یا 'خرچ' ہو چکے ہوں، وہ پھر ٹائپ میں آ جاتے ہیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر ابو الخیر صدیقی صاحب کراچی یونیورسٹی میں نستعلیق ٹائپ وضع کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکے ہیں لیکن ابھی کئی آنچوں کی کسر باقی ہے۔ ابھی شاید کئی برس لگیں گے جب نستعلیق پرنٹ آؤٹ ملنے لگے گا۔ ہمارے یہاں بھی ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں ایسا ہی دعویٰ کیا گیا لیکن پرنٹ آؤٹ نہیں دکھایا گیا۔ معلوم ہوا کہ سرکاری امداد اور سہولتیں حاصل کرنے کے لئے وزیر اعظم کے آس پاس کے لوگوں نے ایک سازش کی تھی۔ اگر سویڈن کی توپوں اور جرمن پنڈبیوں کی رشوتوں کا معاملہ اتنا گرم نہ ہوتا، تو اردو نستعلیق کمپیوٹر کے اس فراڈ کے سلسلے میں بھی کمیشن بٹھانے کی مانگ کی جا سکتی تھی۔ آخر اردو کے ٹھیکیدار حکومت سے کتنی دولت بٹوریں گے؟ کتنے مراعات اردو کے نام پر صرف چند افراد حاصل کریں گے؟

آپ نے "بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟" کے تحت بڑی جرأت سے "دوردرشن کے عوام سے بھدے مذاق" کے بارے میں لکھا ہے۔ ذرا یہ چھان بین بھی کیجئے کہ وزیر اعظم سے اردو نستعلیق کمپیوٹرائزڈ ٹائپ رائٹر کی دوردرشن کے آدھے گھنٹے کے پروگرام میں "پبلسٹی" کرائی گئی لیکن پرنٹ آؤٹ نہیں دکھایا گیا۔ کیمرہ ٹرک سے یہ فراڈ بھی کیا جا سکتا تھا جسے فلم کی اصطلاح میں "جی ٹرنگ" کہتے ہیں، یہ بھی نہیں کیا گیا، کہ کوئی عدالت میں نہ گھسیٹ لے جائے۔

آپ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے اس کی چھان بین کریں کہ کیا وجہ ہے کہ ایک برس میں کسی سرکاری ادارے یا غیر سرکاری ادارے نے اس نستعلیق کا ایک صفحہ کیا، ایک پیراگراف کیا، ایک سطر بھی نہیں، ایک جملہ تک نہ چھاپا۔ وہ نستعلیق ٹائپ رائٹر کہاں ہے؟ اگر آپ کی [illegible] اس تفتیش کی اجازت دیں تو حکومت سے مطالبہ کیجئے کہ سی بی آئی کے ذریعہ تفتیش کرائے۔

اس شمارے میں ایک شذرہ آپ نے لکھا ہے جو نادرست اطلاعات پر مبنی ہے۔ ہر برس آل انڈیا ریڈیو ۲۵ جنوری کو سب زبانوں کا مشاعرہ کراتا ہے، اس کے لئے نظمیں منتخب کرنے کا کام مختلف کمیٹیوں کے سپرد ہوتا ہے۔ آپ کو جس نے بھی یہ اطلاع دی کہ ۲۶ برس میں پہلی بار اب کے ایک ہندو شاعر کی اردو غزل منتخب کی گئی، تو اس نے آپ کو دھوکہ دیا۔ میں آل انڈیا ریڈیو سے ریٹائر ہو چکا ہوں، اور غلط بات کی تردید کرنا میرا سرکاری فرض نہ سہی، لیکن ایک غلط بات کی تردید مجھ پر اس لئے فرض ہے کہ میں حقیقتِ حال سے واقف ہوں۔ فراق گورکھپوری، آنند نرائن ملا، [illegible] تو چند نام ہیں جو اس وقت فوری طور پر ذہن میں آئے جنھوں نے آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر اس "سروبھاشا کوی سمیلن" میں شرکت کی۔ کمیٹی، جو اردو کیلئے بنتی ہے، اس میں غیر مسلم بھی ہوتے ہیں۔ اور عام طور سے غیر مسلم ہی چیئرمین رہے ہیں۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر سارے ہندوستان سے اسٹیشن اپنے یہاں سے نشر ہونے والا کلام بھیجتے ہیں جو پہلے نچلی سطح پر منتخب ہوتا ہے پھر اعلیٰ سطح پر انتخاب ہوتا ہے۔ آپ اردو کے عاشقوں میں سے ہیں، اور میری طرح آپ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو کیا کسی زبان کو کسی ایک فرقہ کی زبان تسلیم نہیں کرتے اس لئے آپ کے قلم سے ایک خلافِ واقعہ بات کا شذرہ میں جگہ پا جانا تکلیف دہ بات ہے، اس کی تردید ہونا چاہئے۔

کمال احمد صدیقی

جناب سرور تونسوی صاحب۔ تسلیم!

میں 'شانِ ہند' کا مطالعہ عموماً کرتا ہوں، اس نے ہمیشہ حق و صداقت کے لئے علم بلند کیا ہے، اور اردو زبان کے تئیں زیادتیوں اور ناانصافیوں کیخلاف آواز اٹھائی ہے۔ میں آپ کے اس جرأت مندانہ اقدام کی داد دیتا ہوں۔

روزنامہ 'ہندوستان' [illegible] ۱۷ اپریل میں ایک اشتہار نظر سے گزرا کہ عالمی اردو کانفرنس کے زیرِ اہتمام ۲۰ جون ۱۹۸۷ء کو پرگتی میدان نئی دہلی میں ایک عالمی اردو مشاعرے کا انعقاد کیا جا رہا ہے جس میں دنیا بھر کے نامور شعراء شرکت فرما رہے ہیں۔ لیکن اس اشتہار سے یہ بھید نہیں کھل سکا کہ اس کانفرنس کے پیچھے کونسی اردو نواز شخصیتیں کارفرما ہیں۔ اشتہار سے اس بات کا سراغ بھی نہیں ملتا کہ حکومت اور ملک کی اردو اکیڈمیوں کا تعاون اس انجمن کو کہاں تک حاصل ہے اور زر کی فراہمی کے ذرائع کیا ہیں۔ امید ہے آپ یہ مسئلہ اپنے اخبار میں اٹھا کر اردو زبان و ادب کیلئے مفید ثابت ہوں گے۔

خیر طلب

اوم کشن راحت

Phone : [illegible] Regd. No. D—(DN) 353
HAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 May 1987
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ اگر آپ نُورمحمّدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور ... منذ کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ... بنایا ہے، آپ یہاں تشریف لاکر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نُورمحمّدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳ ۰ ۰ ۴

آزادیِ تحریر یا تقریر کا یہ مطلب
نہیں کہ ملک کے امن کو غارت
کرنے کی کھلی چھٹی دی جائے

دہلی
شانِ ہند
جون ۱۹۸۷ء

خورشید و شبنم

درشیں میرٹھی

خورشید

اے گوہرِ شب چراغِ شبنم ۔۔۔ کیوں تو نے کیا ارادۂ رم،
نرگس نے نظر ملائی ہے کیا ۔۔۔ سوسن نے زباں چلائی ہے کیا
بلبل سے تو کچھ سنا نہیں ہے ۔۔۔ طوطی نے تو کچھ کہا نہیں ہے
سبزے نے تو سر نہیں اٹھایا ۔۔۔ غنچے نے تو منہ نہیں چڑایا
گلشن کی کوئی کلی ہنسی ہے ۔۔۔ یا بادِ صبا نے چھیڑ کی ہے

باعث تو مجھے بتا دے یعنی
آزردگی بے سبب چہ معنی،

شبنم

گلزارِ جہاں میں میری ہستی ۔۔۔ یعنی کہ یہ موتیوں کی بستی،
غیروں کے وجود پر ہے قائم ۔۔۔ اوروں کی نمود پہ ہے قائم
مجھکو نہ ملے اگر سہارا ۔۔۔ ممکن ہی نہیں مرا گزارا
گویا کہ یہاں قیام میرا، ۔۔۔ محتاجِ کرم ہے دوسروں کا
پھر تو ہی بتا کہ کیا بھروسہ ۔۔۔ ایسی مجبور زندگی کا

دیکر یہ جوابِ ناصحانہ
یکبارگی ہوگئی روانہ

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالاتِ حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اڈیٹوریل

فرقہ وارانہ فسادات

تقسیم ملک سے پہلے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے لیے شہر ملتان مشہور تھا جہاں سب سے پہلے ۱۹۲۲ء میں انگریز ڈپٹی کمشنر نے ایک زرخرید مسلمان سے محرم کے جلوس میں تعزیہ پر پتھر پھینکوا کر ہندو مسلم فساد کرایا۔ اس کے بعد ملتان کسی نہ کسی بہانے فرقہ وارانہ فسادات میں ملوث رہا۔ ملتان میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں اتنی کم تھی کہ ہندو فرقہ وارانہ فساد کی پہل کرنے کے بارے میں خواب میں بھی نہ سوچ سکتے تھے۔ مگر انگریز اپنی مطلب براری کے لیے تقسیم ملک تک اس گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا رہا۔ انگریز کے زمانے میں دیگر کئی مقامات پر بھی بڑے بھیانک ہندو مسلم فسادات ہوئے۔

تقسیم ملک کے بعد تحریک آزادی میں سنہری حروف میں لکھا جانے والا شہر میرٹھ ہندو مسلم فسادات کی آماجگاہ بن گیا۔ آزادی کے بعد چھوٹے موٹے جھگڑوں کے علاوہ ۱۹۶۲ء میں پہلا بڑا دنگا چندر بھانو گپت وزیراعلیٰ اتر پردیش کے عہد میں ہوا جبکہ چودھری چرن سنگھ وزیر داخلہ تھے۔ یہ فساد دراصل علی گڑھ کے فساد کا شاخسانہ تھا۔

اس کے بعد ۱۹۶۸ء میں شیخ عبداللہ کے آنے پر میرٹھ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس وقت چودھری چرن سنگھ وزیراعلیٰ تھے۔ اس کے بعد ہیم وتی نندن بہوگنا کی قیادت والی سرکار کے دور میں بھی میرٹھ پھر ہندو مسلم فسادات کی آگ میں جل اٹھا جبکہ نرنگ حلوائی کی دوکان پر ہوئے ایک قتل کی واردات کو اس کا منبع سمجھا گیا۔

۷ ستمبر ۱۹۸۲ء کو انتہائی خطرناک قسم کا فرقہ وارانہ فساد میرٹھ میں ہوا۔ اس وقت شری مشر وزیراعلیٰ تھے۔ یہ فساد شاہ گیٹ سے شروع ہو کر

میرٹھ کو مہینوں تک جہنم بنائے رہا۔

۲۸ فروری ۱۹۸۷ء کو میرٹھ میں پھر فسادات شروع ہوئے اور اب ۱۹/۱۸ مئی ۱۹۸۷ء کو یہ فرقہ وارانہ فساد سابقہ فسادات کی نسبت دوسرے طرز کا تھا۔

میرٹھ کے اس فساد سے میرٹھ کے مسلمان نہ صرف رنجیدہ ہیں بلکہ ایک حد تک خوف زدہ ہیں اور اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔

ہر مسلمان یہ کہہ رہا ہے کہ یہ فساد منصوبہ بندی کے تحت ہوا ہے۔ ہر ہندو کہہ رہا ہے کہ یہ فساد ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا۔ اور حکومت بھی یہ کہہ رہی ہے کہ یہ فساد پوری پلان کے مطابق ہوا۔

ہندوؤں کا یہ کہنا ہے کہ فساد مسلمانوں نے شروع کیا کیوں کہ بابری مسجد کے بارے میں مسلم لیڈروں نے عام مسلمانوں کو اس قدر مشتعل کر دیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے لڑنے مرنے کو تیار رہتے ہیں۔

اور مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ کچھ ہندوؤں نے مُنظم طور پر یہ پلان بنایا ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے لہٰذا یہ فساد انھیں 'ہندو رکھشک' حضرات کی وجہ سے ہوا۔ اور حکومت اس سلسلہ میں کھُل کر کچھ کہنے کو تیار نہیں کہ فساد میں پہل کس نے کی۔

ایک تو سرکار پہلے ہی دفاعی سودوں کے معاملے میں اپوزیشن کے الزامات کے باعث انتہائی طور پر پریشان ہے اور اس پر سابق ڈیفنس منسٹر جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی عوام میں روز افزوں مقبولیت سے اُتر پردیش کی حکومت خصوصی طور پر خوفزدہ ہے اور پھر حکومت کو اپنے ووٹوں کو ریزرو رکھنے کی بھی فکر ہے۔

اگر حکومت نیک نیتی سے فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں بلا خوف و خطر یہ اعلان کر دیا کرے کہ فساد شروع کس فرقہ کی طرف سے ہوا ہے تو یہ فسادات بہت جلد از خود بند ہو جائیں۔

بہرکیف فساد کسی فرقہ نے بھی پہلے شروع کیا ہو مگر میرٹھ کے فساد میں P.A.C کے بیہمانہ کردار کے باعث ہندوستان کا ہر مسلمان اس وقت رنجیدہ اور افسردہ ہے۔ اور سلیم العقل غیر مسلم حضرات بھی P.A.C کی اس بیان کردہ بہیمانہ کارروائی پر شرمندہ ہیں۔ جو بھی غیر مسلم خدا کی دی ہوئی عقل رکھتا ہے وہ یہ کیسے باور کر سکتا ہے کہ کروڑوں کی تعداد میں مسلمان یہاں سے چلے جائیں گے۔ تقسیم ملک کے وقت تو ایسا ممکن تھا کہ جس طرح پاکستان سے سب ہندوؤں کو نکال دیا گیا یا نکلنے پر مجبور کیا گیا اسی طرح ہندوستان کے سب مسلمانوں کو پاکستان جانے کے لئے کہا جا سکتا تھا۔ مگر اس وقت مہاتما گاندھی ایسی پاک شخصیت ہندوستان میں موجود تھی۔ انھوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں کو یہاں سے پاکستان جانے پر مجبور کیا جائے بلکہ انھوں نے پاکستان جانے والے لاکھوں مسلمانوں کو ریلیف کیمپوں سے اپنے اپنے گھروں میں واپس جانے کی تلقین کی اور حکومت کو اس سلسلہ میں ہر ممکن مدد دینے کو کہا۔ اور ہندوستان اُس وقت انسانیت کے ناطے ایسے بلند مقام پر تھا کہ جس پر اس کے دشمنوں نے بھی اس کے فخر کو محسوس کیا کہ مسلمانوں کا ایک ملک بن جانے پر بھی ہندوستانی عوام اور حکومت نے کروڑوں مسلمانوں کو اس ملک میں برابر کے حقوق دے کر یہیں رکھا۔ اور انھیں پاکستان کی طرف دھکیلا نہیں۔ اس کے باوجود یہاں کے مسلمانوں کی آنکھیں پاکستان کی طرف ہی لگی رہیں۔

رفتہ رفتہ ہندوستانی مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ انھیں یہیں رہنا ہے اور یہیں مرنا ہے۔ تو

> تقسیم ملک کے وقت تو ایسا ممکن تھا کہ جس طرح پاکستان سے سب ہندوؤں کو نکال دیا گیا یا نکلنے پر مجبور کر دیا گیا اسی طرح ہندوستان کے سب مسلمانوں کو پاکستان جانے کے لئے کہا جا سکتا تھا

انھوں نے اپنی روایات کے مطابق ہندوستان پر ہر پاکستانی حملہ کا جواب اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر دیا اور سب ہندوستانی عبدالحمید ایسے مسلمان شہیدوں کے مرہونِ منت ہیں جنھوں نے ہندوستان کو فتح سے ہمکنار کیا۔

آزادی کے بعد ان چالیس سالوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد میں خاصہ نہیں اچھا خاصہ اضافہ ہوا۔ حکومت نے فیملی پلاننگ کے فوائد کے پرچار پر کروڑوں روپیہ برباد کیا مگر ایک تو مسلمانوں کے مذہب میں فیملی پلاننگ کی اجازت نہیں۔ کیونکہ عورت مرد کی کھیتی ہے لہٰذا اسے اختیار ہے کہ وہ اس کھیتی سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرے۔ اور دوسرے مسلمانوں نے قصداً بچے زیادہ پیدا کرنے کے پروگرام پر عمل کیا تاکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مسلمانوں کی خفیہ تنظیموں نے مسلمانوں کو قصداً زیادہ بچے پیدا کرنے کی تلقین کی تاکہ ہندوستان میں ایک نئے پاکستان کے لئے بنیاد

> ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مسلمانوں کی خفیہ تنظیموں نے مسلمانوں کو قصداً زیادہ بچے پیدا کرنے کی تلقین کی ہے تاکہ ہندوستان میں ایک نئے پاکستان کیلئے بنیاد ڈالی جا سکے۔ اسی خفیہ اسکیم پر یار لوگوں نے [illegible] گذشتہ کئی سال سے [illegible] کا نیک فرض ادا کیا اور یہ اسی کارروائی کے بعد ہندو رکھشک جماعتیں یہ چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کو یہاں سے نکال دیا جائے تاکہ ہندوستان میں کسی نئے پاکستان کے خواب لینے والے مسلمانوں کو ان ہندو رکھشک جماعتوں کے ارادوں سے کوئی شک نہیں رہ جانا چاہیے۔

رکھا جاسکے۔ اور اس خفیہ اسکیم پر بار لوگوں نے سینے کا گوشت کھا کھا کر بچے پیدا کرنے کا نیک فرض انجام دیا۔ اور یہ اسی کا ردِّ عمل ہے کہ ہندو رکھشک جماعتیں یہ چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ تاکہ یہ ہندوستان میں کسی نئے پاکستان کے خواب نہ لے سکیں۔ اس لئے مسلمانوں کو ان ہندو رکھشک جماعتوں کے اس ارادے سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ جہاں مسلمانوں کی خفیہ اسکیم کا نشانہ وطن کے ٹکڑے کرنے کا ہے وہاں ان ہندو رکھشک جماعتوں کا نظریہ ملک کو تقسیم ہونے سے بچانا ہے۔

مسلمانوں کی اس خفیہ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کسی دوسرے جناح کی ضرورت تھی اور یہ کمی پوری کر دی جناب سید شہاب الدین نے۔ چونکہ سید صاحب انڈین فارن سروس کے رکن رہ چکے ہیں اور ان میں یہ سوجھ بوجھ کافی حد تک موجود ہے کہ مسلم عوام کا لیڈر بننے کی کوشش میں کامیاب ہو سکیں لہٰذا انھوں نے بابری مسجد کے معاملے کو بڑی شدت سے بڑھایا اور ملک کے مسلمانوں میں اس قدر اشتعال بھر دیا کہ وہ بابری مسجد کے حصول کے لئے کوئی بھی قدم اُٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ آپ کو شاید یاد ہوگا کہ پٹنہ میں مرارجی ڈیسائی نے سید شہاب الدین کو قائدِ اعظم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے اس نئے قائدِ اعظم نے بابری مسجد کا معاملہ اس شدت سے اُٹھایا کہ ملک کا عام مسلمان انھیں اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگا۔ اور سید صاحب نے مسلمانوں کو قومی دھارے میں مدغم ہونے کی بجائے مسلم عوام کو یہ سمجھایا کہ وہ ہر معاملہ میں اپنا علیحدہ حق مانگیں۔ لہٰذا سب سے پہلا یہ قدم اُٹھایا گیا کہ پولیس اور فوج میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ بھرتی کیا جائے۔ اور اب تو یہ کہا جا رہا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پانے والی پولیس میں مسلمانوں کی بھرتی ۵۵ فی صد کی جائے اور غیر مسلموں کی ۴۵ فیصد۔ بظاہر یہ باتیں بڑی معمولی سی ہیں اگر یہ بنیاد ہے ملک کے ٹکڑے کرنے کی۔ اور مسلمانوں کے ان مطالبات پر حکومت کا ردِّ عمل کیا ہوگا یہ تو وہی جانے مگر ملک کی اکثریت کو اس سلسلہ میں خاصی تشویش ہے کہ ملک کے مزید ٹکڑے نہ ہونے پائیں اور اس سلسلہ میں حکومت کو قصوروار ٹھہراتی ہے کہ حکومت محض مسلمانوں کے ووٹوں کی خاطر انھیں اکثریت پر مسلط کرنے کا عمل جاری رکھ رہی ہے۔ اور دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ ایک یہ بھی بڑی وجہ ہے کہ اکثریت حکومتی پارٹی کو اپنے ووٹوں سے دن دن محروم کرتی جا رہی ہے ہم جانتے ہیں! مسلمانوں کی بھرتی ہر محکمہ میں ہو مگر جبری مطالبہ کے خوف سے نہیں بلکہ ان کا حق سمجھ کر۔

بے شک سید شہاب الدین نے بابری مسجد کے موضوع پر اپنی لیڈرشپ کی بنیاد کسی حد تک پختہ کر لی مگر محترم شاہی امام عبداللہ بخاری صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں سے نکلتے دیکھی تو انھوں نے 'سونار کی ایک لوہار کی' کے مصداق مسلم ریلی کو خطاب کرتے وقت اپنی اشتعال انگیز تقریر سے سید شہاب الدین صاحب کے قائدِ اعظم بننے کو اچھی خاصی ضرب لگائی اور بابری مسجد کے بارے میں سید شہاب الدین صاحب کی نسبت مسلم عوام کو زیادہ مسموم کیا۔ اور یہ بابری مسجد کا شاخسانہ ہی ہے جو اس وقت ہر مسلمان کے دل میں بے چینی پیدا کئے ہوئے ہے اور معمولی سی کسی بھی واردات پر فرقہ وارانہ فساد ہو جاتا ہے۔ میرٹھ میں شبِ برأت کے پٹاخوں اور دلی میں سائیکل اسکوٹر کی ٹکر اس قدر ہولناک فساد کی وجہ ہو سکتی ہے، کوئی بھی عقلِ سلیم رکھنے والا ان وجوہات کو باور نہیں کر سکتا۔ درحقیقت دماغوں میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے سلسلے میں بھڑکائی گئی اشتعال انگیزی ایک دوسرے کے گلے پڑنے کا کارن ہے۔

P.A.C کا فرض فساد کو روکنا، امن قائم کرنا اور مظلوم کی مدد کرنا ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ P.A.C نے ایک فریق بن کر مخالف فریق پر گولیاں برسائیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ P.A.C کے دو جوانوں کو گھسیٹ کر لے جایا گیا اور ان کا اسلحہ چھین لیا گیا اور P.A.C کے باقی جوانوں کا بھی یہی حشر کیا جانے والا تھا کہ پی اے سی دستے کے انچارج مسٹر ترپاٹھی نے ملیانہ میں فائرنگ کا حکم دیا اور اس فائرنگ کا جو نتیجہ ہوا وہ ہم سب نے اخباروں میں پڑھ لیا ہے۔ اب اس کہانی میں کہاں تک سچ ہے اور کہاں تک جھوٹ یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا۔ اور اب ایک دوسرے کے بارے میں اتنی بداعتمادی پیدا ہو چکی ہے کہ اگر کوئی سچ بول بھی رہا ہو تو اُسے کوئی ماننے کو تیار نہیں ہے۔

بہرکیف مسلمانوں کے اس مطالبہ کو ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے کہ ایسے نازک موقعوں پر پی اے سی کے دستوں کے بجائے فوجی دستے بھجوائے جایا کریں۔ کیونکہ فوجی ذات پات کے جھگڑے میں نہیں پڑتے اور وہ حق و انصاف کا ساتھ دیتے ہوئے امن قائم کرتے ہیں۔

اور اگر حکومت واقعی ایمانداری سے چاہتی ہے کہ آئندہ ایسے ہولناک فساد نہ ہوں تو اسے ذیل کی معروضات پر عمل کرنا ہی ہوگا۔

۱۔ رام جنم بھومی یا بابری مسجد کا قضیہ

محترم شاہی امام عبداللہ بخاری صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں سے نکلتے دیکھی تو انھوں نے "سونار کی ایک لوہار کی" کے مصداق مسلم ریلی کے اجتماع کو مخاطب کرتے وقت اپنی اشتعال انگیز تقریر سے سید شہاب الدین صاحب کے قائدِ اعظم بننے کو اچھی خاصی ضرب لگائی اور بابری مسجد کے بارے میں سید شہاب الدین صاحب کی نسبت مسلم عوام کو زیادہ مسموم کیا

جیسے بھی ہو ختم ہونا چاہیئے۔ چونکہ دونوں فریق اس سلسلہ میں اس قدر مشتعل کر دیئے گئے ہیں کہ کوئی بھی فریق اپنا مسئلہ چھوڑنے کو تیار نہیں اور نہ ہی کسی باہمی مصالحت پر رضامند نظر آتا ہے۔ اس لئے اس قضیہ کا واحد حل یہی ہے کہ متنازعہ جگہ پر حسب سابق ہر دو فریقین پر پابندی لگا دی جائے۔

۲۔ فرقہ وارانہ فسادات کی چھان بین کے لئے جو کمیشن مقرر کئے جاتے ہیں آج تک ان میں سے کسی بھی کمیشن کی رپورٹ عوام کے سامنے نہیں آئی اور حکومت کا یہ رویّہ ان فسادات کو ہوا دینے کا موجب بنتا ہے۔ اگر حکومت کمیشن کی رپورٹ کو جلد از جلد شائع کر دے تو عوام کو یہ علم ہو سکے گا کہ فساد کس فریق کی وجہ سے شروع ہوا۔ جو بھی فریق قصوروار ہو گا ایک تو ویسے اخلاقی طور پر نادم ہو گا اور دوبارہ یہ کلنک اپنے ماتھے پر رکھنے سے بچے گا۔ دوسرے حکومت کو چاہیئے کہ قصوروار فریق پر اجتماعی جرمانہ عائد کرے اور اسے سختی سے وصول کرے اور جن لوگوں کا مالی اور جانی نقصان ہوا ہو اُسے اس جرمانے سے پورا کیا جائے۔

۳۔ جس قدر بھی دَل۔ سینائیں، رضاکارانہ مسلم تنظیمیں وغیرہ ہیں انھیں قانوناً ختم کر دیا جائے۔

۴۔ پوسٹر، ہینڈبل اور پمفلٹ شائع کرنے کے بارے میں پریس ایکٹ میں ترمیم کی جائے کہ پریس آفیسر سے پاس کرائے بغیر ایسے مواد کا شائع کرنا قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہے۔

۵۔ کسی بھی عبادت گاہ پر بیرونی لاؤڈ اسپیکر لگانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔

۶۔ فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے والی تقاریر کی اجازت نہ دی جائے۔ خالص مذہبی تقاریر اس سے مستثنیٰ ہونی ضروری ہیں۔

۷۔ اخبارات پر یہ پابندی لگائی جانی ضروری ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فضا کو مسموم کرنے والی خبریں، تصاویر اور اعلانات وغیرہ شائع نہ کر سکیں۔ آزادیٔ تحریر یا تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ مُلک کے امن و امان کو غارت کرنے کی کھُلی چھُوٹ دی جائے۔

۸۔ سرکاری دفاتر کے افسرانِ اعلیٰ سے کہا جائے کہ وہ ایسے ملازمین کے بارے میں جو فرقہ پرستی کی لعنت میں مُبتلا ہوں، خفیہ رپورٹ افسرانِ بالا کو ہر ماہ دیتے رہیں تاکہ ایسے فرقہ پرست ملازمینِ سرکار کی فرقہ پرستانہ سرگرمیوں کی اطلاع سرکار کو ملتی رہے۔ اور ایسے ملازمین کو ان کی سرگرمیوں کی رفتار کے مطابق وارننگ دی جاتی رہے۔ اور اگر پھر بھی وہ فرقہ پرستی کو ہوا دیتے رہیں تو انھیں سرکاری ملازمت سے جبری طور پر ریٹائر کر دیا جائے۔

۹۔ اسکولوں اور کالجوں میں جو بھی طالبعلم فرقہ پرستی کا مُرتکب ہو اُسے کم سے کم تین بار تنبیہ کرنے کے بعد اسکول یا کالج سے نکال دیا جائے۔

کاش کہ مُلک کا ہر فرد اپنے مذہب کے سنہری اصولوں پر ایمان داری سے عمل پیرا ہو اور اپنے آپ کو فرقہ واریت کے زہر سے بچائے۔

> اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے والے کو دنیا کے ہر فکر سے نجات مل جاتی ہے۔

قصّہ عالمی مُشاعرہ اور اُردو کمپیوٹر کا

شانِ ہند کی اشاعتِ گذشتہ میں "من کہ مکتوب الیہ" کالم میں دو مکتوباتِ گرامی منجانب جناب ساحر ہوشیارپوری اور جناب کمال احمد صدیقی شائع ہوئے ہیں۔ جن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ دونوں خطوط کمپیوٹر پر ماش کی نذر کر دئیے گئے اور شانِ ہند کو آلۂ کار بنا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی گئی ہے۔

ساحر ہوشیارپوری صاحب کے خط کا تعلق 'عالمی اُردو کانفرنس' کے محرک جناب علی صدیقی صاحب' اور کمال احمد صدیقی صاحب کے خط کا تعلق جناب عادل صاحب اور جناب علی صدیقی صاحب دونوں سے براہِ راست تھا۔ لہٰذا مناسب یہی سمجھا گیا کہ ان دونوں حضرات سے بالمشافہ گفتگو کی جائے اور ان خطوط سے متعلق جس طرح 'شانِ ہند' کو ملوث کیا گیا ہے اس حقیقت کو سامنے لایا جائے۔ مدیر 'شانِ ہند' کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی ندامت نہیں کہ اس نے یہ دونوں خطوط بغیر پڑھے محض ساحر ہوشیارپوری اور جناب کمال احمد صدیقی جیسے ثقہ اور سنجیدہ علمی، ادبی، مستند شخصیتوں کے اسمائے گرامی مکتوب نگاروں کی حیثیت میں پڑھتے ہی خطوط اپنے ساتھی مُقرب صحرائی کے حوالے کئے کہ وہ انھیں شائع کر دیں۔

چنانچہ اس سلسلے میں علی صدیقی صاحب نے بتایا کہ عالمی اُردو کانفرنس کی تحریک دو سال ہوئے شروع کی گئی تو عالمی اُردو مشاعرے کے سلسلے میں جن مقامی شعراء سے مشورہ کیا گیا اُن میں جناب ساحر ہوشیارپوری بھی تھے اور وہ عالمی اُردو کانفرنس کے صدر دفتر میں تشریف لائے۔ چونکہ اُنہیں اس وقت یہ یقین تھا کہ وہ اس عالمی مشاعرہ میں شرکت فرمائیں گے لہٰذا اُنھوں نے اس وقت وہ سوالات نہ اٹھائے جن کی تفصیل اُنھوں نے اپنے اس مکتوب گرامی میں فرمائی ہے۔ چونکہ کچھ ناگزیر وجوہات کے باعث یہ عالمی کانفرنس اور اس کا عالمی مشاعرہ کچھ وقت کے لئے ملتوی کیا گیا۔ اب جبکہ قریباً دو سال بعد یہ پروگرام عمل میں لانے کا وقت آیا تو میں نے اپنی مرضی سے شعراء کا انتخاب کیا۔ بدقسمتی سے

میری فہرست میں اس بار ساحر ہوشیار پوری کا نام نہیں تھا تو انہیں یہ سب کچھ یاد آگیا۔ یہ عالمی کانفرنس یا مشاعرہ میں اپنے بل بوتے پر کر رہا ہوں کسی سے میں نے ایک پیسہ نہیں لیا۔ نہ حکومت سے نہ ہی کسی ادارے یا عوام سے۔ میں نے مشاعرے کے موقعہ پر جو سوئیر شائع کیا ہے ایسا سوئیر آج تک دنیائے اردو میں شائع نہیں ہوا ہے اور میں نے اس کے لئے کہیں سے ایک اشتہار تک کی مانگ نہیں کی۔ میری مرضی ہے کہ میں کسی شاعر کو مدعو کروں یا نہ کروں کسی کو شکایت کا کیا حق ہے۔ ہاں اگر میں نے عوام سے عطیات لئے ہوتے یا حکومت نے میری مالی مدد کی ہوتی یا انجمن ترقی اردو یا کسی دوسرے ادارے نے کچھ دیا ہوتا تو ساحر صاحب تو کیا ہر کسی کو مجھ سے جواب طلبی کا حق تھا۔ ایسی حالت میں جبکہ اخراجات کا متحمل میں خود ہوں تو پھر مجھ سے جواب طلبی کا حق کسی کو کس طرح سے ہے۔ برسبیل تذکرہ علی صدیقی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے اردو اکادمی سے ایک لاکھ روپئے کی مدد چاہی مگر دلی کے لفٹننٹ گورنر نے ہماری درخواست کا کوئی جواب نہ دیا اور یار لوگوں نے مجھ سے غلط بیان کیا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے روپیہ دینے سے ایل۔ جی۔ کو روکا۔ علی صدیقی صاحب کو بڑی حد تک یہ صحیح شکایت تھی کہ پاکستانی شاعروں کو اردو اکادمی استقبالیہ دیتی ہے مگر اس عالمی مشاعرے میں بیسیوں ممالک سے شعرائے کرام تشریف لائے مگر اردو اکادمی کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ چار دانگ عالم سے آئے ہوئے مہمان شعرائے کرام کو چائے ہی پلا دیتی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اردو اکادمی اور اس کے کارکنان پاکستان نواز ہیں۔

اردو کمپیوٹر کے [illegible] جناب عادل صاحب بھی موجود تھے۔ مگر علی صدیقی صاحب نے فرمایا کہ کون بے عقل یہ کہتا ہے کہ اردو کمپیوٹر [illegible] حکومت نے [illegible] دیا ہے صدیقی صاحب نے ذرا تندی سے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ [illegible] صاحب بھی مرکنٹائل بینک سے ہم لوگوں نے لون لے کر اردو کمپیوٹر کا کام شروع کیا ہے۔ اردو کی دنیا میں اردو کمپیوٹر بنانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ خیانچہ اس کارنامہ پر ہماری درخواست پرویز پرا عظم صاحب نے محض اردو کی مقصدی ترقی اور [illegible] اردو کمپیوٹر کی رسم افتتاح [illegible] کا احسان [illegible] احمد صدیقی نے اس سلسلہ میں عدالت میں جواب طلبی ہوگی اور انشاء اللہ وہ یہ ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہیں گے کہ حکومت سے اس کام کے لئے روپیہ لیا گیا۔

مکتبہ [illegible] تعلقات سے مودبانہ گزارش ہے کہ [illegible] مخصوص [illegible] پر کچھ لکھا کریں تو زیادہ مناسب ہوگا

[illegible]

ایک خوشگوار قدم

۳ جولائی ۱۹۸۷ء کو ماسکو میں بھارت اتسو کے افتتاح کا خوشگوار فرض ادا کرتے ہوئے روس کے سربراہ جناب میخائل گورباچیف اور وزیر اعظم ہند جناب راجیو گاندھی نے جن باہمی تعلقات کا مظاہرہ فرمایا اس سے ہندوستان کی بہبودی چاہنے والے ہر فرد کو خوشی ہوگی۔ میخائل گورباچیف کا یہ فرمان کہ ہندوستان جس اندرونی اور بیرونی دباؤ کا سامنا کر رہا ہے وہ بہت جلد بخیر و خوبی ختم ہو جائے گا۔

اسی موقع پر سائنس اور ٹکنالوجی میں تعاون کا جو روس، ہند معاہدہ ہوا ہے وہ بھی اس امر کا مظہر ہے کہ ہمارا ملک اس زمرہ میں [illegible] تک ترقی کی راہ پر منزل تک پہنچ سکے گا۔

پاکستان ہندوستان کو خوفزدہ کرنے کے لئے امریکہ سے اسلحہ کے جو ڈھیر پاکستان میں لگا رہا ہے خدا اس سے ہر ذی روح کو خصوصاً پاکستانی عوام کو محفوظ رکھے۔ اور اگر خدانخواستہ پاکستان نے اس اسلحہ کے بل بوتے جنگ شروع کرنے کی حماقت کی تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے اپنے عوام بھی نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اس لئے ہند اور روس امن عالم [illegible] کی [illegible] میں اس کی کامیابی [illegible] دعا کرنی چاہیئے۔

بھارت اتسو امریکہ میں بھی منعقد کیا گیا تھا اور [illegible] ہونے کے باوجود ہم [illegible] وطن معاصرت [illegible] وطن پرستی سے کچھ نہیں سیکھا اور یہ اتسو پارینہ ہو کر رہ گیا۔ کاش کہ اب ہم ایک سال کے عرصہ میں روس کے عوام سے وطن دوستی اور ان کی تحریک امن عالم سے کچھ سیکھ سکیں اور اپنے ملک سے فرقہ وارانہ فسادات کا قلع قمع کر سکیں۔

جیسے بھی ہو ختم ہونا چاہیئے۔ چونکہ دونوں فریق اس سلسلہ میں اس قدر مشتعل کر دیئے گئے ہیں کہ کوئی بھی فریق اپنا مطالبہ چھوڑنے کو تیار نہیں اور نہ ہی کسی باہمی مصالحت پر رضامند نظر آتا ہے۔ اس لئے اس قضیہ کا واحد حل یہی ہے کہ متنازعہ جگہ پر حسبِ سابق دونوں فریقین پر پابندی لگا دی جائے۔

۲۔ فرقہ وارانہ فسادات کی چھان بین کے لئے جو کمیشن مقرر کئے جاتے ہیں آج تک ان میں سے کسی بھی کمیشن کی رپورٹ عوام کے سامنے نہیں آئی اور حکومت کا یہ رویّہ ان فسادات کو ہوا دینے کا موجب بنا ہے۔ اگر حکومت کمیشن کی رپورٹ کو جلد از جلد شائع کر دے تو عوام کو یہ علم ہو سکے گا کہ فساد کس فریق کی وجہ سے شروع ہوا۔ جو بھی فریق قصوروار ہو گا ایک تو ویسے اخلاقی طور پر نادم ہو گا اور دوبارہ یہ کلنک اپنے ماتھے پر نہ لگنے دے گا۔ دوسرے حکومت کو چاہیئے کہ قصوروار فریق پر اجتماعی جرمانہ عائد کرے اور اسے سختی سے وصول کرے اور جن لوگوں کا مالی اور جانی نقصان ہوا ہو اُسے اس جرمانے سے پورا کیا جائے۔

۳۔ جس قدر بھی دَل۔ سینائیں، رضاکار، مسلم تنظیمیں وغیرہ ہیں انھیں قانوناً ختم کر دیا جائے۔

۴۔ پوسٹر، ہینڈ بل اور پمفلٹ شائع کرنے کے بارے میں پریس ایکٹ میں ترمیم کی جائے کہ پریس آفیسر سے پاس کرائے بغیر ایسے مواد کا شائع کرنا قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہے۔

۵۔ کسی بھی عبادت گاہ پر بیرونی لاؤڈ اسپیکر لگانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔

۶۔ فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے والی تقاریر کی اجازت نہ دی جائے۔ خالص مذہبی تقاریر اس سے مستثنیٰ ہونی ضروری ہیں۔

۷۔ اخبارات پر یہ پابندی لگائی جانی ضروری ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فضا کو مسموم کرنے والی خبریں، تصاویر اور اعلانات وغیرہ شائع نہ کر سکیں۔ آزادیٔ تحریر یا تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ ملک کے امن و امان کو غارت کرنے کی کھلی چھٹی دی جائے۔

۸۔ سرکاری دفاتر کے افسران اعلیٰ سے کہا جائے کہ وہ ایسے ملازمین کے بارے میں جو فرقہ پرستی کی لعنت میں مبتلا ہوں، خفیہ رپورٹ افسرانِ بالا کو ہر ماہ دیتے رہیں تاکہ ایسے فرقہ پرست ملازمینِ سرکار کی فرقہ پرستانہ سرگرمیوں کی اطلاع سرکار کو ملتی رہے۔ اور ایسے ملازمین کو ان کی سرگرمیوں کی رفتار کے مطابق وارننگ دی جاتی رہے۔ اور اگر پھر بھی وہ فرقہ پرستی کو ہوا دیتے رہیں تو انھیں سرکاری ملازمت سے جبری طور پر ریٹائر کر دیا جائے۔

۹۔ اسکولوں اور کالجوں میں جو بھی طالب علم فرقہ پرستی کا مرتکب ہو اُسے کم سے کم تین بار تنبیہ کرنے کے بعد اسکول یا کالج سے نکال دیا جائے۔

کاش کہ ملک کا ہر فرد اپنے مذہب کے سنہری اصولوں پر ایمانداری سے عمل پیرا ہو اور اپنے آپ کو فرقہ واریت کے زہر سے بچائے۔

> اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے والے کو دنیا کے ہر فکر سے نجات مل جاتی ہے۔

قصہ عالمی مُشاعرہ اور اُردو کمپیوٹر کا

شانِ ہند کی اشاعتِ گذشتہ میں "من کہ مکتوب الیہ" کالم میں دو مکتوباتِ گرامی منجانب جناب ساحر ہوشیارپوری اور جناب کمال احمد صدیقی شائع ہوئے تھے۔ جن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ دونوں خطوط کسی [illegible] پر خاش کی بنا پر لکھے گئے اور 'شانِ ہند' کو [illegible]۔ ساحر اپنے دل کی بھڑاس نکالی گئی ہے۔

ساحر ہوشیارپوری صاحب کے خط کا تعلق 'عالمی اُردو کانفرنس' کے محرک جناب علی صدیقی صاحب' اور کمال احمد صدیقی صاحب کے خط کا تعلق جناب عادل صاحب اور جناب علی صدیقی صاحب دونوں سے براہِ راست تھا۔ لہٰذا مناسب یہی سمجھا گیا کہ ان دونوں حضرات سے بالمشافہ گفتگو کی جائے اور ان خطوط سے متعلق جس طرح 'شانِ ہند' کو ملوث کیا گیا ہے اس حقیقت کو سامنے لیا جائے۔

مدیر 'شانِ ہند' کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی ندامت نہیں کہ اس نے یہ دونوں خطوط بغیر پڑھے محض ساحر ہوشیارپوری اور جناب کمال احمد صدیقی جیسے ثقہ اور میچورڈ علمی، ادبی، مستند شخصیتوں کے اسمائے گرامی مکتوب نگاروں کی حیثیت میں پڑھتے ہی خطوط اپنے ساتھی مُضطرب صحرائی کے حوالے کئے کہ وہ انھیں شائع کر دیں۔

چنانچہ اس سلسلے میں علی صدیقی صاحب نے بتایا کہ عالمی اُردو کانفرنس کی تحریک دو سال ہوئے شروع کی گئی تو عالمی اُردو مشاعرے کے سلسلے میں جن مقامی شعراء سے مشورہ کیا گیا اُن میں جناب ساحر ہوشیارپوری بھی تھے اور وہ عالمی اُردو کانفرنس کے صدر دفتر میں تشریف لائے۔ چونکہ اُنہیں اس وقت یہ یقین تھا کہ وہ اس عالمی مشاعرہ میں شرکت فرمائیں گے لہٰذا اُنھوں نے اس وقت وہ سوالات نہ اٹھائے جن کی تفصیل اُنھوں نے اپنے اس مکتوب گرامی میں فرمائی ہے۔ چونکہ کچھ ناگزیر وجوہات کے باعث یہ عالمی کانفرنس اور اس کا عالمی مشاعرہ کچھ وقت کے لئے ملتوی کیا گیا۔ اب جبکہ تقریباً دو سال بعد یہ پروگرام عمل میں لانے کا وقت آیا تو میں نے اپنی مرضی سے شعراء کا انتخاب کیا۔ بدقسمتی سے

میری فہرست میں اس بار ساحر ہوشیار پوری کا نام
نہیں تھا تو انہیں یہ سب کچھ یاد آگیا۔ یہ عالمی کانفرنس
یا مشاعرہ تھا۔ اپنے بل بوتے پر کر رہا ہوں، کسی سے میں
نے ایک پیسہ نہیں لیا۔ نہ حکومت سے نہ ہی کسی ادارے
یا عوام سے۔ میں نے مشاعرے کے موقعہ پر جو سوونیر
شائع کیا ہے ایسا سوونیر آج تک دنیائے اردو میں
شائع نہیں ہوا ہے اور میں نے اس کے لئے کسی سے
ایک اشتہار تک کی مانگ نہیں کی۔ میری مرضی ہے کہ
میں کسی شاعر کو مدعو کروں یا نہ کروں، کسی کو شکایت
کا کیا حق ہے۔ ہاں اگر میں نے عوام سے عطیات
لئے ہوتے یا حکومت نے میری مالی مدد کی ہوتی، یا
انجمن ترقی اردو یا کسی دوسرے ادارے نے کچھ دیا
ہوتا، تو ساحر صاحب تو کیا ہر کسی کو مجھ سے جواب
طلبی کا حق تھا۔ ایسی حالت میں جبکہ اخراجات کا
متحمل میں خود ہوں تو پھر مجھ سے جواب طلبی کا حق
کسی کو کس طرح سے ہے۔ برسبیل تذکرہ علی صدیقی

صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے اردو اکادمی سے
ایک لاکھ روپئے کی مدد چاہی مگر دلی کے لفٹننٹ
گورنر نے ہماری درخواست کا کوئی جواب نہ دیا
اور یار لوگوں نے مجھ سے غلط بیان کیا کہ کنور مہندر
سنگھ بیدی سحر نے روپیہ دینے سے ایل۔ جی۔ کو
روکا۔ علی صدیقی صاحب کو بڑی حد تک یہ صحیح
شکایت تھی کہ پاکستانی شاعروں کو اردو اکادمی
استقبالیہ دیتی ہے مگر اس عالمی مشاعرے میں
بیسیوں ممالک سے شعرائے کرام تشریف لائے مگر
اردو اکادمی کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ چار دانگِ عالم
سے آئے ہوئے مہمان شعرائے کرام کو چائے ہی پلا
دیتی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اردو اکادمی اور
اس کے کارکنان پاکستان نواز ہیں۔
اردو کمپیوٹر کے افتتاح [illegible] جناب [illegible] صاحب
بھی موجود تھے، مگر علی صدیقی صاحب نے فرمایا کہ
کون بے عقل یہ کہتا ہے کہ اردو کمپیوٹر کے [illegible]

حکومت نے زرِ کثیر دیا ہے۔ صدیقی صاحب نے
ذرا تندی سے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے
فرمایا کہ [illegible] مرکنٹائل بینک سے
ہم لوگوں نے لون لے کر اردو کمپیوٹر کا کام شروع
کیا ہے۔ اردو کی دنیا میں اردو کمپیوٹر بنانا کوئی معمولی
کام نہیں ہے۔ چنانچہ اس کارنامہ پر ہماری درخواست
پر وزیرِ اعظم صاحب نے محض اردو کی مقصدی ترقی
اور اردو دوستی کے صدقے اردو کمپیوٹر کی رسم
افتتاح فرمانے کا احسان [illegible] کمال احمد صدیقی نے
اس [illegible] میں عدالت میں جواب طلبی ہوگی اور
انشاء اللہ وہ یہ ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہیں گے
کہ حکومت سے اس کام کے لئے روپیہ لیا گیا۔
مکتوب نگار حضرات سے مؤدبانہ گزارش
ہے کہ وہ شعوری [illegible] کچھ لکھا کریں تو
زیادہ مناسب ہوگا

[illegible]

ایک خوشگوار قدم

۳ جولائی ۱۹۸۷ء کو ماسکو میں
بھارت اتسو کے افتتاح کا خوشگوار فرض ادا کرتے
ہوئے روس کے سربراہ جناب میخائل گورباچیف
اور وزیرِ اعظم ہند جناب راجیو گاندھی نے جن باہمی
تعلقات کا مظاہرہ فرمایا اس سے ہندوستان
کی بہبودی چاہنے والے ہر فرد کو خوشی ہوگی۔
میخائل گورباچیف کا یہ فرمان کہ ہندوستان جس
اندرونی اور بیرونی دباؤ کا سامنا کر رہا ہے، وہ
بہت جلد بخیر و خوبی ختم ہو جائے گا۔
اسی موقع پر سائنس اور ٹکنالوجی میں
تعاون کا جو روس ہند معاہدہ ہوا ہے وہ بھی اس

امر کا مظہر ہے کہ ہمارا ملک امن [illegible] میں [illegible]
تک ترقی کی [illegible] منزل تک پہنچ سکے گا۔
پاکستان ہندوستان کو خوفزدہ کرنے کے
لئے امریکہ سے اسلحہ کے جو ڈھیر پاکستان میں لگا
رہا ہے خدا اس سے ہر ذی روح خصوصاً پاکستانی
عوام کو محفوظ رکھے۔ اور اگر خدانخواستہ
پاکستان نے اس اسلحہ کے بل بوتے جنگ
شروع کرنے کی حماقت کی تو اسے یہ سمجھ لینا
چاہیئے کہ اس کے اپنے عوام بھی نیست و نابود ہو
جائیں گے۔ اس لئے ہند اور روس امن عالم

[illegible] کی کوشش [illegible] ان کی
کامیابی کے لئے [illegible] دعا کرنی چاہیئے۔
بھارت اتسو امریکہ میں بھی منعقد کیا گیا
تھا اور کروڑہا روپیہ صرف ہونے کے باوجود ہم
لیڈران وطن [illegible] وطن پرستی سے
کچھ نہیں سیکھا اور یہ اتسو یادِ رفتہ بن کر رہ گیا۔
کاش کہ اس اہم ایک سال کے عرصہ میں روس
کے عوام سے وطن دوستی اور ان کی تحریک
امن عالم سے کچھ سیکھ سکیں اور اپنے ملک سے
فرقہ وارانہ فسادات کا قلع قمع کر سکیں۔

تغلق عالمی
صاحب اور
تغلق جناب عاد
صاحب دونوں

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

الجھ گئے ہیں شب و روز گتھیاں بن کے
گذر رہی ہیں یہ گھڑیاں پہیلیاں بن کے

لگی ہے نوکِ چمن میں نواسرائی پر
کریں گے گزشت ہمیں حیلے سلسلاں بن کے

تمازتِ غمِ دوراں جو برقرار رہی
برس پڑیں گے کسی روز بدلیاں بن کے

عجب ہے عہدِ رواں میں کسی کا جی لینا
کہ دشمنی بھی ملے قصِ دوستاں بن کے

چلو کٹی تو سہی عمرِ نامراد ایسی
کہ سانس لیتے کہاں تک ریاں رباں بن کے

نہیں ہے سہل یہاں خود سے روبرو ہونا
اڑے گا آپ کا چہرہ ہوائیاں بن کے

وہی جو مخزنِ انوار تھا قیامت ہے
سروں پہ گرنے لگا ہے وہ بجلیاں بن کے

دیارِ زیست میں ہر چیز ہے بزعمِ دروں
یقیں خام نکلنا نہ کیوں گماں بن کے

نہ جانے کتنے ہی موسیٰ نہ جانے کتنے کلیم
ترے حریم سے نکلے ہیں بے زباں بن کے

کہاں وجود میں آتی ہے شخصیت ساری
ہم ابھی ذات کی رہتے ہیں دھجیاں بن کے

حقیر پھر تری پہچان کس طرح ہوگی
بگڑ بھی سکتی ہے قسمت تری یہاں بن کے

عالمی امن کی بقا کے لئے

تاریخ کا اوّلین

عالمی مشاعرہ

خرم قیومی

مشاعرے مقامی اور قومی حدود سے نکل کر اب عالمی سطح پر پہنچ گئے ہیں' لیکن اس میں تشویش کی کیا بات ہے۔ ادب تمام جغرافیائی حدوں سے بالاتر ہے۔ اس لئے مشاعروں کا اہتمام عالمی سطح پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں پہلا مشاعرہ گزشتہ دنوں راجدھانی کے پرگتی میدان میں بڑے زور و شور سے ہوا۔ عالمی امن کے فروغ اور قومی یکجہتی کے لئے اس مشاعرے کا اہتمام عالمی اُردو کانفرنس نے کیا تھا اگرچہ عالمی اُردو کانفرنس کے عزائم اور نصب العین مُطالعہ کے بعد بہت ہی جامع اور اہم محسوس ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہوئے اتنے بڑے بجٹ کے مُشاعروں کا انعقاد شاید اس کے عملی پروگراموں کو کبھی پورا نہ ہونے دے گا اور ہر سال اثر و رسوخ سے حاصل کیا ہوا بجٹ عالمی مشاعرے کی نذر ہو جایا کرے گا۔

دعوت ناموں کی طباعت' اسٹیج کی سجاوٹ قیام و طعام کی نظامت اور شان و شوکت کی روایت پر جس قدر دھیان دیا گیا اگر اتنی ہی توجہ شاعروں کے انتخاب پر دی جاتی تو سننے والے توقع رکھتے ہیں کہ اس سے دونوں ہی فائدہ اٹھائیں گے۔ کیوں کہ ایک کو عالمی مشاعرہ اگلے سال بھی کرانا ہے اور دوسرے کو اس میں شرکت کے لئے انتظار کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اتنے ہی بڑے بجٹ سے واقعی مشاعرہ کرنا مقصود ہوتا تو ابھی ہندوستان میں ایسے شاعروں کی کمی نہیں کہ جن کے کلام میں بیداری' ناسازگار حالات سے مقابلہ کرنے اور سماج کی بدلتی ہوئی قدروں کی کیفیات اور تاثرات بدرجۂ اس کو مصلحتی مشاعرہ نہیں کہتے۔ اگر مشاعرے سے ایک بھی شعر گھر واپس آ جاتا ہے تو سننے والے کی زحمت اور منتظم کی محنت کارآمد ہو جاتی ہے۔ اگر یہ بات انتہائی افسوس کے ساتھ کہی جائے کہ مشاعرے میں شروع سے آخر تک شاعر اور سامع میں کوئی ربط ہی پیدا نہ ہو سکا تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کا سبب معلوم نہیں کیا ہو سکتا ہے۔ شاعروں کا نامناسب انتخاب یا غلط سامعین کو دعوت۔ کیوں کہ داخلہ پہلے سے سپلائی شدہ کارڈ ہی کے ذریعہ تھا۔ مشاعرے میں یکے بعد دیگرے کم و بیش ۲۴ شعراء اور شاعرات نے جی جان سے محظوظ کرنے کی کوشش کی جو کسی حد تک ناکام رہی۔

مشاعرے میں اوّل تا آخر جو کچھ بھی سامعین نے ملاحظہ فرمایا اس کے بارے میں مذکورہ بالا تاثرات انھیں کے ہیں ہمارے نہیں۔ ہم صرف ان کے اور منتظمین کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں اور

عالمی اُردو کانفرنس کے عالمی مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال روزنامہ "قومی آواز" کے شکریہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ جناب خرم قیومی کو غالباً علم نہیں کہ عالمی اُردو کانفرنس کا یہ مشاعرہ کسی اثر و رسوخ سے جمع کئے ہوئے بجٹ کا رہینِ منت نہیں تھا اور نہ ہی حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی مالی مدد کی تھی۔ بلکہ عالمی اُردو کانفرنس کے محرک جناب علی صدیقی نے جملہ اخراجات اپنی گرہ سے کئے ہیں اس لئے اسے مصلحتی مشاعرہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے (ایڈیٹر)

الم موجود ہے لیکن مثل ہے کہ چراغ تلے اندھیرا، ملک کے علاوہ تمام دُنیا کے وہ ہندوستانی شاعر جو اپنی اپنی حکموں پر گمنامی اور فارغ البالی کی زندگی گذار رہے ہیں، ان کو زحمتِ سخن دی گئی تھی جن کے لئے شاعری تفریحِ طبع سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اسی لئے شاید سامعین نے ان کو سنجیدگی سے نہیں لیا اگر واقعی شعراء کے انتخاب میں سنجیدگی، غیر جانبداری اور دانشمندی برتی جاتی تو یہ نہ صرف عالمی بلکہ کامیاب تاریخی مشاعرہ ثابت ہوتا۔ لیکن منصوبہ بندی کرنے والے نے مشاعرے کے معیار کو صرف فائیو اسٹار بنانے کی کوشش کی اور شاعر و سامع کے درمیان رابطہ کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔

لوک سبھا کے اسپیکر جناب بلرام جاکھڑ نے مشاعرے کا افتتاح رات کو ٹھیک ۸ بجے کیا انھوں نے اپنی تقریر میں شاعروں کو ایسے طبقہ سے تعبیر کیا کہ جس کے قلم میں انقلاب برپا کرنے کی طاقت ہوتی ہے اور جو اپنی تحریروں سے قوموں کے ذہنوں کو بدل دیتا ہے۔ انھوں نے شاعروں کو تلقین کی کہ وہ اپنے کلام سے قومی یک جہتی کو فروغ دیں اور اپنے کلام کے ذریعہ امن کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں۔ انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ باوجود اس کے کہ انسان بہت ترقی یافتہ ہو گیا ہے، اس کا ذہن اتنا ہی محدود ہوتا جا رہا ہے وہ پیار و محبت کھو بیٹھا ہے اور ایسے سنگین حالات میں اس وقت شعراء کو ضرورت ہے کہ وہ ایک مرتبہ پھر ماحول میں روح پھونک سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ مژدہ بھی سنایا کہ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے ان سے ملاقات کے دوران جب مشاعرہ کا ذکر آیا تو کہا کہ اس مشاعرے میں حوصلہ افزائی کے لئے ایک شاعر کو ایوارڈ دیا جانا چاہیئے۔

تقریر کے بعد انھوں نے دستِ خاص سے کچھ ایوارڈ تقسیم کئے جو کچھ تو اردو کے خدمت گاروں کے حصے میں آئے اور کچھ خدمتگاروں سے خدمت لینے والوں کی طرف بھی گئے۔ اس سلسلہ کا پہلا ایوارڈ ماہرِ غالبیات مالک رام کی خدمت میں پیش کیا گیا، جسے دلی دکنی عالمی ایوارڈ کا نام دیا گیا۔ ٹریڈ فیئر اتھارٹی کے سربراہ مسٹر محمد یونس ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں دوسرے تھے جنھیں بہادر شاہ ظفر عالمی ایوارڈ دیا گیا۔ تیسرا ایوارڈ بہادر شاہ ظفر کے پڑپوتے پرنس مظفر شکوہ کو جو نیو یارک سے تشریف لائے تھے، پیش کیا گیا۔ موسیقارِ اعظم نوشاد، جو صدرِ مشاعرہ بھی تھے چوتھا ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں تھے۔ وزیر اعظم کے بیس نکاتی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے پانچواں ایوارڈ زین جی رنگون والا کو دیا گیا۔ یہ ایوارڈ اُن کے صاحبزادے نے حاصل کیا۔ چھٹا ایوارڈ ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کو دیا گیا جن کی شعری خدمات نے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ ساتواں ایوارڈ اردو شاعری کی اعلیٰ خدمات کے لئے مشہور شاعر اور نغمہ نگار مجروح صاحب سلطانپوری کو پیش کیا گیا۔ گوپال داس نیرج بھی شعری خدمات پر ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں آٹھویں نمبر پر تھے۔ احمد فراز کا نام نواں تھا

دسواں ایوارڈ ٹورنٹو کی شاعرہ نزہت صدیقی کے روبرو تھا۔ اردو کمپیوٹر کی ترقی کے لئے گیارھواں ایوارڈ مسٹر محمد یونس خاں کے صاحبزادے عادل شہریار کے سپرد کیا گیا۔ ایوارڈوں کا سلسلہ جب ختم ہوا تو نزہت صدیقی نے موقع غنیمت جان کر اپنے شعری مجموعے "ندائے امن" کی رسمِ اجراء محمد یونس خاں سے کرائی، تالیاں بجیں اور اسی کے ساتھ مشاعرے کا آغاز کیا گیا۔

نظامت مشہور ناظم ثقلین حیدر کے سپرد تھی جو اس مشاعرے میں بالکل بھی جوہر نہ دکھا سکے اگر کہیں جرأت بھی کرتے تھے تو قدغن لگا دیا جاتا تھا اس لئے مجبوراً جس طرح مدرسہ کا استاد بچوں

کی حاضری لیتا ہے وہ شاعروں کے نام پکارتے رہے۔ سب سے پہلے شمع ہمدانی کو زحمتِ سخن دی گئی جنھوں نے خراب ساؤنڈ سسٹم میں اپنی مترنم آواز میں مکمل کی، جو شعر میں سن سکا وہ آپ پڑھیئے:-

" خشک پتوں سا سمجھ کر جو جلاتی ہے ہمیں
ابر بن جائیں جو اس آگ کو ٹھنڈا کر دے
اپنی آنکھوں پہ جو روشن ہوں اُمیدوں کے دیئے
کوئی موسم ہو اسے وقفِ تماشا کر دے "

حیدر آباد کے بزرگ شاعر کنول پرشاد کنول بھی مشاعرے کی زینت تھے۔ دوسرے ہی نمبر پر ان کی ضرورت پڑ گئی۔ جو شعر سنائے ان میں چند آپ بھی سنیئے:-

" آگ گلشن میں جو لگاتے ہیں
اُن کے آنگن بھی کل دھواں ہونگے۔ "

فاروق ارگلی صحافی، پبلشر اور نہ جانے پہلے کیا کیا تھے لیکن اب شاعری بھی کرنے لگے ہیں۔ سامعین دہائی دیتے رہے اور وہ نظم کہتے رہے:

" کہیں گیتا کا حوالہ کہیں قرآن کا تھا
اُس کی ہر بات میں خطرہ مرے ایمان کا تھا۔ "

ہند کے مشہور صحافی اور کوی کنہیا لال نندن نے اس مشاعرے میں اپنی شرکت پر اظہارِ تشکر کیا اور ایک طویل نظم پیش کی۔ ان کے بعد سری نگر کی سیدہ نسرین نقاش جو "سرکتا آنچل" کی ایڈیٹر بھی ہیں، کو زحمت دی گئی ؎

" میں زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا
لیکن درِ قفس نہ کھلا تیرے شہر میں
ہم تیری جستجو میں خدا تک پہنچ گئے
لیکن ترا پتہ نہ چلا تیرے شہر میں "

ساغر اعظمی مشاعروں کے شاعر ہیں، ان کو

خرم بیتوی صاحب نے اکثر شعرائے کرام سے ناانصافی یوں کی ہے کہ ان کے کلام کی جھلک تک نہیں دکھائی، محض اپنی اس شکایت کو درست ثابت کرنے کے لئے کہ شعراء کا انتخاب ٹھیک نہیں ہے۔ راقم الحروف نے اس مشاعرے کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھی ہے۔ مثال کے طور پر نور پرکار صاحب کی نظم نہایت عمدہ تھی۔ (ایڈیٹر)

معلوم ہے کہ سامعین کی خواہشات مشاعرے میں کیا ہوتی ہیں۔ قدرے تمہید اور پھر سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے یوں گویا ہوئے۔

دیوتا میرے آنگن میں اتریں گے کیا

زندگی بھر یہی سوچتا رہ گیا

میرے بچوں نے تو چاند کو چھو لیا

اور میں چاند کو پوجتا رہ گیا۔"

اب نیپال کے شاعر گلاب کنن کو بلایا گیا۔ وہ آئے اور ہمت سمیٹ کر یہ شعر پڑھا ؎

جاگتا ہوا بھی آج کیوں سو گیا انساں

حیوانیت کی بھیڑ میں کیوں کھو گیا انساں

انھوں نے ایک نظم بھی سنائی ـــــ جلیل عشرت بنگلہ دیش سے آئے تھے اُن کا ایک شعر دیکھئے

دینے والو مجھے اس گھر کی ضرورت کیا ہے

قبر سے لاش اٹھا کر مری باہر رکھ دو

ایسے خراب ماحول میں اگر شاعر میں صلاحیت ہے تو وہ کچھ نہ کچھ جوہر دکھا ہی جاتا ہے۔ یہی ہوا۔ آگرہ کی ششی تیواری نے مترنم آواز میں پورے اعتماد سے یہ شعر پڑھے ؎

" درمیاں فاصلہ نہیں ہوتا

آدمی غم زدہ نہیں ہوتا

کیسے کیسے ہی رشتے ناتے ہیں

ورنہ کوئی سگا نہیں ہوتا۔"

مشاعروں کی نظامت میں ماہر ملک زادہ منظور احمد کے اشعار سنیئے ؎

اب خون کو مئے قلب کو مینا نہ کہا جائے

اس دور میں مقتل کو بھی میخانہ کہا جائے

جو بات کہی جائے وہ تیور سے کہی جائے

جو شعر کہا جائے حریفانہ کہا جائے "

کناڈا ٹورنٹو سے آئی مہمان شاعرہ سیدہ نزہت صدیقی نے نئے لہجے کی غزل سنائی۔ چند شعر آپ کی نذر ؎

سوچو تو وہ دن کتنا سندر ہوگا

جس دن سارا عالم ایک گھر ہوگا

ساری خلیجیں نفرت کی جو پاٹ سکے

خالق تیرے پاس تو وہ منتر ہوگا

بنگلہ دیش کے نذر نیازی نے سماج میں بدلتے ہوئے اقدار کے احساسات کو پیش کیا ؎

" فکر و نظر کا رنگ کچھ ایسا بدل گیا

انسان کی حیات کا نقشہ بدل گیا۔"

ہلال سیوہاروی نے سنجیدہ ماحول کو قہقہوں میں تبدیل کر دیا۔ غریبی کے موضوع پر چار مصرعے دیکھئے ؎

غریبی کو مٹا دینے کی باتیں صرف باتیں ہیں

جو خود دولت کے بھوکے ہیں غریبی کیا مٹائیں گے

غریبوں کا لہو تو آج کی کاروں کا ڈیزل ہے

غریبی مٹ گئی تو آپ کیا رکشا چلائیں گے "

اور اب فلموں کے شاعر اندیور کی ماری نظم نما چند اشعار پڑھے۔ کویت کے نیاز جارسی نے نظم پڑھی۔ پرنس منظر شکوہ نے نظم میں زندگی کے تجربات بیاں کئے اور رؤف شاد صاحب نے دل کے آپریشن کے بعد اپنے بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے ذاتی نظم پر مشتمل کچھ اشعار سنائے۔ بیماری کی وجہ سے استاد صاحب معذرت کے ساتھ مسند صدارت محمد رحم سلطان پوری کو سونپ کر تشریف لے گئے۔

دہلی کے عوام سے مانوس اور غزل کے شاعر امیر قزلباش کو دعوت سخن دی گئی ؎

میں نے پوچھا تھا کبھی اس کی اداسی کا سبب

تم کبھی مت پوچھنا ورنہ غضب ہو جائے گا۔"

اور دوسری غزل کا بھی ایک شعر ملاحظہ کر لیجئے ؎

" گرا دیا ہے تو ساحل پہ انتظار نہ کر

اگر وہ ڈوب گیا ہے تو دور نکلے گا۔"

ممتاز اور تجربہ کار غزل گو شاعر شمیم جے پوری اس طرح ہم کلام ہوئے ؎

ہمیں ہیں وہ ملی سکی نہ جن کو جس کی راحت چمن میں رہ کر

ہمیں ہیں وہ بے وطن ہوئے جو شمیم اپنے وطن میں رہ کر

اختر الایمان نے عمر رفتہ کا احساس اس طرح دلایا ؎

اٹھاؤ ہاتھ کہ دست دعا بلند کریں

ہماری عمر کا ایک اور دن تمام ہوا۔

ماریشس کے نوجوان شاعر صابر گودڑ نے نظم سنائی اور ان کے بعد اردو ادب کے نقاد نگار ڈاکٹر عنوان چشتی کو زحمت دی گئی۔ انتہائی سنجیدگی اور اختصار سے کام لیتے ہوئے غزل پڑھی یہ شعر آپ کے لئے ؎

" اس دور میں ظالم کو جو تم کوس رہے ہو

کس دور میں مظلوم کی شنوائی ہوئی ہے

سستی ہیں بہت آج بھی بازار میں جانیں

انساں کہاں شہر میں مہنگائی ہوئی ہے "

نیر جہاں امریکا سے تشریف لائی تھیں۔ نظم پڑھی اور واپس چلی گئیں۔ ڈنمارک سے آئے ہوئے سردار شمشیر سنگھ نے دہاڑتی ہوئی آواز میں یہ قطعہ پڑھا

" بہیں گے جو اشک اب نہ ہم پی سکیں گے

کوئی چاک دل کا نہ ہم سی سکیں گے

جو بچھڑو گے ہم سے تو یہ یاد رکھنا

نہ تم جی سکو گے نہ ہم جی سکیں گے "

جدید لب و لہجہ کے شاعر ڈاکٹر شہریار نے ایک غزل پیش کی۔ اسی سلسلے میں ایک دوسرے شاعر رہبر رضوی کا یہ شعر آپ کو بھی پسند آئے گا۔

" میں جو کچھ دوں تو بکھر جانے کا غم مت کرنا

دل کو افسردہ کبھی آنکھ کو نم مت کرنا "

گوپال داس نیرج نے مختصر غزل پیش کی۔

اب تو اک ایسا ورق میرا ترا ایماں ہو

اک طرف گیتا ہو جس میں اک طرف قرآں ہو

کاش ایسی بھی محبت ہو کبھی اس دیش میں

میرے گھر اپواس ہو جب تیرے گھر رمضاں ہو۔

قومی یکجہتی کے احساسات سے بھرپور ان اشعار کے بعد کویت کے نوجوان فنکار نے طویل نظم پیش کی۔ لیکن کیف بھوپالی نے سرور میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار پڑھے ؎

" یوں بھی رات کاٹی ہے زندگی کے ماروں نے

چاند نے جلا ڈالا ڈس لیا ستاروں نے

تیرے قتل ناحق کی بات کچھ نہ تھی لیکن

ناولیں بنا ڈالیں داستاں نگاروں نے "

دبئی کے ڈاکٹر زبیر فاروق نے بھی شعر پڑھے اور چلے پڑھے۔ اس کے بعد عبداللہ صادق اپریم کا ...

بقیہ صفحہ ۲۹ پر

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

مجتبیٰ حسین

ساحر ہوشیارپوری

ساحر ہوشیارپوری کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے مَیں چار پانچ برس پہلے کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔ ایک شام کافی ہاؤس میں میرے ایک دوست نے جو بزنس مین ہیں اور چونکہ ادب سے کسی بھی طرح کی دلچسپی نہیں رکھتے اِس لئے کامیاب بزنس مین بھی ہیں، مجھ سے پوچھا "ابھی پچھلے ہفتہ اُردو کے ایک مشہور شاعر اِس دُنیا سے گزر گئے" غالباً پوری صاحب نام تھا اُن کا۔ کیا وہ سچ مچ بڑے شاعر تھے"؟

مَیں نے حافظہ پر زور دیتے ہوئے کہا "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُردو میں ابھی تک پوری صاحب نام کا کوئی شاعر مشہور نہیں ہوا ہے میرا تو یہ خیال ہے کہ اِس نام کا کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ہے تو اُس کے گذر جانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے"۔

میرے دوست نے کہا "مَیں نے خود اخبار میں پوری صاحب کے اِنتقال کی خبر پڑھی تھی ٹیلی ویژن پر بھی اُن کے مرنے کی خبر آئی تھی۔ تم کیسے کہتے ہو کہ پوری صاحب نہیں مرے۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی تو بات ہے۔" مَیں نے حافظہ پر پھر زور دیا۔ پچھلے ایک ہفتہ میں اُردو کے جتنے بھی شاعر لائن باندھ کر مرے تھے اُن کا حساب جوڑا تو احساس ہوا کہ اِن مرنے والوں میں پوری تو بہت دُور کی بات ہے کوئی کھوری تک شامل نہیں تھی۔ البتہ مرنے والوں میں سرِفہرست حضرت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا نام ضرور شامل تھا۔ میں اپنے بزنس مین دوست کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہر کام میں اپنے فائدے کی چیز تلاش کرتے ہیں۔ انھوں نے رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے لمبے نام میں سے گورکھپوری کے 'گورکھ' کو نکال کر اپنے لئے 'پوری' الگ سے بچالی تھی اور "پوری صاحب پوری صاحب" کہے چلے جا رہے تھے۔ وہ چاہتے تو رگھوپتی کے 'رگھو' کو الگ کرکے فراق کو 'پتی' بھی کہہ سکتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ایسا کہنے میں اُن کا کوئی فائدہ نہیں تھا سو نہیں کہا۔ ہر آدمی وہی [illegible] ہے جو [illegible] اس کا حسن کرشمہ ساز

مگر وہ تو ایک دن پہلے ہی جموں چلے گئے تھے اپنے ایک [illegible] دوست پریم ناتھ پوری کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے مجھے فون نہیں کیا۔ جھنجھلا کر جب مَیں نے اسسٹنٹ کو ڈانٹا کہ وہ میرے دوستوں کے پورے نام کیوں نہیں پوچھ لیتا تو بولا "صاحب! آپ کے دوستوں کے نام ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر آپ کے ایک دوست رام کرشن مضطر ہوا کرتے تھے۔ رام کرشن تو سمجھ میں آجاتا ہے لیکن یہ [illegible] ہے یہ سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔

اُردو کے معروف اور بزرگ شاعر جناب [illegible] ساحر ہوشیارپوری

۷۵ ویں سالگرہ اور ۵۷ سال کی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیے جانے والے

خطاب ممتاز الشعراء

[illegible] کرواتا ہے۔

ساحر ہوشیارپوری کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کرنے سے پہلے مجھے یہ واقعہ اس لئے یاد آیا کہ دو ڈھائی برس پہلے ایک دن میں اپنے دفتر پہنچا تو میرے اسسٹنٹ نے اطلاع دی "صاحب آپ کے لئے کسی پوری صاحب کا فون آیا تھا، آپ کو فون کرنے کے لئے کہا ہے" میں نے برّاج پوری کے بارے میں سوچا

کشمیری لال تو ٹھیک نام ہے لیکن اس کے آگے ذاکر لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں خوب یاد آیا، آج صبح جن پوری صاحب کا فون آیا تھا ان کے نام میں کچھ چالاکی اور ہوشیاری کا بھی ذکر تھا۔ اب آپ سوچ لیں کہ یہ کون سے پوری صاحب تھے" مَیں فوراً تاڑ گیا کہ یہ پوری صاحب ضرور ساحر ہوشیارپوری ہوں گے۔ مَیں نے انھیں فون کیا تو پتہ چلا کہ فون انہی کا تھا۔

اردو شاعروں کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف خود ادب میں آنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے مقام پیدائش یا آبائی مقام کو بھی اپنے ساتھ ادب میں لانا چاہتے ہیں۔ لندن میں تو میں ساقی فاروقی، برمنگھم میں اور بشیر بدر، بریڈفورڈ میں کہیں تک سے مل چکا ہوں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر اصغر نہ ہوتے تو گونڈہ کو کون پوچھتا۔ سلام نہ ہوتے تو مچھلی شہر کا کیا بنتا۔ شیو کمار بٹالوی نہ ہوتے تو بٹالہ کا بھٹہ ہی بیٹھ جاتا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ماں باپ اس بچے کو ایک عدد نام دے کر حکم دیتے ہیں کہ وہ اس نام کو دنیا میں روشن اور مشہور کرے۔ بعض والدین بچوں کے اتنے مشکل نام رکھتے ہیں کہ اس نام والے کو اپنا نام روشن کرنے میں بڑی آفت جھیلنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر میرے ہی نام کو لیجئے۔ یقین مانیئے ادب کو لکھنے میں مجھے اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی جتنی کہ اس نام کو مشہور کرنے میں۔ میں اپنے والدین کی فرمانبردار اولاد ہوں اور پوری سعادت مندی کے ساتھ ان کے رکھے ہوئے مشکل نام کو روشن کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ مجھ میں اگر یہ بزدلی کی حدوں کو چھوتی ہوئی سعادت مندی نہ ہوتی تو میں بھی ساحر ہوشیارپوری کی طرح اپنے والدین کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتا اور اپنا کوئی اچھا سا قلمی نام رکھ لیتا۔ ساحر صاحب کے والدین نے اُن کا نام رام پرکاش رکھا تھا۔ اچھا خاصا نام تھا اور مشکل بھی نہیں تھا۔ مگر ساحر صاحب کو تو اپنے والدین کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا تھا سو اس نام کو چھوڑ کر اپنا قلمی نام ساحر ہوشیارپوری رکھ لیا۔ اب وہ اپنا نام اور اپنے آبائی مقام کا نام دونوں کو مشہور کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک پنت دو کاج اسی کو کہتے ہیں۔ میں نے آج تک ہوشیارپور نہیں دیکھا ساحر ہوشیارپوری کو ضرور دیکھا ہے۔ اور ساحر ہوشیارپوری کے حوالے سے ہوشیارپور کو جتنا سمجھا ہے اُس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہوشیارپور میں پیدا ہونے کے لئے آدمی کا ہوشیار اور چالاک ہونا ضروری نہیں ہے۔ آدمی میں اپنا بل بوتا ہو تو ہوشیارپور میں پیدا ہونے کے باوجود وہ حسب استطاعت سادہ، معصوم اور دنیاداری سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ بھلا بتائیے آپ اس آدمی کو ہوشیار کیسے کہیں گے جس کے خاندان میں لاکھوں کے وارے نیارے ہو رہے ہوں اور اس خاندان کا چشم و چراغ ردیف قافیہ کے چکر میں پھنس جائے "عرض کیا ہے" اور "توجہ چاہتا ہوں" کے فقرے اُس کا تکیۂ کلام بن جائیں۔ گاہکوں سے دولت سمیٹنے کے بجائے اپنے سامعین سے داد کو سمیٹنا شروع کر دے۔ ساحر صاحب نے جب پہلا شعر کہا ہوگا تو اُن کے دل پر جو گذری ہوگی سو گذری ہوگی لیکن اُن کے لکھ پتی بزرگوں کے دلوں پر جو گذری ہوگی اس کا اندازہ ہم جیسے کنگال لوگ ہی لگا سکتے ہیں۔ بخدا ہمارے پاس تیج تج کی دولت ہوتی تو ہم کیوں خواہ مخواہ علم کی دولت کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اپنے آپ کو ہلکان کرتے۔ خاندانی اثاثہ میں اضافہ کرنے کی بجائے شعر و ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیوں کرتے۔ کھاتے پیتے گھرانے کے آدمی کو ادب کے دشت کی سیاحی سے کیا سروکار؟ ؎

"جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں"

حضرات! مجھے یہ اعتراف کرنے دیجئے کہ میں ساحر ہوشیارپوری کا دوست نہیں بلکہ اُن کا ایک ادنیٰ سا مداح ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں میرے بزرگ ہیں۔ میں نے ابھی اِس دُنیا میں آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں تو تب بھی وہ اپنے شعروں سے بڑے بڑوں کی آنکھیں کھول رہے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں جب وہ پیدا ہوئے تھے تو ابھی پہلی جنگ عظیم شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ اپنے شروع ہونے کے لئے کسی معقول وجہ کا انتظار کر رہی تھی۔ ساحر ہوشیارپوری پیدا ہو گئے تو اسے یہ معقول وجہ بھی میسر آ گئی اور وہ شروع ہو گئی۔ ساحر ہوشیارپوری نے دو عظیم جنگیں دیکھی ہیں جبکہ میرے حصے میں صرف ایک جنگ عظیم ہاتھ آئی ہے اور وہ بھی دوسری۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عمر اور تجربہ میں وہ مجھ سے ایک جنگ عظیم آگے ہیں لیکن اس کے باوجود ساحر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ہم جیسوں کی سہولت کی خاطر اپنے سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ میں اُن کی بزرگی کا احترام کرنا چاہتا ہوں مگر وہ میری خاطر اپنی قابل رشک بزرگی سے دستبردار ہو کر دوستی کی سطح پر اتر آتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے اُن کی طبیعت پر جو بوجھ پڑتا ہوگا اُس کا اندازہ مجھے ہے۔

ساحر ہوشیارپوری کو میں نے اُس وقت دیکھا جب یہ ساری دُنیا دیکھ چکے تھے اور ہم جیسوں کو حیرت سے دیکھنے کی اُن کی باری تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اُن کو دیکھنے کے دن نہیں تھے۔ یہ بارہ تیرہ برس پہلے کی بات ہے جب میں حیدرآباد سے دہلی آیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ   کے دفتر پر اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اکثر رسالوں میں اُن کے تازہ کلام کے ساتھ اُن کی پرانی یعنی نوجوانی کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ اب جو ساحر ہوشیارپوری خود بہ نفس نفیس مل گئے تو میں نے انہیں اسی طرح دیکھنا شروع کیا جس طرح ایک تاریخ داں کسی تاریخی عمارت کے آثار کو دیکھ کر اُن میں ماضی کی عظمتوں کی نشانیاں ڈھونڈ رہا ہو۔

● میرے عہد کے بزرگ شاعروں میں بہت کم لوگ ہیں، جن کے فن اور شخصیت دونوں نے مجھے اتنا متاثر کیا ہے جتنا ساحر ہوشیارپوری صاحب کے فن اور شخصیت نے کیا۔ ساحر صاحب انتہائی مہذب، شریف انسان دوست اور سیکولر انسان ہیں اور اسی لیے ان کی شاعری کی بنیاد انسان دوستی رہی ہے۔ میں ساحر صاحب کی پچھتر سالہ سالگرہ پر تہہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ خدا انھیں ہمیشہ سلامت، تندرست اور خوش و خرم رکھے۔

——— خلیق انجم

باسٹھ، ترسٹھ برس نے اُن کے ساتھ اور اُنھوں نے وقت کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اُس کا اندازہ اُنھیں دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ اِن پچھلے ساحر صاحب میں جب میں ماضی کے ساحر صاحب کو تلاش کرنے لگا تو غالباً اُنھیں اِس کا احساس ہو گیا کہ میں اُن کی ذات میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں۔ اِس احساس کے ساتھ ہی وہ اور بھی اکڑ کر بیٹھ گئے اور اس طرح کی باتیں کرنے لگے جیسے نوجوان کرتے ہیں بلکہ دو ایک حرکتیں بھی نوجوانوں کی سی کیں۔ ساحر صاحب کی یہ ادا مجھے بے حد پسند ہے کہ وہ ہر سانچہ میں ڈھل جاتے ہیں۔ نوجوان سے نوجوانوں کی طرح پیش آئیں گے۔ بزرگوں سے بزرگوں کی طرح باتیں کریں گے۔ حد ہو گئی کہ خواتین سے خواتین کی طرح ملیں گے۔ مزاج کی یہ لچک، بات کرنے کا یہ سلیقہ، محفل کو اپنی ذات کی خوشگواری میں سمیٹ لینے کا یہ انوکھا انداز ظاہر ہے کہ اُنھوں نے کچھ تو زمانے سے سیکھا ہو گا، مگر یہ صفات بڑی حد تک اُن کی اپنی ذاتی ہیں۔ اگر ایسی باتیں سیکھنے سے حاصل ہو جاتیں تو ہر آدمی ساحر ہوشیار پوری ہو جاتا۔

آدمی جب پچھتر برس کا ہو جاتا ہے تو فطری طور پر پیچھے پلٹ کر بھی دیکھتا ہے، زندگی کے حساب کتاب کا جائزہ لیتا ہے۔ اِس سفر میں کیا کھویا کیا پایا اس کا اندازہ لگاتا ہے۔ ساحر ہوشیار پوری کی زندگی کے یہ پچھتر برس ایک کامیاب اِنسان کی زندگی کے پچھتر برس نظر آتے ہیں لیکن ان پچھتر برسوں میں جو نشیب و فراز آئے ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ زمانے کی سنگینی اُن کی شخصیت کی رنگینی پر ڈاکہ نہیں ڈال سکی اور اُن کی کلاہ کج آج بھی اُسی بانکپن کے ساتھ ہے۔ اُن کی زندگی میں جتنے نشیب آئے ہیں اتنے ہی فراز بھی ہیں۔ لکھ پتی باپ کی جائیداد سے یکلخت دستبردار ہو کر ایک معمولی ہوٹل کے کمرے میں چلے گئے، ہم جیسے تو ایک ہی شادی کے نتائج و عواقب کو جھیلنے کی سکت نہیں رکھتے، ساحر صاحب نے دو دو شادیاں کیں۔ غم زمانہ ہو یا غم ذات، ساحر ہوشیار پوری ہر غم سے نبرد آزما ہونے اور پھر اس میں سے کامیاب و کامران نکل آنے کا زبردست ملکہ رکھتے ہیں۔

میں نے ساحر ہوشیار پوری کے وہ دن نہیں دیکھے جب وہ حالات کی سنگینی سے لڑ رہے تھے۔ میں جب اُن سے ملا ہوں تو وہ موٹر نشین تو تھے ہی لیکن تیور خاک نشینوں کے سے تھے جو آج بھی ہیں۔ جب تک ساحر صاحب فرید آباد منتقل نہیں ہوئے تھے اور دہلی میں مقیم تھے۔ تو اُن سے میری بیسیوں ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اُن کا کلام سننا ایک مسرت تو ہے ہی لیکن اُن کی باتوں کو سننا بھی کچھ کم مسرت نہیں ہے۔ جتنی محفلیں اُنھوں نے دیکھی ہیں، بہت کم نے دیکھی ہوں گی۔ برصغیر کی کیسی کیسی عظیم الشان ادبی ہستیوں کی جلوت و خلوت دونوں میں شریک رہے ہیں۔ وہ جب باتیں کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ نہیں بول رہے ہیں بلکہ اُردو ادب کے پچھتر برس بول رہے ہیں۔ اپنے اُستاد آنجہانی جوش ملسیانی کا ذکر کریں گے تو نظریں یوں نیچی کریں گے جیسے جوش ملسیانی اُن کے سامنے بیٹھے ہیں۔

ایک دن پُرانی باتوں کا ذکر چل نکلا تو میں نے اُن سے پُوچھا "ساحر صاحب! آپ کی پہلی شعری تخلیق کونسی ہے؟"

ایک آہ بھر کر بولے "میری پہلی شعری تخلیق ایک نظم تھی جس کا عنوان تھا 'اصغر'۔"

میں نے کہا "مکرر ارشاد ہو۔ عنوان میں نے ٹھیک سے نہیں سُنا۔"

بولے "اصغر، اصغر، الف، ص، ع، خ، ر یعنی اصغر"

میں نے اپنے سینے کے اندر ہی اندر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "اصغر، واہ واہ، اصغر، کیا بات ہے اصغر کی، اصغر میں ایک عجیب کیفیت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اصغر ہی سب کچھ ہے اصغر نہ ہو تو دُنیا بے معنی ہے۔ زِندگی کے اصغر کو آنچ

● جناب ساحر ہوشیار پوری ہمارے اُن برگزیدہ شعرا میں ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی عروسِ شعر کی زلفیں سنوارنے میں صرف کر دی ہے۔ انھوں نے ایک ایسے دور میں داغ اسکول کی روایات کو زندہ رکھا اور انھیں آگے بڑھایا جب کہ زبان و بیان کے محاسن کی طرف سے نئی نسل کے شعرا کی توجہ ہٹ رہی تھی۔

جہاں تک کلاسیکی روایات کو نئے اسلوب کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا تعلق ہے، ساحر صاحب کا کلام جادۂ شعر و ادب پر روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری سچی اور کھری شاعری ہے اور اس پر 'از دل خیزد بر دل ریزد' کا اطلاق ہوتا ہے۔

مدرساحر کمیٹی ہم سب کے شکریے کی حقدار ہے کہ وہ ساحر صاحب کو ان کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقعے پر مُمتاز الشعراء کا خطاب پیش کر رہی ہے اور اُن کا جشن منا رہی ہے۔ ساحر صاحب ہر طرح سے اس اعزاز کے مستحق ہیں ——— میں اس موقعے پر مدرساحر کمیٹی اور ساحر صاحب کو تہہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔

——— جگن ناتھ آزاد

جسطرح ادب کے اصطخر سے جوڑا ہے وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ سبحان اللہ 'اصطخر' مرحبا اصطخر۔"

ساحر ہوشیارپوری نے میری اِس بے ساختہ داد کے جواب میں پوری انکساری کے ساتھ سلام کرتے ہوئے کہا" نوازش عنایت کرم شکریہ' مجھے خوشی ہے کہ تم نے اصطخر کو سمجھا ورنہ اِن دنوں ہر طرف جُہلا پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی کو اصطخر کے معنی نہیں معلوم۔ دس برس بعد تم پہلے آدمی ملے ہو جو اصطخر کا مفہوم جانتا ہے۔ اسی لئے تو تم جب بھی آتے ہو جی خوش ہو اٹھتا ہے۔"

مَیں نے کہا" ساحر بھائی! زمانہ ہی ایسا آگیا ہے۔ ہم جیسوں کو اور ہمارے اصطخر کو کون پہچانتا ہے۔ 'نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی' نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں' بھلا بتائیے جو اصطخر کو نہ جانے وہ اُردو زبان و ادب کو کیا خاک جان سکتا ہے"

اس کے بعد ساحر ہوشیارپوری اُردو معاشرہ کی موجودہ حالت پر اظہارِ افسوس اور میری اُردو دانی پر اظہارِ مسرّت کرنے لگے مگر مَیں نے اُس دن اُنھیں زیادہ اظہار کا موقع نہیں دیا کیوں کہ میں 'اصطخر' سے گھبرا گیا تھا۔ فوراً وہاں سے چلا آیا۔ دو چار ادیب دوستوں سے 'اصطخر' کے معنی پوچھے' مگر وہ بھی اپنے کندھے اچکا کر رہ گئے۔ دو ایک ڈکشنریاں دیکھیں تو انھوں نے مجھے اُچکا دیا۔ چنانچہ آج تک مجھے 'اصطخر' کے معنی نہیں معلوم ہو سکے لیکن اس کے باوجود ساحر صاحب مجھ سے اس لئے مَحبّت کرتے ہیں کہ مَیں اصطخر کے معنی جانتا ہوں۔ اُس دن کے بعد مَیں اِس راز کو پا گیا کہ عِلم کے اظہار کا نام عِلم نہیں ہے بلکہ اپنی جہالت کو چھپانا ہی سب سے بڑا علم ہے۔ پتہ نہیں ساحر ہوشیارپوری نے اپنی پہلی تخلیق کا نام اِس قدر مشکل کیوں رکھا' حالانکہ اُن کی بعد کی شاعری ہم جیسوں کی اُردو دانی سے بالکل مطابقت رکھتی ہے۔

ایک بار قبلہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بتایا کہ سنہ ۱۹۵۰ء میں جب جشنِ جمہوریت کا پہلا مشاعرہ منعقد ہوا تو ساحر ہوشیارپوری کو اُس کا جنرل سیکریٹری بنایا گیا۔ مَیں نے کہا" اُس مشاعرے سے ساحر صاحب کے اوّلین تعلّق کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج تک اِس مشاعرے میں "شاعری" کم' اور "جمہوریت" کا بول بالا زیادہ نظر آتا ہے مَیں نے آج تک اِس مشاعرہ میں کبھی چین سے شاعری نہیں سُنی۔ کیوں کہ ہر آدمی ہُوٹنگ کرنے کے اپنے جمہوری حق سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہتا ہے۔ یوں بھی شعر کہنا شاعر کا جمہوری حق ہے اور ہُوٹنگ کرنا سامعین کا۔ ساحر ہوشیارپوری اس معاملہ میں کیا کر سکتے ہیں۔

ساحر صاحب سے میری ملاقاتیں اُن دِنوں بہت ہوتی تھیں جب ان کا دفتر ڈیفینس کالونی میں واقع تھا۔ اُن دنوں وہ " Manpower " یعنی بھولے بھالے ہندوستانیوں کو مشرقِ وُسطیٰ کے ممالک میں بھیجنے کا کاروبار کرتے تھے۔ بڑا شاندار دفتر تھا۔ اُن کا ایک ریسپشنسٹ کیرالا کا رہنے والا تھا۔ بہت دلچسپ آدمی تھا۔ مَیں اکثر شام کے وقت وہاں جاتا تو وہ اکثر مجھے دروازے پر روک کر کہتا تھا" اب تو دفتر بند ہو گیا ہے' کل صُبح کو آنا۔"

مَیں کہتا" مجھے فوراً دوبئی جانا ہے' اپنے صاحب سے مِلنے دو۔"

وہ کہتا" اے مِسٹر۔ تم دوبئی جانا مانگتا یا باتھ روم۔ دوبئی کے لئے ویزا چاہیئے۔"

مَیں کہتا" اپنے صاحب سے مِلنے دو' میرا ویزا اُن کے پاس ہے۔"

وہ کہتا" کیا کوالیفیکشن ہے تمہارا' کیا کام کرنا مانگتا تم دوبئی میں؟"

مَیں کہتا" وَیلڈر یا فِٹر بننا چاہتا ہوں"

وہ کہتا" پہلے ہمارے صاحب کی وَیلڈنگ اور فٹنگ کرو' تب جانا۔"

اس بات پر مَیں اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اُسے دے کر کہتا کہ وہ اپنے صاحب کو دکھا دے۔ وزیٹنگ کارڈ کو ہاتھ میں لے کر کہتا "تم پہلا وَیلڈر ہو جس کے پاس اپنا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ تم بڑا پڑھا لکھا وَیلڈر لگتا ہے۔"

ساحر صاحب مجھے فوراً اندر بلا لیتے۔ اُن کے ریسپشنسٹ سے میری بے شمار ملاقاتیں ہوئیں۔ بلکہ آخری زمانے میں تو اُسے میری بے روزگاری پر ترس بھی آنے لگا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا" مسٹر تم کوئی اور دھندہ کیوں نہیں پکڑ لیتا۔ صاحب تم کو باہر نہیں بھیجے گا۔ تم ایک سال سے اِدھر آتا۔ کل بیس فِٹر اور دس وَیلڈر سعودی عرب کو گئے مگر صاحب تم کو نہیں بھیجا۔ تم کو وَیلڈر بنانے کی آشا دِلا کر تم کو اُن کو اپنی شعر و شاعری سُناتا۔ مِسٹر کیوں اپنا ٹائم اِدھر برباد کرتا ہے۔ مَیں تم کو ایک ویکنسی بتاتا ہوں' کوشش کر لینا"

مَیں نے پوچھا" کونسی ویکنسی؟"

سرگوشی کے انداز میں بولا" مَیں یہ نوکری چھوڑ کر جا رہا ہوں' تم میری جگہ صاحب کے ریسپشنسٹ بن جانا۔"

مَیں ساحر صاحب کا ریسپشنسٹ بننے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ساحر ہوشیارپوری خود اپنی دوکان ڈیفینس کالونی سے بڑھا کر چلے گئے۔ اور مستقلاً فرید آباد میں رہنے لگے۔ فرید آباد کو اُن کی منتقلی کے بعد میری اُن سے ملاقاتیں زیادہ تر ادبی تقریبات میں ہی ہوئی ہیں۔ وہ اکثر مجھے فرید آباد آنے کی دعوت دیتے ہیں مگر مَیں جب بھی فرید آباد جانے کا اِرادہ کرتا ہوں تو دل میں خیال آتا ہے کہ جب فرید آباد جانا ہی ہے تو کیوں نہ حیدر آباد چلا جاؤں۔

ساحر ہوشیارپوری کی صُحبت کا دُوسرا نام خوشگواری ہے۔ اُن محفلوں میں اُن سے بیسیوں غزلیں سُنی ہیں۔ وہ جب کلام سُناتے ہیں تو اُن کی شخصیت کا رنگ ہی دُوسرا ہو جاتا ہے۔ اُن کی موجودہ زندگی خود اُن کے ایک شعر کی تفسیر نظر آتی ہے:۔

" شام کو بادہ کشی شب کو تری یاد کا جشن
مسئلہ یہ ہے کہ دِن کیسے گذارا جائے "

میری دعا یہ ہے کہ ساحر صاحب برسوں ہمارے درمیان رہیں اور اپنی یادوں کے جشن میں ہمیں بھی شامل کرتے رہیں۔ ●●

جو وہ ساتھ دیتے تو کچھ بات ہوتی
رقیبوں کی ہر گام پر مات ہوتی
وہ ہوتے مرے ساتھ اگر رات ہوتی
مزا آتا کر پھر جم کے برسات ہوتی
اگر چاندنی رات میں آپ آتے
تو کتنی حسیں پھر ملاقات ہوتی
میں شہروں میں اہلِ خرد چھوڑ آیا
ہیں تو بیاباں میں بارات ہوتی
اگر خوں کا قطرہ بھی ہوتا جگر میں
تو تیرِ نظر کی مدارات ہوتی
نہ ہوتا مجھے تیرا پاسِ ندامت
تو محشر میں پھر کُل کے ہر بات ہوتی
ہیں جولاں گاہیں عروج اپنی انجم
وگر نہ یہ دُنیا حوالات ہوتی

عروج نعیسی

ہر نفس چلتی ہوئی تلوار ہے
سانس لینا تک ہوا دشوار ہے
آس کی ٹوٹی ہوئی پتوار ہے
اب کنارا بھی لگے منجدھار ہے
زندگی کی سرحدوں سے بھی پرے
مجھ کو لایا زندگی کا پیار ہے
بھیک لے کر ہی تجھے دے گا دُعا
مانگنے والے کا یہ بیوپار ہے
عشق میں ہوتا نہیں صبر و قرار
یہ تو ہر پہلو سے اک آزار ہے
کیا سہارا دے سکے گی زندگی
جو کہ خود گرتی ہوئی دیوار ہے
آج اتنی زندگی مجبور ہے
موت اس کے سامنے لاچار ہے

محمود خالد نیازی

عشق میں نت نئے غم اُٹھاتے رہے
پھر بھی ہر وقت ہم مُسکراتے رہے
یوں خیالوں میں اکثر وہ آتے رہے
دھڑکنیں میرے دل کی بڑھاتے رہے
وہ نگاہوں سے دِل میں سماتے رہے
میری ویران بستی بساتے رہے
در پہ اُن کے سر اپنا جھکاتے رہے
بگڑی تقدیر اپنی بناتے رہے
وہ نقاب اپنے رُخ سے ہٹاتے رہے
خرمنِ دل پہ بجلی گراتے رہے
ہوش ہر دم وہ میرے اُڑاتے رہے
اپنی آنکھوں کے ساغر پلاتے رہے
وہ ہماری غزل گنگناتے رہے
یاد شاید رؤف اُن کو آتے رہے

رؤف بھوپالی

ہمدم نہ کوئی دوست نہ اب کوئی یار ہے
اک بیکسی ہی شام الم غم گسار ہے
تم پیار کی نظر سے مجھے دیکھتے رہو
اس پر ہی میری زیست کا دار و مدار ہے
اب خیر ہو ہمارے گریباں کی دوستو!
آئی ہے پھر بہار رگوں پر نکھار ہے
ہے میرے شوقِ دید کی یہ انتہا کہ اب
آنکھیں ہوئی ہیں بند مگر انتظار ہے
للہ اک نگاہِ کرم میری سمت بھی
اغیار پر تو لطف ترا بے شمار ہے
اللہ تو نے سب عطا کر دیا مجھے!
تیرے کرم پہ یہ ترا بندہ نثار ہے
وعدہ ہے اُن کے آنے کا منظور آج شب
دل ہے کہ صبح سے ہی بڑا بے قرار ہے

منظور سعدی

غزلیں

سمجھ پایا نہ مجھ سے میرے حالات کا رشتہ
اک پل جو ملا ہے تیرا برسات کا رشتہ
پھولوں سے مہکتے ہوئے تھے آتے تھے ہر شام
باقی نہ رہا شہر والوں سے پیار کا رشتہ
بیکار گئی میری تمنا ... کی گواہی
خنجر تھا ہاتھوں کے نشانات کا رشتہ
اس قوم کی عظمت کو گہن لگتا ہے
جس قوم سے ہوتا ہے فسادات کا رشتہ
... انہیں بھرتی ہیں اک ان کی خراشیں
صدیوں سے ہوا کرتا ہے لمحات کا رشتہ
ہے مشعلِ رہ سر پہ مرے ماں کی دعائیں
جڑ پایا نہ مجھ سے کبھی صدمات کا رشتہ
منصور مری غزلیں ہیں منسوب اسی سے
تھا جس کے لبوں سے مرے نغمات کا رشتہ

منصور عثمانی

دوشیزۂ حیات کی زلفیں سنوار دو
جیسے بھی ہو سکے یہ شبِ غم گزار دو
ہونٹوں پہ قہقہوں کے فروزاں کرو چراغ
تاریکیوں میں نُور کے خنجر اتار دو
سمجھیں گے لوگ آپ کو سالارِ کارواں
راہوں میں اپنے نقشِ قدم تو ابھار دو
ملتا ہے کیف مجھ کو تڑپنے میں آجکل
میں کب یہ چاہتا ہوں کہ صبر و قرار دو
کوثر قلم سے بخش دو تحریکِ زندگی
لفظوں کے تیر کاغذی جسموں پہ مار دو

کوثر ساگری

زیست کا غم مآل ہے شاید
یہ بھی اپنا خیال ہے شاید
دل کو ہونے لگی ہے جسم کی مانگ
عشق کا اب زوال ہے شاید
اک تغافل شعار کو ڈھونڈوں
زندگی میں محال ہے شاید
ملک میں رقص بربریت کا
آپ اپنی مثال ہے شاید
عشق کو غم دیا ہوس کو سکوں
حُسن کا یہ کمال ہے شاید
دستِ حالات کے شکنجے میں
زندگی پر عمال ہے شاید
ان کے در پر کھڑا ہے چپکے کوئی
عاشق خستہ حال ہے شاید

مظہر عاشق ہردوئی

داغِ دل ماہتاب ہو جیسے
آپ اپنا جواب ہو جیسے
اللہ اللہ رے تیرا حسنِ شباب
کوئی جام شراب ہو جیسے
ملنے اُس گلبدن کی انگڑائی
کوئی کھلتا گلاب ہو جیسے
ایسے لگتا ہے تیری فرقت میں
سانس لینا عذاب ہو جیسے
یوں تڑپتا ہے آجکل تو شفق
دل کی حالت خراب ہو جیسے

ڈاکٹر ہرش گوپال شفق

ازار بند

ارون کمار

اس کہانی کا اختتام بہت لوگوں کو شرمندہ کردے گا

ایک تحریر جو سرتاپا قابلِ اعتراض ہے مگر پھر بھی قابلِ اعتراض نہیں

کلن ایک رکشہ والا ہے۔ وہ ذات سے
لماں ہے۔ اس کا گھر کیبٹ میں ہے۔ ایک پتلی
گلی ہے جس میں چھوٹے موٹے کام کرنے والے
ل رہتے ہیں۔ گلی ہمیشہ تاریکی اور متعفن پانی
ڈوبی رہتی ہے۔ کلن اپنے خاندان کے ساتھ
چھوٹے سے گھر میں رہتا ہے۔ بچے ابھی چھوٹے
اور دن بھر سڑک کے اطراف دھماچوکڑی مچاتے
ہتے ہیں۔ بیوی پاس پڑوس کے گھروں میں برتن
یرہ صاف کیا کرتی ہے

گلی میں کچھ گھر دھوبیوں کے بھی ہیں۔ اُن
بیویاں علی الصبح گھاٹ پر چلی جاتی ہیں اور رکشے
لوں کی بیویاں برتن صاف کرنے اور دیگر کاموں
مصروف ہوجاتی ہیں۔ بچے یا تو گدھوں پر سواری
کرتے رہتے ہیں یا سڑک پر اچھل کود مچاتے رہتے ہیں
شام کو عورتیں کھانا پکانے میں مصروف ہوجاتی
ہیں اور مرد یا تو سڑک کے بمبوں کے نیچے قمار بازی
کرتے ہیں یا کسی شراب کے ٹھیلے پر پیاز، نمک کے
ساتھ شراب گٹکتے رہتے ہیں۔ رات کو کھاپی کر
لوگ حسبِ معمول سوجاتے ہیں اور رات کی پالی
والے رکشا لے کر شہر کی جانب روانہ ہوجاتے ہیں۔

کلن بیشتر رات ہی میں رکشہ چلاتا تھا۔
رات کو رکشہ لیکر وہ سیدھا اسٹیشن کی جانب چلا جاتا
اور وہاں پڑے پڑے سواریوں کا انتظار کرتا۔ اگر دل
کرتا تو ایک آدھ گانجے کا دم بھی مار لیتا۔ یونیورسٹی
قریب ہونے کے باعث ہاسٹل کے لڑکے بھی جمع ہوتے
تھے جو چائے کی طلب میں آتے تھے اور ہندوستان کی
دوکان پر بیٹھ کر چائے اور سگریٹ کا لطف لیتے رہتے
تھے۔ بعض لڑکے تو ایسے بھی تھے جو رکشہ والوں کے
پاس جاکر گانجے کا دم بھی مارا کرتے تھے۔ جب کوئی
لمبے مقام والی گاڑی آتی تو بعض لڑکے ڈبوں میں
تانک جھانک کرتے اور جینس میں ملبوس کسی پتلونوں
والی لونڈیوں کو دیکھ دیکھ کر رال ٹپکاتے اور اگر موقعہ
ملتا تو کھڑکی کے اندر ہاتھ ڈال کر ان کے پستانوں کو دبا
بھی دیتے۔ رات بھر وہاں چہل پہل رہتی جنکشن ہونے
کے باعث سواری بھی بہت ملتی اور رات میں کرایہ
بھی دوگنا۔ سردیوں کے موسم میں وہاں جمع
ہونے کا لطف تو اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ الاؤ کے اطراف
بیٹھ کر چلم پر دم لگانا کیا مزہ دیتا ہے اور کرایہ؟ جتنا
بھی سواری سے اینٹھ سکو۔

اس طرح کلن کی زندگی آرام سے کٹ رہی
تھی۔ اس کی ہی کیا ہر اس شخص کی جو رات میں اسٹیشن

آیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ شہر میں رہنے والے ہر شخص کی زندگی آرام سے کٹ رہی تھی۔ چونکہ اسٹیشن سے منسلک ہوٹلوں میں ہر قسم کے لوگ آیا کرتے ہیں، اس لئے وہ علاقہ ہر طرح کی خبروں کا واحد مرکز تھا۔ کلن کو سب سے پہلے یہیں سے معلوم ہوا تھا کہ اُن کے چین میں عنقریب خلل پڑنے والا ہے۔ چوک کی جانب سے آنے والے ایک رکشا والے نے یہ خبر دی تھی کہ وہاں پر کسی نے کسی کو چاقو مار کر زخمی کر دیا ہے۔ خبر معمولی تھی چنانچہ کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ بعد میں یہ خبر ملی کہ دو تین لوگ زخمی ہو گئے ہیں۔ چونکہ رنڈیوں کا علاقہ جائے وقوع کے قریب تھا اس لئے لوگوں نے سوچا کہ رنڈیوں کے ساتھ پہلے سونے کے سوال پر کچھ لوگ دست و گریباں ہو گئے ہوں گے۔ تیسرے دن یہ خبر ملی کہ دو لوگوں کو سول لائنز میں چاقو مار دیا گیا ہے جس میں ایک تو وہیں مر گیا اور دوسرے کی حالت بہت خراب ہے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں شریف لوگ ہی آیا کرتے تھے یا لوگ وہاں آ کر خود بخود شریف ہو جایا کرتے تھے۔ اس طرح کے علاقہ میں اس طرح کا کربناک حادثہ ہو جانا بہت سنگین بات تھی۔ رفتہ رفتہ راہ چلتے ہوئے لوگوں کو چاقو مارنے کے حادثات کسی مرضِ متعدی کی مانند شہر کے مختلف علاقوں میں پھیلنے لگے۔ اخباروں کے سرورق پر یہ خبریں جلی حروف میں ثبت رہتی تھیں۔ شام ہی سے سڑکیں ویران ہونے لگیں۔ لوگ سورج ڈوبتے ہی گھروں میں بند ہو جاتے۔ شہر میں تناؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بعد میں آیا سب سے خوفناک پل، جب شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ مضافاتی علاقوں میں یہ فساد نہیں پھیلا تھا لیکن اس بات کا احتمال ہمیشہ بنا رہتا کہ بہت جلد یہ علاقے بھی اس کی چپیٹ میں آ جائیں گے۔

کلن کی گلی بھی ویران ہو گئی۔ اب عورت، مرد کام پر نہیں جاتے تھے۔ اور نہ ہی بچے گلی کے باہر دھما چوکڑی مچاتے تھے۔ سرِ شام ہی سے گھروں میں دم ٹھیکوں پر بڑ دنگ مچتی، سارا شہر جیسے کسی قبر میں زندہ مدفون ہو گیا ہو۔ دھیرے دھیرے گلی میں رہنے والوں کے پاس جو بھی کھانے پینے کا سامان تھا ختم ہونے لگا۔ باہر کرفیو اور گھر میں بھوک کا راج۔ جب کرفیو میں تھوڑا ڈھیل ہوتی تو کھانے پینے کا معمولی انتظام تبھی ہو پاتا تھا۔ کلن کے گھر کی حالت تو اور بھی خراب تھی۔ وہ تو اپنے گھر کی گاڑی یومیہ مزدوری کے بل پر کھینچ رہا تھا۔ لیکن اس کرفیو کی وجہ سے وہ بے بس تھا۔ ایسے برے وقت میں اس نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ اُن مضافاتی ہندو علاقوں میں اس نے رکشا چلانے کا فیصلہ کیا جو ابھی تک فسادات اور کرفیو وغیرہ کی گرفت میں نہیں آئے تھے۔ لیکن یہ کام بہت ہی خطرناک تھا۔ اُس نے سوچا کہ جان تو ہر حال میں جانی ہی ہے، چاہے بھوک سے جائے یا کسی ہندو کے نیزے سے۔ اگر یہ تدبیر چل گئی تو کچھ پیسوں کا انتظام تو ہو ہی جائے گا۔ اس طرح اس نے مضافاتی ہندو علاقوں میں ہندو بن کر رکشہ چلانا شروع کر دیا۔ اب جب کرفیو میں ڈھیل ہوتی، وہ چپکے سے گھر سے نکل پڑتا۔ صاف کُرتا پاجامے میں ملبوس ہو کر گلے میں رُدراکش کی مالا پہن اور ماتھے پر لال رنگ کا قشقہ کھینچ کر رکشہ کھینچنا شروع کر دیتا۔ جب کچھ رقم جمع ہو جاتی تو وہ خاموشی سے گھر جا بیٹھتا اور ختم ہوتے ہی پھر سے رکشہ لے کر نکل پڑتا۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ پھر ایک دن۔ ۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سڑک ویران ہو چکی تھی۔ اکّا دکّا کتے بھونکتے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کلن بھی ایک پھٹی چادر اوڑھے ہوئے رکشے کی پچھلی سیٹ پر پڑا اونگھ رہا تھا۔ اس وقت ایک سپاہی نے اسے جگایا

"ابے او رکشے والے! چل اٹھ۔"

"........... "

"ابے سنتا کیوں نہیں، اٹھ بے۔"

کلن بہت گہری نیند میں سو رہا تھا۔ سپاہی نے بندوق کی نال سے کونچتے ہوئے زور سے کہا۔

"اٹھ بے سالے۔"

بندوق کی چوٹ کھا کر وہ ایک دم سے اُٹھ بیٹھا۔ سامنے ایک سپاہی کو دیکھ کر اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ سٹپٹاتے ہوئے بولا۔

"کہ.. کہ.. کیا ہے مائی باپ؟"

"اب اُٹھے ہو حرامزادے؟ کب سے جگا رہا ہوں چوتیا کی گھوڑی" سپاہی نے اسے ایک زور کا تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"غلطی ہو گئی مائی باپ، حکم دیجئے۔"

وہ درد سے بلبلاتے ہوئے بولا۔

"کوتوالی چل بے، جلدی کر۔"

"جی سرکار۔" وہ اچھل کر رکشے کی سیٹ پر سوار ہوتا ہوا بولا اس نے دیوان جی کو خوش کرنے کی غرض سے ایک فلمی دھن چھیڑ دی۔

"آیا... آیا... اٹریا پہ کوئی چور

او بھابی آنا دریک جھلانا"

"ابے چپ کر، اتنی ٹھنڈ پڑ رہی ہے، لونڈیا کی بھابی تو اُس کے بھیا کے ساتھ گرم ہو رہی ہو گی اور وہ لونڈیا؟ وہ تو کنواری ہے، جانگھوں کے بیچ میں تکیہ دبائے ـــ میرے پاس آ جائے تو میں دباؤں اسے اپنی جانگھوں میں ہا! ہا! ہا! ہا! ہا!" یہ کہہ کر سپاہی بھونڈے ڈھنگ سے ہنس پڑا جیسے اس نے کوئی بہت بڑھیا مذاق کیا ہو۔ کلن بھی ایک کتے کی مانند زور سے ہنسا۔ اب سپاہی بڑے آرام سے ٹھرّے کی بوتل سے گٹ گٹ گھونٹ بھر رہا تھا۔ کوتوالی کے پاس کلن نے رکشا روک دیا۔

"کیوں بے! رکشہ کیوں روک دیا؟"

"کوتوالی آ گئی دیوان جی۔"

"اچھا... اچھا۔"

اتنا کہہ کر سپاہی اُتر کر جانے لگا تو کلن سے نہ رہا گیا۔ وہ بولا۔

"پیسہ دے دیجئے مالک تو مہربانی ہو جائے"

"کیسا پیسہ؟"

"اتنے دور سے، تو کب سے چلا کر لایا ہوں مائی باپ۔"

"تو کیا ہوا بے، ہم تیری رکشہ کے تحفظ کے لئے ہیں اور سالے ہم ہی سے پیسہ بھی لو گے"

کلن ہاتھ جوڑ کر بولا "مالک بچے بھوکے مر جائیں گے، ایک ہی روپیہ دیجئے مالک۔"

"بھاگ جا سالے نہیں تو!"

"ایسا نہ کہیں مالک، اتنی ٹھنڈ میں لایا ہوں مالک، ہاتھ پیر سن پڑ گئے مالک۔"

" ابے ھٹنڈ : ۔ رہتا ہے تو گھر جا کر سو رہ

پنی ماں کے ساتھ ۔"

" گراؤ مت ۔ مانئے ۔ پچاس ہی پیسہ دیدیجئے ۔"

" نہیں مانتا تو لے سالے "

" دھائیں ! "

زور کی ایک آواز ہوئی ، اور کلّن وہیں سڑک پر لوٹ گیا ۔ تھانے سے کئی سپاہی بھاگتے ہوئے آئے اور اسے پکڑ کر اندر لے گئے ۔ بڑے داروغہ اپنے کمرے میں شانتی نام کی لیڈی پولیس کے ساتھ مصروف تھے مگر جوانوں نے ہمت کر کے انھیں بیدار کیا ۔

" کیا بات ہے رام کشن ؟ بڑے داروغہ نے دریافت کیا ۔

" صاحب جگت سنگھ نے ایک رکشہ والے کو گولی ماردی ہے ۔"

" سالا پٹے رہا ہے گا ۔ ایک نہ ایک مصیبت کھڑی کردیتا ہے ۔"

" اب کیا کریں صاحب ؟ "

" لاش کو فوراً اندر کھینچ لو ' اور رکشا کو پیچھے ڈال دو ۔"

رام کشن اور دوسرے لوگ لاش کو کھینچتے ہوئے اندر لے آئے اور سامنے بنے چبوترے پر ڈال دیا ۔

" فوراً لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے صدر ہسپتال ارسال کرنے کا انتظام کرو اور لاش کے کپڑوں کو مہر بند کردو ۔ سالے کو اب بچانا بھی ہے اسے بچانے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر سوچنی پڑیگی ۔"

رام کشن نے جیسے ہی کپڑوں کو مہر بند کرنے کی غرض سے لاش پر چڑھے پاجامے کا ازار بند کھولا تو وہ دفعتاً چیخ پڑا ۔

' صاحب ! صاحب ! یہ تو ..... یہ تو ... !

دوسرے دن صبح اخباروں کے سرورق پر یہ خبر شائع ہوئی ۔

" کل رات پولیس کے بہادر جوانوں نے دورانِ گشت شوگنج میں ایک آدمی کو فساد بھڑکانے کے جرم میں مار گرایا ۔ وہ شخص غیر ملکی ایجنٹ تھا ' اور ایک ہندو کا روپ بنائے وہ ماحول میں زہر گھولنے کی سعی کر رہا تھا ۔ لوگوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ اس قسم کے کسی بھی شخص کا سراغ لگتے ہی اپنے قریب کے تھانے میں فوراً خبر کردیں ۔"

●●

جَلِیلُ القدر

رُوح کو سَرشَار اور ایمَان کو
تازہ کرنے والے واقعَات

۲

وہی صفات، وہی خصوصیات اور ویسی ہی کرامات جیسی ان کے جَدِّ اعلیٰ
حضرت غوث الاعظم میں پائی جاتی تھیں۔

ایک مَردِ حق آگاہ کی سیرت و سَوانح۔

عبدُالقادر نے مخمل کا تھان لے لیا۔ اُنھیں یہ بہت پسند آیا۔ اور درزی کو بُلوا کر حکم دیا کہ یہ مخملی لباس میرے شکاری کُتّوں پر بہت اچھا لگے گا۔ اس لئے اِس سے میرے کُتّوں کی جھولیں تیار کردی جائیں"

چنانچہ کُتّوں کی جھولیں تیار ہوگئیں۔ والد کے اِرادتمندوں میں سے کسی نے اِن جھولوں کو دیکھا تو بہت افسوس کیا اور کہا" ایسا مخمل تو بہت سے انسانوں کو بھی میسّر نہیں اور آپ نے ان سے اپنے شکاری کُتّوں کی جھولیں بنوا دیں، کیا مصرف ہُوا ہے مخملی تھان کا، واہ، واہ، سبحان اللہ!"

عبدالقادر کو یہ طنز اچھا نہیں لگا۔ اُنھوں نے اُس شخص کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔

کچھ دیر بعد یہ خبر اُن کے والد کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اُنھیں بہت دکھ ہُوا اور عبدالقادر کو بُلوا کے جواب طلب کیا۔ پوچھا" بیٹے! یہ مَیں کیا سُن رہا ہوں۔ مَیں نے تمہیں مخملی تھان لباس بنوانے کے لئے دیا تھا مگر تُم نے اُس سے کُتّوں کی جھولیں تیار کروالیں"۔

عبدالقادر نے جواب دیا" کُتّے بھی اُسی کی مخلوق ہیں جس کی مخلوق ہم ہیں۔ مَیں نے جو کچھ کیا اُس میں مجھ کو تو کوئی بُرائی نظر نہیں آتی"۔

والد ایک دم گرم ہوگئے اور اُن کو ڈانٹنے لگے دیر تک ڈانٹتے رہے، عبدالقادر افسردہ و ملول وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔

عبدالقادر کے چلے جانے کے بعد اُن کے والد نے اپنے دوسرے بیٹوں سے پوچھا" مَیں سوچتا ہوں اِس کا بنے گا کیا، مَیں کچھ اور سوچ رہا تھا اور یہ کچھ اور سوچ رہا ہے، میرا دماغ کام نہیں کر رہا"۔

اِس تشویش اور اِس سوال کا جواب کسی کے پاس بھی نہ تھا چنانچہ وہ خاموش رہے۔

اُس رات اُن کے والد نے خواب میں دیکھا کہ اُن کے جدِّ اعلیٰ حضرت محی الدّین عبدالقادر جیلانیؒ تشریف لائے ہیں اور کچھ کبیدہ خاطر سے ہیں۔ اُنھیں اِس کبیدہ خاطری نے پریشان کر دیا پوچھا" جدِّ بزرگوار! کیا آپ ہم سے ناراض ہیں؟

اُنھیں جواب مِلا" ہاں ہم کبیدہ خاطر ہو رہے ہیں ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم نے ہمارے ہم نام اپنے فرزند کو سخت سُست کیوں کہا؟

اُنھوں نے جواب دیا" پیرو مرشد! ہمارے جدِّ اعلیٰ تو آپ ہیں۔ ہم نے اُنھیں جو کچھ بھی کہا سُنا ہے، اپنی اولاد ہونے کی وجہ سے، دوسرے یہ کہ کیا ہمیں اتنی سی بھی تعلیم و تربیت اور تہذیب و ترتیب دینے کا حق حاصل نہیں؟

حضرت غوث الاعظمؒ نے جواب دیا" ہاں! تمہیں اِتنا سا حق بھی حاصل نہیں، عبدالقادر میرا بیٹا ہے۔ اُس کی تعلیم و تربیت مجھ پر واجب کی گئی ہے اُس کو میں تیار کروں گا، تُم اپنے دوسرے بچّوں پر توجہ دو"

بیداری کے بعد وہ کافی پریشان ہوئے رات مشکل سے گزری۔ صبح فجر کی نماز کے بعد اُنھوں نے اپنے بیٹے عبدالقادر کو طلب کیا اور اُس سے کہا" عبدالقادر! مَیں نے تم سے کل جو کچھ کہا تھا اُس پر شرمسار ہوں، آئندہ مَیں تمہیں بالکل نہیں ٹوکوں گا مجھے معاف کردو"۔

عبدالقادر نے شرمندگی سے جواب دیا" یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں! خدا کے لئے مجھے اور زیادہ شرمندہ نہ کریں"۔

باپ خاموش ہو گئے۔

عبدالقادر کی رَوِش میں کوئی فرق نہ آیا وُہی شِکار اور شِکاری کُتّے، وُہی شکار کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھاننا، وُہی مزامیر اور وہی گوَیّے، لیکن اِن جملہ مشغلوں کے باوجود عبدالقادر کو یہی محسوس ہوتا کہ اُن کے اندر کسی چیز کی کمی ہے — اُنھوں نے کچھ کھو دیا ہے یا پھر وہ شے پائی ہی نہیں۔

اپنی الجھنوں اور فکروں میں وہ شکار کھیلنے میں مشغول تھے۔ کسی جھاڑی سے کوئی تیتر بولنے لگا۔ اُس کی آواز میں درد تھا، سوز تھا، اس درد اور سوز کو سبھی نے محسوس کیا۔

یہ سب آرام کی خاطر درختوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔ عبدالقادر تکان کے باوجود گھر جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ والد کے مُریدوں میں سے کسی نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا، "حضرت کبھی آپ نے اِس پر بھی سوچا کہ آپ خاندانی نسب نامے کی رُو سے کتنے بڑے انسان ہیں۔"

اُنھوں نے جواب دیا "سوچنا کیا، میں خوب جانتا ہوں کہ میں اپنے نسب نامے کی رُو سے کتنا بڑا انسان ہوں"۔

کسی جھاڑی سے تیتر ایک بار پھر نہایت سوگوار آواز میں بولا۔ سامنے سے ایک خستہ حال بزرگ گزر رہے تھے۔ انھوں نے یہاں بہت سے آدمیوں کو بیٹھے دیکھا تو رُک گئے۔ پھر عبدالقادر کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا "صاحبزادے، خوب، تو تم یہاں موجود ہو، واہ! تیتر کی آواز سن رہے ہو"

عبدالقادر نے جواب دیا "ہاں، آواز تو سُن رہا ہوں، پھر؟"

درویش نے عبدالقادر کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے دُوسروں سے کہا "تم سب دیکھ لینا، وہ دن دور نہیں کہ یہ نوجوان بھی اِسی تیتر کی طرح آہ و بُکا کرے گا۔ تم سب دیکھ لینا، میں بھی دیکھوں گا"۔

درویش کی آواز اور باتوں میں کیسا سحر تھا کیا اثر تھا کہ عبدالقادر کے اندر ایک آگ سی لگ گئی، کچھ دیر تو یہ اس آگ پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے مگر جب اُس آگ نے انھیں اندر ہی اندر جلانا شروع کر دیا تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا، "واپس چلو! اب شکار نہیں کھیلا جائے گا"۔

اِس حکم، اِس آواز نے سب کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ سب آپ کی صورت دیکھنے لگے۔ اُنھوں نے ایک بار پھر وہی حکم دیا "تم لوگ میری شکل کیا دیکھ رہے ہو، اب میں شکار نہیں کھیلوں گا۔ گھر واپس چلو"۔

لوگوں نے سامان سمیٹا، کُتّوں کو قابو میں کیا اور واپس چل دیئے۔

آپ کئی دن تک خاموش اور تنہا رہے۔

سبھی کو حیرت تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ ان کے والد بھی اس تبدیلی پر سوچ رہے تھے۔

کئی دن بعد دوستوں نے اُن سے پوچھا:-

" حضرت، آپ کے گویّے بہت پریشان ہیں آپ نے تو اُن سے کچھ سنا بھی نہیں"

آپ نے گویّوں کو اپنے پاس بُلوایا اور اُن سے کہا "افسوس کہ اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں رہی، اب تم لوگ جا سکتے ہو"۔

گویّوں کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا، پوچھا "جی کیا فرمایا آپ نے؟ ہم جا سکتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں! اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں رہی"۔

گویّوں نے پوچھا "کیا ہمارے گانے میں کسی قسم کا فرق آگیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "تمہارے گانے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، ہمارے مزاج میں فرق آگیا ہے"۔

گویّے روتے ہوئے چلے گئے۔

اِس کے بعد آپ نے اپنے مُلازمین سے مزامیر منگوائے اور دوستوں کو حکم دیا "انھیں توڑ دو"

دوستوں کو تامّل ہُوا، کہا "حضرت! اِن پر کافی مال و زر خرچ ہُوا ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!"

آپ نے فرمایا "صرف مال و زر ہی نہیں لُٹا، قیمتی وقت بھی، اور مجھے اِس وقت اگر کوئی افسوس ہے تو اِسی وقت کے زیاں کا، عمرِ عزیز کے زیاں کا اور اب مزید بربادی کا میں متحمل نہیں ہو سکوں گا"۔

آپ نے اُن مزامیر کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ پھوڑ کے پھینک دیا اور دوستوں سے کہا "دوستو!

صوفیا و اولیاء میں جتنی مقبولیت عام سید عبدالقادر جیلانیؒ کو حاصل ہوئی وہ شاید کسی اور بزرگ کے حصے میں نہیں آئی۔ آپ علم و فضل اور طریقت و تصوف، دونوں میدانوں میں کامل تھے۔

سید عبدالقادر حسنی و حسینی سید تھے۔ ۱۰۷۷ء (۴۷۱ھ) میں گیلان یا جیلان کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ عمر کا بڑا حصہ بغداد میں بسر ہوا۔

تعلیم کے لیے بغداد گئے۔ مدرسہ نظامیہ میں علوم متداولہ حاصل کیے۔ پھر خود تفسیر، حدیث اور دوسرے دینی علوم کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ تصوف کی ریاضتوں کا شوق تھا، تنہا پہاڑوں میں مشکل ریاضتیں کیں۔ ایک بزرگ لکھتے ہیں کہ مجھے ایک رات ان کے حجرے میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ سید عبدالقادر دو تہائی رات تک نوافل پڑھتے رہے، ایک تہائی رات رہ گئی تو عاجزی اور زاری سے دعائیں کرتے رہے۔ اس وقت مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ آپ پر ایسا نور چھایا ہوا ہے کہ چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی۔

سید عبدالقادر دین کے علوم میں ماہر تھے، چنانچہ مشہور ہے کہ جلیل القدر علماء اکثر مسائل میں آپ سے مشورہ کرتے اور فتویٰ پوچھتے تھے۔ "غنیۃ الطالبین" اور "فتوح الغیب" آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔ طریقت میں آپ کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ تقریباً تمام اکابر صوفیاء آپ کی عظمت کے قائل ہیں۔ آپ کی بہت سی کرامتیں زبان زد عام ہیں لیکن سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ اصول کی اور تقویٰ کی زندگی بسر کی اور صدہا افراد کو خدا کے سچے دین کا راستہ دکھایا۔

جب بیماری شدت پکڑ گئی اور زندگی کا چراغ ٹمٹمانے لگا تو آپ نے اپنے فرزند کو طلب کر کے اس کو خوف خدا، عمل نیک اور توکل علی اللہ کی تلقین کی اور اس کے بعد کلمہ طیبہ پڑھ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (۵۶۱ھ = ۱۱۶۶ء)۔ بغداد میں دفن ہوئے۔ روضہ آج بھی زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

اب میں [illegible] آپ [illegible] وحشت اور تنہائی
کی کیفیت محسوس کر رہا ہوں اور اس لائق نہیں ہوں
کہ دوستی نبھا سکوں، اس لئے آپ بھی کوئی دوسرا
دوست ڈھونڈ لیں"

دوستوں کو بھی بڑا دکھ ہو رہا تھا، انھوں
نے پوچھا "شکاری کتوں کا کیا ہوگا؟"

آپ نے جواب دیا "میری طرف سے اجازت
ہے کہ انھیں آزاد کر دیا جائے، یا آپ لوگ انھیں
لے جائیں۔"

بعد میں آپ کے حکم سے شکاری کتوں کو
جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔

اب آپ کی حالت ہی کچھ اور تھی، سر کے
بال صاف کرا دیئے اور ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔

اُن کے والد اُن سے راضی ہو گئے اور حضرت
غوث الاعظمؒ نے خواب میں جو کچھ فرمایا تھا اُس کی
صداقت اُن کے سامنے آ گئی۔

آپ نے شاہی ملازمت بھی چھوڑ دی۔
بادشاہ کو یہ بات گراں گزری، اُس نے آپ کو پیغام
بھیجا کہ کسی جواز کے بغیر ترکِ ملازمت مزاجِ شاہی پر
گراں گزر رہی ہے، اس لئے آپ کی بہتری اسی میں
ہے کہ کارِ منصبی دوبارہ سنبھال لیں۔"

آپ نے بادشاہ کو صاف صاف لکھ دیا کہ
"اب میں بادشاہ کی ملازمت نہیں کر سکوں گا اس لئے
مجھے معذور سمجھا جائے۔"

بادشاہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگا اور
آپ کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکا۔

اب آپ عشقِ الٰہی میں ڈوب چکے تھے، نماز
اور استغراق، نماز اور مراقبہ، بس اسی میں شب و
روز گزرنے لگے، خود ہی اذان دیتے، خود ہی امامت
فرماتے اور خود ہی اقامت فرماتے۔ پھر ایسا بھی دیکھنے
میں آیا کہ آپ فجر کی نماز سے پہلے گھر گھر جاتے، لوگوں
کو بیدار کرتے اور انھیں بتاتے کہ نماز نیند سے
بہتر ہے۔

آپ کے والد بیمار رہنے لگے تھے، انھوں
نے اپنی بیماری میں انھیں اپنا جانشین قرار دے
دیا تھا، اُن کے والد کے انتقال پر بڑا سوگ منایا گیا

بادشاہ نے بھی رنج و غم کا اظہار کیا اور جو باپ کو دربار
سے جو وظائف ملتے تھے اُن میں کسی قدر اضافہ کر کے
آپ کی خدمت میں بھیج دیا اور کہلوایا کہ "ہمیں آپ
کے والد کی موت کا دکھ ہے اور چونکہ آپ اُن کے
جانشین قرار پائے ہیں اس لئے وظائف کی رقم آپ
کو روانہ کی جا رہی ہے، یہ آپ کو مستقلاً ملتی رہے گی
اگر آپ یہ سمجھیں کہ مذکورہ مراسلہ رقم کم ہے تو ہمیں
اطلاع دیں، اس میں اضافہ کر دیا جائے گا"

جو شخص وظائف کی یہ رقم لے کر آیا تھا آپ
نے اُس سے پوچھا "بھائی، ایک بات تو بتاؤ،
تمہارا نام کیا ہے۔"

جو [illegible] ہے [illegible] نہیں
اور [illegible] سب [illegible]
تک کی تبا[illegible] معدنیات [illegible]
مداری اپنے کھیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اپنی
طرف متوجہ ہوتا ہے نہ تیری طرف۔ مداری کا
کرتب دیکھو لباس مت دیکھو۔

اُس شخص نے جواب دیا "اسلم، مگر آپ
میرا نام کیوں معلوم کر رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "اس لئے کہ مجھے یاد رہے
کہ میرے پاس بادشاہ سے وظائف کی رقم لے کر کون آیا
تھا۔ تم اس رقم کو واپس لے جاؤ اور میری طرف سے
بادشاہ کو بتا دو کہ مجھے یہ رقم نہیں چاہئے۔ میرے باپ
کے لئے جو وظیفہ یا وظائف جاری تھے انھیں منسوخ
کیا جائے، اب مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں۔"

بادشاہ کو آپ کی یہ باتیں بالکل پسند نہیں آ رہی
تھیں۔ اُس نے کہلوایا کہ مال و زر ایسی چیزیں نہیں
ہیں کہ انھیں ٹھکرا دیا جائے۔ آپ وظائف قبول فرمالیں
اور اگر آپ انھیں اپنے خرچ میں لانا نہیں چاہتے
تو کوئی بات نہیں، اور بہت سے حاجتمند اور غرض مند
ہیں، اُن پر خرچ کر دیجئے گا، میں خوش ہوں گا کہ کسی
درویش کے کام آ سکا"

آپ نے جواب میں لکھ دیا "حاجتمندوں
اور غرض مندوں کی تو کوئی کمی نہیں۔ دربار میں بھی
پہنچ جاتے ہوں گے اس لئے میرے خیال میں بادشاہ
سلامت یہ رقم خود ہی حاجتمندوں اور غرض مندوں
میں تقسیم فرما دیں!"

بادشاہ نے اس کا یہ مطلب لیا کہ شاید
عبدالقادر اپنی اَنا کی تسکین کے لئے یہ سب کر رہے
ہیں۔ بادشاہ نے انھیں دھمکی دی "عبدالقادر!
ہمیں معلوم ہے جو کچھ آپ کر رہے ہیں یہ اَنا کا دلچسپ
مگر افسوسناک کھیل ہے کیا آپ کو معلوم ہے کہ بادشاہ
کی ناراضگی کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اگر نہیں معلوم تو
اب معلوم ہو جائے گا۔"

اس کے بعد بادشاہ نے ہر شخص پر یہ ظاہر کر دیا
کہ بادشاہ عبدالقادر سے ناراض ہے اور اُس شخص
سے بھی ناراض ہو جائے گا جو اُن کا ساتھ دے گا"

اس تاثر نے عبدالقادر کی زندگی اجیرن
کر دی، یافت کا سلسلہ بند ہو گیا، ہر طرف سے کھنچاؤ
اور گریز نظر آنے لگا۔

جب بادشاہ کو اس کے مخبروں نے یہ بتایا
کہ عبدالقادر کی مالی حالت بہت خراب ہے اور ہر طرف
سے مایوسی کا سامنا ہے تو اُس نے اِن حالات میں
ایک بار پھر ان کی مدد کرنا چاہی

باقی آئندہ

خلافت بنو امیہ کے زمانے میں عبدالرحمٰن فروخ [illegible]
میں ملازم تھے۔ وہ دور اسلامی فتوحات کا دور تھا، مسلمانوں
کے لشکر بحر و بر کی تسخیر میں مصروف تھے۔ فروخ بھی ایک
لشکر کے ساتھ خراسان چلے گئے۔ اس مہم میں ستائیس برس
لگ گئے۔ جب لوٹے تو چھوٹا بچہ بڑا ہو کر ربیعہ کے نام سے
مشہور ہو چکا تھا۔ عبدالرحمٰن فروخ جاتے وقت تیس ہزار
اشرفیاں بھی اپنی بیوی کے سپرد کر گئے تھے۔ واپسی پر
اس رقم کے متعلق پوچھا۔ بیوی نے کہا۔
"صاحب [illegible] آپ بے فکر رہیں۔" فروخ
مسجد میں نماز پڑھنے گئے، دیکھا کہ ایک شخص حلقۂ درس
میں مشغول ہے۔ خواجہ حسن بصری اور امام مالک جیسے اہل
علم حلقۂ درس میں شامل ہیں۔ شاگردوں کا ایک ہجوم ہے
جو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ پوچھا یہ کون
ہیں۔ حاضرین نے بتایا یہ ربیعہ بن عبدالرحمٰن فروخ ہیں۔
فروخ کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ گھر آ کے بیوی سے
سارا ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا۔
"بیٹے کی یہ شان پسند ہے یا تیس ہزار اشرفیاں؟"
فروخ نے کہا "واللہ میں اس شان کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔"
بیوی نے انھیں بتایا کہ میں نے وہ اشرفیاں بیٹے
کی تعلیم پر خرچ کر دی ہیں۔ فروخ نے کہا۔
"خدا کی قسم تم نے وہ مال ضائع نہیں کیا۔" *

صارفین کی خدمت

چلتا پھرتا بازار

• چلتے پھرتے بازار کی ۴۰ چلتی پھرتی دکانوں نے مئی ۱۹۸۸ء تک تقریباً ۸ کروڑ روپے قیمت کی روزانہ کام میں آنے والی چیزیں فروخت کی ہیں۔ یہ بازار اکتوبر ۱۹۸۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ پچھلے تین برسوں میں اس بازار کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اور صارفین میں ایک نئی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ اس بازار سے دور دراز کی کالونیوں کے خاص کر جہاں کمزور طبقوں کے لوگ رہتے ہیں ۳۰ لاکھ سے زیادہ خاندانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

یہ چلتی پھرتی گاڑیاں روزانہ ۱۰۰ سے زیادہ مقامات پر روزمرہ کے کام میں آنے والی چیزیں مناسب داموں پر لوگوں کو ان کے گھر کے پاس دستیاب کراتی ہیں۔

انتظامیہ اس بازار کے لیے گاڑیوں کی تعداد میں اور فروخت کے لئے روزمرہ کام میں آنے والی چیزوں کی تعداد میں اضافہ کر کے اسے اور مضبوط بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انتظامیہ کا نشانہ ہے کہ یہ انتظام دلی کے سبھی علاقوں کے لئے دستیاب ہو۔

دلی انتظامیہ نے امور صارفین کے محکمے کی بھی تشکیل کی ہے۔ جو سرکاری اور رضاکار تنظیموں کی کوششوں میں تال میل رکھ کر صارفین کے فائدہ کے لئے تقسیم عامہ کے نظام کو مضبوط بنانے کا کام کر رہا ہے۔ تحریک صارفین کو مضبوط کرنے کے لئے اگر آپ کے پاس کوئی تجویز ہو تو تحریر کیجیے۔

جگ پرویش چندر

چیف ایگزیکٹو کونسلر دلی
اولڈ سیکریٹریٹ دلی ۱۱۰۰۵۴

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و اشاعت،
دلی انتظامیہ دلی

یہ کوچۂ یار ہے انداز محرمانہ گزر

مستقل کالم

سرور تونسوی

جناب بی۔ ایس کینٹ جس قدر وجیہہ شکیل، خوش مزاج اور خوش ذوق تھے اُسی قدر فراخ دلی اور خوش اخلاقی میں بھی اپنا جواب آپ تھے۔ دہرہ دون کے مشہور، اے کلاس سرکاری ٹھیکیدار شری رتن چند کے ساتھ شراکت میں اُن کا کاروبار بڑا اچھا اور اعلیٰ پیمانے کی زیادہ تر ذمہ داری ان کی بیوی پر رہی تھی جسے وہ بہ طریق احسن نبھا رہی تھیں۔ محلے والے کینٹ صاحب کی بیوی کو اپنا سرپرست سمجھتے تھے کیونکہ وہ ہر کسی کی مصیبت میں اور مشکل وقت میں دل کھول کر مدد کرتی رہتی تھیں۔

مندر ہر روز جانا ان کا معمول تھا اور اکثر اوقات وہ اپنے گھر پر بھی رامائن کی کتھا یا کیرتن کراتی

دسولها ملا تھا

بیوہ عورت اگر چاہے تو مرتے دم تک کسی دوسرے مرد کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھے۔ اور اگر وہ کھل کھیلے تو پھر اُس کا عشق کنواری لڑکیوں کے مقابلے میں بھی بڑا فاسٹ اور خطرناک قسم کا ہوتا ہے۔ کیونکہ کنواری لڑکی نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں ہوتا اور بیوہ مردانہ جسم کی لذت چشیدہ اور مرد کو رجھانے

نوکر کی بددُعا

شخصیات، واقعات، تأثرات،

پر تھا۔ کینٹ صاحب دہرہ دون کے محلہ کھربڑا میں کرایہ کی کوٹھی میں رہائش رکھتے تھے۔ اور اپنے قدوقامت اور خوش پوشی کے باعث محلہ کی ایک سرکردہ اور معزز شخصیت سمجھے جاتے تھے۔

اُن کی بیوی ایک ملٹری آفیسر کی صاحبزادی تھیں اور وہ اپنے مائیکہ سے ہی خود شناسی، انا، فراخدلی، خوشامد پسندی اور ضد وراثت میں لائی تھیں۔ لہٰذا محلہ بھر میں کینٹ صاحب کا گھرانا اچھا خاصا مشہور تھا۔

کینٹ صاحب تو ٹھیکیداری کے سلسلے میں کئی کئی روز گھر سے باہر رہتے تھے لہٰذا گھر رہتی تھیں جس سے محلے کی عورتوں کا اُن کے ہاں آنا جانا زیادہ تھا۔

کینٹ صاحب کی کوٹھی سے تین، چار کوٹھیاں چھوڑ کر ایک سکینہ بیوہ اپنی کوٹھی میں رہائش رکھتی تھیں، جن کی چار، پانچ لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔ یہ سکینہ محترمہ بھی کیرتن میں، یا رامائن کی کتھا سُننے کینٹ صاحب کی کوٹھی میں آیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں کینٹ صاحب ہزاروں میں ایک تھے۔ اکثر عورتیں اُنھیں کنکھیوں سے دیکھتی تھیں تو من ہی من میں کینٹ صاحب کی بیوی کی قسمت پر رشک کرتی تھیں۔ جنھیں ایسا

کے طریقوں سے واقف ہونے کے باعث اپنے من پسند مرد کو اپنی بیوی تو کیا، دُنیا چھوڑنے پر مجبور کر دے۔

چنانچہ اُس سکینہ بیوہ کی جہاں دیدہ آنکھوں میں کینٹ صاحب پور سے کے پورے سما گئے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ ویسے کینٹ صاحب اپنی بیوی کی چوکسی اور پیش بندیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ اُن کی یہ مجال ہی نہیں تھی کہ بیوی کی موجودگی میں کسی غیر عورت پر غائرانہ تو کیا سرسری نظر بھی ڈال سکیں۔ ویسے اس قسم کی بیویاں جو اپنے

شوہروں پر "آنشیحت کال" کا کرفیو لگائے رہتی ہیں، وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ اُن کے شوہر بہت جلد اُن سے اُوب جاتے ہیں اور وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کینٹ صاحب بھی ڈیرہ۔ دون ایسی پُرفضا آب و ہوا کے باوجود تازہ ہوا کے جھونکوں کا لطف اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ کینٹ صاحب اور اس سکینہ بیوہ کی ملاقاتیں ڈیرہ دون کے ہوٹلوں، ریسٹورانوں، اور پارکوں میں ہونے لگیں۔ اور سکینہ بیوہ نے یہ چال چلی کہ کینٹ کی بیوی کو اپنی بہن بنا لیا اور مکاری اور تریا چرتر کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے انھیں یہ یقین دلا دیا کہ "میں بیوہ ہوں اس لئے لوگ مجھ پر جھوٹی تہمتیں لگاتے ہیں۔ میرا بیٹیوں کا ساتھ ہے، آپ میری رکھشا کریں اور بدمعاشوں اور بدنام کرنے والوں سے میری حفاظت کریں"۔ کینٹ صاحب کی بیوی ایک ملٹری آفیسر کی بیٹی تو تھیں ہی اور پھر سماج سیوا کا بھی انھیں بڑا شوق تھا لہٰذا انھوں نے اس مکار سکینہ بوا کو یقین دلا دیا کہ تم بے فکر رہو، میں تمھاری حفاظت کروں گی اور دیکھوں گی کہ تمھیں کون بدنام کرتا ہے۔ چنانچہ سکینہ بیوہ کا کینٹ صاحب کے گھر میں آنا جانا اتنا بڑھ گیا کہ شاید سگی بہنوں کا بھی ایک دوسرے کے ہاں اس قدر آنا جانا نہ ہو۔

محلہ کی عورتیں کینٹ صاحب کی بیوی سے سرگوشیاں کرتیں کہ آج بھائی صاحب کو اس سکینہ عورت کے ساتھ فلاں پارک میں بیٹھے دیکھا تھا کوئی کہتی کہ میرے مرد نے انھیں فلاں ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے یا چائے پیتے دیکھا تھا، مگر کینٹ صاحب کی بیوی کسی بات پر یقین نہیں کرتی تھیں بلکہ ایسی ہمدرد عورتوں کو ڈانٹ دیتی تھیں کہ تم بیچاری بیوہ کو بدنام کرتی ہو۔ بجائے اس کے کہ اس کی مدد کرو، اُلٹا اسے دُنیا کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی ہو۔ اسکی چار بیٹیاں شادی کے لائق ہیں، اُن سے کون شادی کرے گا؟ آخرکار محلے کی عورتوں نے ٹھیکیدارنی صاحبہ سے ان کے شوہر کی شکایت کرنی ہی چھوڑ دی۔

اس دوران کینٹ صاحب کا لڑکا تین چار سال کا ہو گیا۔ گھر کے نوکر چاکر اور برتن صاف کرنے اور کپڑے دھونے والی نوکرانیاں کینٹ صاحب کے لڑکے کی دیکھ بھال میں لگے رہتے۔ ادھر ان نوکروں اور نوکرانیوں نے بھی گھر کی مالکن کی نمک حلالی کرتے ہوئے اپنے مالک اور سکینہ بیوہ کی اٹھکیلیوں اور ایک دوسرے کی نازبرداریوں کے بارے میں اطلاعات دینی شروع کیں تو کینٹ صاحب کی بیوی نے ٹھیکیدار صاحب کی خود جاسوسی شروع کر دی اور ویسے بھی عشق اور مشک نہ محلوں میں چھپ سکتے ہیں اور نہ جھونپڑوں میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کینٹ صاحب کی بیوی نے اپنے شوہر اور اس بیوہ سکینہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا، محلے کی عورتیں ان کے ساتھ تھیں لہٰذا انھوں نے بیوہ سکینہ کی کوٹھی پر یلغار کی مگر سکینہ بیوہ کو پہلے ہی خبر لگ گئی اور وہ اپنے گھر سے اِدھر اُدھر ہو گئیں اور بیوہ کی لڑکیوں نے بڑی معصومیت سے کہا "ماسی جی، ہماری ممی تو دو دنوں سے ڈیرہ دون میں نہیں ہیں۔ ٹھیکیدارنی صاحبہ نے سکینہ بیوہ کے کمروں کی تلاشی لی اور اسے وہاں نہ پا کر واپس اپنے گھر آ گئیں۔

اب تو ٹھیکیدارنی صاحبہ نے اپنے گھر کو میدانِ جنگ بنا لیا اور ٹھیکیدار صاحب نے ایسا انتظام کیا کہ راتوں رات بیوہ سکینہ ڈیرہ دون چھوڑ گئی نہ معلوم کس مقام پر چلی گئیں جس سے کینٹ صاحب کے گھر میں کچھ ٹھنڈک پڑی۔ کچھ دنوں کے بعد پتہ چلا کہ سکینہ بیوہ نے اپنی کوٹھی بھی فروخت کر دی ہے۔ مگر کینٹ صاحب کو علم تھا کہ سکینہ بیوہ غازی آباد میں آباد ہو چکی ہے۔

کینٹ صاحب کے گھر میں ہر ہفتہ یا ہر دوسرے تیسرے دن نوکروں کی بدلی ہوتی رہتی تھی کیوں کہ ٹھیکیدارنی صاحبہ کی طبیعت بڑی تیز تھی اور وہ اکثر نوکروں پر ہاتھ بھی اُٹھا لیتی تھیں جس کی وجہ سے عام طور پر نوکر بھاگ جاتے تھے۔ ایک پہاڑی لڑکا جس کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی اُس نے کینٹ صاحب کے ہاں نوکری کر لی اور اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ کینٹ صاحب کے لڑکے کو کھلائے اور اس کا ہر دم خیال رکھے۔ یہ نوکر بڑا صاف ستھرا تھا اور کینٹ صاحب کے بیٹے کا خاص خیال رکھتا تھا اس لئے کینٹ صاحب کی بیوی چاہتی تھیں کہ یہ نوکر ان کے ہاں سے نہ جائے لہٰذا اس نوکر سے خلافِ دستور اچھا اور مہربانی کا سلوک ہونے لگا۔

تین چار ماہ بعد اس نوکر پہاڑی لڑکے نے اپنی مالکن سے کہا کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتا ہے لہٰذا اس کا حساب کر دیا جائے کیونکہ اس کے بھائی کی چٹھی آ گئی ہے کہ فصل کاٹنی ہے تو ایک ماہ کے لئے چھٹی لے کر آ جا۔ کینٹ صاحب کی بیوی کی یہ خواہش کہ ملازم لڑکا اپنے گھر نہ جائے اور لڑکا بضد کہ میں بغیر حساب کئے ہی گھر چلا جاؤں گا لہٰذا ایک دن تو لڑکے نے ایسی ضد کی کہ وہ کسی حالت میں بھی ان کے ہاں نہیں رہے گا اور ابھی اور اسی وقت چلا جائے گا۔ اس پر کینٹ صاحب کی بیوی نے اس ملازم لڑکے کو اس کمرے میں بند کر دیا جس میں عمارتی لکڑی کے ٹکڑے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ لڑکا روتا رہا مگر ٹھیکیدارنی نے دروازہ نہ کھولا بلکہ کمرے کو تالا لگا دیا تاکہ کوئی دوسرا نوکر اسے باہر نہ نکال دے۔ اس ملازم لڑکے نے نہ تو کھانا کھایا اور نہ ہی پانی پیا اور کمرہ میں روتا رہا۔ شام کو جب کینٹ صاحب کام سے واپس گھر آئے تو اس ملازم لڑکے کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کہاں ہے۔ کینٹ صاحب کا بچہ اس ملازم لڑکے کو اپنے پاس نہ دیکھ کر رو رہا تھا چنانچہ ٹھیکیدارنی نے بتایا کہ اُسے کمرے میں بند کر رکھا ہے کیونکہ وہ گھر جانے کی ضد کر رہا تھا۔ کینٹ صاحب نے فوراً کمرے کا دروازہ کھولا اور لڑکے کو باہر نکالا تو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ کینٹ صاحب نے اس کی خاطر مدارات کی۔ پوری تنخواہ جو اس کی نکلتی تھی وہ دی۔ اور کہا کہ تو اگر ابھی جانا چاہتا ہے تو ابھی چلا جا مگر رات کو کہاں جائے گا۔ اس لئے صبح چلے جانا۔ ملازم لڑکے نے کہا کہ وہ ابھی جائے گا اور راستے میں گاؤں کے کسی آدمی کے پاس

رات رہ جائے گا اور وہاں سے صبح اپنے گھر چلا جائے گا۔ لہٰذا یہ ملازم لڑکا اپنی چادر وغیرہ لپیٹ کر جانے لگا تو روتے ہوئے کہنے لگا "ماں جی! آپ نے جو دُکھ مجھ کو دیا ہے اس سے میں بڑا دُکھی ہوا ہوں۔ میں کمرے میں بند رو رو کر اپنی دیوی سے یہی کہتا رہا کہ اس عورت نے مجھے دکھ دیا ہے، اس کا گھر اُجاڑ دے" اور اب میں پہاڑ پر اس دیوی کے مندر میں جا کر یہ پرارتھنا کروں گا کہ وہ تمہارا گھر برباد کر دے۔ اس پر کینٹ صاحب کی بیوی نے دُھتکارتے ہوئے کہا "جا کتے، تو ایسا مہاتما کہاں سے آ گیا جو مجھے شراپ دے گا۔

یہ ملازم لڑکا چُپ چاپ چلا گیا اور دوسرے دن اس نے پہاڑ پر دیوی کے مندر میں جا کے کوئی پرارتھنا کی یا نہ، مگر کینٹ صاحب کے گھر میں یدھ شروع ہو گیا۔ مرد جب ایک بار دوسرے کی ناند میں چارہ کھا لیتا ہے تو پھر اُسے اپنے ہاں کا چارہ اور ناند دونوں نہیں بھاتے۔ کینٹ صاحب چوری چھپے غازی آباد جانے لگے تھے اور اس کی خبر ان کی بیوی کو تک پہنچ چکی تھی۔ کینٹ صاحب کی بیوی چونکہ بھجن کیرتن میں زیادہ وقت گزارتی تھیں لہٰذا ان کے نزدیک ایسے دُشٹ مرد کو اپنے گھر میں رکھنا گناہ تھا۔ لہٰذا اُنھوں نے ضد پکڑ لی کہ میں تمھیں اپنے ہاں نہیں رکھوں گی۔ اور ان کا یہ مطالبہ نہ صرف بڑھتا جاتا تھا بلکہ ان کے سلوک میں بھی بے رُخی اور بے عزتی بر روز زیادہ سے زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ لہٰذا اُس ملازم لڑکے کے جانے کے عین دس دن بعد ایک شام کو کینٹ صاحب نے اپنے بیٹے کو خوب خوب پیار کیا اور صرف ایک جوڑا پہنے، اپنے گھر کو خیرباد کہتے ہوئے کہیں چلے گئے۔ رات کو جب دیر گئے تک کینٹ صاحب گھر نہیں آئے تو ان کی بیوی نے نوکر سے دریافت کیا کہ کیا صاحب اپنے کمرے میں ہیں یا کام سے ہی واپس نہیں آئے، تو نوکر نے بتایا کہ بی بی جی آپ رسوئی میں تھیں، بابو جی نے بچے کو اپنے کمرے میں آپ سے چوری سے ... اور خوب پیار کیا اور اس کے بعد ٹرنک سے کالا سوٹ نکال کر پہنا اور چُپ چاپ چلے گئے۔

واقعی ٹھیکیدارنی کا گھر برباد ہو چکا تھا۔ ٹھیکیدار صاحب غازی آباد سکینہ بیوہ کے ہاں جا چکے تھے اور ٹھیکیدارنی دہرہ دون چھوڑ کر اپنے مائیکے چلی آئیں، اور ٹھیکیدار نے اپنے نئے گھر میں اپنی نئی بیٹیوں اور بیٹوں کے ساتھ زندگی گزاری اور یہ گھر پھر آباد نہ ہو سکا۔ ٹھیکیدار صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور ان کی بیوی گو بھگوان سے لو لگائے ہوئے ہیں مگر ان کے من کو چین نہیں ہے۔ اُن کا بیٹا اُنھیں ہر طرح سے آرام سے رکھتا ہے مگر یہ کسی طور پر کل نہیں پا رہی ہیں۔

کیا یہ اُس ملازم پہاڑی لڑکے کا شراپ ہے؟ یا پہاڑی دیوی کا عتاب جو چالیس سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ٹھیکیدارنی کی جواس باختگی نہیں جاتی؟....

آج مندر کی دیواریں بول اٹھیں آج مسجد کی میناریں بول اٹھیں

"بند کرو مذہب کے جھگڑے آپس کی تکرار"

فلم "نیا سنسار" سے ماخوذ ــــ خواجہ احمد عباس نے اپنی فلمی زندگی کی شروعات اسی فلم سے کی۔

خواجہ احمد عباس نہیں رہے

شہرۂ آفاق ادیب، بے باک صحافی اور فلمساز خواجہ احمد عباس اب ہمارے درمیان نہیں رہے مگر اُن کی ستر کتابیں، ۲۵ فلمیں اور صحافت کی دنیا میں عوام کے حق میں ان کا بے لاگ آزاد قلم انھیں ہمارے درمیاں ہمیشہ زندہ رکھیں گے

بقیہ عالمی مشاعرہ

سے آئے ہوئے شاعر جو وہاں ہندوستانی سفیر ہیں جناب کمار آئے اور اپنا اپنا کلام سُنا کر چلے گئے۔

لندن سے تشریف لائے ہوئے احمد فراز کو اختتامی لمحات میں بلایا گیا ؎

اوّل اوّل کی دوستی ہے ابھی
یہ غزل ہے کہ ہو رہی ہے ابھی

دوسری غزل کے چند اشعار ؎

غرورِ جاں کو مرے یار بیچ دیتے ہیں
قبا کی حرص میں دستار بیچ دیتے ہیں
یہ لوگ کیا ہیں کہ بیمار خواہشوں کیلئے
تمام عمر کا پندار بیچ دیتے ہیں "
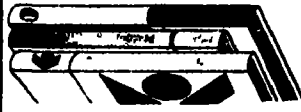
ہندوستان کے نامی گرامی شاعر خمار بارہ بنکوی نے اُستادانہ لہجہ میں یہ اشعار پڑھے ؎

نہ ہار ہے عشق اور نہ دُنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے، ہوا چل رہی ہے
چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں
نیا ہے زمانہ نئی روشنی ہے "

اختتام میں مشاعروں کی روایت اور تہذیب کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مجروح سلطانپوری اور علی سردار جعفری نے مقطع کے طور پر اپنا کلام سُنایا اور اسی کے ساتھ مشاعرہ ختم ہو گیا۔

بابِ انتقاد

اسلام اینڈ انڈین کلچر (انگریزی)
خدا بخش میموریل اینوئل لیکچر (پٹنہ ۱۹ دسمبر ۱۹۸۵ء)
ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات
فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر (لکھنؤ ۵ جنوری ۱۹۸۶ء)
بھارتیہ سنسکرتی کی سمگرتا (ہندی)
ڈاکٹر راجندر پرساد ویاکھیان مالا (۲۳ دسمبر ۱۹۸۵ء)

شری بی این پانڈے۔ گورنر اڑیسہ

آج جب کہ ملک کی فضا فرقہ پرستی، تنگ نظری اور خود غرضی جیسی لعنتوں کا شکار ہو رہی ہے اور اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ عوام کو ہندوستانی تمدن کے ... وارفتہ ہم آہنگی کے اصولوں سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ ملک کی پرانی ثقافت ... پر آپسی محبت، قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھ کر ملک کو ترقی کی طرف لے جانے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ تو اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اڑیسہ کے گورنر شری بشمبر ناتھ پانڈے نے اوّل تو پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں تین لیکچر انگریزی زبان میں بعنوان "اسلام اور ہندوستانی تمدن" ۱۹ تا ۲۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو دیئے اور پھر ۲۳ دسمبر کو ڈاکٹر راجندر پرساد ویاکھیان مالا کے تحت ہندی میں بعنوان "ہندوستانی تمدن کی ہمہ گیریت" اور ۵ جنوری ۱۹۸۶ء کو لکھنؤ میں مرحوم صدر فخرالدین علی احمد کی یاد میں اردو میں ایک لیکچر بعنوان "ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات" دیا۔ اور ان تمام لیکچروں میں مناسب تاریخی حوالہ جات کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان نے ہمیشہ ہی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو اہمیت دی ہے اور اس ملک کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ ہندوستان نے کبھی بھی اچھی رسوم اور اچھے خیالات کے حاصل کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ یونانی، ساسانی، ہن، سیتھین، ایرانی، ترک، مغل اور افغان اس ملک پر حملہ آور ہوئے لیکن واپس جاتے ہوئے اگر اپنے کچھ لوگوں کو چھوڑ گئے تو ہندوستان نے ان سب کو اپنے اندر سما لیا۔ ان کی نیک رسوم و رواج کو اپنا لیا اور شروع شروع کی مخاصمت کے باوجود بعد میں اُن سے ایسا میل جول کر لیا کہ یہ یہاں کے ہی ہو کر رہ گئے۔ اسلام کے مدعیوں نے تو بہت زیادہ حملے ہندوستان پر کئے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ بعد میں جب مسلمان حملہ آور ہی ہندوستان میں آئے تو ہندوستانی مسلمانوں نے ڈٹ کر اُن کا مقابلہ کیا۔ اسلام کے تو اردے اپنی کئی غلط رسموں کو ترک کر دیا اور اُن کی اچھی رسموں کو بصد خوشی قبول کر لیا۔ فلسفۂ تصوّف کا وجود میں آنا، اسلام پر ہندو فلسفہ کے اثر کو ظاہر کرتا ہے اور اس کے تحت تمام مذہبی کوتاہ نظری کافور ہو جاتی ہے۔ جتنے بھی حملہ آور ہندوستان میں وارد ہوئے تھے اُن کی اپنی زبانیں یونانی، ایرانی، ترکی اور افغانستانی تھیں لیکن آج ان زبانوں کے بولنے والے یہاں آکر ـــــ جہاں کہیں بھی اپنا بسیرا بنایا وہاں کی زبان ہی قبول کر لی۔ اور سارے ہندوستان میں کہیں بھی، کسی جگہ بھی، اُن زبانوں میں سے کوئی زبان نہیں بولی جاتی ہے۔
اسی طرح ہندوستانی دیہات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی رسوم تقریباً ایک ہی جیسی ہیں اور نگ زیب کو بدنام کرنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اس نے مندروں کو جاگیر عطا کی، مہاکال مندر اجین، بالاجی مندر چترکوٹ، کمکشا مندر گوہاٹی (آسام)، جین مندر گرنار، دلواڑہ مندر آبو اور گورودوارہ رام رائے دہرہ دون کو جاگیریں عطا کی ہوئی تھیں۔ اسی طرح ٹیپو سلطان نے اپنے قلعے کے اندر ہی رنگناتھ کا مندر بنوایا ہوا تھا جہاں ہر روز صبح ناشتہ سے قبل وہ درشنوں کو جایا کرتا تھا۔ اکبر کی رانا پرتاپ سے لڑائی میں اکبر کے ساتھیوں میں راجہ مان سنگھ اور راجپوت سپاہی تھے اور رانا پرتاپ کی فوج کا سپہ سالار حکیم خان سور تھا۔ جالور کے تاج خاں اور اس کے ایک ہزار پٹھان سپاہیوں نے رانا کا ساتھ دیا تھا۔ اسی طرح گورو گوبند سنگھ کے ساتھی اکثر و بیشتر مسلمان تھے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ سب ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کی قدر کرتے تھے۔ سیواجی نے حکم دے رکھا تھا کہ کہیں بھی قرآن شریف کی بے ادبی نہ کی جائے بلکہ جب سیواجی کے ایک کمانڈر نے کسی بڑے مغل حاکم کی خوبصورت لڑکی کو اغوا کر کے سیواجی کو پیش کیا، تو اس نے اس کمانڈر کو موقوف کرتے ہوئے بہت لعن طعن کی کہ اس نے ہندوستانی تہذیب کو کلنک لگایا ہے اور لڑکی کو اپنی بیٹی کہہ کر فوج کی حفاظت میں اس کے والدین کے پاس صحیح سلامت پہنچاتے ہوئے معافی بھی مانگی۔
آج کل کے سیاسی لیڈر اپنی خود غرضیوں کے لئے مختلف فرقوں میں عناد اور بغض پیدا کرنے میں اپنی بزرگی سمجھتے ہیں۔ شری پانڈے نے آج کے ہندوستان کے سیاسی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے واقعی یہ ہندوستانی تہذیب پر بڑا بھاری احسان کیا ہے، جو لوگوں کو اصلیت سے آگاہ کیا ہے۔ ان لیکچروں سے کئی اور بھی اچھے اچھے پہلو مترشح ہوتے ہیں جن کو پڑھنے سے انسان کے دل میں ہندوستان کی صحیح تہذیب کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اور آپس میں مل بیٹھ کر سارے ملک کی ترقی اور بہبودی کے لئے کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شری پانڈے اس نیک کام کے لئے ہر ہندوستانی کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خدا انہیں توفیق عطا کرے کہ وہ اس نیک کام میں ہر طرح سے کامیابی حاصل کرتے ہوئے ہندوستانی تہذیب و تمدن کے نام کو مزید اونچا کریں۔

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا

من کہ مکتوب الیہ

بھائی صاحب : نمسکار !

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔ کرم نامہ نظر نواز ہوا' زحمت فرمائی کا بہت بہت شکریہ" اردو صحافت" میں اردو اکادمی دہلی نے جو آپ کو انعام دیا ہے یہ ایک بالکل صحیح فیصلہ ہے۔ آپ اس اعزاز کے قطعی مستحق ہیں۔ یہ خبر سُن کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بھگوان آپ کو عمرِ دراز' کامیاب زندگی اور شاندار صحت عطا فرمائے۔ آمین ! انعام کا ایک پیسہ بھی اہمیت رکھتا ہے لیکن آپ جیسے بہادر' صاف گو' بے لوث' بے دریغ' ایماندار اور کرمٹھ صحافی کے لئے یہ بہت کم ہے۔

ڈاکٹر اودے سرن اہمان

محترم و مکرم سرور صاحب۔ آداب !

شانِ ہند' کے نئے رنگ روپ آفسیٹ کی چھپائی کے لئے بہت بہت مبارک۔ تازہ شمارہ ملا۔ مہربانی' شکریہ۔ ابھی پہلی نظر اس پر ہوئی ہے سب سے پہلے نظر حقیر آستانی کی نظم پر جم گئی بہت خوبصورت نظم ہے" اچانک کچھ نہیں ہوتا" ایسی مرصع نظم جدت اور روایت کا سنگم' جی خوش ہوگیا۔ صفحات اُلٹتے اُلٹتے آپ کی تحریر سامنے آ گئی" ملزم اصالتاً حاضر ہے" پڑھنا شروع کیا مگر باقی کام بھول گئے اور میں اس تحریر میں ڈوب گیا۔ یہ تحریر کسی بھی بہت اچھے افسانے سے زیادہ متاثر کرنے والی ہے۔ ان واقعات پر تو جاسوسی ناولوں جیسی چیز لکھی جا سکتی ہے۔ " نصف صدی کا قصہ ہے دو چار دنوں کی بات نہیں" آپ بزرگوں کی زندگی ایسے واقعات سے لبریز ہے۔ آپ یہ سلسلہ جاری رکھیں' یقین جانیے' ہم لوگوں کے لئے تو یہ نادر تحفہ ہے

ایڈیٹر الف لام' جموں

برادرِ محترم سرور صاحب آداب !

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ 'شانِ ہند' اب آفسیٹ پر چھپنا شروع ہوگیا ہے۔ آزادی کے بعد میدانِ صحافت میں ایک طویل جدوجہد کے بعد آپ نے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ نے ادبی صحافت میں سنسنی خیزی کو کبھی دخل انداز نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اُردو کی تہذیبی سرگرمیوں اور حقیقت پسندانہ رویوں کو ہی اہمیت دی ہے۔ جس کی وجہ سے' شانِ ہند' ایک خاص مزاج کا ماہنامہ بن سکا ہے۔

نیازمند

(رام لعل)

برادرِ محترم جناب سرور صاحب تسلیم !

یہ معلوم کر کے کہ اُردو اکادمی دہلی نے آپ کو اردو کا بہترین صحافی قرار دے کر اعزاز و انعام سے نوازا ہے ——— آپ واقعی اس اعزاز کے مستحق ہیں جو اُردو زبان کے اس بحرانی دور میں بھی ایسی لگن سے زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس موقع پر میری دِلی مُبارکباد قبول کیجئے۔

اندر موہن کیف

محترم سرور بھائی۔ آداب !

کل اچانک 'شانِ ہند' ملا۔ خوبصورت اور حسین ! نئے تن و من کے ساتھ ! میری اور شہناز کی جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

کتابت' فوٹو آفسیٹ کی طباعت اور اچھے لے آؤٹ' نے 'شانِ ہند' کو ایک نیا جنم دیا ہے۔ ترتیب بھی اچھی ہے اور مواد بھی پہلے سے بہتر ہے۔ جیسے بھی ہو' آئندہ بھی اس معیار کو برقرار رکھیے۔ قدرت کرے آپ صحت کے اعتبار سے بھی بعافیت رہیں۔

نیازکار شمس کنول

مندوبِ والا محترم سرورؔ۔ تحفۂ ہائے خلوص!
سب سے پہلے آپ کو دلی مبارکباد اور
نذرانۂ تہنیت و تبریک پیش کروں کہ دہلی اردو
اکادمی کی جانب سے آپ کو صحافت کا ایوارڈ پیش
کیا گیا ہے۔ "فیصل جدید" میں یہ مسرت خیز خبر پڑھ
کر بڑی خوشی اور شادمانی ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ دہلی
اکادمی کے منتظمین نے یہ اعزاز آپ کی نذر کر کے صحیح
فکر و شعور کا ثبوت دیا ہے۔ آج کی صحافت کی دنیا میں
جو آپ کا مقام و منصب ہے اس کے اعتبار سے آپ
بجا طور سے اس ایوارڈ کے مستحق اور حقدار ہیں۔
خالقِ حقیقی آپ کو یہ اعزاز مبارک کرے اور
آپ اسی تنومندی اور خورسندی کے ساتھ اردو
ادب اور صحافت کی خدمت انجام دیتے رہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

توصیف علوی

عالیمقام عم محترم۔ احترام و آداب!
"اردو اکادمی ایوارڈ" کی دلی مبارکباد قبول
فرمایئے۔ ہر چند کہ آپ کی شخصیت اور صحافتی خدمات
کے آگے یہ ایوارڈ بہت چھوٹا ہے لیکن اس دورِ
بے شعوری میں شعوری علامات کا درجہ رکھتا ہے کہ
آپ کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور آپ کے بیباک
قلم کی انفرادیت تسلیم کی گئی۔ خدا آپ کو تادیر سلامت
رکھے کہ سچائیوں کے چراغ روشن رہیں۔ آمین!

منصور عثمانی

بندگوار نمسکار!
آج "اسٹیٹسمین" میں آپ کو
انعام ملنے کی خبر، آپ کی تصویر اور رپورٹ پڑھی۔
مبارکباد!

نیازمند رام لعل

جناب سرورؔ صاحب آداب مناسب!
سچ تو یہ ہے کہ آپ جیسے صاف و بیباک
صحافی ہندوستان میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

یہ جملہ میں رسمًا نہیں بلکہ دلی خوشی کے جذبے کے تحت
لکھ رہا ہوں

بخشی اختر امرتسری

محترم سرورؔ تونسوی صاحب۔ آداب!
سب سے پہلے تو آپ دلی اردو اکادمی کے
انعام کی مبارکباد قبول فرمایئے۔ اسی کو کہا جاتا ہے
"حق بہ حقدار رسید" دیر سے سہی بہر حال حقدار
تک تو پہنچ گیا

رضوان احمد

برادرِ مکرم و محترم۔ آداب!
دہلی اردو اکادمی کی جانب سے ایوارڈ ملنے
کی خبر اور تصویر معاصر "پیٹریاٹ" اور "اسٹیٹسمین" دہلی
میں دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ دلی مبارکباد قبول
فرمائیں۔
اگرچہ یہ ایوارڈ اور اعزاز آپ کا حق ہے
جو عرصہ قبل ملنا چاہیئے تھا، تاہم "دیر آید درست آید"
کے مصداق ہی سہی "حق بہ حقدار رسید" سے خوشی ہونا
قدرتی امر ہے۔

سورج تنویر

محترمی۔ تسلیم!
دلی اردو اکادمی کی طرف سے اردو صحافت
پر انعام کی مبارکباد قبول کیجئے۔ خدا کرے آپ
کی صحافت اسی طرح "شانِ ہند" بن کر چمکتی رہے۔

محسن واصلی قنوجی

سرورؔ تونسوی صاحب آداب!
کل اخبار میں یہ خبر پڑھ کر کہ آپ کو انعام
سے نوازا گیا ہے، مسرت ہوئی۔

اوم کرشن راحت

محترم المقام جناب سرور تونسوی صاحب! تسلیم بصد تعظیم
عرصۂ دراز کے بعد حاضرِ خدمت ہونے کی سعادت
نصیب ہوئی ہے۔ ہوا یوں کہ آج کے "آزاد ہند"
کلکتہ میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ آپ کو (اردو صحافت)
سنہ ۱۹۸۶ء کا سالانہ اردو اکیڈمی ادبی ایوارڈ دیا
جا رہا ہے۔ اس عظیم ایوارڈ کے لئے آپ کا انتخاب
واقعی قابلِ صد ستائش ہے۔ میں اپنی اور اپنے احباب
کی جانب سے آپ کی خدمتِ اقدس میں مبارکباد
پیش کرتا ہوں۔ قبول فرمائیں۔

آزاد گورداسپوری

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا۔ ہمیں ضرور لکھئے۔

شمع ہند

جولائی ۱۹۸۷ء

جلد ۴۸
شمارہ ۷

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر
وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ "شمع ہند"
ملت انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی

ایک جوگی اور ایک مسافر دریا کے کنارے پہونچے دونوں دریا پار کرنا چاہتے تھے مسافر نے کشتی والے کو دو پیسے دیئے اور ملاح نے دریا پار کرا دیا۔ جوگی نے اس مسافر کو ہنس کر دیکھا اور پانی پر چلنے لگا، یوں وہ دریا پار کر گیا۔

دریا کے کنارے پر جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو مسافر نے ہنس کر دیکھا اور کہنے لگا کہ تم نے ساری عمر ریاضت کر کے دو پیسے کا کام ہی سیکھا ہے

سلام جنگ

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد
فرقہ پرستی کی
وبا میں اضافہ

"ایسی فرقہ پرستی نہ دیکھی تھی نہ سنی جیسی کہ اب دیکھنے میں آ رہی ہے۔ ہندوؤں میں فرقہ پرستی کے جراثیم سنہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک کے بعد کثرت سے پیدا ہوئے۔ آر۔ ایس۔ ایس یا جن سنگھ، آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا نے ہندوؤں کو ... مذہب کو بچانے کی اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی تلقین کرنے میں جو رول ادا کیا ہے، اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کیوں کہ اس سے ہندو اب کافی حد تک محض روپیہ کو ہی اپنا ایمان دھرم نہیں سمجھتا بلکہ اُسے اب گہری ... ہوشی سے بیدار کیا گیا ہے۔"

موجودہ ملکی صورت حال پر سرور تونسوی کی خصوصی تحریر۔ پڑھیے صفحہ ۳ پر

"ملک چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟"

دیگر دلچسپیاں

میں نے کمرۂ عدالت سے باہر نکلتے ہی ... صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ گھر جائیے۔ جو تکلیف آپ کو اٹھانی پڑی اس کے لئے معافی خواہ ہوں۔ ... صاحب فرمانے لگے مسعود بھائی! تم تو یونہی ایڈیٹر بنے۔ اگر وکالت کا پیشہ اختیار کرتے تو تمہاری وکالت خوب چمکتی۔

ایک مجسٹریٹ کا قصہ۔ جو ٹی بی کا دیرینہ مریض تھا اور نا مناسب طور پر الجھنیں پیدا کرنے کے لئے اپنی مزاجی کیفیت سے مجبور تھا۔

پڑھیے صفحہ ۲۷ پر

اب کوئے یار ـــــ

حسن کار
مصطفےٰ آرٹسٹ

خطاط
... سلطان ...

زر سالانہ ...

غزل

حکیم اورنگ آبادی

صبا! شرمندۂ احسان نہ کر اتنا مرا دل ہے
کہیں یہ نخلِ ماتم کی کلی کھلنے کے قابل ہے

کسی کے ناوکِ انداز کا شاید یہ گھائل ہے
تڑپ پہلو میں دل کی آج رنگِ رقصِ بسمل ہے

ہمارے دم قدم سے ہے یہ سب ہنگامہ آرائی
گل و غنچہ ہیں، مہر و ماہ ہیں، تاروں کی محفل ہے

جسے کہتی ہے دنیا، سوزِ دل، داغِ جگر ہمدم!
یہ اصلِ زندگی ہے آرزوئے دل کا حاصل ہے

غرورِ خود پرستی میں اُسے پامال کر ڈالا،
نہ سمجھا تو نے او ظالم! کسی بیکس کا یہ دل ہے

وفورِ شوق سے بیگانۂ عقل و خرد ہونا!
طلبگارِ جمالِ یار کی یہ پہلی منزل ہے

یہی اک سر چھپانے کیلئے تھا آسرا میرا،
مگر اب آسمان بھی سرزمینِ کوئے قاتل ہے

جہاں کا ذرّہ ذرّہ ہے مرقعِ درسِ عبرت کا
تعجّب ہے کہ پھر بھی یہ دلِ دیوانہ غافل ہے

مرا دل مرکزِ مہر و وفا سے ہٹ نہیں سکتا
شبیہِ دوست ہر دم میری نظروں کے مقابل ہے

یہ بنیادِ محبت ایک دن گر گر نہ رہ جائے
یہی گر زلزلہ خیزی تری اے لرزشِ دل ہے

جنابِ خضر اس پر بھی نگاہِ لطف تھوڑی سی
کوئی بدبخت راہِ شوق میں گم کردہ منزل ہے

حکیم اس انقلابِ دہر نے ناچار کر ڈالا
جو کل آسان سی اک بات تھی وہ آج مشکل ہے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالات حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اڈیٹوریل

۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ پرستی کی وبا میں اضافہ

گزشتہ پینتیس سال (جب سے ہم لوگوں نے ہوش سنبھالا ہے) کے طویل عرصہ میں ایسی فرقہ پرستی نہ دیکھی تھی نہ سنی جیسی کہ اب دیکھنے میں آ رہی ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے سدا سے کاروباری مصروفیات یا کھیتی باڑی کے اس ضمن میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اور ہندو تو صرف روپیہ پیدا کرنے میں ہی لگا رہا۔ اسے فرقہ پرستی کے لفظی معنی بھی نہ آتے تھے۔ بیشک ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج نے رفتہ رفتہ ہندوؤں کو فرقہ پرستی سے روشناس کرایا مگر ان دونوں اخلاقی قدریں اس قدر دلوں میں گھر کئے ہوئے تھیں کہ آریہ سماج اور مسلمانوں کے مذہبی مناظروں کے باوجود فرقہ پرستی کا بھوت کسی گہرے غار میں دفن تھا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ اور اسی قماش کی دیگر متعدد تحریکوں نے ہندوؤں کو فرقہ پرستی کی راہ پر گامزن کرنے میں بہت بڑا یوگ دان دیا اور گزشتہ بیس سالوں میں ہی ہندوؤں کا نوجوان طبقہ فرقہ پرستی کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہندوؤں میں فرقہ پرستی کے جراثیم ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک کے بعد کثرت سے پیدا ہوئے اور ہندوؤں نے یہ سمجھ لیا کہ پاکستان کا وجود چونکہ دو قوموں کی بنیاد پر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے اس لئے ہندو بھی مسلمانوں کی طرح کیوں نہ اس دو قومی بنیاد پر اپنے وجود کو جلا بخشیں اور یہی وجہ ہے کہ آر ایس ایس، ہندو سینا اور اسی قسم کی خالص فرقہ پرست تحریکیں ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ہندوستان میں شروع ہوئیں۔ دوسرے معنوں بلکہ صاف الفاظ میں اسے یوں کہنا چاہیے کہ ہندوؤں میں فرقہ پرستی کی

ہی منتقل ہوئی ہے۔ ہندوستان میں مذہبی جنون جس قدر مسلمانوں اور سکھوں میں ہے کسی دوسری قوم میں نہیں ہے۔ مسلمان اپنے مذہب یا بانیٔ اسلام کے خلاف کچھ سُن ہی نہیں سکتا۔ اس کے برعکس ہندو نے اپنے مذہب کو محض گنگا اشنان یا مندر میں ماتھا ٹیکنے تک ہی محدود رکھا اور ہندوؤں کی اکثریت نے روپیہ کو ہی اپنا ایمان دھرم سمجھا۔ اور دن رات روپیہ پیدا کرنے میں ہی لگے رہے۔

آر۔ ایس۔ ایس۔ یا جن سنگھ، آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا نے ہندوؤں کو اپنے مذہب کو پہچاننے کی اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی تلقین کرنے میں جو رول ادا کیا ہے اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے کیوں کہ اس سے ہندو اب کافی حد تک محض روپیہ کو ہی اپنا ایمان دھرم نہیں سمجھتا بلکہ اسے اب گہری نیند بلکہ بے ہوشی سے بیدار کیا گیا ہے اور وہ اپنے مذہب کو کسی حد تک سمجھنے لگا ہے۔

ہندوؤں کو بیدار کرنے والی تحریکوں نے ہندوؤں میں حُبّ الوطنی کا جذبہ پیدا کیا اور انہیں اس سے روشناس کرایا کہ اپنے ملک کو اب ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانا ان کا کرتویہ ہے۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد یقینی طور پر ہندوؤں میں حُبّ الوطنی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کے تحفظ کا بھی جذبہ پیدا ہوا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی ہندو اپنے ہم وطنوں کی طرح غلام ہونے کے باوجود ملک کو آزاد کرانے کے لئے اپنے ہم وطنوں سے دو ہاتھ آگے ہی رہا، اس میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہندوؤں کی بعض تحریکوں نے ہندوؤں میں فرقہ پرستی کا الاؤ جلا رکھا ہے۔ مگر اس سے روگردانی کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہوگا کہ ہندوؤں میں فرقہ پرستی کا یہ الاؤ مسلمانوں کی فرقہ پرستی کی تیز ہواؤں سے ہی روشن ہوا ہے۔

مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ وہ فرقہ پرست نہیں بلکہ مذہب پرست ہے۔ اس کا مذہب جو کچھ اسے بتاتا ہے وہ اس پر گامزن ہے۔ مگر افسوس تو یہی ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کی ان روایات یا احکامات کو بھول رہا ہے جو اس نے اُسے اپنے پڑوسی کے حقوق، یا دوسرے مذاہب کے معابد کی عزت اور دوسرے مذاہب کے پیغمبروں یا اوتاروں کی تعظیم اور قومی یک جہتی کے لئے دے رکھے ہیں۔ ہاں آج کا مسلمان اسے بڑی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ ہر غیر مسلم کافر ہے (اس ضمن میں آیت پیش کی جا سکتی ہے) اور اس کا رب 'ربّ العالمین' نہیں بلکہ رب المسلمین ہے، اس کا رسول رحمۃٌ للعالمین نہیں بلکہ رحمۃٌ للمسلمین ہے۔

راقم الحروف نے مولانا ابو الکلام آزاد کا "ترجمان القرآن" (حالانکہ یہ مکمل نہیں ہے) پڑھا ہے (آج کا نوجوان مسلمان مولانا آزاد کی اس تفسیر سے بھی متفق نہیں ہے) مگر مولانا آزاد، مولانا احمد سعید کی تفاسیر قرآن میں جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہی ذہن نشین ہوتا ہے کہ اسلام امن وسلامتی کا پیامبر ہے اور اس مذہب میں کسی بھی بد اخلاقی یا بدقماشی کا مرتکب ہونا اپنے آپ کو نارِ جہنم کے سپرد کرنا ہے۔ چہ جائیکہ کسی معصوم اور بے گناہ یا کسی غیر مسلم پڑوسی کو قتل کرنا۔

ہندو دھرم جس میں چیونٹی تک کو مارنے کی مناہی ہے، آج اس کے پیروکار انسانوں کا قتل ایک معمولی بات سمجھتے ہیں۔ سکھ مذہب کے بانیوں نے دوسروں کی حفاظت کی اور آج اس کے بعض ماننے والے اپنے گوروؤں کی اس تعلیم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے گناہوں کا قتل سکھ پنتھ کی خدمت سمجھتے ہیں۔

مذہبی فرقہ پرستی کا یہ جنون ملک، قوم اور خود فرقہ پرستوں کے لئے کس قدر خطرناک نتائج کا موجب ہو رہا ہے، اسے بخوبی سمجھتے بوجھتے ہوئے بھی ہر کوئی ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں کوشاں ہے۔

حکومت زبانی اور کاغذی طور پر ملک سے فرقہ پرستی کے بھوت کو بھگانے کے بڑے بڑے دعوے کرتی ہے مگر عملی طور پر وہ فرقہ پرستی کو ہوا دے رہی ہے۔ جب ہم سیکولر حکومت کے دعویدار ہیں تو پھر آکاشوانی اور دوردرشن پر مذہبیات کا پرچار کیا معنی؟ اسکولوں میں ابتدائی کلاسز کے طلبا کو مذہب کے بارے میں صحیح رہنمائی کرنے کے بجائے تاریخ کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ اگر اسکولوں میں طلبا کو مذہب کی صحیح تعلیم دی جائے تو کچھ عرصہ بعد فرقہ پرستی کی جگہ مذہبی رواداری بڑھنے لگے گی۔ مگر یہاں تو پڑھایا یہ جاتا ہے کہ اورنگ زیب ہندوؤں کا دشمن تھا، شواجی مسلمانوں کا قاتل تھا۔

ضرورت ہے کہ حکومت اور عوامی نمائندے نیک نیتی سے مذہبی فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کریں۔

ہندوؤں میں فرقہ پرستی مسلمانوں سے ہی منتقل ہوئی ہے۔ ہندوستان میں مذہبی جنون جس قدر مسلمانوں اور سکھوں میں ہے کسی دوسری قوم میں نہیں ہے۔

زمانہ تھا کہ ہندؤوں کی سماجی تقریبات میں
لمان نیتا اور مسلمانوں کی سماجی تقریبات
ہندو نیتا آگے آگے ہوتے تھے اور دونوں
مذہبی رواداری اور اخلاقی روایات کا اس
ردمیان رکھا جاتا تھا کہ کیا مجال جو کسی کے

مذہبی جذبہ کو ذرا بھی ٹھیس پہنچے۔
ہندو کو یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ مسلمان اسی
مٹی سے پیدا ہوا ہے اور اسی مٹی میں دفن ہوگا
مسلمان کو بھی یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ ہندو مہد سے
لحد تک اس کا پڑوسی ہے یہ کہیں نہیں

جائے گا۔ جب دونوں نے یہیں رہنا ہے
تو پھر لڑ جھگڑ کر کیوں رہیں؟ کیوں نہ ایک دوسرے
کی ضرورت بن کر رہیں تاکہ دونوں کو برابر کا درجہ
حاصل رہے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ
کے حصہ دار بن کر رہیں۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک کی مقبولیت!

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک کی
خ جب دریا گنج میں کھولی گئی تو عام طور
ہا جاتا تھا کہ مسلمانوں کا یہ بینک دہلی
دوسرے بینکوں میں کیا کامیاب ہو سکے
بینک کی اِس شاخ میں کھڑے ایک لالہ
نے فرمایا تھا کہ اِس بینک کا کیا بھروسہ
ب فیل ہو جائے، مسلمانوں اور بینک
ذا اینٹ اور کتے کا بیر ہے، مسلمانوں
سود لینا یا سود پر قرض دینا منع ہے
بینک چلتے ہی سود پر ہیں، انہیں لالہ
نے فرمایا تھا کہ ہندؤوں کو اِس بینک
ساتھ لین دین نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ
ی کوئی گارنٹی نہیں کہ یہ بینک کب
جائے۔

ایڈیٹر شانِ ہند نے جب اُن لالہ جی
لعایا کہ اب ہندوستان میں کسی بینک
فیل ہونے کا خدشہ نہیں رہا کیونکہ
ہ بینک ریزرو بینک کے زیر سایہ
کرتے ہیں، اور ریزرو بینک نے
ایسے انتظامات کر رکھے ہیں کہ کوئی بھی
بینک اپنے کھاتے داروں کے لئے نقصان
کا باعث نہیں ہو سکتا۔

اِس پر لالہ جی فرمانے لگے اگر آپ
اِس بینک کی کامیابی کا اتنا یقین رکھتے
ہیں تو پھر اپنا اکاؤنٹ بھی اِس بینک میں
کھلوائیے۔ چنانچہ ایڈیٹر شانِ ہند نے نہ
صرف ماہنامہ شانِ ہند کا اور اپنا ذاتی
کھاتہ اِس بینک میں کھولا بلکہ اپنی بیوی بچو
اور لڑکوں تک کے کھاتے اِس بینک
میں کھلوانے کے علاوہ اپنے جملہ دوستوں
کے ایک ضد کے قریب کھاتے اِس بینک
میں کھلوائے۔

اور آج اِس بینک کی کامیابی کا یہ
عالم ہے کہ اسے کاروباری اداروں کے
کھاتوں کے لئے الگ بلڈنگ میں کام
جاری کرنا پڑا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وقت دہلی کے
کسی بھی بینک کی ایک شاخ میں کرنٹ
اور سیونگ کے کھاتے اِس قدر نہیں
ہیں جتنے کہ بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک کی دہلی
شاخ میں ہیں، اور یہ سب کچھ محض اِس
بینک کے ریجنل مینجر جناب شمیم کاظم
صاحب کی شرافت، خوش اخلاقی اور ہر فرقہ
کے عوام سے مخلصانہ سلوک کا نتیجہ ہے۔
شمیم کاظم صاحب نے اپنی اَنتھک کوششوں
سے دلی کے مسلمانوں کو بینک کی برکتوں
سے رُوشناس کرایا ہے اور اِس بینک کے
طفیل آج دہلی کے ہزاروں بے روزگار مسلمان
حضرات اپنے اچھے کاروبار کے مالک ہیں
کہا جاتا ہے کہ اِس بینک میں تقریباً ۲۵ ہزار
سیونگ اکاؤنٹ ہیں، اور کرنٹ کھاتوں
کی تعداد بھی چھ سات ہزار سے کم نہیں ہے
آج یہ بینک بلا تخصیص مذہب و ملت ہر
فرقہ کا محبوب بینک ہے، اِس بینک کے
کارکنان جس قدر مہذب اور با اخلاق
طریقوں سے اپنے حساب داروں سے
پیش آتے ہیں وہ دہلی کے دوسرے
بینکوں کے کرم چاریوں کے لئے ایک
مثال کا درجہ رکھتے ہیں۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک ہے
جس کی ۴۳ شاخیں مہاراشٹر، گجرات،
دہلی اور جموں و کشمیر میں پھیلی ہوئی ہیں
اِس بینک کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب
زین جی رنگون والا نے صرف دس ہزار
چھ سو روپیہ کے قلیل سرمایہ سے اِس بینک
کا شری گنیش کیا تھا، اور اِس وقت ۳۰ر
جولائی ۱۹۸ء کو بینک کی ڈپازٹ کی رقم

دو ارب ساٹھ کروڑ روپئے سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔

پچاس سال تک کو آپریٹو بینک میں جناب زین جی رنگون والا کی اعلیٰ خدمات کے صلے میں حکومتِ ہند نے رنگون والا کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا ہے۔

اگر ریزرو بینک فراخ دِلی کا ثبوت دے تو صرف دلّی میں اِس بینک کی درجنوں شاخیں کھُل سکتی ہیں۔ اور تمام یو، پی اور دیگر مقامات کے عوام متمنی ہیں کہ بمبئی مرکنٹائل بینک کی شاخیں اُن کے شہروں اور قصبوں میں کھُلیں تاکہ تنگ کے غریب عوام اِس بینک سے مستفید ہو سکیں۔

ہم جناب شمیم کاظم صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ اُن کی انتھک محنت اور کاوش سے دلّی میں بمبئی مرکنٹائل کو آپریٹو بینک ہر خاص و عام کے دِل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔

ہمیں شمیم صاحب سے یہ گذارش بھی کرنی ہے کہ اُن کے بینک کے دو نوں حصّوں حصّوں میں کھاتے داروں کا ہجوم رہتا ہے۔ اور جگہ اتنی کم ہے کہ کھاتے داروں کا دم گھُٹنے لگتا ہے، لہذا آپ کو بینک کے کچھ شعبہ جات کے لئے دریا گنج میں کہیں کوئی اور جگہ کا بھی انتظام فوری طور پر کرنا ہوگا کیونکہ ہر روز آپ کے بینک میں کھاتے داروں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اِس امر پر فوری توجہ دیں گے۔

اُردو اکادمی دِلّی

۱۔ حال ہی میں اُردو اکادمی دِلّی نے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی اُردو مطبوعات (صرف دِلّی میں) پر انعامات کا اعلان کیا ہے مگر افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں یہ اعلان نہیں کیا گیا کہ کس کس ناشر کو سال ۱۹۸۶ء میں بہترین اور خوبصورت کتاب پر ایوارڈ دیئے گئے ہیں کیونکہ ہر سال دو ناشروں کو بھی بہترین مطبوعات شائع کرنے پر ایوارڈ دینے کا سلسلہ دِلّی اُردو اکادمی نے شروع کیا تھا۔ اور نہ ہی گزشتہ سال اس سلسلہ میں کوئی اعلان کیا گیا اور نہ ہی اس سال ایسا کیا گیا ہے۔

اکادمی کو سال ۸۷-۱۹۸۶ء میں پچاس لاکھ روپئے کی سرکاری گرانٹ دی گئی تھی اور اب سال ۸۸-۱۹۸۷ء میں سرکار نے گرانٹ میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ مگر اُردو اکادمی نے اُردو مطبوعات کے سلسلہ میں ناشرین کتب کے ایوارڈز کی رقوم میں اضافہ کرنے کی بجائے سُنا ہے کہ یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ ختم نہیں ہُوا تو اکادمی کے ذمہ دار ارکان کو اس کا اعلان کرنا چاہیئے کہ یہ ایوارڈ کس کس ناشر کو اُن کی کن کن مطبوعات پر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے لفٹننٹ گورنر ایسے انصاف پسند چیئرمین اُردو اکادمی کے عہد میں ایسا ہونا یقیناً ایک عجیب سی بات ہے۔

۲۔ اکادمی کے قواعد و ضوابط میں درج ہے کہ اکادمی کے جملہ ایوارڈز صرف دِلّی میں رہنے والوں کے لئے مخصوص ہیں اور دہلی والا اُسے سمجھا جائے گا جو کم سے کم دس سال سے دلّی میں مستقل قیام پذیر ہو۔ اس سلسلہ میں ہم دِلّی اکادمی کے ارکان پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے جناب جیون سرن نازؔ کی کتاب "رہبرِ اعظم" کو اکادمی کی مالی امداد سے شائع کرنے کی اجازت کیسے دی، جبکہ نازؔ صاحب دس سال سے دلی میں مقیم نہیں ہیں بلکہ سال میں کبھی کبھار دو چار ہفتوں کیلئے اپنے لڑکے کے ہاں دِلّی آجاتے ہیں ورنہ وہ ضلع جون پور میں ہی رہتے ہیں۔

"رہبرِ اعظم" کی تعدادِ اشاعت ایک ہزار بیان کی گئی ہے اور مصنف نے اُردو اکاڈمی سے ایک ہزار کی اشاعت کے حساب سے ہی مالی امداد حاصل کی ہے جبکہ یہ کتاب بہت ہی کم تعداد میں شائع کی گئی اور مصنف نے غلط حلف نامہ داخل کر کے اکادمی سے غلط طور پر مالی مدد حاصل کی۔ اکادمی نے اس امر کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی کہ کتابیں گن کر مالی مدد دی جاتی۔ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ ڈھائی صد شائع کی گئی اگر ایک ہزار شائع کی گئی ہے تو مصنف اور اس کا تقسیم کار "ایسٹ ویسٹ بکس" اس کے ثبوت مہیا کریں کہ یہ کتاب انھوں نے کہاں کہاں فروخت کی حالانکہ اکادمی کو چاہیئے تھا کہ مصنف کا راشن کارڈ دیکھتی مگر کسی قسم کے قاعدے کی پابندی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور ایک ہزار کتاب پر مالی مدد دے دی گئی۔ یاد رہے کہ یہ کتاب 'ایسٹ ویسٹ بکس' کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی اور وہی اس کے تقسیم کار ہیں۔

۳۔ اب جبکہ اس کتاب پر ۵۰۰ روپیہ انعام دیئے جانے کا اکادمی کی طرف سے اعلان ہوا تو ہم نے جناب سیکریٹری صاحب اُردو اکادمی کو زبانی طور پر جملہ حالات سے آگاہ کیا تو انھوں نے نازؔ مانک پوری سے راشن کارڈ طلب کیا اور نازؔ صاحب نے راشن کارڈ بھیج دکھایا بھی جس پر ہم نے تحریری طور پر اکادمی

تو اطلاع دی کہ داخلی طور پر ریکارڈ کو بغور ملاحظہ فرمایا جائے کہ نازؔ مالک پوری کا نام اس میں کب تحریک ہوا۔ کیا 'رہبرِ اعظم' کا مسودہ منظور ہونے کے وقت سے دس سال پیشتر نازؔ صاحب کا نام دلی راشٹنگ میں درج تھا یا نہیں! ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ نازؔ صاحب نے اپنا نام دلی راشٹنگ میں دس سال پہلے تو کیا بہت بعد میں درج کرایا ہے اس لئے کتاب 'رہبرِ اعظم' کے بارے میں جو بھی غیر قانونی طور پر کارروائی کر کے اس کتاب کے مسودہ پر مالی مدد دینا منظور کیا گیا یا اس پر انعام کا اعلان کیا گیا اس لاقانونی کی تمام ذمہ داری اُردو اکادمی دلی پر آتی ہے۔ لہٰذا اکادمی کی جو رقم اس طرح ضائع کی گئی وہ اکادمی کو ان حضرات سے واپس دلوائی جائے اور یا پھر شری چرن سرن مالک پوری پر دھوکہ دہی کا سرکاری مقدمہ چلا کر ان سے وہ روپیہ وصول کیا جائے جو انھوں نے دھوکے سے حاصل کیا۔

اگر اکادمی نے اس سلسلہ میں کارروائی نہ کی تو ہم لفٹیننٹ گورنر سے گذارش کریں گے کہ وہ اس سلسلہ میں اکادمی کے ارکان سے کہیں کہ وہ اکادمی کا یہ نقصان پورا کرنے کے لئے مناسب کارروائی کریں۔ اور اگر اس سلسلہ میں خاموشی اختیار کی گئی تو پھر شانِ ہند کی طرف سے اُردو اکادمی سے عدالتی طور پر باز پرس کرنے کی کارروائی کی جائے گی۔

۴۔ جیسا کہ ہم نے سابقہ ماہ لکھا تھا کہ پروفیسر محمد حسن کے ماہنامہ "عصری آگہی" کی ۵۲ کاپیاں اکادمی ہر ماہ خریدتی ہے جبکہ دیگر چند رسائل کی صرف دس، پندرہ یا سترہ کاپیاں، اور تو اور "رہنمائے تعلیم" ایسا رسالہ جو کہ پچھتر سال سے جاری ہے اور جسے ہر اسکول میں خریدا جانا چاہئے۔ اس کی صرف اکتیس کاپیاں خریدی جاتی ہیں، محض اس وجہ سے کہ پروفیسر محمد حسن صاحب اُردو اکادمی کے ممبر ہیں اور اس لئے اُن کا رسالہ ہر سینئر سیکنڈری اسکول میں بھجوایا جانا ضروری ہے جبکہ طلبا، تو طلبا، اسکولوں کے ٹیچر بھی "عصری آگہی" کے لفظی معنوں کی تشریح نہیں کر سکتے۔ اب ہمیں بتایا گیا ہے کہ "عصری آگہی" کی ۵۲ کاپیاں اکادمی کے دفتر میں آتی ہیں اور اکادمی اسے اپنے ڈاک خرچ پر اسکولوں کو بھجواتی ہے۔ جبکہ اکادمی کو محض بک پوسٹ پر ہی ہر ماہ "عصری آگہی" پر ڈاک محصول ایک صد روپیہ سے زائد لگانا پڑتا ہے جبکہ دوسرے رسائل کے لئے اکادمی کا یہ حکم ہے کہ ہر اسکول کو رسالہ انڈر پوسٹل سرٹیفکیٹ بھجوایا جائے اور ڈاک خانہ سے حاصل کردہ سرٹیفکیٹ اکادمی میں پیش کیا جائے۔ کیا اکادمی اس فضول خرچی اور اکادمی کے ایک ممبر کی بے جا رعایت کے جواز میں کچھ کہہ سکتی ہے!۔

۵۔ اکادمی نے یہ طے کیا ہے کہ اکادمی کی لائبریریوں کے لئے پاکستانی مصنفین کی کتابیں نہ خریدی جائیں۔ حیرت ہے کہ یہ اُردو دشمنانہ فیصلہ اُردو اکادمی دلی نے کیا ہے جبکہ مصنفین، شاعروں، اور نقادوں کو کسی خاص فرقہ، ملک، یا طبقہ کی بجائے تمام ادبی دُنیا کا مشترکہ سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ تو پھر ہمارے پاکستانی مصنفین یا مؤلفین کے لئے اکادمی نے یہ پابندی کیوں لگائی ہے؟ جبکہ ہماری حکومت ہر ممکن طور پر کوشاں ہے کہ پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھیں۔ کیا غضب ہے کہ حکومت تو پاکستان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی فکر میں ہے اور اکادمی نے پاکستانی مصنفین کی کتابیں خریدنے پر پابندی لگا دی ہے۔

۶۔ بعض اُردو اکادمیاں جن میں دلی اُردو اکادمی بھی شامل ہے جب کسی مصنف سے اس کی تصنیف کو انعامی مقابلہ میں شریک کرنے کے لئے وصول کرتی ہیں تو ڈیکلیریشن میں یہ بھی لکھواتی ہیں کہ ابھی تک اس کتاب پر کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے یا اکادمی سے انعام نہیں ملا۔

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اگر کسی کتاب میں ایسا دم خم ہو کہ اس کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر ملک کی ہر اکادمی نے اُسے انعام دیدیا ہو، پھر ہر سرکاری ادارہ ایوارڈ دے تو کسی اردو اکادمی کو دردِ شکم کیوں ہو؟

یہ انتہائی فضول، مضحکہ خیز، غیر ادبی شرط ہے جو اکادمی کو ختم کر دینی چاہیئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دلی اُردو اکادمی بھی اس شرط کو ترک کر دے اور اگر اُسے اس شرط کے ختم کرنے میں کوئی اڑچن ہے تو اسے عوام کی آگاہی کے لئے واضح کرے۔ ●●

نئی غزل

اختر شاہجہانپوری

پیر طیب بہاروں کے دن شمار کرتے ہیں
سارے گلستاں کو ہی بے قرار کرتے ہیں
سوگوار کرتے ہیں

ہم ترا وفا دشمن اعتبار کرتے ہیں
رات دن اِسی باعث انتظار کرتے ہیں
دلفگار کرتے ہیں

دوستی کا دامن جو تار تار کرتے ہیں
کب وہ ایسے ویسے ہیں باوقار کرتے ہیں
شرمسار کرتے ہیں

جو طریقِ احسن ہے اختیار کرتے ہیں
پہلے اپنے دشمن کو ہوشیار کرتے ہیں
تب ہی وار کرتے ہیں

مجھ کو میرے یاروں میں شرمسار کرتے ہیں
کون ہیں جو رازوں کو آشکار کرتے ہیں
رازدار کرتے ہیں

کب وہ دِل کے داغوں کو آشکار کرتے ہیں
جو غموں کی محفل کو پُر بہار کرتے ہیں
سازگار کرتے ہیں!

آج بھی ہم اسے اختر پیش شمار کرتے ہیں
جو ہماری شہرت پر انحصار کرتے ہیں،
کتنا پیار کرتے ہیں

RANGIN CHAUPAL
SHAHJAHANPUR
242 001

O Lord, make me
a Channel of Thy peace

Where there is hatred
I may bring love

Where there is error
I may bring truth

Where there is discord
I may bring harmony

Where there is despair
I may bring hope

Where there is doubt
I may bring faith

Where there is shadow
I may bring light

Where there is sadness
I may bring joy

دُعا

نوبل پرائز ونر مدر ٹریسا کا یہ دُعائیہ
ریکارڈ دُنیا کے مختلف ممالک میں
ان کے قائم کردہ ۱۷۰ سینٹروں میں
ہر صبح بجایا جاتا ہے۔ نہایت پاکیزہ دُعا ہے یہ:

یا خُدا تجھ سے ہے میری یہ دُعا
میری ہستی ہو ذریعہ امن کا

جس جگہ نفرت، کدورت، بُغض ہو
مَیں کروں پیدا محبّت کی فضا

جس جگہ ہوں کچھ غلط اندیشیاں
مَیں دکھاؤں راستی کا راستہ

جس جگہ ہو پھوٹ، دوئی، اختلاف
مَیں وہاں لاؤں دلوں میں ایکتا

جس جگہ ہو یاس و حسرت کا وفور
مَیں جلاؤں شمعِ اُمّید و رجا

جس جگہ غالب ہوں شُبہات و شکوک
مَیں دکھاؤں نورِ ایماں و صفا

جس جگہ ہوں واہمے کی پرچھائیاں
مَیں وہاں لاؤں حقیقت کی ضیا

رنج، غمگینی، اُداسی ہو جہاں
مَیں وہاں باندھوں مسرت کی ہوا

چکّی

ڈاکٹر حقیر آستانی

ایک مُردہ کل
جسے اب دفن ہوئے عرصہ ہُوا ہے
رات دن آٹھوں پہر زندہ ہے
یُوں لگتا ہے جیسے
مَوت کا سایہ سروں پر ہر گھڑی منڈلا رہا ہو
ایک مُردہ کل کا سایہ، مَوت کے آنچل کا سایہ
ایک کل ہے
جو ابھی پیدا نہیں ہو پایا
لیکن اُس کا سایہ بھی
بشر کی فِکر کے انداز، اُس کی سوچ کی پرواز پر
پڑتا ہی رہتا ہے
یہ دو کل، فردا و دِیروز، پڑ ہیں ایک "چکّی" کے
جو مِل کر پیستے ہیں آدمی کا آج، اُس کی زیست کا اِمروز
اِدھر اندھے ہیں اندھیروں میں، اُدھر مُبہم سویروں میں
یہ "چکّی" ختم نہ پائے گی
اَزل سے چل رہی ہے، تا اَبد چلتی ہی جائے گی
وگرنہ وقت کو رُکنا پڑے گا
خود اپنے سامنے جُھکنا پڑے گا

اَب تو ویزا کٹا کر تُو آجا بلم

جناب بنارا عبدالرّب نشتر
شیخاوالی — (دوبئی)

ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے لاکھوں باشندے خلیجی ممالک میں اپنا اپنا گھربار چھوڑ کر روپیہ کمانے کی فکر میں جلاوطنی کا سا وقت گذار رہے ہیں، روپیہ کمانے کے اس لالچ نے ہزاروں گھروں کا سکھ چین ختم کر دیا ہے، میاں بیوی کی کئی کئی سالوں کی جدائی اکثر اوقات یا تو طلاق کا موجب بنتی ہے یا جنسی بے راہ روی کا، بچے اپنے باپ ..... کی شکل تک بھول جاتے ہیں، جلبِ زر کی اس لعنت کا اظہار جس انداز میں ان اشعار میں کیا گیا ہے وہ یقیناً اُن لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہوگا جو خلیجی ممالک میں جاکر روپیہ کمانے کی فکر میں اپنا گھربار بھی فروخت کر دیتے ہیں۔

سونی بستی ہے دل کی بسا جا بلم
منتظر گھر کی چوکھٹ پہ ہوں رات دن
سونا سونا ہے دل کا نگر تیرے بن
میری تنہائی آکر مٹا جا بلم
آج پھر مجھ کو انگڑائی آنے لگی
اِن سہانی رُتوں میں تو آجا بلم
بول میٹھے پپیہا سنانے لگا
مجھ کو اپنے گلے سے لگا جا بلم
تو نے خط میں بلم ہائے کیا لکھ دیا
پل جھپکتے ہی تو گاؤں آجا بلم
نیم کی چھاؤں تجھ کو بلائے صنم
بن کے خوشبو کا جھونکا تو آجا بلم
رات برہا کی کٹتی نہیں تیرے بن

گیت چاہت کے آکر سنا جا بلم
اَب تو ویزا کٹا کر تو آجا بلم
کاٹتا ہے مجھے اپنا گھر تیرے بن
اب تو ویزا کٹا کر تو آجا بلم
اور ساون کی رِم جھم ستانے لگی
میری تنہائیوں کو مٹا جا بلم
پھر تصور ترا دِل ... جلانے لگا
اب تو ویزا کٹا کر تو آجا بلم
سال دو مجھ سے کیسے کٹیں گے بھلا
میری تنہائیوں کو مٹا جا بلم
میٹھی اِملی ستم مجھ پہ ڈھائے صنم
میری تنہائیوں کو مٹا جا بلم
دِل میں یادوں کے نشتر لگیں رات دِن

میرے زخموں پہ مرہم لگا جا بلم
اب تو ویزا کٹا کر... تو آجا بلم

برتر کون؟ مرد یا عورت

ثناءُاللہ خان

نقطۂ نظر صنف کرخت کا ہے. لیکن حقائق، و دلائل معاشرتی سچائیوں اور صنفِ نازک سے لئے گئے ہیں

تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ لڑکیاں خود کو محفوظ نہیں سمجھتی ہیں۔ کیا تم واقعی یہ کہنے میں حق بجانب ہو یا یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ تمہارے مفروضہ سے چند ایک الجھاو پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ مفروضہ واقعی کوئی حقیقت رکھتا ہے تو پھر آگے بڑھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ اُسے سمجھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ میں اس کا ذمہ دار عورت اور مرد دونوں کو ٹھہراتا ہوں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زیادہ قصور لڑکیوں کا ہے۔ کیا تم نے ان کے ملبوسات پر کبھی غور کیا ہے؟ جو دعوتِ عام کا ساماں پیدا کرتے ہیں۔ غیر شریفانہ میک اپ، لہراتی بل کھاتی ہوئی چال، خود ہی سوچو اگر یہ سبھی کچھ ایک لڑکی میں موجود ہو تو ایک زاہد خشک بھی اپنا سب کچھ تیاگنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ تم نے بھی صنفِ نازک کی اس روش کو ناپسند کیا ہوگا۔ آج بھی لڑکیاں معقول رویّہ اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ لڑکے بھی نازیبا حرکات سے باز نہ آجائیں۔ تم نے یہ بھی لکھا ہے کہ آج کی عورت اگر اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہے تو اُس کا ذمہ دار یہ معاشرہ ہے جہاں تک میرا خیال ہے، ہمارا معاشرہ معقول، سخت گیر، پاکیزہ، سادہ اور پُرخلوص ہے، تم چاہو تو دُنیا بھر سے اس کا مقابلہ کرلو۔ سمندر پار ہی نہیں، ذرا اپنے ملک

کی سرحدوں سے پار ہی نظر دوڑا کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ صنفِ نازک وہاں پر کیونکر گزر بسر کر رہی ہے اُن کی زندگیاں کہیں غیر محفوظ ہیں جبکہ ہمارے معاشرہ میں ایسے عدم تحفظ کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے۔ عدم تحفظ اور مایوسی کے کہیں گہرے اور سیاہ بادل غیر ممالک کی صنفِ نازک کے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انھیں اب صرف اُس آسمانی بجلی اور کڑک کا انتظار ہے جو کسی بھی لمحہ ان پر گرا چاہتی ہے۔ رہا ہمارے معاشرے کا موزوں ترین علاج تو وہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں کی لڑکیاں اپنی سج دھج کی سرِعام نمائش چھوڑ دیں اور جب وہ اِس ظاہری نمائش کو چھوڑ دیں گی تو پھر کوئی بھی نظر ایسی نہ ہوگی جو ان کے جسموں میں چھید کر سکے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم معاشرے کی ایسی تمام بُرائیوں پر اسی وقت قابو پا سکتے ہیں جب کہ ہم اِسلام کے بتائے ہوئے تمام راستوں پر دل و جان سے عمل پیرا ہوں۔ لیکن اِس کا کیا علاج کہ ہمارا موجودہ معاشرہ اسلام کے نام پر بُری طرح بٹ گیا ہے۔ مذہب ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو مرد اور عورت دونوں کو واضح طور پر بتاتا ہے کہ اچھائی کیا ہے اور بُرائی کسے کہتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ معاشرہ میں اس بُرائی کا باعث کون ہے؟ بلاشبہ ایسے مرد اور عورتیں جو غیر شادی شدہ ہیں؟ اور میں پورے دعوے سے کہتا ہوں کہ معاشرے میں اگر ان افراد کی کمی ہو جائے تو بلاشبہ بُرائیاں گھٹ جائیں۔ شاید تمہیں معلوم ہو، ہمارے موجودہ معاشرے میں ۷۰ فیصدی ایسے لڑکے اور لڑکیاں موجود ہیں جو اپنی شادی کے قابل عمریں گزار چکے ہیں اور ابھی تک اُنہوں نے شادی کے بارے میں سوچا تک بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ شادی کی ذمہ داریوں سے گریزاں ہیں۔ اُن کے والدین کچھ زیادہ ہی کاروباری ذہنیت رکھتے ہیں۔ تمام کنبے کا یکجا رہنا بھی اس کا ایک سبب ہے۔ لڑکے کو لڑکی کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں اور اسی طرح لڑکی مرد کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔ اِس کا پانچواں سبب سوشل اِسٹیٹس بھی ہے اور پھر سرمایہ کی غیر مساویانہ تقسیم اور مذہبی گروہ بندیاں بھی ایک بڑا سبب ہے۔

رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے سے قبل میرے خیال میں کورٹ شپ بڑی اہمیت کا حامل ہے جہاں اس سے طرفین میں محبت بڑھتی ہے، وہاں طرفین کو اپنا بہترین ساتھی تلاش کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ آج وقت آگیا ہے کہ نہ پالے رفتن نہ جائے ماندن' والا معاملہ ہمیشہ درپیش ہے اور ہمیں اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے یا تو اپنی غیر شادی شدہ آزادی کو وسیع کرنا ہوگا یا پھر ہمیں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا پڑے گا۔ تاکہ ہم صحیح طور پر اپنی زندگی کے دن گزار سکیں۔ لینبرز کا قول ہے کہ شادی زندگی بھر کا مسئلہ ہے۔

> آج کی عورت نے اپنی نسوانیت کا جولا اُتار پھینکا ہے۔ اُس نے اپنی آزادی کو تسلیم کرانے کے لئے جو طریقے اختیار کیے ہیں اُن سے یہ کبھی اپنی زندگی گزارنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ یہ عورتیں عورت ہوتے ہوئے بھی نسوانیت کو سوا ذو ہیں اور ان کی منزلِ مقصود سوائے شادی کے کچھ بھی تو نہیں ہے۔ اور شادی کا صحیح اور واضح مطلب صرف یہی ہے کہ یہ ... تابع ہو ... دقار کو نابود کرنا ممکن نہیں جس کی معاشرت اور اقتصادی بنیادیں [illegible]

> بلاشبہ ایسے مرد اور عورتیں جو غیر شادی شدہ ہیں، میں پورے دعوے سے کہتا ہوں کہ معاشرے میں اگر ان افراد کی کمی ہو جائے تو بلاشبہ بُرائیاں گھٹ جائیں

ہم ایک ہی نظر میں، پہلی ہی نظر میں بہترین رفیق حیات نہیں چن سکتے۔ اور طرفین اسی صورت میں بہترین ساتھی تلاش کر سکتے ہیں جب کہ وہ ایک دوسرے سے ملیں جلیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکی کو یہ آپس میں ملنے جلنے کا موقع اُن کے بزرگ ہی دے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ فریقین کڑی نظر بر مہذبانہ طور طریقوں کو پیش نظر رکھیں اور سختی کے ساتھ مہذبانہ اصولوں پر عمل پیرا ہوں۔ مہذبانہ اطوار سے میری مراد صحیح طور پر مہذبانہ اطوار ہیں جو کہ ایک مہذب معاشرہ میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔ اِس سے میری مُراد مغربی مُعاشرے کے اصول اور طور طریقے ہرگز نہیں ہیں اور آج کون نہیں جانتا کہ مغربی مُعاشرہ اپنی اِس حماقت پر کس قدر نوحہ کناں ہے کہ اُس نے کس قسم کی ٹھوکر کھائی ہے۔ اپنی عورتوں کو آزادروی کا خوگر بنا کر بلاشبہ مغربی معاشرے کے مرد زندگی کا وہ لُطف نہیں اُٹھا رہے ہیں جو آج ہم مشرقی مُعاشرے کے مرد و زن اُٹھا رہے ہیں۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ہم بھی مغربی مُعاشرے کی نقالی کرتے ہوئے اُن ہی کی طرح حیوانوں کی سی زندگی گزارنے کی راہ پر گامزن ہو رہے ہیں اور ہماری اِس روش سے بعید نہیں کہ ہم بھی انھیں کی طرح کسی بھی وقت زندگی کی لطافتوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں ایسی زندگی میں محبت کی ہستیاں تو ضرور ہو سکتی ہے لیکن سکون نام کو بھی نہ ہوگا۔ مختصراً یہ کہ میرے نزدیک تو ہمارے مُعاشرے کی تمام بُرائیوں کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے "شادی"

تم نے اپنے خط میں کہیں اس بات کا تذکرہ
ں کیا ہے کہ عورت مرد سے کہیں بہتر صنف ہے۔ اگر
ر سے بہتر نہیں تو مرد کے برابر تو ضرور ہے۔ تمہارا
انداز فکر سطحی ہے جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی
سطہ نہیں ہے۔ میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے
ری ہی صنف کی ایک دانشور اور عالمگیر شہرت کی مالک
مصنفہ سیمون ڈی بیووار کا ایک قول لکھ رہا ہوں:۔
"آج کی عورت نے اپنی نسوانیت کا چولا اتار
پھینکا ہے۔ اس نے اپنی آزادی کو تسلیم کرانے کے
لئے جو طریقے اختیار کئے ہیں ان سے یہ کبھی انسانی زندگی
نے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ یہ عورتیں عورت ہوتے
ہوئے بھی نسوانیت سے کوسوں دور ہیں۔ ان کی منزل
سوا نے شادی کے اور کچھ بھی تو نہیں ہے اور
ی کا صحیح اور واضح مطلب صرف یہی ہے کہ یہ مرد
کی تابع ہوں۔ مردانہ وقار کو نابود کرنا ممکن نہیں جس
کی معاشرتی اور اقتصادی بنیادیں انتہائی مضبوط ہیں
بعض کمزوریوں کی بنا پر عورت۔۔۔ بالآخر ایک عورت ہی
ہے اور نسوانیت کی معراج یہی ہے کہ ہم بحیثیت
ایک عورت کے نسوانی کمزوریوں کو تہ دل سے تسلیم کرلیں
اور پھر یہ کہ عورت کی یہ کمزوریاں قدرت کی ہی عطا کردہ
ہیں اور۔۔۔ عورت ازل ہی سے مرد کی تابع چلی آرہی ہے۔"
دیکھا تم نے عورت کا دماغ اور سوچ مرد کے
انداز فکر اور سوچ سے کس قدر مختلف ہے۔ ہمیں یہ تسلیم
کئے بغیر چارہ ہی نہیں ہے کہ قدرت نے مرد کو جو خصوصیات
ودیعت کی ہیں وہ عورت میں نہیں ہیں۔ مرد کو اپنی خلقی توانائی
کے باعث حصول معاش کے لئے دنیا کے مشکل ترین کام کرنے
پڑتے ہیں اور پھر مرد کی برتری کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ
بچے کی پیدائش کا باعث مرد ہے اور نسل انسانی کو چلانے
والا بھی مرد ہی ہے۔ یہ بھی تو سوچو کہ عورت کی پرورش
کرنے والا اس کا باپ بھی مرد ہے۔ اگر بفرض محال اس
کا باپ سر پر نہ ہو تو پھر اس کے مرد رشتہ دار ہی اسے پروان
چڑھا کر اسے اس کے خاوند کے حوالے کر دیتے ہیں اور
پھر جب اس کا خاوند مر جاتا ہے تو پھر اس کی دیکھ بھال
اس کے لڑکے کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی کی یہ
رسم دراصل عورت کے لئے اس کے تحفظ ہی کا ایک ذریعہ
ہے۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرد
فطری طور پر عورت کی طرف راغب ہوتا ہے عورت
کی اس کشش سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا اور یہ
ایک طرح سے تمہاری برتری ہے۔ کہو! میری باتیں زیادہ
بری تو نہیں لگیں!!

●●

ایڈز

خود کو کیسے بچائیں

ایڈز انتہائی خطرناک بیماری ہے اور ابھی تک اس کا کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں بے پناہ افواہیں گردش کر رہی ہیں لیکن خود کو اس سے بچانا مشکل نہیں ہے بشرطیکہ اس سے متعلق آپ چند حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیں.

ایڈز کیا ہے ؟

ایڈز انگریزی کے چار الفاظ ایکوائرڈ امیونو ڈیفی شنسی سنڈروم کے ابتدائی حروف کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک ایسے وائرس کے سبب ہوتا ہے جو انسانی جسم کے خود حفاظتی نظام کو تباہ کر دیتا ہے.

یہ کیسے پھیلتا ہے

صحت مند آدمی ایڈز کے وائرس کا شکار اس وقت ہی ہوتا ہے جب اس کے جسم میں ایڈز کے مریض کا خون یا مادۂ منویہ داخل ہو جائے۔ زیادہ تر افراد ایڈز کے مریض کے ساتھ جنسی اختلاط کے نتیجے میں ہی ایڈز وائرس کا نشانہ بنتے ہیں. باقی لوگ متاثرہ مریض کی استعمال شدہ انجکشن سوئی کو استعمال کرنے سے اس خطرناک مرض کا نشانہ بن جاتے ہیں اور ایسے واقعات زیادہ تر نشیلی دوائیوں کے عادی افراد میں عموماً پائے جاتے ہیں. ایڈز کے کسی مریض کا خون دیا جانا ایڈز کے پھیلاؤ کے لئے بہت کم ذمہ دار ہے.

لازمی نہیں ہے کہ ہر وہ آدمی جس میں ایڈز کا وائرس موجود ہے اس مرض کا شکار بھی ہو جائے. درحقیقت زیادہ تر معاملات میں ایسا نہیں ہوتا ہے لیکن کوئی بھی آدمی جس میں یہ وائرس موجود ہے اس وائرس کو دوسرے شخص کو منتقل کر سکتا ہے چاہے وہ خود کو مکمل طور پر صحتمند محسوس کرتا ہو اور دیکھنے میں بھی ایسا ہی نظر آتا ہو.

آپ ان چیزوں سے ایڈز کا شکار نہیں ہو سکتے :

- عمومی سماجی تعلقات جیسے ہاتھ ملانا، چھونا اور بغل گیر ہونا.
- سوئمنگ پول، ریستوران اور دیگر عوامی مقامات پر.
- کھانسی، چھینک، تھوک.
- کپڑوں کے استعمال سے.
- ٹوائیلیٹ سیٹ، دروازوں کے ہینڈل وغیرہ، کھانا، عینک اور پیالیاں

آپ ایڈز وائرس کا شکار نہیں ہو سکتے جب :

آپ خون کا عطیہ کرتے ہیں.
آپ ڈاکٹر، ڈینٹسٹ یا کسی دوسرے ہیلتھ کیئرورکر سے انجکشن لگواتے یا علاج کرواتے ہیں.

ان چیزوں سے بچیں :

- اجنبی افراد کے ساتھ جنسی اختلاط۔ یہ ہمیشہ ہی خطرناک ہوتا ہے اجنبی فرد کے بارے میں آپ نہیں جانتے کہ وہ اس مرض سے متاثر ہے یا نہیں
- غیر فطری جنسی اختلاط۔ اس میں بہت زیادہ خطرہ ہے اور اس سے ہر حال میں بچنا چاہیئے.
- جتنے زیادہ افراد کے ساتھ جنسی اختلاط ہوگا خطرہ اتنا ہی زیادہ بڑھ جائے گا
- نشیلی دواؤں کے عادی لوگوں کی استعمال شدہ انجکشن سوئی استعمال کر کر.

یاد رکھیئے

ایڈز ایسی بیماری نہیں ہے جس کے خطرے کو محض خوش فہمی میں نظر انداز کیا جائے کیونکہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ایڈز کا کنٹرول لوگوں کے رویئے اور انسدادی تدابیر پر منحصر ہے.

مزید تفصیلات کے لئے لکھیں :
اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل (ایڈز)
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف ہیلتھ سروسز، نرمان بھون
نئی دہلی 110011

ایڈز کا علاج نہیں
لیکن آپ اس سے بچ سکتے ہیں

جاری کردہ :
سنٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو
ڈی جی ایچ ایس ، کوٹلہ روڈ ، نئی دہلی۔ 110002

شان ہند نئی دہلی جولا

ثقافتی اِفہام و تفہیم کے لئے پڑوسی مُلک سے ایک تحریر

بزم "ضیاءِ ادب" حیدرآباد، اور طنزیہ
یہ جریدے ،، ظرافت ،، کے زیرِ اہتمام
۱۴ر جون بروزِ اتوار دیال داس کلب
اباد کے سبزہ زار پر ایک عظیم الشان کل
ان مُشاعرہ منعقد ہوا، اِس مُشاعرہ کی
رت سید شاکر علی جعفری صدر ایوانِ صنعت
رت نے کی اور مہمانِ خصوصی جناب سبکتگین صبا
سٹ کلکٹر کسٹم تھے۔ شام کو شُعراء کرام کے
ر میں ایک خوبصورت محفلِ موسیقی بر مکان
سراج الدین برپا کی گئی۔ جس میں ریڈیو پاکستان
ف فنکار اور سینیئر پروڈیوسر جناب تصدق
ن اور جناب ظہیر احمد وارثی نے پاکستانی شُعراء
یں سُنا کر حاضرینِ محفل سے خوب داد
ی۔ اِس محفل میں پاکستان بھر سے آئے ہوئے
کے علاوہ معززینِ شہر کی ایک بڑی تعداد
لت کی محفل کے اختتام پر پُر تکلف چائے
انوں کی تواضع کی گئی۔ آخر میں شاد پیرزادہ
غزل سُنا کر چائے کا لُطف دوبالا کر دیا

رات نو بجے سید شاکر علی جعفری کے مکان پر کھانے کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں شُعراء کے علاوہ ایوانِ صنعت و تجارت کے ممبران بھی شامل ہوئے۔ اِس پُر تکلف دعوت سے فارغ ہو کر تمام شُعراء مُشاعرہ گاہ پہونچے۔ دیال داس کلب کا سبزہ زار بڑی طاقت کی رنگین ٹیوب لائیٹوں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ مُشاعرہ گاہ کا اسٹیج اتنا وسیع و عریض تھا کہ اُس پر بیک وقت سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اسٹیج کو رنگ برنگے قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ شُعراء کی آمد سے پہلے ہی ہزاروں سامعین بیٹھ چکے تھے ٹھیک گیارہ بجے تلاوتِ کلام سے اِس محفل کا آغاز کیا گیا۔

راقم الحروف افتتاحی کلمات کہنے کے لئے اسٹیج پر آیا تو کمر میں شدید درد کی وجہ سے۔ کچھ لوگوں کا سہارا لے کر مائیک تک پہونچا اور کسی نامعلوم شاعر کا یہ شعر پڑھا تو محفل سے قہقہے بُلند ہوئے ؎

ایک دُکھ ہو تو کوئی اُس کا مُداوا بھی کرے
دردِ دل، دردِ جگر، دردِ کمر تینوں ہیں

اپنی افتتاحی تقریر میں راقم الحروف نے اُن مُشکلات کا ذکر کیا جو مُشاعرہ کے انعقاد کے سلسلے میں پیش آئیں۔ حاضرینِ محفل کو بتایا گیا کہ ایک سال پیشتر بزمِ ضیاءِ ادب نے حکومتِ سندھ سے درخواست کی تھی کہ محکمہ تعلیم مُشاعرہ کے انعقاد میں تعاون کرے حکومتِ سندھ نے یہ درخواست ڈائریکٹر ثقافت سندھ کو ارسال کر دی جو ایک سال گذرنے کے بعد بھی آج تک اُنہی کی دراز میں پڑی ہے، بزمِ ضیاءِ ادب کی جانب سے یاد دہانی کے کئی رجسٹرڈ خطوط لکھے گئے۔ اور کراچی ان کے دفتر جا جا کر ان کو یاد کرایا جاتا رہا مگر ؎

زمیں جنبد نہ جنبد گُل محمد

اُنہوں نے جواب تک دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ آج کے مُشاعرہ کے لئے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے چیئرمین مہران آرٹ کونسل لطیف آباد کے سیکریٹری اور ڈائریکٹر آف کالجز سے الگ الگ گذارش کی گئی کہ ان کے اداروں کے تحت کوئی بھی گراؤنڈ اس مُشاعرہ کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دے دیں مگر تینوں حضرات نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ مشاعرہ کے لئے جگہ فراہم نہیں کر سکتے بزمِ ضیاءِ ادب نے ان افسران کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ اِس شہر میں کوئی مُشاعرہ یا ادبی تقریب منعقد نہیں کرے گی اِن مختصر معروضات کے بعد جناب اقبال حیدر سینیئر پروڈیوسر پاکستان ٹیلی ویژن کی دعوت دی گئی کہ وہ مُشاعرہ کی نظامت سنبھالیں۔ تمام شُعراء کو کلب کی جانب سے ایک ایک اجرک پیش کی گئی اور ٹریٹ کارپوریشن کی طرف سے ایک ایک گفٹ بکس حضرت بسمل آغائی مرحوم کے لئے جناب عنایت علی خان نے دعاءِ مغفرت کی۔ یہ عظیم الشان مُشاعرہ صبح چار بجے اختتام پذیر ہوا۔ جن شُعراء نے اپنا کلام پیش کیا اُن کے اسماءِ گرامی اور نمونۂ کلام پیشِ خدمت ہے۔

ضیاء الحق قاسمی (حیدرآباد)

لوگ ناحق شور کرتے ہیں ملاوٹ کے خلاف
یہ غلط ہے قوم کا اس سے کباڑا ہو گیا

میری سُننے کیں نے مرنے کے لئے کھایا تھا نیر
کچھ ڈکاریں آئیں میرا پیٹ ہلکا ہو گیا

اقبال حیدر (کراچی)

ہماری آپ بیتی پر نہ جاؤ
بہت سے واقعے ہم نے گھڑے ہیں

قدسیہ احمد قدسی (حیدرآباد)

ناقدر کا ہو قدر بھلا کون قدرداں
جب قدر کا جہاں میں کوئی قدرداں ہو

حمید انجم (حیدرآباد)

رنگ برنگے پھولوں سے ڈر جاتا ہوں
ہوا چلے تو زخموں سے گھبرا جاتا ہوں

شعلہ بدایونی (حیدرآباد)

چہرہ روشن ہے بال کالے ہیں
کچھ اندھیرے ہیں کچھ اجالے ہیں

نسیم احمد زخمی (حیدرآباد)

اس پاپی سنسار میں زخمی کیسے اپنے زخم گنے
جس جس نے بھی خنجر پھینکے سب کے سب نوکیلے تھے

وحید دانش (حیدرآباد)

اُس کی یادوں کے ٹوٹ کر سدا رہتا ہوں میں
اپنی آنکھوں کو سلا کر جاگتا رہتا ہوں میں

عمر جمالی (حیدرآباد)

آوازہ سُنو در پہ کسی خاک بسر کا
کشکول نہ توڑ دیوں کسی دیدۂ تر کا

رعنا ناہید رعنا (حیدرآباد)

اپنے افکار کو میلا تو نہیں کر سکتی
پھول برسیں کہ برستے ہوئے پتھر دیکھو

راحت عارفی (حیدرآباد)

اِک ضرورت آن پڑی کتنی مہر وفا کے سستے ہیں
اب ہم بیچ آئے ہیں اپنا سب کچھ سستے میں

قربان میرا (حیدرآباد)

اُردو ادب میں لگ گئے یوں جس سے چار چاند
وہ بے مثال بزمِ ضیائے ادب ہے آج

قاصد عزیز (حیدرآباد)

خوب گھنے سیاہ بادل اور بدن بھرا بھرا
جیسے شبابِ حسن کا کوئی چمن بھرا بھرا

ثریا سومن (حیدرآباد)

(کوئی شعر نوٹ نہ کیا جا سکا)

حسن رضوی (لاہور)

کبھی کتابوں میں پھول رکھنا کبھی درختوں پہ نام لکھنا
ہمیں بھی ہے یاد آج تک وہ نظر سے حرفِ سلام لکھنا

ثروت حسین (حیدرآباد)

خاک کے چشمۂ صد رنگ اُبلتے دیکھا!
ہم نے اُس شوخ کو پوشاک بدلتے دیکھا

سعادت سعید (لاہور)

تقویم کیا بتائے گی عمروں کی مدتیں
آوازۂ حباب کی تاریخ سُن لے

محشی لکھنوی (کراچی)

اک اشک تھا جو دیدۂ تر میں نہیں رہا
گھر کا معاملہ بھی تو گھر میں نہیں رہا

قسیم الدین دارا (کراچی)

اگر منزل ہمیں ملتی ہو گردن کے جھکانے سے
تو ایسی جیت سے اچھا ہے مجھ کو ہار ہو جائے

صرف اک تم ہی نہیں مرکزِ تحریکِ خیال
مسئلے اور بھی کچھ غور طلب ہوتے ہیں

نرگس یوسفی (حیدرآباد)

صرف اک تم ہی نہیں مرکزِ تحریکِ خیال
مسئلے اور بھی کچھ غور طلب ہوتے ہیں

انور سبزواری (حیدرآباد)

مَیں اپنے آپ میں تنہا سہی مگر انور
مری نگاہ سے روشن ہیں آئینہ خانے

عنایت علی خان (حیدرآباد)

خود ہی خنجر بدست ہوں ہر دم
اور خود ہی لہو لہان بھی ہوں
میری مشکل عجیب مشکل ہے
مَیں مہاجر بھی ہوں پٹھان بھی ہوں

عصمت ڈاھری (نواب شاہ)

زندگی زندہ دلی کا نام ہے بس نامِ آتش
دم بدم دیکھی سُلگتی ہم نے نارِ زندگی

وحید بیالی (حیدرآباد)

مانا کہ اِن بُتوں کا نہیں کوئی بھی مقام
لیکن خدا کے گھر سے نکالے ہوئے تو ہیں

خالد عرفان (کراچی)

بہت اُداس ہوں اِس شہر میں جنم لے کر
مرا جنم بھی مرے عشق کے مقابل تھا
نہ ہو سکی مری پنڈی میں اس لئے شادی
کہ میرے پاس کراچی کا ڈومیسائل تھا

شہاب (کراچی)

سفر پہ نکلو تو ہو فاصلوں کا اندازہ
زمیں سے تو فلک بھی قریب لگتا ہے

راشد نور (کراچی)

عجب جستجو تھی عجب تشنگی
ترے بعد پھر اعتدال آگیا

سید امروہوی (کراچی)

جھلملانے لگے ہیں چراغ
اُٹھئے سید سحر ہو گئی

نیر سومن (کراچی)

ہم ایسے لوگ ترے شہر کی رعنائیاں ہیں
رہیں گے اور کوئی دن جو آب و دانہ رہا

شہناز یونس (کراچی)

اب مجھے بلاتی ہے کس کے گھر کی ویرانی
اک دیا جو روشن تھا دے دیا ہواؤں کو

ثمر رشیدی (حیدرآباد)

کب سفر پہ نکلے تھے قافلے محبت کے
کچھ سبب نہیں کھلتا یہ تکان کب سے ہے

ساره آفرین (کراچی)

پاؤں میں بھنور باندھے موجوں سے الجھتی
کشتی کے مقابل کوئی طوفان تو ہوتا

اعجاز رحمانی (کراچی)

اعجاز نیند آئی تو اعصاب سو گئے
لیکن مرا شعورِ سخن جاگتا رہا

ضیاء الحق قاسمی (لاہور)

تونے تو کچھ بھی دیکھنے نہ دیا
اے مری چشمِ تر مدینے میں

تاج قائم خانی (میرپور)

بن جاؤ گے لہر بھی جان لیوا منجدھار
نااہلوں کے ہاتھ میں مت دیجیو پتوار

محسن بھوپالی (کراچی)

عمرِ مصروف کوئی لمحۂ فرصت ہو عطا
میں کبھی خود کو میسر نہیں ہونے پاتا

انور مسعود (اسلام آباد)

نکلتا ہے یا آدھی رات تک روپوش رہتا ہے
ہمیں معلوم ہو کیسے کہ اس کا مدعا کیا ہے
مناسب ہے یہی اب تو کہ ہر اک عید سے پہلے
کمیٹی چاند سے پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

حمایت علی شاعر (کراچی)

شاید اسی سبب سے توازن سا مجھ میں ہے
اک محتسب لیے ہوئے تلوار مجھ میں تھا

دلاور فگار (کراچی)

رہنماؤں نے کہا ہے ظالمانہ ہے بجٹ
ہر طرف تنقیدِ پیہم کا نشانہ ہے بجٹ
ہم یہ کہتے ہیں کہ بالکل شوہرانہ ہے بجٹ
بیویوں کو تنگ کرنے کا بہانہ ہے بجٹ

محشر بدایونی (کراچی)

کرے دریا نہ پل مسمار میرے
ابھی کچھ لوگ ہیں اس پار میرے

راغب مراد آبادی (کراچی)

سوچ تو گلشن کی بربادی کا ہوگا کیا مآل
شاخِ گل پہ آشیاں تیرا ابھی ہے میرا بھی ہے

غزل
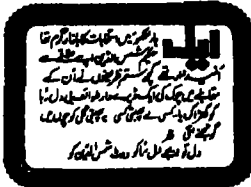
نبھ پایا نہ مجھ سے مرے حالات کا رشتہ
اک کچی حویلی سے تھا برسات کا رشتہ
پھولوں سے مہکتے ہوئے بھتے آتے ہیں بسنام
باقی ہے ابھی شہروں سے دیہات کا رشتہ
بے کار گئی میرے مخالف کی گواہی
خنجر سے تھا ہاتھوں کے نشانات کا رشتہ
اس قوم کی عظمت کو گہن لگتا رہا ہے
جس قوم سے ہوتا ہے فسادات کا رشتہ
اک دن میں نہیں بھرتی ہیں اک زخم کی خراشیں
صدیوں سے ہوا کرتا ہے لمحات کا رشتہ
ہے ہاتھ ردا سر پہ مرے ماں کی دعائیں
ٹوٹا پایا نہ مجھ سے کبھی صدمات کا رشتہ
منصور مری غزلیں ہیں منسوب اسی سے
ہماں کے لبوں سے مرے نغمات کا رشتہ

منصور عثمانی

غزل

زندگی سے تنگ تھا حالات سے بیزار تھا
کیا سنبھلتا میں کہ اک گرتی ہوئی دیوار تھا
اوڑھ کر چادر غریبی کی میں سوتا ہی رہا
لوگ مجھ کو پڑھ رہے تھے جیسے میں اخبار تھا
زندگی کا درد میں بھی بانٹ سکتا تھا مگر
اس کو کیا کہیے کہ میرا ذہن ہی بیمار تھا
گھر غریبوں کے جلے کیسے جلے کیونکر جلے!
لوگ کہتے ہیں محافظ شہر کا بیدار تھا!
جھیل سی آنکھوں میں ان کی ڈوبنا ہی پڑا
دوستوں کا مشورہ بے سود تھا بے کار تھا
میں یہاں کس طرح پہنچا ہوں مجھ سے پوچھیے
آپ تو کہتے ہیں میرا راستہ ہموار تھا
شہرِ دل میں شوق پھر مجھ پہ ہی یہ الزام کیوں
جب تمہارے سامنے ہر شخص کا کردار تھا

شوق جالندھری

غزل

کھلے تھے لب کبھی بہرِ شکایت
ابھی تک ہوں میں تصویرِ ندامت
وہ آنسو جو ہیں اب تک رائیگاں سے
محبت جانتی ہے ان کی قیمت
کسی سے شکوۂ جور و ستم کو
سمجھتا ہوں میں توہینِ محبت
بس اک گوشہ ہے دنیا بھر کا فانی
کہوں کیا وسعتِ دامانِ رحمت
کروں کس طرح ان سے شکوۂ غم
مری نظروں میں ہے شانِ محبت
نہ ہوتا یہ محبت بھی نہ ہوتی
تمہارا غم ہے بنیادِ محبت
مجھے کیوں کر غمِ عصیاں ہو گوہر
میرے ہاتھوں میں ہے دامانِ رحمت

ڈاکٹر یوسف گوہر

جلیل القدر

روح کو سرشار اور ایمان کو
تازہ کرنے والے واقعات

وہی صفات، وہی خصوصیات اور ویسی ہی کرامات جیسی ان کے جدِ اعلیٰ
حضرت غوث الاعظم میں پائی جاتی تھیں۔

۲

ایک مردِ حق آگاہ کی سیرت و سوانح۔

بادشاہ نے اُن کے نام ایک فرمان جاری کیا
ں میں اُس نے یہ کہا تھا کہ عبدالقادر! آپ
مارے دربار سے وابستہ تھے، پھر اچانک آپ نے
بستگی ختم کردی اور ہمیں اس سے مطلع نہیں کیا
مرہم نے آپ کے باپ کے وظائف آپ کے نام جاری
ئے تو آپ نے انھیں بھی قبول نہیں کیا اور سارے
ظائف واپس فرما دیئے یہ ساری تقصیرات ہیں
پ کی، مَیں اُن کو بھی معاف کرسکتا ہوں، اُن سے
رفِ نظر کرنے پر تیار ہوں، مگر اس شرط پر کہ
پ ہمارے دربار سے دوبارہ وابستہ ہوجائیں گے،

آپ نے اس کا منظوم جواب دیا:۔

" ہیچ باب ازیں باب روئے گشتن نیست
ہرآنچہ برسرِ ما می رَوَد مبارک باد

(ہم اس دروازے کو چھوڑ کر کسی اور دروازے
نہیں جا سکتے۔ اس کے صدمیں ہمیں جو کچھ برداشت
رنا پڑے گا، اسے خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے،

کسے کہ خلعتِ سلطانِ عشق پوشیدہ است
بحُلہائے بہشتی کجا شود دل شاد

(جس نے عشق کی بادشاہی کا لباس پہن
یا اُس کا ان بہترین لباسوں سے دل مسرور نہیں
ہوتا) آپ کے اس جواب نے بادشاہ کو لاجواب اور
خاموش کردیا۔

آپ کے ہاتھوں میں اتنی تاثیر تھی کہ جس
مریض پر رکھ دیتے صحت یاب ہوجاتا۔ بیمار آپ کے
پاس آتے اور انھیں یاد دلاتے کہ آپ کے جدّ اعلیٰ
حضرت غوث الاعظمؒ کے دستِ مبارک میں یہ تاثیر تھی
کہ بیماروں کو اچھا اور نابیناؤں کو بینا فرما دیتے تھے
اور یہ وہ صفت تھی جو دوسری قوموں کے نبیوں میں
ہوا کرتی تھی اور رسولِ مقبولؐ کے ولیوں میں پائی جاتی
ہے۔"

آپ نے دریافت فرمایا" تم کہنا کیا چاہتے
ہو؟"

جواب ملا" شفا، اسی طرح بیماریوں سے
شفا، جس طرح حضرت غوث الاعظمؒ عطا کرتے تھے"

آپ نے جواب دیا" لوگو! میں انھیں کا فرزند
ہوں اور مجھے بھی وہی چیزیں بخشی گئی ہیں"

اس کے بعد آپ نے بیماروں کو اپنے ہاتھوں
سے شفا بخشنا شروع کردیا۔ مریضوں کی قطاریں بڑھ
جاتیں، آپ اندر سے نمودار ہوتے اور مرض کے حصوں
پر ہاتھ پھیر کے اُس کا مرض دفع کردیتے۔ نابینا حضرات
اپنی بینائی واپس لے کر جاتے۔

ایک دن آپ نے انتہائی جوش میں فرمایا
" اللہ نے میرے ہاتھوں میں وہ تاثیر رکھی ہے
کہ مَیں جس بیمار پر ہاتھ پھیر دوں گا خدا اُس کو
شفا دے گا" یہ خبریں تو عام تھے ہی اور اُن کی
تصدیق بھی ہوتی جا رہی تھی، کہ شہر ایک مصیبت میں
مبتلا ہو گیا

اسی شہر میں ایک اور متقی اور پرہیزگار شخص
بھی مقیم تھے، اُن کا نام تھا غیاث الدین لنگاہ۔ یہاں
بھی عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اُن کے مُریدوں کو
اپنے پیر و مُرشد کے بارے میں یہ خوش فہمی تھی کہ
غیاث الدین لنگاہ کا مرتبہ عبدالقادر جیلانی سے بڑا
ہے۔ اُن کی مجلس میں اس قسم کے تذکرے ہوتے
رہتے تھے۔ غیاث الدین لنگاہ انھیں منع کرتے تھے
کہ ایسی باتیں مت کیا کرو، کیونکہ کہاں مَیں اور کہاں
مخدوم عبدالقادر"۔

اُن کے ایک مُرید نے کہا" حضور! یہ تو آپ
عاجزی اور انکساری سے کام لے رہے ہیں ورنہ
ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیا ہیں اور آپ کیا ہیں۔"

غیاث الدین لنگاہ نے کہا" دیکھو مَیں اپنے
آپ سے بھی اچھی طرح واقف ہوں اور اُن سے بھی
اُن کا تعلق حضرت غوث الاعظمؒ کے خاندان سے ہے
وہ درحقیقت مخدوم ہیں، مخدوم عبدالقادر ثانی ہیں

اُن کی بے حد عزت کرتا ہوں"
مُریدوں نے بظاہر تو آپ کی بات مان لی مگر
سے منکر رہے۔ انھیں مُریدوں میں سے ایک کی
ت کے پیچھے پیر طبیعت خراب ہو گئی۔ اُس کی پسلیوں
ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ گھر والوں کو شبہ ہوا کہ شاید
اٹک گئی ہے۔ انھوں نے مالش کا تیل استعمال کیا
ڑے تھوڑے وقفہ سے پسلیوں کی مالش ہوتی
لیکن درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ صبح ہوتے ہی
خص ایک طبیب کے پاس پہنچا۔ اور اپنی کیفیت
ان کر کے کہنے لگا "جناب میں رات بھر کا جاگا ہوا
کرم کوئی ایسی دوا دے دیجئے کہ میں کچھ دیر آرام
ہوں، سُکھ کی نیند لے سکوں"۔

طبیب نے اُس کا اچھی طرح معائنہ کیا لیکن
بات سمجھ میں نہ آئی۔ یہ درد ساری پسلیوں میں
اور ہوا کا قطعی نہ تھا۔ طبیب نے کچھ پینے کی دوا
اور کچھ مالش کی۔ وہ شخص دوا لے کر سیدھا گھر چلا
اور گھر میں جیسے ہی دوا استعمال کی، مرض میں
ت پیدا ہو گئی۔ آناً فاناً اس درد میں اتنی شدت
ہو گئی کہ اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ گھر
ں نے جب یہ دیکھا کہ مرض کسی طرح قابو میں نہیں
تو وہ مریض کو اُس کے پیر کے پاس لے گئے۔ غیاث
بن لنگاہ نے مریض کی پسلیوں پر ہاتھ پھیرا اور کوئی
پڑھ کے پھونک ماری لیکن مرض میں ذرہ برابر فرق
یا۔ اب وہ شخص تڑپنے لگا تھا۔ چارپائی پر دو دو ہاتھ
تا اور گر جاتا۔ چلاتے ہوئے کہتا "مار دیا" خدایا
کہاں جاؤں، کس کے پاس جاؤں، مجھے کون اچھا
ے گا، اے اللہ! تو ہی رحم کر مجھ پر"۔

مگر اُس کی دُعا قبول نہیں ہوئی کیونکہ اب
یض کو لمحہ بھر کا قرار حاصل نہیں تھا۔

آخر اُس مرض میں تیسرے دن اُس کا انتقال
و گیا۔ سب پر اِس موت کا بڑا اثر ہوا۔ مُریدوں میں
ہرام برپا ہو گیا۔ ہر شخص دوسرے سے یہی پوچھتا تھا
آخر یہ کیسا درد اور کیسا مرض تھا کہ کسی دوا سے قابو
میں نہیں آیا۔ انھوں نے اپنے مُرشد سے پوچھا۔
"حضرت! آپ تو کشف سے معلوم کر سکتے ہیں
یہ کیسا مرض تھا جو جان لے کر ہی گیا!

حضرت لنگاہ نے جواب دیا "یہ مرض نہیں
مشیّتِ ایزدی تھی جو پوری ہو گئی اور مشیّتِ ایزدی
پر کوئی دوا یا دُعا کارگر نہیں ہوتی"۔

مُریدوں نے لاجواب ہو کر سکوت اختیار کر لیا
لیکن انھیں اپنے ساتھی کی موت کا گہرا رنج تھا۔

کئی دن بعد یہی درد دوسرے مریض کی پسلیوں
میں بھی شروع ہوا۔ اُس مریض کی تو جان ہی نکل گئی۔
اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بھاگا بھاگا طبیب کے پاس
پہنچا اور کہا آپ اِس پر خصوصی توجہ دیجئے اور اس
کا علاج کیجئے، ورنہ میں تو دہشت سے ہی مرجاؤں گا"۔

طبیب نے جواب دیا "سچی بات تو یہ ہے کہ
یہ مرض اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔ اور جب مرض ہی
سمجھ میں نہ آیا ہو تو اُس کا علاج کس طرح کیا
جائے گا؟"

مریض رونے لگا "پھر میں کہاں جاؤں؟
کس کے پاس جاؤں؟ بتائیے میں کیا کروں؟

وہ یہاں سے اپنے پیر و مُرشد کے پاس
پہنچا اور رو رو کر اُن سے دُعا کی درخواست کرنے لگا
"حضرت! میری زندگی بچا لیجئے، مجھے بچا لیجئے، ورنہ میں
مرجاؤں گا"۔

پیر مُرشد غیاث الدین لنگاہ کے لئے مشکل
یہ تھی کہ وہ مشیّتِ ایزدی کے پابند تھے اور اس
معاملہ میں خود کو بے دست و پا محسوس کرتے تھے،
مریض مُرید کو جواب دیا "میں تیرے حق میں دعا کروں
گا مگر پتہ نہیں کہ وہ قبول بھی ہوگی یا نہیں، مجھے کچھ پتہ
نہیں۔ بہرحال تمہاری خواہش ہے کہ میں دُعا کروں
تو میں تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ آگے
اللہ جانے اور اُس کا کام"۔

آپ اپنے حُجرے میں چلے گئے اور پھر سجدہ
میں گر کے گڑگڑا گڑگڑا کر دُعا مانگنے لگے "اے میرے
مولیٰ، اے اللہ، میرے مُرید مجھ سے کچھ توقع رکھتے
ہیں اور بار بار مجھ سے اِستمداد کی درخواست کرتے
ہیں لیکن میں انھیں ٹال دیتا ہوں اور یہی کہتا ہوں
کہ میں صاحبِ کرامت نہیں ہوں، میں بھی تمہاری
ہی طرح ایک انسان ہوں"

اس واقعہ کے کئی دن بعد یہ مرض عام ہو
گیا۔ جس کو دیکھئے پسلی پکڑے چلا آرہا ہے۔ پسلیوں
میں درد، پھر اُس میں شدت اور آخر میں موت
اب تو پوری آبادی سراسیمہ اور خوفزدہ نظر آنے

جب یہ مرض مخدوم عبدالقادر ثانی کے مُرید
میں بھی پھیل گیا تو اُن سے بھی استدعا کی گئی کہ و
دُعا کریں کہ خدا اِس وبا سے شہریوں کو نجات د
کسی مُرید نے آپ کو بتایا "یہ مرض غیاث الدین لنگاہ
کے مُریدوں سے پھیلا ہے اور سُننے میں آیا ہے
اِس سلسلہ میں وہ بھی دُعا کر چکے ہیں لیکن شا
اُن کی دُعا قبول نہیں ہوئی"۔

آپ نے اُس مُرید کو گھور کر دیکھا اور پو
"تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

مُرید نے جواب دیا "میں کہنا چاہتا ہوں
جب لنگاہ میں کچھ ہے ہی نہیں تو وہ پیری کا ڈھونگ
کیوں رچائے ہوئے ہیں"۔

آپ اپنے مُرید پر خفا ہونے لگے، بولے
"تو کیا کہہ رہا ہے! تو یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ
کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ اُن کے پاس بہت
ہے۔ وہ بلاشبہ اللہ والے ہیں اور اللہ کے برگز
بندوں میں شامل ہیں، اُن کی دُعا کیوں قبول ہ

**اب وہ شخص تڑپنے لگا تھا چارپائی پر دو دو ہاتھ اُچھلتا اور گر جا
چلاتے ہوئے کہتا "مار دیا! خدایا! میں کہاں جاؤں، کس کے پاس
جاؤں، مجھے کون اچھا کرے گا، اے اللہ تو ہی رحم کر مجھ پر"،
مگر اس کی دُعا قبول نہیں ہوئی، کیونکہ اب مریض کو لمحہ بھر قرار
حاصل نہیں تھا۔**

ہوئی' یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہوگا لیکن میں تم کو یہ بتلائے
دیتا ہوں کہ تم آئندہ لنگاہ کی بزرگی پر شک نہ کرنا"
مُرید خاموش ہوگیا۔ رات کو عشاء کے
بعد آپ سجدے میں گر گئے اور دُعا مانگنے لگے" اے
میرے اللہ! اے جہانوں کے پالن ہار! یہاں ایک
وبا نے انسانی مخلوق کو پریشان کرکے رکھ دیا ہے۔
مجھے میرے ایک مُرید نے بتایا کہ یہاں کے بزرگ غیاث
الدین لنگاہ نے اس وبا سے تیری بارگاہ میں نجات کی دُعا کی
جو نامنظور ہوگئی۔ کیوں نامنظور ہو گئی' مجھے نہیں معلوم
لیکن جب لوگوں نے مجھے اپنا وسیلہ بنا لیا تو میرا یہ فرض
ہو گیا کہ میں تجھ سے مدد چاہوں' اگر تو نے مجھے بھی
مایوس کر دیا تو میں کہاں جاؤں گا؟ میں کس کا سہارا
لوں گا'

یہ کافی دیر تک رو رو کر دعائیں مانگتے رہے
رات کو بھی یہی خیال دامن گیر رہا' وہ جب تک جاگتے
رہے' دُعا مانگتے رہے۔ رات کے پچھلے پہر اُن کی آنکھ
لگ گئی۔ خواب میں رسولِ مقبولؐ کو دیکھا' آپ نے
فرمایا" بیٹے عبد القادر! غیاث الدین لنگاہ کے پاس
جاؤ' ہم نے اُس کو ہاتھ بھر بانس کا ایک ٹکڑا دے
دیا ہے اُس ٹکڑے کو لے لو اور اُس پر دس بار سورۂ
اخلاص پڑھ کے دم کرو اور اُس کے بعد یہ بانس کا ٹکڑا
جس مریض کو لگا دو گے صحت یاب ہو جائے گا۔"
آپ نے پوچھا" یارسول اللہ! کسی قسم کا سوال
کچھ مناسب نہیں لگتا لیکن پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ
آپ یہ بانس کا ٹکڑا براہِ راست اس ناچیز کو بھی مرحمت
فرما سکتے تھے پھر غیاث الدین لنگاہ کے ذریعہ کیوں مرحمت فرمانا؟
جواب ملا لنگاہ کے بعض مُریدوں کو اُس کے
مرتبہ و مقام میں شُبہ تھا' اس طرح اُن کو یہ بتانا مقصود

ہے کہ لنگاہ بھی ایک مردِ بزرگ ہے۔"
بیداری کے بعد آپ لنگاہ کے پاس پہنچے اور
فرمایا" بانس کا ٹکڑا کہاں ہے!
لنگاہ نے اپنے ارادت مندوں کی موجودگی
میں جواب دیا" ابھی کچھ دیر پہلے میں نے خواب میں
دیکھا کہ رسولِ مقبولؐ تشریف لائے ہیں۔ آپ کے ہاتھ
میں بانس کا ایک ٹکڑا تھا۔ آپ نے یہ ٹکڑا مجھے دیا' اور
فرمایا" لنگاہ! یہ بانس کا ٹکڑا میرے فرزند عبد القادر
کو پہنچا دو اور اُس سے کہہ دو کہ اِس پر دس بار سورۂ
اخلاص پڑھ کے اس کو جس سے بھی مس کرو گے وہ
صحت مند ہو جائے گا۔"
لنگاہ کے مُریدوں نے یہ منظر دیکھا اور اپنے
پیر و مرشد کی بزرگی کے قائل ہو گئے۔"
مخدوم عبد القادر نے بانس کے اس ٹکڑے
کو سورۂ اخلاص دم کر کے مریضوں کو چھوانا شروع کیا
اور اُس سے مریض تیزی سے صحت یاب ہونے لگے
اُچہ اور مُلتان میں اِن واقعات نے بڑا شہرہ حاصل کیا
اور جس کی زبان پر دیکھو' بانس کے اس ٹکڑے کا ذکر ہے
بانس کے اُس ٹکڑے نے پسلیوں کے درد کی وبا کو
ختم کر دیا۔ غیاث الدین لنگاہ حضرت مخدوم عبد القادر
کے پاس چلے آئے اور زندگی بھر اُن کی خدمت کرتے
رہے۔
کہیں دُور سے گھومتا ہوا ایک قوال آپ کی
خدمت میں پہنچا اور ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا اُس
کی خواہش تھی کہ آپ اُسے قوالی کے لئے کہیں تو وہ
شروع کرے لیکن آپ بھی خاموش بیٹھے رہے۔ اس
طرح کافی دیر ہو گئی ایک مُرید نے آپ کے پاس
جا کر کہا" مخدومِ محترم! وہ شخص ۔

آپ نے بات کاٹ دی' فرمایا" ہاں ہمیں معلوم
ہے کہ وہ شخص کیا چاہتا ہے' لیکن ہمیں اِس کا شوق
نہیں ہے۔"
مُرید خاموش ہو گیا۔
قوال انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو آپ کے
پاس پہنچا اور ادب سے عرض کیا" حضرت ہم پر بھی
توجہ ہو جائے تو کرم ہو۔"
آپ نے جواب دیا' ہمیں قوالی کا بالکل
شوق نہیں ہے اِس لئے خاموش بیٹھے ہے۔ اب
تم جا سکتے ہو!
قوال نے اصرار کیا' حضرت ایک بار سُنیں
تو سہی' اگر پسند نہ آئے تو ۔"
آپ نے فرمایا" اگر پسند نہ آئے تو.... آگے
کہہ۔ چُپ کیوں ہو گیا؟
قوال نے جواب دیا" آگے میں کیا عرض
کروں' میری کیا مجال"۔
مخدوم عبد القادر نے فرمایا" اگر تو فلاح چاہتا
ہے تو جیسا میں کہوں ویسا کر"۔
قوال نے پوچھا" یعنی' ارشاد؟"
آپ نے جواب دیا" ساز و آواز فریب ہیں'
دھوکا ہیں' اِس میں اپنی عُمرِ عزیز مت ضائع کر۔ ان
سے تجھ کو کچھ نہیں ملے گا۔"

باقی آئندہ

مخدوم عبدُالقادر نے بانس کے اِس ٹکڑے کو سُورۂ اخلاص دم کرکے مریضوں کو چھُوانا شرُوع کیا اور اُس سے مریض تیزی سے صحت یاب ہونے لگے۔ اُچہ اور مُلتان میں اِس واقعہ نے بڑا شہرہ حاصل کیا۔ اور جس کی زبان پر دیکھو بانس کے اُس ٹکڑے کا ذکر ہے۔

بندر کی بلا

اظہر کلیم

اُردو ادب سے انتخاب
ایک خوبصورت کہانی

اور ٹوبی کا دعوی بالکل درست ثابت ہوا۔ گرزلی ایک حیرت انگیز بندریا تھی۔ وہ ایک بہترین مصور تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کا اتنا خوبصورت اسکیچ بنا تی کہ

صاحب طرز ادیب اور الفاظ کے جادو گر اظہر کلیم کی اپنے مخصوص انداز میں دلچسپ تحریر

اُس کی خمار آلود نیند رات کے نہ جانے کون سے پہر ٹوٹ گئی۔ بوجھل پلکیں اٹھانے کے بعد سب سے پہلی چیز جو اُسے دکھائی دی وہ ایک بندریا تھی۔ یہ بندریا الماری پر بیٹھی اُسی کی جانب دیکھ رہی تھی' وہ اُچھل کر بیٹھ گیا .. پھر اُس کا دایاں ہاتھ بڑھا اور اُس نے محوِ خواب روزی کو جھنجوڑ ڈالا۔ جھنجوڑنے کے اِس عمل سے پورا ٹریلر ہی ہل گیا اور ٹوبی نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر بعد اُس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ بندریا اب بھی اپنی جگہ موجود تھی'' اُف میرے خدا" وہ بڑبڑایا۔

"کیا بات ہے؟" روزی نے بیدار ہو کر پوچھا۔ پھر اُس کی نگاہوں کے تعاقب میں بندریا کی طرف دیکھ کر ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

" تمہاری ٹھیک ٹھاک خدمت کر رہی ہے نا؟" اس نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔

"ٹونک ... کیا یہ بالکل اصلی ہے؟"

" بالکل اصلی۔ ورنہ تم اُسے کندھے پر بٹھا کر کیوں لاتے"

"اوہ ۔' ٹوبی نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "ہاں واقعی' اِسے تو خود میں ہی لایا تھا۔ میں نے دو ڈالر اور ایک بوتل وسکی کے عوض اسے ایک سیاہ فام سے خریدا تھا" وہ ذہن پر زور دینے لگا۔" لیکن میں نے اِسے کیوں خریدا؟ اوہ.. ہاں' اُس سیاہ فام کا دعویٰ تھا کہ یہ ایک آرٹسٹ بندریا ہے' اگر اسے کاغذ اور پنسل فراہم کردی جائے تو یہ ہر اُس شخص کی تصویر بنا سکتی ہے جو اِس کے سامنے موجود ہو' اُس نے اِس کا نام گرزلی بتایا تھا"

" لیکن اِسے تو پسّو پڑے ہوئے ہیں" روزی نفرت سے ناک سکیڑ کر بولی۔

"بندروں کو پسّو نہیں پڑتے ڈارلنگ"

" اگر یہ پسّو اور جوئیں تلاش نہیں کر رہی ہے تو اور کیا کر رہی ہے؟"

" بندروں کی ایسی حرکات کا تعلق غالباً محض تنفس سے ہوتا ہے"۔ ٹوبی نے جواب دیا اور بندریا کی طرف دیکھا جو اب منہ بند کر کے اونچی آواز میں خوخو کر رہی تھی۔

"اور یہ ایسی آوازیں کیوں نکال رہی ہے؟"

"میں بھلا کیسے بتا سکتا ہوں" ٹوبی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے بندروں کی بس ایک عادت ہوتی ہے"۔

روزی کے دِل میں بندریا کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ "اور تم اِسے رکھو گے کہاں؟ میں اِسے اپنے ٹریلر میں تو ہرگز برداشت نہیں کر سکتی"

" وہ کیوں؟ یہ ایک صاف ستھری بندریا ہے جان!"

"تمہیں کیا پتہ۔ تم نے اسے شدید نشے کی حالت میں خریدا تھا"

"اِس وقت صاف ستھری نظر آ رہی ہے'

میں نشے میں نہیں ہوں۔ گرزلی کتنا خوبصورت نام ہے میں سمجھتا ہوں یہ ایک فرانسیسی نام ہے"

گرزلی نے اپنا دایاں پاؤں اپنی گردن پر رکھ لیا تھا اور اس پیر کے تلوے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی

"دیکھا تم نے کیا یہ کسی سمجھدار جانور کا کام کر رہی ہے" روزی کی جھلاہٹ بڑھ گئی اور وہ بندریا کو کینہ توز نظروں سے دیکھنے لگی۔

"یہ ایک تربیت یافتہ بندریا ہے اور ہمارے لئے خوش قسمتی لائے گی، سو جاؤ، میں صبح تمہیں اس کی صلاحیتیں دکھاؤں گا تو تم انگشت بدنداں رہ جاؤ گی"

..... اور ٹوبی کا دعویٰ بالکل درست ثابت ہوا۔ گرزلی ایک حیرت انگیز بندریا تھی۔ وہ ایک بہترین مصوّر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، سامنے بیٹھے ہوئے شخص کا اتنا خوبصورت اسکیچ بناتی کہ تماشائی حیرت سے دانتوں تلے انگلی داب لیتے۔ ٹوبی ایک سرکس کا مالک تھا۔ یوں تو اُس کے سرکس کی بعض دوسری خصوصیات بھی تھیں لیکن گرزلی کی وجہ سے اُس کا سرکس شہرت کے آسمانوں کو چھونے لگا... اور شہرت کے آسمانوں سے جتنی دولت برستی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ دولت برسنے لگی تو ٹوبی کے دل میں گرزلی کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اُس کی بیوی روزی کے دل میں اُس بندریا کے خلاف روز بروز نفرت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نفرت کا احساس غالباً گرزلی کو بھی تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر جب خوخو کرتی تو روزی کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ ایک روز اُس نے ٹوبی سے شکایت کی

"میں اِس بندریا کی وجہ سے بے حد پریشان ہوں، نہ جانے کیوں یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ بندریا میری جاسوسی کرنے لگی ہے۔ خاص طور سے جب میں غسل کرتی ہوں تو اِس کی نگاہوں کا احساس مجھے بے چین کر دیتا ہے"

ٹوبی کھل کھلا کر ہنس پڑا "یہ بھی تمہاری طرح مؤنث ہے۔ اگر اسے تاک جھانک کی عادت پڑ گئی ہے تو اسے تم ایک نسوانی کمزوری سمجھ کر ٹال سکتی ہو!"

اُسی لمحہ اُن کے ٹریلر کی الماری پر بیٹھی ہوئی بندریا خوخیانے لگی۔ روزی کے ابرو کمان ہو گئے۔ وہ نفرت سے بندریا کی طرف گھورنے لگی تب اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ گرزلی بھی آنکھیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں دبی غصہ اور نفرت جھلک رہی ہے

"یہ مجھ سے نفرت کرتی ہے ڈارلنگ!" روزی نے اُلجھ کر کہا "مجھے دیکھ کر خوخیاتی ہے اور..."

"چھوڑو بھی جان!" ٹوبی نے محبت سے اُس کا ہاتھ تھام لیا "تم تو اِس کے سلسلے میں باقاعدہ وہم کا شکار ہوتی جا رہی ہو"

اور وہ دونوں ایسی حالت میں تھے کہ تہذیب اُسے کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، قابلِ اعتراض، خلافِ تہذیب اور کریہہ حالت میں

اُس وقت تو معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن اگلے چند دنوں میں ٹوبی بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ گرزلی واقعی اُس کی بیوی سے نفرت کرتی ہے۔ اس نفرت کی وجہ اُس کی سمجھ سے بالاتر تھی... لیکن آخر کب تک! ایک رات یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ گرزلی کو اُن کے یہاں آئے چھ مہینے بیت چکے تھے اور اس دوران میں ٹوبی نے اتنا کما لیا تھا کہ اس نے گذشتہ چھ سال کے عرصہ میں اِتنی دولت نہیں کمائی تھی۔

جس رات حقیقت کھل کر سامنے آئی، اُس شب ٹوبی نے معمول سے کہیں زیادہ شراب پی لیکن اُسے ذرا سا بھی نشہ نہیں ہوا کئی جام لنڈھانے کے بعد وہ شراب خانے سے نکلا اور آگ بگولہ ہو کر اپنے ٹریلر کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں کاغذ کی ایک شیٹ دبی ہوئی تھی۔ ٹریلر میں داخل ہو کر اُس نے روزی کی طرف دیکھا جو بستر پر لیٹی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "تم... بے وفا، فاحشہ!" وہ غصہ سے چیخ پڑا۔ اُس نے آگے بڑھ کر پوری قوت سے روزی کے منہ پر تھپّڑ مارا۔

روزی اُچھل پڑی۔ اُس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ٹوبی اِتنے غصّے میں کیوں ہے۔ اُس نے آج تک اُس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور طمانچہ کی چوٹ سے اُس کا رخسار سُلگ اُٹھا۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو ڈارلنگ!" وہ بے یقینی سے بولی "تم اپنی بیوی پر تہمت لگا رہے ہو۔ میں تمہاری وفادار ہوں، اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو"

"خاموش! وہ دہاڑ اُٹھا۔ یہ بندریا تمہاری جاسوسی کرتی ہے، یہی کہا تھا نا تم نے؟ میں سمجھ گیا یہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ اِس کے دل میں تمہارے لئے جو نفرت تھی اُس کی وجہ یہ تھی کہ تم اُس کے مالک کو دھوکا دے رہی تھیں" یہ کہہ کر اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شیٹ روزی کے منہ پر دے ماری۔

روزی بستر پر اٹھ بیٹھی تھی۔ اُس نے کاغذ کی شیٹ اُٹھا کر دیکھی تو اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ یہ خود اُس کی تصویر تھی۔ تصویر میں اُس کا سراپا فطری لباس میں تھا۔ اگر اتنی سی بات ہوتی تو ٹوبی اُسے ہنسی میں ٹال دیتا۔ مصیبت یہ تھی کہ تصویر میں شیروں کو سدھانے والا ایل میگانو بھی تھا۔ اور وہ دونوں ایسی حالت میں تھے کہ تہذیب اُسے کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی قابلِ اعتراض، خلافِ تہذیب اور کریہہ حالت میں۔ مارے غصّے کے روزی بستر سے اُتری اور دیوانوں کی طرح گرزلی کی طرف بڑھی لیکن ٹوبی نے راستے میں ہی اُس کی کلائی پکڑ لی اور دھاڑنے لگا "تمہیں بہت دیر ہو گئی ذلیل عورت! اب تم اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں" اُس نے روزی کو گھسیٹ کر دروازے سے نکالا، ایک ٹھوکر اُس کی کمر پر رسید کی اور ایک دھماکہ سے دروازہ بند کر لیا۔

اگلے روز سرکس کا ماحول بے حد سوگوار تھا۔ روزی ایک ہر دل عزیز خاتون تھی جبکہ ایل میگانو کو بھی پسندیدہ شخص سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو اُن کے غیر فطری تعلقات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ خود ٹوبی حیران تھا۔ لیکن وہ اُس تصویر کا کیا کرتا جو ایک معصوم جانور

نے بنائی تھی، ایک ایسا جانور جو بغیر دیکھے تصویر بنانے پر قادر نہیں تھا۔ روزی کے بغیر ٹوبی کی زندگی ویران ہوگئی۔ بندریا نے اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ ٹوبی کو اُس فنکار بندریا سے نفرت ہوگئی تھی کیوں کہ اُس نے ایسے حقائق بے نقاب کئے تھے جن سے اُس کی زندگی میں انگارے ہی انگارے بھر گئے تھے۔ ایک ہفتہ بعد اُس نے کاروبار کی پرواہ کئے بغیر بندریا ایک ماہرِ نفسیات جارج کے ہاتھ فروخت کردی۔

ماہرِ نفسیات جب گرزلی کو لے جارہا تھا، تو ٹوبی نے اُس کی آنکھوں میں پہلی بار نفرت کی جھلک دیکھی تب اُسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر کینہ پرور بندریا تھی۔

گرزلی کے جانے کے بعد اُس کی تنہائیاں اور بڑھ گئیں۔ روزی کی یاد اُس کے دل کا ناسور بن گئی جو رات کی تنہائیوں میں اس بری طرح رسنے لگتا تھا کہ ٹوبی کے لئے رات پہاڑ بن جاتی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے روزی کو معاف کردیا اور ہر روز بیتابی سے انتظار کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں اُسے یقین ہوتا جارہا تھا کہ بندریا کی بنائی ہوئی تصویر جھوٹی تھی۔

ایک طوفانی رات وہ نشے میں دُھت ٹریلر کی چھت کو گھور رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اُچھل پڑا۔ اُسے یقین تھا کہ دروازہ کھولتے ہی اُسے روزی دکھائی دے گی ... لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر جارج کو دیکھ کر حیران رہ گیا، وہی ماہرِ نفسیات جارج جس کے ہاتھ اُس نے وہ منحوس بندریا گرزلی فروخت کی تھی۔ جارج کی آنکھوں میں قاتلوں جیسی سُرخی تھی، اُس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اُس کے کندھے پر گرزلی بیٹھی خوخیا رہی تھی اور جارج کے دائیں ہاتھ میں ایک رائفل دبی ہوئی تھی "کیا بات ہے جارج!" ٹوبی نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں خبیث! یہ دیکھو" اُس نے کاغذ کی شیٹ آگے بڑھادی" اپنے کالے کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لو"

سکتے کے سے عالم میں ٹوبی نے وہ شیٹ دیکھی اور اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ بندریا کی بنائی ہوئی تصویر تھی اور اُس میں ٹوبی اور جارج کی بیوی میورل کو دکھایا گیا تھا، ایسی حالت میں کہ کوئی مہذب انسان اُسے دیکھ کر مارے ندامت کے زمین میں گڑ جاتا۔ جارج..." ٹوبی نے تھوک نگل کر کہنا چاہا" یہ بندریا جھوٹی ہے۔ مم... مَیں تو آج تک تمہاری بیوی سے ملا بھی نہیں ہوں اور..." اس کی آواز ٹوٹ گئی اور وہ دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے جارج کی طرف دیکھنے لگا جس کی رائفل کا رُخ اُس کے سینے کی طرف تھا۔ پھر اُس کی نگاہ گرزلی پر جم گئی جس کی آنکھوں سے غصّے اور نفرت کا احساس ہو رہا تھا اور وہ مخصوص انداز میں خوخیا رہی تھی۔ ●●

تریاق

اختر نثار

تین دن تک وہ اکیلا غار میں پڑا سوچتا رہا۔ جن چیزوں کو وہ اب تک پسند کرتا چلا آیا تھا وہ چیزیں اُس کے سانس کی گرمی سے راکھ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

افریقہ کے جنگلوں میں پروان چڑھنے والے نرم مزاج چھوٹے سے سانپ کی کہانی

وہ ایک نرم مزاج چھوٹا سا سانپ تھا اور
ی افریقہ کے صحرا میں اکیلا ہی پروان چڑھ رہا تھا۔
۔اُس نے آنکھ کھولی تو اردگرد کوئی بھی ایسا نہ تھا
ے اُس کی فطرت سے آگاہ کرتا اور بتاتا کہ وہ کتنی
ناک چیز ہے۔ وہ ازخود یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اُس
لق سانپوں کی ایسی زہریلی اور نادرُالوجود نسل سے
و اب زمیں پر ما پید ہے اور وہ نہ صرف اُس نسل کا
مد ساب ہے بلکہ اِس نسل کی افزائش کا دار و مدار بھی
ُ سی پر ہے۔ لیکن وہ خود کو ایک معمولی سانپ سمجھتا
رم پتوں اور پھولوں سے اپنا پیٹ بھر کر مزے کی
ی گزار رہا تھا۔

جب وہ ذرا بڑا ہوا تو ایک دن حسبِ معمول
سنے نرم و نازک جھاڑیوں پر اپنا منہ دے مارا "ارے
بچا، یہ کیا ہوگیا"
جو کچھ ہوا تھا اُسے اتفاق سمجھ کر اُس نے پھر
ی جھاڑیوں پر منہ مارا۔ اُس کی پھنکار سے جھاڑیاں
بھی پہلی جھاڑیوں کی طرح راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئیں۔

"اوہ خدایا" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ تو میری وجہ سے ہو رہا ہے" وہ صدمے سے آنسو بہانے لگا۔ تین دن تک وہ اکیلا ایک غار میں پڑا سوچتا رہا۔ جن چیزوں کو وہ اب تک پسند کرتا چلا آیا تھا وہ چیزیں اُس کے سانس کی گرمی سے راکھ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

چوتھے دن رینگتا ہوا غار سے نکلا۔ وہ عزم کر چکا تھا کہ وہ نیلی غار میں رہنے والے بزرگ سے ملاقات کر کے اپنی پریشانی سے آگاہ کرے گا۔ وہ بزرگ عقل مند تھا اُس کے پاس میری مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا۔ وہ نیک انسان ہے وہ میری مدد ضرور کرے گا" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

بوڑھے بزرگ نے بڑے تحمل سے سانپ کی گفتگو سنی پھر مایوسی کے عالم میں سر ہلا کر بولا۔

" افسوس! میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا تم ویسے ہی رہو گے جیسا تمھیں خدا نے بنایا ہے۔ تمہاری فطرت تبدیل نہیں ہو سکتی کیونکہ تم روح سے محروم ہو صرف جسم ہو، اگر تم انسان ہوتے تو میں شاید تمہارے لئے کچھ کرتا، مگر تم سانپ ہو۔ میری مانو تو اپنی تقدیر پر شاکر ہو جاؤ کیونکہ تم اُس سے فرار نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ تمھاری پھنکار سے جھاڑیاں اور درخت جل کر راکھ نہ ہوں لیکن افسوس تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی"۔

" قابلِ احترام بزرگ!" وہ ادب سے بولا۔ "میں آپ کی دانش اور بصیرت پر اعتماد کرتا ہوں، اگر میں نے سن رکھا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اپنی تقدیر بدل سکتا ہے"۔

"ہاں ... لیکن تمہارے لئے یہ ممکن نہیں" بزرگ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

سانپ کو اس انکار سے سخت صدمہ پہنچا اور اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی اور آن کی آن میں وہ بزرگ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئے۔ یہ دیکھ کر سانپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ خود کلامی کے انداز میں بولا "یہ دُرست ہے کہ بزرگ میری وجہ سے راکھ ہوگئے مجھے ان کی موت کا غم ہے، مگر میں بھی کیا کر سکتا ہوں

اُس نے مجھے جو فلسفہ سمجھانے کی کوشش کی وہ میرے لئے بیکار تھا لیکن اُن کے لئے مناسب تھا یقیناً اُن کی تقدیر یہی تھی۔

وہ رینگتا ہوا اب بسنتی رنگ کی چادر میں ملبوس جوگی کے پاس پہنچا۔ غار میں داخل ہونے سے قبل اُس نے اپنے آپ سے کہا "مجھے اُس بزرگ سے ملنے کی بجائے جوگی سے ملنا چاہئے تھا۔"

جوگی نے بڑی دل چسپی سے سانپ کی باتیں سنیں جب اُس نے بزرگ کے انجام کی رُوداد سُنی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"یہ فلسفی اور اُصول پرست لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں اور وہ اِسی طرح مرا کرتے ہیں، تم کوئی فکر نہ کرو میں جلد ہی تمہاری مشکل حل کر دوں گا۔ ہر زہر کا ایک تریاق ہوتا ہے میں تمہارا علاج کروں گا۔ بس ذرا یہ احتیاط کرنا کہ تمہارا اسرار اِدھر اُدھر نہ پھیلے۔" یہ کہہ کر وہ غار میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا جیسے اُسے کسی چیز کی تلاش ہو، وہ ساتھ ساتھ کہتا جا رہا تھا "میں ابھی تمہاری مشکل کا حل تلاش کرتا ہوں۔ فطرت بے لچک نہیں ہوتی ہر چیز کا متبادل ہوتا ہے، ہر راز کی ایک کنجی ہوتی ہے آدمی کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ اُس کنجی تک رسائی حاصل کرے" پھر وہ بڑے فخر سے بولا "میں تو لوہے کے ٹکڑے پر ایسا عمل کرتا ہوں کہ وہ سونا بن جاتا ہے، تمہارا مسئلہ بہت معمولی سا ہے۔"

"آپ دُرست فرماتے ہیں جناب۔" سانپ نے کہا۔ "مگر جب تک..."

"جب تک کیا؟" جوگی نے کہا "یہی نا کہ جب تک تمہاری سانسوں میں زہر رچا ہوا ہے، اُس وقت تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، تم فکر مت کرو، یہ بہت معمولی سی بات ہے۔"

جوگی نے ایک بوتل سے ایک گرم سیال نکال کر چمچے میں ڈالا، سیال سے دھواں نکل رہا تھا "یہ بھی ایک زہر ہے، جس میں تمہارے زہر کا توڑ موجود ہے اسے پی جاؤ۔"

"یہ تو بہت گرم دکھائی دیتا ہے، مجھے جلا ڈالے گا" سانپ نے شک کا اظہار کیا۔

"ارے تم گھبرا گئے! اسے پی جاؤ، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، شاید تمہیں علم نہیں کہ تمہاری نسل کے سانپ لازوال ہوتے ہیں"

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں لازوال ہوں؟" سانپ نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم ضرور پیلے ہو، یا پھر اَن پڑھ ہو، تمہیں کسی بات کا علم ہی نہیں۔ تمہاری نسل کے سانپ پر کسی زہر کا منفی اثر نہیں ہوا کرتا، کوئی ریچھ ہی تمہاری موت کا سبب بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ تمہاری زہریلی پھنکار سے محفوظ رہے" جوگی نے بتایا۔

"واہ! آپ نے خوب بات بتائی" سانپ خوش ہو گیا

"اب وقت ضائع نہ کرو" جوگی سیال سے بھرا ہوا چمچہ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ سانپ رینگتا ہوا چمچے کے قریب ہو گیا اور اُس نے چمچے سے ایک گھونٹ بھرا، گرم زہر سے اُس کا منہ جل اٹھا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے، درد اور کرب سے اس نے اپنا سر جھٹکا۔

"اِس نے مجھے جلا دیا، آپ تو کہتے تھے یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا" سانپ کے لہجہ میں احتجاج تھا "آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

سانپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دُھندلاہٹ دُور ہوئی تو اُس نے اپنے سامنے راکھ کی ایک چھوٹی سی ڈھیری دیکھی، پھر وہ آنکھیں جھپک کر بولا "افسوس ہے یہ سب میری وجہ سے ہوا مگر یہ آدمی بھی معقول نہ تھا، معقول تو میں ہوں" سانپ نے خود سے کہا "اِس راکھ کی ڈھیری تو بزرگ کی راکھ سے کہیں چھوٹی ہے۔"

وہ اُداس سا غار سے باہر آ گیا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اُس نے ایک خوفناک ریچھ کو دیکھا۔ ریچھ اُسے دیکھتے ہی آگے بڑھا تو سانپ گڑگڑانے لگا۔

ریچھ صاحب! ایک منٹ کے لئے رُک جائیے! آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے، میں ایک بے ضرر سانپ ہوں اور نرم و نازک پودوں، اور پھولوں سے محبت کرتا ہوں"

"اپنی موت کے لئے تیار ہو جاؤ" ریچھ نے کڑک کر کہا "مجھ سے محبت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"جناب! مجھ پر اعتماد کیجئے، اگرچہ میرا سانس زہر آلود ہے لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ کسی درخت اور انسان کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا" سانپ گڑگڑانے لگا

"میں تم پر ہرگز اعتماد نہیں کر سکتا، تمہارا زہر ہم سب کے لئے نقصان دہ ہے"!

"مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا"۔

"تو تم اب کہتے ہو، تمہارے پاس وہ قوت ہے کہ تم جھاڑیوں، پتھروں اور انسانوں کو ایک پھنکار میں راکھ کر سکتے ہو، میں نے کسی سے سُنا تھا کہ طاقت کا نشہ ہر ایک کو پاگل کر دیتا ہے" یہ کہہ کر ریچھ نے ایک گرجدار آواز نکالی اور حملہ کرنے کے لئے مستعد ہو گیا۔ سانپ خوفزدہ کھڑا رہا، اُس کی کھوپڑی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے، دِل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا، وہ اب بھی یہی کہنا چاہتا تھا کہ مجھ جیسے نرم مزاج سانپ کو مارنا ظلم ہے لیکن اُس کی سُنتا ہی کون تھا۔ سانپ نے عالم یاس میں سَر اُٹھایا۔ اچانک ریچھ کے بال نیلی پیلی چنگاریوں کی زد میں آ گئے اور پھر چند لمحوں ہی میں ریچھ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ ڈھیر پہلے تمام ڈھیروں سے چھوٹا تھا

"وہ مارا" سانپ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا "اب میں پہلے سے زیادہ طاقت ور ہوتا جا رہا ہوں" پھر وہ گنگنانے لگا "اس سے یہ ظاہر ہوا کہ میں شدید خواہش کے باوجود اپنی قسمت سے نجات حاصل نہیں کر سکتا، تو پھر... تو پھر..." وہ فخر سے سر اُٹھا کر تناور بلوط کے تن آور درخت کو دیکھنے لگا اور پھر ایک زوردار پھونک ماری، پلک جھپکنے میں شاہ بلوط کا درخت راکھ ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا "میں تمام جانوروں سے زیادہ زہریلا اور طاقتور سانپ ہوں، اُس ریچھ نے طاقت کے نشہ کے بارے میں کچھ کہا تھا لیکن وہ تو راکھ بن چکا ہے اور میں زندہ ہوں، اب میں سامنے والے پہاڑ کو راکھ میں تبدیل کر دوں گا"۔

پہاڑ پر پہنچ کر سانپ نے دوسری طرف دیکھا اُسے سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں ریچھ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے دکھائی دیئے۔ سانپ نے دراُلحمد [illegible]

"میں اُن سب سے نپٹ لوں گا"

ابھی وہ ایک پتھر پر رکھ کر [illegible]

اُن ریچھوں کو دیکھنے لگا جو چند لمحوں میں [illegible]

راکھ بننے والے تھے۔

قاعدہ کے مطابق کسی بھی رسالہ یا اخبار کی ہر اشاعت پر پرنٹ لائن کا شائع ہونا ضروری ہے۔ یعنی رسالہ یا اخبار کی ہر اشاعت پر یہ لکھا جانا ضروری ہے کہ رسالہ یا اخبار کس پریس میں چھپا اور کس نے بطور پرنٹر، پبلشر اسے چھپوایا اور کہاں سے شائع کیا۔

کرنا ہوتا ہے اور اس ڈیکلریشن میں اس امر کا اعلان کرنا بھی شامل ہے کہ یہ اخبار یا رسالہ کس کس پریس میں چھپے گا اور اگر ان پریسوں میں بلاک پرنٹنگ کا انتظام نہیں ہے تو سرورق اور دیگر تصاویر کے بلاک کس پریس میں چھپیں گے۔

اکثر و بیشتر ساہنی صاحب کی اس ادبی لوٹ کا لکھا جوکھا کرتا تھا جس کی وجہ سے ساہنی صاحب سرور تونسوی کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔

سردار امریک سنگھ منکلا تھیوری ایڈیٹر "للکار" کا مسٹر ساہنی سے ملنا جلنا اکثر رہتا تھا باتوں باتوں میں ایک دن سردار امریک سنگھ کہنے لگے۔ سرور

شخصیات، واقعات، تاثرات،

سرکاری قواعد اور ضوابط کی پابندی ایڈیٹر شانِ ہند کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے۔ مگر قدرت کا ستم ظریفی دیکھئے کہ چند سال پیشتر ایک آدھ نہیں مسلسل سترہ ماہ تک شانِ ہند کی پرنٹ لائن کی اشاعت میں سہو ہوتا رہا کہ اس کے سرورق کے چار صفحات کس پریس میں چھپے۔ سرورق کے صفحات بلاک پرنٹنگ کے ہوتے تھے۔ اور اندرونی صفحات لیتھو پرنٹنگ کے۔ کسی بھی اخبار یا رسالہ کی اشاعت کے سلسلے میں سرکاری طور پر ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر کو ایک ڈیکلریشن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہاں اب پولیس کمشنر کے ہاں، داخل

سچائی کی حمایت اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے نیز بے باکی سے لکھنے کے باعث ایڈیٹر شانِ ہند کے مزعومہ دشمن اکثر اس کے گرد ایک حلقہ بنائے رکھتے ہیں مگر خدا کا کرم ہمیشہ ایڈیٹر شانِ ہند کے ساتھ رہا ہے۔

مسٹر ساہنی (مرحوم شیام سُندر پرتوینا کے حقیقی بھائی) ایک ہفتہ وار اخبار "چوٹ" شائع کرتے تھے اور "چوٹ ادبی معمہ" بھی جاری کئے ہوئے تھے "چوٹ ادبی معموں" کے انعامات کبھی تقسیم نہ کئے گئے، اور ساہنی صاحب ان معموں کے ذریعہ کو لوٹتے تھے۔ لہٰذا "شانِ ہند"

صاحب تمہاری شکایت ساہنی صاحب کرنے والے ہیں کہ آپ نے سترہ ماہ سے رسالہ شانِ ہند کی پریس لائن میں بلاک پرنٹنگ کے صفحات چھاپنے والے مُراری آرٹ پریس کا نام نہیں لکھا سردار امریک سنگھ کی زبانی بظاہر یہ اُڑتی سی خبر دراصل ایک قانونی فروگذاشت کی اطلاع تھی کر راقم الحروف نے ایک سیکنڈ بھی ضائع کئے بغیر فوراً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کے نام ایک درخواست لکھی کہ اتفاقی طور پر مستقل سترہ ماہ تک شانِ ہند کی پریس لائن کے اندراج میں بلاک چھاپنے والے پریس کا نام لکھنا رہ گیا ہے اور یہ ایک اتفاقی امر ہے، دیدہ و

دانستہ قانون کی خلاف ورزی نہیں. لہٰذا اِس فروگذاشت کو محض ایک اتفاقی امر سمجھ کر درگذر کیا جائے آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی یہ درخواست دستی طور پر سردار سُریندر سنگھ پریس کلرک دفتر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دی گئی۔ اور اُس نے دیرینہ مخلصانہ تعلقات کی بنا پر مجھے ساتھ لے کر میری یہ درخواست جناب کنور سُریندر سنگھ بیدی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کی خدمت میں پیش کی، بعض محکموں کے بارے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اپنی پاور کسی بنا پر، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو منتقل کر دیتا ہے چنانچہ پریس کے جملہ مُعاملات کے بارے میں ڈی۔ ایم نے اپنی پاور جناب کنور سُریندر سنگھ بیدی (اے۔ ڈی۔ ایم) کو منتقل کر رکھی تھی۔ جناب کنور سُریندر سنگھ بیدی مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے (کنور سُریندر سنگھ بیدی صاحب جناب کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر کے چھوٹے بھائی ہیں) لہٰذا انہوں نے میری درخواست پیش ہوتے ہی یہ حکم صادر فرمایا کہ شانِ ہند کے ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر کو وارننگ دی جاتی ہے کہ آئندہ وہ اِس جُرم کا ارتکاب نہ کرے سردار سُریندر سنگھ نے چند منٹ میں ہی میرے نام یہ وارننگ ٹائپ کرکے اور اے۔ ڈی، ایم صاحب کے دستخط کرانے کے بعد میرے سپرد کر دی، اور میں بے فکر ہو گیا۔

ساہنی صاحب کی شکایت پر پریس آفیسر جناب شیدا صاحب (مرحوم)، نے ایڈیٹر شانِ ہند کے خلاف سترہ مُقدمات عدالت میں دائر کئے قدرت کی ستم ظریفی کہیئے یا میری خوش نصیبی کہ جس روز اے، ڈی۔ ایم صاحب نے مجھے وارننگ دی اُس کے دوسرے ہی دن پریس کا محکمہ پولیس کمشنر کے تحت کر دیا گیا اور ان سترہ مقدمات میں سرکار (یعنی پولیس کمشنر) بنام ایڈیٹر شانِ ہند کارروائی شروع ہوئی۔ یہ تمام مُقدمات شری شرما مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت میں سماعت کے لئے بھجوائے گئے شرما صاحب مجسٹریٹ میری رہائش گاہ اور دفتر شانِ ہند سے چند قدم کے فاصلے پر ۵۲ دریا گنج میں رہائش رکھتے تھے دن میں دو چار مرتبہ شرما صاحب سے آمنا سامنا ہو جاتا تھا. محلے کے دوکاندار اور اکثر باشندے اُنہیں فرشی سلام کرتے تھے اور راقم الحروف ناچیز نے اُنہیں کبھی سَر کی جنبش سے بھی وش نہیں کیا تھا اِس لئے شرما صاحب دل ہی دل میں مجھے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ فوجداری مُقدمات کی ابتدائی کارروائی کی تکمیل وغیرہ میں کافی دن لگ جاتے ہیں. لہٰذا کچھ ماہ بعد شرما صاحب کی عدالت سے ایک سمن مجھے اور مُراری آرٹ پریس کو موصول ہوا کہ پریس ایکٹ مُقدمہ میں پیش ہو کر جواب دہی کریں۔

تاریخ مُقررہ پر مرحوم شبش چندر طالب دہلوی کو ہمراہ لے کر اور ان کا ضمانت نامہ مرحوم محمد شفیع مجسٹریٹ درجہ اوّل سے تصدیق کروا کر شرما صاحب کی عدالت میں پیش ہوا تو اُنہوں نے دو ہزار روپیہ کی ضمانت طلب فرمائی ضمانت نامہ میں رقم کا اندراج کرکے مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا. ضمانت نامہ ایک دوسرے مجسٹریٹ کا تصدیق شدہ تھا جسے رد نہیں کیا جا سکتا تھا، مگر شرما صاحب نے اپنی مجسٹریٹی شان کو برقرار رکھتے ہوئے طالب صاحب دہلوی کی جائیداد کے کاغذات مُلاحظہ فرمائے اور بادلِ ناخواستہ ضمانت منظور فرمائی۔ اور مجسٹریٹ صاحب نے آئندہ کی پیشی لگا دی کہ اتنے میں پیش کار نے سولہ دیگر مُقدمات کے کاغذات مجسٹریٹ صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ مُلزم کے خلاف سولہ مُقدمات بھی زیرِ سماعت ہیں۔ اِس پر مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا کہ سولہ ضمانتیں دو، دو ہزار روپیہ کی پیش کیجئے۔ عرض کیا گیا کہ اِن سولہ مُقدمات کو زیرِ سماعت نہیں کیا جا سکتا. کیونکہ آپ کی عدالت نے ایک مُقدمہ کے سمن جاری فرمائے اور اُسی مُقدمہ کے سلسلے میں مَیں پیش ہوا۔ اور حسبِ ضابطہ اِس زیرِ سماعت مُقدمہ کی ضمانتِ حاضری دے دی گئی جسے آپ نے منظور فرما کر اگلی پیشی بھی مُقرر فرما دی۔ اِس لئے باقی کے سولہ مُقدمات کے باضابطہ سمن طلبی موصول ہونے پر جب تاریخِ پیشی پر حاضرِ عدالت ہوا جائے تو آپ مزید کارروائی فرما سکتے ہیں۔

اِس بیان پر مجسٹریٹ صاحب طیش میں آ گئے اور فرمانے لگے۔ پیش کار ابھی اِن مُقدمات کے سمن بنا کر انہیں ڈلیور کئے جائیں اور مجھے حُکم ہوا کہ آپ بیٹھ جائیے۔ میرا لڑکا ارام لال میرے ساتھ تھا اُس سے مَیں نے دو جوڈیشنل پیپر منگوائے، اور مجسٹریٹ مذکور کی عدالت میں حسب ذیل درخواست فوری طور پر پیش کر دی

"مَیں مُسمّیٰ وِدیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ماہنامہ شانِ ہند پریس ایکٹ کے مُقدمہ ہٰذا میں آپ کی عدالت میں پیش ہوا اور آپ نے اِس مُقدمہ میں دو ہزار روپیہ کی ضمانت طلب فرمائی جو پیش کی گئی اور آپ نے ضمانت منظور فرما کر اگلی پیشی سماعت کے لئے مُقرر بھی فرما دی۔ مگر اچانک ہی پریس ایکٹ کے سولہ مُقدمات کی فائیل آپ کے سامنے رکھی گئی اور بغیر کوئی سمن طلبی وغیرہ جاری کئے جانے کے آپ نے دو، دو ہزار روپیہ کی سولہ ضمانتیں اور طلب فرمائی، اور میرے احتجاج کرنے پر کمرۂ عدالت میں ہی مجھ پر جبراً سمنوں کی تعمیل کرانے کا زبانی حُکم فرمایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ نے مجھے حبسِ بے جا میں رکھا ہے اور جس ضامن جناب طالب دہلوی صاحب کو مَیں ہمراہ لایا ہوں وہ لاکھوں کی جائیداد کے مالک ہیں۔ اور ان کا لاکھوں روپیہ فکسڈ ڈپازٹ کے طور پر بینک میں موجود ہے، اور جس کی تصدیق ایک مجسٹریٹ درجہ اوّل نے فرمائی ہے، اور آپ بھی طالب صاحب کی جائیداد اور اُن کی حیثیت کے کاغذات مُلاحظہ فرما چکے ہیں. لہٰذا آپ دیگر سولہ مُقدمات میں بھی طالب صاحب کی ضمانت منظور فرمائیں اور قانونی طور پر تو آپ کو اِن سولہ مُقدمات کے باضابطہ سمن جاری فرما کر تاریخِ پیشی مُقرر فرما کر اگلی کارروائی کرنی چاہیئے۔

چونکہ آپ کا رویّہ غیر ہمدردانہ ہے اور غیر قانونی بھی، لہٰذا مَیں فوری طور پر اے ڈی ایم صاحب کی عدالت میں تبدیلیٔ مُقدمہ کی درخواست دے رہا ہوں لہٰذا آپ تبدیلیٔ مُقدمہ کے سلسلے

میری مجوزہ درخواست کے سلسلہ میں جتنی رقم کی بھی ضمانت لینا چاہیں حکم فرمایا جائے ریہ قاعدہ ہے کہ اگر عدالت سے یہ کہا جائے کہ ملزم کو عدالت مذکورہ سے انصاف کی توقع نہیں ہے اور وہ تبدیلی مقدمہ کی درخواست ہائی کورٹ میں دینا چاہتا ہے تو مجسٹریٹ ملزم سے اس امر کی ضمانت طلب کرتا ہے کہ اگر ملزم نے اگلی پیشی تک تبدیلی مقدمہ کی درخواست نہ دی تو اس سے ضمانت کا روپیہ ہرجانہ کے طور پر وصول کیا جائے گا،

درخواست پڑھتے ہی مجسٹریٹ شرما صاحب نے میری درخواست پر کوئی حکم نہ لکھا مگر زبانی طور پر فرمایا کہ آپ جو ضامن ساتھ لائے ہیں اُنہی کی ضمانت دے دیجیے، فوری طور پر سولہ ضمانت نامے منگوئے گئے اور میں نے تمام کاغذات نصف گھنٹہ میں تیار کر کے مجسٹریٹ صاحب کے سامنے رکھے اور طالب دہلوی صاحب بھی پیش ہوئے مجسٹریٹ صاحب نے سولہ ضمانتیں منظور فرما کر اگلی پیشی مقرر فرما دی۔

میں نے کمرۂ عدالت سے باہر نکلتے ہی طالب صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اب آپ گھر جائیے جو تکلیف آپ کو اُٹھانی پڑی اُس کے لئے معافی خواہ ہوں، طالب صاحب فرمانے لگے۔ سرور بھائی تم تو یونہی ایڈیٹر بنے۔ اگر وکالت کا پیشہ اختیار کرتے تو تمہاری وکالت خوب چمکتی۔ لنچ کا ٹائم ہو گیا تھا چنانچہ ایک ریسٹورنٹ میں طالب صاحب نے پُر تکلف چائے پلائی اور اپنے گھر چلے گئے۔

میں نے جناب اشفاق حسین صاحب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی خدمت میں تبدیلی مقدمہ کی درخواست دیتے ہوئے جہاں جملہ حالات جو شرما صاحب کی عدالت میں پیش آئے درج کرتے ہوئے یہ بھی استدعا کی کہ مجسٹریٹ مذکور چونکہ ٹی۔ بی کے دیرینہ مریض ہیں اِس لئے اُن کا مزاج چڑچڑا ہو گیا ہے لہذا وہ ملزمان کے لئے نامناسب طور پر اڑچنیں پیدا کرنے کے لئے اپنی مزاجی کیفیت سے مجبور ہیں اِس لئے اُنہیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنا مناسب علاج کرانے کے لئے رخصت پر چلے جائیں اور ویسے بھی ایک مجسٹریٹ جو ٹی۔ بی کا دیرینہ مریض ہو اُس کا اِس طرح عدالت میں ٹی۔ بی کے جراثیم پھیلانا صحتِ عامّہ کے لئے بھی خطرناک ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اِس سلسلے میں مناسب کارروائی فرمائیں گے۔ اے۔ ڈی۔ ایم صاحب کو میں نے سردار سُریندر سنگھ بیدی ایڈیشنل مجسٹریٹ کا وہ حکم نامہ بھی دکھا دیا جس میں اُنہوں نے مجھے اِس قانونی فروگذاشت کے لئے وارننگ دی تھی جناب اشفاق صاحب اے۔ ڈی۔ ایم کی خدمت میں یہ بھی گذارش کی گئی کہ پریس کے سلسلے میں جملہ اختیارات پریس کمشنر کو یکم اکتوبر کو تفویض ہوئے اور اے۔ ڈی۔ ایم کا حکم نامہ جس میں مجھے وارننگ دیکر آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی ہدایت کی گئی ہے وہ ۳۰ ستمبر کا ہے لہذا ویسے بھی یہ سترہ کے سترہ مقدمات پریس آفیسر نے غلط طور پر دائر کئے ہیں۔

نہ معلوم اشفاق حسین اے۔ ڈی۔ ایم صاحب نے ہماری درخواست تبدیلی مقدمہ پر کیا حکم صادر کیا مگر اگلی پیشی پر میں شرما صاحب کی عدالت میں پیش ہوا تو اُنہوں نے فرمایا کہ جائیے آپ کے تمام مقدمات سرکار نے واپس لے لئے ہیں۔ اور میں اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کمرۂ عدالت سے باہر چلا آیا۔

●●

غزل

خلیل انجم

بات ہماری مان لے انجم ورنہ بہت پچھتائے گا
بول کے سچی بات کسی دن پھانسی پر چڑھ جائے گا

چھین لو بڑھ کر ساغر و مینا ریت ہے یہ مے خانے کی
میخوارو کیا سوچ رہے ہو جام نہ تم تک آئے گا

شہر میں آ کر بھول گئے ہم، البیلا پن گاؤں کا
ہریالی لہراتے دیکھیں کب وہ زمانہ آئے گا

چند کتابیں، چند رسالے کچھ شعری مجموعے ہیں
اک شاعر کے گھر سے آخر چور بھی کیا لے جائے گا

آج نہیں تو کل سمجھیں گے لوگ مرے "اشعار" کو
میری غزل کا اک اک مصرع حُسنِ غزل کہلائے گا

شاپنگ

رؤف خیر

بے شک تھی شاہکار، گٹھری میں گھاس تھی
گڑیا نہ لی کہ وہ تو فقط خوش لباس تھی
تصویر بولتی سہی، تصویر ہی تو تھی

چینی کا تاج خوب تھا، ناپائیدار تھا
تھا بادشاہ وقت مگر ہاتھی دانت کا
کیا کھنکھناتا جسم تھا جو ٹوٹتا رہا

بازار کا جو مال تھا جی کو نہیں لگا
کچھ دیر اور جیب میں سکّہ پڑا رہا

پھر یوں ہوا کہ خیر سے گھر لوٹتے ہوئے
آنکھیں خرید لیں کسی اندھے فقیر سے

بابِ انتقاد

صحرا کی دھوپ

حجم: ۲۲×۱۸/۸ سائز کے ۱۳۶ صفحات

کتابت، طباعت، کاغذ، جلد بندی، گرد پوش سب عمدہ۔

قیمت: چالیس روپیہ۔

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

ساحر شیوی کوکس نژاد ہیں مگر عرصہ سے بیرونی (کیپا) میں مقیم ہیں۔ سرزمین کوکس نے ہمیں بہت اچھے ادیب، شاعر اور نقاد دیئے ہیں جن میں بلامبالغہ ساحر شیوی کا نام نامی انگلیوں پر گنے جانے والے محافظانِ اُردو میں شمار ہوتا ہے۔ ساحر شیوی کے دو شعری مجموعے "نیم شگفتہ" اور "وقت کا سورج" قبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

حال ہی میں اُن کا تیسرا مجموعۂ کلام "صحرا کی دھوپ" زمانہ جدید کی جملہ طباعتی خوبیوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جس کا پیش لفظ "جناب ڈاکٹر مظفر حنفی کے زورِ قلم کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اگر ہمارے ادیب اور نقاد اردو مطبوعات خصوصاً شعری مجموعوں کا پیش لفظ ایسی ایمانداری اور حق گوئی سے لکھنا شروع کر دیں تو قارئینِ کرام پیش لفظ یا دیباچہ کو "کیمپی" کہنے کے بجائے اُردو ادب کا ایک شہ پارہ کہنے پر مجبور ہو جائیں۔ حقیقتاً عرصہ کے بعد ایسا مختصر مگر جامع اور شاعرانہ کلام پر ہر پہلو سے بےباکانہ اور صحیح اظہارِ رائے کا مظہر "پیش لفظ" پڑھنے کو ملا ہے۔

اس مجموعہ میں ۳۹ غزلیں، ۲۵ نظمیں، ۸۷ رباعیات اور ۱۲ قطعات شامل ہیں۔ جن میں غزلیات کے اکثر و بیشتر اشعار ہمارے غزلیہ سرمایہ میں اگرچہ کوئی بڑا اضافہ نہیں کرتے (بقول ڈاکٹر مظفر حنفی) تاہم ان کی انفرادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نظموں میں "مسکراتے رہو" اور "صحرا کی دھوپ" ہماری نظمیہ شاعری میں واقعی اضافہ ہے۔ ساحر شیوی کی رباعیات بہت اچھی ہیں۔ بہرکیف یہ مجموعۂ کلام کسی بھی صاحبِ ذوق کی ذاتی لائبریری میں ایک خوشگوار اضافہ کا موجب ہوگا۔ اور لائبریریوں کے لئے بھی یہ ایک اچھی اور قابلِ مطالعہ کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساحر شیوی نے "صحرا کی دھوپ" کو جناب گانی داس گپتا رضا کے نام منسوب کیا ہے، جو اُن کے تبحرِ لطیف سے کماحقہٗ طور پر واقف ہونے کی دلیل ہے۔

سرور تونسوی

آئینۂ حافظ آباد

مصنف و ناشر: پنڈت ہرگولال شرما۔

ضخامت: ۵۱۲ صفحات۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت، دس روپے۔

شری پنڈت ہرگولال جی شرما نے حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ (حال پاکستان) کی شروع سے لے کر سنہ ۱۹۴۷ء تقسیم پنجاب تک کی تاریخ لکھ کر حافظ آبادیوں پر نہیں بلکہ پنجاب کی تاریخ کے خواہشمندوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ شستہ اُردو زبان میں انھوں نے حافظ آباد کی ابتدا سے تاریخ لکھی کہ کس طرح مسلمانوں، سکھوں، انگریزوں کے عہدہائے سلطنت میں حافظ آباد کی شخصیتوں نے کیسے کیسے اہم کارنامے ادا کئے ہیں۔

اس امر سے، قبل از تقسیم سارا پنجاب واقف تھا کہ پنجاب میں اعلیٰ درجہ کے صحافی، ڈاکٹر، انجینئر، سائنسداں اس چھوٹے سے قصبہ نے پیدا کئے جنھوں نے ملک اور قوم کی خدمت کی۔ ابتدائی بیرسٹروں میں حافظ آباد کے لالہ بلاقی جو پڑھ سنہ ۱۸۹۰ء میں بیرسٹری کر کے آئے اور انھوں نے ہی پہلی مرتبہ دیا سلائی کا کارخانہ ہندوستان میں لگایا۔ صحافیوں میں لالہ دینا ناتھ ایڈیٹر دیش، پبلک ہمالیہ نے بیسویں صدی کے شروع میں اردو صحافت میں نام پیدا کیا جیسے بعد میں سردار دیوان سنگھ مفتون، لالہ امیر چند کھنہ اور مہاتما نند گوپال نے نام عروج پر پہنچایا۔ ڈاکٹروں میں مشہور زمانہ آنکھوں کے سرجن ڈاکٹر متھرا داس پاہوا، موگا والے، مہاراج کرشن، ڈاکٹر گنیش داس وغیرہ کا نام ماہرینِ طب میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ اسی طرح سے ماہر انجینئر، پروفیسر اور منتظمینِ سلطنت کے بارے میں اور حافظ آباد کے برہمنوں، کھتریوں وغیرہ کی برادریوں، نیز وہاں کے اہم مقامات اور وہاں کے [illegible] کا وضاحت سے ذکر کیا گیا ہے، جن کی وجہ سے ہم بالخصوص دسہرے کے دنوں میں وہاں کے ناٹکوں کو دیکھنے کے لئے ہندوستان بھر سے لوگ دور دراز سے وہاں آیا کرتے تھے۔

وہاں کی مقتدر شخصیتوں کے متعلق وضاحت سے لکھا ہوا یہ مرقع بڑا ہی دلچسپ ہے۔ آخر میں وہاں کے کچھ پنجابی اُردو کے گانے بھی لکھے گئے ہیں۔ وہاں کی منڈی جو غلہ کی خرید و فروخت میں ہندوستان بھر میں اعلیٰ مقام رکھتی تھی اس کے بارے میں بھی، نیز وہاں کے بیوپاریوں کے بارے میں بھی بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر ہیرالال [illegible]
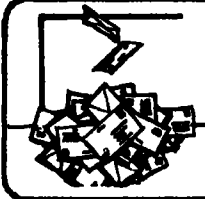
من کہ مکتوب الیہ

مکرمی — خلوص و عقیدت !

'شانِ ہند' کے حالیہ شمارے میں فرقہ وارانہ فسادات پر آپ نے محققانہ' نیز وطن پرستانہ اداریہ سپردِ قلم کیا ہے 'جو فی الواقع صورتِ حالات کا آئینہ دار ہے۔ ہندوستان کی جمہوریت دراصل بورژوائی آمریت ہوتی ہے۔ ہندو مسلم عوام لڑنا نہیں چاہتے مگر قائدین اپنے مفاد کی خاطر لڑواتے ہیں۔ اس پر میری تحریر 'آزاد ہند' کلکتہ' میں ملاحظہ فرمائیے گا۔

سیاست' مذہب' سبھی موروثی ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی امامت موروثی ہو چکی ہے ورنہ شاہی امام کیا معنی؟

'شانِ ہند' آفسیٹ پر آنے کے بعد سے بڑا اہم رسالہ بن کے ابھرا ہے۔

آپ کا :-

تاجہان رستوگی

شانتی نیکیتن
ڈی ۔ ۲۲۹ اندرانگر
لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

برادرِ محترم سَروَرؔ صاحب ! آداب

آپ کے مقبولِ عام کالموں کا مجموعہ "بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گذر" رجسٹری سے موصول ہوا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کے کالم ایک تو کتابی صورت میں آ گئے۔ دوسرے یہ کتاب فنِ کتابت' فنِ طباعت اور فنِ لطیف (خاکوں) سے بھی آراستہ و پیراستہ ہے۔ مجھے اس کا کوئی گوشہ تشنہ محسوس نہیں ہوا۔

جس طرح آپ کا قلم اپنی بے باکی کی وجہ سے مشہور ہے اسی طرح اس کتاب کا حُسن بھی بے باک نظر آتا ہے جلوہ دکھانے کے لئے۔

مجھے یقین ہے آپ کی یہ تصنیف تاریخِ صحافت میں ایک نیا باب ثابت ہو گی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوں گے

آپ کا

رام لعل

محترمی — تسلیم !

صحافت ایوارڈ ملنے پر دلی مبارکباد۔ حالانکہ یہ ایوارڈ آپ کو بہت پہلے ملنا چاہئیے تھا۔ عالمی مشاعرے کی رپورٹ پڑھی۔ محترم علی صدیقی صاحب بانیٔ مشاعرہ اس لئے اور بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ مشاعرہ بغیر کسی عوامی یا سرکاری مدد کے کیا۔ جبکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں جمع کر کے مشاعرے کرتے ہیں اور گول مال کرتے ہیں۔ علی صدیقی صاحب کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ منتخب اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے ملک زادہ منظور احمد صاحب کے اشعار نظر سے گزرے۔ اس سلسلہ میں اتنا عرض کروں گا کہ یہ اشعار عالمی مشاعرہ میں پڑھنے والے نہیں گویا انھوں نے یہ اشعار پڑھ کر ہندوستان کی نمائندگی کی ہے میرے سامنے صرف دو شعر ہیں اور دونوں معمولی حیثیت کے شعر ہیں۔ مطلع تو برائے مطلع ہے لیکن یہ شعر

جو بات کہی جائے وہ تیور سے کہی جائے
جو شعر کہا جائے حریفانہ کہا جائے۔

اس میں 'ہم ردیف' ہونے کا عیب موجود ہے اور مضمون بھی ایسا نہیں جس کی وجہ سے اس عیب کو برداشت کیا جا سکے۔

اختر شاہجہاں پوری

سَروَرؔ تونسوی صاحب !

یہ معلوم کر کے بیحد خوشی ہوئی کہ دلی اردو اکادمی نے اس سال آپ کو اُردو صحافت کا ایوارڈ دیا ہے۔ یہ اکادمی کا کوئی کرم نہیں' بلکہ یہ تو "حق بہ حقدار رسید" کا معاملہ ہے۔ اس وقت اُردو صحافت کی دُنیا میں جو لوگ عمر' تجربے اور خدمات کے لحاظ سے سب سے زیادہ لائقِ احترام ہیں' اُن میں آپ سرِ فہرست ہیں۔ اگر یہ ایوارڈ آپ کو اس سال بھی نہ ملتا تو بے انصافی ہوتی۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

امید ہے آپ ہر طرح بخیریت ہوں گے۔

اختر بستوی

مُراسلات صاف اور خوشخط لکھیے

قبلہ سَرْوَرؔ صاحب، تسلیم و نیاز!
اخبار میں آپ کو انعام ملنے کی خبر پڑھی۔ دلی مسرت ہوئی۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔
آگرہ کے مشاعرے کے بعد آپ سے تفصیلی ملاقات کا طالب تھا۔ مگر میری قسمت کہ ملاقات ہی نہیں ہوئی دیکھیے کب ہوتی ہے۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں آمین!

نیاز مند
شین۔ کاف۔ نظام

برادرِ محترم جناب سَرْوَرؔ صاحب۔
خلوص و نیاز!
'شانِ ہند' کی حالیہ اشاعت (جون ۱۹۸۷ء) میں آپ نے جناب علی صدیقی صاحب سے "بالمشافہ گفتگو" کر کے عالمی مشاعرے کے بارے میں جو تاثرات سپردِ قلم فرمائے ہیں، وہ حقائق پر مبنی نہیں۔ آپ نے اگر مجھ سے بھی گفتگو کرنے کی زحمت فرمائی ہوتی تو اس معاملے کی صحیح تصویر سامنے آ جاتی۔ اب یہ چند سطور 'شانِ ہند' میں اشاعت کے لئے ارسالِ خدمت ہیں تاکہ قارئین اگر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہوں، تو اس کا ازالہ ہو جائے۔

۱ جناب علی صدیقی صاحب سے متعارف اور ہم کلام ہونے کا موقع مجھے آج تک نہیں ملا اور میں اُن کے دفتر میں کبھی نہیں گیا۔

۲ ۸ مارچ ۱۹۸۶ء کو جو عالمی مشاعرہ ہونے جا رہا تھا، اس کا دعوت نامہ ڈاک سے اور اس کے التوا کی اطلاع بذریعۂ تار مجھے دہلی کے ایک معروف اشاعتی ادارے کے ایڈریس پر بھیجی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ منتظمین کو میرا ذاتی ایڈریس بھی معلوم نہیں تھا۔ اس عالمی مشاعرے کے دعوت نامہ پر محترمہ جمیلہ بانو کے دستخط بہ طور کنوینر ثبت تھے اور دفتر کا ایڈریس این ۹۹ گریٹر کیلاش، پارٹ ۱ نئی دہلی دیا گیا تھا۔ یہ مشاعرہ دن کے اوقات میں منعقد ہونا قرار پایا تھا۔ میں خرابیٔ صحت کی بنا پر رات میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت سے گریز کر رہا ہوں۔

۳ میرے شعر مطبوعہ 'شانِ ہند' اپریل ۱۹۸۷ء سے میری ہجو/مبارزت کیا گیا ہے اس کی زیادہ اشتہار

ہے جو روز نامہ 'ہندوستان ٹائمز' نئی دہلی میں ۱۷ اپریل ۱۹۸۷ء کو چھپا ہے۔ اس اشتہار میں سکریٹری، کنوینر، پریذیڈینٹ یا کسی بھی عہدیدار کا نام درج نہیں اور ایڈریس تھا "۱۶۴۔ راؤز ایونیو نئی دہلی"۔

۴ 'شانِ ہند' کے اسی شمارے میں (مئی ۱۹۸۷ء) عالمی مشاعرے کے سلسلے میں ایک خط جناب اوم کرشن راحتؔ کا بھی تو چھپا ہے۔ جناب علی صدیقی صاحب نے اس خط کے بارے میں اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیوں نہیں فرمایا؟۔

۵ آپ کے بیان مطبوعہ 'شانِ ہند' جون ۱۹۸۷ء کے مطابق اس مشاعرہ کے جملہ اخراجات جناب علی صدیقی صاحب نے خود برداشت کئے ہیں۔ اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے ان کا یہ اقدام لائقِ تحسین ہے۔ اللہ کریم ان کو توفیق عطا فرمائیں کہ وہ اس بے سہارا زباں کی خدمت گزاری میں آئندہ بھی کوشاں رہیں۔
امید کہ مزاجِ گرامی بہ خیر ہوگا۔

آپ کا مخلص:۔
ساحرؔ ہوشیارپوری

برادرم عزیز سَرْوَرؔ صاحب!
خدا آپ کو بہت دیر تک سلامت رکھے۔
مئی ۱۹۸۷ء کا 'شانِ ہند' موصول ہوا۔ اس کی ظاہری اور اندرونی خوبیوں کے لئے آپ کو... دلی مبارکباد عرض کرتا ہوں۔ اُردو اکیڈمی دہلی کی طرف سے صحافت کا ایوارڈ اس سال آپ کو ملا حقیقت میں اکیڈمی کی عزت اور قدر شناسی کی صلاحیت میں اضافہ ہے۔ ایوارڈ کی تقریب پر میں اتفاقاً وہاں موجود تھا اور بلا استثنا ہر ایک کی زبان پر یہی ایک کلمہ تھا کہ "حق بہ حقدار رسید" اگرچہ یہ حق دیر میں ملا ہے میں تو خوش قسمتی سے نصف صدی سے زائد عرصہ سے آپ کا اور 'شانِ ہند' کا مدّاح ہوں کیونکہ آپ نے اُردو صحافت میں ٹھوس کام کیا ہے اور ہر معاملہ میں دیانتدارانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ اُردو ادب 'شانِ ہند' کی خدمات کا ہمیشہ ممنون رہے گا۔ آپ کو اس ایوارڈ کے لئے بھی مبارکباد عرض کرتا ہوں۔
ماہِ مئی کے شمارہ میں شاہجہاں بانو یادؔ کے متعلق آپ کا مضمون بہت ہی اچھا لگا اور پرانی... فراموش شدہ یادوں کو تازہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ یادؔ صاحبہ پرانے مشاعروں کی جان تھیں۔ اور اب بھی وہ اپنی مثال آپ ہیں۔
ڈاکٹر اودے سرن ارمانؔ کی کہانی "کرائے دار" میں پریم چند کی کہانیوں کی افادیت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ کہانی کا پلاٹ بھی بہت اچھا ہے اور ڈاکٹر ارمانؔ کی تحریر بھی دل کش ہے۔ ایسی کہانیوں سے اخلاق کی پختگی کی تبلیغ ہوتی ہے۔
آفسیٹ میں نئی ہیئت کذائی میں 'شانِ ہند' کو پیش کرنے کے لئے بھی مبارک!
'شانِ ہند' کی مقبولیت، دلکشی اور مزید خوبصورتی کی دعاؤں کے ساتھ

آپ کا بندہ
ہیرا لال چوپڑہ

سَرْوَرؔ صاحب۔ جے ہند!
آپ اس انعام کے بجا طور پر مستحق تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو اکیڈمیوں نے آپ کی اور 'شانِ ہند' کی شناخت قدرے تاخیر سے کی ہے۔ جو کام اب ہوا ہے وہ بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا بہرحال حق و صداقت کی جیت ہوئی ہے اور آپ کے قلم کا لوہا مان لیا گیا ہے۔ آپ کے سبھی دوستوں اور مدّاحوں کو خوشی ہوئی ہوگی مگر میری شادمانی کی تو کوئی انتہا نہیں ہے۔

مخلص:۔
وشوناتھ طاؤسؔ

سہیلؔ عظیم آبادی کا آخری خط

برادرم ــــ!
'شانِ ہند' کا تازہ شمارہ ملا، تمہارا مضمون پڑھا۔ اعلیٰ درجہ کے افسانہ کا مزہ آیا۔ زندہ باد۔ اگر عرصہ سے کچھ نہیں پڑھا تھا۔ ایسے مضامین کا سلسلہ جاری رکھو ــــ!

سہیلؔ عظیم آبادی

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 July 1987
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے

● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لُطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نُور محمّدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجّب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنا لیا ہے، آپ یہاں تشریف لا کر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے

نور محمدی ہوٹل، نور بلڈنگ 181/182 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳ ...

شانِ ہند

کے خوں ہند کی مٹی کو چمن کر ڈالا

آزادی ایڈیشن

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

رجسٹرڈ آف نیوز پیپرز انڈیا
رجسٹریشن نمبر ۵۰۴۴۴
رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۳۵۳
ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۶۰۲

شانِ ہند دہلی

آزادی ایڈیشن

اگست ۱۹۸۷ء

جلد ۴۸
شمارہ ۸

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر ۔۔۔
وڈیا بزکاس سرور تونسوی
طابع ۔۔۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقامِ اشاعت ۔۔۔ ماہنامہ شانِ ہند
۔۔۔ کشن داس اگروالی دہلی

خطاط
سبطین حیدر
محمد عمران

حسن کار
مصطفےٰ آرٹسٹ

قیمت فی شمارہ ۔۔۔ چار روپے
قیمت سالانہ ۔۔۔ چالیس روپے
لائف ممبری ۔۔۔ پانچ سو روپے

ممالکِ غیر میں بذریعہ سمندری ڈاک Rs 60.00
بذریعہ ہوائی ڈاک سعودی عرب
متحدہ عرب امارات اور کویت Rs 150.00
انگلینڈ، ناروے، سوئٹزرلینڈ Rs 200.00
کناڈا، امریکہ Rs 250.00

"بہار آئی گھٹا چھائی"

از فصیح الفصحا حضرت شفق رضوی عماد پوری

پڑیں بوندیں، کھلیں کلیاں، چمن پھولا، بہار آئی
بچھا سبزی کا فرشِ مخملی، اودی گھٹا چھائی

عروسانِ چمن نکھرے بدلنے کو نئے جوڑے
پہنانے کو گلے میں ہار پھولوں کے صبا لائی

اُدھر پیمانۂ ساقی صہبا شکن لایا
اِدھر زاہد نے توبہ توڑ کر کی بادہ پیمائی

بیاباں ہو گیا گلشن، گلستاں بن گیا صحرا
جنوں نے گل کھلائے، رنگ لائی آبلہ پائی

ملا پھولوں کو مژدہ خندۂ چاکِ گریباں کا
مبارک بلبلوں کو رخصتِ صبر و شکیبائی

اٹھانا ہی پڑا پیری میں خمیازہ جوانی کا
سحر ہوتے ہی اُٹھے سونے والے لیکے انگڑائی

سوا تیرے نہیں اے بیکسی کوئی تہِ مدفن
رفیقِ گوشۂ حرماں انیسِ کنجِ تنہائی

مزارِ بیکساں پر شامیانہ بن گئی حسرت
اُداسی نے غریبوں کی لحد پر چھاؤنی چھائی

نہ پہچانے کوئی اُس کو یہ ہے پہچاننا اُس کا
شناسائی کے پردے میں چھپی ہے ناشناسائی

ترے در تک پہنچ کر بھی نہ تھا سجدہ مقدر میں
یہ حسرت ہے کہ رہ کر رہ گیا داغِ جبیں سائی

جما دو رنگ پھر فیضِ امیر نکتہ پرور!
شفق ہو جاؤ پھر مدہوش دورِ جام مینائی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالاتِ حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اڈیٹوریل

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

محترم وزیر اعظم

۱۹۷۵ء میں جن حالات کے پیش نظر آپ کی والدہ محترمہ شریمتی اندرا گاندھی نے جس جواں ہمتی سے پارلیمنٹ کے نئے انتخابات کا اعلان فرمایا تھا وہ اس امر کا مظہر تھا کہ شریمتی اندرا گاندھی جمہوریت میں یقین کامل رکھتی تھیں۔

یہ دوسری بات ہے کہ وہ نہ صرف خود بلکہ کانگریس کے قریباً تمام امیدوار بری طرح ہار گئے تھے۔ مگر انھوں نے جمہوریت کو شرمندہ نہ ہونے دیا تھا۔

عین ویسی ہی حالت دس سال بعد پھر سامنے آ رہی ہے۔ اُس وقت ایمرجنسی کے نفاذ کے سلسلہ میں عوام کانگریس پر لعنت بھیجنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور اس وقت صرف اور صرف آپ کی کچھ خوشگوار اور کچھ ناخوشگوار حماقتوں کے باعث عوام کانگریس سے نالاں ہیں اور اگر آپ بھی اپنی والدہ صاحبہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قبل از وقت پارلیمنٹ کے انتخابات کا اعلان فرما دیں گے تو اب بھی وہی حشر کانگریس کا ہوگا جو اُس وقت ہوا تھا۔

پچھلے دنوں آپ کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی معلوم دے رہی تھی۔ مگر خدا کا کرم ہے کہ آپ نے چند ایسے اقدام اٹھائے ہیں جن کی وجہ سے وہ فوری خطرہ فی الحال ٹل گیا ہے جس کا امکان دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

۱۹[illegible] کے انتخابات میں شان ہند نے ووٹروں سے گزارش کی تھی کہ وہ اپنا ووٹ دیتے وقت مندرجہ ذیل حقائق کو پیش نظر رکھیں۔

۱۔ کانگریس اور دوسری جماعتوں میں سے

کون خالص جمہوری جماعت ہے۔

۲۔ ملک سے غریبی، بیماری اور دوسری سماجی برائیوں کو دور کر کے ملک کو ترقی کی راہ پر لے جانے کی صلاحیت کس پارٹی میں ہے۔

۳۔ کس جماعت کے ہاتھوں میں اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہیں۔

۴۔ انتہائی ایمانداری کے ساتھ اپنے دل کی آواز پر فیصلہ کیجئے کہ کیا اس وقت سارے ہندوستان میں کوئی بھی ایسا لیڈر ہے جو اندرا گاندھی سے بہتر طور پر وزارت عظمیٰ کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔"

مگر عوام کانگریسی حکومت کے خلاف اس قدر بوکھلائے ہوئے تھے کہ انھوں نے غصہ میں آکر حکومت کی باگ ڈور حزب مخالف کو سونپ دی۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس 'جنڈال چوکڑی' کی کرتوتوں سے ہوا جو اس وقت شریمتی اندرا گاندھی کے اردگرد ایک مضبوط ہالے کی طرح تھی۔

اس وقت بھی حالت وہی ہے کہ حزب مخالف میں کوئی بھی ایسا لیڈر نہیں ہے جو حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکے۔ اپوزیشن کے مختلف دھڑے یکجا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ اس وقت یکجا ہو بھی جائیں تو اس کی کیا گارنٹی ہے کہ جنتا پارٹی کی طرح یہ اتحاد کس وقت ٹوٹ جائے اور جوتیوں میں دال بٹنے لگے۔

اس لئے ملک کا دانشور طبقہ باوجود اس کے کہ وہ آپ سے قطعاً ناامید ہو چکا ہے، تاہم وہ جانتا ہے کہ اس وقت ملک میں آپ سے بہتر کوئی دوسرا لیڈر ایسا نہیں ہے جو بار حکومت اپنے کندھوں پر سنبھال سکے۔ اس لئے آپ اپنی ڈھل مل پالیسیوں میں پختگی لائیں۔ ملک کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے سخت اقدام اٹھائیں۔ ملک کے ٹکڑے کرنے والوں کے ناپاک ارادوں کو اس انداز میں غارت کریں جیسا کہ غداری کے مرتکب مجرموں کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔

اقلیتوں کی ہر مناسب ضرورت کو پورا کرنا حکومت کا اولین فرض ہے، مگر محض ووٹ کی خاطر اقلیتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے کرسی سلامت نہیں رہتی۔ اقلیتوں کے حقوق انھیں ملنے ہی چاہئیں مگر کسی قسم کی بلیک میلنگ سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔

ہم چاہتے ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھوں میں رہے کیوں کہ اس وقت حزب مخالف کے تمام گروپ محض کرسی کے حصول کے لئے عوام کو بے راہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جبکہ اس وقت ہندوستان کو ایک مضبوط حکومت کی ضرورت ہے اور وہ آپ دے سکتے ہیں بشرطیکہ آپ عوام کے دلوں کی دھڑکنوں، کوششیں عوام کی تکالیف کو دور کریں۔ ملک کے دیگر تمام مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ پنجاب کا ہے۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ آپ نے کبھی بھی اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بھرپور کوشش نہیں کی۔ آپ دنیا بھر کا فکر اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ مگر پنجاب میں قتل ہو رہے بےگناہ عوام کے لئے کوئی حل ڈھونڈنے کی آپ کو فرصت نہیں۔ آپ آج تک پنجاب نہیں گئے تاکہ زخمی دلوں پر پھاہا رکھ سکتے۔ مانا کہ سیکورٹی والے آپ کو وہاں جانے سے منع کرتے ہیں اور وہ کوئی جوکھم اٹھانے کو تیار نہیں ہیں۔

مگر ملک کا وزیر اعظم ہونے کے ناطے آپ کا اولین فرض ہے کہ آپ مسئلہ پنجاب کو حل کریں، کیونکہ پنجاب کے ہندو دہشت گردی کی چپیٹ میں ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ لوگ بے بسی کے برف خانوں میں لگے ہوئے ہیں اور اب تو پنجاب کا چہرہ ہی مسخ ہو کر رہ گیا ہے اور رنگ و نور کا دامن خونچکاں ہو کر آپ کو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے ؎

" پھلائیں اور دیوانہ! پھلائیں اور ویرانہ!
مجھے تو یہ عنایت آپ کی معلوم ہوتی ہے۔"

بیشک اس وقت پارلیمنٹ میں آپ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک سے نہیں جیتا سکتی کیونکہ ممبران کی تین چوتھائی تعداد آپ کے ساتھ ہے اور تقریباً ڈھائی سال بعد تک جب کہ نئے انتخابات کا وقت آئے گا، خواہ کتنے ہی کانگریس سے باغی ہو جائیں یہ وافر تعداد آپ کے ساتھ منسلک رہے گی۔ کیونکہ ان ممبران پارلیمنٹ کی زیادہ بیشتر تعداد محض راجیو گاندھی لہر جو کہ آپ کی والدہ محترمہ کے شہید ہونے کے بعد اٹھی تھی کے سنگ ریزے ہیں، جو اس لہر کی تیز رَوی کے باعث سمندر کے ماہر ساحلِ سمندر کی ریت پر آ پڑے ہیں۔ اگر آپ کی سرپرستی نہ ہوتی تو یہ لوگ کسی گاؤں کی کانگریس کمیٹی کے رکن ایسی حیثیت بھی نہ رکھتے۔

> محض ووٹ حاصل کرنے کی خاطر اقلیتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے کرسی سلامت نہیں رہتی۔ اقلیتوں کے حقوق انھیں ملنے ہی چاہئیں، مگر کسی قسم کی بلیک میلنگ سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔

لہٰذا اگر آپ اس زعم میں رہے کہ پارلیمنٹ میں اکثریت آپ کے ساتھ ہے اور آپ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پاس ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے تو بے شک نئے انتخابات یعنی دو ڈھائی سال مزید آپ وزیر اعظم رہ سکیں گے مگر اس کے بعد کیا ہوگا یہ آپ بخوبی جانتے ہیں۔

لہٰذا آپ کے لئے یہی مناسب ہے کہ آپ اپنے غیر مستند مشیروں پر تکیہ نہ رکھیں اور نہ ہی موجودہ پارلیمنٹ کی وافر تعداد پر۔ کیونکہ آپ کو وزارت عظمٰی کی کرسی پر صرف اور صرف عوام ہی بٹھائے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ عوام کی خدمت میں اپنا تن۔ من۔ دھن، سب صرف کر دیجئے ملک سے فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کرنے کے جتن کیجئے۔ اقلیتوں کے حقوق ضرور دیجئے مگر اُن کی بلیک میلنگ کا شکار نہ بنئے۔ اپنی پولیس کو سنبھالئے جسے اب اقلیتیں ہندوستانی پولیس نہیں بلکہ ہندو پولیس کہنے لگی ہیں۔ ملک کے ٹکڑے کرنے والی جماعتوں کی بیخ کنی میں کسی قسم کی رعایت نہ کیجئے، مسئلۂ پنجاب کا حل سوچئے غرضکہ جس طرح بھی ہو عوام کے دلوں میں اپنی جگہ بنا لیجئے۔

کیونکہ عوام میں ایک ایسی بے چینی ہے جو کسی بھی تبدیلی کا باعث بن سکتی ہے۔ عوام کو اس وقت ایک ایسے ہمدرد کی ضرورت ہے جو اُن کے دلوں کی دھڑکنوں کی آواز کو سنے اور اُن کی تکالیف کو دور کرے کیونکہ عوام اب حضرت فیض کا یہ شعر گنگنانے لگ پڑے ہیں ؎

"کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آجکل صورتِ بربادیِ یاراں کیا ہے"

اور جب اس قسم کے انقلابی اشعار عوام کی زبان پر آنے لگتے ہیں تو انقلاب کے قدموں کی چاپ دھیمی دھیمی سنائی دینے لگتی ہے

اُردو والوں کا خود ساختہ وفد

موقر روزنامہ منصف حیدر آباد میں ایک تصویر شائع ہوئی ہے جس کا کیپشن ہے:۔

"اُردو ٹرسٹ انڈیا کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسٹر ابوالفیض سحر کی رہنمائی میں اُردو والوں کا ایک وفد نائب صدر جمہوریہ مسٹر شنکر دیال شرما کو مبارکباد دینے اُن کی کوٹھی پر گیا تصویر میں ہمدرد کے جنرل مینیجر شمس الرب صدیقی، ڈاکٹر ایم۔ آر۔ رشید ابرار کرتپوری، واجد سحری، ذہین نقوی، حاجی رئیس دہلوی دیکھے جا سکتے ہیں"

ہر شخص کا یہ ذاتی فعل ہے کہ وہ نائب صدر جمہوریہ ہند کو مبارکباد پیش کرنے کا شرف حاصل کرے مگر محض اُردو کے نام پر شہرت حاصل کرنے کے متمنی چھ سات حضرات اُردو والوں کے خود ساختہ وفد بن کر نائب صدر جمہوریہ ہند الیسی عظیم ہستی کو یہ دھوکہ دیں کہ وہ اُردو والوں کے نمائندوں کی حیثیت سے اُنھیں مبارکباد پیش کرنے آئے ہیں نہ صرف دلی اُردو اکادمی، انجمن ترقی اُردو ہند، غالب انسٹی ٹیوٹ اور دیگر درجنوں اُردو کی فعال انجمنوں اور دلی میں اُردو کے مسلّم ادیبوں شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں کی بے عزتی و بدنامی کا باعث ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی بھی توہین ہے۔

ڈاکٹر شنکر دیال شرما مدتوں دلی میں مرکزی وزیر اور ایک معزز شہری کی حیثیت سے مقیم رہے ہیں اور انھیں بخوبی علم ہے کہ دلی میں اُردو دانشوروں کی اتنی وافر تعداد ہے جو سارے ملک میں اُردو کی رہنمائی کرتی ہے۔ نہ معلوم اُنھوں نے اُردو والوں کے اس خود ساختہ وفد کے رہنما سے یہ کیوں نہ پوچھا کہ اُن کے اس وفد میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، خلیق انجم، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، بیگم حمیدہ سلطان، ظفر پیامی، شفیع قریشی، شریف الحسن نقوی، مالک رام، کامل قریشی، حکیم عبدالحمید، یونس دہلوی، انور دہلوی، حمیدہ بیگم، گلزار اور درجنوں دیگر ہندو، مسلم اور سکھ، عیسائی اُردو دانشوروں نے شرکت کیوں نہیں فرمائی؟ کیا دلی میں اُردو اس ذلت سے زندہ ہے کہ اُردو والوں کے وفد کو ایک بھوپالی سرکار کی افسری رہنمائی کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اور وہ بھی محض اس لئے کہ یہ بھی بھوپال کا رہنے والا ہوں اور آپ بھی۔

ہمیں افسوس ہے کہ جناب ابوالفیض سحر نے محض اس ڈپلومیسی کی نسبت کے لئے کہ وہ نائب صدر جمہوریہ کے ساتھ ذاتی تعلقات رکھتے ہیں چند احباب کو اُردو والوں کا خود ساختہ وفد بنا کر دلی کے تمام اُردو دانشوروں، اُردو کے فعال اداروں اور خود اُردو کو نائب صدر جمہوریہ ہند کی نظروں میں گرانے کی ناپاک کوشش کی ہے۔

ہم نائب صدر جمہوریہ ہند کی خدمت عالیہ

میں مؤدبانہ التماس کریں گے کہ مسٹر ابوالفیض سحر کی سوانح میں جو حضرات آپ کو مبارکباد پیش کرنے آپ کی کوٹھی پر تشریف لے گئے وہ اُردو والوں کے نمائندے نہیں تھے۔ اور نہ ہی وہ

ابوالفیض سحر کے آپ خود بھی اس خود ساختہ وفد کے کسی ممبر کو اردو دانشور کی حیثیت سے نہ جانتے تھے اور نہ پہچانتے تھے۔

دلی کے اردو والے سب ملکر دلی اُردو اکادمی یا انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام آپ کو مجموعی طور پر مبارکباد پیش کریں گے۔

اُردو کُتب کی مالی امداد کیلئے مختص شدہ بجٹ کا عدم استعمال

اُردو کتب کی ترویج و مالی امداد کے سلسلہ میں حکومت ہند کے بجٹ کی کل رقم استعمال نہیں ہوئی ہے۔ گذشتہ ماہ مرکزی نائب وزیر تعلیم شریمتی کرشنا ساہی نے لوک سبھا میں مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری جناب غلام محمود بنات والا کے ایک سوال کے جواب میں کہا ہے۔ وزیر موصوف نے بتلایا کہ اس سلسلہ میں بجٹ رقم اور استعمال شدہ رقم کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سال	بجٹ رقم	استعمال شدہ رقم
۸۶-۱۹۸۵ء	۵ لاکھ	۲,۷۱,۶۵ روپئے
۸۷-۱۹۸۶ء	۳ لاکھ	۲,۰۸,۶۰ روپئے

وزیر صاحبہ نے بتلایا کہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں اردو مصنفین سے اُن کی تصانیف کی کاپیاں خرید نے پر حکومت ہند نے ۱,۷۹,۰۰۰,۷۷ روپئے خرچ کئے تھے۔ وزیر نے بتلایا کہ اب ۸۸-۱۹۸۷ء سے اردو کتب کی ترقی اور مالی امداد کی اسکیم کا نفاذ اُردو بیورو کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب اسکیم نفاذ کے لئے اردو اسٹاف کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ وزیر موصوف نے جناب بنات والا کو مزید بتلایا ہے کہ حکومت ہند اُردو کی ترقی کے لئے اُردو مصنفین سے اُن کی تصانیف کی کاپیاں خریدتی ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سال	مصنفین کی تعداد	کاپیوں کی کُل تعداد جو خریدی گئیں
۸۵-۱۹۸۴ء	۴۴	۶,۲۵۰
۸۶-۱۹۸۵ء	۲۵	۱,۱۵۵
۸۷-۱۹۸۶ء	۲۱	۱,۳۰۰

ان اعداد و شمار پر نہ معلوم جناب بنات والا نے نائب وزیر تعلیم سے یہ دریافت کیوں نہ فرمایا کہ وہ کونسی وجوہات تھیں جن کے باعث متعلقہ محکمے تخصیص شدہ بجٹ کی رقوم اُردو کتابوں کی ترویج و مالی امداد پر صرف کرنے میں سہل انگاری کا شکار ہوتے ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ بنات والا صاحب نے شریمتی کرشنا ساہی سے بجٹ کو صرف میں نہ لانے کی وجوہات کے بارے میں کچھ بھی دریافت نہ فرمایا۔ چنانچہ ہم بنات والا صاحب کی واقفیت کے لئے ذیل میں چند ایسے نکات تحریر کر رہے ہیں جن سے انہیں علم ہو سکے کہ اُردو پر صرف ہونے والا روپیہ سرکاری خزانے میں واپس کیونکر چلا گیا۔

۱۔ حکومت ہند کے محکمہ تعلیم کی طرف

سے اس کا کوئی اعلان نہیں کیا جاتا کہ اردو کتب کی ترقی و مالی مدد کے لئے وزارتِ تعلیم اردو کے مصنفین کی تصانیف کی اشاعت کے لئے مالی مدد دیتی ہے اور مطبوعہ اردو کتب مصنفین سے خریدتی ہے اور اس سلسلے کے لئے درخواستیں، مسوّدے اور مطبوعہ کتابوں کے نمونوں کی کاپیاں کس افسر کے ہاں بھجوائی جاتی ہیں۔

۲۔ افسانہ۔ ناول۔ شاعری، صحت اور دیگر عام دلچسپی کے موضوعات پر مبنی اردو کتب اس سلسلہ میں خریدنے کی مناہی کردی گئی ہے صرف تنقید وغیرہ پر مبنی کتب ہی خریدی جاتی ہیں۔ تنقیدی کتابیں ویسے ہی بہت کم شائع ہوتی ہیں اور پھر ایسی کتب کے مصنفین کو یہ علم ہی نہیں ہوتا کہ محکمۂ تعلیم کا کوئی سیل ایسا بھی ہے جو ایسی کتب کی 'بلک پرچیز' کرتا ہے۔ متعلقہ سیل کے انچارج اپنے کسی چہیتے کو نواز دیں تو دوسری بات ہے۔

۳۔ جناب الفریڈ جگت سنگھ نے بڑی تحقیق کے بعد 'مشیرِ خوراک' (غذائی مسئلے کا حل) عنوان سے کتاب شائع کی جس کی اہمیت اور انفرادیت کا اعتراف کرتے ہوئے دہلی اردو اکادمی نے اس کتاب پر انعام دیا۔ مگر جب الفریڈ جگت سنگھ اپنی یہ کتاب لے کر متعلقہ دفتر میں گئے تو درجنوں چکر لگوانے کے بعد یہ جواب دیا گیا کہ اس موضوع پر کتابیں اپرووَل پر لینے کی اجازت ہی نہیں کیونکہ ہندوستان میں اب کھادیہ پدارتھ کے بھنڈار بھرے پڑے ہیں اور خوراک کی کوئی کمی ہی نہیں تو 'غذائی مسئلہ کا حل' ایسی کتاب کی کیا ضرورت ہے! حالانکہ امسال سوکھے کی وجہ سے حکومت کو جھک مار کر یہ اعلان کرنا پڑا ہے کہ گوداموں کے بھنڈار بھرے پڑے ہیں مگر اب سوکھے کی وجہ سے شادی کی تقریبات میں مہمانوں کی تعداد پر پابندی لگائی جائے اور ہوٹلوں وغیرہ میں دو سے زیادہ چیزیں کھانے کو نہ دی جائیں۔

۴۔ جب بھی کوئی مصنف اپنی تصنیف اپرووَل کے لئے متعلقہ دفتر میں دینے گیا تو اسے کسی نہ کسی بہانے واپس کردیا گیا۔ اوّل تو ریسپشن والے اس سیل کے انچارج کے ہاں جانے نہیں دیتے تھے۔

۵۔ مسٹر کے۔ کے۔ کھلر کے اس سیل سے جانے کے بعد کوئی ساؤتھ انڈین افسر اس سیل کا انچارج بنایا گیا جس نے نہ معلوم اردو والوں سے کس جنم کے بدلے لئے کہ اردو کی کوئی کتاب اپرووَل کے لئے لی ہی نہ گئی ہاں کوئی ایک دو سفارشی ایسا کام کر سکے ہوں تو یہ دوسری بات ہے۔ چنانچہ ۸۷-۱۹۸۶ء میں صرف ۲۱ مصنفین اس سیل تک پہنچ کر کامیابی حاصل کر سکے۔

اردو دشمنی حکومتِ ہند کے اکثر کارکنان کا روزمرّہ مشغلہ ہے اور وہ کسی نہ کسی طور اردو کو نقصان پہنچانے میں لگے رہتے ہیں۔

سنا ہے کہ اب یہ سیل محکمۂ تعلیم نے ختم کر دیا ہے اور ترقیِ اردو بورڈ کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ اردو کتابوں کی بلک پرچیز کا کام بھی سنبھال لے۔ خدا کرے کہ ترقیِ اردو بورڈ کے کارکنان محض اپنے چہیتوں اور دوستوں کو ہی نوازنے کا نیک کام انجام نہ دیں بلکہ حقداروں تک ان کا حق پہنچنے دیں۔ ترقیِ اردو بورڈ کی ڈائرکٹر محترمہ فہمیدہ بیگم صاحبہ سے امید تو یہی ہے کہ وہ حق و انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسی کتب کی خریداری میں کسی طور غفلت کا عمل دخل نہ ہونے دیں گی بلکہ جو کتابیں واقعی حکومتِ ہند کے محکمۂ تعلیم کی لائبریریوں کیلئے موزوں ہوں گی ایسی کتب کی مناسب پذیرائی کریں گی۔

غزل

روی بھاردواج

ہائے یہ میرے رنگیں جسم پہ رینگیں چمکیلے سانپ
ہنستے ہنستے حسن کی جھیل دیکھے رنگ رنگیلے سانپ

میرے بدن کے روم روم میں زہر اگلتے رہتے ہیں
تیرے مدھر مدھر شبدوں کے زہریلے زہریلے سانپ

ٹھنڈی آہیں ٹھنڈی سانسیں ہجر کے ٹھنڈے ٹھنڈے سائے
میرے سینے میں پلتے ہیں برفیلے برفیلے سانپ

زلف کے گہرے گہرے سائے خواب سنہری آنکھوں کے
تنہائی میں اکثر ڈستے ہیں یہ کالے پیلے سانپ

بھولے بھالے الھڑ جوبن بھولی بھالی نظریں شوخ
مری گلی میں گھوم رہے ہیں شرمیلے شرمیلے سانپ

کوئی یار ہے کوئی دوست ہے کوئی دشمن کوئی رقیب
میری باہوں سے لپٹے ہیں زہریلے زہریلے سانپ

چاہے مانو انھیں دیوتا چاہے انھیں کہو شیطان
سانپ تو یارو سانپ ہیں گے سانپ ہیں یہ زہریلے سانپ

میرے اشکوں کے دریا سے جب چنچل موجیں ابھریں
وہ چیخے بچاؤ اے لوگو آئے گیلے گیلے سانپ

وعدوں کی دھندلی تصویریں یادوں کے میلے نقشے
رَوی مرے دل میں بستے ہیں دردیلے دردیلے سانپ

ہشیار بنو!

ڈاکٹر حقیر آستانی

ظلمت شب نہ بنو، مطلع انوار بنو
بخت خوابیدہ نہیں، دانش بیدار بنو

زندگی یوں بھی تو آسان نہ تھا جی لینا
اس پہ جیتے کہ سمجھ بوجھ کے دشوار بنو

کچھ تو ہو روح کی تسکین کا باعث یارو
لب کی شیرینی بنو، نرمیٔ گفتار بنو

دشمن جاں ہیں سبھی، بغض و عناد و نفرت
مہر و اخلاص و مروت کے طرفدار بنو

دیکھتے دیکھتے ہو جاتے ہو تم بے قابو
بات ہی بات میں آمادۂ پیکار بنو

جنگ اپنوں سے لڑی جاتی ہے اپنے پن میں
شرط یہ ہے کہ کبھی جیت کبھی ہار بنو

دیکھو پو پھوٹنے والی ہے بہت جلد حقیر
اٹھو تم بھی کسی غم دیدہ کے غم خوار بنو

اردو شاعری میں حُبُّ الوطنی

یف علوی عاصی کیرانوی

اردو زبان بڑی زندہ تابندہ زبان ہے ... وقت اور سماج کی بہترین عکاس ... اس کی پوری تاریخ اس حقیقت ... اردو شاعری نے ہمیشہ اور ہر دور ... معاشرے اور سماج کی تصویر کشی کی ... دور کے حالات اور جذبات کی ... پیش پیش رہی ہے۔ کیونکہ ہندوستان ... تہذیب و تمدن کی پیداوار ہے اور اس ... اس برِ صغیر کی آغوش میں آنکھیں ... یہیں کی آب و ہوا میں پروان چڑھی، اس ... وطن سے اردو کو دلی محبت اور فطری لگاؤ ... ہے کہ اردو ادب اور کلچر کا خزانہ ... کے گہر پاروں اور حُبّ الوطنی کے ... سے بھی مالا مال ہے۔ ہمارے شعراء ... کی ایک بڑی تعداد خاص طور سے دور ... دورِ جدید میں حبِ قومی سے سرشار اور ... کے جذبات سے مست و بیخود نظر آتی ہے۔ حُبّ الوطنی ایک نہایت ہی پاک اور متبرک ... ہے اور اس کے کئی پہلو اور گوشے ہیں۔ وطن ... سے محبت، اس کی فضاؤں اور ... سے دلبستگی، اس کی تعمیر و ترقی میں تن دہی ... وطن کی آزادی کے حصول کے، تحفظ

کے لئے قربانی، ابنائے وطن اور سربرآوردگانِ قوم کے لئے سچی عقیدت اور خلوص وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب وہ بنیادی نقطے اور نقوش ہیں جن سے حُبّ الوطنی کی تصویر بنتی اور سنورتی ہے اور حبِ قومی کا محل تعمیر و استوار ہوتا ہے۔

جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے اُسے کسی زاویہ اور پہلو سے دیکھا اور پرکھا جائے اس کے یہاں حُبّ الوطنی اور قوم پرستی نہایت ہی پُرخلوص جذبات اور احساسات کے ساتھ ملتی ہے۔ اس میں دیش بھگتی کے ترانے بھی ہیں اور اس کی خاک اور اس کے ذروں سے محبت بھی۔ اس میں قومی اصلاح اور وطن کی آزادی کے حصول اور اس کے تحفظ و تعمیر کے ولولے بھی ہیں، سربرآوردگانِ وطن کے لئے خلوص و عقیدت بھی اور سربراہانِ قوم کے لئے عزت و احترام بھی اور سچ تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اردو شاعری کا سر دوسرے شعری کارواں سے اونچا اور بلند نظر آتا ہے۔

چونکہ قومی یکجہتی و ہم آہنگی اور حُبّ الوطنی کے جذبات و احساسات کے تشخص و تعمیر میں آزادی کی تحریک اور اس کی جد و جہد سے ایک خاص رشتہ اور تعلق ہے اس لئے اردو شاعری میں حُبّ الوطنی اور دیش بھگتی بالخصوص اسی تحریک کے ساتھ ابھرتی اور چمکتی نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں

حبِ قوم پرستی اور دیش کی آزادی کے جذبات میں ایک خاص نکھار آیا اور غلامی کے جوئے کو اُتار کر وطن کو آزاد کرانے اور آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہونے کے تصورات میں ایک جوش پیدا ہو تو ہماری اردو شاعری میں بھی اس کی صدا لہرا اُٹھنے لگی اور اہلِ وطن کو گدگدانے لگی۔

ان نئے رجحانات اور قومی جذبات کی ترجمانی اردو شاعروں کے لئے ایک فطری عمل تھا چنانچہ وقت کے تقاضے اور سماج کے مصلح مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے حبّ الوطنی سے دلوں کو گرمانے اور نغمہ ہائے قومی سے سرشار کرنے کے لئے نہایت جرأت مندانہ قدم بڑھایا۔ یہ وہ وطن پرست شعراء ہیں جنھوں نے باقاعدہ وطن پرستی اور قوم کی گذشتہ عظمتوں کی بازیابی کو موضوع سخن بنایا اور اہلِ وطن کو بلا تفریق مذہب و ملت باہمی میل و محبت کا درس دیا۔ اس سلسلہ میں حالی کی بے شمار نظمیں منہ بولتی تصویر ہیں۔ ان کی نظم "حبِّ وطن" اس موضوع کا خاص شہپارہ ہے جس کا ایک ایک شعر اور ایک ایک لفظ جذبۂ وطن اور قومی اصلاح کا آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں:

"اے وطن! اے مرے بہشتِ بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
تیری اک مُشتِ خاک کے بدلے

لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے "

اس نظم میں آگے چل کر حالی صاحب ہموطنوں کو حسن خلوص سے باہمی محبت اور رواداری کا سبق دیتے ہیں، وہ ربط باہم اور قومی ہم آہنگی کا بہترین درس و پیام ہے۔ کہتے ہیں:

" تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہوں مسلمان اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو!
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو "

مولانا محمد حسین آزاد ایک نئے انداز میں وطن دوستی اور قوم پرستی کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور نوجوانوں میں "ہمت رواں" اور "جوشِ فراواں" کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

یارو چلو چلو! یہ کرو انتظار تم
کرتے ہو کیا امیدِ یمین و یسار تم
میدانِ عزم و رزم کے ہو شہسوار تم
بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر بار بار تم
چلا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو

آزاد اور حالی کے بعد اکبر الٰہ آبادی بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے انگریزی قوم کے اجتماعی مزاج اور اس کے انفرادی اطوار کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھا تھا اور اس کے متعلق زیادہ قطعی اور صحیح نظریہ رکھتے تھے۔ اکبر نے اپنے قومی تاثرات اور احساسات کا اظہار طنزیہ پیرائے میں کیا ہے، جس میں کہیں کڑواہٹ اور کہیں ظرافت کی چاشنی ہے۔ اس سے ان کے دل کی اس کسمساہٹ کا پتہ چلتا ہے جو وہ اہلِ وطن کی مغرب پرستی اور اپنی قومی اقدار کے دم توڑنے پر محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ وہ وطن کی لٹی ہوئی روایات پر اس طرح ماتم کناں نظر آتے ہیں ؎

" کٹی رگِ اتحادِ ملت، رواں ہوئیں خونِ دل کی نہریں
ہم اس کو سمجھے ہیں آبِ صافی، نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں
کہاں وہ اب لطفِ باہمی ہے محبتوں میں بہت کمی ہے
چلی یہ کیسی ہوا الٰہی کہ ہر طبیعت میں برہمی ہے "

مشرقی بتلوں میں خدمتگزاری کی امنگ
" مغربی گٹکوں سے شانِ خود پسندی آشکار
مصلحت آمیز ہر طرزِ فریقِ انتظام
حکمت آگیں ہر ادائے حاکمانہ نامدار "

پہلی جنگِ عظیم کے بعد بین الاقوامی اور ملکی سطح پر کئی اہم واقعات رونما ہوئے جنھوں نے ہماری آزادی میں ایک تیزی بھی پیدا کر دی اور واضح سمت بھی دے دی۔ ان واقعات نے بین الاقوامی سطح پر اشتراکی نظام کا آغاز، ملک میں خلافت کی تحریک، انگریزی حکومت کی ناانصافیاں اور ترکِ موالات وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ ان واقعات کے ردِ عمل نے بڑی شدت سے ہندوستان میں حب الوطنی اور وطن پرستی کے جذبات کو ہوا دی۔ اس نئی بیداری کی عکاسی اردو شاعری میں بھی فطری تھی۔ چنانچہ اس دور میں حب الوطنی اور دیش بھگتی کا ایک ایسا نمایاں اور روح پرور عکس سامنے آیا، جو حبِ قومی ہی کی نہیں بلکہ اردو ادب کی شان اور اس کا قیمتی خزانہ ہے اور اس دور کے شاعر اردو دنیا کے بہترین معمار اور وطن کے مشہور پرستار ہیں۔ ان میں علامہ اقبال، برج نارائن چکبست، مولانا حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، روش صدیقی، تلوک چند محروم اور دوسرے بہت سے وہ شاعر اور اہلِ قلم ہیں جنھوں نے ان سبھی موضوعات اور مسائل پر قلم اٹھایا اور اپنے شعری اور تخلیقی فن پاروں سے ہماری قومی اور وطن پرستی کی فکری تاریخ مرتب کی۔

اس سلسلہ میں علامہ اقبال کا "وطن کا ترانہ" ایک زندۂ جاوید گوہر پارہ ہے۔ جس میں ہندوستانی عظمت کے اظہار کے ساتھ قومی یکجہتی اور وطن پرستی کا بیش بہا پیام موجود ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا "

اس دور میں جو اردو شاعری میں قومی اور ملی شاعری کا ایک نیا جوش پیدا ہوا، اس نے ہماری شاعری کو مختلف پہلوؤں سے متنوع بھی کیا اور بیش بہا جواہر پاروں کی دولت بھی دی۔ چکبست ایسے ہی وطن پرست شاعروں میں ہیں جنھوں نے وطن کی عظمت اور حرمت کے لئے گرانقدر تخلیقات دیں۔ ان کی نظم "صورِ حبِ قومی" اسی سلسلہ کا ایک بہترین شاہکار ہے جس کا لفظ لفظ حبِ وطن میں ڈوبا ہوا اور عظمت و شان کا ایک ...

" ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کا
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کا "

اس رنگ میں کہنے والوں میں حامد اللہ افسر میرٹھی بھی ایک مشہور قومی شاعر ہے۔ انھیں وطن سے والہانہ محبت تھی۔ وہ یہاں کے موسم، دریا، جنگل یہاں تک کہ ذرّوں کو بھی قابلِ تعظیم سمجھتے تھے اور یہی ان کی شاعری کی اساس اور بنیاد تھی۔ انھوں نے بے شمار وطن کی عظمت و توقیر کے نغمے لکھے جن سے اردو کی نصابی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

وطن کے سلسلہ میں اس دور کا دوسرا رنگ، بدیسی حکومت کے خلاف باغیانہ اور انقلابی جذبات کی عکاسی تھی۔ احسان دانش بڑے عوامی اور عوامی شاعر تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی تصنیفات میں "باغی کا خواب" ان کا ایک ایسا ہی شہپارہ ہے جس میں دانش صاحب نے ایک نئے انداز سے انگریزی حکومت کے جبر و استبداد کا خاکہ کھینچ کر دیش کی آزادی کے لئے علمِ بغاوت بلند کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

" اٹھو تلواریں اٹھاؤ عسکری انداز سے
اپنے حصے کا رے ... آسمان کے ساز ...
اب ہمارے ساتھ ہیں ارض و سما کی قوتیں

آج ہیں مجبور بندوں میں خدا کی قوتیں
بزدلی کا مجرم کر سکتی نہیں فطرت عات
صاف یاں ہر سو نظر آنے لگے میدان صاف "

اس سلسلہ میں جوش ملیح آبادی کا نام بھی ہماری قومی شاعری میں ایک بڑے ممتاز اور منفرد مقام کا حامل ہے۔ اُن کی بے شمار تخلیقات سے ہماری رگ رگ میں حب الوطنی کا لہو دوڑایا اور قومی یادگار اور باغ کے جذبہ کو بیدار کیا۔ اس زمرہ میں ان کی ایک مشہور نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" ایک بڑی معرکتہ الآرا اور انقلابی نظم ہے جس نے اس دور میں غیر ملکی حکومت کے ایوانوں کے در و دیوار ہلا دیئے تھے۔ اس کے آخری چند شعر اس سلسلہ کے بہترین گوہر پارے ہیں۔

" حیراے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی "

جوش ملیح آبادی کی اس موضوع پر اور کئی انقلابی اور قومی تخلیقات ایسی ہیں جو ہماری قومی شاعری کا انمول سرمایہ ہیں۔ ایک دوسری نظم میں وہ اس طرح انقلاب کی دعوت دیتے ہیں ؎

" اُٹھو اک ان تاریکیوں سے سرخیاں پیدا کریں
اس زمیں کی پستیوں سے آسماں پیدا کریں
زرستاں میں خون دہقاں سے امیروں کے نزاع
اٹھو کے دہقاں کے نفس سے آندھیاں پیدا کریں "

ایک اور نظم "شکستِ زنداں کا خواب" میں آپ اس طرح انقلاب کی آمد کی خبر دیتے ہیں ؎

" کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیکھو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گیا
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں اور ٹوٹ رہی ہیں زنجیریں "

قومی شاعری میں فراق گورکھپوری بھی اپنے ایک منفرد مقام کے حامل ہیں انھوں نے بھی مختلف انداز اور پہلوؤں سے حب الوطنی کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کی ہے۔ اُن کی رباعیات میں ہند کی تاریخی عظمت اور بین الاقوامی انفرادیت ملاحظہ کیجئے ؎

" اے مادرِ ہند صبح تری تیری شام
ہیں ساقیٔ دوراں کے چھلکتے ہوئے جام
لمحوں میں ترے رازِ ابد ہے پنہاں
تیری ہر سانس ہے اک پیغامِ دوام "

" ہر فرقہ و ہر ملت و ہر مذہب و دیں
سب نے جائے پناہ پائی ہے یہیں
اولاد میں ممتا جھلکتی ہے تیری
دنیا کی مادرِ وطن ہے یہ سرزمیں "

۱۹۴۷ء کے بعد آزادی کا خیر مقدم کرنے والوں اور اُسے خوش آمدید کہنے والوں میں کروڑوں اہلِ وطن کے ساتھ ہمارے اردو شعراء کا قافلہ بھی پوری طرح نغمہ خواں نظر آتا ہے۔ اس نشاطِ ثانیہ کے بعد بلا شبہ ہزارہا نظمیں آزادی کے استقبال اور خیر مقدم میں لکھی گئیں ان میں آزادی کی خوشی اور مسرت بھی ہے اور نئی ذمہ داریوں کے قبول کرنے کی تلقین بھی۔ اسی کے ساتھ ایک خوش آئند مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے لئے دعوت عزم و عمل بھی۔ آلِ احمد سرور کی اسی سلسلہ کی ایک نظم کے چند شعر ہیں:

" یہ مقدس دن یہ صدیوں کی تمناؤں کا عطر
کتنے خوابوں کا دیا کتنی امیدوں کی کرن
اس کی پیشانی کی زیبائش رہا ہے کیسے
حل ہوا کتنے شہیدانِ وطن کا بانکپن "

یہ مبارک دن ہمارے کئے دستور کا ہے
اک ادائے سرفروشی اک نوائے سینہ تاب
روحِ گوتم کی طہارت ذہن اکبر کا شکوہ
قلب کا مدھی کی حرارت فکرِ نہرو کا شباب

دن ہے یہ تجدیدِ پیمانِ محبت کے لئے
دعوتِ تازہ ہے ہر حسنِ تعمیر کے لئے۔

آزادی کے بعد بھی برابر اردو شعراء اور اربابِ شعر و فن قومی زندگی کے ہر موڑ پر عوامی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کر رہے ہیں آزادی سے ہم کنار ہونے کے بعد ہمارے کندھوں پر جو ذمہ داریاں آئیں اور قومی تعمیر و ترقی کی راہ میں جس عزم و عمل کی ضرورت ہے اُن پر اردو شعراء کی بڑی فراخدلانہ نظر ہے۔ چنانچہ اس دور کی شاعری پر اگر نظر ڈالی جائے تو وطن پرستی اور حب الوطنی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں وہ سب ہماری شاعری میں پوری طرح اور بہ حسن اسلوب جھلکتے ہیں۔ وطن کی عظمت اور اس کے پرچم کی بلندی، اس کے جانبازوں اور شہیدوں سے خلوص و عقیدت، وطن کی تعمیر و ترقی کے لئے جوشِ عمل کی دعوت، اس کی عزت و توقیر کی بقا کے لئے سرفروشی کی تلقین، یہ سب اس دور کی اردو شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

ڈاکٹر تنویر علوی جو اس دور میں اردو دنیا کے چیدہ محققین میں ہیں اور ایک عظیم مفکر و شاعر بھی، اپنی ایک نظم میں نہایت خلوص سے بھارت کے پرچم کو سلامِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

" یہ گلِ حبِ وطن یہ ملک کے دل کی امنگ
قوم کی عظمت کا پیکر یہ ستونِ زینت
مشترک تہذیبِ قومی کے نشاں ہوا سکے سنگ
اسکے سائے میں لڑی ہے ہم نے آزادی کی جنگ
اس مسلسل جہد کو اس سعیٔ پیکر کو سلام
اس نشانِ عہدِ اس بھارت کے پرچم کو سلام

کرشن موہن کی نظم "میرا وطن" میں ہندوستان کی عظمت کی عکاسی اور تہذیبی ہم آہنگی دیکھئے:۔

ہے مرکزِ علم و فن جنت نشاں ہندوستاں میرا وطن
گہوارۂ روحانیت یہ درسگاہ فکر و فن
راحت بداماں امن و امان کا یہ رنگیں چمن
اب صیدِ رنگ و غم نہیں یہ وادیٔ گنگ و جمن
تھا محو پہلے سوچ میں اب مائلِ ایجاد ہے

ن پہ لوٹ ہے مسرور ہے دل شاد ہے "

غر نظامی حب الوطنی قوم پرستی اور حُبِّ الوطنی
ہن و فکر کی ہم آہنگی کا مظہر ہے
قومی رنگ بھی بے شمار تخلیقات کہیں
ں کی مشترکہ تہذیبی اقدار کی مختلف انداز
ں کی۔ اپنی ایک نظم "رُکے نہ کارواں"
ہیں ؎

رواں ہے ملّتوں کی عظمتوں کا کارواں
ہبوں تمدنوں روایتوں کا کارواں
ں ہے شنکھ کی صدا کہیں ہے نغمۂ اذاں
صلیب کا نشاں کہیں ہلال کا نشاں
نشان سربلند دار حمند و زرفشاں
رُکے نہ اپنا کارواں

سکندر علی وجد اپنی ایک مایہ ناز کاوش
نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے
بھی شاعرانہ انداز میں اس طرح
ہے

سازِ تر ہے یہ جدید ہے فسانے
لئے ہیں لئے آگہی کے پیمانے
قتوں میں یہاں ڈھل رہے ہیں افسانے
کو راہ دکھاتے ہیں تیرے دیوانے
ہدوں کا ہوا ارجمند ہو کے رہا
ے وقار کا پرچم بلند ہو کے رہا۔

ی سلسلہ میں طپش صدیقی کی نظم "حدیثِ
قابلِ ذکر ہے۔ جس میں ہندوستان کو
ے بانیانِ مذہب ارباب علم و دانش اور
آگہی کا گہوارہ بتایا گیا ہے۔
یہ رام و لکشمن یہیں بڑھے جواں ہوئے
یہ نانک و کرشن مدہ گہر فشاں ہوئے
سور و تلسی و کبیر نغمہ خواں ہوئے
یتن و وارث و نظام حق بیاں ہوئے
بم و صابر و کلیم نکتہ داں ہوئے
تیر میر و مرزا و ارباب جاں ہوئے

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من "

حُبّ الوطنی اور وطن پرستی اس وقت تک
ادھوری اور تشنہ رہتی ہے جب تک شہیدانِ وطن
اور سرفروشانِ قوم کو نذرانہ ہائے عقیدت پیش نہ
کئے جائیں اور وطن پر جاں نثار کرنے والوں کی محبت
کے ترانے نہ گائے جائیں۔ اُردو شاعری حُبِّ
قومی کے اس پہلو میں بھی آگے ہے۔ اردو دنیا کا
ہر وہ شاعر جس کے دل میں قوم کی محبت اور وطن
پرستی کا صحیح جذبہ موجود ہے شہیدانِ ملک و قوم
کو عقیدت و خلوص کے نذرانے چڑھاتا ہوا نظر
آئے گا۔ سعادت نظر کی نظم "جنگِ آزادی کے
شہیدوں کی خدمت میں نذرِ عقیدت" کے دو بند
ملاحظہ فرمایئے ؎

اے شہیدانِ وطن اے سرفروشانِ وطن
مرحبا صد مرحبا اے جاں نثارانِ وطن
ہے تمہارے خون سے رنگیں گلستانِ وطن
کھل گئیں کلیاں چمن پر ابرِ رحمت چھا گیا
دُور کر زنگینیوں میں موسمِ گُل آ گیا

آفریں تم پر کہ تم نے یوں وطن پر جان دی
جیسے پروانوں نے شمعِ انجمن پر جان دی
بلبلوں نے جیسے گلہائے چمن پر جان دی
بن گئے تمہید تم صبحِ بہاراں کے لئے
کر دئیے خوں میں جشنِ چراغاں کے لئے۔"

خداداد مونس کی نظم "شہیدانِ وطن کے نام"
کے دو بند دیکھئے۔ کس انداز سے شہیدانِ قوم کو
گلہائے عقیدت پیش کئے گئے ہیں۔
خون سے ہو گئیں گل رنگ فضائیں جن کی
اُن شہیدانِ وطن کو مری جانب سے سلام
کیا مٹائے گا اُن اللہ کے بندوں کو کوئی
موت خود لائی ہے جن کے لئے جینے کا پیام

یہ وطن تم پہ ہے نازاں کہ شہیدو! تم نے
دے کے خوں ہند کی مٹی کو چمن کر ڈالا
لاکھ بیغارہوئی تم پہ نہ ہٹے ایک قدم
مرحبا! تم نے ادا حقِ وطن کر ڈالا "

ایک سچے وطن پرست اور محبِّ قوم شاعر کا
دل نسبتاً زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ جہاں وطن کی
خوش حالی اور فصلِ بہاراں کو دیکھ کر خوشی سے جھومتا
اور نغمہ سرا ہوتا ہے وہاں پر ذرا بھی اگر آنچ
آتی ہے اور اس کے صاف شفاف دامن پر اگر ذرا
بھی دھبہ دکھائی دیتا ہے تو وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ یہی
صورتِ حال اُردو کے وطن دوست اور قوم پرست
شعراء کی ہے۔ آزادی کے بعد اس کے نیصان اور
عرفان کے جو خواب آنکھوں نے دیکھے تھے جب وہ
بکھرنے لگے اور ہندوستان میں اندرونی خلفشار
اور فرقہ وارانہ نفرت کی ہوائیں چلنے لگیں تو قوم
پرست اردو شاعروں کے دل کو ٹھیس پہنچی اور اس
نے مختلف انداز سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔
عاصی کیرانوی کی نظم "تصویرِ آزادی" میں اسی کی
عکاسی دیکھئے :۔

ادھوری ہے ابھی انسانی کی تصویرِ آزادی
نہیں پہنچی ہے سب تک جام و سبوئے آزادی
ابھی تک بیشمار خار و گل باقی ہے گلشن میں
ابھی تک کاغذی تحریر ہے تحریرِ آزادی
ابھی تک زندگی ہے سرنگوں طاقت کے ایوان میں
ابھی مخصوص کچھ ہاتھوں میں ہے جاگیرِ آزادی۔

جناب قمر مراد آبادی کے اس سلسلہ میں
تاثرات دیکھئے۔
ابھی ہے آئینۂ ذہن و دل بھی گرد آلود
تعصبات کے شعلے ابھی بھڑکتے ہیں
عروسِ امن کا ماتھا ہے داغدار ابھی
چمن چمن ابھی نفرت کے آگ بہتے ہیں

میر مشتاق اپنی نظم "بیانِ حال" میں
اس طرح ماتم کناں ہیں ؎
یہاں کوتاہئ عزم و عمل کے ہیں شکایت بھی
چمن والوں کو راس آئی نہیں فصلِ بہار اب بھی

وہی سَیلِ حوادث ہے وہی مَوجِ تلاطم ہے
گُلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں نوکِ خارِ اب بھی "

قاری اسحاق حافظ سہارنپوری وطن کے اس بحران پر یوں سوز خوانی کرتے ہیں ؂

کیسا دور ہے جس کو دیکھو
لرزاں لرزاں بیکل بیکل
کیسے ہنسیں، کیسے مُسکائیں
من ہے ہمارا بوجھل بوجھل
کتنے سہاگ جلے ہیں دیکھو
آگ لگی ہے آنچل آنچل

اگرچہ اُردو شعراء وطن کے اس خلفشار اور بحران سے کبیدہ خاطر ضرور ہیں اور یہ حُبّ الوطنی اور قوم پرستی کا ایک فطری تقاضا بھی ہے، تاہم شکستہ دل اور مایوس نہیں ہیں۔ یہ حضرات ملک و قوم میں نئی رُوح پھونکنے اور نئے جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے قلم فرسا ہوتے ہیں اور دیش کی عظمت و توقیر کے تحفظ کے لیے بڑے اعتماد و عزم سے کہہ اٹھتے ہیں۔ عاصی کیرانوی کی نظم "آؤ ہم عہد کریں" کا بند ملاحظہ ہو ؂

اپنے آدرش کو قربان نہ ہونے دیں گے
چاکِ انساں کا گریبان نہ ہونے دیں گے
قلبِ گیتی کو پریشان نہ ہونے دیں گے
شعلوں سے نذرِ گلستان نہ ہونے دیں گے
آؤ ہم عہد کریں، عہد کریں، عہد کریں "

جلال مرادآبادی کے اس سلسلہ میں عزم و ارادہ دیکھئے ؂

ہم درسِ مساوات و وفا دیتے رہیں گے
مانا کہ زمانے میں ستم جاگ اٹھے ہیں
ہم وقت کی آواز پہ لبیک کہیں گے
کہہ دو یہ زمانے سے کہ ہم جاگ اٹھے ہیں "

تلک زادہ منظور کی نظم "عزمِ جواں" کا یہ بند اس سلسلہ کا بہترین آئینہ دار ہے ؂

گیتا سے سبق بھی لیتے ہیں قرآں کی زباں بھی رکھتے ہیں
گوتم کی صدا، نانک کی کتھا، چشتی کی اذاں بھی رکھتے ہیں
ٹیپو کا علم بھی ہاتھ میں ہے ارجن کی کماں بھی رکھتے ہیں
منظور بتا دو دُنیا کو، ہم عزمِ جواں بھی رکھتے ہیں
جب آنچ وطن پر آتی ہے تلوار اٹھایا کرتے ہیں

آج کے دَور میں جب دیش کو مختلف چیلنجوں کا سامنا ہے اور وطن بڑے نازک دَور سے گذر رہا ہے حُبّ الوطنی اور قوم پرستی کا یہی تقاضا ہے کہ ملک میں قومی ایکتا، ہم آہنگی اور باہمی میل ملاپ کے قدروں کو اجاگر کیا جائے اور ہندوستان کی سالمیت اور اتحاد کی عظمت کو ابھارا جائے۔ چنانچہ ہمارے اُردو شعراء وقت کے ان اہم تقاضوں کو بڑی سختی سے محسوس کر رہے ہیں اور بڑے جوش و خروش اور نہایت خلوص کے ساتھ قومی یک جہتی اور فکری ہم آہنگی کی اقدار کو زندہ و تابندہ کرنے کی کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اس دَور کی ہماری اُردو شاعری دیش کی سالمیت اور قومی ایکتا کا بہترین عکس و آئینہ ہے۔ کاشف گنڈکوی کی نظم "ہندو مسلم ایک ہیں" میں ان جذبات کی عکاسی دیکھئے ؂

دونوں چمن کی زینت گلشن کی شان دونوں
روحِ چمن ہیں دونوں گلشن کی جان دونوں
ہو شوکتِ وطن کے تم آسمان دونوں
ہندوستاں کی دیکھو ہو آن بان دونوں
منزل سے کیوں بھٹکتے ہو بار بار دونوں
ہو جاؤ ایک کر لو آپس میں پیار دونوں

اس سلسلہ میں حضرت رتن پنڈوری اپنی ایک نظم میں اس طرح درسِ رفاقت دیتے ہیں ؂

یہ تفریق و تنفر یہ تعصب کیا وطن والو
نگاہوں میں ہے صیاد کا کھٹکا وطن والو
بدل ڈالو اس آپس کی رقابت کو رفاقت سے
بدل ڈالو غبارِ دل کو اخلاص و محبت سے
کتابِ زندگی میں اُنس کا عنوان بن جاؤ
بظاہر آدمی تو ہو مگر انسان بن جاؤ

یہی یک جہتی اور قومی ایکتا کا سبق شا[...] اپنی ایک نظم "ایکتا" میں شاعرانہ انداز سے [...] طرح دیتے ہیں ؂

سب ایک گگن کے متوالے سب ایک زمیں کے پیارے
سب ایک ہی سورج کی کرنیں سب ایک ہی چاند کے تارے
وہ اُتر ہو یا دکھن ہو ست رنگ دھنک تو ایک ہی
وہ پورب ہو یا پچھم ہو پھولوں کی مہک تو ایک ہی

اسی موضوع پر عاصی کیرانوی کی نظم [...] میں بھی یہ پیام کتنے پیارے انداز سے مل رہا ہے

ہیں تو نا قوس و اذاں دونوں کی ہے آواز ایک
شیخ ہو یا برہمن دونوں کی ہے پرواز ایک
دَیر ہو یا ہو حرم ہے دونوں کا اعجاز ایک
ایک انداز نظر ہے ایک شانِ انجمن
ایک ہے میرا گلستاں ایک ہے میرا چمن

غرض کہ ہماری اُردو شاعری حُبّ ا[لوطنی] اور قوم پرستی کے میدان میں سب سے منا[سب] منفرد مقام رکھتی ہے۔ ہمارے اُردو شعراء نے [وطن] کی عظمت و توقیر کے ہر ہر پہلو سے گیت گا[ئے] پیغام گو بجائے ہیں اور ہر ایک پہلو سے قو[م] کو زندہ و تابندہ بنایا ہے۔ غلامی کے دَور میں بڑی جراٴتِ رندانہ اور ہمّت مردانہ کے ساتھ تو[می] پرچم بلندی اور سرفروشی کی تلقین کی ہے، آزادی کے بعد دیش کی تعمیر و ترقی اور اس کی [حفاظت] کے لیے تن، من، دھن سے آگے آنے کا بھی [پیغام] دیا ہے۔ ہندوستان میں باہمی خلفشار اور ا[نتشار] پر اگر اُردو شعراء دُکھی اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں [تو] آج کے تقاضوں کے تحت قومی یک جہتی اور فر[قہ] وارانہ ہم آہنگی اور ملک کی سالمیت اور اتحاد [کے] لیے بھی جس خلوص و محبت کے پیام دے رہے [ہیں] وہ اُردو ادب ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے قو[می] ادب میں ایک بیش بہا اور قابلِ فخر مقام کا [حامل] ہے۔

WITH
BEST
COMPLIMENTS
FROM

K. L. NARANG
(SAQI)

FAIRDEAL IMPEX INDIA

REP-LICENCE NEGOTIATORS
EXPORT HOUSE CONSULTANTS

L-4, CONNAUGHT CIRCUS
NEW DELHI-110001

Phones . 311562-312364 Res 6418040
Telex 031-3980 SAQI IN

ایک طوائف جو

جنگِ آزادی کی مجاہدہ بن گئی

کمل سوگانی

جنگِ آزادی میں وطن کی خاطر مر مٹنے والوں میں ایک طوائف بھی ہے جس نے فرنگی حکومت کے چھکے چھڑانے کے لئے اپنا پیشہ چھوڑ، ہاتھ میں ننگی تلوار تھام لی تھی۔

یہ طوائف ریاست بہار کے "آرا" ضلع میں رہتی تھی۔ لوگ اسے گلاب کلی نام سے جانتے تھے۔ بڑے بڑے جاہ و ثروت والے افراد اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی دہلیز پر بھکاریوں کی طرح پڑے رہتے تھے۔ یہ مجسم حسن کی دیوی گلاب کلی رقص و موسیقی کے لئے دور دور تک مشہور تھی۔ اسے حسن و جمال خود کام دیوتا نے بے حساب دیا تھا۔ نوٹوں کی گڈیوں سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے بے بہا تحائف کے درمیان، گلاب کلی کا حسن و شباب کتنے ہی فرنگی افسران کو اپنے یہاں پانی بھرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ انگریزی فوج کے بہت سے افسر بھی اس کے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اکثر سے تو اس کا بہت ہی گہرا تعلق تھا۔

۱۸۵۷ء میں گلاب کلی کو بیسواں برس لگا۔ اس موقعہ پر جگدیش پور نام کی ریاست کے حاکم کنور سنگھ نے اسے اپنے یہاں مدعو کیا۔ رات کے وقت بہت چمکیلے کپڑے پہن کر گلاب کلی مجرا کر رہی تھی۔ ناچتی ناچتی وہ بابو کنور سنگھ کے سامنے کسی بھاری تحفہ کی امید میں آ بیٹھی۔ کنور سنگھ نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا لیکن یہ کیا! وہ تو اڑ گئی! ضد ٹھان بیٹھی "آج تو میں بابو صاحب سے انگور کی شراب، اور کوئی قیمتی تحفہ پائے بنا ذرا بھی آگے نہ بڑھوں گی۔"

کنور سنگھ نے لاکھ سمجھایا، لیکن وہ نہ مانی، بولی "آپ جو بھی دیں گے اسے میں خلوص دل سے قبول کر لوں گی، پر کچھ لئے بنا بڑھوں گی نہیں اس در سے آگے۔"

بابو کنور بولے، "خدمت کرو، میرے پاس تمہارے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔"

یہ سن کر وہ مضبوط لہجہ میں بولی۔ "بابو صاحب، ایک ادنیٰ سی بندی، آپ کے پاؤں کی جوتی ہوں میں، پر آج من میں کچھ ایسا آ ہی گیا ہے۔"

اب بابو کنور نے کہا "سوچ لو، یہ ضد مہنگی پڑے گی۔ تم گھبرا کر پیچھے تو نہیں ہٹ جاؤ گی؟"

وہ بولی "سوغات تو دیں، باندی جان کی بازی لگا دے گی، وہ ہٹے گی نہیں، ذرا بھی پیچھے نہیں۔"

بابو کنور سنگھ نے بائیں ہاتھ سے اس کی داہنی ہتھیلی اپنے سامنے کھینچی اور داہنے ہاتھ سے اپنی تلوار کھینچ کر اس پر رکھ دی۔

"یہ ننگی ہے، اس کی میان بھی بابو صاحب" گلاب کلی پُرسکون لہجہ میں بولی۔ کنور سنگھ نے میان بھی دے دی۔ "میں بھی ننگی ہوں بابو صاحب"، گلاب کلی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اس کے کہتے ہی کنور سنگھ نے اپنا انگرکھا اتار کر اسے اڑھا دیا۔

طوائف نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے تمام چمکیلے کپڑے چیر کر پھینک دیئے اور اسی انگرکھے کو سر سے پیر تک لپیٹ کر بابو کنور سنگھ کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اس کا مجرا اسکی طوائفانہ زندگی وہیں ختم ہو گئی اور لگا جیسے ایک نئی گلاب کلی کا جنم ہوا۔

اب وہ بابو کنور سنگھ کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی۔ بابو صاحب کو اس کا پتہ بھی نہ ہوتا۔ بابو صاحب نے اس کے لئے ایک نیا گھر لے دیا۔

اب وہ اُسی میں رہتی تھی ۔ گھر میں وہ بابو صاحب کنور سنگھ سے اُن کی گلاب کلی کے روپ میں ملتی تھی ۔ لیکن اس کے علاوہ وہ سپاہی کے بھیس میں مردانہ روپ اختیار کر کے اُن کے ساتھ باڈی گارڈ بن کر رہتی ۔ اس راز سے بھی بابو کنور سنگھ بے خبر تھے ۔

بابو کنور سنگھ اور انگریزوں میں فیصلہ کُن جنگ کالپی میں ہوئی ۔ جنگ کے خاتمہ پر مرنے والوں کی آخری رسومات اور زخمیوں کی دیکھ بھال کی غرض سے بابو صاحب اپنے معاونوں کے ساتھ میدان میں پہنچ گئے ۔ ایک کراہ کی سمت مُتوجہ ہوتے ہی انھیں لگا کہ یہ تو اُن کا پیارا محافظ ہے ۔ وہ بُری طرح زخمی تھا ۔ بابو صاحب نے اس کی تیمارداری کا حُکم دیا ۔ لیکن اُس نے کہا میرا وقت اب پورا ہو گیا ہے ۔ کچھ بھی کرنے سے اب فائدہ نہیں ہے ۔ آپ پر کیا گیا وار اپنے اوپر لے کر میں دھنیہ ہو گئی ۔ اب میں جا رہی ہوں ۔"

رہی ہوں سُن کر بابو کنور چونکے لیکن انھیں پہچاننے دیر نہیں لگی ۔ وہ تو اُن کا محافظ نہیں بلکہ اُن کی اپنی گلاب کلی ہے جو محافظ کے روپ میں اب تک اُن کی ہر لڑائی میں سائے کی طرح اُن کے ساتھ رہی تھی ۔

جیسے ہی کنور سنگھ نے اس کے پاس بیٹھ کر اُسے جی بھر کر دیکھنا چاہا تو وہ سسکتے ہوئے کہنے لگی "میرے آقا! میرے سرتاج! یہ رہی آپ کی امانت اِسے میں نے اپنی جان سے بھی بڑھ کر مانا ۔ اس کی مریادا کو سنبھال کر رکھا ہے" گلاب کلی کی ہتھیلی پر بابو کنور کی دی ہوئی کٹار تھی ۔ وہ وِداع ہو رہی تھی ۔ جاتے جاتے اُسے کنور سنگھ نے اپُراشک خراجِ عقیدت پیش کیا ۔

بھارت کی جنگ آزادی کے مجاہدوں میں سرفروش " گلاب بائی" کا نام بھی امر ہے ۔

●●

غزل

اس تکلف سے نوائے صبح سرگم بن گئی
مُنہ پہ ہر نورس کلی کے آگ شبنم بن گئی
خنجروں کے رقص کی وہ گردشِ پیہم نہ پوچھ
اس قدر کجلا گئی دھرتی کہ نیلم بن گئی
دیکھنا افسوں زدہ مُوئے قلم کا حُسنِ فن
شُعلۂ جوّالہ سر تصویرِ آدم بن گئی
برگ و بر پر دھوپ کی آتش فشانی دیکھ کر
شاخ یوں مہکی کہ گویا سُرخ پرچم بن گئی
مُفلسی کی لاج رکھ لی برچھیوں کے سحر نے
بارشِ خوں سینۂ عُریاں پہ محرم بن گئی
اس سلیقہ سے سجا کر دھجیاں رکھ دی گئیں
ہر گلی شہرِ ہوس کی ایک البم بن گئی
عین فصلِ گُل میں تھی تخلیق کس فن کار کی
اک تڑپتی لاش اور سِنگھار موسم بن گئی
نیند کا اب تک نہ اترا تھا کچھ آنکھوں سے خمار
اور اِدھر بیدار کی دنیا جہنم بن گئی
شمس اگھر باہر جدھر دیکھو فضا مسموم ہے
جاں کنی کی سی گھٹن تقدیرِ عالم بن گئی

●

احمد حسین شمس

غزل

واقف عروض سے ہیں نہ ماہر زباں کے ہیں
ہم دِل کی بات کہتے ہیں شاعر کہاں کے ہیں
کہتے ہیں شاعر اور زبانوں میں بھی غزل
احساں بہت زبانوں پہ اُردو زباں کے ہیں
الفاظ میں ڈھلے تو وہ اشعار بن گئے
دل پر ہمارے فیض جو سوزِ نہاں کے ہیں
بھٹکے ہوئے ہیں راہ میں کچھ ہیر پھیر سے
جائیں گے ایک روز وہیں ہم جہاں کے ہیں
مذہب کا نام لیتے ہیں بیکار خود پرست
ناقوس کے فساد نہ جھگڑے اذاں کے ہیں
طفلی ہے کھیل عہدِ جوانی ہے مثلِ خواب
پیری ہے جس کا نام وہ دن امتحاں کے ہیں
حامیٔ اتحاد ہمیشہ رہیں گے ہم
اُردو زباں ہماری ہے ہندوستاں کے ہیں
قشقہ کہیں ہے تو کہیں نقشِ سجود ہے
پہلو عبادتوں میں بھی نام و نشاں کے ہیں
جس کو عزیز معصیتِ سخن مانتے تھے لوگ
تلمیذ ہم ادیب اسی نکتہ داں کے ہیں

●

ادیب لکھنوی

غزل

مجھے اب عشق کرنا آ گیا ہے
پری چہروں پہ مرنا آ گیا ہے
غزل میں رنگ بھرنا آ گیا ہے
جگر کا خون کرنا آ گیا ہے
حوادث سے گزرنا آ گیا ہے
مجھے دب کر اُبھرنا آ گیا ہے
مری تدبیرِ پیہم اللہ اللہ
مُقدّر کو سنورنا آ گیا ہے
خزاں کے فضل سے اے فصلِ گُل اب
مرے زخموں کو بھرنا آ گیا ہے
اُلجھ کر مجھ کو ہر موجِ بلا سے
سفینہ پار کرنا آ گیا ہے
تری رحمت کے بل بوتے پہ یارب
خطا پر ناز کرنا آ گیا ہے
کچھ اب اقرار کی صورت بنی ہے
اُنھیں انکار کرنا آ گیا ہے
ہمارے دوستوں کو آرزو اب
نمک زخموں میں بھرنا آ گیا ہے

●

اندرجیت آرزو

شوقی جالندھری

قومی اتحاد

رُخِ انساں نکھر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں ،
سماج اپنا سنور جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

تعصّب کا جو اِک چڑھتا ہوا طوفاں ہے ذہنوں میں
یقیناً یہ اُتر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں

جلاتا پھر رہا ہے بستیاں جو بے گناہوں کی
وہ فتنہ خود ٹھہر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں

یہ خود غرضی ، یہ فرقہ پروری ، رشوت کی یہ ناگن
ابھی بے موت مر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں

جو دھندلا ہو چلا ہے چہرۂ انسانیت یارو
بہر صورت نکھر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں

عداوت کا جو اِک اُٹھتا ہوا طوفاں ہے ذہنوں میں
دبے پاؤں گزر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں

جو اِک ناسور بن کر پھیلتا جاتا ہے ہر دِل میں
وہ زخمِ کہنہ بھر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں

بہاتا ہے جو خوں انسان کا انسان کے ہاتھوں
وہ شیطاں خود ہی مر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں

حسد ، بد گوئی ، بد خواہی ، تفرقے اور بے دینی
یہ شیرازہ بکھر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں

نہ کوئی لوٹنے پائے ، کسی اَبلا کی عِصمت کو
بہ عزّت اپنے گھر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں

نہ سامانِ سفر لوٹے کوئی اے شوقؔ راہوں میں
مُسافِر بے خطر جائے ۔ اگر ہم ایک ہو جائیں ،

اُردو اکادمی دہلی کی سرگرمیاں سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء

سالانہ ایوارڈ

سال سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں پانچ دانشوروں کو ان کی گرانقدر خدمات کے عوض اکادمی کا سالانہ ایوارڈ پیش کیا گیا۔

ادیبوں و فنکاروں کو پینشنز

سال سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں دس افراد یا اُن کے پسماندگان کو چار سو روپیہ ماہوار کے حساب سے پینشن دی گئیں۔

طالب علموں کو انعامات اور وظائف

سال سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں ۴۸ طالب علموں کو انعامات اور ۲۷ طالب علموں کو وظائف دیئے گئے۔

اسکولی سطح پر تعلیمی مقابلے

پرائمری، مڈل سیکنڈری و سینئر سیکنڈری اسکول کے درمیان تعلیمی مقابلے منعقد کرائے گئے۔ ۱۵۵ کامیاب طالب علموں کو اکادمی کی سند اور تمغات دیئے گئے

ادبی سیمنار / ورکشاپ

سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں اردو ریسرچ اسکالرز، نئی تعلیمی پالیسی اور اُردو تدریس، ڈاکٹر ذاکر حسین — قومی و ادبی خدمات، اردو شاعری کی ہندی اصناف اور اردو مرثیہ پر (کل ہند) سیمنار منعقد کرائے گئے۔

مشاعرے

یوم جمہوریت اور یوم آزادی کے موقعوں پر کل ہند مشاعرے منعقد کرائے گئے نیز ابھرتے فنکاروں، اردو اساتذہ اور بہادر شاہ ظفر کی یاد میں طرحی مشاعرے بھی منعقد کرائے گئے

اشاعتی پروگرام

سال سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں اکادمی کی جانب سے ۱۱ کتابیں شائع کی گئیں۔ ۱۳ کتابوں کی اشاعت میں اکادمی نے مالی تعاون دیا۔ اکادمی نے اُردو تاجران و ناشرین کی ایک بین الاقوامی ڈائریکٹری بھی شائع کی ہے۔

تعلیمی پروگرام

دہلی کے مختلف علاقوں میں غیر اُردو داں عوام کے لیے چھ مراکز قائم ہیں جہاں روزانہ شام بغیر معاوضہ اُردو سکھائی جاتی ہے خواتین کے دو مراکز بھی قائم کئے گئے ہیں۔

سال سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں دہلی کے ۳۳ اردو میڈیم اسکولوں میں مختلف مضامین کے ۸۰ اساتذہ کا تقرر کیا گیا۔

۳۳ اُردو میڈیم اسکولوں کی لائبریریوں میں رسالے اور کتابیں فراہم کی جاتی ہیں۔ دہلی کے مختلف علاقوں میں اخبارات کے ۲۰ گوشے قائم کئے گئے ہیں، نیز مختلف علاقوں میں قائم ۲۴ لائبریریوں میں اکادمی اردو کتابیں فراہم کرتی ہے۔

ماہانہ پروگرام

شام غزل، شام موسیقی، اُردو ڈرامے اور بزم قوالی کی محفلیں نیز دیگر ثقافتی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا۔

شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ شامیں منائی گئیں جن میں غیر ممالک سے آنے ہوئے شعرا کے اعزاز میں شعری نشستیں بھی شامل ہے۔

ادبی پروگراموں کے لئے تعاون

سال سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء میں چار کالجوں کی "بزم ادب" کو تعاون دیا گیا نیز دہلی کی ۵۰ ادبی انجمنوں کو بغرض ادبی تقاریب مالی تعاون پیش کیا گیا۔

دریا گنج نئی دہلی
ٹیلی فون۔ ۲۷۶۲۱۱

المشتہر
سید شریف الحسن نقوی
سکریٹری اُردو اکادمی، دہلی

हिन्दी अकादमी, दिल्ली

ہندی اکادمی دلی

منصوبے اور پروگرام

۱۔ ادیبوں کو اعزازات ۔
۲۔ ادیبوں کی مالی معاونت ۔
۳۔ ادبی نگارشات پر انعام ۔
۴۔ تعمیری ادب اور ادبی تخلیق کے لئے مالی معاونت / گرانٹس وغیرہ ۔
۵۔ ہندی سویم سیوی سنستھاؤں اور سنگھٹھنو وغیرہ کی مالی معاونت / گرانٹس وغیرہ ۔
۶۔ چھوٹے اخبارات ورسائل کی مالی معاونت / گرانٹس وغیرہ ۔
۷۔ ریسرچ اسکالروں کے لئے وظائف (دلی کے ادب، لوک ادب پر) ۔
۸۔ ابھرتے ہوئے قلم کاروں کے لئے انعامی مقابلے ۔
۹۔ طالب علموں کو انعامات ۔
۱۰۔ ادبی مذاکرے / اجلاس / نمائش ۔
۱۱۔ تعلیمی مذاکرہ / تعلیمی اجلاس ۔
۱۲۔ یوم جمہوریت کوی سمیلن ۔
۱۳۔ یوم آزادی کوی سمیلن ۔
۱۴۔ راج بھاشا سمیلن ۔
۱۵۔ برہد ساہتیہ سمیلن ۔
۱۶۔ ہندی سویم سیوی سنستھاؤں کا سمیلن ۔
۱۷۔ ماسک ساہتیکی کاریہ کرم ۔
۱۸۔ ہندی دِوس / سپتاہ کا آیوجن ۔
۱۹۔ ہندی کے اہم ادیبوں / شاعروں وغیرہ کے جنم دن یا ساہتیہ کار جینتی کا آیوجن ۔
۲۰۔ اُبھرتے سوَر یُوا کوی سمیلن ۔
۲۱۔ اساتذہ کوی سمیلن ۔
۲۲۔ پروتساہن پرتی یوگتاؤں نبندھ / سلیکھ / ٹائپ / آشولپی / واد وِواد وغیرہ کا آیوجن ۔
۲۳۔ بال کوی سمیلن ۔
۲۴۔ ایکتا گیت پرتی یوگتا (اسکولی طلباء کے لئے)
۲۵۔ اسکول اور کالجوں میں ملاجلا منعقدہ پروگرام ۔
۲۶۔ بھاشا وبھاگ کے ساتھ ملاجلا پروگرام ۔
۲۷۔ اُردو اور پنجابی اکادمیوں کے ساتھ لسانی اور قومی یک جہتی کی بنیاد پر ملاجلا پروگرام ۔
۲۸۔ ہندی سویم سیوی سنستھاؤں کے ساتھ ملاجلا اور سہیوگی کاریہ کرم ۔
۲۹۔ ریڈیو اور دوردرشن پر پرایوجت کاریہ کرم ۔
۳۰۔ دلی ساہتیہ کاروں کی ڈائرکٹری کی اشاعت ۔
۳۱۔ ہندی منوئل کی اشاعت ۔
۳۲۔ پانڈو لپی سنگرہ اور پرکاشن ۔
۳۳۔ "پتریکا" کا پرکاشن ۔
۳۴۔ بچوں کے لئے دلکش ادب کو پروتساہن اور پرکاشن ۔
۳۵۔ دلی کے لوک گیتوں، کہانیوں اور دیگر ادبیات کی ترتیب اور اشاعت ۔
۳۶۔ ہندی کے پرچار پرسار کے لئے دیگر اشاعتیں ۔
۳۷۔ لائبریریوں اور دارالمطالعوں کا قیام ۔ (مرکزی اور علاقائی پستکالیوں / واچنالیوں کی استھاپنا)
۳۸۔ ہندی کیندروں کا قیام (ہندی ٹائپ، آشولپی اور ہندی بھاشا کی تدریس / تربیت کے لئے) ۔
۳۹۔ بھاشا کاریہ شالا یوجنا ۔ (ہندی ترجمہ ہندی ٹیچنگ آیکھن کی تربیت کے لئے)
۴۰۔ انوواد یوجنا (ہندی زبان کے دلکش ادب کا دیگر ہندوستانی زبانوں میں اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے دلکش ادب کا ہندی میں ترجمہ)
۴۱۔ طلباء کو ماہانہ وظائف کا پروگرام ۔
۴۲۔ انٹرویو اور لسانیاتی مباحثے ۔
۴۳۔ ادیبوں کے انٹرویو اور ٹیپ تیار کرنا ۔
۴۴۔ پرتبھاؤں کی کھوج ۔
۴۵۔ ہندی فلم یوجنا (قومی اور جذباتی ہم آہنگی کے اور بھارتیہ سنسکرتی کے پرچار کے لئے)
۴۶۔ لوک پرو ہندی کارکنان سمیلن کا آیوجن ۔
۴۷۔ نیتک راج بھاشا سمیلن کا آیوجن ۔
۴۸۔ ہندی شکشک پرسکار یوجنا ۔
۴۹۔ بیس سوتری یوجنا کے تحت خصوصی پروگراموں کا آیوجن (پسماندہ اور دیہی علاقوں میں)
۵۰۔ ہندی ادیبوں کا مختلف مقامات کا دورہ (ہندی کے پرچار، پرسار اور آپسی آدان پردان اور کھوج کے لئے)
۵۱۔ ساہتیہ کار سانندھیہ سنگوشٹھی ۔
۵۲۔ ہندی میلا اور پردرشنی (یوم ہندی کے موقعہ پر)
۵۳۔ سائنسی اور دیگر تکنیکی اور جدید موضوعات پر ہندی ادب کی تخلیق کو پروتساہن ۔
۵۴۔ طلباء اور عوام میں قومی ایکتا اور دیش پریم کے جذبہ کو بڑھاوا دینے کے لئے آدرش ساہتیہ کی تخلیق و تعمیر ۔
۵۵۔ ہندی طلبا کا میتی یوجنا ۔
۵۶۔ ہندی انوسندھان یوجنا ۔
۵۷۔ ہندی سمپرک سیوا ۔
۵۸۔ ہندی آشولیکھ یوجنا ۔
۵۹۔ ہندی ویڈیو تربیت یوجنا ۔
۶۰۔ دیگر پرچار اور پرسار سے متعلق ۔

ڈاکٹر ماسلی دھ پانی والے
سکریٹری ہندی اکیڈمی دلی

۲۴۲۷ سنڑانٹ الشنورنس بلڈنگ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ ٹیلی فون نمبر

جشنِ جمہوریت

کندن لال گرِدھر

یہ دِل کچھ اور کہتا ہے، زباں کچھ اور کہتی ہے
حقیقت اور ہے کچھ، داستاں کچھ اور کہتی ہے

کہو تم جی میں جو آئے، چلو ہم مان لیتے ہیں
زبانِ خلق پر اے مہرباں! کچھ اور کہتی ہے

جو آنکھیں دیکھتی ہیں، وہ تو لب پر آ نہیں سکتا
خموشی بن کے لیکن مہرباں! کچھ اور کہتی ہے

سُنا تو تھا، بہارِ گلفشاں، گلشن میں آ پہنچی
مگر یہ چیختی بادِ خزاں، کچھ اور کہتی ہے

یہ وعدہ تھا، چمن میں ہر نشیمن بے خطر ہوگا
سَروں پر کوندتی برقِ تپاں، کچھ اور کہتی ہے

دلاسہ ناخدا کا ہے، سفینہ ہے لبِ ساحل
مگر ہر موجِ بحرِ بے کراں، کچھ اور کہتی ہے

بجا فرماں مسیحا کا، مریض اب رُو بصحت ہے
عزیزوں کی مگر آہ و فغاں، کچھ اور کہتی ہے

چمن زاروں میں بوم و زاغ کے غوغے فلک رس ہیں
چمن زادوں کی لب بستہ فغاں، کچھ اور کہتی ہے

مناؤ جشنِ آزادی، مبارک نغمۂ شادی
مگر سُن لو کہ جنتا نیم جاں، کچھ اور کہتی ہے

بتاؤ کچھ تو اِس دھرتی پہ جنت لانے والو اب!
یہ دھرتی بن کے کیوں شعلہ فشاں، کچھ اور کہتی ہے

شہیدوں کی چتاؤں سے صدا کچھ اور اُٹھتی ہے
لبِ ستلج کی یادِ رفتگاں، کچھ اور کہتی ہے

دو رنگی ہی سیاست ہے یقیں اِس کا ہو کیا گرِدھر؟
وہاں کچھ اور کرتی ہے یہاں کچھ اور کہتی ہے

قطعہ تاریخ

حصولِ اعزازِ صحافت منجانب اُردو اکادمی دہلی

مبارک باد کی اُٹھیں صدائیں — مِلا سَرورؔ کو اعزازِ صحافت
نویدِ جاں فزا پھیلی جہاں میں — مسرت کو ہوئی حاصل مسرت
نکلتی ہے دُعا یہ ہر زباں سے — خُدایا اور دے سَرورؔ کو شہرت
قناعت بُردباری، رحم کوشی — ہے عظمت آشنا اُن کی سخاوت
بیاں میں ہے حقیقت آفرینی — قلم کے زور میں شانِ صحافت
نجابت اُن کے دروازے کی درباں — عطا کی ہے خُدا نے وہ شرافت
جبھی تحریر میں ہے دِل پذیری — کہ ہر اِک لفظ ہے عینِ صداقت
غریبوں بے نواؤں کے مُعاون — ادا کرتے ہیں مُحتاجوں کی حاجت
صحیفہ کی نگارش اُن کا حِصّہ — ہے "شانِ ہند" خود اِس کی شہادت
کئے جاتے ہیں سُکڑے دَور میں بھی — دلیرانہ ادب اُردو کی خدمت

دُعا بھی ہے رتنؔ تاریخ بھی ہے
بڑھا یا ربّ! تو سَرورؔ کی جسارت

۱۹۸۷ عیسوی

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

مستقل کالم

تاسیں سال ہوئے قنوج (یو پی) میں یک مشاعرہ منعقد ہوا۔ منتظم مشاعرہ نے شعراء ی رنگینیں قنوج کی عطر بیز سرزمین پر اپنے شاعرانہ کمالات دکھانے کے لئے میدان میں اتار دیں۔ در خدا کی قسم مشاعرہ اتنا بہترین اور کامیاب ہوا کہ مدت تک ایسا لاجواب مشاعرہ دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔

کے روایتی مالک مکان تھے گر صدا آواز میں کہنے لگے کہ مجھ سے تو اس لوگوں نے چند گھنٹوں کے لئے جگہ مانگی تھی اور کہا تھا کہ صرف مشاعرہ شروع ہونے تک کے لئے جگہ دیجئے۔ میں تو ان لوگوں کو جانتا بھی نہیں۔

شاعروں کا طائفہ قنوج کی گلیوں میں بے یار و مددگار پھر رہا تھا اور انہیں کوئی چائے

ایجارج اور کچھ دوسرے حضرات نے ان شعراء کو دوپہر کا کھانا کھلوایا۔

عام طور پر شعراء حضرات کسی نہ کسی طرح مقام مشاعرہ تک پہنچنے کا زادِ راہ لے کر گھر سے نکلتے ہیں اور جائز طور پر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ مشاعرہ میں شرکت کے بعد طے شدہ معاوضہ تو ملے گا ہی لہٰذا واپسی کے زادِ راہ کی فکر کرنے کی

عیار منتظمین مشاعرہ

شخصیات، واقعات، تاثرات،

یہ مشاعرہ صبح چار بجے ختم ہوا اور زیادہ سے زیادہ پانچ دس منٹوں میں شامیانے، بجلی کے قمقموں کی لڑیاں، ٹیوب لائٹس، دریاں، اسٹیج وغیرہ سب غائب۔ منتظم مشاعرہ کا کہیں پتہ نہیں شعراء قیام گاہ پر واپس گئے تو وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ مالک مکان نے فرمایا کہ مشاعرہ ختم ہو چکا اب آپ لوگ یہاں نہیں رہ سکتے لہٰذا واپس چلے جائیے۔

بیچارے شعراء نے حیرت سے مالک مکان سے مشاعرہ کے منتظم اور کنوینر مشاعرہ کے بارے میں پوچھا تو یہ صاحب جو خالص قسم

پلانے والا بھی نہیں تھا۔ یاد صاحب فرمانے لگیں سرور بھائی مجھے تو اندور ریڈیو پر آج رات کو مشاعرہ میں شرکت کرنی ہے۔ اس لئے میں تو جا رہا ہوں۔ ایاز جھانسوی بھی اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ یاد تاکید کر گئیں کہ منتظم مشاعرہ کو چھوڑیئے گا نہیں سب کے پیسے دلوا دیجئے گا۔

مجھے اور روحی صاحب کو سیٹھ چندر گپت صدر میونسپل بورڈ اپنے ہاں لے گئے۔ میرے کہنے پر سیٹھ صاحب نے بے یار و مددگار شعراء کو چائے پلوائی اور ناشتہ کا بھی انتظام کرایا۔ اصغر علی محمد علی عطر والوں کی قنوج شاخ کے

کیا ضرورت ہے۔ مگر میں اور روحی جب بھی کسی مشاعرے میں جاتے تو ہمیشہ آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ معقول رقم اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ جہاں جا رہے ہیں وہاں کی کوئی چیز مشہور ہو تو اُسے خریدنے میں دقت نہ ہو۔ یا دورانِ سفر کوئی ضرورت پیش آجائے۔

لہٰذا شعرائے کرام میں جن دو چار حضرات کے ساتھ ہمارے ذاتی تعلقات تھے انھیں زادِ راہ دے کر پہلی گاڑی سے ہی بھجوا دیا گیا۔ مگر ان کے علاوہ چالیس شعراء میں سے

پچیس سے زائد تو لکھنؤ، کانپور، بارہ بنکی وغیرہ کے تھے لہٰذا دو بہت سے کھانے سے پہلے چند حضرات سے کہہ کر اطرافِ لکھنؤ کے جملہ شعراء کو دس دس روپے دے کر رخصت کر دیا گیا۔ اور رات تک باقی ماندہ شعراء کو بھی اپنے اپنے دُور دراز مقامات پر واپس جانے کا انتظام کر دیا گیا

ایڈیٹر شانِ ہند، مشاعرہ کے بعد تین دن قنوج میں سیٹھ چندر گپت کا مہمان رہا اور اِس دوران ضلع فتح گڑھ، یوپی، کے کلکٹر سے مل کر یہ سارا معاملہ اُن کے سامنے رکھا۔ جنھوں نے قنوج کے پولیس انچارج کو مُناسب ہدایات جاری کرنے کے بعد وعدہ فرمایا کہ وہ اِن بدقماش منتظمینِ مشاعرہ کو سبق سکھائیں گے کہ پھر وہ ایسا نہ کر سکیں اور اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جملہ شعراء کو مجوزہ معاوضہ بعد میں منی آرڈر سے موصول ہوا۔

ضلع ٹمکور (کرناٹک) میں غالباً ۱۹۷۵ء میں کسی ادبی انجمن کی طرف سے ایک شاندار مشاعرہ منعقد کئے جانے کا اعلان اخبارات میں کیا گیا اور شعرائے کرام کو جو دعوت نامے بھجوائے گئے تھے اُن میں نہایت عاجزی کے ساتھ یہ اِستدعا کی گئی تھی کہ "ہمارے شہر میں پہلی بار یہ عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ جناب سے قوی توقع ہے کہ اِس مشاعرہ میں شریک ہو کر ہماری عزت افزائی فرمائیں گے۔ اخراجاتِ آمد و رفت اور قیام و طعام کی جملہ سہولیات کے علاوہ دو صد روپیہ نذرانہ پیش کیا جائے گا۔"

اس دعوت نامہ پر تاریخ مقررہ پر جملہ مدعو کردہ شعرائے کرام کا جمِ غفیر ٹمکور پہنچا تو ٹمکور کو مشاعرہ کے پوسٹروں اور بینرز سے آراستہ پایا۔ مگر کسی شاعر کے بھی قیام و طعام کا کوئی انتظام کسی جگہ بھی نہیں تھا۔ آخر کار شعراء کا یہ قافلہ کسی نہ کسی طرح منتظمینِ مشاعرہ کے گھروں پر پہنچا تو ایک منتظم نے بتایا کہ مشاعرہ کے خازن معہ رقم کے دو دن سے غائب ہیں اِس لئے مشاعرہ کا انعقاد ممکن نہیں۔ اِس پر شاعروں نے واپسی کے اخراجات کا مطالبہ کیا تو جواب ملا کہ حالات کچھ ایسے ہی ہیں کہ آپ کا یہ مطالبہ بھی قابلِ قبول نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ شعراء بیچارے بے نیل و مرام نہ معلوم کیسے کیسے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چند منچلوں نے عوام اور شاعروں کو اُلّو بنا کر سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق اس طرح سات ہزار روپیہ بٹور لیا۔

غالباً ۱۹۶۹ء یا ۱۹۷۰ء میں آندھرا پردیش کے ایک تعلقہ میں بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ وہاں کے منتظمینِ مشاعرہ نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ شعرائے کرام کے ہر مطالبہ کو بخوشی منظور کر کے دعوت نامہ بھجوا دیا گیا۔ اگر کسی شاعر نے فرسٹ کلاس کے کرایہ کا مطالبہ کیا تو سر آنکھوں پر اسے قبول کر لیا گیا اور اگر کسی نے یہ لکھا کہ میں دو سو نہیں، پانچ سو روپیہ معاوضہ علاوہ جملہ اخراجات کے لوں گا تو وہ بھی قبول کر لیا گیا۔ حالانکہ اُنہی دنوں پانچ صد روپیہ معاوضہ حضرت جگر ایسے شعرائے کرام کو پیش کیا جاتا تھا۔ مگر منتظمین نے پیشگی کسی شاعر کو ایک پیسہ بھی نہ دیا۔ حالانکہ اکثر و بیشتر شعراء نے نصف یا چوتھائی معاوضہ اخراجاتِ سفر کے لئے پیشگی طلب کیا تھا۔ مگر واہ رے منتظمینِ مشاعرہ کہ کسی شاعر کو ایک پیسہ پیشگی دیئے بغیر سب کے سب شعرائے عظام کو مشاعرہ میں شرکت کے لئے راضی کر لیا گیا۔ اگر دو چار نے پیشگی کے لئے ضد کی تو انھیں کورا جواب دے دیا گیا کہ چونکہ اس سے پہلے کچھ شعراء نے پیشگی رقم لے کر مشاعرہ میں شرکت نہیں فرمائی اس لئے کمیٹی نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ کسی شاعر کو بھی پیشگی نہیں دی جائے گی۔ اور اگر آپ بغیر پیشگی مشاعرہ میں شرکت نہیں فرما سکتے تو پھر ہماری طرف سے معذرت قبول کرتے ہوئے دعوت نامہ منسوخ سمجھا جائے۔"

چنانچہ یہ جواب پا کر پیشگی کی ضد کرنے والے شعراء بھی دعوت نامہ منظور کرتے ہوئے مشاعرہ میں شریک ہوئے۔ جونہی کوئی شاعر اسٹیشن پر گاڑی سے اُترتا تو منتظمین کی طرف سے بِلّے لگائے ہوئے رضا کار اُن کا استقبال پھولوں کے ہار سے کرتے اور اسٹیشن سے باہر لا کر شاعر صاحب کو رکشا یا ٹانگا میں بٹھاتے اور رکشا والے کو اٹھنی اور ٹانگے والے کو ایک روپیہ کرایہ دے کر کہتے کہ انھیں فلاں ہوٹل میں لے جایئے اور شاعر صاحب کو نہایت عاجزی اور نیاز مندی سے کہتے کہ آپ ہوٹل میں اپنی پسند کا کمرہ لے لیجئے۔ صبح آپ کے معاوضہ کے ساتھ ہی ہوٹل کے کمرہ کا کرایہ اور آپ کے کھانے اور چائے وغیرہ کا بل بھی ادا کر دیا جائیگا اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دیتے کہ آپ اپنی مرضی سے جو بھی کھانا چاہیں بڑے شوق سے کھایئے۔

شاعر حضرات رضا کاروں کی عاجزانہ درخواست پر ہوٹل کو روانہ ہوتے گئے اور ہوٹل میں اپنی اپنی پسند کا کمرہ قبضہ میں کرتے گئے۔ شاعر ابھی منہ ہاتھ دھونے کی تیاری ہی کر رہا ہوتا کہ ہوٹل کا مُلازم رجسٹر لئے پہنچتا اور شاعر صاحب سے کہتا کہ حضور اپنی مُبارک آمد کا اندراج رجسٹر میں فرما دیجئے۔ چنانچہ ہوٹل کے قاعدہ کے مطابق ہر شاعر اپنا نام پتہ وغیرہ درج کر کے دستخط کرتا رہا۔ اگر کسی شاعر نے یہ کہا کہ منتظمینِ مشاعرہ آ کر اندراج وغیرہ کرائیں گے تو ہوٹل کا ملازم کہتا کہ حضور قیام آپ نے فرمانا ہے، اندراج تو آپ کو ہی کرنا ہوگا لہٰذا طوعاً و کرہاً ایسے ہوشیار شاعروں کو بھی اندراج اپنے قلم سے کرنا پڑا۔

رات کو مشاعرہ بڑے ٹھاٹ سے ہوا۔ اور مشاعرہ کے بعد شعراء سے کہا گیا اب آپ ہوٹل میں آرام فرمایئے" صبح ناشتہ کے بعد ہم ہوٹل آئیں گے اور آپ حضرات کا معاوضہ اور ہوٹل کا بل وغیرہ ادا کر دیا جائے گا۔"

مگر صبح تک تمام منتظمینِ مشاعرہ فرار ہو چکے تھے اور شعراء کو اپنے قیام و طعام کے جملہ بل ہوٹل کو خود ادا کرنے میں اور واپسی کے اخراجات کے لئے جن دُشواریوں اور ذلّت کا سامنا کرنا پڑا، اُس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے۔

●●

دلّی کے شہریوں

مختارنامے کے ذریعے لین دین

دلّی میٹروپولیٹن کونسل نے ۲۲ جولائی ۱۹۸۰ء کو ایک اہم تجویز پاس کی ہے جس کے نتیجے میں مختارنامے (پاور آف اٹارنی) کے ذریعے کی گئی خرید و فروخت یا زمین یا جائداد میں مفادات کی منتقلی کے دیگر معاملوں کو باضابطہ بنانے میں مدد ملے گی۔

تجویز میں کہا گیا ہے کہ اس تجویز کے پاس کرنے سے پہلے جو سودے کئے گئے ہیں انھیں قانونی درجہ دیا جائے۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے اس تجویز کے بارے میں تفصیل سے جاننے کی استدعا کی ہے۔ تجویز یہ ہے:

یہ ہاؤس تجویز کرتا ہے کہ زمین یا جائداد کی خرید و فروخت اور زمین یا جائداد میں دیگر مفادات کی منتقلی کے معاملے میں جو اس تجویز کے پاس ہونے سے پہلے جنرل پاور آف اٹارنی کے ذریعہ کیے گئے ہیں انھیں مقاصد کی عمل برآری کے لیے قانونی طور پر جائز تسلیم کیا جائے۔ اس تجویز کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے قانون میں ترمیم کی جائے۔

اگر اس ضمن میں آپ کوئی تجویز دینا چاہتے ہیں تو براہِ کرم ارسال فرمائیں

جگ پرویش چندر

چیف ایگزیکٹو کونسلر دلّی

اولڈ سیکریٹریٹ دلّی ۵۴-۱۱۰۰

جاری کردہ: **محکمۂ اطلاعات و اشاعت،**
دلّی انتظامیہ دلّی

موجِ شفق موجِ غبار — نور پرکار

سنہ ۱۹۸۴ء ۱۶/۳۰×۲۰ ۱۰۴ صفحات

۱۰ روپے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔

جناب منوہر لال کپور (ایڈوکیٹ) طالب چکوالی اس وقت عمر کی اسّی منزلیں طے کر چکے ہیں۔ تقسیمِ ملک کے بعد طالب چکوالی نے بھی دہلی کو ہی اپنا مسکن بنایا۔ اکثر و بیشتر مشاعروں اور ادبی و شعری نشستوں میں ان کا ساتھ رہا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں لال قلعہ میں جو اوّلین جشنِ جمہوریت منایا گیا اس پر آپ نے جو طویل نظم کہی تھی وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ طالب چکوالی کو دِلّی کی ادبی محفلوں میں عزت و احترام سے دیکھا جانے لگا۔

طالب صاحب کے تین شعری مجموعے اور ان کی یادداشتوں پر مشتمل ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے اور حال ہی میں اُن کے ۲۶ سوانحی مضامین کا مجموعہ "مور پنکھ" شائع ہوا ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" دہلی سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ بعض روزنامہ "پرتاپ" دہلی اور ایک دو "زمانہ" کانپور میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر جاوید وششٹ نے "رنگِ مور پنکھ" کے عنوان سے "مور پنکھ" میں شائع شدہ تمام مضامین کا تجزیہ فرمایا ہے اور جہاں بھی انھیں کچھ اختلاف محسوس ہوا ہے، بلاکم و کاست اُسے بیان کر دیا ہے۔

"مور پنکھ" میں طالب صاحب نے اپنے پہلے مضمون میں شاہ مُراد خان پوری کو اُردو کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں "نہ ولی دکنی پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے اور نہ پہلا غزل گو۔ بابا شاہ مراد تحصیل چکوال کے موضع خان پور کے باشندے تھے جو ولی سے ۴۱ برس پہلے فوت ہو گئے۔" طالب صاحب کا یہ فرمانا صحیح نہیں ہے۔ ظاہر ہے اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ تھا۔ بقول کتاب کے ناشر جناب اندرجیت لعل "یہ مضامین زیادہ تر تاثراتی ہیں۔ بالخصوص اُن شعرا کی شاعری و شخصیات پر جو شاعری میں اساتذہ کا درجہ رکھتے تھے اور جن سے طالب علموں کو کئی سال تک ادبی رفاقت کے مواقع نصیب ہوئے۔"

بہرحال "مور پنکھ" خاصی دلچسپ کتاب ہے۔ سوانحی خاکے، انشائیے اور شعری ادب سے لگاؤ رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب یقیناً ایک نعمت سے کم نہیں۔

سرور تونسوی

مور پنکھ — طالب چکوالی

سنہ ۱۹۸۴ء ۱۶/۳۰×۲۰ ۱۴۴ صفحات

۳۰ روپے سادھنا پبلی کیشنز، نئی دہلی۔

سرزمینِ دکن نے جن سرکردہ شعرا اور ادیبوں کو جنم دیا ہے اُن میں نور پرکار کا نام صفِ اوّل میں آتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ اُن کی ۳۰ نثری نظموں کا دلکش مجموعہ ہے جسے مکتبہ "الراشد" پوسٹ بکس ۲۰۰۹۴ المرقاب۔ کویت نے شائع کیا ہے۔ نثری شاعری دیکھنے میں بڑی آسان معلوم ہوتی ہے مگر اس صنفِ شاعری پر عرق ریزی کرنا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں ہے۔ نثری شاعری بھی کئی پابندیوں کے تحت ہوتی ہے، اور انتہائی منظّم کارگزاری کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام قاری مطالعہ کے دوران نثری شاعری میں نظم و ضبط کو دیکھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔

نثری نظمیں مقبول ہو رہی ہیں اور نور پرکار اپنی نثری نظموں کے ذریعہ اُسے اور بھی مقبولیت سے ہمکنار کر رہا ہے۔

خورشید الاسلام، بلراج کومل، قاضی سلیم اور صلاح الدین پرویز کے علاوہ متعدد شعرا اپنی نثری نظموں کے ذریعہ "موزوں" نظمیں کہنے والوں پر حاوی نظر آتے ہیں۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کتاب کے دیباچہ میں نثری نظم پر جو سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے وہ مطالعہ کے قابل ہے۔ نثری نظموں کے مطالعہ کا شوق رکھنے والے حضرات نور پرکار کے اس مجموعہ کو پڑھیں گے تو یقیناً داد دینے پر مجبور ہوں گے۔ یہ مجموعہ ہندوستان میں مکتبہ جامعہ دہلی سے پندرہ روپے میں دستیاب ہے۔

سرور تونسوی

من کہ مکتوب الیہ

برادرِ محترم۔ تسلیم!

'شانِ ہند' کی خوبصورت 'پُرکشش' آفسیٹ اشاعت کی بات اگرچہ پُرانی ہو چلی ہے' تاخیر ہی سے سہی 'مبارکباد قبول فرمائیں۔ پرچہ تو پہلے ہی جاندار اور طاقتور تھا' اب اس کا ظاہری حسن بھی بڑھ گیا ہے۔ بطور ودّیا پرکاش (شخص) اور بطور سرورؔ تونسوی (رہبر) دونوں لحاظ سے آپ کی بے باکیوں کا کوئی جواب نہیں۔ اس دَور میں اتنے حوصلہ والے اور سچّے کھرے انسان ہیں ہی کتنے! خُدا آپ کی بے باکیوں میں اضافہ کرے اور 'شانِ ہند' کے توسط سے آپ کو اُردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ یہی دُعا گو ہوں۔

انعام ملنے پر دوسری مبارکباد تازہ تازہ ہی قبول فرمائیں۔ اکادمی کو آخرکار صحیح فیصلہ کرنے پر مطمئن ہو جانا چاہیئے۔

آپ کا بھائی
کیول دھیر

ای۔۱۰
سینیڈ اپارٹمنٹ
پالی ہِل۔ کھار
بمبئی۔ ۴۰۰۰۵۲ (ہند)

دُشمن چشم بیمار۔

بہ کوئے یار۔۔ اس قدر دلچسپ اور عبرت انگیز تھی کہ دو ہی نشستوں میں پوری کی پوری پڑھ ڈالی۔
نتیجتاً آشوب چشم میں مبتلا ہو گیا اور چارہ ساز یعنی آنکھوں کے اسپیشلسٹ سے رُجوع کرنا پڑا۔ آج ہی کچھ افاقہ ہوا ہے اور یہ خط لکھنے کے قابل ہوا ہوں اور کل ہی اپنے وکیل سے رجوع کر رہا ہوں کہ ضابطۂ فوجداری کی کون کون سی دفعات کے تحت آپ کے خلاف جرمانے کا دعوےٰ دائر کیا جا سکتا ہے۔

دعاگو
مانک ٹالا

محبِّ محترم! نمسکار

'بہ کوئے یار'..... کھول کر چند ہی سطریں پڑھی تھیں کہ کتاب بند کر دینی پڑی۔ یہ تو جان لیوا چیز ہے۔ اگر ایسا فعلِ بد نہ کرتا تو ساری رات آنکھ نہ جھپک سکتا۔ مطالعہ چند روز کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ واقعات نہایت دلچسپ اور سبق آموز' اسلوب نہایت پُرلطف اور رواں دواں۔ مبارکباد بعد میں۔

نیازکیش۔
کالی داس گپتا رضاؔ

بھائی صاحب! نمسکار

اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔ کرم نامہ معہ کتاب کے بہشتِ نظر ہوئے۔ بہت دن ہو گئے مَیں نے روپے تو بھجوا دیئے ہیں' لیکن جواب دینے میں دیر اس لئے ہوئی کہ مَیں پوری کتاب پڑھ کر ہی خط لکھنا چاہتا تھا۔ اِس دَور میں آدمی سب کچھ کر سکتا ہے مگر سچ نہیں بول سکتا لیکن آپ نے یہ مشکل کام کیا ہے اور کس خوبصورتی کے ساتھ سچ بولا ہے کمال ہے۔ یہ کام آپ جیسا بے باک' ایماندار' بہادر اور حاتم صفت انسان ہی کر سکتا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب میں ایک لاجواب شاہکار ہے

آپ کا چھوٹا بھائی
اودے سرن ارمان

جنابِ سرورؔ صاحب!

کتاب کیا ہے ایک جاندار' اور صداقت نگار قلم سے نکلے ہوئے حسین' پُرکشش' بے باکانہ اور بے لوث واقعات و بیانات' حقائق و تجربات مختلف کرداروں کی صحیح خاکہ نگاری اور واقعہ نویسی' حقیقتوں کو بے نقاب کرنے میں بےساختگی و روانی' صحافیانہ خیالات کا خلاصہ' طرزِ بیان

کی دلکشی، دل آویزی، دل افریبی اور دلچسپی، پُر فریب شاعروں کی فریب سامانیاں، مشاعروں کی ریاکارانہ کہانیاں، نیک و بد، بلند و پست اشخاص کی قلمی تصویریں، قلمی سفر کی بوقلمونیاں، گوناگونیاں، دلچسپیاں، بوالعجبیاں۔ متوثر اور سچے حادثات انواع و اقسام کے واقعات پر حاوی لطائف و ظرائف، زندگی کے مختلف تغیرات و نشیب و فراز کی دردمندانہ داستانیں، خود ساختہ اور من گھڑت متشاعروں، اُگب ماز ادیبوں کی لن ترانیاں لیڈروں، رہنماؤں، اخبار نویسوں، رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں کی کمزوریوں کا ایک حقیقی یادگار نامہ ہے جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سرور تونسوی صاحب کا تجربہ کس قدر وسعت رکھتا ہے اور انھیں کن حالاتِ مختلفہ سے واسطہ پڑا ہے۔

لطف یہ ہے کہ ہر واقعہ اور سانحہ میں ذات کا حوالہ دیا ہے لیکن خود کو کہیں نمایاں نہیں کیا ہے صحیح معنوں میں یہ کتاب ایک ادبی و صحافتی و تجرباتی اور اصلاحی نگارخانہ ہے۔

(طویل خط سے اقتباس)

رتن پنڈوری

آیا کہ میں اسے پڑھ کر کیا کروں گا۔ کسی کے ذاتی معاملات میں کیا دلچسپی ہوگی۔ سچائی یہ ہے کہ دل ناخواستہ کے ساتھ چند صفحے پڑھے۔ بیگم صاحبہ کا مقالہ اولین تھا۔ اسے پڑھا۔ مختلف قسم کے خیالات، دلیلیں، پرانی یادیں، زیر و زبر کے ساتھ ادبی و سماجی پہلو ابھرتے رہے، آتے رہے اور جاتے رہے۔ وقت کا اندازہ نہ رہا۔ جب سر اٹھایا تو میں ۶۵ صفحے پڑھ چکا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر میں نہ پڑھتا تو کتاب کے بیش قیمت ادبی و سماجی حالات سے محروم رہ جاتا، اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا جیسے کوئی جرم سرزد ہوا ہو۔ پھر آپ کی ساری کتاب خوب جم کر پڑھ ڈالی۔

ہربنس لال سبھروال

محترم! تسلیم

گزشتہ کے شانِ ہند میں یہ مژدہ پڑھ کر بہت ہی شاد ہوا کہ آپ کو صحافت کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ حالانکہ یہ ایوارڈ آپ کو بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا۔ خیر حقدار کو حق تو ملا۔ دعا ہے کہ آپ کی اور شانِ ہند کی عمر دراز کرے اور قلم اسی طرح بے باک اور حق گو بنائے رکھے

مونس اعظمی

پیارے سرور صاحب

آداب!

آپ کی تحریر کردہ کتاب "بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ" پڑھی۔

مجھے ڈاک سے بعد دوپہر دو بجے بذریعہ رجسٹری ملی۔ ۲ بجے پڑھنی شروع کی، اور رات ۱۲ بجے تک پڑھی۔ اور دوسرے دن ۲ بجے شام پڑھ سکے۔ کی نہایت دلچسپ کتاب ہے۔

بڑے بھائی صاحب منالی سے کھتہ تشریف لائے تھے، اُن کو دے دی اور وہ منالی لے گئے جب کتاب دوبارہ منالی سے واپس آئیگی تو دوبارہ پڑھنا شروع کروں گا۔

— آر۔ ایس۔ سو

سرور تونسوی صاحب، تسلیم!

سچ تو یہ ہے کہ کتاب کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ آپ کی خوش سلیقگی کی داد دیتے ہی بنی۔ کتاب ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے معیاری ہے۔ میں نے ایک ہی نشست میں بیشتر حصہ پڑھ ڈالا۔ آپ کی طرز تحریر اور اس پر واقعات کا انتخاب بہت ہی دلچسپ لگا۔ زندگی کی رنگارنگ جھلکیوں سے سجا ہوا ایک جلوس ہے جو پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ اس فنکارانہ پیش کش پر میری دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

انل موہن کیف

جناب سرور صاحب تسلیم!

کتاب کا مضمون دیکھ کر خیال

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 August 1987
Regd. with the Registrar of Newspaper at R No. 644/57

NOOR MOHAMMADI HOTEL

جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے

● [illegible] فلمی ستارے [illegible] مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مداحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنایا ہے۔ آپ یہاں تشریف لاکر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نور محمّدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 183/181 ای-آر-روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳۰۰۰۴

فون ہوٹل 8511008 فون دفتر: 8516115

شانِ ہند
دہلی
ستمبر ۱۹۸۷ء
2 NOV 1987
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؓ
یہ شمارہ
سیدنا حسینؓ

لمعات!

کوکب شاہجہانپوری

ظلم ہونا چاہئے شایانِ شانِ اہلِ درد
بندہ پرور! آپ تو ہیں قدر دانِ اہلِ درد

دیکھ او غارتگرِ تاب و توانِ اہلِ درد
نامکمل رہ نہ جائے امتحانِ اہلِ درد

جانتے تھے، لازمی ہے امتحانِ اہلِ درد
لیکن اس حد تک نہ تھا وہم و گمانِ اہلِ درد

بدگماں سے بدگماں کو بھی نہ آئے گا یقیں
اس قدر بیدرد ہو گا رازدانِ اہلِ درد

یہ ہمیں بھی علم ہے اس درد کا درماں نہیں
سُن تو لے بیدرد! لیکن داستانِ اہلِ درد

ہر نگاہِ یاس ہے ٹوٹے ہوئے دل کا پیام
خامشی پر بھی یہ ہے زورِ بیانِ اہلِ درد

کوندتی ہے برقِ غم ہر "خندۂ بیمار" میں
بند ہونے پر بھی گویا ہے زبانِ اہلِ درد

سننے والا چاہئے افسانۂ خاموش کا
ہر نگاہِ مضمحل ہے ترجمانِ اہلِ درد

امتیازِ دوستی و دشمنی دشوار ہے
کیسے کیسے مہرباں ہیں مہربانِ اہلِ درد

اور ہی عالم میں ہیں غم آشنا حسرت نصیب
اور ہی ہیں اب زمین و آسمانِ اہلِ درد

پوچھنا کیا ہے دیکھئے اسے ساری حالت آئینہ
اب نہیں سننے کے قابل داستانِ اہلِ درد

زندگی تو درحقیقت اب ہوئی ہے زندگی
مرحبا اے دردِ دل اے آرامِ جانِ اہلِ درد

دل کی دنیا ہی بدل دی اک نگاہِ لطف نے
لٹ گیا منزل پہ آکر کاروانِ اہلِ درد

بُلبُل چہ گفت؟ گُل چہ شُنید؟ صبا چہ کرد؟

اظہار و افکار | حالاتِ حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اڈیٹوریل

نئے مزاج کا شہر، میرٹھ

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو ملا کرو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

دنگوں کے بعد میرٹھ ایک تاریخی شہر نہیں قبرستان بن گیا ہے۔ مارپیٹ، پتھراؤ، گرفتاریاں اور تلاشیاں آج میرٹھ والوں کی زندگی کا جز بن گئی ہیں۔ اکا دکا وارداتیں دن دہاڑے ہوتی ہی رہتی ہیں اور شام ہوتے ہی کرفیو سا ماحول ہو جاتا ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا المیہ دنگوں کے بعد کا ماحول ہے ہر ایک کے دماغ میں بسا نامعلوم خوف و شک کا ہے، بقول مولانا اسیند کی بوڑھیا رام دلاری کے میرٹھ کی حالت سانپ اور انسان کی سی ہے دونوں ایک دوسرے کو دشمن سمجھ رہے ہیں۔ بوڑھی رام دلاری کی سن رسیدہ، تجربہ کار آنکھوں نے میرٹھ میں اس سے پہلے کئی دنگے دیکھے ہیں اس کا کہنا ہے کہ یہ دنگا سابق دنگوں سے کئی گنا خطرناک ثابت ہوا ہے۔ مولانا اسیند شہر کے

ہاشم پورہ سے لے کر ملیانہ تک کئی مسلم خاندانوں کے چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گئے

مراد نگر کے پاس دس دنوں تک گنگا نہر میں اکا دکا لاشیں ملتی رہیں یہ لاشیں میرٹھ میں بربریت کی گواہ ہیں

پولیس نے اب لاشوں کی گنتی بند کر دی ہے۔ جب کچھ لاشیں نظر آتی ہیں اور انھیں دیکھنے بھیڑ جمع ہو جاتی ہے تب ایک پولیس والا ڈنڈا لے کر بھیڑ کو ہٹا کر بس یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کا فرض ادا ہو گیا ———

باہر ا میرٹھ کی بنی ہیں درآمد ہے۔ یہ علاقہ بھی فسادات کی زد میں نہیں آیا تھا لیکن اس بار فسادیوں نے یہاں کی دوکانیں بھی جلائی ہیں۔ موانا اسٹینڈ کے بالکل قریب پولیس تھانہ ہے جب یہاں دوکانیں جلائی جا رہی تھیں تب پولیس جائے واردات پر نہیں ہوگی۔ پولیس کا یہ رویہ سوال طلب ہے۔

ملیانہ سے لے کر میڈیکل کالج تک آتش زنی کے ثبوت موجود ہیں۔ فسادات میں جلنے موٹر کاروں، دوکانوں اور گھروں کے نقصان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اس کا معاوضہ/ ہرجانہ دیا جا سکتا ہے، لیکن جن انسانوں کی جان چلی گئی اُن کا معاوضہ نہ تو لیڈروں کے سبز باغ نُما وعدوں سے مل سکتا ہے اور نہ ہی سرکاری راحت کے وعدوں سے۔ بال کشن داس مہیشوری کالج کی بارہ لڑکیوں کے والدین فسادوں میں مارے گئے۔ اِن سبھی لڑکیوں کے والدین نے نہ جانے کتنی تکلیفوں سے اپنی اپنی لڑکیوں کے رشتے طے کیے تھے۔ عنقریب ان کا بیاہ ہونا طے تھا۔ یہ بارہ والدین ہندو ہیں۔ جن کے مکانات مسلمانوں کے مکانات سے لگے ہوئے ہیں۔

دوسری طرف ہاشم پورہ سے لے کر ملیانہ تک کئی مسلم گھرانوں کے چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گئے۔ مراد نگر کے پاس دس دنوں تک گنگا نہر میں اکا دکا لاشیں ملتی رہیں۔ یہ لاشیں میرٹھ پر بربریت کی گواہ ہیں۔ پولیس نے اب لاشوں کی گنتی بند کر دی ہے۔ جب کچھ لاشیں نظر آجاتی ہیں اور انھیں دیکھنے بھیڑ جمع ہو جاتی ہے تب ایک پولیس والا ڈنڈا لے کر بھیڑ کو ہٹا کر بس یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کا فرض ادا ہو گیا۔

میرٹھ کے دنگوں میں سب سے زیادہ نقصان کھادی کپڑے کے تاجروں کو ہوا۔ کپڑے کی تجارت سے ہندو مسلم دونوں کو روزی ملتی تھی۔ کپڑوں کے بعض کارخانوں کے مالک ہندو ہیں اور اکثر مزدور مسلم لیکن گذشتہ کچھ سالوں سے مالکان نے بہار سے

مزدوروں کو لا کر تربیت دینی شروع کر دی ہے جس سے مقامی مسلم مزدور ناراض ہیں۔ فسادات میں بیلو کھیڑی اور لکھی پورہ کی کپڑے بنانے کی مشینیں جلا دی گئی ہیں۔ اس سے ۸ کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔ واضح رہے کہ ان سب مشینوں کے مالک ہندو ہیں اور جو کپڑوں کا کچا مال جلا وہ سب مسلمانوں کا ہے۔

اس علاقہ میں تین دن تک قتل و آتش زنی کی وارداتیں چلتی رہیں۔ لیکن تینوں دنوں میں پولیس وہاں ندارد تھی۔ قینچی اور کھلونوں کی صنعت کا نقصان کپڑے کی صنعت کے نقصان میں ملا دیں تو کل نقصان ۳۰ کروڑ روپیہ سے زائد ہوتا ہے ان صنعتوں میں میرٹھ کے مقامی مزدوروں کے علاوہ باہر سے آئے مزدور بھی شامل ہیں۔ اب سب کے سب بے روزگار ہو گئے ہیں اور فاقہ کشی میں مبتلا ہیں۔ قارئین کو معلوم ہوگا کہ میرٹھ میں بنے کھلونے نہ صرف بھارت میں بلکہ دُنیا بھر کے متعدد ممالک میں فروخت ہوتے ہیں فسادات

کے بعد لوگوں نے اب بحث کرنا شروع کیا ہے کہ آخر فسادات کی شروعات کن وجوہات سے ہوئی ہے؟ اب یہ پوچھا جا رہا ہے کہ آخر ایسا ماحول پیدا ہونے ہی کیوں دیا گیا؟ کہ ایک واردات کی چنگاری پورے شہر کو جلا کر راکھ کر دے۔

مغربی اُتر پردیش کے اندرا کانگریسی ممبر پارلیمنٹ ستیہ پال ملک کا کہنا ہے کہ "یہ فسادات سیاسی ناکامی اور انتظامیہ کی نااہلی کا نتیجہ ہیں۔ فسادات سے پہلے ہی اندرا کانگریس ہندوؤں کی کانگریس اور مسلمانوں کی کانگریس میں بٹ چکی تھی"۔

اب دنگوں کے بعد بھی حکمراں اندرا کانگریس کا یہی حال ہے۔ سرد یہ لیڈر ماسٹر سندر لال اس کوشش میں لگے ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیچ کی دیوار گر جائے۔ اُن کا ساتھ دے رہے ہیں میرٹھ کالج کے پروفیسر ڈاکٹر پی۔ ایس۔ جین۔ دیگر نوجوان لیڈر بھی دونوں فرقوں میں دوبارہ خلوص و اعتماد جگانے کی کوشش کر رہے ہیں

لیکن دوسری طرف سرکاری افسران حقیقت پر پردہ ڈال کر اپنی ذمہ داری سے بھاگ رہے ہیں۔ میرٹھ کے کلکٹر کا دعوے ہے کہ "ملیانہ سے خوف زدہ ہوکر جانے والے اب واپس آگئے ہیں"۔ اسی کلکٹر کا دوسرا بیان ہے کہ "فسادات میں جن لوگوں کو ہلاک سمجھا گیا تھا وہ غلط ہے وہ زندہ ہیں اور واپس شہر لوٹ رہے ہیں"۔ اخبار میں ملیانہ سے خوفزدہ ہوکر فرار ہونے والے اور فسادات میں ہلاک ہونے والوں کی خبر پہلے چھپی تھی اور اب کلکٹر کا بیان بھی چھپا ہے لیکن سرکاری بیان میں ایسے لوگوں کی تعداد نہیں بتائی گئی ہے۔ خود ملیانہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ سرکاری دعوے بے بنیاد اور گمراہ کن ہے۔ یہاں سے ۱۱۱ لوگ لاپتہ ہوئے ہیں۔ پی اے سی والوں نے کتنی لاشوں کو غائب کیا؟ اس کا ابھی تک حساب نہیں ملا ہے۔ ملیانہ گاؤں کی دیواروں سے گولیوں کے نشان مٹانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ بہتر ہوتا کہ عوام کے ٹیکس کا پیسہ ثبوت مٹانے کے بجائے انسانیت کے چہرہ پر لگے ان داغوں کو مٹانے کے لئے خرچ ہوتا۔ دنگوں کے مجرموں کو پکڑنے میں خرچ ہوتا، متاثر لوگوں کو نئی زندگی دینے میں خرچ ہوتا، جس سے راکھ کے ڈھیر میں ابھی تک دبی چنگاریوں کو ہمیشہ کے لئے بجھانے میں مدد ملتی۔

(صداقت)

اُردو اکادمی نے اپنے آرگن "ایوانِ اُردو" کے تازہ شمارہ میں یہ اعلان فرمایا ہے کہ کس پبلشر کو اس کی کس کتاب پر ناشر کا اوّلین انعام دیا گیا ہے۔ مگر دوسرے انعام کا اعلان نہیں کیا گیا دریافت کرنے پر سکریٹری صاحب اکادمی نے بتایا کہ کمیٹی نے دوسرے انعام کا مستحق کسی کتاب کو نہیں پایا، لہٰذا دوسرے انعام کی رقم کتب کی انعامی رقم میں دے دی گئی۔

ہمارے لیفٹننٹ گورنر چونکہ اُردو اکادمی کے چیئرمین ہیں، اس لئے وہ اُردو اکادمی کی کسی بھی فروگذاشت پر اس لئے کان نہیں دھرتے کہ آخر کار اکادمی کے چیرمین تو دہی ہیں اسی لئے تمام تر ذمہ داری اُن پر ہی آتی ہے۔

مگر ہم لیفٹننٹ گورنر سے یہ گذارش ضرور کریں گے کہ وہ ان تمام کتابوں کو خود ملاحظہ فرمائیں جو پبلشرز انعام کے سلسلہ میں اکادمی کو موصول ہوئیں اور پھر خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ کمیٹی نے کس قدر بھونڈے پن کا مظاہرہ کرکے نہ صرف اُردو اکادمی کی سابقہ ساکھ کو دھکا لگایا ہے بلکہ اکادمی کے چیئرمین کی شان کے خلاف کھلے بندوں قدم اٹھایا ہے۔ ایڈیٹر شانِ ہند اپنے قانونی مشیر

سے مشورہ کر رہا ہے کہ کیا ناشر الفاظ کے اس غلط فیصلہ کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ

کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر قانون نے کسی طور بھی ہمارا ساتھ دیا تو یہ رٹ دائر کی جائیگی تا کہ

کم از کم اکادمی آئندہ کے لئے ایسا غلط، جانبدارانہ فیصلہ نہ کر سکے۔

فکر تونسوی اردو دنیا کا ایک ایسا عظیم مزاح نگار اور کالم نگار تھا کہ جس کی جگہ پُر ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ہمارے برصغیر ہندو پاکستان میں اس وقت کوئی مزاح نگار یا کالم نگار ایسا نہیں جو ہر روز فکاہی کالم لکھنے میں فکر تونسوی کا ثانی ہونا تو بہت دور کی بات ہے اس کی گرد کو بھی پہنچ سکے۔ ان حالات میں فکر تونسوی کا انتقال پُر ملال اردو زبان کے لئے اور بھی افسوس ناک ہے کیونکہ یہ بالکل صاف نظر آ رہا ہے کہ اردو صحافت میں کالم نگاری کا باب عملاً ختم ہو گیا ہے۔

ویسے تو آج بھی ہمارے ملک اور پاکستان میں صفِ اوّل کے کئی طنز و مزاح نگار موجود ہیں مگر ان میں سے ایک بھی مزاح یا طنز نگار ایسا نہیں جو عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو اپنی کالم نویسی میں سمو سکے۔

اردو صحافت کو یہ شرف پہلی بار فکر تونسوی کے باعث حاصل ہوا کہ ملک کے راشٹرپتی سے لے کر آٹا دال فروخت کرنے والا معمولی اردو پڑھا لکھا دکاندار محض پیاز کے چھلکے یعنی فکر تونسوی کے کالم پڑھنے کے لئے ملاپ خریدے۔

اردو صحافت کو یہ شرف پہلی بار فکر تونسوی کے باعث حاصل ہوا کہ ملک کے راشٹرپتی سے لے کر آٹا دال فروخت کرنے والا معمولی اردو پڑھا دوکاندار محض "پیاز کے چھلکے" یعنی فکر تونسوی کے فکاہی کالم پڑھنے کے لئے ملاپ خریدے۔

اردو جو دن دن رو بہ تنزل ہوتی جا رہی ہے، فکر تونسوی کا ایسے عالم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا ہر اردو داں کے لئے یقیناً رنج و غم کا باعث ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو طنز و مزاح اور کالم نگاری پر فکر تونسوی نے جو انمٹ چھاپ چھوڑی ہے جب تک اردو باقی ہے باقی رہے گی۔

شانِ ہند دہلی ستمبر

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

اکیلے میں اگر دو اشک بہہ جائیں ندامت کے
تو ہنگامے بپا ہو جائیں ممکن ہے قیامت کے
بشر جب نامساعد وقت سے دوچار ہوتا ہے
سراسر خشک ہو جاتے ہیں سرچشمے ذہانت کے
ہم اپنی ذات کے کب ہو سکے، ہم نے یہاں اکثر
تراشے ہیں نئے پہلو، امانت میں خیانت کے
تمہی الزام، تم ہی مجرم ہو، انصاف بھی تم ہو
کہاں دامن کو پھیلائے چلے ہو تم ضمانت کے
وہ کب کا مر چکا ہے واسطہ دیتے ہو تم جس کا
بہانے کھوجتے ہو بر طرف جس کی اعانت کے
غنی تم ہو یہاں گفتار کے، کردار کے، مانا!
کہو تم ہی کہ پرکالے یہاں کتنے ہیں آفت کے
مبادا شان میں اُس شخص کی ہو جائے گستاخی
کہ ٹھیکے اُس نے لے رکھے ہیں عالم میں لطافت کے
یہ ثروت کام آنے ہی کو ہے ٹھہرو، سنبھل جاؤ
سنو بجنے لگے ہیں چار سُو ڈنکے شرافت کے
حقیرؔ منتظر اب چھوڑ دے یہ انتظار اپنا
کہاں ملتے ہیں دنیا میں بشر تجھ سی نزاکت کے

ناردرن ریلوے

آپ کی روزمرہ زندگی سے وابستہ ہے
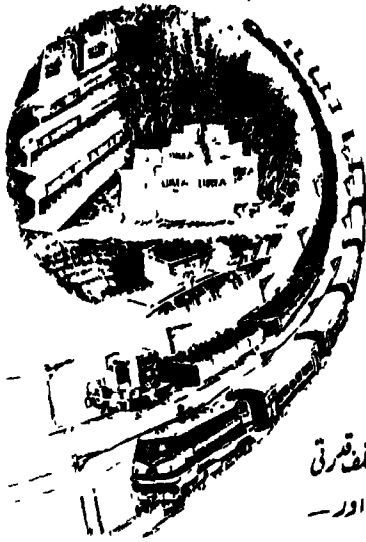
ذرا سوچئے۔

● ناردرن ریلوے ان گنت طریقوں سے آپ کی زندگی کو آرام دہ بناتی ہے۔ سماجی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو ریلوے سے مربوط نہ ہو۔

ایک حیات بخش وسیلہ جو کروڑوں کو غذا، ایندھن اور انرجی فراہم کرتا ہے۔ ریلوے مختلف علاقوں کو باہم جوڑنے والی مضبوط کڑی ہے۔

● ناردرن ریلوے آپ کے فرصت کے لمحات کو زیادہ پرلطف بناتی ہے۔ یہ آپ کو مختلف قدرتی مناظر، راجستھان کے تپتے ہوئے ریگستانوں سے ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں، پنجاب، ہریانہ اور اترپردیش کے سرسبز و شاداب میدانوں میں لے جاتی ہے۔

● تقریباً ۱۲۵ سالوں سے ریلوے ہر طرح قومی ترقیاتی پروگراموں، نقل و حمل، زرعی ترقی، بجلی کی پیداوار، صنعتی ترقی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔

● ناردرن ریلوے روزانہ ۹۰۰ میل، ایکسپریس اور پسنجر ٹرینوں میں ۱۱ لاکھ مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچاتی ہے اور روزانہ چھ سو مال گاڑیوں میں ۲ لاکھ ٹن مال ڈھویا جاتا ہے۔

ناردرن ریلوے کی روزانہ کارگزاریوں میں شامل ہیں —— ● ۴۷,۰۰۰ ٹن اناج کی شمال کے زرعی علاقوں سے مختلف حصوں کو ترسیل۔
● ۶۲,۰۰۰ ٹن کوئلہ صنعتی کاموں کیلئے پہنچانا۔ ● ۱۵,۰۰۰ ٹن پیٹرولیم کی پیداوار کی آمد و رفت۔ ● ۷,۰۰۰ ٹن کھاد ڈھونا۔

یہ سب ملک میں خود اعتمادی اور خودداری کی فضا تیار کرنے میں معاون ہیں۔
خاموشی سے، مگر یقینی طور پر ناردرن ریلوے کروڑوں باشندوں کے بہترین مستقبل کے لئے سرگرم ہے۔
ریل پٹریوں کا مضبوط جال، زندگی کو قائم رکھنے والی رگوں اور نسوں کی طرح کام کر رہا ہے۔

شمالی افق پر ملک و قوم کی عظمت کا درخشاں ستارہ

گوشۂ عقیدت

جلیل القدر

رُوح کو سرشار اور ایمان کو تازہ کرنے والے واقعات

وہی صفات، وہی خصوصیات اور ویسی ہی کرامات جیسی ان کے جدِ اعلیٰ حضرت غوث الاعظمؒ میں پائی جاتی تھیں۔

ایک مردِ حق آگاہ کی سیرت و سوانح۔

آخری قسط

قوّال بہت مایوس ہوا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا، یہ کیسے پیر ہیں کہ انہیں قوالی پسند نہیں۔ میں اتنی دُور چل کے خواہ مخواہ آیا۔

آپ نے کشف سے اُس کی سوچ کا پتہ لگایا فرمایا "لیکن تو خود آیا ہے یہاں، ہم نے تجھ کو نہیں بلایا۔"

قوّال بہت گھبرایا۔ اُس نے سوچا کہ یہاں تو سوچ کا بھی پتہ چلا لیا جاتا ہے، خوب۔ پوچھا "پیر مُرشد! پھر اس ناچیز کے لئے کیا حکم ہے؟"

آپ نے جواب دیا "کوئی حکم نہیں، بس ایک مشورہ دُوں گا تجھ کو، چند نصیحتیں کروں گا، اور کچھ نہیں۔"

قوّال نے کہا "اس دربار سے مجھ کو جو کچھ ملے گا میں نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر لے جاؤں گا، آپ ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے جواب دیا "اے قوّال! توبہ کر، تو اب تک جو کچھ بھی کر چکا ہے اس سے توبہ کر لے۔"

قوّال نے قدرے سکوت کے بعد عرض کیا، حضرت! میں نے توبہ کر لی، آگے اب مجھے کیا کرنا ہے فرمائیے۔"

آپ نے جواب دیا "ہم نے تیرے دل میں اُتر کے دیکھا، وہاں بہت کھوٹ ہے۔"

اِس دربار میں ایک نومسلم لنگایت کا رئیس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نومسلم کے خاندان والوں نے بھی اِسلام قبول کر لیا تھا اور اب وہ دین ہی کے لئے جی رہے تھے اور دین ہی کے لئے جان دینے کو تیار تھے۔ اُس خاندان کا ایک رئیس اِس محفل میں موجود تھا اور وہ بھی آپ کی باتیں بہت توجّہ سے سُن رہا تھا۔

اُس رئیس نے قوّال سے کہا "دیکھ پیر مُرشد نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے تُو اس پر عمل کر اور اگر اس عمل سے تجھ کو کچھ حاصل نہ ہو تو یہاں دوبارہ چلا آ۔ اور زیادہ توجہ دی جائے گی۔"

قوّال نے آپ سے ایک بار پھر پوچھا "ہاں تو آپ نے وہ کیا تجویز بتائی تھی میرے لئے، مجھے اپنی کامیابیوں کے سلسلہ میں کیا کچھ کرنا چاہیئے؟"

آپ نے فرمایا "تُو کس کامیابی کی بات کر رہا ہے؟ دُنیاوی یا دینی؟"

قوّال نے جواب دیا "حضرت، ہم دُنیادار، گنہ گار لوگ — دین کے بارے میں کہاں سوچتے ہیں، ہمیں تو دُنیاداری کے بارے میں دُعائیں دیجئے اور اپنی قوّالی سے بھی میں دُنیا ہی حاصل کرنے آیا تھا۔"

آپ نے اپنی باتیں جاری رکھیں، فرمایا "جو ہم بتائیں اُس کو توجہ سے سُن لے۔"

قوّال خاموش ہو گیا۔ آپ فرمانے لگے "دیکھ، ہم تجھ سے کہتے ہیں کہ توبہ کر لے، اپنے ساز توڑ کے پھینک دے، سر کو مُنڈوا، اور درویشوں میں شامل ہو جا، یہ بہترین ساعتیں ہیں، ہم جو کہہ رہے ہیں تو اس پر عمل کر کے قابلِ قدر درویش بن جائے گا۔"

لنگایت کے رئیس نے پوچھا "مخدوم محترم! کیا یہ گنہگار بھی؟"

آپ نے فرمایا "ہاں تو بھی"

وہ رئیس اُسی وقت گھر گیا اور اپنی آسائش کی چیزیں تقسیم کر دیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر کے زار و قطار روتا رہا۔ اس نے بعد سر کے بال کٹوائے اور آپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ قوّال کو جس حال میں بیٹھا چھوڑا تھا، وہ اُسی طرح اب بھی بیٹھا ہوا تھا۔

رئیس کے آنسو رُکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے اُس کو اپنے اندر تبدیلیاں ہوتی محسوس ہو رہی تھیں اب رئیس کو اتنا بھی ہوش نہ تھا کہ وہ قوال سے پوچھتا کہ تو اب یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے، جا اپنے گھر کی راہ لے۔"

قوّال نے رئیس کی حالت جو دیکھی تو سمجھا شاید یہ دیوانہ ہو گیا ہے، کہنے لگا حضرت میں نے تو

پہلے ہی یہ عرض کر دیا تھا کہ میں دُنیا دار آدمی ہوں میں اگر اپنے ساز توڑ دوں گا تو کماؤں کھاؤں گا کس چیز سے' میرے حق میں تو دُنیا کی دعا کیجئے۔"

آپ نے جواب دیا" جس کو جو ملنا تھا مِل چکا اب تو جا سکتا ہے!

رئیس نے اچانک زور زور سے رُونا شروع کر دیا مجلس کے لوگ رئیس کو دیکھنے لگے۔

آپ نے پوچھا" تُو نے کیا دیکھ لیا؟ کیا نظر آ گیا تجھ کو؟

رئیس نے جواب دیا" حضرت مخدوم محترم! میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں' اِس وقت گجرات میرے سامنے ہے۔ یہاں میرے بھائی کا کنبہ رہتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں میرے بھائی کی میّت کو نہلایا جا رہا ہے"!

مجلس میں سناٹا طاری تھا' رئیس خاموش ہو گیا مگر اس کی سسکیوں کی آواز صاف سُنی جا رہی تھی۔

قوال نے حیرت سے پوچھا" تم کو گجرات اور بھائی کی میّت دکھائی دے رہی ہے' بھائی تم تو کمال کے آدمی ہو"۔

رئیس نے کہا" اب میرے بھائی کو کفنایا جا رہا ہے' دیکھ کتنے سارے لوگ جمع ہیں اور سبھی سوگوار ہیں"۔

قوال کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد رئیس نے کہا" وہ دیکھو' وہ لوگ میرے بھائی کا جنازہ قبرستان لے جا رہے ہیں"۔

قوال نے کہا" بھائی رئیس! یہ تو کمال ہو گیا' تم تو اچھے خاصے ولی بن گئے' بتا نا تو سہی کہ اب کیا ہو رہا ہے؟

رئیس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن کچھ دیر بعد اعلان کیا" افسوس کہ میں دیکھ تو رہا ہوں لیکن ان آخری رسوم میں شریک نہیں ہو سکتا۔ وہ دیکھو میرے بھائی کا جنازہ کھُدی ہوئی قبر کے پاس رکھ دیا گیا اور لوگ آخری دیدار کر رہے ہیں۔ ذرا رکو تو سہی میں بھی تو اس کا آخری دیدار کر لوں۔ وہ کتنا پیارا چہرہ ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی سویا ہے' جلد ہی جاگ جائے گا"۔

ان صدمات نے اُسے نیم دیوانہ کر دیا۔ وہ جس طرف بھی جاتا یہی کہتا —
" میں قوالی سُنانا چاہتا ہوں سنو گے؟"
اور لوگ اس کو پاگل خبطی سمجھ کر اُس کا مذاق اڑاتے

اب قوال دہشت زدہ ہو گیا تھا' خاموش ہو گیا

حاضرینِ مجلس کو افسوس تھا کہ ان بخشش و فیض کی ساعتوں میں انھوں نے یہ سب کچھ کیوں نہیں حاصل کیا۔

رئیس اچانک پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

اب وہ کہہ رہا تھا" یار لوگ اُس کو دفن کر رہے ہیں. میرے بھائی کو۔ ہائے اب تو اُس پر تختے رکھ دیئے گئے' اور ہاں' یہ کیا؟ اچھا تو یہ مٹی دی جا رہی ہے اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون" بے شک ہم سب کو بھی ایک نہ ایک دن اُس کے پاس جانا ہے. جلد یا بدیر! اے اللہ! تو ہر مسلمان کو توبہ کی توفیق دے"۔

اِس مجلس میں جو بھی تھا' متأسف تھا کہ یہ دولت اُس نے کیوں نہیں حاصل کی۔ قوال تو وہاں سے کچھ اِس طرح فرار ہوا کہ" نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" یہاں سے اُٹھ کے کہیں قوالی گانے کے لائق بھی نہ رہا۔ اُس کی آواز کا رس' سوز اور لہریں کچھ بھی تو نہ رہا تھا اُس میں چشتیہ سلسلے کے بزرگوں نے بھی اُس سے قوالی نہیں سُنی' اور اِن صدمات نے اُسے نیم دیوانہ کر دیا۔ وہ جس طرف بھی جاتا یہی کہتا" میں قوالی سُنانا چاہتا ہوں' سُنو گے؟"

اور لوگ اُس کو پاگل اور خبطی سمجھ کر اُس کا مذاق اُڑاتے۔

یہ سکندر لودھی کے عہد کی باتیں ہیں سکندر لودھی شریف الطبع بادشاہ تھا لیکن دربار میں یہاں

بھی چغلیاں کھانے والے موجود تھے اور مخدوم عبدالقا[در] کے ایک بھائی اب بھی اِس دربار سے وابستہ تھے لوگ بھائی کو بھی ورغلاتے اور کہتے" باپ کی خلافت پر آپ کا حق تھا لیکن ہے اُڑ سے آپ کے بھیا! عبدالقادر' کیا یہ زیادتی نہیں ہوئی ہے آپ پر!

لیکن یہ چغلی خور اِدھر سے مایوس ہو گئے... کے پاس پہنچے

اُس کو ورغلانے اور بہکانے لگے۔ اُنھوں نے بادشاہ سے کہا" حضور والا! آپ تو ماشاءاللہ ظلّ اللہ (اللہ کا سایہ) ہیں' اور عبدالقادر محض درویش' اُن کو کبھی کبھی آپ کے پاس تو آنا ہی چاہیئے"۔

بادشاہ نے جواب دیا' میں اُن کو بیجا تکلیف نہیں دینا چاہتا'

ایک چغل خور نے کہا" حضورِ والا! یہ درویش لوگ بھی کیسے دُنیادار ہوتے ہیں۔ ان کے پاس دربار کے لوگ پہنچتے رہتے ہیں اور وہ سب اُن سے دعاؤں کی درخواست کرتے رہتے ہیں' ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ دربار کے کسی امیر نے اُن سے کہا کہ حضرت! میرے حق میں دُعا کیجئے کہ اس مُلک کی بادشاہت مجھے مل جائے"

بادشاہ نے پوچھا" پھر! اُنھوں نے اس کے لیئے دُعا کی؟"

چغل خور نے جواب دیا" ضرور کی ہو[گی] بلکہ میں نے تو یہ سُنا ہے کہ دربار کے ذِمّہ دار اور بااثر لوگ اکثر و بیشتر وہاں پہنچتے رہتے ہیں اور اُن سے دُعائیں کراتے رہتے ہیں"۔

بادشاہ نے کہا" اگر وہ لوگوں کے

بس پھر کیا تھا۔ مریض اس سبزہ پر ٹوٹ پڑے اور چند دنوں میں ہی اس کا صفایا ہوگیا۔ جب سبزہ ختم ہوگیا تو وہاں کی مٹی استعمال کی جانے لگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طاعون کے مریض سبزہ اور مٹی سے صحت یاب بھی ہو گئے۔

دعائیں کرتے رہتے ہیں تو میں کیا کروں؟ وہ درویش ہیں، اُن کی دُعا اور بددعا پر میرا کیا اختیار، میں اُن سے نہیں اُلجھنا چاہتا۔"

کسی دوسرے چغل خور نے عرض کیا "حضور اُن سے کچھ کیوں کہیں، اگر حضور پسند فرمائیں تو اس ناچیز کے پاس ایک ایسی تجویز موجود ہے جس سے درباری امراء کا وہاں جانا موقوف ہو جائے گا اور عبدالقادر کا زور بھی ٹوٹ جائے گا"

بادشاہ نے پوچھا "وہ کیا تجویز ہے! ذرا ہم بھی تو سنیں!"

اُس نے جواب دیا "حضور والا اگر آپ عبدالقادر کی جگہ اُن کے بھائی کو خلیفہ و جانشین بنادیں تو درباری امراء کٹ جائیں گے۔"

بادشاہ کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اُس نے اس کا اقرار کیا "بیشک، تجویز تو بہت اچھی ہے اور اس سے اس شر کا سدباب بھی ہو جائے گا جس کا اندیشہ پایا جاتا ہے۔"

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا لائحہ عمل تیار کیا جانے لگا۔

ابھی بادشاہ کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت مخدوم کا ایک آدمی کاغذات کا پلندہ اور بادشاہ کے نام ایک خط لئے ہوئے دارالحکومت میں داخل ہوا۔

بادشاہ نے اس خط کو پڑھوایا اور کاغذات کا پلندہ ایک طرف رکھ دیا۔ اس خط میں انتہائی اختصار سے کام لیا گیا تھا۔

"ہم کو نہ تو بادشاہی جاگیر کی ضرورت ہے اور نہ سجادہ نشین کی۔ فرامینِ جاگیر متعلقہ خانقاہ واپس ارسال ہیں۔ آپ جس کو چاہیں سجادہ نشین بنادیں۔"

بادشاہ خوفزدہ ہوگیا اور اپنے ارادہ سے باز آگیا۔ جملہ فرامین حضرت مخدوم کو واپس کر دیئے اور جواب میں لکھ دیا۔

"ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں، گو کہ یہ کسی اور نے تجویز پیش کی تھی۔ فرامین متعلقہ جاگیر واپس ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ کم از کم ایک بار ضرور قدم رنجہ فرمائیں۔"

لیکن آپ دہلی نہیں گئے۔

شہر میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف جنازے اُٹھ رہے تھے اور لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کے بھاگ بھی رہے تھے۔ بخار چڑھتا، گلٹی نکلتی اور مریض کا کام تمام ہو جاتا۔

آپ جہاں وضو فرماتے تھے، وہاں سبزہ اُگ آیا تھا۔ معلوم نہیں کسی عاشق اور ارادتمند نے بہ حالتِ بیماری اس گھاس کو دوا کے طور پر استعمال کیا اور اچھا ہوگیا۔ یہ بات مشہور ہوگئی بس پھر کیا تھا۔ مریض اس سبزہ پر ٹوٹ پڑے اور چند دنوں میں ہی اس کا صفایا ہوگیا۔ جب سبزہ ختم ہوگیا تو وہاں کی مٹی استعمال کی جانے لگی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طاعون کے مریض سبزہ اور مٹی سے صحت یاب بھی ہو گئے۔ اب ہر طرف انہی کا ذکر تھا اور لوگوں نے آپ کو متفقہ طور پر مخدوم عبدالقادر ثانی کہنا شروع کر دیا۔

جب تک آپ زندہ رہے، اسلام اور انسانوں دونوں کی خدمت کرتے رہے اور کتنے ہی غیر مسلموں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

سنہ ۸۶۲ھ میں پیدا ہونے والی یہ حیرت انگیز شخصیت ۱۸ ربیع الاول سنہ ۹۴۰ھ میں وفات پا گئی۔ لوگ غربت سے امارت کی طرف جاتے ہیں لیکن آپ امارت سے غربت کی طرف مراجعت کر گئے اور درویشی میں وہ نام پیدا کیا کہ بادشاہ بھی اُن کی ہمسری نہ کر سکے۔

ختم شد

ہندی اکادمی دلی

اکادمی کی اہم خدمات اور حصول

ادبی مذاکرے کانفرنسیں اور مباحثے وغیرہ

سیمنار :-

تعلیمی سیمنار صحافت سیمنار ترجمہ سیمنار آچاریہ ہزاری پرساد دویدی سیمنار بھارتیندو ہریش چندر سیمنار میتھلی شرن گپت سیمنار ڈاکٹر راجندر پرساد سیمنار منشی پریم چند سیمنار ہندی اور راشٹریہ ایکتا سیمنار ہندی اردو آپسی سمبندھ سیمنار آچاریہ کاکا کالیلکر سیمنار مہامنا مالویہ سیمنار سنت روی داس سیمنار

مباحثے اور کانفرنسیں :-

ہندی اساتذہ کی کانفرنس ہندی کارکنوں کی کانفرنس 'جدوجہد آزادی میں ہندی ادیبوں کا رول' مباحثہ 'ساہتیہ اور سدبھاؤ' مباحثہ ہندی کے بیس بسنت مباحثہ 'ہندی ہم سب کی' مباحثہ ہندی ہفتہ / پکھواڑے' کا آیوجن ادیبوں سے انٹرویو۔

کوی سمیلن :-

اکادمی کی طرف سے ہر سال یوم جمہوریت اور یوم آزادی کے موقع پر ۲۳ جنوری اور ۱۲ اگست کو راشٹریہ کوی سمیلنوں کا آیوجن کیا جاتا ہے۔ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے جذبات کے پرچار اور پرسار کے لئے اکادمی کے ذریعہ کچھ خصوصی کوی سمیلنوں کا آیوجن بھی کیا گیا جس میں 'ایکتا کے سور' 'چیتنا کے سور' 'بندنا کے سور' میتھلی شرن گپت جنم شتابدی سمیلن خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

دیگر :- ہندی اکادمی نے سال ۸۷-۱۹۸۶ء کو 'ایکتا ورش' کی شکل میں منایا۔

ڈاکٹر نارائن دت پالیوال
سکریٹری :- ہندی اکادمی دلی۔ اے ۲۶/۲۷
سنلائٹ انشورنس بلڈنگ، آصف علی روڈ نئی دہلی ۲

جناب سُریش ستلانی کی رہائش گاہ
ایک محفلِ مسالمہ اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا
ں کی صدارت ہندوستان کے معروف شاعر
اب شاہد رتلامی نے کی جو ایک طویل عرصہ کے
د ہندوستان سے واپس لوٹے ہیں۔ جبکہ
رالدین مکی والا صاحب نے بہ حیثیت مہمانِ
صوصی شرکت کی اور نظامت کے فرائض جناب
لام مصطفٰے ابیکس نے انجام دیئے۔ اس
فل میں کم و بیش بیس شعرائے کرام اور متعدد
دب نواز خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ شاہد
لامی نے صاحبِ خانہ کا اور صاحبِ خانہ
ریش ستلانی صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

مسالمہ و مشاعرے کے باقاعدہ آغاز سے
قبل جناب ایوب قاسم کرجیکر کے والد، لغیتم
چودھری صاحب کی والدۂ ماجدہ کے انتقال پر
اظہارِ تعزیت کیا گیا۔ بعد ازاں فرید قریشی سحر
اکبرآبادی نے صدرِ مشاعرہ کا تعارف کرایا۔ جن شعراء
حضرات نے اس محفل میں نعت، سلام و غزلیں
پیش کیں، اُن کے نام یہ ہیں:۔
نور پرکار، عبدالحمید ہوش، عبداللہ ساجد

شاہد رتلامی، باقی احمد پوری، غلام مصطفٰے ابیکس
فرید قریشی سحر اکبرآبادی، طاہر کیفی، راز فتحپوری،
وفا صابری، رشید میواتی، محمد کمال الفطرۃ
عبدالمجید نجم، خورشید منظفر، عنبر فتحپوری، محمد
یونس طالب، محشر افغانی، اقبال راحت،
ایوب قاسم کرجیکر، افتخار اعظمی اور بنامن وردگ۔
مشاعرہ میں پڑھے گئے کچھ اشعار

درجِ ذیل ہیں۔

نیں کوئی نظم نہیں
جسے تم پڑھ سکو، معنی سمجھ سکو
الفاظ کی ادا، یا میری انا کو پرکھ سکو
یہ الگ بات کہ مجھے
میرے نام کے ہجے تک نہیں آتے
اور تم کتابیں پڑھ کے بھی
میرا نام بھول جاتے ہو۔
(نور پرکار)

شیشوں میں عکسِ زخمِ مقدر لئے ہوئے
میری صدی ہے ہاتھ میں پتھر لئے ہوئے
(عبداللہ ساجد)

آگ سے ربطِ محبت کو بڑھاتے کیوں ہو
موم کا جسم لئے دھوپ میں جاتے کیوں ہو
(شاہد رتلامی)

افسوس کربلا میں پیاسے رہے ہیں کون
وہ لوگ جن کے فیض سے چشمے اُبل پڑے
(غلام مصطفٰے ابیکس)

ایسی نماز کون پڑھے گا جہان میں
سجدہ کیا تو سر نہ اُٹھایا حسینؑ نے
(رشید میواتی)

وہ میرا ہمنشیں ہے ہزاروں کی بھیڑ میں
جیسے ہو چاند کوئی ستاروں کی بھیڑ میں
(عنبر فتح پوری)

تاریخ اس کو بھول نہ پائے گی تا ابد
بے مثل بن گئی ہے شہادت حسینؑ کی
(عبدالمجید نجم)

ناشناساؤں سے پہچان کرادو یارو
ایک قطرہ ہوں سمندر میں ملادو یارو
(محشر افغانی)

دل سے تیری یاد کا گر سلسلہ برہم ہوا
زندہ رہنے کیلئے پھر پاس کیا رہ جائیگا
(محمد یونس طالب)

دستِ جنوں کو دیکھئے کرتا ہے تار تار
دامن کبھی کبھی تو گریباں کبھی کبھی
(عبدالحمید ہوش)

ترے جمال کی جب بات کرنے لگتے ہیں
خیال و فکر میں سو رنگ بھرنے لگتے ہیں
(باقی احمد پوری)

حق سے تمھیں ملائیں گی راہیں حسینؑ کی
مل جائیں تم کو کاش پناہیں حسینؑ کی
(فرید قریشی سحر اکبرآبادی)

سانحۂ کربلا تاریخ اسلام کے انتہائی المناک واقعات میں سے ایک ایسا واقعہ ہے جس میں غم واندوہ کا ایک شدید تاثر اور عبرت و نصیحت کا پہلو شامل ہے۔ غور و تجسس سے کام لیا جائے تو شہدائے کربلا کے اس بے مثال جذبۂ ایثار و قربانی سے ایسے نتائج اخذ کرنے میں مدد مل سکتی ہے جن کی کسوٹی پر ہم اپنے معاشرتی گوشوں کو پرکھ سکتے ہیں۔ اور اپنے لئے جادۂ صداقت منتخب کر سکتے ہیں اور مستقبل کی اس راہِ مستقیم کو دریافت کر سکتے ہیں جو ہمیں اللہ ربّ العزت نے قرآن کریم کے ذریعہ، نبیٔ برحق ختم المرسلینؐ کے توسط سے بتائیں۔ لیکن ہم قرآنِ حکیم کی ان تعلیمات کو اپنے جاہ و حشم اور سیاسی رفتار کی بالادستی سے پیدا ہونے والے فکری جمود و انحطاط میں بار بار فراموش کرتے رہے ہمیں یہ یاد نہ رہا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والا صفات ہے، وہی لازوال و لافانی ہے۔ اس مسلمہ حقیقت کی روشنی میں ایسے لوگ خواہ وہ اپنے دور میں کتنے ہی بااثر و مقتدر رہے ہوں، اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک نبیؐ کی نصیحت و موعظت سے دامن کش ہونے کے باعث دائمی خسارے میں رہتے ہیں۔ یہ اصول کسی عہدِ حکومت یا زمانے میں معطل یا غیر مؤثر نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ جو دوسروں کو بے گناہ قتل کریں، ان کے حقوق غصب کریں، کسی جرم و خطا کے بغیر دوسروں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائیں اور اعلائے کلمۃ الحق کے الزام میں تشدد کے بدترین حربے آزمائیں، طاقتور ہونے کی بنا پر مظلوموں کا خون بہائیں، انھیں قرآنِ حکیم میں نہایت صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ قانونِ قدرت انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ خدا منصفِ حقیقی ہے وہ پورا پورا انصاف کرے گا۔

ہم جب کربلا کے سانحۂ عظیم پر غور کرنے اور سیاق و سباق کے ساتھ شہادتِ حسینؑ کے واقعات پر غور و فکر کا موقع ملتا ہے تو یہ دیکھ کر حزن و ملال بھی ہوتا ہے اور حیرت بھی کہ جن افراد یا عناصر کا ان واقعات سے براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق تھا، یا جو لوگ کسی بھی جواز سے ان واقعات کے ذمہ دار تھے انھوں نے اس حقیقت

کو کیوں فراموش کر دیا کہ ہر بندہ کو ایک نہ ایک دن اپنے خالقِ حقیقی کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ کیا انھیں یہ یاد نہیں رہا کہ خالقِ کائنات نے کتنی نسلوں کی بنا ڈالی اور کتنی ہی نافرمان، سرکش، اور گمراہی میں مبتلا اقوام کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا۔

لیکن دوسرے المناک پہلوؤں کی طرح یہ بھی ایک نہایت المناک اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو جب کبھی شدید نقصان اور شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا تو اس میں بیشتر تیر اپنے ہی کسی ترکش سے آئے تھے۔ فتنہ و فساد کی بنا خود اپنوں ہی نے ڈالی تھی اور اپنوں کے خلاف اپنوں ہی نے تلوار اٹھائی تھی۔ سانحۂ کربلا کا سب سے زیادہ افسوس ناک رُخ یہ ہے کہ حسینؓ ابنِ علیؓ اور اُن کے اقارب و رفقاء کے مدِ مقابل ایسے افراد کا لشکر تھا جو توحیدِ الٰہی اور رسالتِ محمدیؐ پر ایمان رکھتے تھے اور کلمہ گو تھے۔ لیکن نواسۂ رسولؐ، فرزندِ علیؓ اور جگر گوشۂ فاطمہؓ امام حسینؓ سے بیعتِ یزید لینے پر مُصر تھے اور اس بیعتِ یزید کے لئے تشدد، سختی اور ظلم و ستم کا کوئی حربہ نہ تھا جو لشکرِ یزید کی طرف سے حسینؓ اور اُن کے ساتھیوں پر نہ آزمایا گیا ہو۔ حسین علیہ السلام میدانِ کربلا میں خیمہ زن ہونے کے بعد لشکرِ یزید کی خانوادۂ رسالت پر سخت گیری، اور واقعاتِ شہادت پر تاریخ میں خاصی تفصیل موجود ہے اور یہ بات متفق علیہ ہے کہ یہ واقعۂ المیہ سرزمینِ کربلا پر رونما ہوا جو ۶۱ھ کے عشرۂ اوّل میں پیش آیا، جس نے تاریخِ اسلام میں ایک سیاہ باب کا اضافہ کر دیا جس کا ایک ایک لفظ لہو کی ایک ایک بوند کی طرح صفحۂ قرطاس پر ثبت ہو رہا تھا اور جس میں آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کا سبق موجود تھا اور جو ظالموں کی مستقل رسوائی اور ہزیمت کا تاریخی جائزہ تھا۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اسلامی تاریخ کے اوراق میں بے شمار شجاعت و سرفروشی کے ایسے واقعات ملتے ہیں جن پر نہ صرف مسلمانوں کے سر فخر و مباہات سے بلند

سیدنا حسینؑ کے حضور میں

تری بارگاہِ جمال پر جو نگاہِ شوق مچل گئی
مری شمعِ محفلِ آرزو جو بجھی ہوئی تھی وہ جل گئی

ترے کوئے ناز سے شور اٹھا کہ انا الشہید بکربلا
تری تیغِ حسنِ جہاں ستاں جو گلوئے عشق پہ چل گئی

نہ قرارِ جانِ نزار تھا [illegible]
وہ عجب [illegible] عشق میں ڈھل گئی

مجھے ایک لمحہ ملا تو تھا کہ میں جان تم پہ نثار کروں
مگر اپنے بخت کو کیا کروں جو گھڑی ملی تھی وہ ٹل گئی

[illegible]

بنی نوعِ انسان کی قیادت و امامت کا جو منصب انھیں سونپا تھا خود کو اس کا جائز وارث اور حقدار ثابت کرتے۔

المیۂ کربلا سے نہ صرف اہلِ اسلام بلکہ دیگر اقوامِ عالم کا متأثر ہونا اور امام حسینؑ کی حقانیت کا اعتراف کرنا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ افراد یا اقوام جو وجودِ الٰہی ہی سے منکر ہیں وہ بھی شہادتِ حسینؑ کے گُن گاتے ہیں۔ اس طرح ہر دَور میں اہلِ دُنیا نے اُنھیں حق کا امین اور رہبر سمجھا ہے، اور جب تک کرۂ ارض پر انسانی وجود باقی ہے، حسینؑ کو اسی طرح خراجِ عقیدت پیش

نظر سے دیکھا۔

آنجہانی مہاتما گاندھی نے کہا۔
"مَیں نے کربلا کے ہیرو کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جس سے مَیں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستان کی آزادی و اس کی بقا، حسینی اصولوں کو اپنانے میں مضمر ہے"

مسز سروجنی نائیڈو نے کہا:۔
"حسینؑ جیسے ہر دلعزیز اسلامی رہنما کی طرح کسی مذہب کے کسی رہنما کو ایسی غیر فانی عزت و شوکت

مقتل کی سرزمین پہ بناتے رہے حسین علیہ السلام
اسلام کی حیات کا نقشہ تمام رات

کتبہ: محمد حسین

وجاتے ہیں بلکہ غیر مسلم بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مسلمان محیرالعقول کارنامے انجام دینے والی ایک قوم ہے جس نے ہر شعبۂ زندگی میں پُر شکوہ کامیابیاں اور ہر میدانِ جنگ میں عظیم فتوحات حاصل کیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر مسلمانوں کی صفوں میں کچھ ذاتی غرض کے بندے، مفسد، فتنہ پرور اور در پردہ سازشوں کا جال بچھانے والے داخل نہ ہوتے تو فتح و کامرانی اور شہرت و نیک نامی کا یہ سلسلہ تاریخ کے کسی دَور میں بھی منقطع نہ ہو پاتا۔ مسلمان آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے اور پروردگارِ عالم نے

کیا جاتا رہے گا۔ کون نہیں جانتا کہ معرکۂ کربلا کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے، پھر دوسری اقوام کا امام حسینؑ پر اعتماد، رائے زنی، حمایت اور اظہارِ عقیدت کیوں ؟
اور کس لئے ؟ ——————

قبل اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب تلاش کریں، مناسب ہے کہ مختلف عقیدہ اور مختلف مذاہب کی چند اہم شخصیتوں کی حسینؑ سے متعلق رائے کا اظہار یہاں کر دیا جائے۔ جس سے اندازہ ہو سکے کہ اقوامِ عالم کے مشاہیر نے حسینؑ کو کس

نہیں، کہ حسینؑ کا نام تاریخ کے افق پر روشن ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔"

بابو راجندر پرشاد نے کہا:۔
"مَیں امام حسینؑ کی بڑی قدر کرتا ہوں اور اُنھیں انسانیت کو فروغ دینے والا تسلیم کرتا ہوں ہم سب بلا تفریق مذہب و ملت واقعۂ کربلا سے ایک سبق اور قوت حاصل کر سکتے ہیں۔"

فنِ خطاطی کا خوبصورت نمونہ

وقارِ خونِ شہیدانِ کربلا کی قسم
یزید مورچہ جیتا ہے جنگ ہارا ہے

چہلم حضرت امام حسین علیہ السلام

تحریر —
محمد حسین بگھروی

تجزیاتی مطالعہ

اُردو شاعری میں نعت گوئی اور منقبت نگاری دونوں ہی بڑی اہم اصنافِ سخن ہیں اور کچھ مخصوص اقدار کی حامل ہیں۔ ان کا اُردو ادب میں ایک منفرد اور نمایاں مقام ہے۔ دونوں کا اسلامی عقائد سے ایک کلیدی اور بُنیادی رشتہ ہے۔ نعت گوئی پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفٰے صلعم کی مدحت و توصیف ہے، جبکہ آلِ رسول، صحابۂ کرام اور دیگر بزرگانِ دین کی مدح سرائی منقبت نگاری کی تعریف میں آتی ہے۔ مگر ہندوستانی تہذیب، بھارتی کلچر اور اُردو شاعری اپنے مزاج اور فکروفن کے اعتبار سے ہمہ گیر اور سیکولر ہیں۔ اسی لئے اگرچہ یہ دونوں اصناف اپنی بعض بُنیادی قدروں کے مدِنظر مُسلم سخنوروں کا حصّہ سمجھی جاتی ہیں مگر اُردو شعروسُخن کی دُنیا میں واقعتاً ایسا بالکل نہیں ہے۔ یہاں پوری اُردو شاعری بلا لحاظِ مذہب و مِلّت اور فکروعقیدت ہر اہلِ فن اور صاحبِ ذوق کا بجا طور پر حق اور حصّہ ہے۔ چنانچہ اُردو شاعری کا ہر دَور اور اس کی ہر صنفِ سُخن اس حقیقت کی عکاس ہے۔

یہ دَور جوکہ اپنی شورشِ پسندی اور باہمی انتشار کے سبب نہایت پُرآشوب بنتا جارہا ہے اور اسی وجہ سے اگرچہ ہماری قومی اور انسانی یکجہتی میں بھی بہت سے شکن اور جھول آتے جارہے ہیں تاہم اُردو شعروفن میں برابر اس کی روایتی ہم آہنگی اور یگانگت برقرار ہے۔ یہاں تک کہ نعت گوئی اور منقبت نگاری میں وہی فکری اور ذہنی یکجہتی کی عکاسی نظر آتی ہے اور ان مخصوص اصناف میں بھی مُسلم اور غیرمُسلم سخنوران شانہ بشانہ اور قدم بہ قدم موجود ہیں۔ یہاں بھی بہت سے غیر مُسلموں نے نعت و منقبت کے بے شمار فن پارے اور آئینے تراشے ہیں اور فکروعقیدت کے بیش بہا گوہر بکھیرے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے غیرمُسلم صاحبِ ذوق حضرات کے تو ان اصناف میں دیوان اور مجموعے موجود ہیں۔ ایسے ہی صاحبِ قلم اور اربابِ فکر میں ایک قابلِ فخر اسمِ گرامی جناب کالی داس گپتا رضا ہیں۔ جن کا نعتیہ مجموعہ "اُجالے"

اس سلسلہ کا ایک بہترین اور لائق تحسین صحیفہ ہے اور جسے نعت و منقبت کے ادب میں ایک قابلِ داد تحفہ کہا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب رضاؔ صاحب اس دَور کے بڑے اچھے صاحبِ قلم اور اہلِ ذوق شعراء میں ہیں۔ ان کے قلم میں بڑی وسعت اور فکر و فن میں ہمہ گیری ہے۔ انھوں نے اُردو دُنیا کو کئی بلند پایہ اور گراں قدر شعری مجموعے اور تحفے عنایت کئے ہیں۔ ان میں "اُجالے" کے علاوہ "شعلۂ خاموش" "شورشِ بہاراں" "شاخِ گُل" اُن کے روایتی شعر و فن کے وہ گراں بہا صحیفے ہیں جو اُن کے ادبی مقام اور بلند پائیگی کے پورے عکاس ہیں۔ یہ اُن کے ادبی امتیاز کی آئینہ داری ہے کہ ان تینوں مجموعوں کو حکومت ہند اور اُترپردیش نے قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے اعزازات سے نوازا ہے۔ جیسے مجموعۂ کلام "شعلۂ خاموش" کو مرکزی حکومت کا ایوارڈ ملا ہے اور دوسرے دو مجموعے حکومت یو۔پی سے ایوارڈ یافتہ ہیں

جناب کالیداس گپتا رضاؔ اپنی دوسری اصنافِ سخن اور شعر و فن کے ساتھ نعت اور منقبت کے میدان میں بھی ایک اچھے شہسوار اور علمبردار ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے صرف معدودے چند عقیدت پارے نہیں تراشے بلکہ اس قسم کی تابناک قلم کاریوں کا ایک اچھا مجموعہ "اُجالے" ترتیب دیا ہے جو واقعی نعت و منقبت کی دُنیا میں کچھ نئے اُجالوں اور کرنوں کا آئینہ دار ہے جسے اُن کے نعتیہ فکر و فن اور منقبتی جذبات و احساسات کا بہترین مظہر کہنا چاہیئے۔

رضاؔ صاحب ادبی اور شعری دُنیا کی ایک ایسی خوش قسمت اور بلند پایہ ہستی ہیں جنھوں نے اپنے فکری اور قلمی دائرے کو ہندوستان سے باہر پہنچایا اور ہماری گوناگوں تہذیب، قومی یکجہتی اور اُردو شعر و سخن کی باہمی یگانگت کی روایات کو غیر ممالک میں بھی روشناس کرایا۔ خاص طور سے نعت و منقبت کا یہ مجموعہ "اُجالے" اسی سلسلہ کی ایک روشن کڑی ہے۔ آپ مشرقی افریقہ کے ایک مشہور شہر "نیروبی" میں تقریباً ۲۰، ۲۵ سال مقیم رہے۔ انھوں نے وہاں اُردو شعر و ادب کا ایک نیا جوش و خروش پیدا کیا اور بہت سی ادبی انجمنوں کی روحِ رواں بنے رہے۔ انھوں نے نیروبی جیسے شہر میں اپنے قیام کے دوران بڑی بڑی عظیم الشان ادبی محفلیں اور مشاعرے جگائے۔ اور ان میں نئی روشنی اور تابندگی دی۔ انھوں نے وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں اتنا ادبی ذوق شوق پیدا کیا کہ ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں بڑے بڑے ادبی جشن" اقبال ڈے" "حسین ڈے" اور "میلاد النبی" وغیرہ کا انعقاد عمل میں آیا ــــ

چنانچہ رضاؔ صاحب کی شاعری کے عروج کے ساتھ ساتھ ان کا یہ نعت و منقبت کا ذوق و جذبہ بھی اسی ماحول کی دین اور عکاسی ہے اور آپ کا یہ نعتیہ مجموعۂ کلام "اُجالے" بھی انھیں فکر و فن کی کرنوں کا عکس و آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ مجموعہ اگرچہ دیکھنے میں کچھ مختصر اور ان کی چوتھائی صدی کے فکری مجاہدے کے مدِ نظر کچھ ناقابلِ لحاظ ہے مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دَور کی تمام زرکاوشوں کا ایک ناقابلِ فراموش خلاصہ اور جوہر ہے۔

جہاں تک کالیداس گپتا رضاؔ کے نعت و منقبت کے ذوق و شوق کا سوال ہے وہ نیروبی میں ان کے لمبے قیام، اس ادبی ماحول کا عکس تو ہے ہی جہاں ان حضرات کو فکری یکجہتی اور باہمی یگانگت کی دُنیا میں رہنے کا ایک اچھا موقع ملا۔ مگر اس کے ساتھ ان کے اپنے سیکولر مزاج انسان دوستی، اور ادبی مذاق کی بھی آئینہ داری ہے اور ان کے اس نظریہ کی بھی نشان دہی ہے کہ "سبھی انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور سبھی مذاہب کے پیشوا اور عقائد برابر تعظیم و توصیف کے مستحق ہیں۔ مذاہب کی تقسیم سے کوئی نقصان نہیں بلکہ انسانوں کی تقسیم تکلیف دہ ہے" ان کے اس نظریہ کی، اس رُباعی میں عکاسی دیکھیئے:-

" بیکار کی باتوں نے اُبھارا ہم کو
عیسیٰؑ بھی، محمدؐ بھی ہے پیارا ہم کو
تقسیم مذاہب سے نہیں کچھ بگڑا
انسان کی تقسیم نے مارا ہم کو "

جہاں تک نعت گوئی اور منقبت نگاری کا تعلق ہے یہ دونوں اصنافِ سخن بعض فکری اور فنی اعتبارات سے بڑی نازک اور اہم ہیں۔ اس لئے کہ نعت، جو رسول اللہؐ کی تعریف و توصیف سے معنون ہے اس میں "با خدا دیوانہ باشد با محمدؐ ہوشیار" کے اصول کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے جس کے معنی ہیں کہ نعت اس احتیاط کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ اس میں اتنا غلو نہ ہو کہ اس کی سرحدیں "خدائیت" اور "الوہیت" سے ٹکرانے لگیں اور نہ ہی اتنی سبک سری ہو کہ رسولِ اکرمؐ کی شان میں کوئی ذرہ برابر بھی محرومیت آ جائے۔ اسی طرح منقبت میں یہ خیال رکھنا ہوتا ہے کہ اس میں صاحبِ منقبت کی انفرادیت اور امتیاز کی عکاسی ہوتی ہے۔

رضا صاحب کے نعتیہ اور منقبتی کلام کو جب اس آئینے میں دیکھتے ہیں تو ان کا تمام تر اس قسم کا کلام نعت و منقبت کی اقدار کا پوری طرح غماز نظر آتا ہے۔ ان کے نعتیہ مجموعہ "اُجالے" کے دو باب ہیں۔ ایک "بابِ رسالت" دوسرا "بابِ شہادت" پہلا باب نعتیہ عقیدت پاروں پر مشتمل ہے اور دوسرا حضرت امام حسینؓ اور کچھ دوسرے اہلِ بیت سے متعلق ہے۔ نعتیہ کلام میں عید میلاد النبیؐ، ولادتِ رسولؐ، میلادِ رسولؐ وغیرہ عنوانات کے علاوہ نعتیں، رباعیات اور قطعات ہیں جن میں رضا صاحب نے محبت و عقیدت میں ڈوب کر رسولِ مقبولؐ کی شان میں نذرانے پیش کئے ہیں اور ان تمام موضوعات کی روایتی اور کلیدی اقدار کو ملحوظ رکھا ہے جن کی عکاسی ان اقتباسات سے ہو رہی ہے۔

رباعی:۔ " ہر طور سے اس راز کو کھولا ہم نے
سو بار دِلوں میں اس بات کو تولا ہم نے
تحریر دہیں یا ملیں محمدؐ کی صفات
جس گوشۂ دل کو ٹٹولا ہم نے "

قطعہ:۔ وہ ثنا نغمہ کہ مُضطرب بھی ثنا خواں ہو جائے
شانِ دربارِ رسولؐ اور نمایاں ہو جائے

اے رضاؔ ذکرِ نبیؐ میں وہ عقیدت بھر دے
بزم کی بزم تری نعت پہ رقصاں ہوجائے

چنانچہ ایک ایسی نعت بھی دیکھئے جس پر
بزم کیا بلکہ ایک زمانہ رقص کرسکتا ہے۔ اس
خلوص و عقیدت کے ساتھ زورِ کلام بھی دیکھنے
قابل ہے اور ندرتِ بیانِ کتنا قابلِ داد ہے۔

" دوست اور دشمن پہ یکساں مہرباں تو ہی تو ہے
رہگزارِ زیست میں جوئے رواں تو ہی تو ہے
آنکھ جس کی ہے تمنائی وہ صورت ہے تری
گوش جس کے منتظر وہ داستاں تو ہی تو ہے
ڈوبنے انساں کی نظریں اور کس جانب اُٹھیں
جو لگادے پار وہ سیلِ رواں تو ہی تو ہے
طائرِ بے بال و پر بے آشیاں میں ہی تو ہوں
اوجِ پرواز و سکونِ آشیاں تو ہی تو ہے
بیقراروں کو ہے تیرا آسرا بعدِ خدا
روحِ دل تو ہی تو ہے تسکینِ جاں تو ہی تو ہے"

رضاؔ صاحب کی ایک اور نعت میں اُن کا
حسنِ تخیل، اور ذوقِ فکر ان کے خلوص و محبت
کی کس طرح عکاسی کر رہا ہے۔ الفاظ بڑے سادہ
اور زبان بڑی تیکھی ہے:۔

" ساقیٔ میخانۂ احمدؐ کی ہے کتنی اچھی
جام اچھے ہیں، خُم اچھے ہیں، صُراحی اچھی
جام و مینا سے نہیں ہم کو سروکار مگر
آپ کے نام پہ آجائے تو مستی اچھی
واسطے آپ کے جھیلوں تو ستم بھی اچھا
عشق میں آپ کے آئے تو بلا بھی اچھی
اُسوۂ شاہِ رُسلؐ کا جو ہوا دیوانہ
اُس نے بنیادِ طریقت کی اٹھائی اچھی "

رضاؔ صاحب نے نعت گوئی کے کچھ دوسرے
پہلوؤں پر بھی بڑے پُرخلوص اور سیرحاصل انداز سے
کوششیں کی ہیں اور مدحتِ رسول کا پورا حق ادا کیا ہے
جن میں بعثتِ رسول سے قبل کی عکاسی، میلادِ رسول
برکات، میلاد النبی کے مظاہر وغیرہ وغیرہ موضوعات

کے ساتھ آپ نے نعت گوئی کے خوب خوب
جوہر دکھائے ہیں، جن سے جناب کالی داس
گپتا کے پُرخلوص جذبات اور عشقِ عقیدت
کی بہترین آئینہ داری ہوتی ہے:۔ قبل از ولادت

" زمیں پہ روشنی نہیں، فلک پہ روشنی نہیں
سبب ضرور اس کا ہے کسی کو آگہی نہیں
محبتیں کہیں نہیں عداوتوں کا زور ہے
اذیتوں کا زور ہے، ضلالتوں کا زور ہے
نہ غنچہ میں چٹک رہی، نہ پھول عطر بیز ہے
خزاں کے ظلم و جور سے چمن بھی نالہ ریز ہے
سب اپنے اپنے تنگ دل قبیلوں میں بٹے ہوئے
ہیں سب کے دل عداوتوں کے زہر سے بجھے ہوئے

عیدِ میلاد النبیؐ:۔

آج ہے یومِ ولادت اُس رسولِ پاک کا
کیمیا جس نے بنایا ذرّہ ذرّہ خاک کا
آج وہ دن ہے کہ جس کی شان انوکھی شان ہے
جو سمجھ لے اس حقیقت کو وہی انسان ہے
آج ہی اس مردِ کامل کے قدومِ پاک سے
سینکڑوں انوار برسے فرش پر افلاک سے
آج کے دن آپ نے اے بانیٔ صدق و صفا
اس سرائے دہر میں رکھی حق و وحدت کی بنا
جب یہ دن دیتا ہے ہم کو درسِ صلح و آشتی
کیوں نہ پھر ہل کر منائیں عیدِ میلاد النبیؐ

برکاتِ محمدیؐ کا ذکر آپ نے ایک نعتیہ نظم میں
کتنے اچھے اور قابلِ داد انداز سے کیا ہے۔

آپ کیا آئے زمانے میں تبسم آیا
نالہ جاتا رہا گلشن میں ترنم آیا
لبِ خاموش کو اندازِ تکلم آیا
ظالم کا نور ہوا دل میں ترحم آیا
دوست دشمن سبھی آپس میں گلے ملنے لگے
ریت کے ٹیلوں پہ ہر رنگ کے گل کھلنے لگے

سرورِ کائنات حضرت محمد صلعم کی
بعثتِ مبارک کے بعد انسانی زندگی اور معاشرہ میں

کتنا زبردست انقلاب آیا اور انسان اور اُس کے
مقام کو کتنا عروج ملا، اس کی عکاسی رضاؔ صاحب
اپنی ایک نعتیہ نظم "اے امامِ زندگی" کے عنوان سے
اس طرح کرتے ہیں:۔

عرش سے لائے پیمبرؐ وہ پیامِ زندگی
بڑھ گیا جس سے وقار و احترامِ زندگی
اب کہاں بیتابیٔ دل ظلمتِ دل ہے کہاں
نورِ قرآنی سے ہے لبریز جامِ زندگی
ارض پر جب سے کلامِ پاک کا چرچا ہوا
عرش پر پہنچا ہے اُس دن سے مقامِ زندگی
زیستِ آزاد کی لذت عطا کی آپ نے
ورنہ رہتے آج تک ہم بھی غلامِ زندگی
خود عمل کر کے سکھایا ہے نبیؐ نے اے رضاؔ
خوب سے خوب، اچھے سے اچھا نظامِ زندگی

نعت گوئی کے ساتھ منقبت نگاری میں بھی
جناب کالیداس رضاؔ نے اسی خلوص اور جذبہ کا
اظہار کیا ہے۔ یہ اُن کے مجموعہ "اُجالے" کے دوسرے
باب میں بڑی آب و تاب سے جھلک رہا ہے۔ یہ "بابِ
شہادت" کے نام سے موسوم ہے۔ منقبت نگاری میں
مرکزی شخصیت حضرت امام حسینؑ کی ہے۔ اگرچہ
غیر مسلم سخنوروں کے یہاں عام طور سے امامِ عالی مقام
پر بہت کچھ کہا گیا ہے، مگر یہ رضاؔ صاحب کا ذوق و شوق
اور زورِ قلم ہے کہ انھوں نے حضرت امام حسینؑ کے
ساتھ دوسرے اہلِ بیت "حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؑ
وغیرہ کئی دوسری جلیل القدر شخصیتوں پر بھی خامہ
فرسائی کی ہے اور منقبت نگاری کے اچھے جوہر
دکھائے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ کی عظمت، شہادت،
اور ان کی راہِ حق میں بے مثال قربانی پر رضاؔ صاحب
کی بہت سی اور مختلف انداز کی کاوشیں ہیں۔ اُن
میں رباعیات، قطعات، سلام اور نظمیات سبھی کچھ
ہیں۔ اس سلسلہ میں چند عقیدت پارے پیش کئے
جاتے ہیں۔ زبان و بیان کی ندرت دیکھئے
رباعی:۔ بڑھتے ہوئے فتنوں کی رکاوٹ تجھ سے
ہے خون میں جوش کی گھلاوٹ تجھ سے
اے جانِ جہاں، جانِ علیؑ جانِ رسولؐ

قرباں گہہ کربل کی سجاوٹ تجھ سے "

قطعہ۔ اے حسینؑ ابن علیؑ، شانِ محمدؐ
تجھ سے سرسبز ہے گلستانِ محمدؐ
تو نگہ دار ہے تسلیم و رضا کا
اک نظر ہم پہ بھی اے جانِ محمدؐ

نظم " اے حسینؑ "
تیری عزت تیری عظمت سے اجازت مانگ کر
کہہ رہا ہوں قصۂ صبر و صداقت اے حسینؑ
یہ عظیم الشان قربانی کا تیری ہے کمال
بڑھ گیا اسلام میں رنگِ شجاعت اے حسینؑ
جو دلِ اسلام کو رکھنی ہے اب تک برقرار
ہے ترے اک قطرۂ خوں کی حرارت اے حسینؑ
تو نے اپنے خون سے سو رنگ اس میں بھر دیئے
جب کبھی جب ہونے لگی شانِ حقیقت اے حسینؑ
پھر وہی ایثار کا جذبہ دکھا دیئے ہر کو
اے طہارت اے شہادت اے امامت اے حسینؑ

حضرتِ فاطمہ زہرا کا بھی اہلِ بیت میں ایک بڑا عظیم و جلیل مقام ہے۔ یہ نبی اکرم کی صاحبزادی اور حضرت امام حسن اور حسین کی والدۂ محترمہ تھیں مگر منقبت نگاروں میں بہت کم حضرات نے ان کی شان میں قلم فرسائی کی جرأت کی ہے۔ تاہم جناب کالیہ سن رضا صاحب کو چونکہ اہل بیت سے پوری عقیدت و محبت تھی اس لئے انھوں نے خاتونِ جنت حضرت فاطمہ کی شان میں بھی بڑے کامیاب عقیدت پارے گذارے ہیں۔ ایک قطعہ ہے ؎

اے طاہرہ اے بلبلِ گلزارِ محمدؐ
اے زاہدہ اے مدرکِ اسرارِ محمدؐ
افضل ہی کوئی تیرے فضائل کو گن لے
اے سیدہ اے مرکزِ انوارِ محمدؐ

منقبت کے حسینیاتی پہلوؤں میں کئی اور اہم شخصیتیں ہیں جن کا معرکۂ کربلا میں نمایاں مقام ہے "نوحہ" ارضِ کربلا" اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے

چنانچہ رضا صاحب کے جوش و جذبہ اور وسعتِ فکر کی حدیں وہاں تک بھی پہونچی ہیں اور انھوں نے اپنی حسینی نظمیات میں جگہ جگہ ان حضرات کو بھی نذرانے پیش کئے ہیں اور "معرکۂ کربلا" کے عنوان سے ایک علیحدہ کاوش میں اس خونچکاں داستان کی بڑی المناک تصویر کھینچی ہے۔ جناب علی اصغر کی شان میں چند شعر ہیں :۔

تھی پیاس کی کلفت سب کیلئے شدت تھی علی اصغر کے لئے
ہے جن کے لئے کوثر تر تڑپا کئے چلّو بھر کے لئے
پیاسا ہی رہا ہم شکل نبی پینے کے لئے قطرہ نہ ملا
تھے زخم بھی خون بہانے کو تھے اشک بھی چشمِ تر کے لئے
ہر آن جفا ہر لحظہ ستم اشکوں کا بھی منبع سوکھ گیا
رستہ ہی کوئی باقی نہ رہا تسکینِ دلِ مضطر کے لئے

اے طاہرہ اے بلبلِ گلزارِ محمدؐ
اے زاہدہ اے مدرکِ اسرارِ محمدؐ
افضل ہی کوئی تیرے فضائل کو گنا دے
اے سیدہ اے مرکزِ انوارِ محمدؐ

"معرکۂ کربلا" کے بندوں میں رضا صاحب نے اس عظیم الشان اور بے مثال تاریخی معرکہ کے کئی اچھوتے پہلوؤں پر بڑے پُراثر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ایک بند میں کچھ دوسرے اہلِ بیت کا ذکر دیکھئے ؎

شبیرؑ ہیں اک فرض ادا کرنے پہ مامور
عباسِ دلاور ہیں کہ جرأت میں ہیں مشہور
ہیں اہلِ حرم جن کے ہیں دل یاس سے معمور
کچھ اور سادات ہیں و فاجن کا ہے دستور
یا عابدِ بیمار ہیں دریا کے کنارے

اس نظم کے آخری بند میں رضا صاحب نے کتنے پرسوز انداز سے واقعہ نگاری کی ہے ؎

اے کلکِ رضا تھم، بڑا خونیں ہے یہ منظر
ہاں آج شہیدوں کو ملا زیست کا ساغر
میداں میں ہیں عباس نہ اکبر ہیں نہ اصغر
مقتول ہوئے آج بہتر کے بہتر
سوئے ہوئے حقدار ہیں دریا کے کنارے

اسی سلسلہ کی ایک اور نظم " یادِ کربلا" کے آخری بند میں بھی حضرتِ شبیر کی شان اور عظمت کی عکاسی دیکھئے :۔

اَلسَّلَامُ اے شاہِ دوراں اَلسَّلَامُ اے شاہِ دیں
اَلسَّلَامُ ابنِ پیمبر اے امامت کے امیں
اَلسَّلَامُ اے دشمنی سے دُور، الفت کے قریں
اَلسَّلَامُ اے مرکزِ علم و عمل صد آفریں
واقعی شبیر نے اپنے لہو سے اے رضا
عظمتِ اسلام کے جامہ کو رنگیں کر دیا۔

جناب کالیہ سن گپت رضا کے مجموعہ "اُجالے" کے ان اقتباسات اور خلوص پاروں سے یہ نشان دہی ہو رہی ہے کہ آپ اردو دنیا کے اس دور میں وہ صاحبِ قلم اور اہلِ ذوق ہیں جنھوں نے شعر و فن کے کئی گرانقدر صحیفوں کے ساتھ نعت و منقبت کے میدان میں بھی اپنے فکر و تخیل کے جوہر دکھائے اور خلوص و عقیدت کے بہترین نگینے تراشے ہیں، جن سے ایک طرف ان کی وسعت نظری، بلند خیالی، انسان دوستی اور صاف طبعی کی غمازی ہوتی ہے، اور دوسری طرف اسلامیات سے اُن کی دلچسپی اور معلومات، نعت و منقبت سے ایک فطری ذوق اور حسینیات سے پُرخلوص عقیدت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ خاص طور سے اس پُرآشوب زمانے میں غیر مسلم سخن کاروں کی صف میں اُن کا یہ مقام بڑا ہی قابلِ داد اور لائقِ تحسین ہے اور اردو شاعری کی دنیا میں فکری یک جہتی اور باہمی یگانگت کی کھلی آئینہ داری کرتا ہے۔

آفریں! آفریں! مرحبا! مرحبا!
یہ فکر و تخیل، یہ ذوقِ رضا۔

حسینؑ ابنِ علیؑ ایثار و قربانی کی دُنیا میں تا قیامِ شمس و قمر جلوہ گر رہیں گے۔ انگریزی ادیب کارلائل کا خراجِ تحسین شہیدِ انسانیت کی خدمت میں کہ "حسینؑ نہ صرف عالمِ اسلام میں احترام و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، بلکہ پیروانِ عیسےؑ بھی اپنے پیغمبر کی طرح حسینؑ کی خدمت میں گلہائے عقیدت پیش کرتے ہیں" امام حسینؑ کے ابدی پیام کی یاد دلاتا ہے جو دسویں محرم کو کربلا کے ریگستانوں میں گونج اُٹھا کہ

"سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں"

اسی ابدی پیام کی پرزور تحریک سے متاثر ہو کر آزادی حاصل کرنے گاندھی جی اُٹھ کھڑے ہوئے ہندوستان کی تاریخ آزادی میں سنہ ۱۹۲۱ء ایک سنگِ میل ثابت ہوا جو ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں آزاد ہندوستان کے زیرِ سایہ پرچم ہند لہراتا ہوا بڑے تابناکیوں کے ڈانڈے ابدی پیامِ حسینی سے ملاتا ہے۔ گاندھی جی نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر امام حسینؑ کو اپنی مدد کے لئے اس وقت پکارا جب اُن کا پہلا قدم انگریز حکمرانوں کے ظلم و تعدّی کے خلاف اٹھ رہا تھا۔ ڈانڈی مارچ سنہ ۱۹۲۱ء میں ۷۲ افراد کا انتخاب کیا گیا تھا اِن الفاظ کے ساتھ کہ "جس طرح کربلا کی جنگ میں حضرت امام حسینؑ نے اپنے ۷۲ بے مثال رفقائے کے ساتھ رہتی دُنیا تک صداقت و انسانیت کا پرچم بلند کیا، مَیں بھی اُسی عظیم الشان عمل کو اپنا راہبر بنا کر کامیابی کی منزل پر پہنچ جاؤں گا۔"

کارلائل ایک عظیم المرتبت ادیب مانا گیا ہے لیکن گاندھی جی نے اپنی تاریخی قیادت کی بدولت نہ صرف ہندوستان کو انگریز حکومت سے آزاد کروایا بلکہ دُنیا کے ہر گوشہ سے آزادی کی تحریکوں میں گاندھی اِزم کو ایک بُنیادی اصول تسلیم کیا گیا ہے۔ ایسی عالمگیر شخصیت نے اپنی سیاسی عملی زندگی کو پرچمِ حسینؑ کے تلے سنوارا اور ہندوستانی قوم کو چار چاند لگا دیئے۔

فی الحقیقت کسی ایثار کو جاودانی اور کسی پیام کو لافانی حقیقت عطا کرنے کے لئے صداقت اور عمل کو بُنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ مشہور ماہرِ عمرانیات ای۔ ایچ۔ ڈاسن سماج اور مذہب پر بحث کرتے وقت یوں رقم طراز ہے کہ:۔

"مذہب یا اُس کے پیش کرنے والوں نے صداقت کا دامن تھامے بغیر

اپنے ایثار کی تصویر پیش کی تو سمجھ
لیجئے کہ یہ ایک عیر دانشمندانہ عمل ہوگا۔
ثابت یہ ہوا کہ ڈاسن کے اس جملہ سے کہ
ایثار وصداقت ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم
ہیں۔ براین وجہ حضرت امام حسینؑ کے لافانی ایثار
نے ہر مکتبِ خیال کے حامیوں سے صداقت کا لوہا
منوالیا ہے۔ علومِ حاضرہ کے سراہنے والوں
سے التجا ہے کہ کسی پیام یا مکتبِ خیال کو حقیقت
پسندی قبول کرنے سے پہلے روضۂ حسینؑ پر حاضری
دینی پڑے گی۔ جہاں ایثار وقربانی کے ۷۲ انمول
موتی اپنی ساری تابناکیوں کے ساتھ معیارِ صداقت و
ایثار کی ضیا پاشیوں سے جگمگ نظر آئیں گے۔
آستانۂ حسینؑ پر جبہ سائی ڈاسن جیسے ماہرِ
عمرانیات تو کرتے آئے ہیں لیکن پیامِ اسلام
کو زندۂ جاوید بنانے والے حسینؑ اپنے نانا جناب
پیغمبرِ خدا سے خراجِ عقیدت کے مہکتے پھولوں
سے نوازے جاتے ہیں۔ اس روحانی کیفیت
سے متاثر ہو کر علامہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ
نے آواز دی" اللہ کرا ے حسینؑ کار کردی"
ساتھ ہی خواجۂ خواجگانِ ہند کی مقدس نگاہوں نے
بارگاہِ حسینؑ کا بوسہ بھی لیا اور زبان یوں پکار اٹھی ؎

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دیں است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دستِ یزیدؔ
حقا کہ بنائے لا اِلٰہ است حسینؑ

محبتِ حسینؑ میں بلند ہونے والی آوازوں
پر دنیا دم بھر رہی ہے اور ہم سب کا چہیتا اقبالؔ
خاموش ؟ نہیں نہیں — علامہ اقبالؔ تو
اہلبیت اطہار پر نچھاور ہونے والوں میں شمار
کئے جاتے ہیں۔ کہاں کہاں اقبالؔ کی انوکھی
صداقت پسندانہ شاعری آب وتاب کے ساتھ
نظر آتی ہے۔ اقبالؔ جیسے فلسفی شاعر کی زبان نئے
نئے انداز میں یوں نغمہ سرا ہے ؎

" اللہ اللہ ! بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر
نقشِ الّا اللہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

جہاں آقا حسینؑ کا ذکر آئے گا، وہاں
اُمّ المصائب، شریکۃ الحسینؑ جناب زینبؑ کا ذکر
کیسے نہیں آئے گا ؟ علامہ اقبالؒ تو سجدہ ریز ہو چکے
نجفِ اشرف میں، مدینۂ منورہ میں، کربلائے معلیٰ میں
اور دمشق میں کھل کر پکارا ٹھے اقبالؔ کہ •

کتابِ عشق دو باب است کربلا و دمشق
یکے حسینؑ رقم کرد و دیگرے زینبؑ

ماہرِ قانون عدل وانصاف کی معرکۃ الآرا
ہستی جن کا سلسلہ چشتیہ عقیدے سے جا ملتا ہے،
اور جن کی انگریزی ادب میں بھی ایک خاص شہرت
ہے، تحریر کرتے ہیں اپنی کتاب "دی اسپرٹ آف
اسلام" (The Spirit of Islam)
میں :—

I am one of those
greatful persons
whose intellect
beheld the light
of wisdom on the
threshhold of Imam
Hussain, who was
valiant like his father.

(میں اُن ممنون افراد میں سے ایک ہوں
جن کی دانشمندی نے خردمندی کے نور کو آستانۂ
حسینؑ پر جلوہ افروز دیکھا ہے، وہ جری حسینؑ جس
کی بہادری اُن کے بابا علی ابن ابیطالب کی جوانمردی
کے مماثل تھی۔)
حسینؑ جیسی لازوال مقدس ہستی اب
کا ہے کو ہے کوئی حامل اس ایک شعر کا
سوائے حسینؑ کے جنھیں شاہد صدیقی نے یوں
پکارا ہے ؎

یہ ظلمت ونور کا تصادم ازل سے جاری ہے زندگی میں
یزید شمعیں بجھا رہا ہے حسینؑ شمعیں جلا رہے ہیں

ہم نے دیکھ لیا کہ مختلف النوع مکاتبِ
خیال کی ہستیاں کس خلوص ودیانت داری سے
اپنے اپنے جذبات ظاہر کرتی ہیں۔ اور ایسے فرقے
جو کربلا میں دکھائی دیئے اور مستقبل میں چشمِ
فلک بھی دیکھ سکتی لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں
ہو سکتے کہ شمعِ حسینی کے پروانوں میں ہمارا نام نہ
لکھا جائے یہ ممکن ہے اور ایسا ہوتا بھی آرہا
ہے۔ لیکن اُن نقوش پر جبہ سائی کرنی پڑے گی، جو
ریگِ گرمِ کربلا پر تا قیامِ شمس وقمر درسِ حقانیت دیتے
رہیں گے دعوے ثبوت چاہتا ہے۔ حسینی پیام کو
عمل کے سانچوں میں ڈھالنا ہی پڑے گا ورنہ۔ لیجئے
زبانی پانی پر نمک کے محل بنانا ہے۔ زبانی دعوے اور
میدانِ عمل سے گریز احسینؑ کے چاہنے والوں کو زیب
نہیں دیتا کہ جس راہِ نجات کی نشاندہی ہمارا قدیم
قائدِ محترم کر چکا ہے اُس پر سجدہ ریز نہ ہو جائیں۔
ماں جناب فاطمہ زہرا کا عمل آخر نماز،
بابا علیؑ مرتضیٰ کی آخری منزل سجدہ اور آقا حسینؑ
کا سر ؎

" سر جو نیزہ پر چڑھا شبیرؑ کا
دونوں عالم سر جھکا کر رہ گئے "

سجدہ گاہ غسل گاہ بن گئی۔ فرزند امام زین العابدینؑ
نے ایسی مسلسل عبادت کی کہ سید الساجدین کے
لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان مقدس ہستیوں
کی عبادت خود ایک لازوال پیام بن گئی۔ ایسے
مقدس پیام پر ہم سب کا سلام۔ اس یقین آفرینی
کی روشنی میں جو بعد عصر کربلا کے ریگستانوں پر نور
کی چادریں بچھا رہی ہے کہ ہم لفظاً وعملاً آقا حسینؑ کے
پیام پر اپنی جانیں نچھاور کر دیں گے تا کہ ہمارا سلسلۂ
عبادت جاری رہے اور صراطِ مستقیم ہے جس
پر نمازی گامزن ہیں، حسینؑ کے چاہنے والے رواں
دواں ہیں تا کہ بیکسوں کی مدد کی جائے طالبانِ علم
کی مدد کی جائے، سماج سے برائیوں کو دور کرنے
کے لئے قدم اٹھایا جائے اور "سر داد نہ داد دست"
کی روح کو للکارا جائے کہ پیامِ حسینی پر مر مٹنے
والے
" سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں "۔

حضرت حسینؓ کا معاشی پیام اور حسینی سیاست

حامد لطیف ملتانی قادری

ایک جانب یزید کی جبر و نفرت، ملوکیت و استبداد، استعماریت و قہاریت صف آرا تھی تو دوسری جانب حسینؓ حق کی حمایت، اسلام کی بقا، انسانیت کے تحفظ، حریت و آزادی کا بول بالا کرنے کے لئے آمادۂ جہاد تھے

تاریخ اسلام میں امام حسینؓ کی سیاست کو عظیم الشان اہمیت حاصل ہے

حضرت امام حسینؓ سرمایہ داری اور دولت جمع کرنے کے سخت خلاف تھے، شان و شوکت، عیش پسندی اور نفسانیت کے بھی بہت مخالف تھے۔ حضرت کے پاس کافی دولت رہا کرتی تھی اور اس دولت کو غربا و مساکین وغیرہ میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ حضرت امام حسینؓ دولت کا انبار لگانے کو ناپسند کرتے تھے۔ اس لئے ہزاروں درہم قومی تعمیری کاموں اور خیرات میں خرچ فرما دیا کرتے تھے۔ عزت و دولت کی برابر تقسیم، زکوٰۃ کی غربا میں تقسیم و کارِ خیر میں عمل فرمایا کرتے تھے۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر توکل فرمایا کرتے تھے اور دولت کو قوم کی غربت و افلاس دور کرنے میں صرف فرمایا کرتے۔ حضرت کی سخاوت و فیاضی مشہور تھی۔ کبھی کوئی ضرورت مند خالی ہاتھ درِ حسینؓ سے واپس نہیں گیا۔ بیت المال کے طریق عمل کو بہت پسند فرمایا کرتے تھے اور مال غنیمت و زکوٰۃ ہمیشہ غریبوں میں تقسیم کرتے اور دوسروں کو ہدایت فرماتے۔

حسینی سیاست

تاریخ اسلام میں امام حسینؓ کی سیاست کو عظیم الشان اہمیت حاصل ہے۔ سیاست

حسینؑ ہی کی وجہ سے اسلام اب تک دنیا میں باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس مقدس فلسفۂ سیاست نے عالمِ انسانیت پر اپنے خوشگوار اثرات مرتب کئے ہیں جو رہتی دنیا تک تازہ رہیں گے۔ حسینؑ کی سیاست و تدبر کی کامیابی کا راز بقا و عروجِ اسلام میں مضمر ہے۔ حسینؑ نے میدانِ کربلا میں دنیا کو وہ درسِ سیاست دیا جو تاریخِ عالم میں عدیم النظیر ہے۔ حالتِ بے سر و سامانی، غربت و یاس، بھوک و پیاس کی شدت میں حق و صداقت کی حمایت کرتے ہوئے، انسانیت کے اصول کی تائید میں، حریت و آزادی کا علَم بلند کر کے حسینؑ نے اُس وقت کی عظیم ترین سلطنت و بے پناہ لشکرِ جرّار کا مقابلہ کیا جو انسانیت کا خاتمہ کرنے اور بربریت بہیمیت کو جاری کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ ایک جانب یزید کی جبر و نفرت، ملوکیت، استبداد، استعماریت و قہاریت صف آرا تھی، تو دوسری جانب حسینؑ حق کی حمایت، اسلام کی بقا و انسانیت کے تحفظ اور حریت و آزادی کا بول بالا کرنے کے لئے آمادۂ جہاد تھے۔ بربریت و انسانیت، جبر و تشدد، صبر و ایثار، آزادی، ملوکیت و عمومیتِ اسلام، شخصی آمریت و آزادی کی قوتوں میں میدانِ کربلا میں تصادم ہوا۔ بظاہر استعماریت و ملوکیت کی فتح ہوئی۔ مگر باطنی طور پر حق و صداقت کو کامیابی ہوئی اور بہت جلد جبر و ظلم کا خاتمہ ہو گیا۔ قانونِ الٰہی نافذ ہو کر حریت و آزادی کو فروغ ہوا۔ اسلام کو حیات نو ملی اور وہ پھلتا پھولتا ہی گیا۔ حسینؑ نے میدانِ کربلا میں انسانیت کے اُن زریں اصولوں کی تعلیم دی اور دنیا کو وہ مقدس درسِ حریت و آزادی دیا اور اسلام کو اس طرح مستحکم کیا اور شخصی ایثار و قربانی، صبر و استقلال سے آنے والی نسلوں کو وہ سبقِ عبرت دیا جو ہمیشہ انسانیت کے لئے شمعِ ہدایت کا کام دے گا۔ امام حسینؑ نے آزادی، مساوات، حکومتِ الٰہیہ کے قیام پر اپنی سیاست کی تعمیر کی۔ انھوں نے شخصی آمریت کے خلاف اسلامی عمومیت کی ہمیشہ حمایت کی۔ انسانی جبر و ظلم و اقتدارِ حکومت کے مقابلے میں خلافتِ الٰہیہ اور اقتدارِ مالک الملک کی تائید کی اور اسلامی مساوات، شخصی آزادی کو برقرار رکھا۔ حضرت حسینؑ کی سیاست دراصل اسلام ہی ہے اور اسلام کی سیاست قرآن، حدیث اور اسوۂ حسنۂ نبیؐ پر قائم ہے۔ چونکہ امام حسینؑ علیہ السلام نے آغوشِ نبیؐ میں پرورش پائی اور اسلامی ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی، اس لئے اس پر حضرت رسولِ خداؐ کی شخصیت، نبوت و مذہبی ربط کا بڑا گہرا اثر تھا اور دورِ خلافتِ راشدہ میں حضرت امامؑ نے عالمِ شباب میں اسلامی فتوحات اور انتظامات، سلطنت کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ ابتدا ہی سے حضرت حسینؑ حق و صداقت کے پرستار، آزادی و حریت کے دلدادہ، مساوات و انسانیت کے علمبردار اور خلافتِ الٰہیہ کے مؤید اور ملتِ اسلامیہ کے محسن تھے۔ وہ ہمیشہ شخصی اقتدار کے خلاف اللہ کی حکومت کے قائل تھے اور یہی حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی اصلی سیاست تھی۔

سلام

داغؔ دہلوی

ہائے یوں پیاس میں مانگے علی اصغرؑ پانی
آبِ پیکاں سے ملے بوند برابر پانی

وائے حسرت کہ پئیں اہلِ حرم خونِ جگر
اور اعدا کا پئے سامنے لشکر پانی

اتنی مدت رہے بے آب وہ پیاسے بچے
یاد اُن کو نہ رہا پینے میں کیونکر پانی

شاہؑ کی تشنہ لبی یاد جو آئی اُس وقت
پھینکا عباسؑ نے چلّو میں اٹھا کر پانی

ہائے وہ بحرِ کرم، ابرِ عطا یوں ترسے
تیسرے دن بھی نہ ہو شہ کو میسر پانی

ڈوب جاتی عرقِ شرم سے تو بہتر تھا
اے زمیں تجھ میں رہا نام کو کیونکر پانی

العطش سب کی زباں پر تھا کوئی دے نہ سکا
باپ بیٹے کو، برادر کو برادر، پانی

آبرو خاک ہو دنیا میں تری نہرِ فرات
آلِ احمدؐ کو دیا تو نے نہ بڑھ کر پانی

یہ دعا داغؔ کی ہے میں نہ رہوں تشنہ لب
مجھ کو دیں ساقیِ کوثر لبِ کوثر پانی

سلام

جلیلؔ مانک پوری

ہائے شبیرؑ نہ پائیں لبِ دریا پانی
بات ایسی ہے کہ ہوتا ہے کلیجہ پانی

آؤ دیکھیں علَمِ ساقیِ کوثر دیکھو
یہ جگہ وہ ہے جہاں بھرتے ہیں دریا پانی

نامِ شبیرؑ سے ملتی ہے وہ لذت دل کو
جیسے پیاسے کو مزہ دیتا ہے ٹھنڈا پانی

پیاس میں صبر تھا مقصودِ شہِ دیں ورنہ
قدمِ پاک کے نیچے سے نکلتا پانی

لیے تو دست تھے شمشیر ہی میں عباسؑ
مشک پہ اک ہاتھ پڑا اس پہ نہ مانگا پانی

ذکرِ شبیرؑ سے ہوتا ہے یہ حال آنکھوں کا
جس طرح پھوٹ کے دیتا ہے چھالا پانی

سامنے دیدۂ عباسؑ جھک جاتے تھے
ہو کے بیتاب جو کہتی تھی سکینہؑ پانی

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے میں قرباں جلیلؔ
ان پیالوں میں ہے کوثر کا چھلکتا پانی

جہاں آپ کی رقم پہلے سے زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے

اب ۹٪ سالانہ سود حاصل کیجئے

چھ ماہ اور اس سے زائد لیکن
ایک سال سے کم مدت کے لئے میعادی ڈپازٹ پر۔

●

فکسڈ ڈپازٹ پر شرح سود

۱۱٪ سالانہ ۲ سال کی مدت کے لئے
۱۰٪ سالانہ :۔ ایک سال سے زائد لیکن ۲ سال سے کم مدت کے لئے۔

●

سیونگ ڈپازٹ پر ۶٪ سالانہ سود دیا جاتا ہے۔

ایک ہزار روپے ۶ سال میں ۲۰۔۳۳ روپے بن جاتے ہیں۔
ایک ہزار روپے ۱۰ سال میں ۷۔۲۶۳ روپے بن جاتے ہیں۔

ہر قسم کے بینکنگ کے کاروبار (جس میں غیر ملکی زر مبادلہ بھی شامل ہے) کے لئے تشریف لائیں۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ ۳۶ نیتاجی سبھاش مارگ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون: ۲۶۸۲۶۶، ۲۶۴۲۷۴ ٹیلیکس 31 - 66823 Zain in

گلاچھوائی اور پلک موتنی

شخصیات، واقعات، تأثرات،

۲۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو میلہ گراونڈ کوروائی (مدھیہ پردیش) میں ایک غیرطرحی مشاعرہ ہوا جس میں دومقامی شعرار کو اُن کے مداحوں نے نوٹوں کے ہار غزل سانے کے دوران پہنائے بلکہ یہ ہار بار بار اُن کے گلوں سے چھوائے گئے کیونکہ ترنم تو انہی گلوں سے نکل رہا تھا۔ مشاعرہ ایسی ادبی محفل میں اس عمل یعنی گلاچھوائی پر اکثر شعرائے مشاعرہ نے اعتراض کیا اور کہا کہ اس قسم کی خوش فعلیاں طوائفوں کے مجروں میں تو سُنی تھیں مگر خالص ادبی محفل میں اس بدعت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔

یہ بدعت پنجابی کوی دربار (پنجابی زبان کے مشاعروں) میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ بلکہ جس پنجابی کوی (شاعر) کو زیادہ سے زیادہ روپیہ کلام سُناتے وقت سامعین کی طرف سے انعام کی صورت میں ملے گا وہ اُتنا ہی بڑا اور مقبول شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ نوٹوں کے ہار بھی پنجابی کوی درباروں میں ہی پنجابی گویئوں کو پہنائے جاتے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں بلکہ اس بدعت کو پنجابی شعرار خود ہوا دیتے ہیں اور وہ اپنے مداحوں سے پہلے ہی ملی بھگت کر لیتے ہیں کہ کوی دربار میں انہیں نقد روپیہ انعام کے طور پر دیں اور نوٹوں کے ہار پہنائیں تاکہ ان مداحوں کی دیکھا دیکھی دوسرے سامعین بھی نقد روپیہ انعام میں دیں۔ ملی بھگت والے مداحوں کا روپیہ بعد میں واپس کر دیا جاتا ہے۔

ہندی کوی سمیلن اس بدعت سے قطعی پاک ہیں۔ کئی بار اُردو مشاعروں میں بھی یہ بدعت دیکھنے میں آئی ہے مگر اُردو کے اُنہی شعرا نے اس قسم کا مظاہرہ کیا۔ تو ایسا نذرانہ قبول کیا جو شراب پینے کے عادی ہیں۔ کرنال کلب میں مشاعرہ ہو رہا تھا کہ ایک سردار صاحب جو شراب کے نشہ میں بدمست ہو رہے تھے سامعین میں سے اُٹھے اور مائک کے قریب آکر نور جہاں نور حیدرآبادی کو بیس روپے کا نوٹ پیش کیا۔ نور جہاں نور روپیہ کے معاملہ میں اپنے خسر حضرت مولینا انور صابری سے بھی کوسوں آگے تھیں لہٰذا انھوں نے بیس روپے کا نوٹ جھپٹ کر اپنی بیاض میں رکھ لیا۔ اس پر کرنال کے اُس وقت کے ڈپٹی کمشنر جناب سکھ دیو پرشاد اپنی نشست سے اُٹھے اور نور صاحبہ سے نوٹ واپس لے کر کلب کے سیکریٹری کو دے دیا کہ کلب کے حساب میں جمع کرایا جائے۔

مشاعروں میں اس قسم کے خالص قوالیانہ یا مجرے قسم کے نذرانے اُن لوگوں کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں جنھیں شعروشاعری سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور وہ اپنی سخن فہمی کا بھونڈا مظاہرہ اس طرح سے کرتے ہیں۔ اور جو شاعر ایسے نذرانوں کو قبول کرتے ہیں وہ زیادہ تر روپیہ کے ضرورت مند ہوتے ہیں

ویسے اُردو مشاعروں کے اکثر سامعین بہت ہی شاطر قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ شرابی شعرا کو مشاعرے سے پہلے یا بعد میں گھٹیا یا معمولی قسم کی شراب پلاکر اپنی مدّاحی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

اور اکثر شاعرات جو عام طور مشاعروں کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی ہوتی ہیں وہ اپنے مداحوں سے قیمتی ساڑھیاں تک قبول کرنے میں مشاق ہوتی ہیں۔ شاعرات کو ساڑھیوں کے تحفے دینے میں مئو ناتھ بھنجن کے ساڑھی بنانے والے کارخانہ دار خاصی شہرت رکھتے ہیں کیونکہ وہاں کسی شاعرہ یا متشاعرہ کے کلام یا ترنم کے معیار کی نسبت اُن کے حُسن کی داد دی جاتی ہے۔ اور پھر اُردو کے شاعروں یا شاعرات یا متشاعرات کو اگر اس قسم کی مداحی سے نوازا جاتا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ اُردو شاعری تو نام ہی اُس تثلیث کا ہے جو شراب، حسن اور موسیقی سے مرکب ہے۔

اُردو مشاعروں میں تو ایسا نیا طوائفانہ مجرے کا رنگ لانے میں بھی شاعری کے پردہ میں حسن پرستی کرنے والے منتظمین مشاعرہ کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔

دلّی کی ایک شاعرہ ہیں جن کا کلام یونہی برائے نام ہی ہوتا تھا اور وہ بھی کسی گھٹیا شاعر کا عطا کیا ہوا مگر چونکہ یہ شاعرہ کافی حسین تھیں (آجکل تو ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی ہیں) لہٰذا کیا سرکاری مشاعروں کے منتظمین اور کیا عام مشاعروں کے منتظمین، اس شاعرہ کو اپنے مشاعروں میں مدعو کرنے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ ٹیلی گرام پر ٹیلی گرام دے رہے ہیں، مُنہ مانگا معاوضہ منظور کر رہے ہیں طعام و قیام کے لئے اچھے سے اچھے انتظام کا لالچ دے رہے ہیں اور یہ شاعرہ تھیں کہ کسی طرح مشاعرہ کا دعوت نامہ منظور کرنے میں ہی نہ آتی تھیں بیچارے منتظمین مشاعرہ دلّی کے کچھ ایسے حضرات سے سفارش کرانے کے بعد اس شاعرہ کو بُک کر سکتے تھے جن کا اس شاعرہ اور اس کی والدہ سے مجلسی تعلقات ہوتے تھے۔

مُراد آباد کی ایک شاعرہ ہیں جنھوں نے منتظمین مشاعرہ کو اپنے حسن کا ایسا دیوانہ بنا رکھا تھا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ اس شاعرہ کو مدعو کرنے کے لئے بڑی دُور دُور سے منتظمین مشاعرہ مُراد آباد آ کر ان صاحبہ سے دست بستہ گذارش کرتے تھے۔ مشاعرہ میں شرکت کے معقول معاوضہ کے علاوہ نہ معلوم کیا کیا وعدے کرتے تھے تب کہیں جا کر یہ شاعرہ اپنی منظوری عطا فرماتی تھیں ان شاعرہ کے بارے میں 'شانِ ہند' میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر بیچاری شاعرات کا کیا قصور ہے۔ حرامی قسم کے کچھ منتظمین مشاعرہ اپنی کمینہ خصلت کی وجہ سے ایسی سفلہ پن کی حرکات کرتے تھے کہ جس سے اُردو اور اُردو کے مشاعرے دونوں بدنام ہوچکے تھے۔

لکھنؤ کی ایک شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنے ترنم کی وجہ سے اور اپنی طوائفانہ حرکتوں سے مشاعروں کے منتظمین تو کیا اکثر شعرائے کرام کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ اُردو کے ایک بڑے مشہور شاعر نے انہیں بڑے بڑے خوش ذوق لوگوں کو تحفتہً پیش کر کے خود تو ایک مقام حاصل کر لیا یہ بیچاری اب بھی اسی ڈگر پر چل رہی ہیں۔ ا... جسم پر بوٹی اور چہرہ پر رونق ہے لہٰذا کوئی نہ کوئی آنتو کا بھلا انھیں سہارا دینے کے بہانے خود ا... کے سہارے سے اپنا اُلّو سیدھا کرنے وا... مل ہی جاتا ہے۔
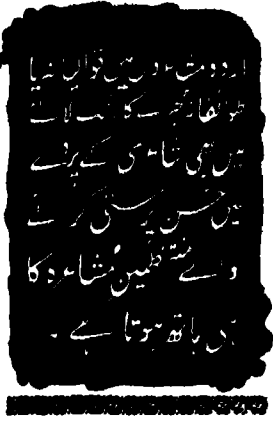
یو پی سے ہی ایک اور شاعرہ بڑے طمطرا... سے مشاعروں میں وارد ہوئی۔ اُن کے اُستا... بھی اُن کے ہمراہ رہتے تھے جو شکل و شباہت سے اُستاد کم اور سارنگی بجانے والے بہتر نظ... تھے۔ اُستاد صاحب شعر و شاعری میں معمولی س... بُوجھ رکھتے تھے۔ اِملا اُن کی اکثر غلط ہوتی تھی یہ شاگردہ اپنے اُستاد کا عطیہ کلام پڑھتی تھیں مگر پڑ... خوب تھیں۔ عُمر اُن کی جوانی کو دُور چھوڑ چکی تھی مگر بن ٹھن کر خوب رہتی تھیں۔ خصوصاً بالوں پر خاص تو... دیتی تھیں۔ مشاعروں میں جب انھوں نے اپنے اُس... سے زیادہ بہتر اور معقول شکل و شباہت کے ا... شاعروں کو دیکھا جو اپنی شاگردہ سے عشق لڑانے... اچھا تجربہ رکھتے تھے تو اُس شاعرہ نے اپنے اُستا... شاعرانہ طلاق دے دیا اور انبالہ کے مشاعرے اپنے نئے اُستاد کے ساتھ غسل خانہ میں راز و نیاز کے انداز میں پائی گئیں۔ جبکہ مشاعرہ عروج پر تھا،

اردو مشاعروں میں تو ایسا نیا طوائفانہ مجرے کا رنگ لانے میں بھی شاعری کے پردے میں حسن پرستی کرنے والے منتظمین مشاعرہ کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔

مشاعروں میں جب انھوں نے اپنے اُستاد سے زیادہ بہتر اور معقول شکل و شباہت کے ایسے شاعروں کو دیکھا جو اپنی شاگردہ سے عشق لڑانے کا اچھا تجربہ رکھتے تھے تو اُس شاعرہ نے اپنے اُستاد کو شاعرانہ طلاق دے دیا اور انبالہ کے مشاعرے میں اپنے نئے اُستاد کے ساتھ غسل خانہ میں راز و نیاز کے انداز میں پائی گئیں۔

بابِ انتقاد

راز و نیاز □ راز لائلپوری
سنہ ۱۹۸۵ء □ اڈیمائی سائز □ ۱۶۰ صفحات
۲۵ روپے □ ماہنامہ شانِ ہند دہلی

"راز و نیاز" غزلیات، رُباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے
راز بنیادی طور پر غزل گو ہیں۔ رُباعیات و قطعات میں بھی تغزل کی کیفیت موجود ہے۔

راز چونکہ قدیم اخلاقی و رُوحانی اقدار کے پاسدار ہیں اس لئے اُن کا کلام اعلیٰ اقدار کی شکست و ریخت سے محفوظ رہا۔ انھوں نے زندگی میں قدم قدم پر دوستوں سے فریب کھائے مگر خلوص کا دامن نہ چھوڑا۔ یہ اقدار پرستی کی دین ہے۔ فرماتے ہیں ؎

"قدم قدم پہ دیئے دوستوں نے لاکھ فریب
مرے خلوص میں لیکن نہ کچھ کمی آئی۔"

احترامِ اُستاد بھی ایک اعلیٰ قدر ہے۔ اُن کے مقطعوں میں اس کا کھُل کر اظہار ہوا ہے۔ مثلاً ؎

"جہاں میں اہلِ سخن راز کہتے ہیں مجھ کو
جناب ساحرؔ و اخترؔ کی خاکِ پا ہوں میں!"
ساحرؔ کے فیض و لطف سے کہہ لیتا ہے غزل
اب رازؔ کا شمار بھی اہلِ سخن میں ہے۔

اس سعادت مندی نے ہی رازؔ کو خود اعتمادی بخشی ہے۔ رازؔ داغؔ کے دبستانِ شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"فصاحت جس کی لونڈی ہے، بلاغت جس کی باندی ہے
فصیح مُلک، داغؔ دہلوی کا وہ دبستاں ہے۔"

اسی سرچشمۂ حیات سے شاعر شعورِ حیات حاصل کرتا ہے ؎

"ہم بہرہ ور ہیں دولتِ دانش سے زیست میں
حاصل ہمیں متاعِ شعورِ حیات ہے۔"

اور اسی وسیلہ سے شاعر کو وسعتِ قلب و نظر حاصل ہوتی ہے۔

"اک وہ کہ جن کو کام ہے اپنی ہی ذات سے
اک ہم کہ جن کو فکرِ دو عَم کائنات ہے!"

دُنیا اُن کے نزدیک درختِ بے ثمر ہے ؎

"چلے ہیں ہاتھ خالی ہم ادھر سے ملا کیا اِس درختِ بے ثمر سے!"

رازؔ شراب کے رسیا ہیں، اس لئے خمریات ان کی غزل کا خاصہ ہے۔ خمریات میں اُن کے فکر و فن کے جوہر کھُلتے ہیں۔ فرماتے ہیں

"مے نوش بے نیاز ہیں روزِ حساب سے
دھوتے ہیں روز دھبّے گنہ کے شراب سے"

ظاہر ہے ایسے بلا نوش حالاتِ عصر سے بے نیاز ہوں۔ تاہم خمریات کی معرفت کبھی کبھی ایسے شعر بھی کہہ دیتے ہیں ؎

"یہ کیا انداز ہے تقسیمِ مے کا تیری محفل میں؟
کوئی تشنہ رہے ساقی! کوئی سرشار ہو جائے۔"

اس شعر میں واضح طور پر حالاتِ حاضرہ کا عکس۔ ایک مقطع میں رازؔ کہتے ہیں ؎

"وہ اور تھے جنھیں بھر بھر کے جام اُس نے دیئے
ہمارے حصّہ میں اے رازؔ تشنگی آئی۔"

دیر و حرم پر میخانہ کی فوقیت کا اظہار کرتے ہیں ؎

"دیر و مسجد سے سروکار نہیں ہے اے رازؔ
صحنِ میخانہ میں جب چاہو بُلا لو مجھ کو"

میکدہ میں ہی فرض نماز ادا کرتے ہیں ؎

"میکدے ہی میں ادا کرتے رہے فرضِ نماز
ہم نے کعبہ کبھی دیکھا، نہ کلیسا دیکھا"

لیکن اس کے باوجود شرابِ رازؔ "شرابِ طہورہ" ہونے پاتی۔ ایک رباعی میں اپنی اعلیٰ ظرفی کا اعلان کرتے

"زخمِ جگرِ چاک نہیں سی سکتا ہرگز وہ مرے ساتھ نہیں جی
پینے کے لئے چاہیئے اعلیٰ ظرفی کم ظرف مرے ساتھ نہیں پی"

غرض "راز و نیاز" کی یہ جھلکیاں آپ نے دیکھیں اب آپ کتاب پڑھیئے تو یقیناً مزہ دوبالا ہو جائے گا اور پھر آپ شاعر سے فرمائش کریں۔

"رازؔ! تم ہی کوئی سناؤ غزل
کس لئے بیٹھے ہو میاں خاموش"

جاوید وشسٹ

محترمی و مکرمی بھائی سرور صاحب!

آپ کی کتاب موصول ہوئی طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ آپ نے اس کتاب کو تصنیف و ترتیب دے کر خود کو امر کر دیا اور قارئین کے اوپر احسان فرمایا ہے۔ ماشاء اللہ 'شانِ ہند' بھی روز افزوں ترقی کرتا جا رہا ہے۔ تازہ شمارہ کا اداریہ 'سن ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ پرستی کی وبا میں اضافہ' بہت بے باکی سے لکھا ہے اور بڑی تلخ حقیقت کی عکاسی کی ہے۔ امن و صلح دل میں ہوتی ہے اور نفرت کا جذبہ بھی دل سے ہی پیدا ہوتا ہے اور ان جذبات کے حامی ہمارے خیالات ہیں۔ ہمارا ملک ہندوستان ہے اور ہمارے لئے ہمارا دیش مقدم ہے۔ اس کی حفاظت اس کی خدمت ہمارا دھرم ہے۔ ان خیالات کو تسلیم کئے بغیر اور ان پر عمل ہوئے بغیر ہمارا اور ہمارے دیش کا مستقبل خطرہ میں ہے اور فرقہ پرستی بھی۔ گزیدہ

ڈاکٹر رام ناتھ پیسی

سول لائنز لدھیانہ

محترم بھائی صاحب

نمستے!

آپ کا خط صباحت لب خنداں کا مزہ دیتا ہے بار بار محبت کی کہکشاں سے گذر رہا ہوں۔ مگر آپ کے اداریل میں وہی نکیلا اور کٹیلا پن ہے۔ یوں لگتا ہے لکھتے وقت آپ کے اندر برہم تیج آ جاتا ہے اور آپ دریا کے کنار ہو جاتے ہیں۔ تحریرات سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ برائی اور ناانصافی کے خلاف آپ ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے ہیں مگر مفاہمت اور معاملہ فہمی اور مصلحت کوشی آپ میں کم ہے۔

بہر حال! آپ پڑھنے کی شے ہیں۔

آپ کا

اندر پرتاپ نیّر۔

برادر محترم سرور تونسوی صاحب!

آداب

'شانِ ہند' کے اکھٹے تین شمارے ملے۔ ٹائٹل پر چھپے رسالے کا نیا روپ رنگ بہت پسند آیا۔ ایک تھوڑا سا اور فربہ ہو جائے تو مزہ آ جائے۔

آپ کے ادارئیے بدستور رہنما اور فکر انگیز اور معلوماتی ہیں 'زندہ باد! اور زندہ باد' اور مبارکباد اس لئے بھی کہ دہلی اردو اکیڈمی نے آپ کو ایوارڈ سے نوازا ہے جس کے آپ صحیح معنوں میں ایک مدت سے حقدار تھے۔

'زندہ باد' پر یاد آیا یہاں ہماری لائبریری کے میرے اپنے سیکشن میں 'گڈ مارننگ' کی طرح 'زندہ باد' سلام کی طرح رواج پانے لگا ہے۔ چلو ہم سے نارویجنوں میں اردو نوشتہ کی یہ حقیر سی خدمت تو انجام ہوئی۔

ادھر میں نے اس صدی کے سترہ مشہور نارویجن افسانہ نگاروں کے افسانے اردو میں ترجمہ کئے ہیں جو عنقریب دہلی سے کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔

کل ہی ایک دوست کے خط سے فکر تونسوی صاحب کے رحلت فرما جانے کی دردناک خبر ملی ہے۔ انہوں نے اپنا آخری خط مجھے زیست کے آخری دن لکھا تھا 'ہفتہ بھر بعد دنیا ہی چھوڑ دی'۔ بہت شاک لگا۔ اس بار دہلی میں انہیں ملا تو بیماری اور گھر پڑنے کی وجہ سے بہت دل شکستہ تھے۔ باہر رہنے والا حساس انسان تو وطن کے ذرا سے نقصان کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے یہ تو اردو اور وطن دونوں کا نقصان عظیم ہے خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

اب اور کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔ دل بہت اداس ہو گیا ہے۔

مخلص۔

ہرچرن چاولہ

اوسلو، ناروے

محترم بھائی سرور تونسوی صاحب
آداب و نیاز!

عرض یہ ہے کہ 'شانِ ہند' جولائی ۱۹۸۶ء کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ۔ آپ کا اداریہ ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ پرستی کی وبا میں اضافہ" بہت پسند آیا۔ آپ کا مضمون حقائق پر مبنی ہے۔ اگر ہمارا قومی پریس اسی طرح کے مضامین شائع کرے تو یہ فرقہ پرستی کا بھوت ہمیشہ کے لئے دفن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ فرقہ پرستی کو ہوا دینے میں حکومت کے ساتھ ساتھ ہمارا قومی پریس بھی برابر کا شریک ہے۔ میری دعا ہے کہ خداوند قدوس 'شانِ ہند' کی مزید ترقی فرمائے اور آپ کو عمرِ جزیل عنایت فرمائے۔ آمین!

آپ کا مخلص
ڈاکٹر اکبر علی انصاری
جنرل سکریٹری:۔ انڈین یونین مسلم لیگ
تحصیل بلاری ضلع مراد آباد

درخدمت سرور صاحب۔ سلام مسنون!
من زبانِ اردو نمی دانم۔ فقط زبان فارسی می دانم۔ کتابی کہ شما فرستید کتابِ اولین است کہ من بہ طور مکمل خواندہ ام۔ این نوشتۂ شما خیلی دلچسپ است۔ امروز من این را ختم کردہ ام۔

باتبریکاتِ تمام
درخدمتِ دائمی شما
آچاریہ دھرمیندر ناتھ

محترمی سرور صاحب۔ تسلیم!
آپ کی کتاب نہایت دلچسپ اور قابلِ ستائش ہے۔ اگر میں یہ سچائی عرض کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ مرحوم سردار دیوان سنگھ مفتون کی "ناقابلِ فراموش" کے بعد اگر کسی دوسری تصنیف نے دل و دماغ اپنا اثر چھوڑا ہے تو وہ "بہ کوئے یار" ہے۔

سرور صاحب! آپ اسے میری خامی سمجھیے یا انتہائے ذوق، کہ جب ایسی دل پذیر کتاب پڑھنے لگتا ہوں تو بس اسے ختم کر کے ہی دم لیتا ہوں۔

اب تو جناب 'شانِ ہند' بھی نئی شان، سج دھج کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جس کے لئے مبارکباد! اُمید ہے کہ دیئے سے دیا جلانے کے مصداق آپ اسی طرح تاریخی اور دلچسپ تصانیف کا سلسلہ جاری رکھیں گے، جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

جناب کی اعلیٰ صحت اور قوتِ تحریر کے لئے ہمیشہ بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہوں۔

نیاز مند۔
لہری رام کلسی۔ کالکا

محترمی جناب سرور تونسوی صاحب۔
آداب و تسلیمات!

آپ کی کتاب "بہ کوئے یار" کا پارسل مل گیا تھا۔ بے شک اِس صدی میں اُردو زبان میں ایسی بے مثال کتاب آج تک دیکھنے میں میسّر نہیں ہوئی۔ کتابت، چھپائی اور گیٹ اپ وغیرہ قابلِ رشک ہیں۔ جہاں تک مضامین کا سوال ہے، آپ کی محنت و کاوش اور بلندیٔ فکر کی داد دیتا ہوں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت بھی عطا کرے تاکہ آپ اردو ادب کی خدمت
چار چاند لگا سکیں۔

جناب فکر تونسوی مرحوم کی موت جا
لیوا ثابت ہوئی ہے۔ "پیاز کے چھلکے" کا خالق ہمیشہ
کے لئے ہم سے جُدا ہو گیا ہے۔ اب اُن کی برا
کا ادیب کب پیدا ہوگا؟ تونسہ شریف کی مٹی
ایسی تاثیر اور عظمت کہاں سے پیدا ہوئی؟ جنا
ساحر ہوشیارپوری بھی اب گھر سے باہر نکلتے
'شانِ ہند' میں ان کے مراسلے پڑھتا ہوں تو ا
صورت ملاقات ہو جاتی ہے۔ اگر کبھی اُن سے
ہو تو میرا اُن کو سلام دیں۔ وہ میرے جاننے وا
میں سے ایک اس دُنیا میں موجود ہیں۔ اُن کی صح
اور درازیٔ عُمر کے لئے دعاگو ہوں۔

خیر اندیش دلارام شباب

مُراسلات
صاف اور
خوشخط لکھیں

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 September 1987
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنا دیا ہے، آپ یہاں تشریف لاکر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے

نور محمدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳۰۰۰۰

فون ہوٹل 8511008 فون دفتر 8516115

شانِ ہند
3 NOV 198
ان ہند کی یہ اشاعت
رزمن، شہید امن مہاتما گاندھی
خراج عقیدت پیش کرنے
کیلئے وقف ہے (ادارہ)
قیمت ۴ روپے

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فون نمبر ۲۷۵۶۰۲

شانِ ہند دہلی

اکتوبر ۱۹۸۷ء

جلد ۴۸ شمارہ ۱۰

گاندھی ایڈیشن

چیف ایڈیٹر سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر
وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"
ملت اصلاحی مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی

خطاط
سبطین حسین
محمد عمران

حسن کار
مصطفےٰ آرٹسٹ

قیمت فی شمارہ ـــ چار روپے
قیمت سالانہ ـــ چالیس روپے
لائف ممبر شپ ـــ پانچ سو روپے

ممالک غیر میں بذریعہ بحری ڈاک Rs 80.00
بذریعہ ہوائی ڈاک سعودی عرب متحدہ عرب امارات اور کویت Rs 150
انگلینڈ، ناروے، سویڈن، ہالینڈ Rs 200.00
کناڈا، امریکہ Rs 250.00

درسِ حیات

طالبؔ باغپتی

دل سے نظر کا کام لے، عارفِ کائنات بن — آئینۂ صفات دیکھ، محرمِ حسنِ ذات بن!

چھوڑ یہ خود فریبیاں کیسی تلاش و جستجو — حسنِ طلب کے طور سیکھ قابلِ التفات بن!

فرش سے عرش چوم لیں پھر تری سربلندیاں — خود کو بھلا خودی مٹا، ذرہ کائنات بن!

سوزِ اثر سے پھونک دے پردۂ امتیاز کو — رفعتِ بامِ حسن پر برقِ تخیلات بن!

پردۂ وعظ و پند میں آہ یہ بت فروشیاں — بتکدۂ غرور توڑ غازیِ سومنات بن!

کوشش ہمسری نہ کر اپنی مثال آپ ہو — قطرے سے بحر خلق کر، ذرے سے کائنات بن!

معجزۂ شہود بن، بزمِ مشاہدات میں — رزم گہہِ حیات میں پیکرِ شش جہات بن!

وقت کی نبض تیز ہے طالبِؔ اک بار اٹھ
بزمِ جہاں میں اک نیا درسِ حیات بن!

بُلبُل چہ گفت؟ گُل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | کالم کا خاصہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

ا د ی ٹ و ر ی ل

وطن کی فکر کر ناداں.... سردار بوٹا سنگھ متوجہ ہوں!

وزیر داخلہ حکومت ہند

جو پاکستانی ہندوستان میں اپنے عزیزوں سے ملاقات یا کاروباری اغراض یا کسی قسم کی عیارانہ سیاسی غرض سے آتے ہیں، ان میں سے اکثریت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ آگرہ، کشمیر، اجمیر شریف، بمبئی، کلیر شریف یا دوسرے مقامات پر بھی جائیں۔ ان میں سے اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جو محض ان تاریخی یا مذہبی نوعیت کے مقامات کو دیکھنا یا نذرِ عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو "سمگلنگ" ایسے "معزز پیشہ" سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اپنے اس شاہی کاروبار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ا[illegible] معدودے چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف [illegible] اور صرف کسی نہ کسی عیارانہ قسم کی سیاسی غرض یا جاسوسی کے لئے ہندوستان کے اہم مقا[illegible]

شانِ ہند دہلی، ۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء

پاکستان سے ہندوستان آنے والے
گوں کو زیادہ سے زیادہ چار مقامات کا ویزا مل سکتا
ہے۔ اور اگر ہندوستان آکر وہ ویزا میں درج
چار مقامات کے علاوہ کسی اور شہر یا قصبہ جانا
چاہتے ہیں تو اُس کے لئے ایک خاص دفتر
چانکیہ پارک میں قائم ہے جو ہر طرح کے
نا سب پوچھ تاچھ اور معاملے کی نوعیت کو دیکھتے
وئے درخواست دہندہ کو اجازت دینے کا
جاز ہے۔

مگر ظاہر ہے کہ ہر شخص کو چار مقامات
کا ویزا نہیں مل سکتا۔ لہٰذا ضرورت مند یا تفریح
کا شوق رکھنے والے، سمگلر، یا سیاسی طور پر
رخنہ اندازی کرنے والے یا جاسوسوں کو غیر قانونی
طریقوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور وہ اپنے
مقاصد میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو جاتے
ہیں۔ کیونکہ رشوت اور بد دیانتی کی ہوا بلکہ جھکڑ
اس زور سے چل رہا ہے کہ رشوت کے پیسے
نے اپنی جڑیں پاتال تک پھیلا دی ہیں اور رشوت
آجکل اتنا بڑا تناور درخت بن گیا ہے کہ اُسے نہ تو
خزاں کا ڈر ہے اور نہ باغبان کا۔ نہ اُسے کوئی
آندھی گرا سکتی ہے اور نہ کوئی اوزار اُسے
کاٹ سکتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے مابین ہر دو
ممالک میں ایک دوسرے ملک میں جانے والوں کو
ویزا کے حصول کی درخواست میں ایسے دو نام
اور پتے رشتہ داروں کے دینے ہوتے ہیں
جہاں وہ قیام کریں گے۔ اگر ان پتوں میں کسی
رشتہ دار کے علاوہ دوست یا ہوٹل کا پتہ
ہو تو ویزے کی درخواست نامنظور کر دی
جاتی ہے۔ مگر یار لوگ غلط سلط پتے لکھ کر
اپنا مطلب نکال لیتے ہیں اور مقام مقصود پر
پہنچ کر کسی ہوٹل میں قیام کر لیتے ہیں اور متعلقہ
پولیس کو یہ اطلاع دے دیتے ہیں کہ چونکہ
جہاں ہم نے رہنا تھا، وہاں گھر چھوٹا ہونے
کی وجہ سے جگہ نہیں ہے لہٰذا ہم فلاں ہوٹل

اتنا اسٹاف ہی نہیں کہ وہ ہر روز یا بار بار
ہوٹلوں کو چیک کر سکے مگر چالاک اور بدقماش
پولیس کے کچھ ملازم ایسے لوگوں کی تلاش
میں رہتے ہیں اور وہ ایسے لوگوں سے رشوت
لے کر، ہندوستان بھر میں جہاں وہ چاہیں
جانے کی اجازت دے دیتے ہیں اور ایک
فرضی کاغذ پر اُن کا نام وغیرہ لکھ لیتے ہیں اور
رشوت لینے کے بعد کہتے ہیں کہ آپ جہاں
جانا چاہتے ہیں جائیے، ہم آپ کی حاضری
لگاتے رہیں گے۔ حالانکہ حاضری وغیرہ لگانے
کا کوئی قاعدہ ہی نہیں، بلکہ یہ چیک کرنا ہوتا ہے
کہ جو غیر ملکی مسافر ہوٹل میں ٹھہرا ہے وہ صحیح
پاسپورٹ اور ویزا پر آیا ہے یا نہیں۔

پاکستان میں کچھ ادیبوں نے اپنے ہندوستانی
سفرنامے شائع کرائے ہیں جن میں انھوں نے
دلی پولیس پر بالکل صاف الفاظ میں الزام لگایا
ہے کہ اُسے رشوت دے کر ہم بھارت بھر
میں جہاں ہمارا دل چاہا، گھومتے رہے اور ہمیں
آگرہ، اجمیر، بمبئی وغیرہ میں کہیں بھی چیک نہیں
کیا گیا۔

ایڈیٹر، شانِ ہند، یہ اپنا فرض سمجھتا
ہے کہ وہ حکومت کو آگاہ کر دے کہ بعض ناپسندیدہ
پاکستانی لوگ بغیر ویزا کے کھلے بندوں کشمیر
جاتے ہیں اور کئی کئی دن وہاں رہ کر واپس دہلی
آتے ہیں۔ اگر مناسب ڈھنگ سے تحقیقات کی
جائے تو جس قدر پاکستانی ہندوستان آتے ہیں
اُن میں سے پچاس فیصد غیر قانونی طور پر آگرے
ضرور جاتے ہیں۔ سینکڑوں اجمیر شریف، کلیر
شریف ایسے مذہبی تقدس رکھنے والے مقامات
پر جاتے ہیں۔ اسی طرح بمبئی اور سری نگر جاتے
ہیں اور بعض تو پاکستان سے آنے کے بعد
ہندوستان میں کہیں بھی مستقل رہائش اختیار
کر لیتے ہیں۔ ہماری ان اطلاعات کی تصدیق
کے لئے وزیر داخلہ کی رپورٹ کے مطابق
اندازاً ستره صد ایسے پاکستانیوں کا پتہ نہیں

سے ہندوستان آئے تھے۔ رپورٹ کے
مطابق اُتر پردیش میں ایسے گم شدہ پاکستانیوں
کی تعداد زیادہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ لوگ
گئے کہاں؟ اور ہماری پولیس اور خفیہ انٹلی جینس
انھیں ڈھونڈ کر کیوں نہیں نکالتی۔ اسی سے صاف
ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی پولیس اور خفیہ
انٹلی جنس اپنے فرائض کو بخوبی نبھا نہیں رہی
ہے۔ اس بارے میں خفیہ ایجنسیوں کا کہنا
ہے کہ پاکستانی لوگ یہاں کے عوام میں گھل مل
جاتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں ڈھونڈ نکالنا
بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ پاکستانی
لوگوں پر نظر رکھنے کے باوجود ہزاروں لوگ
دھوکہ دے کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو
جاتے ہیں۔ ویسے یہ خفیہ ایجنسیوں کے لئے
بہت ہی چونکا دینے والی بات ہے۔ اُن کا کہنا
ہے کہ اُن میں سے کچھ لوگ یہاں رہ کر سمگلنگ
کرتے ہیں۔ یہاں رہ کر جاسوسی بھی کرتے ہیں۔

جانکار حلقوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہندستان
میں آنے والے پاکستانیوں میں کچھ لوگ پاکستان
کے جاسوسی ایجنٹ ہوتے ہیں جو ہندوستان
میں رہ کر تخریبی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں
اس کے علاوہ کچھ لوگ سی۔ آئی۔ اے کے
ایجنٹ بھی ہو سکتے ہیں، جو پاکستانی لوگوں کے
ساتھ مل کر اپنا کام کرتے ہیں۔ جانکار حلقوں کا
تو یہاں تک کہنا ہے کہ پاکستانی حکومت باقاعدہ
ٹریننگ کر کے لوگوں کو ہندوستان بھیجتی ہے۔

پاکستان کے ہی نہیں بلکہ بنگلہ دیش اور
افغانستان کے بھی بہت سارے لوگ ہندوستان میں آئے
ہوئے ہیں۔ خصوصی ذرائع کی اطلاع کے مطابق
اس وقت امرتسر میں ۳۰ ہزار بنگلہ دیشی موجود
ہیں۔ بی۔ ایس۔ ایف کے مطابق یہ بنگلہ دیشی
اس ملک میں سرحد پار کر کے اسمگلنگ اور
جاسوسی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ
ہند پاک سرحد پر ادھر سے ادھر بڑی آسانی

کے ساتھ آتے جاتے رہتے ہیں۔ سرحد پر مارے جانے والے لوگوں میں بنگلہ دیشی افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ خفیہ ایجنسیوں کا کہنا ہے کہ سی۔ آئی۔ اے والے بنگلہ دیش اور افغانستان کے پناہ گزینوں کو جاسوسی کرنے کے لئے آج کل استعمال کر رہے ہیں۔ دراصل پاکستان کے موجودہ پناہ گزینوں کی سی۔ آئی۔ اے دل کھول کر مدد کر رہی ہے۔ دوسری طرف بھارت آنے والے لوگوں میں اُن پناہ گزینوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو باقاعدہ ٹریننگ لے کر آتے ہیں۔

دوسری طرف یہ بھی خیال کیا جاسکتا ہے کہ روس کی خفیہ ایجنسی کے۔ جی۔ بی۔ بھی افغانستان میں افغان مجاہدین میں گھس کر امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے پر نظر رکھنے کے لئے پاکستانی اور افغان مجاہدین کو استعمال کر رہی ہو اور وہ بھی اپنے ایجنٹ ہندوستان بھیج رہی ہو۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے مُلک کی خفیہ ایجنسی اس طرح کی خیال آرائیاں تو کر رہی ہے مگر آج تک ایک بھی پاکستانی، بنگلہ دیشی یا افغانی پناہ گزین کو جاسوسی سمگلنگ یا تخریبی کارروائی کرنے کے جرم میں اب تک پکڑنے میں کیوں ناکام ہے؟

ہماری خفیہ ایجنسی کی خفیہ باتیں تو وہ جانے، مگر ہماری دِلّی حکومت اس ضمن میں کیا کر رہی ہے، آیئے ذرا اُس کی بھی تفصیل سُن لیجئے۔

ایڈیٹر "شانِ ہند" نے دلّی کے لفٹنٹ گورنر کو ایک خط لکھا کہ مُلکی تحفظ کے سلسلہ میں آپ سے کچھ کہنا ہے، ملاقات کا وقت دیجئے مگر کوئی جواب موصول نہ ہوا تو مسٹر عظیم اختر پریس آفیسر سے ذکر آیا کہ کچھ پاکستانی حضرات پہاڑ گنج کے کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ بغیر ویزا کے کشمیر گئے ہیں اور اسی طرح پاکستانی حضرات بغیر ویزا کے آگرہ اور دیگر شہروں کا غیر قانونی چکر لگاتے ہیں۔ لیفٹننٹ گورنر سے اس ضروری معاملہ میں بات کرنی تھی لہٰذا اُن سے وقت مانگا گیا ہے تو جواب تک نہیں مِلا۔ مسٹر عظیم اختر نے بتایا کہ پاکستانی ویزا وغیرہ کا معاملہ ہوم سیکریٹری کے تحت ہے۔ اس لئے آپ اگر یہ معاملہ ہوم سکریٹری سے بتائیں تو وہ کوئی مناسب انتظام فرمائیں گے۔ چنانچہ ہوم سیکریٹری صاحب (اُس وقت مسٹر روی کمار آہوجہ ہوم سیکریٹری تھے) سے اُن کی ملاقات کے مقررہ اوقات میں ملاقات کے لئے ایڈیٹر شانِ ہند اُن کے دفتر پہنچا اور اُن کے P.A سے ہوم سکریٹری صاحب سے ملاقات کرانے کو کہا تو P.A کہنے لگے کہ آپ کو کس کام کے لئے ہوم سکریٹری صاحب سے ملنا ہے؟ چنانچہ انھیں ملاقات کا مقصد بتایا گیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے محکمہ کی شکایات ہمارے ہی صاحب سے کرو گے؟ فوراً نکل جاؤ یہاں سے آپ کی ہمت کیسے ہوئی کہ ہمارے محکمہ کی شکایت کرو۔ انھیں آپے سے باہر ہوتا دیکھ کر سمجھایا گیا کہ یہ مُلکی تحفظ کا معاملہ ہے۔ اگر آپ ہوم سکریٹری سے ملنے نہیں دیتے تو گورنر صاحب کو اس نافرض شناسی اور گستاخی کے بارے میں شکایت کی جائے گی، تو کہنے لگے لفٹنٹ گورنر میرا کیا بگاڑ لے گا، میں پکا سرکاری افسر ہوں، اور وہ عارضی نوکر۔ آج لفٹنٹ گورنر ہے کل کو راجیو چاہیں گے تو واپس اپنی جگہ بھیج دیں گے اور وہ پھر مسٹر کپور کے کپور رہ جائیں گے۔ P.A نے بے شک حرام زدگی کی حد تک گستاخانہ انداز میں یہ سب کچھ کہا مگر بات پتے کی کہہ رہا تھا کہ وہ واقعی پکا سرکاری افسر ہے اور بیچارہ لیفٹنٹ گورنر عارضی سرکاری نوکر۔ جب راجیو جی کا دل چاہے گورنری سے ہٹا دیں جیسے گوائی صاحب کو ہٹا دیا گیا تھا خیر یہ تو P.A کی مُلک سے غداری تھی کہ اُس نے ہوم سکریٹری تک ایسا ضروری معاملہ پہنچنے نہ دیا۔ مگر اس قسم کے مُلکی غدار نہ جانے کتنے سرکاری دفتروں میں موجود ہیں جو اپنے فرائضِ منصبی کو ادا کرنے میں مجرمانہ حد تک کوتاہی برتتے ہیں۔

اس کے بعد پھر لفٹنٹ گورنر کو پھر ایک عریضہ بھجوایا گیا مگر انھوں نے پھر بھی ملاقات کا وقت نہ دیا تو حال ہی میں ایڈیٹر شانِ ہند نے پولیس کمشنر مسٹر مرداہا کو فون کیا اور اُنہوں نے فوری طور پر ملاقات کا وقت دیا۔ اور جب اُنھیں یہ تمام واقعات سنائے تو وہ خوش ہوئے کہ اُنھیں اس صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا اور اُنہوں نے اُسی وقت متعلقہ بڑے افسران کو بلوایا جنھوں نے ایڈیٹر شانِ ہند سے تفصیلی گفتگو کی اور اس مسئلہ پر کافی غور و خوض ہوا۔

تو سردار بوٹا سنگھ جی۔ . . . ! یہ ہے مختصر سی داستان جو مُلکی تحفظ کے لئے آپ کی دلّی حکومت کر رہی ہے اور آپ دن رات دہائی دیتے رہتے ہیں کہ ہم مُلک کی حفاظت میں یہ کریں گے . . وہ کریں گے، اور حالت یہ ہے کہ سینکڑوں پاکستانی ہر روز بغیر ویزا کے ہندوستان میں جہاں چاہیں یہاں تک کہ کشمیر تک جائیں، انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آپ کے لیفٹنٹ گورنر کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ مُلکی تحفظ کے لئے پانچ منٹ بات سننے کے لئے نکال سکیں ہاں جہاں انھیں پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا جائے، یا جہاں اُن کی تعریف میں قصیدے پڑھے جاتے ہوں، وہاں وہ گھنٹوں برباد کر سکتے ہیں اور ایسے ہیں ہمارے ہاں کے پی۔ اے، جو اپنے آپ کو اپنے باس سے بھی زیادہ طاقتور اور با اختیار سمجھتے ہیں اور ایک انتہائی ضروری معاملہ میں بھی ہوم

سکریٹری سے ملنے نہ دیا گیا۔
اب آپ براہِ کرم کشمیر گورنمنٹ کو لکھیئے کہ وہ سری نگر میں داخل ہونے والوں کی ضروری دیکھ بھال کرے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی کے ماتھے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ کون پاکستانی ہے اور کون ہندوستانی لیکن اگر کشمیر پولیس اور وہاں کی خفیہ سرکاری ایجنسیاں دل و جان سے چاہیں تو غیر قانونی طور پر کشمیر میں داخل ہونے والوں کا پتہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی یو۔پی حکومت کو لکھیئے کہ وہ آگرہ کے تاج محل، سکندرہ وغیرہ میں خفیہ پولیس کے آدمی تعینات کرے اور دہلی سے جانے والی ہر ٹورسٹ بس اور دیگر ذرائع سے وہاں جانے والوں کی اچھی طرح پوچھ تاچھ کرے۔ اگر آگرہ کے افسران متعلقہ دیانتداری اور محنت سے کام کریں تو ہر روز دس، بیس ناجائز طور پر وہاں جانے والے پاکستانی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ اسی طرح حکومتِ راجستھان کو بھی فہمائش کیجئے کہ وہ اجمیر کے خادمان کی سختی سے خبر گیری رکھے کیوں کہ یہ خادمان ہی پیسے کے لالچ میں غیر قانونی طور پر اجمیر شریف جانے والے پاکستانیوں کی پناہ گاہیں ہیں۔

امید ہے کہ آپ ملکی تحفظ کے اس زاویئے کو بھی فراموش نہ کریں گے اور ہر ممکن طریق سے اس غیر قانونی دھندے کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔

دِلّی اُردو اکادمی کی بددیانتی

دہلی اُردو اکادمی نے اس بار اردو مطبوعات کے ناشرین کیلئے دو انعامات میں سے ایک انعام ایسے ادارے کو دیا ہے جو نہ تو باقاعدہ طور پر ناشر تھا اور نہ ہی اس وقت ہے۔ اس ادارے کی جس کتاب پر انعام دیا گیا ہے اس پر ناشر کا نام ہے ہی نہیں یعنی بجائے ناشر کے یہ انعام پریس کو دیا گیا ہے اور دوسرے انعام کے بارے میں جناب سکریٹری صاحب اُردو اکادمی کا کہنا ہے کہ چونکہ کوئی بھی کتاب دوسرے انعام کی حقدار نہیں تھی اس لئے دوسرے انعام کی رقم بھی کتابوں کے مصنفین کے انعام میں شامل کردی گئی۔ جبکہ ناشرین کے انعامی مقابلہ میں اس بار ایسی ایسی بہترین اور عالمی شہرت رکھنے والی کتابیں شاملِ مقابلہ ہوئی تھیں کہ جس کتاب پر اوّلین انعام دیا گیا ہے وہ اُن کے مقابلہ میں کسی لحاظ سے بھی قابلِ غور نہ تھی۔

اُردو اکادمی ایسی کھلی بددیانتی کے خلاف ہم ہر ماہ اُس وقت تک یہ احتجاج شائع کرتے رہیں گے جب تک کہ لیفٹننٹ گورنر اس دھاندلی کے بارے میں کوئی نوٹس نہیں لیتے

(ایڈیٹر)

چاہیئے!

ڈاکٹر حقیر آستانی

چاہیئے ہر آنکھ ہو نظّارہ جو
چاہیئے ہر دل رہے محوِ خرام

چاہیئے ذوقِ تماشا جا بجا
اِک تماشہ گاہ ہے عالم تمام

چاہیئے کِھل جائے ہر دل کی کلی
چاہیئے مِل جائے ہر دل کو سکوں

چاہیئے آجائے ہر جاں کو قرار
یہ کسک، یہ سوگ، یہ بیداد کیوں؟

چاہیئے ہر ساز میں سوزِ حیات
چاہیئے ہر تان میں مستی کی لَے

چاہیئے ہر تار ہو تارِ نشاط
زندگی کی نوحہ خوانی تابہ کے

چاہیئے بدلے زمانے کی ہوا
چاہیئے بدلے زمانے کا چلن

چاہیئے اِک ارتباطِ باہمی
ایک لعنت ہے یہ آپس کی جلن

آؤ دیوارِ عداوت توڑ دیں
آؤ! مِل کر وقت کا رُخ موڑ دیں

702, Gold Crown
J P Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

شانِ ہند دہلی، اکتوبر ۱۸ء

گاندھی جی

نقیبِ صبح و میرِ کارواں و صاحبِ منزل

رباب رشیدی

ہمالیہ کا طلسمی وقار، گنگ و جمن کا تقدس، سرسوتی کا علمی فیضان، شاہین کی نگاہ، آسمان رفعت، سبزہ زاروں کا حسن! نشاط انگیز و جاں فزا خوشبوؤں کا مجموعہ اور اقبال کے مردِ قلندر کا تصور، جب کسی انسانی پیکر کا روپ دھار لیتا ہے تو وہ تاریخ کے صفحات پر موہن داس کرم چند گاندھی بن کر جگمگاتا ہے۔

ان کی پوری زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔ ان کا ہر عمل حب الوطنی کا آئینہ دار، ان کا ہر قول صداقت کا شاہکار، خلوت و جلوت میں ایک ہی بات، ایک ہی فکر! آنسو چھلکے تو ملک و قوم کے غم میں، تبسم برلب ہوئے تو ہندوستان کی ہندوستانیت پر، سوئے تو دیش کی آزادی کا خواب لیے ہوئے، جاگے تو حصولِ تعمیر کا خیال سمیٹے۔ غرض کہ رگ رگ میں جذبۂ حریت کا بہاؤ خون کی گردش بن گیا تھا۔ گاندھی جی کا فلسفۂ حیات ہندوستان کے رنگ و مزاج سے اتنا ہم آہنگ کہ انھیں ایک دوسرے سے کسی طرح علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فلسفۂ حیات صدیوں سے کسی نہ کسی زاویے سے دانشوروں کے ذہن میں رہا ہے مگر اس کو برتنے کا شرف باپو کے حصے میں آیا۔ مسئلہ صرف زنجیرِ غلامی کاٹنے کا نہیں تھا، اصل مسئلہ تھا یہاں کے مخصوص جغرافیائی حالات کے تحت ایک مربوط نظامِ زندگی کا۔ پسماندگی، غربت و جہالت کے خلاف ایک مضبوط محاذ کا، صدیوں سے استحصال کا شکار طبقوں کے باوقار ڈھنگ سے جینے کا، اور جمہوری خطوط پر ملک کو چلانے کا۔ یہ دودھ کی نہر نکالنے سے کہیں زیادہ مشکل کام تھا۔

گاندھی جی ذہن و عمل کے اسرار سے آگاہ تھے۔ کڑی دھوپ میں بھی وہ شبنم کی طرح خنک رہتے تھے۔ یہی ان کی خصوصیت تھی اور یہی ان کا جوہر جس نے انھیں بالآخر منزل نشین کر دیا۔

میرِ قافلہ جنگ آزادی کی حیثیت سے جو مثبت رول باپو نے ادا کیا وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ ذرا اس دور کی طرف پلٹ کر دیکھیے، کیسے کیسے عاقل و بالغ نظر، کیسے کیسے عالم و مجاہد، کیسے کیسے پرجوش و باہوش افراد

کر دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کی نگاہ بصیرت افروز کے اثر سے بڑے بڑے سرکش اپنا سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔ اُن کی روحانی قوت کے آگے اچھے اچھے سپر ڈال دیتے تھے۔ باپو نے اپنی اخلاقی روحانی قوتوں اور اپنے عزمِ راسخ کی بدولت ہندوستان کو وہ مقام عطا کر دیا جس کے سبب یہاں کے سبھی رہنے والے ایک عجیب شانِ افتخار محسوس کرتے ہیں۔

آج جب بڑی طاقتیں قیامِ امن کی بات کرتی ہیں، نیز تخفیفِ اسلحہ پر مذاکرات ہوتے ہیں، پھر دیتام اور بیروت کی طرف نظر جاتی ہے تو ہمیں باپو کی یاد آتی ہے۔

جب کہیں سے فساد کی خبریں آتی ہیں اور فضا خون سے رنگین ہونے لگتی ہے، انسانیت کی چیخوں سے ماحول متغیر ہو جاتا ہے تو باپو بہت یاد آتے ہیں۔

ہمارا اپنا عالم یہ ہے کہ ہم شخصیتوں سے پیار کرتے ہیں اور زبان و دل سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر اُن شخصیتوں کی پسند و ناپسند کا خیال نہیں رکھتے ہیں اس صورت میں دو ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں یا تو وہ باتیں ہمیں پسند نہیں یا ہم اُن کی اب ضرورت محسوس نہیں کرتے، دوسری بات یہ کہ بس فیشن کے طور پر ہم بھی اپنے قائدین کا کبھی کبھی ذکر کر لیتے ہیں یا اُن کی یاد منا لیتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ کیا واقعی اب ہم وہ باتیں پسند نہیں کرتے یا اُن کی ضرورت محسوس نہیں کرتے باپو نے اہنسا کا جو پیغام دیا تھا کیا وہ اپنی قدر کھو چکا ہے۔ اگر اہنسا کا عمل کل دوسروں سے اپنی بات منوانے کے لئے کارگر ہوا تھا تو آج — کار اور کیا ہو سکتا ہے؟

یاد رکھیے اگر ہم نے وہ راستہ چُنا جو باپو کے بتائے ہوئے راستے سے جدا ہے اور مخالف سمت جاتا ہے تو اس ملک کے لئے کوئی اچھے مستقبل کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس ملک کا روشن مستقبل تبھی محفوظ رہ سکتا ہے جب ہم گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں۔ کیا کبھی ہم یہ سوچتے ہیں کہ انھوں نے اس دیش کی خاطر کتنی سختیاں جھیلیں کتنے مصائب برداشت کئے، کتنے برت رکھے، کس لئے؟ صرف اپنے عوام کی محبت میں دُکھی انسانوں کے لئے غلام ہندوستان کے واسطے۔ آخر ان کو کس شے کی کمی تھی! متمول گھرانے میں پیدا ہوئے، اعلیٰ تعلیم حاصل کی، بیرسٹر بنے، ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ پھولوں کی سیج پر لیٹتے مگر انھوں نے کانٹوں کے بستر کا انتخاب کیا۔ قدرت سے وہ گدازِ قلب و متاعِ چشمِ تر لے کر آئے تھے ملک کو آزادی دلانا اور عوام کو بھائی چارگی، مساوات و اخوت کے سانچے میں ڈھالنا اُن کی زندگی کے دو اہم مقاصد تھے۔ باپو کا خواب اُسی وقت شرمندۂ تعبیر ہوگا جب یہاں کے سارے رہنے والے وطنیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہم رنگ ہو جائیں۔ مذاہب جداگانہ سہی، معاشرہ میں فرق سہی، لباس الگ سہی، زبانیں مختلف سہی لیکن ایک لہر ملک کے ہر گوشہ میں یکساں ہونا چاہیئے۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہم سب انسان ہیں، ہم سب ہندوستانی ہیں۔ ہم نے اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کے سارے جھمیلے ختم کر دیئے ہیں۔ ہم ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح ہیں۔

غزل

خالد شریف

اے کہ میں تیرے لئے تھا اور تو میرے لئے
اب ترے ہاتھوں پہ لکھا ہے لہو میرے لئے

○

میری بکھری کرچیوں میں پھوٹنے والے ہیں پَر
میرے قاتل جال پھیلا چار سُو میرے لئے

○

کاش ایسا ہو کہ اب کے بے وفائی میں کروں
تو پھرے قریہ بہ قریہ کو بہ کو میرے لئے

○

میں تو لامحدود ہو جاؤں سمندر کی طرح
تو بہے دریا بہ دریا جُو بہ جُو میرے لئے

○

پھر زمیں کی سسکیاں اپنی لگیں خالد مجھے
پھر ہوا ہے جشنِ مرگِ آرزو میرے لئے

صداقت کے رموز و اسرار ان پر کس طرح منکشف تھے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل قول سے ہو جائے گا۔ فرماتے ہیں:—

"صداقت ایک عظیم درخت ہے۔ جیسے جیسے اس کی خدمت کی جاتی ہے ویسے ویسے اس میں ان گنت پھل آتے دکھائی دیتے ہیں جو جاوید ہوتے ہیں"

اہنسا کے بارے میں اُن کے اقوال مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں:—

"میرے لئے سچ سے بڑا کوئی

جب ہمیں کہیں سے فساد کی خبریں آتی ہیں اور فضا خون سے رنگین ہونے لگتی ہے انسانیت کی چیخوں سے ماحول متغیر ہو جاتا ہے تو باپو بہت یاد آتے ہیں

مذہب نہیں ہوتا ...
مقدس فریضہ نہیں۔ اہنسا کے بغیر
سچ کی تلاش و جستجو اور کامیابی
ناممکن ہے۔ اہنسا ذریعہ ہے اور
سچ مقصد ہے۔ اسی لئے اہنسا پر
کاربند ہونا ہمارا فرض اوّلین ہے
اہنسا ایک انفرادی عمل نہیں
بلکہ سماجی عمل بھی ہے۔ میری تاکید
اتنی ہے کہ قومی اور بین الاقوامی سطح
پر اسے بروئے کار لایا جائے"

اہنسا۔ سچ کی روح ہے۔ اس
کے بغیر انسان جانور ہے۔"

مذہب کی ضرورت پر باپو نے ہمیشہ زور دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ہر مذہب بنیادی طور پر آفاقی قدروں کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے فلسفے انسان کو پیار، محبت، برابری، نیکی اور سچائی کا پیکر بناتے ہیں اسی لئے وہ مذہب کی اہمیت پر لکھتے رہتے تھے۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ لامذہبیت بے راہ روی اور بے ضابطگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"فرد و سماج مذہب سے زندہ رہتے ہیں، لامذہبیت سے فنا ہو جاتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو مذہب زندگی کی ہر سانس کے ساتھ عمل میں لانے کی چیز ہے۔

اگرچہ درخت کے پتوں کی طرح سارے مذاہب الگ الگ نظر آتے ہیں مگر جڑ کو دیکھا جائے تو سب ایک ہی دکھائی دیتے ہیں۔

دنیا کے مختلف مذاہب ایک ہی منزل پر پہنچنے کے الگ الگ راستے ہیں۔ اہنسا ہم کو درس دیتی ہے کہ ہم دوسرے مذہبوں کا بھی ویسا ہی احترام کریں جیسا کہ اپنے مذہب کا کرتے ہیں۔"

گاندھی جینتی

محمود الٰہی

> انھیں قوم نے باپو کے نام سے یاد کیا۔ انھیں قوم نے مہاتما کا خطاب دیا مگر وہ قوم کی ان باتوں سے خوش نہیں ہوتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو، کسی مذہب کے ساتھ ناانصافی نہ ہو، کسی زبان کے ساتھ ناانصافی نہ ہو، کسی خطہ اور مذہب کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

ہماری جدوجہدِ آزادی کے سب سے بڑے رہنما گاندھی جی تھے۔ اُن کی قیادت میں ملک آزاد ہوا۔ وہ سیکولر تھے، سماج کے ستائے ہوئے طبقوں کے مسیحا تھے اور ہر ہندوستانی کو باعزت زندگی گذارنے کا حق دینا چاہتے تھے وہ بے تاج کے بادشاہ تھے۔ نہ اُن کے پاس کوئی فوج تھی نہ اسلحے۔ بس ایک فلسفۂ حیات اور ایک نظامِ اخلاق کے علاوہ وہ کسی چیز کے مالک نہ تھے۔ اسی فلسفۂ حیات اور اسی نظامِ اخلاق کے سہارے انھوں نے سارے ملک کو اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ اُن کی شخصیت میں فریب کاری کا گزر نہیں تھا اور اُن کے کردار میں کوئی تصنع نہیں تھا۔ انھیں قوم نے باپو کے نام سے یاد کیا، انھیں قوم نے مہاتما کا خطاب دیا، مگر وہ قوم کی ان باتوں سے خوش نہیں ہوتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو، کسی مذہب کے ساتھ ناانصافی نہ ہو، کسی زبان کے ساتھ ناانصافی نہ ہو، کسی خطہ اور علاقہ کے ساتھ ناانصافی نہ ہو اور آخر کار ان آدرشوں کے لئے انھوں نے اپنی جان بھی دے دی"

ہر سال ۲ / اکتوبر کو ہم گاندھی جی کا یومِ پیدائش مناتے ہیں دراصل یہی وہ موقع ہے جب قوم کو اپنا احتساب کرنا چاہیئے کہ اس نے گاندھی جی کے رہنما اصولوں کا کس حد تک احترام کیا یا اُن سے انحراف کی رفتار کتنی تیز ہے۔ گاندھی جی نے ہمیں اہنسا یا عدم تشدد کی تلوار دی تھی۔ یہ تلوار زنگ آلود تو نہیں ہو گئی؟ گاندھی جی ایکتا اور قومی یکجہتی کی کھلی ہوئی کتاب تھے۔ کیا اب بھی ہم اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں؟ یہ اور ایسی طرح کے بہت سے موضوعات و سوالات ہیں جو ہر سال ۲ / اکتوبر کو بہ طور خاص ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور آخر ان کا جواب ہم کب دیں گے؟۔

ابھی اُٹھ کے آئے ہیں بزمِ دُعا سے
وطن کے لئے لَو لگا کر خُدا سے
ٹپکتی ہے رُوحانیت سی فضا سے
چلی آتی ہے رام کی دُھن ہوا سے
دکھی آتما شانتی پا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آگئی ہے

یہ گھیرے ہے کیوں رونے والوں کی ٹولی
خُدارا سناؤ نہ منحوس بولی
بھلا کون مارے گا باپُو کو گولی
کوئی باپ کے خوں سے کھیلے گا ہولی
عبث مادرِ ہند شرما گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آگئی ہے

محبت کے جھنڈے کو گاڑا ہے اس نے
چمن کس کے دل کا اُجاڑا ہے اس نے
گریبان اپنا ہی پھاڑا ہے اس نے
کسی کا بھلا کیا بگاڑا ہے اس نے
اسے تو ادا امن کی بھا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آگئی ہے

ابھی اُٹھ کے خود وہ بٹھائیگا سب کو
لطیفے سُنا کر ہنسائیگا سب کو
سیاست کے نکتے بتائیگا سب کو
نئی روشنی پھر دکھائیگا سب کو
دلوں پر سیاہی سی کیوں چھا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آگئی ہے

ابھی سندھ با چشمِ نم تک ر
لئے دل میں پنجاب غم تک
ابھی وار دھا دم بدم تک
ابھی راستہ آشرم تک ر
مسافر کو رستے میں نیند آگ
جگاؤ نہ باپو کو نیند آگ

وہ سوئے گا کیوں جو ہے سب
کبھی میٹھا سپنا نہیں اس
وہ آزاد بھارت کا ہے جن
اُٹھے گا نہ آنسو بہا دیں
اُداسی یہ کیوں بال بکھرا
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ

جھاڑوں پہ صحنِ بسر اپنا پیا
وفاؤں کی دُنیا میں مر مر کے جیتا
جو اک بات قرآں تو اک بات گیتا
ستم گار ہارے وہ مظلوم جیتا
زمانے پہ مظلومیت چھا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

وہ حق کے لئے تن کے اڑ جانے والا
نشاں کی طرح رن میں گڑ جانے والا
نہتّا حکومت سے لڑ جانے والا
بسانے کی دُھن میں اُجڑ جانے والا
بنا ظلم کی جس سے تھرّا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

دُکھی، بے سہارا کسانوں کا والی
جفاکش، غریبوں کے چہرے کی لالی
وطن کے خزاں دیدہ گلشن کا مالی
دُہی، گود جس کی تھی پھولوں سے خالی
تھکی روح کانٹوں میں غش کھا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

غلاموں کو جس نے بغاوت سکھائی
نئی سرفروشی کی جرأت سکھائی
سلیقے سے مرنے کی حکمت سکھائی
محبّت کی طرزِ شہادت سکھائی
"اہنسا" تشدد سے ٹکرا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

سلاسل نے جکڑا تو زنداں نے گھیرا
مگر رنگ کانٹوں میں ایسا بکھیرا
اُجالے سے ٹکرا کے ہارا اندھیرا
ہُوا دیس کی شامِ غم کا سویرا
خوشی نیند کا ہار پہنا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

وہ بھگتی کی سمرن، وہ چاہت کی مالا
صداقت کی گنگا، خرد کا ہمالہ
وہ بوڑھوں میں بوڑھا وہ بالوں میں بالا
اک اندھیر نگری کا تنہا اُجالا
کرن جیسے بادل میں لہرا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

دُکھوں سے رہائی دلانا تھا مذہب
محبّت کی دارُو پلانا تھا مذہب
کلی دو دلوں کی کھلانا تھا مذہب
جو بچھڑے ہوں اُن کو ملانا تھا مذہب
محبّت دلی آرزو پا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

وہ اُپواس والا وہ اُپکار والا
وہ آدرش والا وہ آدھار والا
وہ اخلاق والا وہ کردار والا
وہ مانجھی اہنسا کی پتوار والا
لگن جس کی ساحل کا سکھ پا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

ہے مغرب میں سورج لبِ بام دیکھو
ہوئیں بند آنکھیں سرِ شام دیکھو
سُنہرا سُنہرا سا پیغام دیکھو
محبّت کا رنگین انجام دیکھو
فضا میں شفق پھول برسا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

نہ دلکش تماشے نہ رنگیں نظارے
نہ راحت کی کلیاں نہ عشرت کے تارے
بہت تھک گیا تھا مشقت کے مارے
ذرا لگ گئی آنکھ جمنا کنارے
تھکن آج ٹھنڈی ہوا پا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

کوئی اس کے خوں سے نہ دامن بھریگا
بڑا بوجھ ہے سر پہ کیونکر دھرے گا
چراغ اس کا دُشمن جو گُل بھی کرے گا
امر ہے امر، وہ بھلا کیا مرے گا
حیات اُس کی خود موت پر چھا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

وہ پربت، وہ بحرِ رواں سو رہا ہے
وہ پیری کا عزمِ جواں سو رہا ہے
وہ امنِ جہاں کا نشاں سو رہا ہے
وہ آزاد ہندوستاں سو رہا ہے
اُٹھے گا، سحر مجھ سے بتلا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

جیسے کوئی بہت کڑوی چیز منہ کا ذائقہ خراب کر
گئی ہو اور پھر درشت لہجہ میں کہا" میں مرد کے
ہمراہ رہنا پسند نہیں کرتی"۔

ابراہیمؒ اس کا جواب سُن کر حیرت زدہ
رہ گئے۔ جب وہ شہر کے حصار سے باہر آئے
تو خاتون کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔

ابراہیمؒ کو قدیم فارس کے خوبصورت
شہر "رے" سے چلے ہوئے ابھی صرف دو دن
ہوئے تھے۔ "رے" اُن کا وطن تھا۔ اُن کے
والد احمد خواص ایک دولتمند تاجر تھے۔ والد نے
انھیں علوم متداولہ سے بحدِ کمال سیراب کرنے
کے لئے بڑے بڑے علماء کی خدمات حاصل
کی تھیں جس کے نتیجہ میں وہ صرف بائیس سال
کی عمر میں فارغ التحصیل عالم بن گئے تھے۔ تحصیلِ
علم سے علم کی پیاس اور بڑھی تو علم الکلام
میں قلب کی آسودگی تلاش کرنی چاہی۔ علم الکلام
سے ذوقِ حق رسی ملا تو عبادت میں محو ہو گئے۔
والد کی موت کے بعد ذمّہ داریوں کا بوجھ اُن کے
شانوں پر آ گیا۔ کچھ دن اُنھوں نے ان ذمّہ داریوں
سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی تو معلوم ہوا
کہ تجارت سے کوئی اُن کی ذہنی مناسبت ہی
نہیں ہے۔ کاروبار کارندوں کے سپرد کر کے
وہ پھر خلوت نشین ہو گئے۔ خلوت نشینی شفیق
ماں کی موت کے ساتھ سے ختم ہوئی۔ تجارت کا
حساب کیا تو معلوم ہوا کہ کارندے دل کھول
کر غبن کر رہے ہیں۔ اس بدمعاملگی نے ابراہیمؒ کو
ملول کر دیا۔ اُنھوں نے تمام کارندوں کو جمع کر کے
کہا "تم لوگوں سے میں شرمندہ ہوں۔ میں نے
تمھیں آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ دُنیا نے تم سے
آخرت خرید لی، تم بک گئے اور میری دولت تمھارے
لئے وبال بن گئی۔ میں یہ بتائے بغیر کہ تم میں سے
کون کون بدعنوانی کا مرتکب ہوا ہے، سب کو
معاف کرتا ہوں، میرا تم سے کوئی مطالبہ نہ دُنیا
میں ہے نہ آخرت میں ہوگا۔ آج سے میں اپنا تمام
کاروبار بند کر رہا ہوں۔ میری طرف سے تمھیں
چھٹی ہے"۔

ابراہیمؒ نے اس دن سے اپنے تمام
اثاثوں کو بیچنا شروع کر دیا اور صرف ایک مہینہ
میں دو لاکھ دینار جمع کر کے تمام پونجی خیرات
کر دی یا رفاہی کاموں میں لگا دیئے اور خالی ہاتھ
"رے" سے نکل کھڑے ہوئے۔

ابراہیمؒ اس وقت ایک سایہ دار درخت
کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ماضی پر سرسری
نظر ڈال کر اُنھوں نے ایک آہ بھری۔ اُنھیں
ملال اس کا نہیں تھا کہ امارت فقر کی منزل میں
آ گئی تھی، بلکہ دُکھ یہ تھا کہ طلبِ حق کی راہ میں وہ ابھی
تک کوئی منزل نہ پا سکے تھے۔ ایک مست خاتون
نے اُن کی بے بضاعتی کے احساس کو شدید
کر دیا تھا۔ اُنھوں نے خود کو اس کے مقابلے
میں بہت پست پایا تھا۔ حرص ایک اخلاقی
عیب ہے مگر حرص اگر خیر کے لئے دل میں جگہ
پا لے تو اس سے بہتر کوئی سعادت بھی نہیں ہے۔
آپ نے رات اسی درخت کے سائے میں
گزاری اور نمازِ فجر کے بعد سفر کا آغاز کیا۔ پانچ
فرسخ چلے ہوں گے کہ آپ بھوک کی شدت
سے بیتاب ہو گئے۔ نازو نعم میں پرورش پانے
والے ابراہیمؒ نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔
انھیں ایک درخت میں جنگلی سیب نظر آئے تو
بے قرار ہو کر اس کی طرف بڑھے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر
سیب پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتے تھے کہ سیب
توڑ لیں، اچانک خیال آیا یہ سیب نہ جانے کس کی
ملکیت ہے۔ میں مالک کی اجازت کے بغیر اس
سیب کو کیسے کھا سکتا ہوں۔ انھوں نے سوچا۔

بھوک کی شدت کا اقتضا تھا کہ سیب توڑ
کھا لیں اور تقویٰ شکم سیری پر موت کو ترجیح
کے لئے اکسا رہا تھا۔ ذہنی کشمکش طویل ثابت
جلد ہی سیب توڑ کر نہ کھانے کا فیصلہ کیا
قدم بڑھا دیئے۔ کچھ دور مزید سفر کرنے
بعد وہ نڈھال ہو کر بیٹھ گئے۔ ابھی آپ کو
زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک نوجوان جو آتش
تھا آپ کے پاس آیا۔ اُس نے آپ کا نام
کر سلام کرتے ہوئے کہا" میں بھوکا بھی ہو
اور پیاسا بھی کیا تم مجھے کچھ کھلاؤ گے پلاؤ
نہیں؟"

آتش پرست کا مطالبہ سُنا تو آپ
اُسے حیرت سے دیکھا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا" اگر
پاس کچھ نہیں ہے تو کیا ہوا تمھارے خدا
پاس تو سب کچھ ہے۔ میرے لئے تم اپنے خدا
رزق طلب کرو"۔

آپ نے آتش پرست کی گفتگو میں
چھپے ہوئے پہلو کو محسوس کیا تو تڑپ اُٹھے
اس سے کہا "بیٹھو! میں تمھاری ضیافت
کروں گا"۔ وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ کے
آپ کے پاس بیٹھ گیا تو آپ نے دعا کے
ہاتھ اٹھائے اور کہا" اے اللہ تعالیٰ! ا
حبیب مکرم کے صدقہ میں مجھے آتش پر
کے سامنے ندامت سے بچا لے"۔

ابھی آپ دعا سے فارغ ہوئے ہی
کہ آسمان سے ایک خوانِ نعمت نازل ہوا

وہ بے حد حسین تھی۔ اس کے انگ انگ میں مستی
موجزن تھی۔ گرد و غبار کی دبیز تہیں شعلۂ
حُسن کو چھپانے میں ناکام تھیں۔ برہنہ سر برہنہ پا
اور خود رفتگی کے عالم میں......

نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد آتش پرست کا رویہ مؤدب ہوگیا۔ اُس نے درخواست کی "مجھے اپنے ساتھ سفر کی اجازت دیجیے تاکہ آپ کی مصاحبت سے استفادہ کرسکوں۔"

آپ نے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں، مگر یہ اچھی طرح سوچ لو کہ میں بار بار رزق طلب کرنے کے لئے دُعا کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ تمہیں بہت فاقے کرنے ہوں گے۔"

آتش پرست خوشی سے سفر قبول کرکے آپ کے ساتھ ہولیا۔ شام سے پہلے آپ زنجان پہنچ گئے۔ زنجان کے امیر کبیر علی موسوی نے آپ کا بڑا پُرتپاک خیر مقدم کیا کیونکہ وہ آپ کے والد کا دوست تھا۔ رات کھانے پر آپ نے خود معذرت کرلی اور آتش پرست نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ صبح آپ چلنے لگے تو موسوی نے پھر اصرار کیا کہ آپ کچھ کھالیں مگر آپ نے رات ہی روزے کی نیت کرلی تھی۔ روزے کے عذر کے بعد اصرار کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ زنجان سے آپ قزوین کی طرف بڑھے تو آتش پرست نے دریافت کیا:

"آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟ موسوی غیر تو نہیں تھے۔ وہ بالکل اپنے بیٹوں کی طرح آپ سے محبت کرتے ہیں۔"

آپ نے کہا "غیر ضروری سوالوں سے پرہیز کیا کرو۔ تمہاری ریاضتوں نے تمہیں ایک حد تک صاحبِ کشف بنا رکھا ہے۔ جو بات تم سمجھ چکے ہو کیوں پوچھ رہے ہو! ہر چیز جو سامنے آجائے کھانے کی نہیں ہوا کرتی۔ لذیذ غذاؤں کی خوشبو اشتہا انگیز ہوا کرتی ہے لیکن اشتہا پر وہ لقمہ حرام ہے جس کے حصول میں حرام و حلال کی تمیز نہ کی گئی ہو۔"

سفر کا ساتواں دن تھا اور فاقے پر فاقے ہو رہے تھے۔ آتش پرست کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اُس نے کہا "آپ اجازت دیں تو آج میں آپ کی ضیافت کا اہتمام کروں۔"

لق و دق میدان میں اس کی یہ بات سن کر آپ نے کہا "اگر تم اہتمام کرسکتے ہو تو ضرور کرو۔" آتش پرست نے اپنا عصا زمین پر ٹیک کر زیرِ لب کچھ کہا اور اسی وقت ایک خوانِ نعمت آسمان سے نازل ہوگیا۔ یہ خوانِ نعمت بھی ویسا ہی تھا جیسا آپ کی دُعا کے بعد نازل ہوا تھا۔ آتش پرست کی مقبولیتِ دعا دیکھ کر آپ کو حیرت ضرور ہوئی مگر آپ نے حیرت کا اظہار نہیں کیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا "تم کھانا کھالو میں ابھی اور بھی بھوک برداشت کرسکتا ہوں۔"

آتش پرست نے کہا "آپ میری مقبولیتِ دعا پر حیران نہ ہوں اور کھانا کھالیں۔ کھانا کھانے کے بعد میں آپ کو دو خوشخبریاں سناؤں گا۔"

آپ کھانے میں شریک ہوگئے۔

فراغتِ طعام کے بعد آتش پرست نے کہا۔ "پہلی خوش خبری یہ ہے کہ میرا دل آپ کے دین پر مائل ہوگیا ہے، مجھے کلمۂ طیبہ پڑھائیے۔"
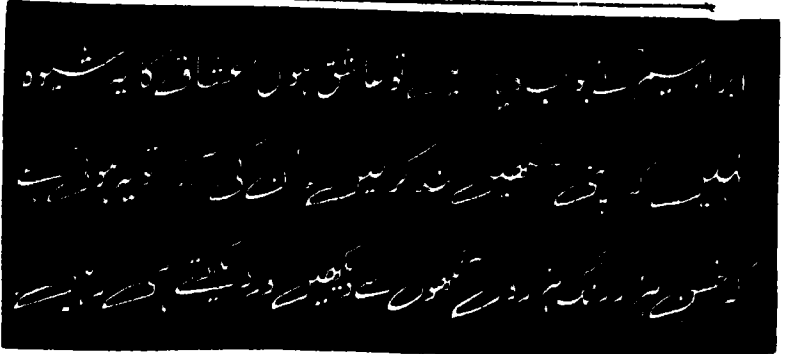
آتش پرست نے اسلام قبول کرنے کے بعد دوسری خوشخبری سنائی "آپ اللہ کے مقبول بندے ہیں اور اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں کفر و شرک کی نجاستوں سے آلودہ تھا میں نے اپنی دُعا سے اسی طرح خوانِ نعمت حاصل کرلیا جس طرح آپ نے حاصل کیا تھا لیکن اس میں میرے کسی کمال کو کوئی دخل نہیں تھا۔ آپ میری دُعا سُن لیں اور خود ہی اندازہ لگالیں کہ میرا خیال کس حد تک درست ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے صرف یہ کہا تھا کہ اے اللہ! میں تو سراپا خطا ہی خطا ہوں، اس بزرگ کے صدقہ میں جو میرا رفیقِ سفر ہے، مجھے ندامت سے بچالے!"

آتش پرست کا نام آپ نے عبداللہ تجویز کیا۔ جب اُس کے ساتھ آپ قزوین پہنچے تو اُس سے کہا "اب ہماری راہیں مختلف ہیں۔ تم یہاں سے مکۂ مکرمہ چلے جاؤ اور وہیں قیام کرو، زندگی نے وفا کی تو تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

عبداللہ آپ سے رخصت ہو کر حجازِ مقدس کی طرف روانہ ہوگئے۔ قزوین میں آپ دو دن قیام کے بعد ہمدان کی طرف چل پڑے۔ دورانِ سفر میں ایک جوانِ رعنا نفیس لباس میں ملبوس آپ سے ملا اور سفر میں ساتھ رہنے کی استدعا کی۔

آپ نے اُس سے بھی بطورِ شرطِ سفر کہا "میرے ساتھ رہو گے تو فاقے کرنے ہوں گے۔ اس مصیبت کو خوش دلی سے قبول کرلو تو میرے ساتھ سفر میں کوئی قباحت نہیں ہے۔"

نوجوان ساتھ ہولیا۔ چوتھے دن ویرانہ میں ایک جھونپڑی نظر آئی۔ آپ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بزرگ محوِ عبادت ہیں۔ آپ کی آہٹ سُن کر انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر استقبال کیا۔ کھانے کا وقت ہوا تو بزرگ نے دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چن دیئے۔

آپ نے نوجوان سے کہا "آؤ! کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرو۔"

نوجوان نے کہا "آپ شوق سے کھانا تناول فرمائیں۔ میرا عزم تو یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ مجھے بلا واسطہ کھانا عطا نہ فرمائے گا ہرگز

[illegible]

ں اس کی شرکت، دراصل کاروباری ضرورت تھی۔ اُسے
بھی لاشیں اچھی نہیں لگتی تھیں اور نہ ہی وہ ادارے کے
پُراسرار خاموش اور گونگے ماحول کو پسند کرتا تھا۔ جب بھی
سے تابوت کے پاس سے گزرنا پڑتا تھا تو اسے متلی سی ہونے
لگتی تھی۔۔ خاص طور سے ایسے ماحول میں جہاں
بوت کے ارد گرد لوگ گریہ وزاری بھی کر رہے ہوں۔

آج تو خاص طور سے حالات مختلف تھے' لیکن
یڈ کو نہ تو متلی ہو رہی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی الجھن۔

وہ کسی متوفی کی تدفین میں نہیں آیا تھا' وہ تو
یک مقتول کا آخری دیدار کرنے آیا تھا' اسے آخری
رندرانۂ عقیدت پیش کرنے کی خاطر یہاں موجود تھا۔

ویڈ کو دو لفظوں سے شدید چڑ محسوس ہوتی تھی
یک قتل اور دوسری مقتول سے۔ اس کا ذاتی نظریہ تھا
کہ یہ دو لفظ ہی پھانسی کا باعث بنتے ہیں۔ اسے اُن قاتلوں
سے بھی شدید نفرت تھی جو گرفتار ہو جاتے تھے اور وہ
عام طور پر کہتا تھا کہ ایسے قاتلوں کو پھانسی دینے کے
بجائے تڑپا تڑپا کر مارا جائے۔

ہال میں پہنچ کر نہ جانے کیوں اسے جھرجھری سی
گی۔ یہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ہال سے اس کمرے تک
جانے والی گلی نما راہداری بالکل خالی تھی جہاں تابوت
رکھے ہوتے ہیں۔

وہ سوچنے لگا کہ مجھے اتنی رات کے وقت نہیں
آنا چاہیئے تھا اور وہ بھی تنہا۔ اسے تو صرف یہ ثبوت
پیش کرنے کی خواہش یہاں لے آئی تھی کہ وہ بھی اپنے
دوست کا آخری دیدار کرنے کی خاطر آیا تھا مگر یہاں
نہ تو کوئی اسے دیکھنے والا تھا اور نہ ہی کوئی گواہ۔ اُس
نے تعزیت کے لئے آنے والوں کی کتاب میں دستخط
کئے اور پھر سوچنے لگا کہ اب اپنی موجودگی ثابت کرنے
کے لئے مجھے کل تدفین کے وقت کل چرچ بھی جانا پڑے گا
اور پھر کچھ سوچ کر مسکرانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دولت
کی اب اسے کوئی کمی نہیں' وہ چارلی کے تابوت پر سنوں
پھول ڈال سکتا تھا۔ اور ...... اس سلسلے میں اسے کنجوسی
کے مظاہرے کا کوئی حق نہیں' کیونکہ یہ دولت چارلی ہی
کی وجہ سے تو اسے ملی ہے۔

پھر مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی۔

.... آخر چارلی کی آخری رسوم کے لئے
اس گھٹیا سے ادارے کا انتخاب کس کنجوس نے کیا ہے
وہ بڑبڑانے لگا" چارلی کے شایانِ شان کوئی چیز
بھی نہیں۔ بجلی کے بجائے مدقوق لیمپ جل رہے ہیں اور
سارا ماحول سیلن زدہ ہے" پھر اس کی نظر تابوت والے
کمرے پر جم گئی۔ اور وہ ایک بار پھر جھرجھری لے کر رہ گیا
"حادثہ.. " اس نے زیرِ لب مسکرانے
کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اسے سب کچھ یاد آنے لگا

چارلی کے نئے گیراج میں داخل ہونا کوئی مشکل
بات نہ تھی' لہٰذا جب ویڈ کو یہ علم ہو گیا کہ چارلی کس
گاڑی میں دس لاکھ کے جعلی نوٹ لے جانے والا ہے تو
اس نے اپنے منصوبے پر فی الفور عمل درآمد شروع کر دیا
یہ تمام نوٹ دس اور پچاس ڈالر کے تھے۔ اور چارلی ویڈ
کو کئی بار یہ گر بتا چکا تھا کہ پولیس والے ان چھوٹے نوٹوں
پر کوئی شک نہیں کرتے اور ویڈ نے اس نکتہ کو گرہ
میں باندھ لیا تھا۔

اسے علم تھا کہ چارلی کس راستے سے جائے گا
لہٰذا گیراج میں چارلی کی گاڑی کے اسٹیرنگ پر تین چار بار
ہاتھ پھیرنے کے بعد اس نے اپنی کار ریک بلف روڈ پر
پہنچ کر اس طرح ترچھی کھڑی کی کہ چارلی کو موڑ کاٹتے
ہوئے ہی زور سے بریک لگانا پڑے اور کھائی سے
بچنے کے لئے اسٹیرنگ کو گھمانا بھی پڑ جائے۔

لہٰذا جونہی چارلی نے ایک کار ترچھی کھڑی دیکھی
تو بریک لگانے کے ساتھ ہی اسٹیرنگ بھی گھمایا' لیکن
اسٹیرنگ پورا گھوم گیا۔ گاڑی بدستور اسی سمت
میں چلتی رہی جس میں پہلے چل رہی تھی اور پھر ایک طرف
الٹ کر نیچے گر گئی۔

ویڈ اس وقت تک نیچے نہیں گیا جب تک گاڑی
میں آگ نہیں لگ گئی۔ جب اس نے شعلے دیکھے تو پھر
وہ دوڑ کر نیچے گیا اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس
اٹھا لیا۔ گاڑی کے اندر چارلی ابھی زندہ تھا۔ اس کو دیکھ
کر ویڈ نے منہ پھیر لیا اور واپس چل دیا۔ چارلی کی چیخیں
بھی اس کا دل نہ پگھلا سکیں' اسے سو فیصد یقین ہو گیا کہ
چارلی چند لمحہ بعد جل کر راکھ ہو جائے گا۔

وہ جلد ہی قصبہ سے نکل آیا۔ اس کا منصوبہ
بھرپور تھا' وہ پہلے ہی جاننے والوں کو بتا چکا تھا کہ وہ
ویگاس جا رہا ہے کیونکہ وہاں اسے کاروبار ملنے کی
توقع ہے۔

ویگاس پہنچ کر وہ پُرسکون ہو گیا۔ اب اس
کے پاس رقم بہت تھی لیکن وہ اتنا احمق نہ تھا کہ اسے
فوراً خرچ کرنے لگتا وہ مناسب وقت کا انتظار کرنے
لگا اور اس دوران باقاعدگی سے اپنے شہر کے اخبارات
پڑھتا رہا' پانچ روز بعد اسے ایک خبر نظر آئی تو وہ
مسکرانے لگا۔

"پولیس کو بلف روڈ کے قریب کھائی سے ایک
جلی ہوئی کار میں ایک سوختہ لاش ملی ہے' پولیس کے
مطابق یہ واقعہ اور موت دونوں محض اتفاقی ہیں اور
جیوری نے بھی موت اور آتشزدگی کو اتفاقی قرار دے
دیا ہے۔ عدالت کے حکم پر چارلی نامی اس شخص کی تدفین
ہفتہ کے روز ہو گی' جسے اس کی ایک انگوٹھی سے شناخت
کیا گیا ہے۔"

یہی وہ خبر تھی جسے پڑھ کر ویڈ فوراً ویگاس
سے روانہ ہوا تھا۔

تابوت والے کمرے کے باہر دیوار کے ساتھ
ساتھ پھولوں کی درجنوں چادریں رکھی ہوئی تھیں۔
اور اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت سے لوگ دن میں
اظہارِ عقیدت کرنے کے لئے آ چکے تھے۔

ویڈ نے ایک طویل سانس لی تو پھولوں کی
مہک اس کے پھیپھڑوں تک میں اتر گئی لیکن وہ برا سا
منہ بنا کر کھانسنے لگا۔ اسے ان پھولوں سے متلی ہونے
لگی کیونکہ اُن میں لاش پر لگائی جانے والی دواؤں
کی بو بھی شامل تھی۔

دراصل اسے ایسی ہر چیز سے نفرت تھی جس
کا تعلق موت سے ہو۔ اُسے تابوت' کفن' قبر' گورکن'
چرچ اور خود موت کی میم سے خوف محسوس ہوتا تھا۔

"چلو۔۔ واپس چلو" اس نے خود سے کہا۔
" چارلی کا چہرہ دیکھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے' ویسے بھی
تابوت بند ہو گا' کیونکہ چارلی کی لاش جل کر ناقابلِ شناخت
ہو گئی ہے۔"

اس نے ایک لمحہ کے لئے' اپنی آنکھیں بند
کر لیں اور پھر شعلوں میں چھپا ہوا چارلی چشمِ تصور میں

دد آیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چارلی کے
ملنے کا منظر اتنا خوفناک تھا کہ وہ اسے ایک لمحے کے لئے
بھی برداشت نہ کر سکا۔

" میرا خیال ہے کہ تابوت پر ایک نظر ڈال ہی
ں"۔ اس نے ہونٹ دبا کر سوچا۔ تابوت سے کیا خوف
، تو لکڑی کا ایک ڈبہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر جو چیز ہے
س سے ڈرنا اب فضول ہے۔ وہ بے جان ہو چکی ہے
یلن اگر اس کی جگہ میں ہوتا اور ....

وہ مجھے قبر میں

ن کر دیتے تو کیا.....'

قبر اور دفن ہونے کے خیال ہی سے اس کے
ؤ کانپنے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں
ں ڈال لئے مگر پھر بڑے حوصلے سے کام لے کر کمرے
یں داخل ہو گیا جہاں چارلی کا تابوت رکھا ہوا تھا۔

وہ سیٹی بجا کر رہ گیا۔

یہ تابوت بہت مضبوط تھا اور اس کے جوڑوں
ر لوہے کی پتریاں لگائی گئی تھیں تاکہ جوڑ کھل نہ جائیں۔
ہ تابوت دیکھ کر خوف کی سرد ترین لہر اسے بے حال
ر گئی۔

یہ تابوت ایسا تھا کہ اس میں سے نکلنے کا کوئی
سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

" چلو۔ یہاں سے نکلو!"

س نے اپنے آپ سے کہا۔ " یہاں تو دم گھٹنے لگا
ہے۔ کسی کے جلنے کی بو آ رہی ہے' چلو... چلو یہاں
سے....

کہیں چارلی تابوت کھول کر نکل نہ آئے

۔ صبا گو۔ !

پھر ویڈ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔
تابوت کا بالائی حصہ واقعی آہستہ آہستہ اوپر

اٹھ رہا تھا۔

ویڈ نے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام
ا۔ ایسا لگا جیسے اس کے پیر زمین نے پکڑ لئے ہوں۔
تابوت کا بالائی تختہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور
ارلی تابوت میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ ناقابلِ شناخت نہ تھا۔

اُس کے جسم سے قطعِ نظر' چہرے پر جلنے کا
ایک ہلکا سا نشان تھا' وہ بھی بائیں جبڑے کے نیچے۔

.... اور اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور بھی
تھا۔

" آؤ دوست ...." ریوالور کی نال کا رخ
ویڈ کے پیٹ کی طرف ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ
کھیلنے لگی۔

" ب.... ب... بھوت... ت. ت!" ویڈ
کانپنے لگا۔ چارلی کی آواز نرم تھی' ایسے جیسے کوئی خواب
میں بولا ہو۔

" نہیں میرے دوست! میں بھوت نہیں ہوں..."

" تم تو مر... چکے... تھے... چ... چارلی"

" میں زندہ ہوں!" یہ کہہ کر چارلی پھولوں پر پیر
رکھتا ہوا تابوت سے نکل آیا۔ اس کا جسم بھی محفوظ
تھا۔ " میں زندہ تھا اور زندہ ہوں ویڈ تمہارے فرار
ہوتے ہی میں بھی کار سے نکل آیا تھا' ویسے میں نے سڑک
پر تمہاری کار پہچان لی تھی' پھر جب تم نے حادثے کے بعد
سوٹ کیس اٹھایا تو میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔"

ویڈ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ایک لفظ بھی منہ سے
نہ نکل سکا۔ اب تو اس کی زبان بھی ساتھ چھوڑ رہی
تھی۔ اس نے ہنسنا چاہا تاکہ چارلی اسے مذاق سمجھ
کر بھول جائے مگر ہنسی بھی نہ آ سکی۔ پھر نہ جانے کس
طرح چند جملے اچانک نوکِ زبان سے پھسل گئے۔

" اخباروں میں تو تمہاری ....موت کا تذکرہ
تھا.. چارلی..."

" ہاں!" چارلی کے جبڑے تن گئے۔ " ہمیں علم
ہو گیا تھا کہ تم ویگاس گئے ہو۔ لہٰذا ہم نے تمہیں جلد
تلاش کر لیا اور یہ بھی پتہ چلا لیا کہ تم قصبے کے اخبار
میں بہت دلچسپی لے رہے ہو۔ ایک روز ہم نے اسی اسٹال
پر سے اس ایڈیشن کی تمام کاپیاں اٹھا لیں جو شہر سے
آیا تھا اور اپنی چھاپی ہوئی کاپیاں رکھ دیں اور تم اس
جال میں پھنس گئے۔ ہم چاہتے تھے کہ تم اپنی تدفین
کے لئے خود خاموشی سے یہاں آ جاؤ اور ..... وہ
مقصد پورا ہو گیا۔

" ت.... تم نے.... جعلی اخبار چھاپا تھا؟"

" ہاں۔ لوگ مجھے چارلی دی پرنٹر ہی کہتے ہیں"
نا' چارلی کے چہرے پر بلا کی سرخی تھی۔

ویڈ سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ یہ بھی جان گیا کہ
چارلی تابوت میں کیوں لیٹا ہوا تھا۔ انھوں نے اس
گھٹیا ادارۂ تدفین کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ یہاں لوگ
کیوں نہیں تھے۔ لیکن اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا
وہ مفلوج ہو رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں
کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا
اور جسم میں یکایک تپش شدید ہو گئی تھی۔

اور پھر اس کی آنسو بھری آنکھوں نے چارلی
کے بھائی سام' ادارۂ تدفین کے مالک لگاری اور چارلی
کے سالے انجیلو کو بھی دیکھا جو انتہائی سنجیدگی سے
باری باری کمرے میں داخل ہو کر ویڈ کے سامنے کھڑے
ہو رہے تھے۔

انھوں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اسی
کے ساتھ پھولوں کی بو تیز ہو گئی۔ اس نے ان سے
لڑنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا اور پھر وہ اس پر
چھاتے چلے گئے۔ " مجھے گولی مار دو" اس نے گھگھیا کر
درخواست کی' مگر چارلی نے ریوالور جیب میں رکھ لیا

" پلیز... چارلی... مجھے گولی مار دو... سنو!"

کسی نے بھی اس کی ایک نہ سنی۔ سام نے اس
کی پنڈلیاں اور انجیلو نے اس کی کلائیاں باندھیں
اور پھر لگاری نے ایک آہنی ہتھکڑی سے اس کی رانیں
بھی باندھ دیں اور ..... اس کے بعد انھوں نے اسے
تابوت میں لٹا دیا۔ وہ چیخنے لگا مگر اسی لمحے ایک زوردار
ضرب اس کی ٹانگ پر پڑی۔ لگاری نے کوئی آہنی چیز
ماری تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

اور پھر جب اُسے ہوش آیا تو وہ تابوت میں
کیلیں ٹھونک رہے تھے۔

وہ تابوت بند کرنے سے قبل اس کے منہ میں
روئی ٹھونس کر ٹیپ لگانا بھی نہیں بھولے تھے۔

ایک نوجوان نے ڈاکٹر کی خدمت
میں یہ درخواست کی کہ وہ اسے اپنی
فرزندی میں قبول کریں۔
ڈاکٹر نے پوچھا: تمہاری عمر
کیا ہے۔؟
نوجوان نے جواب دیا۔ " اٹھارہ سال۔
مگر میری بیٹی کی عمر بائیس سال ہے۔"
ڈاکٹر نے کہا: کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ
تم چار سال انتظار کر کے اس کے ہم عمر ہو جاؤ

ثواب کی خاطر

انور عنایت اللہ

یہ کہتے ہوئے وہ لنگڑاتا ہوا چلا گیا اور اُس کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے تمام فقیر اندھیرے میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اور اس ہیبت ناک قبرستان میں اس اجنبی میت کے ساتھ تنہا رہ گیا۔

دنیا میں بہت سے کام کئے تھے لیکن یہ کام میرے لئے نیا تھا۔ آخر کو خدا جانے..

قبرستان کی چار دیواری کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں آثار قدیم کے کسی کھنڈر میں آگیا ہوں۔ جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی تھیں اور اس کے ٹیڑھے ترچھے پتھروں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے موسم اور وقت نے اس قبرستان کے ساتھ بھی بڑا ظلم کیا ہو۔

سورج غروب ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود یہاں خاصی روشنی تھی۔ میں بڑے پھاٹک میں سے قبرستان میں داخل ہوا تو یکایک آس پاس کے چھوٹے بڑے، حسین اور بے ہنگم مقبروں میں تیز روشنیاں جل اٹھیں اور دن کا سا گمان ہونے لگا۔ غالباً یہاں ایسے امیر مردے دفن تھے۔ اس لئے ان کے ورثاء کے علاوہ کارپوریشن نے بھی چاروں طرف تیز روشنی کا انتظام کر رکھا تھا، جب کہ آس پاس کی سڑکیں کچھ زیادہ روشن نہیں تھیں۔

میں نے ایک جگہ رُک کر گرد و پیش کا جائزہ لیا تو دائیں طرف مجھے ایک سیاہ فام موٹا تگڑا شخص نظر آیا جو ایک صاف ستھری پکی قبر پر بیٹھا حقے کی چلم بھر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کپڑے جھاڑتا اٹھا اور مسکراتا ہوا میرے پاس آیا۔ بڑے ادب سے سلام کیا اور جھک کر خوشامدانہ انداز میں میرے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"جناب کو کتنی جگہ چاہیئے؟ یوں تو سرکار نے یہ قبرستان بند کر دیا ہے لیکن وڈی ہم نے آپ جیسے شریف آدمیوں کے لئے تھوڑی بہت جگہ بچا کر رکھی ہے۔ آپ کے مردے کو یہاں بالکل تکلیف نہیں ہوگی بجلی کا بھی معقول انتظام ہے۔ وڈی ایک درخت بھی نزدیک ہے۔ اگلی گرمی میں اس کا سایہ بھی آپ کو ملے گا۔"

اس نے یہ تفصیلات اتنی تیزی اور روانی سے بتائیں کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کا کون مرا ہے" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"کوئی نہیں —— دراصل آج صبح ہمارے

گھر کے عین سامنے ایک غریب چلتے چلتے گرا اور مر گیا۔ خدا جانے کون تھا بیچارہ ——— دن بھر ہم پولیس اور تھانوں کے چکر میں رہے۔ شام کو لاش ملی۔ وارثوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پولیس والے خود دفن کرنا چاہتے تھے لیکن مجھے اچھا نہ لگا۔ ثواب کمانے کو بھی بہت جی چاہا۔ اس لئے میں لاش گھر لے آیا۔ محلے والوں کے ساتھ مل کر چندہ جمع کیا اور سیدھے تمہارے پاس آیا ہوں۔ ایک عدد قبر چاہیئے۔ تقریباً پانچ ساڑھے پانچ فٹ لمبی۔ اب بتاؤ تم کیا لوگے؟" میں نے تفصیلات بتاتے ہوئے پوچھا۔

میری باتیں سنتے ہی گورکن کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کی جھکی کمر آناً فاناً، آپ ہی آپ سیدھی ہوگئی اور اس نے نہایت خشک لہجے میں جواب دیا۔

" ادھر جگہ ذرا مہنگا ہے صاحب ——— چوں کہ پہاڑ کے اوپر قبرستان ہے اس لئے ادھر کا ریٹ زیادہ ہے۔ آپ یا تو ہم کو ڈھائی سو روپیہ دے دو یا مردے کو لالو کھیت لے جاؤ۔ ہم نے آپ کو رعایتی ریٹ بتایا ہے۔ اپن کو پکا مسلمان ہے صاحب۔ اس لئے سب کو نوا جگہ دیتا ہے ایک مردے کو نکال پھینک کر دوسرے کو اُن میں دفن کرنا، وڈی ہم کو اچھا نہیں لگتا۔ مرنے کے بعد انسان کی عزت تو کرنی ہی پڑتی ہے صاحب۔ اس کے آرام کا بھی بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ فٹافٹ ڈھائی سو نکالو ابھی کام شروع کر دیگا!"

یہ سُننا تھا کہ فوراً میرے حواس ٹھکانے گئے۔ "یعنی ڈھائی سو روپے صرف ایک میّت کے!" بے اختیار میرے منھ سے نکلا۔

" اور نہیں تو کیا اکھا شہر کے؟" اُس نے نہایت بدتمیزی سے جواب دیا۔ "ہم نے تو آپ پر ترس کھا کر رعایت کر دیا تھا ورنہ بابو صاحب بعد تو پانچ سو میں بھی قبر نہیں ملتی۔ منظور ہے دیتا دو ورنہ گھر جاؤ۔ کیوں خالی پیلی ہمارا وقت ضائع کرتا ہے؟"

" نہلانے دُھلانے کا کیا ہوگا؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

" یہ کام ہم نہیں کرتا صاحب۔ ہم تو صرف قوم کا قبر کھودتا ہے۔ اِدھر شہر میں بڑا ٹھاکو پلی ہے۔ کسی کو بھی ٹیلیفون مارو۔ وہ سب کچھ کر دے گا۔ میرا خیال ہے تم پر ترس کھا کر سو روپے میں کر دے گا!"

اس کے حساب سے پورے ساڑھے تین سو کا نسخہ تھا۔ میں نے سر کھجاتے ہوئے حساب لگایا تو یاد آیا کہ ہم سب نے مل کر کل ساٹھ روپے پچھتر پیسے جمع کئے تھے۔

"ارے کس سوچ میں پڑ گئے صاحب؟ جلدی کرو۔" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

" ذرا گھر جا کر محلے والوں سے بات کر لوں ——— ابھی آکر جواب دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے مُڑا۔

"ذرا جلدی جواب دینا صاحب ——— وڈی ہم رات کو ساڑھے آٹھ اور صبح کے سات بجے کے درمیان بالکل کام نہیں کرتا۔ اگر کوئی ارجنٹ معاملہ ہے تو اس کا ریٹ دگنا ہے!" وہ بڑی بدتمیزی سے چیخا۔

میں صبح سے تھکا تو تھا ہی۔ اب گورکن کی باتوں سے مجھے بڑی وحشت ہونے لگی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور رہ رہ کر مجھے اپنی نئی نویلی دلہن کا خیال آرہا تھا جو ابھی ہفتہ بھر پہلے ٹنڈو آدم سے کراچی آئی تھی۔ اس بیچاری کے ساتھ تو بہت سے ظلم ہوتے تھے۔ شادی کے فوراً بعد میرا تبادلہ۔ کراچی میں معقول گھر کا نہ ملنا۔ پھر بڑی مشکل سے ہاؤسنگ سوسائٹی کے اس غیر آباد علاقے میں چھوٹے سے مکان کا ملنا ——— وغیرہ وغیرہ۔ یہاں سے بازار خاصا دور تھا۔ صرف قبرستان محلّے کے بیچوں بیچ تھا۔ شاید اسی لئے رہنے والوں کی سہولت کے لئے یہ سوسائٹی آباد بھی کی گئی تھی۔

بہرحال صبح سے میری بیوی نے طوفان مچا رکھا تھا۔ وہ شام کو یہ کہہ کر اپنی ایک سہیلی کے یہاں چلی گئی تھی کہ جب تک غیر کا مردہ گھر میں ہوگا وہ دہلیز پار نہیں کریگی۔ اِدھر مُلازم نے علیحدہ جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ ڈر سے اُس کا بُرا حال تھا۔ میری مشکلات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اگر کوئی مومن میرے گھر کے عین سامنے مرتا اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو کیا میں اُسے میڈیکل کالج کے حوالے کر دیتا تاکہ لونڈے اور لونڈیاں چیر پھاڑ کر تجربے کریں؟ میں تو انسانی ہمدردی میں اس کی لاش اپنے یہاں لایا تھا۔

اب گورکن سے تبادلۂ خیال کے بعد جو سوال مجھے پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ اگر ساڑھے تین سو روپئے جمع نہ ہو سکے تو اِس غریب کی لاش کا کیا ہوگا! خود میرا حشر کیا ہوگا؟ بیگم حالات کا جائزہ لینے کیلئے صبح لوٹنے والی تھیں۔ ٹھیک سات بجے انھوں نے پورے سترہ گھنٹوں کی مہلت دی تھی اور دھمکی دی تھی کہ اگر اس وقت تک لاش ٹھکانے نہ لگی تو وہ سیدھے میکے کا ٹکٹ کٹا لیں گی۔

اسی اُدھیڑبُن میں جب میں قبرستان سے گھر لوٹا تو مجھے اپنے گھر لوٹا تو مجھے اپنے گھر کا صدر دروازہ چوپٹ کھلا مِلا۔ نہ ملازم کا پتہ تھا اور پڑوسیوں کا۔ میّت برآمدے میں جُوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں۔ میں نیا نیا اِس محلے میں آیا تھا۔ مجھے ان پڑوسیوں کے نام معلوم تھے اور نہ پتے جنھوں نے چندہ دیا تھا ان لوگوں کو تو میں میّت کے پاس چھوڑ گیا تھا اب خدا جانے وہ کہاں غائب تھے۔ میں نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔ سات بجے تھے۔ جلدی سے میں نے گھر کا صدر دروازہ بند کیا اور مسجد کا رُخ کیا۔

محلّے کی یہ مسجد ابھی زیر تعمیر تھی۔ چوں کہ آبادی کم تھی اس لئے اکثر خالی رہتی تھی۔ اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ منبر کے قریب ایک اسٹول پر لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے نمازیوں کے ساتھ ساتھ مولانا صاحب بھی گھر جا چکے تھے۔ صحن میں مجھے ایک لنگڑا فقیر نظر آیا جو ایک طرف بیٹھا سر کی جوئیں مار رہا تھا۔ میں نے اس سے پیش امام صاحب کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب

۔" وہ تو گھر چلے گئے۔ اب عشاء کے وقت آئیں
ہ ـــ بات کیا ہے؟ کیا کسی کی شادی وادی
ہ بابوجی؟" وہ اپنے ٹیڑھے میڑھے زرد زرد
ہ دانت نکالے مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھنے
ا۔

نہیں بھئی ـــ ایک میت ہے ـــ
ے نہلانا دفنانا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے
ورہ کرنا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اجی وہ کیا مشورہ دیں گے بابوجی؟ سارے
درے تو وہ مجھ سے لیتے ہیں۔ کیا آپ کہیں
یب ہی رہتے ہیں؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا؟
ہے میری امارت کا اندازہ لگانا چاہتا ہو۔ "ہاں"
ں نے جواب دیا۔

"تو بابوجی۔ آپ ۹۸۷۴۳۲ پر ٹیلیفون کر دیجئے
ا اچھی انجمن ہے۔ جو تسلی سے سب کام کر دیتی ہے۔
ا کا نام ہے ـــ 'انجمن فلاحِ گورکن و غسال وکفن
ِ شان و مرحومین' ـــ مرحوم کون تھا؟ ـــ
کا رشتہ دار؟"

"نہیں" "ملازم ہوگا؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔ گورکن سے
بصیرت افروز گفتگو کے بعد میں ذرا محتاط ہو گیا
ا۔

"ہاں" آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ قبر تک ـــ
نتظام وہ انجمن کر دے گی۔ ویسے آپ کرتے
ہتر تھا کیونکہ سنا ہے۔ لوگ موقع پا کر ایک
قبر میں کئی کئی مردے دفن کر دیتے ہیں ـــ
ن بابوجی آپ کو کیا ـــ آپ کا مُردہ نئی میں
ن ہو یا پرانی میں۔ ملازم ہی تو تھا ـــ جائیے
ی جلدی سے فون کھڑکھڑائیے۔"

"اخراجات کیا ہوں گے؟" میں نے ڈرتے
تے پوچھا۔

"اجی بابوجی آپ سے کیا زیادہ لیں گے۔
و آپ سے ایسے موقعے ملتے ہی رہیں گے۔
نوجوان ہیں' دولت مند ہیں ـــ کنبہ بھی
ہوگا۔ بہر حال یہی کوئی ڈیڑھ سو روپئے لیں گے۔"

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

ڈیڑھ سو روپئے؟ ـــ میں نے گھبرا کر
سوچا۔ مزید نواسی روپئے پچیس پیسے کہاں سے
آئیں گے، یکایک مجھے یاد آیا کہ بیگم نے میرے نئے
سوٹ کے لئے سو کا ایک نوٹ چھپا کر الماری میں
رکھا تھا۔ اس سے مجھے تسلی ہو گئی اور میں نے فوراً
اس لمبے چوڑے نام کی انجمن کی خدمات حاصل کرنے
کا فیصلہ کر لیا اور چلنے کے لئے مُڑا تو لنگڑے فقیر
نے مجھے روکا۔

"اگر کوئی دقت ہو تو مجھے بلوا لیجئے گا بابوجی
ـــ نام میرا جانو لنگڑا ہے۔ اسی مسجد میں
رہتا ہوں اپنا ریٹ کچھ زیادہ نہیں ـــ صرف پانچ
روپئے ـــ اگر دو چار اور خرچ کریں تو میت
کے ساتھ قبرستان تک جانے والوں کا بھی انتظام
کرتا ہوں!"

مجھے جلدی تھی اس لئے میں نے اس کی پیش
کش پر زیادہ غور نہیں کیا، سیدھے ایرانی کے ہوٹل
پہنچا اور انجمن مرحومین وغیرہ وغیرہ کو فون کیا۔ دوسری
طرف سے گھنٹی کے بجتے ہی ریسیور فوراً یوں اٹھا لیا
گیا جیسے کوئی بے چینی سے ٹیلیفون کے انتظار میں بیٹھا
ہو۔ "جی؟ کیا فرمایا؟ ـــ جی ہاں انتظام ہو جائیگا۔
صرف دو سو روپئے لیں گے ـــ جی؟ ـــ جی
نہیں جناب۔ رات کا ریٹ دوگنا ہوتا ہے۔ دن سے
تو ہم سو روپئے لیتے ہیں ـــ جی نہیں اس سے
پائی کم نہیں ہوگی ـــ خدا حافظ ـــ جلد کہ
فیصلہ کیجئے گا۔ دفتر رات بھر کھلا رہتا ہے!"

اس کے ساتھ ہی کھٹ سے سلسلہ منقطع
ہو گیا اور مجھے یوں لگا جیسے اس کے ساتھ ہی
میرے لئے امید کے سارے دروازے بند
ہو گئے۔ بے چینی سے گھڑی دیکھی۔ صبح کے سات
بجنے میں پورے پونے تیرہ گھنٹے رہ گئے تھے
اس وقت تک مشکل آسان نہیں تو کیا ہوگا؟ بیوی
اور ملازم دونوں سے ہاتھ دھونا ہوگا ـــ خدایا ـــ
میری مدد کر ـــ میری توبہ ـــ آئندہ
جو کسی پر ترس کھاؤں ـــ بس اس بار نجات
کا راستہ دکھا دے ـــ تیری قسم ساری عمر
ایسے جھمیلوں سے دور رہوں گا۔ نوکر کا سود
کے بارے میں کبھی سوچوں گا بھی نہیں!

میری دعا یہیں تک پہنچی تھی کہ یکایک اند
میں روشنی کی ایک کرن آئی جس نے پلک جھپکا
جانو لنگڑے کا روپ دھار لیا۔ میں تیزی سے
دوبارہ مسجد پہنچا۔ جانو وہیں بیٹھا اونگھ رہا
مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھِل اٹھا۔ میں نے د
لفظوں میں اپنی تجویز پیش کی۔ وہ غور سے سنتا ر
پھر اُس نے بعض اہم مشورے دیئے۔ چند لمے
مزید گفت و شنید جاری رہی۔ آخر کو پوسو
پر معاملہ طے ہو گیا اور میں نے فوراً جیب سے کچ
روپئے نکال کر بطور پیشگی اُسے دیئے اور خدا کا
ادا کیا کہ اس نے اتنی جلدی میری سن لی اور
سستے چھوٹا۔

اس سے معاملہ طے کر کے میں گھر پہنچ
لاش جوں کی توں رکھی ہوئی تھی اور ملازم یا بچوں
کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر لنگ
اور کو لولا اور کانوں کی ایک فوج وہاں آگئی او
بڑی مہارت سے کام شروع ہو گیا۔ سب نے
پانی گرم کیا۔ ایک جا کر کہیں سے پھاوڑا لے آیا
دوسرا بس میں صدر گیا اور کفن وغیرہ لے آیا۔ بیو
نے میت کے سرہانے بیٹھ کر قل ھو اللہ پڑھنا
کر دیا کیوں کہ اس بیچارے کو صرف یہی سورۃ یا
تھا جو تھا جا کر قبر کے لئے پُرسکون اور محفوظ
دیکھ آیا۔ اس دوران میں میں نے سب کے
چائے اور کھانے کا انتظام کیا۔
خدا کے فضل سے دیکھتے ہی دیکھتے سا
کام اطمینان سے ہو گئے۔ رات کے ایک بجے
دنیا سو گئی اور محلے پر سناٹا چھا گیا تو اللہ کا نا
میت اٹھائی گئی اور ہم اس قبرستان میں جا پہنچ
جس کے گورکن نے صرف قبر کے ڈھائی سو ما
تھے۔ اتفاقاً ہم نے روشنی کا انتظام نہیں کی
تھا ویسے جانو یہاں کے چپے چپے سے جس ط
اپنی واقفیت کا ثبوت دے رہا تھا اس سے
ہو رہا تھا کہ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے
پروگرام یہ تھا کہ قبرستان کے ایک ویران گو

میں چپ چاپ قبر کھود دی جائے اور میت اللہ کا نام لے کر دفن کر دیا جائے۔

جب ہم وہاں پہنچ گئے تو جاتو ہی نے جنازے کی نماز پڑھائی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بابو جی ——— لیجئے ہمارا کام پورا ہو گیا۔ اب آپ کا شروع ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کر پوچھا کیونکہ اس کا لہجہ مجھے گڑبڑ لگا۔

"اگر ہمارے ہاتھ پاؤں ٹھیک ہوتے تو ہم کبھی آپ کو تکلیف نہیں دیتے ——— یہ پھاوڑا اٹھائیے بابو جی اور فوراً قبر کھودنی شروع کر دیجئے!" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

یہ سننا تھا کہ میرے ہوش اڑ گئے۔

"میں قبر کھودوں؟ ——— میرے باپ دادا نے بھی کبھی ———!" میں تقریباً چیخ پڑا۔

اس پر جاتو نے فوراً مجھے ٹوکا۔ "ش ——— ذرا آہستہ بولئے۔ اگر کسی نے سن لیا تو شامت آجائیگی ہم سے قبر کہاں کھودی جائے گی؟ ——— آپ ماشاءاللہ صحت مند ہیں ——— جوان ہیں، دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں ——— پھر اتنی پریشانی کیوں؟ ——— اٹھائیے پھاوڑہ اور شروع کر دیجئے کام ——— بجے لولے نے دو بالٹی پانی یہاں ڈال رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی وقت لگے گا ہی ——— پتھریلی زمین ہے ——— کورا قبرستان ہوتا تو منٹوں میں کھد جاتی قبر" اس نے نرسان سے مجھے سمجھایا۔

اس کی بکواس سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن آخر کرتا کیا؟ انکار کرتا تو صبح کو قیامت آجاتی۔ نئی نویلی دلہن بچھڑ جاتی ——— ان کی ضد سے میں واقف ہو چکا تھا۔ وہ ضرور میکے جا کر دم لیتیں۔ مجھے خاموش دیکھ جاتو میرے قریب آیا اور اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے بابو جی؟ ——— وقت کم ہے۔ شروع کیجئے نا کام؟ سات بجے گورکن لوٹ آتا ہے۔ اس سے پہلے کچھ ہو جانا چاہئے۔ آپ تیزی سے ہاتھ چلائیں۔ اتنی دیر ہم ذرا کمر سیدھی کر لیں ——— آج بڑا مصروف دن گزرا ——— جب چار فٹ کھد جائے قبر تو ہمیں جگا دیجئے گا ——— بقیہ کام ہم کر لیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ لنگڑاتا ہوا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے تمام فقیر چپ چاپ اندھیرے میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اور اس ہیبت ناک قبرستان میں، اس انجانی میت کے ساتھ تنہا رہ گیا۔

دنیا میں بہت سے کام کئے تھے لیکن یہ کام میرے لئے نیا تھا۔ اس لئے خاصی دیر لگ گئی۔ آخر کو خدا جانے کتنی دیر کے بعد قبر تیار ہو گئی اور ہم سب نے مل کر بڑے احترام سے میت دفن کر دی۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد میں نے کمر سیدھی کی اور پیشانی کا پسینہ پونچھا تو ساڑھے پانچ بجے تھے اور کہیں اذان ہو رہی تھی

——— اللہ اکبر ——— اللہ اکبر!!!

غزل

عروج نفیسی جہانسوی

ہر ایک ہاتھ میں خنجر دکھائی دیتا ہے
یہ دورِ نو کا مقدر دکھائی دیتا ہے

نہ بھائی بھائی کا ہے اب نہ باپ بیٹے کا
ابھی سے حشر کا منظر دکھائی دیتا ہے

یہ کیسے آئینہ خانوں میں لوگ رہتے ہیں
ہر ایک ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے

میں آنکھ بند بھی کر لوں تو پردہ اٹھ جائے
کسی کا جلوہ برابر دکھائی دیتا ہے

جفا کا گرم ہے بازار اس جہاں میں عروج
جسے بھی دیکھو ستمگر دکھائی دیتا ہے

غزل

فخر واحدی

یہ اثر وہ نظر کر گئی
ٹکڑے ٹکڑے جگر کر گئی

آج وہ بھی ہیں مغموم سے
آہ میری اثر کر گئی

دل ہے اس دن سے مثلِ حرم
جب سے یاد ان کی گھر کر گئی

یوں مسلسل تری بے رخی
زندگی مختصر کر گئی

ان کی شمشیر کا شکریہ
قابلِ فخر سر کر گئی

آنریبل مسٹر جسٹس خواجہ محمد یوسف

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انیسویں صدی
ا جب پنجاب کا صوبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس
ے ورثار کے حلقۂ اقتدار سے نکل کر انگریزوں کے

هیرالال چوپڑا

نہ میں آیا تو وہاں انگریزی راج کی جڑوں کو مضبوط
رنے کے لئے انگریزی حکام نے بنگال سے افسوں کو
بھیجا تاکہ وہ وہاں پر انگریزی طریقۂ تعلیم کو پائیدار
یادوں پر قائم کریں۔ جب پنجاب کی اعلیٰ عدالت
یاب چیف کورٹ' یا پنجاب کی یونیورسٹی ۱۸۸۲ء میں
مرضِ وجود میں آئیں تو اُن میں چیف کورٹ کے لئے
ج' اور یونیورسٹی کے لئے پروفیسر بنگال سے ہی بھیجے
لے تھے۔

بیسویں صدی کے شروع ہونے تک پرتول
ندر چیٹرجی جج چیف کورٹ اور پروفیسروں میں
نریزی' فلسفہ' تاریخ' اقتصادیات' سنسکرت
ے اعلیٰ پروفیسر نیز سائنس کے مضامین کے اساتذ
ر فارسی میں بھی اعلیٰ پروفیسر (کے۔ ایم۔ میترا)
یونیورسٹی کے رجسٹرار پی۔ این۔ دت سب بنگال
ہی گئے ہوئے تھے اور پنجاب اسی لئے بنگال
رہونِ منت رہا ہے کہ اس نے اس کی تعلیم و تربیت
نصاف میں اس کی رہنمائی کی اور یہ سلسلہ تقسیم
ب تک قائم رہا۔

اب بنگال میں حال ہی میں ایک نوجوان خواجہ
د یوسف کا مغربی بنگال کی ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا

جانا گویا پنجاب کو ایک ایسا موقع فراہم کرنے کے
مترادف ہے کہ پنجاب' بنگال کے احسانوں کا شکریہ
ادا کر سکے نیز یہ بنگال کی فراخدلی کی ایک بیّن مثال
ہے کہ بنگال صوبہ پرستی کی لعنت سے بلند و برتر
ہے۔

آج سے پچاس' ساٹھ سال قبل خواجہ محکم
دین ساکن چکوال ضلع جہلم اپنے بیوپار کو فروغ
دینے کی غرض سے پنجاب سے بنگال گئے اور وہیں
کے ہو رہے۔ ان کے لڑکے محمد یوسف نے کلکتہ میں
ہی ابتدا سے لے کر آخر تک تعلیم حاصل کی۔ آج سے
کوئی تیس سال قبل اس نوجوان نے کلکتہ یونیورسٹی
سے اسلامک ہسٹری اور کلچر میں ایم۔ اے کا امتحان
پاس کیا اور اس کے ساتھ ہی وکالت کی ایل۔ ایل۔ بی
کی ڈگری بھی حاصل کی۔

زمانۂ طالب علمی ہی سے میں اس برخوردار کو
دیکھ رہا ہوں کہ اس کا اپنے مطالعہ میں انہماک کے
ساتھ' اسے ہندوستانی کی تہذیبی' ثقافتی اور
سماجی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کا شوق تھا۔
تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب میں کلکتہ گیا' اور
وہاں کی ادبی اور ثقافتی مجلسوں میں مدعو کیا جانے
لگا تو اس نوجوان کو ہر مجلس میں آگے بڑھ کر حصّہ
لیتے ہوئے دیکھا۔ ۱۹۴۸ء میں ہی میں نے ڈاکٹر
محمد اسحاق مرحوم کی جاری کردہ ایران سوسائٹی کی
سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع اور اس سوسائٹی کے
سہ ماہی رسالہ" انڈو ایرانیکا" میں مضامین لکھنے شروع
کئے اور سوسائٹی کے تحت منائے جانے والے
" البیرونی' بوعلی سینا' حافظ' اقبال' پروفیسر براؤن'
عمر خیام وغیرہ کی یاد میں جشن منائے جانے لگے
تو اُن میں یہ ہونہار طالب علم بڑھ چڑھ کر خدمت
کرتا تھا۔ بعد میں دیکھا کہ جب بھی کوئی مہم' تہوار' یا
جشن منایا جاتا تو ان کے متعلق یہ عزیز کلکتہ کی مقتدر
انگریزی اخبارات اسٹیٹسمین' امرت بازار پتریکا
وغیرہ میں ان تہواروں کے متعلق پُر از معلومات
مضامین لکھتا جنھیں ناظرین بڑے شوق سے پڑھتے
'انڈو ایرانیکا' میں بھی اس کے پُر از معلومات مضامین
شائع ہوتے اور یہ میگزین کا انچارج ایڈیٹر ہونے
کے علاوہ ایران سوسائٹی کا صدر بھی منتخب ہو گیا
اور اپنی کوششوں سے اُس نے ایران اور ہندوستان
کی ثقافتی ہم آہنگی میں پائیدار تقویت پیدا کی۔ اُدھر
اپنے پیشہ میں ترقی کرتا ہوا سینیر گورنمنٹ ایڈوکیٹ
ہو گیا۔ اب ماشاءاللہ بنگال کی ہائی کورٹ کا مستقل
جج مقرر ہوا ہے جس پر بنگالی اور پنجابی خوش
ہی نہیں بلکہ اس کی اس تقرری پر نازاں ہے۔
وہ کلکتہ کی تمام سماجی' علمی' ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں
میں پیش پیش ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ
دُعا ہے کہ وہ اس نوجوان کو ترقی کی اونچی سے اونچی
منزلوں تک پہنچائے تاکہ ایسے غیر فرقہ پرست
اور وطن دوست لوگوں کی زندگیوں سے آنے
والی نسلیں اچھا سبق حاصل کر کے ملک اور
قوم کی خدمت میں اعلیٰ نام پیدا کریں۔ آمین!

شاہ صاحب جودھپوری رح

شخصیات، واقعات، تأثرات،

سنہ ۱۹۵۰ء میں پہلی بار جے پور گیا تو پارسا کوفری نے مولانا کوثر کاکوردی سے میری ملاقات کرائی۔ کوثر صاحب ایسی ہستیاں اب ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتیں۔ چند ہی لمحوں میں مشرقی تہذیب و شرافت کا یہ مجسمہ میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ کوثر صاحب نے میرے نام کے ساتھ تونسوی لکھا دیکھا تو فرمانے لگے "خواجہ شاہ سلیمان تونسوی رح کے خلیفہ سے تو آپ جے پور میں ملے ہوں گے"

شاہ سلیمان تونسوی رح اور تونسہ شریف کا ذکر میرے لئے نوید جاں فزا سے کم نہ تھا۔ میرے استفسار پر مولانا کوثر نے قبلہ مولینا حاجی معین الدین شاہ صاحب جودھپوری سے متعلق چند ایسی باتیں بتائیں کہ میں نے جوشِ اشتیاق میں کوثر صاحب سے استدعا کی کہ وہ اپنے ساتھ ہی مجھے حضرت شاہ صاحب جودھپوری کے ہاں لے چلیں۔ فرمانے لگے "صبح کو آٹھ بجے سے پہلے آجاؤ تو ساتھ لے چلوں گا۔" کوثر صاحب نے یہ بھی تاکید کر دی "وقت کی پابندی ضرور کیجئے گا کیونکہ شاہ صاحب نو بجے کے بعد کسی سے نہیں ملتے"

میرا قیام مسلم مسافر خانہ (بیرون سانگا نیری گیٹ) میں تھا۔ دوسرے دن صبح سویرے تیار ہو کر میں نے ساڑھے سات بجے کوثر صاحب کے درِ دولت پر دستک دی۔ وہ میرے انتظار میں ہی تھے۔ فوراً میرے ساتھ ہوئے اور اپنے مخصوص دل پذیر لہجہ میں حضرت شاہ صاحب سے متعلق بات چیت کرتے ہوئے تین چار سٹ کے بعد ایک ریتیلے چوک میں لے آئے (اب یہ چوک پختہ ہو گیا ہے) اور فرمانے لگے "خواجہ سلیمان تونسوی رح کا عُرس اسی چوک میں منایا جاتا ہے۔ اور وہ سامنے کا دروازہ وہ دروازہ ہے کہ خلقت کو اسی دروازہ سے سب کچھ ملتا ہے۔"

ایک منٹ بعد میں حضرت شاہ صاحب کے سامنے تھا۔ کوثر صاحب نے میرا تعارف شاہ صاحب سے کرایا۔ کچھ حضرات وہاں اور بھی موجود تھے۔

شاہ صاحب نے تونسہ شریف سے متعلق کئی باتیں دریافت فرمائیں۔ تونسہ شریف کے خواجگان حافظ صدید الدین صاحب اور خواجہ غلام نظام الدین صاحب اور اُن کے صاحبزادگان کے بارے میں سوالات فرمائے۔ ایک گھنٹہ تک شاہ صاحب نے مجھے خوب کھنگال لیا تو انہیں یقین ہو چکا تھا کہ میں واقعی تونسہ شریف کا رہنے والا ہوں۔ پورے نو بجے شاہ صاحب اپنی نشست سے اُٹھے اور فرمایا "اچھا! اب وقت ہو گیا۔"

سب حاضرین باہر جانے لگے تو شاہ صاحب نے کوثر صاحب سے کہا "آپ دونوں میرے ساتھ اوپر چلئے" نصف گھنٹہ تک شاہ صاحب سے مزید بات چیت رہی۔ اس مختصر سے وقت میں حضرت شاہ صاحب نے میرے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا کہ شاہ سلیمان تونسوی کی جو کمت

کے اس کفش بردار کو جے پور میں حضرت مولانا حاجی معین الدین شاہ صاحب جودھپوری کا دروازہ آستاں بوسی کے لئے موزوں و مناسب دکھائی دیا اور اب جب کہ شاہ صاحب کو اس جہانِ فانی سے پردہ کئے قریباً پچیس سال ہو چکے ہیں میری عقیدت اس آستانہ سے ویسی ہی ہے جیسی مجھے اپنے وطن مالوف تونسہ شریف کے آستانۂ سلیمانی سے ہے۔

جے پور میں مولوی احترام الدین شاغل ان دنوں انجمن ترقی اُردو راجستھان کے جنرل سکریٹری تھے۔ وہ ایک مستند اہلِ قلم تھے اور جے پور کے چپہ چپہ کی تاریخ سے باخبر۔ شاغل صاحب نے حضرت مولانا حاجی محمد معین الدین شاہ صاحب چشتی النظامی الفخری السلیمانی جودھپوری ثم جے پوری کے حسبِ ذیل مختصر حالات بتائے:

"اُن کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مولانا حافظ محمد نظام الدین تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی القرشی الاسدی سہروردی سے ملتا ہے۔ آپ کی ولادت ۱۵ رجب المرجب ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۸۸۶ء موافق سمت ۱۹۴۳ بکرمی یوم شنبہ بوقتِ ظہر بمقام جودھپور آپ کے آبائی مکان میں ہوئی۔ جو معہ زمینِ ملحقہ آپ کے والدِ ماجد کو سرکار سے ملا ہوا تھا۔

حضرت حافظ صاحب ایک متقی، پرہیزگار، مرتاض و دیندار بزرگ تھے۔ روزانہ ختم قرآن مجید آپ کا مدت تک معمول رہا۔ دینیات کی تدریسی شغل اور طباعت ذریعۂ معاش تھا۔ خود بھی درویش صفت بزرگ تھے اور بزرگانِ دین سے اعتقادِ خصوصی رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ شاہ محمد عبد اللطیف شاہ ولایت جودھپوری سے تو خاص مراسم تھے چنانچہ ایک روز حضرت موصوف نے فرمایا کہ برادر نظام الدین مجھے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں ایک کامل فن، درویش صفت فرزند عطا فرمائے گا۔ بعد ولادت معین الدین شاہ نام رکھنا۔ چنانچہ آپ کا یہی نام تجویز کیا گیا۔ ابھی آپ کی عمر پانچ چھ سال کے درمیان تھی کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور آپ کی تعلیم و تربیت کا بار آپ کی والدہ صاحبہ کو اٹھانا پڑا۔ موصوفہ نے حضرت کو بہ غرضِ تعلیم حضرت مولانا قاضی کبیر احمد صاحب جودھپوری کے سپرد کیا جن سے آپ نے آٹھ سال کی عمر تک علاوہ قرآن مجید اور دینیات کے اُردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی ذہانت اُستاد کے لئے باعثِ فخر و استعجاب تھی۔

آٹھ، نو سال کی عمر کے بعد آپ نے تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیا تو گوشہ گیرانہ طریقہ پر رہنے لگے اس وقت جو آپ کی حالت تھی اُسے نہ جذب کہہ سکتے ہیں نہ سلوک، نہ خودی اور نہ بےخودی۔ تیرہ سال کی عمر تک یہی حالت رہی۔ مگر اس دوران میں نامعلوم اور غیر محسوس طریقہ سے آپ کو علمِ نجوم، رمل و جفر و طلسمات اور تصوف میں وہبی طور پر دخل حاصل ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی خدمتِ خلق کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ چنانچہ مختلف قسم کے سفوف اور سرمہ سازی کا شغل آپ نے شروع فرما دیا۔ مریضوں اور طبیبوں کو حیرت تھی کہ جب کوئی دوا آپ کے ہاتھوں کسی مریض تک پہنچتی ہے تو تیر بہدف ثابت ہوتی ہے اور وہی دوا کسی اور کی دی ہوئی بے تاثیر رہتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہونے لگا کہ جو کچھ پیش گوئی آپ نے کی وہ اسی طرح پوری ہوئی۔ اس شہرت نے مخلوق کو آپ کی جانب متوجہ کیا۔ یہاں تک کہ اسی اسی برس کے معمر حضرات بھی اعتقاداً حاضر ہونے لگے۔ بالخصوص پشکرنہ برہمن صاحبان کا ایک گروہ تو آپ کو گورو مہاراج کے لقب سے یاد کرنے لگا۔ آپ گھر سے بہت ہی کم نکلتے۔ کبھی کسی ضرورت کے باعث کہیں جانا ہوتا تو دو مُسن پشکرنے برہمن ساتھ میں نقرئی عصا ہاتھ میں لے کر آگے آگے چلتے اور خاص جماعت آپ کے ساتھ ہوتی۔

ایک روز مہاراجہ سروپ سنگھ والیٔ ریاست سروہی نے اپنی ایک خاص ضرورت اور مقصد براری کے لئے آپ کو آبو بلوایا۔ ویسے تو آپ نے جانے سے انکار کر دیا مگر جودھپور کے سربرآوردہ اصحاب اور آپ کے معتقدین خاص نے پے در پے [illegible] کی تو آپ نے اقرار فرمایا اور ساتھ ہی یہ [illegible] کہ مہاراجہ کا کام تو ہمارے آبو پہنچنے کے فوراً [illegible] جائے گا مگر اُن سے ملاقات ایک ہفتہ تک [illegible] ہو سکے گی۔ چنانچہ آپ آبو تشریف لے گئے کھراڑی (آبو ریلوے اسٹیشن) میں کیسر گنج میں قیام فرمایا۔ آپ جس مقصد کے لئے تشریف لے گئے تھے وہ واقعی آپ کے پہنچتے ہی پورا ہو [illegible] مہاراجہ نے اپنے مراسمِ ریاستانہ کے بموجب ایک ہفتہ تک آپ کی مہمان داری کر لی تو اس [illegible] دن سے آبو روڈ آ کر شاہ صاحب کی قیام گاہ [illegible] حاضر ہوئے اور اظہارِ تشکر کرتے ہوئے [illegible] کثیر رقم بطورِ نذرانہ پیش کی مگر آپ نے انکار [illegible] اور بعد ملاقات جودھپور واپس تشریف لے آئے۔

آپ کی شہرت طب و نجوم و طلسمات [illegible] زیادہ تر اور تصوف میں بدرجۂ اوسط جاری تھی کہ طبعِ مبارک میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ عنفوانِ شباب کا عالم اور جذب و سلوک کی راہوں کی پیمائی، مگر نہ تو خالصتاً حالتِ مجذوبانہ نہ [illegible] کیفیتِ سالکانہ۔ نہ مجذوب سالک، نہ سالک مجذوب، ہر وقت حالتِ استغراق بھی اور کمال ہوشیاری و ثباتِ الحواسی بھی۔ اس زمانے میں آپ نے دوائیں تقسیم کرنا بھی بند کر دیں جو معمولاً عطا فرمایا کرتے تھے، اور پیش گوئیاں بھی ترک فرما دیں اور مریضوں اور آسیب زدوں کا ہجوم [illegible] کہ روزانہ اور بھی بڑھنے لگا۔ اب یہ دستور [illegible] کہ مریض اور آسیب زدہ ایک قطار میں کھڑے ہو [illegible] اور آپ ایک خاص وقت پر دولت خانہ سے نکلتے اور جس جس مریض کو اس صف سے نکال کر دوسری طرف کھڑا کر دیتے تھے وہی تندرست ہو جاتا [illegible]

چند دیگر خاص واقعات بھی شاغل صاحب نے بتائے جن کا ذکر ذیل میں کر رہا ہوں:-

جودھپور میں اوسوال صاحبان کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ اُن کے گرو مہاراج کسی مرضِ مہلک میں مبتلا تھے اور وہ مذہباً کسی مسلمان کے سائے سے بھی بچتے تھے۔ مہنت بختا در اصل اُن کے چیلے تھے

اور مہتہ جی کے باغ میں ہی گرو مہاراج مقیم تھے۔ ڈاکٹر اونکار سنگھ سول سرجن جودھپور کا علاج عرصہ سے جاری تھا مگر فائدہ قطعی نہیں ہو رہا تھا جب گرو مہاراج زندگی سے مایوس ہو گئے تو چیلوں کے اصرار پر انھوں نے حضرت شاہ صاحب سے لالہ گل راج ڈیوڑھی دار (منتظم محلات شاہی) کے ذریعہ رجوع کیا۔ شاہ صاحب کے معتقدین کے معروضات اور لالہ گل راج کی درخواست پر شاہ صاحب ایک روز وہاں تشریف لے گئے تو باغ سے باہر سول سرجن شاہ صاحب کو مل گئے جو گرو مہاراج کو دیکھ کر واپس جا رہے تھے۔ چنانچہ سول سرجن بھی شاہ صاحب کے ساتھ واپس گرو مہاراج کے ہاں آ گئے۔ شاہ صاحب اندر جا کر گرو جی کے سرہانے تھوڑی دیر بیٹھ کر مراقب ہوئے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ کا اٹھنا تھا کہ گرو جی بھی بستر علالت سے اٹھ بیٹھے۔ انھوں نے مرض سے نجات پائی۔

باقی آئندہ

کراچی میں پٹھانوں اور مہاجروں کی باہمی پیکار سے متاثر ہو کر

خانہ بدوش

حسن نجمی۔ سکندر پوری

اب سے چالیس سال پہلے میں
گنگا جمنا کے سبزہ زاروں میں
چھوڑ کر اپنا سارا سرمایہ
گرتا پڑتا وہاں پہ پہنچا تھا
جس کو اب "بنگلہ دیش" کہتے ہیں

تاکہ ایمان کھو نہ بیٹھوں میں
اپنی پہچان کھو نہ بیٹھوں میں
میں سلامت رہا مگر افسوس
میری معذور ماں، کنواری بہن
ان کو میں اپنے ساتھ لا نہ سکا
موت کے خوفناک اندھیرے میں
ان کا کوئی سراغ پا نہ سکا

بعد میں یہ خبر ملی مجھ کو
مری ماں پر برس پڑے خنجر
اور میری بہن ہوئی نیلام

میں جواں سال تھا جواں ہمت
دل کے زخموں کو بھول کر میں نے
پھر بنا ڈالی اک نشیمن کی
مرے ہاتھوں میں سبز پرچم تھا
اس کے کونے میں چاند ہنستا تھا

یہ ہنسی میری زیست پر چھائی
اب میں تنہا رہا، نہ تنہائی
اک حسینہ کا ساتھ صبح و شام
جس کے ہاتھوں میں پیار کا اک جام
چند بچوں کی رس بھری آواز
ان کے لہجہ میں گیت کے انداز

لعنتیں خود غرض سیاست کی
ذہن انسان پہ پھر ہوئیں حاوی
کارواں چل پڑے اندھیروں کے
قاتلوں رہزنوں لٹیروں کے

خون ہونے لگا اخوت کا
ہر طرف موت کی مہیب آواز
ٹوٹا پھر مری زندگی کا ساز
بیوی بچوں کو میں بچا نہ سکا

ان کی لاشوں کا بھی پتہ نہ چلا
کھو کے ان سب کو پھر اکیلا تھا
میرے ہاتھوں میں سبز پرچم تھا
اس کے کونے میں چاند ہنستا تھا

طے کیا میں نے آگ کا صحرا
تب ملا راستہ کراچی کا
پھر سمیٹا شکستہ ہمت کو
میں نے غیرت دلائی جرأت کو

حوصلوں کو جواں کیا میں نے
اپنا گھر پھر بسا لیا میں نے

چار دن کی چاندنی افسوس
عارضی تھی مری خوشی افسوس
بربریت نے لی پھر انگڑائی
تیرگی قلب و ذہن پر چھائی
پھر درندے گھس آئے بستی میں
ان کے ہونٹوں پہ نعرۂ تکبیر
اور ہاتھوں میں خنجر و شمشیر
مرے خوابوں کی نکلی یہ تعبیر

زندگی مجھ سے پھر ہوئی روپوش
ہم سفر مری ہو گئی خاموش
دیکھ کر لاش مرے بچوں کی
اک معذور بڈھا پکار اٹھا
رحم دل ہے مرا خدا کتنا

اور آج میں پھر اکیلا ہوں
مرے ایمان کا خدا حافظ
مری پہچان پھر ہے خطرے میں
مرے ہاتھوں میں سبز پرچم ہے

اس کے کونے میں چاند ہنستا ہے
سامنے دور تک اندھیرا ہے

بابِ انتقاد

اُردو کی چند مشہور کتابیں ۔ جلد اوّل، جلد دوم
ترتیب ساحل احمد سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
مجموعی ضخامت ۴۵۶ صفحات، مجموعی قیمت ۳۹/ روپے

"اُردو رائٹرس گلڈ" کے نام سے جناب ساحل احمد نے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے اور وہ اس ادارے کے تحت بہت اچھی اور مفید کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب سلسلۂ کتابیات کی ایک مثالی کڑی ہے اور جس کی دو جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ حالانکہ انھوں نے یہ دائرہ ۲۴ جلدوں تک پھیلا رکھا ہے۔ پہلی جلد میں چودہ اور دوسری جلد میں بارہ مختلف حضرات کے مضامین ہیں جو مختلف مشہور مطبوعات پر ہیں اور جنھیں سلیقے سے شائع کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ کتابیات سے دلچسپی رکھنے والے اسکالروں اور شائقین کے لئے اُردو رائٹرز گلڈ کا یہ سلسلہ ایک بیش بہا نعمت ثابت ہوگا

سرور تونسوی

مُطالعۂ مُومن ۔ ترتیب ۔ ساحل احمد
$\frac{20 \times 30}{16}$ ۔ ضخامت ۱۸۸ صفحات
قیمت ۱۵/ روپے

یہ کتاب بھی اردو رائٹرس گلڈ کی پیش کردہ ہے جسے ساحل احمد صاحب نے ترتیب دیا ہے ۔ اس کتاب میں بارہ مختلف مشہور لکھنے والوں کے حکیم مومن خاں مومنؔ سے متعلق قابلِ مطالعہ مضامین ہیں۔ حکیم مومن خاں مومنؔ اور اُن کے کلام سے متعلق کوئی گوشہ ایسا نہیں جن پر ان مضامین میں کسی نہ کسی پہلو سے بحث نہ کی گئی ہو ۔ بہر کیف زیرِ نظر کتاب مومنؔ سے متعلق ایک ایسی جاندار دستاویز ہے جس کے مطالعہ سے قاری کو مومنؔ سے متعلق بھرپور واقفیت حاصل ہو سکتی ہے ـــــ

سرور تونسوی

نوٹ: ـــــ اردو رائٹرس گلڈ کی جملہ مطبوعات دفتر "شانِ ہند" سے بھی دستیاب ہیں

اک چراغ اور دھرم پال عاقل
ڈمائی سائز مجلد ۳۵/ روپے
سندر کتاب گھر، پائن ۸، شملہ۔۱۷۱۰۰۲

سنہ ۱۹۸۶ء میں جس قدر بھی شعری مجموعے چھپے جناب دھرم پال عاقل کا یہ مجموعہ صفِ اوّل کے چند بہ شعری مجموعوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ "مجھے کہنا ہے کچھ" تحت عاقل صاحب نے بہت ہی بہتر انداز سے اس واہمہ کی کی ہے کہ آج کل اُردو شاعری کے مجموعے کوئی نہیں خریدتا۔ اُن فرمانا بالکل بجا ہے کہ اگر کسی شاعر کے کلام میں جان ہے اور آ میں زندگی کی سچائیاں ہوں گی تو اسے پڑھنے والے ضرور ملیں جناب کشمیری لال ذاکر چیئرمین ساہتیہ اکاڈمی چنڈی گڑھ نے "اُجالوں کا عاشق" کے عنوان کے زیرِ بحث جن عاقل اور ان کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے اور تبصرہ میں ان کے اشعار بھی دیئے ہیں۔ اور یہ اشعار ایسے ہیں شعر پر داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ کاش کہ شانِ ہند تنگ دامانی اس کی اجازت دیتی کہ اُن اشعار کو یہاں نقل جا سکتا۔

بیس صفحات پر فاضل مصنف نے "آئینۂ غزل" عنوا صنفِ غزل جو سیر حاصل اور قابلِ مطالعہ بحث فرمائی ہے اس مطالعہ سے ہی کتاب کی قیمت وصول ہو جاتی ہے۔ ثبوت پر عاقل صاحب نے پچاس سے زائد مشہور اور مستند غزل گو کے اشعار پیش کرکے غزل کی اہمیت کو جس انداز سے اُجاگر یہ انھیں کا کام تھا۔

اس کے بعد عاقل صاحب کا کلام بلاغت نظام ہے بھی اچھے اور مشہور شاعر کے کلام سے کسی طور بھی کمزور نہیں۔ اسقام کا تو دور دور تک کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ یہ ہر لحاظ قابلِ مطالعہ مجموعہ کاغذ، کتابت، چھپائی اور گٹ اپ کے لحاظ بھی موجودہ زمانے کی نمائندگی کرتا ہے۔

سرور تونسوی

من کہ مکتوب الیہ

برادرِ محترم سرورؔ صاحب
نمستے!

میں دوبارہ خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا تھا۔ اپنے رقیب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اگر استاد داغؔ زندہ ہوتے تو میرے دل کی کیفیت کی یوں تصویر کشی کرتے

"داغِ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے۔"

'نشانِ ہند' بھی مل گیا۔ میرے دو اشعار بھی آپ نے کر دیے۔ بہت بہت شکریہ دو سال کے لئے یہ جاری کر دیں اور وی۔ پی سے بھیج دیں۔

آپ کی کتاب آدھی سے زیادہ ختم کر چکا ہوں کہ نقشِ ہر ہر لفظ سے گلابی چاند ابھر آیا ہے۔ اس میں رنگ ہی رنگ بکھرے ہیں، دھنک کے رنگ طبیعت شگفتہ و شاداب ہو گئی۔ جوں جوں پڑھتا گیا دل کے کاشانے میں رونقِ کوئے یار پیدا ہو گئی۔ آپ کی قلم سے گل بوٹے بنتے ہی چلے جاتے ہیں۔ آپ کا اندازِ تحریر صرف رنگین و دلچسپ ہی نہیں بلکہ جھوٹے اُدبا، ریاکار لیڈروں، مکار مذہبی پیشواؤں اور بلیک میلر ایڈیٹروں کی رگِ جاں کے لئے دشنہ و خنجر بھی ہے۔ امید ہے یارانِ ادبا سے ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے شوق کی پذیرائی کریں گے۔

آپ کی نظرِ ملتفت کا منتظر ہوں۔ گاہے گاہے لکھتے رہیے، اس سے محبت کو دم ملتا ہے۔

آپ کا ہی
اِندر پرتاب نیرؔ

قبلہ و کعبہ جناب سرورؔ صاحب
تسلیم و نیاز!

آپ کا نوازش نامہ معہ "بہ کوئے یار" ملا۔ شکریہ!

"بہ کوئے یار" واقعی ہی نایاب کتاب ہے۔ کتاب کو دیکھنے اور پڑھنے والوں کی رائے سو فیصد ٹھیک ہے۔ اس سلسلہ میں آپ ہم سب کی طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے

"بہ کوئے یار" کی قیمت سو روپے فی کاپی ہے جبکہ ایسی کتاب کی قیمت نہ جانے کیا ہونی چاہیئے تھی۔ بہرحال آپ نے یہ کتاب چھاپ کر اردو اور ادب نواز لوگوں پر احسان کیا ہے۔
سرورؔ صاحب، انشاء اللہ بذریعۂ منی آرڈر کتاب کی قیمت اسی ہفتہ میں آپ تک پہنچ جائے گی۔

اقبال بھائی، محمود اور امی آپ کو سلام دعا کہتے ہیں۔ باقی خیریت ہے۔

نیاز کیش: ساجدہ مرزا

برادرِ محترم سرورؔ صاحب تسلیم و نیاز!
امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

"بہ کوئے یار" دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا کتاب کی ظاہری خوبیوں سے ہی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ ٹائٹل، کتابت اور کاغذ وغیرہ تمام جاذبِ نظر ہیں۔ اور پھر آپکی تصنیف ہے آپ کی جادو بیانی کا تو کوئی جواب ہی نہیں جب لوگ افسانوں اور کہانیوں سے متاثر ہو جاتے ہیں تو زندگی کی حقیقتوں کا اُن پر کیا اثر ہوگا؟ اگر پڑھنے والوں کی یہ رائے ہے کہ اس صدی میں اردو زبان میں ایسی دلچسپ کتاب شائع نہیں ہوئی، تو ان کی رائے سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ یہ تحسینی کلمات آپ سے میری ذاتی عقیدت مندی کا اظہار نہیں ہیں بلکہ "ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں" پر صادق آتے ہیں۔ اگر آپ میرے دشمن (خدا نہ کرے) بھی ہوتے تو میں آپ کی حق گوئی و حق بینی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہتا۔ میں ایسی لاثانی تصنیف پر آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی دلی اردو اکادمی کے جملہ اراکین کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت میں انھوں نے آپ کو تعاون دیا۔

آپ کا اپنا
خلیل انجم
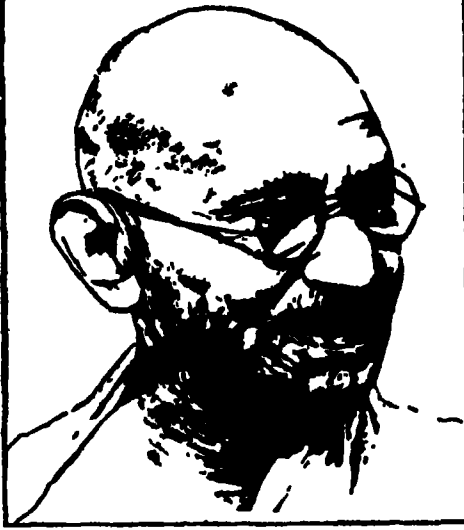
"آئیے، ہم سب ایک دوسرے میں ایسے کھو جائیں جیسے سمندر میں پانی کی بوندیں۔
اگر سمندر کی بُوند بُوند جُدا جُدا ہو تو ان میں سے ہر ایک سوکھ کر جلد ہی صفحۂ ہستی سے
مٹ جائے گی۔ لیکن یہی بوندیں جب آپس میں خلط ملط ہو کر سمندر کی شکل اختیار
کرلیتی ہیں، تو اس قدر طاقتور بن جاتی ہیں کہ بڑے بڑے جہازوں کو اس کی
وسعت کے آر پار ڈھو لیتی ہیں۔ سمندر کی طرح یہ بات ہم پر بھی صادق آتی ہے،
کیونکہ آخر کار ہم بھی تو انسانوں کا ایک سمندر ہیں۔"

سمندر کی بُوندوں کی طرح ایک رہیئے۔

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 October 1987

Regd. with the Registrar of Newspaper at R No. 644/57

ان سے گھر تک

خوبصورت کہانی

قیمت ۴/ روپے

ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۶۰۲

نگار ہند دہلی

نومبر ۱۹۸۷ء

جلد ۴۸

شمارہ ۱۱

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر سرور تونسوی
طابع خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ نگار ہند
دفتر انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی

خطاط
سبطین حیدر
محمد عمران

حسن کار
مصطفےٰ آرٹسٹ

قیمت فی شمارہ ــــــ چار روپے
قیمت سالانہ ــــــ چالیس روپے
لائف ممبری ــــــ پانچ سو روپے

ممالک غیر سے بذریعہ سمندری ڈاک Rs. 80.00
بذریعہ ہوائی ڈاک سعودی عرب
متحدہ عرب امارات اور کویت Rs. 150.00
انگلینڈ، ناروے، سویڈن Rs. 200.00
کناڈا، امریکہ Rs. 250.00

غزل

محمد عظمت علی حسرت لکھنوی

صدقے خیال یار کے حسنِ خیالِ یار کے
درد کو دل بنا دیا اُس نے ابھار کے

یوں تو نہ صبر آئیگا چپ رہیں جی کو مار کے
بن نہ پڑیگی کچھ بھی جب بیٹھ رہینگے ہار کے

یہ بھی مری گواہ ہیں یادِ وفا دلائیں گے
پھول اٹھا تو لیجئے آپ مرے مزار کے

رہتے تھے کیا الگ تھلگ خیر تو ہے جنابِ دل
پھیرے پہ پھیرے آج ہیں کیسے یہ کوئے یار کے

اُف وہ روش نگاہ کی ہم نے تڑپ کے آہ کی
رہ گئے وہ بھی دم بخود زانو پہ ہاتھ مار کے

دل پہ گذر رہی کیا اہلِ قفس سے پوچھئے
دھوم ہے سارے باغ میں آگئے دن بہار کے

ٹھان چکے ہیں آج تو ہونا ہے جو وہ حشر ہو
کٹ نہ سکینگے ہم سے دن زحمتِ انتظار کے

سحرِ نظر تھا کیا بلا ملتے ہی دل الٹ گیا
چپکے سے کہنے والی بات کہنے لگے پکار کے

حسرتِ خانماں خراب ہوتے ہیں یوں نہیں محوِ خواب
تو نے دیا نہ کچھ جواب تھک گئے ہم پکار کے!

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالاتِ حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

ا ڈ ی ٹ و ر ی ل

پنڈت گووند ولبھ پنت کے جنم دن پر

قومی ایکتا مشاعرہ اور کوی سمیلن

اُردو والوں کیلئے ایک لمحۂ فکریہ

نہ معلوم اُردو والے اپنے آپ کو کافی حد تک مُلک دُشمن قرار دیئے جانے کی کوششیں کیوں کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو قومی دھارے سے دُور رکھنے میں اپنی عافیت کیوں سمجھتے ہیں؟

گذشتہ ۱۰ دنوں سور گیہ پنڈت
ووند ولبھ کے جنم دن پر قومی ایکتا مشاعرہ
ر کوی سمیلن منعقد ہوئے۔ سور گیہ
ڈت گووند ولبھ مُلک کو آزادی دلانیوالوں
صفِ اوّل میں تھے اور اُنھوں نے جس

لگن اور دیانت داری سے مُلک کی خدمت
کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔
ظاہر ہے کہ ایسے مُلکی رہنما کے جنم دن
کے موقعہ پر اُن کے دکھائے ہوئے راستہ پر چلنے
کی تلقین، حُبّ الوطنی، قومی ایکتا اور مُلک کی

حفاظت کے عہد ایسے موضوعات پر شاعروں
اور کویوں کو کلام اور کویتائیں سُنانی چاہیئے تھیں
اور ہمیں دلی خوشی ہے کہ ہندی کے ہر کوی نے
اپنا فرض نبھایا اور ایسی کویتائیں سُنائیں، جن
میں دیش پریم، قومی ایکتا اور دیش کی حفاظت

کے لئے چوکنے رہنے کی بھرپور تلقین تھی۔

مگر ہمارے اُردو شاعروں نے وہی گھسا پٹا غزلیہ کلام سُنایا جو ہم برسوں سے سُنتے آ رہے ہیں۔ اور تو اور کامریڈ علی سردار جعفری صاحب نے چالیس سال پُرانی نظم "ان ہاتھوں کی تعظیم کرو" سُنائی۔ کسی شاعر نے وزیرِ اعظم کے اس عزم کا مذاق اُڑایا کہ وہ مُلک کو اکیسویں صدی میں ایک ترقی یافتہ قوم کی حیثیت سے لے جائیں گے، تو کسی نے مچھروں کا شکوہ کیا کہ وہ رات کو ستاتے کیوں ہیں غرض کہ حُبّ الوطنی، قومی ایکتا، مُلکی حفاظت ایسے ضروری مسائل سے مُتعلق کلام کا پوری طرح سے بلیک آؤٹ رکھا گیا۔

نہ معلوم اُردو والے اپنے آپ کو کافی حد تک مُلک دُشمن قرار دیئے جانے کی کوششیں کیوں کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو قومی دھارے سے دُور رکھنے میں اپنی عافیت کیوں سمجھتے ہیں۔

اُردو والوں کا یہ کہنا کہ عوام غزلوں، اور مزاحیہ کلام، نیز ایسا کلام جس میں حکومت کا مذاق اُڑایا گیا ہو، سُننا ہی پسند کرتے ہیں اور حُبّ الوطنی، مُلکی تحفظ اور قومی ایکتا پر مبنی کلام نہیں سُنتے، یہ اس امر کا اعلان ہے کہ اُردو کے شعراء، اور اُن کو سُننے والے، دونوں ہی مُلکی اور قومی دھارے میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔ اور یہ اقدام کس قدر خطرناک ہے اس کا اندازہ اُن اداروں کو خصوصی طور پر ہونا چاہیئے جو عام طور پر اُردو مشاعرے مُنعقد کراتے ہیں۔

اس ضمن میں اُردو اکادمی دہلی کو خصوصی طور پر یہ جان لینا چاہیئے کہ اُسے، دلی کے عوام کا لاکھوں روپیہ محض اللّے تللّوں پر ضائع کرنے کے لئے نہیں ملتا، بلکہ اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ اُردو والوں میں قومی ایکتا، حُبّ الوطنی اور مُلکی تحفّظ کا جذبہ پیدا کرنے کی بھی کوشش کرے اور اُسے یہ سوچنا چاہیئے، کہ کہ جب ہندی کوی سمیلنوں میں عوام ایسا کلام سُننا پسند کرتے ہیں تو اُردو والوں کا اس طرح کا کلام سُننے سے اُن کا دم کیوں گھُٹنے لگتا ہے۔ قومی ایکتا پکھواڑے میں اُردو اکادمی نے لگاتار تین مُشاعرے منعقد کئے مگر حرام ہے کہ کسی ایک شاعر نے بھی قومی ایکتا سے مُتعلق کلام سُنایا ہو۔ ہاں عشقیہ غزلوں کا جواب نہیں تھا۔

جشنِ جمہوریت کے مُبارک موقعہ پر ہر سال ۲۴ جنوری کو لال قلعہ میں اُردو اکادمی قومی مشاعرہ کراتی ہے۔ لہٰذا اُسے دعوت ناموں میں صاف طور پر شاعروں کو ہدایت کردینی چاہیئے کہ پہلے دَور میں لازمی طور پر ایسا کلام سُنائیں جو اس مُبارک موقعہ سے مُطابقت رکھتا ہو، بھلے ہی سامعین اپنی وطن دُشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے ایسے کلام کو نا پسند کریں۔

اُمید ہے کہ اُردو اکادمی دہلی کی پروگرام و مُشاعرہ کمیٹی کے ارکان اس مرتبہ محض اپنے اپنے احباب شُعراء کو بلانے کی کوشش نہیں کریں گے اور واقعی ایسے شُعرائے کرام کا انتخاب کریں گے جو اس مُبارک موقعہ کی اہمیت کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور اس تقریبِ سعید سے مُطابقت رکھنے والا کلام لکھنے اور سُنانے کی تو فیق رکھتے ہوں۔

اس سلسلہ میں ہم اُردو اکادمی کے چیئرمین جناب لیفٹننٹ گورنر سے بھی اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اردو اکادمی کے مشیر اور پروگرام و مشاعرہ کمیٹی کے ارکان کو فہمائش کریں کہ دوست نوازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایسے شاعروں کا انتخاب کیا جائے جو ۲۴ جنوری کے قومی مشاعرے کے شایانِ شان کلام سُنانے کی سکت رکھتے ہوں

اس ضمن میں ہم دُوردرشن کے ڈائرکٹر جنرل سے بھی گذارش کریں گے کہ ابھی حال ہی میں "بزم" پروگرام کے تحت جو قومی ایکتا مُشاعرہ پیش کیا گیا (یہ وہی مشاعرہ ہے جو سورگیہ پنڈت گووند ولبھ پنت کے جنم دن کی تقریب پر منعقد ہوا) کیا اس میں کسی شاعر نے ایک مصرعہ بھی ایسا

اُردو والوں کا یہ کہنا کہ عوام غزلوں، اور مزاحیہ کلام، نیز ایسا کلام جس میں حکومت کا مذاق اُڑایا گیا ہو سُننا پسند کرتے ہیں اور حُبّ الوطنی، مُلکی تحفّظ، اور قومی ایکتا پر مبنی کلام نہیں سُنتے" یہ اِس امر کا اعلان ہے کہ اُردو کے شعراء اور اُن کو سُننے والے دونوں ہی مُلکی اور قومی دھارے میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔ اور یہ اقدام کس قدر خطرناک ہے، اِس کا اندازہ اُن اداروں کو خصوصی طور پر ہونا چاہیئے جو عام طور پر اُردو مشاعرے منعقد کراتے ہیں۔

سنایا جو قومی ایکتا جیسے پاک جذبہ کا اظہار کر رہا ہو۔ لہٰذا "سامعین بزم" پروگرام کے کارکنان کو یہ نمائش کرنی چاہیئے کہ جب آپ اخبارات میں اعلان کرتے ہیں کہ بزم کے تحت قومی ایکتا مشاعرہ پیش کیا جا رہا ہے اور ٹی۔وی پر بھی "قومی ایکتا کا مشاعرہ" لکھے بینرز دکھاتے ہیں تو پھر محض غزلیہ اور وزیر اعظم کے عزم "اکیسویں صدی" کا مذاق اڑانے والا کلام کیوں پیش کیا گیا؟

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ یا تو "بزم" پروگرام پیش کرنے والے قومی ایکتا کا مطلب ہی نہیں سمجھتے اور یا پھر وہ بھی اردو شعراء اور اردو مشاعروں کے سامعین کی طرح قومی اور ملکی دھارے سے دور ہیں اور باتیں کہنے کی دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور پر عمل کرتے ہوئے اعلان تو قومی ایکتا مشاعرے کا کرتے ہیں اور کلام سنواتے ہیں بالکل اس کے الٹ۔

●

اُردو اکادمی کی بدَدیانتی

اِس سال اُردو اکادمی دہلی نے پبلشرز انعامات کے سلسلہ میں جو دھاندلی اور بددیانتی کی ہے اُس کی بابت اکثر اصحاب نے بذریعہ خطوط اور ٹیلیفون تفصیل معلوم کرنا چاہی ہے۔ چنانچہ اِس بددیانتی کی تفصیل یوں ہے کہ دہلی اُردو اکادمی ہر سال اُردو کی دیدہ زیب اور بہترین کُتب شائع کرنے والے دو پبلشرز کو دو دو ہزار روپیہ ——— انعام دیتی ہے ۱۹۸۶ء میں شائع شدہ اردو کتب میں سے اکادمی نے "رختِ سفر" کتاب پر پبلشر انعام دیا ہے، جو صوفی ایوب زمزم صاحب بجنوری کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس مجموعہ پر جو سیما آفسیٹ پریس چوڑی والان دہلی ۶ میں چھپا ہے، اکادمی نے انعام بھی سیما پریس کو ہی دیا ہے، جبکہ اس کتاب میں کسی بھی پبلشر کا نام شائع نہیں ہوا ہے۔ یعنی سیما پریس میں یہ کتاب صرف چھپی ہی ہے، پبلشر سیما پریس قطعاً نہیں ہے۔ یار لوگوں کا کہنا ہے کہ سیما پریس والوں نے پبلشنگ کا کام شروع کر رکھا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سیما پریس والوں نے "عماد پبلی کیشنز" کے نام سے ادارہ قائم کر رکھا ہے اور یہ ادارہ "رختِ سفر" شائع ہونے سے کم سے کم چھ ماہ پہلے سے قائم ہے اگر سیما پریس والے ہی اس کتاب کے پبلشر تھے تو وہ اپنے اصلی ادارے "عماد پبلی کیشنز" کا نام بطور پبلشر

ستم ظریفی یہ ہے کہ دوسرا انعام کسی بھی پبلشر کو نہیں دیا گیا۔ جبکہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی عالمی شہرت رکھنے والی تصنیف کے پبلشر نے بھی اپنے ہاں کی یہ کتاب جمع کرائی تھی۔

اس کتاب پر دے سکتے تھے، جبکہ اس کتاب کے ملنے کے پتوں میں دیگر تین پتوں کے علاوہ "عماد پبلی کیشنز" کا بھی پتہ دیا گیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کتاب مصنف نے خود یا اُن کے کسی عزیز نے چھپوائی۔ سیما پریس نے اس کتاب کو چھاپا۔ اور اس کتاب کے دستیاب ہونے والے پتوں میں سیما پریس کے اس پبلشنگ ادارہ کا بھی نام ہے۔ اگر سیما پریس والے اس کتاب کے پبلشر تھے تو وہ اپنی دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی "عماد پبلی کیشنز" کا نام بہ طور ناشر دیتے۔ نہ معلوم اردو اکادمی نے اس کتاب کا پبلشر سیما آفسیٹ پریس کو کیسے قرار دیا؟ کیا جناب چیئرمین اُردو اکادمی، جناب سکریٹری صاحب اُردو اکادمی اور ایوارڈ کمیٹی اُردو اکادمی کے ارکان اس "دھاندلی" اور بددیانتی کی کوئی وجہ جواز بتا سکتے ہیں؟

وُکلاء کا کہنا ہے کہ اکادمی قانونی طور پر یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ اس نے اس کتاب پر پبلشرز انعام دے کر اپنے حقوق کا جائز استعمال کیا ہے۔ چونکہ ماہنامہ "شانِ ہند" نے بھی پبلشرز کے اس مقابلہ میں اپنی مطبوعات برائے مقابلہ جمع کرائی تھیں اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ اکادمی نے "رختِ سفر" کتاب کے جس معزوضہ پبلشر کو انعام دیا ہے اس کا وجود بطورِ پبلشر قطعاً نہیں ہے۔ لہٰذا ادارہ "شانِ ہند" اور دیگران اداروں کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے جنھوں نے اس مقابلہ میں اپنی اپنی مطبوعات جمع کرائی تھیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ دوسرا انعام کسی بھی پبلشر کو نہیں دیا گیا۔ جبکہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی عالمی شہرت رکھنے والی تصنیف کے پبلشر نے بھی اپنے ہاں کی یہ کتاب جمع کرائی تھی۔

ہم اکادمی کے چیئرمین جناب لیفٹننٹ گورنر دلی کی خدمت میں اس صورتِ حال سے متعلق تفصیلی مُراسلہ بھجوا رہے ہیں۔ اگر اُنھوں نے اس سلسلہ میں اکادمی کے ذمّہ دار حضرات سے باز پرس نہ کی تو مجبوراً ہمیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

چلتے چلتے ہم یہاں تک آگئے
آگئے اب تو جہاں تک آگئے

آتے آتے آئے تھے جب آئے تھے
ٹھیک ہے نغمے فغاں تک آگئے

اپنے ہاتھوں پھونک ڈالیں آشیاں
اب تو شعلے آشیاں تک آگئے

آگئے اپنا سمجھ کر آپ کو !
شکوے جو میری زباں تک آگئے

ہم حقیر آستانی کے طفیل
ایک بت کے آستاں تک آگئے

702, Gold Crown
J P Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

شاہجہاںپور میں

کُل ہند مشاعرہ اور ہندی کوی سمیلن

۱۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو فیکٹری اسٹیٹ شاہجہاں پور کے سبزہ زار پر ایک کُل ہند اُردو مشاعرہ اور ہندی کوی سمیلن جناب اختر شاہجہانپوری کی کنوینر شپ میں منعقد ہوا۔ آرڈیننس فیکٹری کے جوائنٹ جنرل مینجر جناب آئی۔ بی۔ مصرا نے دیپ جلاکر مشاعرہ اور کوی سمیلن کا افتتاح کیا۔ اور جناب اختر شاہجہاں پوری نے مدعو شعرائے کرام کا تعارف کرایا۔

یہ مشاعرہ قومی یکجہتی کے سلسلہ میں منعقد ہوا۔ جناب معراج فیض آبادی نقیبِ مشاعرہ تھے اور کوی شری بھونو جی نے ہندی کویوں کو کویتائیں سنانے کے لئے آمنترت کیا۔

جناب شاہد رضا نے اس مشاعرہ اور کوی سمیلن کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال تحریر فرمایا ہے، مگر افسوس ہے کہ شانِ ہند کی روایات کے مطابق یہ رُوداد قابلِ اشاعت قرار نہ دی جا سکی اس لئے محض اُردو کے شعرائے کرام کے کلام کا انتخاب ہی پیش کیا جا رہا ہے۔ ویسے ہندی کے کوی "اگنی ویش شکل کی کویتا" اشفاق اللہ خاں کی آخری رات" حاصلِ مشاعرہ و کوی سمیلن رہی (ایڈیٹر)

خان آصف ؎

شاخ شاخ کا یوں تو مستقل تقاضا ہے
برق بھی تو مہلت دے آشیاں بنانے کی
مَیں وفا کی راہوں سے ہٹ کے چل نہیں سکتا
اور کیجئے کوشش، آپ آزمانے کی

نسیم نکہت ؎

بنجارے ہیں رشتوں کی تجارت نہیں کرتے
ہم لوگ دکھاوے کی محبت نہیں کرتے
ملنا ہے تو آجیت لے میدان میں ہم کو
ہم اپنے قبیلہ سے بغاوت نہیں کرتے
طوفان سے لڑنے کا سلیقہ ہے ضروری
ہم ڈوبنے والوں کی حمایت نہیں کرتے
پلکوں پہ ستارے ہیں نہ شبنم ہے، نہ جگنو
اس طرح تو دشمن کو بھی رخصت نہیں کرتے
کیوں اُچھلے بیٹھے ہو تم ذہن پہ اپنے
ہم لوگ تو دشمن سے بھی نفرت نہیں کرتے
ہر سمت بڑے لوگوں کی اک بھیڑ ہے نکہت
ہم اتنے خداؤں کی عبادت نہیں کرتے۔

عادل لکھنوی ؎

اک روز جا رہے تھے کہیں سائیکل سے ہم
کچھ دور ہی چلے تھے کہ نازل ہوا ستم
پیڈل سے ایک بارگی پاؤں اکھڑ گئے
ہم جاکے ایک شوخ حسینہ سے لڑ گئے

تبسم شاہجہاں پوری ؎

فرض، احساس، تمنائیں، محبت، یادیں،
ہم اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں جنازے کتنے
یاد جب مجھ کو ترا عہدِ وفا آتا ہے
طنز کرتے ہیں یہ رنگین لفافے کتنے
تم تبسم در و دیوار سے دکھ سکھ کہہ لو
حالِ دل رہ گئے اب پوچھنے والے کتنے

تسنیم صدیقی ؎

جانے یہ کیا ہوا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
دل تیرا ہو گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
اب تو یہ مشغلہ ہے تجھے دیکھنے کے بعد
ہم ہیں اور آئینہ ہے تجھے دیکھنے کے بعد
ہم تو سمجھ رہے تھے ملے گا سکونِ دل
درد اور بڑھ گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
جو کچھ مَیں چاہتی ہوں وہ سب کچھ تجھی میں ہے
اب کس کو دیکھنا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

معراج فیض آبادی

زندگی دی ہے تو جینے کا ہُنر بھی دینا
پاؤں بخشے ہیں تو توفیقِ سفر بھی دینا
مَیں تو اس خانہ بدوشی میں بھی خوش ہوں لیکن
اگلی نسلیں تو نہ بھٹکیں انھیں گھر بھی دینا

مجھ کو تھکنے نہیں دیتا یہ ضرورت کا پہاڑ
میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

خدائے شب یہ تری کیسی کبریائی ہے
چراغ میرے ہیں اور روشنی پرائی ہے
تمام دن کی تھکن چبھ رہی ہے آنکھوں میں
چراغ بجھنے لگے ہیں تو نیند آئی ہے۔

ڈاکٹر ساغر اعظمی ؎

شام ڈھلے یہ سوچ کے بیٹھے ہم اپنی تصویر کے پاس
ساری غزلیں بیٹھی ہوں گی اپنے اپنے میر کے پاس

ایسی نہیں ہے بات کہ قد اپنے گھٹ گئے
چادر کو اپنی دیکھ کے ہم خود سمٹ گئے
جب ہاتھ میں قلم تھا تو الفاظ ہی نہ تھے
اب لفظ مل گئے تو مرے ہاتھ کٹ گئے
صندل کا مَیں درخت نہیں تھا تو کس لئے
جتنے تھے غم کے ناگ وہ مجھ سے لپٹ گئے
ساغر کسی کو دیکھ کے ہنسنا پڑا مجھے
دنیا سمجھ رہی ہے مرے دن پلٹ گئے

اختر شاہجہاں پوری ؎

ہم نے یزیدِ وقت کو سجدہ نہیں کیا
کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اچھا نہیں کیا
نیزے پہ اپنے سر کو اٹھائے ہوئے ہیں ہم
اسلاف کے وقار کا سودا نہیں کیا
اس دورِ پُرفریب میں ہم نے تو عشق بھی
سچ کہہ رہے آپ سے سچا نہیں کیا

اے سر پھری ہوا تجھے اس کی خبر بھی ہے
چڑیوں نے آج رین بسیرا نہیں کیا

وسیم بریلوی ؎

عجب احساس ہے گردِ گُنہ چھو کر گزر جائے
تو اپنے آپ کو ہم دیر تک میلے سے لگتے ہیں

ہونہ ہو تو قلم ترجماں نہیں ہوتا
ہمارے دور میں آنسو زباں نہیں ہوتا

جہاں رہے گا وہیں روشنی لُٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا
یہ کس مقام پہ لائی ہے میری تنہائی
کہ مجھ سے آج کوئی بدگماں نہیں ہوتا
وسیم صدیوں کی آنکھوں سے دیکھیے مجھ کو
وہ لفظ ہوں جو کبھی داستاں نہیں ہوتا

گوہر عثمانی مراد آبادی ؎

کیسے پتہ چلے گا گنہ گار کون ہے
سب بے قصور ہیں تو خطاوار کون ہے

یہ فیصلہ بھی آپ مؤرخ پہ چھوڑ دیجئے
تاریخ خود بتائے گی غدار کون ہے

عظمتِ اہلِ وفا اور بڑھا دیتا ہے
غم مسلسل ہو تو پھر غم بھی مزا دیتا ہے
اپنے کردار پہ موجوں کو بھی شرم آتی ہے
جب کوئی ڈوب کے ساحل کا پتہ دیتا ہے
دل دھڑکتا ہے تو پہروں نہیں سونے دیتا
نیند آتی ہے تو احساس جگا دیتا ہے۔

دِلّی اُردو اکادمی کی بددیانتی

دہلی اُردو اکادمی نے اس بار اردو مطبوعات کے ناشرین کیلئے دو انعامات میں سے ایک انعام ایسے ادارے کو دیا ہے جو نہ تو باقاعدہ طور پر ناشر تھا اور نہ ہی اس وقت ہے۔ اس ادارے کی جس کتاب پر انعام دیا گیا ہے اس پر ناشر کا نام ہے ہی نہیں یعنی بجائے ناشر کے یہ انعام پریس کو دیا گیا ہے اور دوسرے انعام کے بارے میں جناب سکریٹری صاحب اُردو اکادمی کا کہنا ہے کہ چونکہ کوئی بھی کتاب دوسرے انعام کی حقدار نہیں تھی اس لئے دوسرے انعام کی رقم بھی کتابوں کے مصنفین کے انعام میں شامل کردی گئی۔ جبکہ ناشرین کے انعامی مقابلہ میں اس بار ایسی ایسی بہترین اور عالمی شہرت رکھنے والی کتابیں شاملِ مقابلہ ہوئی تھیں کہ جس کتاب پر اوّلین انعام دیا گیا ہے وہ اُن کے مقابلہ میں کسی لحاظ سے بھی قابلِ غور نہ تھی۔

اُردو اکادمی کی ایسی کھلی بددیانتی کے خلاف ہم ہر ماہ اُس وقت تک یہ احتجاج شائع کرتے رہیں گے جب تک کہ لیفٹننٹ گورنر اس دھاندلی کے بارے میں کوئی نوٹس نہیں لیتے

(ایڈیٹر)

تازہ کرنے والے واقعات

اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں کو عجب کمالات سے نوازتا ہے۔ ایسے کمالات جو عام انسانوں کے فہم سے بالاتر ہوں، مگر اس کے لئے جو کہ عالموں کا مقتدرِ اعلیٰ ہے کوئی بات ناممکن نہیں۔

دوسری قسط

ابراہیم الخواصؒ

تاریخ کی روشن حقیقتیں۔ ایک بزرگ کی سوانح مبارک

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کشف المحجوب	تذکرۃ الاولیاء	نفحات الانس	سفینۃ الاولیاء	انوار الاولیاء
شیخ علی ہجویری	شیخ فریدالدین عطار	عبدالرحمٰن جامی	داراشکوہ	صبغۃ اللہ شاہ

اس سے پہلے کہ آپ کھانا تناول فرمائیں، میں چاہتا ہوں کہ توکل کے موضوع پر آپ سے تبادلۂ خیال کرلوں۔ پہلے میں توکل کا وہ مفہوم بیان کرتا ہوں جو میں سمجھا ہوں، اس کے بعد آپ توکل کے متعلق اپنے خیالات سے مجھے استفادہ کا موقع فراہم فرمائیں۔"

آپ نے کہا" بالکل درست! پہلے آپ فرمائیں"

"توکل، قرآنی اصطلاح ہے۔ اس کے معنی اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ کرنا ہے۔ اللہ پر بھروسہ کرنے میں انسان کبھی گھاٹے میں نہیں رہتا۔ دُنیا اور آخرت میں صاحبِ توکل کی عزت محفوظ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حبیب مکرم کا ارشاد ہے کہ جو یہ پسند کرے کہ سب سے زیادہ طاقتور بنے تو وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے اور جس کو سب سے زیادہ دولت مند ہونا پسند ہو اُس کو اپنی ملکیت سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ توکل دل کو امراضِ حرص سے نجات دیتا ہے، مہذب بناتا ہے، ہدایت دیتا ہے، عجائبات دکھاتا ہے اور قوت بخشتا ہے متوکل کو اللہ تعالیٰ دن رات اپنی عنایتوں سے سرفراز کرتا ہے اور ایسی جگہ سے فتوحات فراہم کرتا ہے جہاں اُس کے گمان تک کی رسائی نہیں ہوتی۔ میں نے ابھی تک توکل کے متعلق شارع علیہ السلام کے ارشادات بیان کئے ہیں جو اپنی جگہ اتنے جامع ہیں کہ اُن پر کسی تفریح کا اضافہ ممکن نہیں ہے۔ آپ کے بیان کی روشنی میں توکل، افلاس، غربت، فاقہ کشی اور دربدری کا نام نہیں ہے۔ لوگ مسلسل فاقوں میں توکل تلاش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ توکل کے ابتدائی مراحل میں کھو جاتے ہیں۔ توکل کے ثمرات تک اُن کی رسائی نہیں ہوتی۔"

میزبان اپنا سلسلۂ کلام ختم کر کے آپ کی طرف دیکھنے لگا۔

اس خاموش استفسار کے جواب میں صرف چند آنسو آپ کی آنکھوں سے گرے، آپ

نے اپنے دامن سے آنسو خشک کرنے
کچھ دیر بعد کہا" آپ کو اللہ تعالیٰ جزا
آپ کی باتیں ہمیشہ میرے لئے شمع ہدایت
میزبان عبدالرحمٰن ہمدانی بڑے

حال بزرگ تھے۔ وہ اسلحہ سازی کے ایک کارخانے کے مالک تھے۔ اُن کے کارخانے میں کام کرنے والے سارے مزدور نفع میں برابر کے شریک تھے۔ سب لگن سے کام کرتے تھے۔ اُن کے کارخانے کا تیار شدہ مال معیاری ہوتا تھا۔ بازار میں اس مال کی کھپت بہت تھی۔ اور اسی تناسب سے نفع اپنی متعینہ مقدار میں رہ کر بھی سب کو خوش حال بنا رہا تھا عبدالرّحمٰن ہمدانی کے ذاتی خادم تک ویسا ہی لباس پہنتے تھے جیسا وہ خود پہنتے تھے خادم و مخدوم کے معیارِ زندگی میں کسی قسم کا تفاوت، ابراہیمؒ اپنے دورانِ قیام میں محسوس نہ کر سکے۔

آپ جب ہمدان سے چلے تو آپ کی دُنیا بدل چکی تھی۔ عبدالرّحمٰن ہمدانی کی مصاحبت سے فکر و نظر کی بنیادیں مستحکم ہوگئی تھیں۔ آپ کی اگلی منزل اصفہان کا تاریخی شہر تھا۔ چلتے چلتے رات ہوئی تو آپ ایک گاؤں سے قریب تھے۔ آپ قیام کے ارادے سے وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ پورے گاؤں میں آتش پرست آباد ہیں گاؤں کا ایک گشت لگا کر آپ نے گاؤں سے باہر ایک درخت کے نیچے بسیرا کیا۔ رات آپ جب یادِ الٰہی میں مستغرق تھے موسمِ سرما کی برفیلی ہوا کے جھکّڑ چلنے لگے۔ آپ پر ایک لرزہ سا طاری ہوگیا۔ سردی کی شدّت سے آپ کا جسم نیلا ہونا شروع ہوگیا اور آواز کی کپکپاہٹ سے ذکر کے الفاظ ٹوٹنے لگے۔ آپ نے سجدہ میں سر رکھ کر کہا "یا اللہ! اپنے ذکر کو برقرار رکھنے کی توفیق عطا فرما"

دُعا نے درِ قبولیت پر دستک دی اور قبول ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آپ کے اطراف ایک آگ کا حصار قائم ہوگیا جو آپ سے پندرہ ہاتھ کے فاصلہ پر تھا۔ تھوڑی دیر میں سردی کے تمام اثرات زائل ہوگئے اور بقیہ رات یادِ الٰہی میں بڑے سکون سے گزری صبح کی نماز کے بعد آپ لیٹے تو آنکھ لگ گئی آگ کا حصار ابھی تک برقرار تھا۔ آپ نے اپنے

> تم صدیوں سے آگ کو پوج رہے ہو
> مگر ــــــ
> آگ آج بھی تمہیں جلا دیتی ہے۔
> اگر ــــــ
> آگ میں الوہیت ہوتی تو ــــــ
> وہ تمہاری پرستش کے صلہ میں کبھی تو تم پر مہربان ہوتی
> مگر مجھے دیکھو! ــــــ
> کہ مَیں آگ کے خالق کا پرستار ہوں اور ــــــ یہ اُسی
> کا کرم ہے کہ آگ مجھ پر گلزار بن گئی ہے۔

اطراف ایک شور کی آواز سن کر جب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ آگ کا حصار غائب ہے اور آتش پرستوں نے آپ کو گھیر رکھا ہے۔ آپ جیسے ہی اُٹھ کر بیٹھے تمام آتش پرست تعظیم کے لئے کمر کے بل خم ہوگئے۔

تعظیم کے بعد اُن لوگوں کے سربراہ نے ایک یا دو قدم بڑھ کر کہا "آگ کے عظیم مظہر کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔ شام کو آپ ہماری بستی میں آئے تھے مگر ہماری اندھی آنکھیں آپ کو پہچان نہ سکیں۔ رات جب مقدس آگ کے انعکاس نے ہمارے بام و در روشن کئے تو ہماری آنکھیں کھلیں۔ ہم آتش پرست ہیں، کس قسم کا شعلہ کس چیز کے جلنے سے پیدا ہوتا ہے، اس کا ادراک ہمارے لئے دشوار نہیں ہے۔ ہم اپنے گھروں سے نکل کر مقدس آگ سے قریب آگئے تھے اور اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ وہ مقدس آگ اپنے وجود کے لئے کسی مادّے کی محتاج نہ تھی۔ ہم نے رات مقدس آگ کے حضور میں کھڑے ہو کر عبادت میں گزاری۔ مہرِ منوّر طلوع ہونے کے بعد جب مقدس آگ سورج کی شعاعوں میں تحلیل ہوگئی تو ہم نے آپ کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ آپ کتنے عظیم ہیں کہ موسم کے سرد تھپیڑوں سے بچانے کے لئے مقدس آگ نے آپ کو ماں کی طرح آغوش میں لے لیا۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں اور ہمیں اپنی میزبانی کی عزّت سے سرفراز کریں۔"

آتش پرستوں کے سربراہ کی گفتگو سن کر توہم زدہ ذہنوں کی سوچ کو آسانی سے سمجھ گئے۔ آپ نے اُن کے خیالات کی تردید کو مصلحتِ تبلیغ کے منافی سمجھتے ہوئے کہا "جو کچھ تم نے رات کو دیکھا اُس کی روشنی میں، مَیں تمہارے نزدیک سچّا آدمی ہوں یا نہیں؟"

آتش پرستوں کے مذہبی رہنما نے بڑے ادب سے جواب دیا "مقدس آگ کی آغوش میں صداقت کے علاوہ کوئی شے اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ آپ کی سچائی ہر شبہ سے بالاتر ہے۔"

یہ جواب سن کر آپ نے کہا۔

"اچھا تو پھر ایک سچی بات سنو! آگ میں کوئی الوہیت نہیں، آگ مخلوق ہے۔ سورج مخلوق ہے، اور اس عالمِ خلقت میں تم جو کچھ دیکھ رہے ہو یا محسوس کر رہے ہو، اُن سب کا ایک

خالق ہے۔ تم صدیوں سے آگ کو پوج رہے ہو مگر آگ آج ابھی تمہیں جلا دیتی ہے۔ اگر آگ میں الوہیت ہوتی تو وہ تمہاری پرستش کے صلہ میں کبھی تو تم پر مہربان ہوتی مگر مجھے دیکھو کہ میں آگ کے خالق کا پرستار ہوں اور یہ اُسی کا کرم ہے کہ آگ مجھ پر گلزار بن گئی ہے۔ اگر تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ دنیا کی آگ اور نارِ جہنم سے محفوظ رہو تو اس کی پوجا کرو جو خالقِ کائنات اور ہم سب کا رب ہے۔"

آتش پرستوں کے سربراہ نے آپ کی دعوت پر غور کیا اور کہا۔

"آپ ہمارے ساتھ چلیے۔ ہمارے آتش کدہ میں جو آگ دو سو سال سے جل رہی ہے اگر اُس نے بھی آپ پر اثر نہ کیا تو میں آپ کی دعوت قبول کر لوں گا۔"

آپ خاموشی سے ان کے ساتھ ہو لئے۔ آتش کدہ میں پہنچے تو دیکھا کہ دس ہاتھ چوڑے اور دس ہاتھ لمبے رقبہ میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آپ نے "بسم اللہ" پڑھی اور بے خوفی سے آگ میں داخل ہو گئے۔ اور وسط میں جا کر آرام سے دہکتے انگاروں پر بیٹھ گئے۔ آتش پرست یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد آپ جب صحیح سلامت آگ سے باہر آئے تو آتش پرستوں کا سربراہ آپ کے قدموں پر گر پڑا۔ دوسرے آتش پرستوں نے بھی سرِ اطاعت خم کرنے میں دیر نہ کی۔ آپ نے اُسی وقت سب کو مسلمان بنا لیا۔ بستی کے باقی ماندہ افراد بھی داخلِ اسلام ہو گئے۔ آتش کدہ کو مسجد بنا کر آپ نے ان نومسلموں کی تعلیم و تربیت کے لئے وہیں قیام فرمایا۔ یہاں آپ نے ڈھائی سال قیام کر کے ان لوگوں کو ارکانِ دین اور قرآنِ حکیم کی تعلیم دی۔

اچھی طرح یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ یہ نومسلم اب آدابِ مسلمانی سے خوب واقف ہو چکے ہیں، آپ وہاں سے اصفہان چلے گئے۔ ایک دن آپ اصفہان کے بازار سے گذر رہے تھے کہ آپ کی نظر ایک نوجوان مجذوب خاتون پر پڑی جو لباس سے قطعی بے نیاز تھی۔ آپ کی نگاہ کے لمس سے اُس پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ "مرد آگیا" "مرد آگیا" کہتے ہوئے وہ بھاگنے لگی اور ایک کپڑے کی دوکان میں گھس کر ایک چادر سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا۔

دوکان کا مالک اُس مجذوب خاتون کا احترام کرتا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ آپ بھی دوکان پر پہنچ گئے اور دوکاندار سے کہا "اگر تم دونوں جہانوں میں سرخروئی چاہتے ہو تو اس خاتون سے ابھی نکاح کر لو۔"

دوکاندار نے اس پیش کش کو قبول کر لیا آپ نے دونوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

آپ چلنے لگے تو مجذوب خاتون نے جو اب بالکل ہوش میں تھی اپنے شوہر کی معرفت کہلوایا۔ "دعوتِ ولیمہ میں شرکت کے بغیر آپ نہیں جائیں گے۔" آپ نے اصفہان میں ایک دن مزید قیام کا فیصلہ کر لیا۔

مجذوبہ کے ہوش میں آنے کی داستان جب اصفہان میں عام ہوئی تو خلقِ خدا آپ کی زیارت کے لئے ٹوٹ پڑی۔ والیٔ اصفہان شہباز بیگ کو آپ کی کرامت کا حال معلوم ہوا تو وہ اپنی پاگل بیٹی کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "خدا کے لئے میری بیٹی پر بھی توجہ فرمائیے۔ گذشتہ پانچ سال سے یہ اپنے حواس کھو بیٹھی ہے۔ گھر کے افراد سے بھی منہ چھپائے اپنے کمرہ میں پڑی رہتی ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے اس کی عمر ۱۵ سال تھی۔ اُسی زمانے میں اس نے خواب دیکھا تھا، جس میں اس کی شادی ایک اجنبی اور خوبصورت جوان سے ہوئی تھی۔ خواب دیکھنے کے بعد تین ماہ تک یہ ہر وقت دروازے کے قریب یا کھڑکی سے لگی کھڑی رہتی تھی ہر آہٹ پر چونک کر کہتی تھی "میرا شوہر آگیا ہے دروازہ کھولو۔" کھڑکی سے کوئی شخص دور سے نظر آتا تو سراپا اشتیاق بن کر اسے تکتی رہتی، مگر آنے والا جب قریب آجاتا تو اُس کے خواب بکھر جاتے۔ تین ماہ اپنے خیالی شوہر کا انتظار کرنے کے بعد یہ بالکل مایوس ہو گئی۔ ناامیدی نے اس کے اعصاب اور ذہن کو اتنا متاثر کیا کہ یہ رفتہ رفتہ حواس کھو بیٹھی۔"

آپ نے لڑکی کی پوری روداد سُن کر اُس پر توجہ کی۔ وہ اس وقت بھی سہمی سہمی منہ چھپائے آپ کے سامنے بیٹھی تھی۔ آپ نے پانی طلب کر کے اُس پر کچھ پڑھ کر دَم کیا اور اُس کے چھینٹے لڑکی پر مارے۔ اس عمل کے نتیجہ میں لڑکی ہوش میں آگئی۔ عالمِ ہوش و حواس میں اس نے آپ کو دیکھا تو کہا "میرے شہزادے! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی، مگر خیر! تم آ تو گئے۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں رہا۔" اور ساتھ ہی باپ سے کہا "تم لوگ کہتے تھے کہ میں نے خواب دیکھا ہے، اب خود دیکھ لو، میرا شوہر مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے آ ہی گیا۔"

لڑکی نے یہ بات کہی تو سب آپ کا منہ دیکھنے لگے۔ ہر شخص جواب کا منتظر تھا۔ آپ نے بڑی متانت سے کہا "جو خواب اس لڑکی نے دیکھا تھا وہی خواب پانچ سال پہلے میں نے بھی دیکھا تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ ایجاب و قبول کے وقت اس کا نام سلمہ بتایا گیا تھا۔"

یہ بات سُن کر شہباز بیگ نے کہا "یہ اپنے دولہا کا نام ابراہیم بتایا کرتی تھی۔ کیا آپ کا نام بھی ابراہیم ہے؟"

آپ کا جواب اثبات میں سُن کر حاضرین ششدر رہ گئے۔ سب دم بخود آپ کی طرف متوجہ تھے۔ آپ نے یہ کہہ کر سکوت توڑا "خواب اتنے سچے بھی ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے بھی نہ تھا۔"

شہباز بیگ نے کہا "اگر آپ سلمہ کو بیداری میں اپنی زوجیت میں قبول کرنا پسند کریں تو مجھے دِلی مسرت ہوگی۔"

یہ بات سُن کر آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور کافی دیر بعد ایک پُرسوز آہ کے ساتھ آنکھیں کھولتے ہوئے کہا "اے اللہ! میں تیری رضا

کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔"

اسی دن آپ کی شادی سلمہ سے ہو گئی
پ جب حجلۂ عروسی میں پہنچے تو سلمہ دوڑ کر آپ
سے ہم آغوش ہوئی اور اپنی جان، جان آفریں
کے سپرد کر دی۔ سلمہ کا بے روح جسم گرنے لگا
آپ نے اُسے سنبھال کر پھولوں کی سیج پر ڈالا
ر باہر آ کر سلمہ کی موت کی خبر شہباز کو دیتے
دے کہا "عشق آگ ہے اور ماسوا کو جلا کر
خاک کر دیتا ہے۔"

سلمہ کی تجہیز و تکفین کے بعد آپ اصفہان
سے آذربائیجان ہوتے ہوئے نہاوند پہنچے۔
لمہ کی موت نے آپ کے سوز و گداز کو اتنا بڑھا
یا تھا کہ ایک لمحہ بھر بھی اضطراب کم نہ ہوتا تھا۔
ر آپ ہر غم کو غمِ جاناں بنائے رہے۔ آپ کا
طلوب آپ کا معبود تھا اور معبود ہی مقصود تھا
اوند سے جب آپ شوستر کی طرف گرمِ سفر تھے
ب جگہ پانی دیکھ کر پیاس بجھانے کے لئے پانی
کے پاس پہنچے تو جھاڑیوں میں سے شیر کی دہاڑ
نائی دی۔ آپ آواز کی طرف متوجہ ہوئے تو
ھا ایک شیر جھاڑیوں سے نکل رہا ہے۔ اس
، دہکتی ہوئی آنکھیں آپ پر جمی ہوئی تھیں۔ آپ
ں صورتِ حال سے قطعاً خوفزدہ نہ ہوئے۔
ے اطمینان سے کھڑے رہے۔ شیر آپ کی
ف بڑھا تو لنگڑا رہا تھا۔ پہلی نظر میں ہی دیکھ لیا
اس کا پاؤں زخمی اور متورم ہے۔ وہ آپ کے
ں آیا اور درد کی شدت سے زمین پر گر کر لوٹنے
۔ آپ نے اس کے زخمی پاؤں کو پکڑ کر زخم کا
رہ لیا۔ پاؤں میں دو بڑے بڑے کانٹے پیوست
چنانچہ بڑی آہستگی سے دونوں کانٹے نکال
، پھر زخم کو پانی سے صاف کیا۔ اپنی چادر
ر پٹیاں بنائیں اور زخم کو احتیاط سے باندھ
شیر اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ ذرا سی دیر میں
شیر اپنے دو خوبصورت بچوں کے ساتھ واپس
س کے بچے اظہارِ تشکر کے لئے آپ کے چاروں
گھومنے لگے آپ نے شفقت سے اُن کے
تھپکی دے کر کہا "جاؤ! میں نے تم پر کوئی احسان
نہیں کیا۔ کسی کے دکھ درد میں کام آنا میرے فرائض
میں داخل ہے"

یہ سن کر شیر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ
جنگل میں چلا گیا۔ شیر کے چلے جانے کے بعد آپ
نے پانی پیا، وضو کر کے نمازِ ظہر ادا کی اور چل پڑے
ابھی ایک ساعت ہی گزری تھی کہ دُور سے گرد و غبار
اُڑتے دیکھا۔ اس غبار کی چادر سے ایک گھوڑا سوار
برآمد ہوا جو تیزی سے آپ کے پاس سے گزر گیا۔
اسی وقت آپ نے دیکھا کہ گھوڑا سوار ایک عورت کو
دبوچے ہوئے ہے اور عورت مسلسل چیخ رہی ہے
"مجھے بچاؤ" "مجھے بچاؤ۔"

مظلوم کی فریاد سن کر آپ تعاقب میں دوڑ
پڑے مگر آپ کی رفتار گھوڑے کے مقابلہ میں بہت
کم تھی۔ آپ کو جلد ہی یقین ہو گیا کہ آپ اُسے اس
رفتار سے نہیں پکڑ سکتے۔ اسی عالمِ اضطراب میں
آپ کے لبوں پر بے اختیار ایک دعا آ گئی "یا اللہ!
میری رفتار گھوڑے سے بھی تیز کر دے اور مجھے
توانائی عطا فرما کہ میں مظلوم کی مدد کر سکوں"

اللہ تعالیٰ نے دُعا قبول فرمائی۔ آپ کی رفتار
تیز ہو گئی، لمحہ لمحہ فاصلہ کم ہونے لگا یہاں تک کہ صرف
چند سو قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ ٹھیک اسی وقت گھوڑا
اچانک ایک پہاڑی درّے میں مڑ کر نگاہوں سے
اوجھل ہو گیا۔ جب آپ درّے کے دہانے پر پہنچے
تو گھوڑا سوار درّے کی پیچ در پیچ راہوں میں روپوش
ہو چکا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بھی نہیں آ رہی
تھی۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ درّے میں کوئی خفیہ کمین گاہ
ضرور ہے۔ چنانچہ آپ درّے میں داخل ہو گئے اور
احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ درّے میں ایک جگہ
غار نظر آیا ساتھ ہی گھوڑے کی ہنہناہٹ نے بھی
آپ کو اپنی طرف متوجہ کیا غار کے دہانے پر پہنچے تو
ایک مکروہ قہقہہ سنا۔ قہقہہ کی گونج ختم ہوئی تو کرخت
آواز میں کسی نے کہا، جب ہو جاؤ نازنین! یہاں
وہی سب کچھ ہو گا جو میں چاہوں گا۔ اس غار میں اب
تک اٹھارہ لڑکیوں کو دفن کر چکا ہوں آج انیسویں
قبر بھی بن جائے گی۔ میں تمہاری آبرو نہیں
لوٹوں گا۔ مجھے عورتوں سے نفرت ہے۔ میں صرف
اپنے چابک سے تمہاری کھال اتاروں گا تمہاری
چیخیں میرے کانوں میں رس گھولیں گی۔"

اس ظالمانہ برتاؤ کے اعلان کے جواب میں
ایک بہت مطمئن اور ٹھہری ہوئی نسوانی آواز آئی
"اے ظالم انسان! اگر میری عصمت محفوظ ہے تو
میں دردناک موت سے بالکل نہیں ڈرتی چابک
اُٹھا اور میری کھال میرے جسم سے الگ کر دے!
میری چیخیں سن کر خوش ہونے کا تجھے موقع میسر
نہیں آئے گا۔"

اور اس کے بعد شائیں، شائیں، کی
آوازیں آنے لگیں۔ چابک پڑ رہے تھے مگر کوئی
چیخ یا سسکاری کی آواز سنائی نہیں دے رہی
تھی

باقی آئندہ

حق گو

ڈاکٹر اودے سرن ارمان بلاری

آپ کے محبوب افسانہ نگار کی ایک اور خوبصورت تحریر

[illegible] قبل مسیح بے بی لون میں مگروس ندی کے کنارے کیش گھاٹ پر لاطفا ملاح مسافروں کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر پار لگایا کرتا تھا اور خالی وقت میں مچھلی مار لیا کرتا تھا۔ یہی اس کا ذریعۂ معاش تھا۔ ایک دن ایک بیوپاری اپنی جوان اور بہت ہی خوبصورت لڑکی کے ساتھ پار اترنے کو گھاٹ پر آیا۔ یہاں آکر اس کو دھیان آیا کہ بٹوہ کہیں رہ گیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی ریشا کو ملاح کی سپردگی میں چھوڑ کر بٹوا لینے چلا گیا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ ملاح ریشا کو لیٹنے سانے اور آرام سے بیٹھنے کے لئے کوٹھری میں لے گیا ملاح کا دل پاک تھا۔ جیوں ہی دونوں کوٹھری میں داخل ہوئے کھونے میں سے ایک سیاہ زہریلا ناگ نکل کر لڑکی کی طرف کو بڑھا۔ لڑکی چیخ مار کر ملاح کے سینے سے چمٹ گئی۔ اُس نے ریشا کو دھکیل کر الگ نہیں کیا، بلکہ ایک ہاتھ سے بچے کی طرح گود میں سنبھال لیا اور اسی حالت میں پھرتی کے ساتھ یکے بعد دیگرے دونوں پیروں سے اچھل کود کر اس سانپ کا کام تمام کر دیا سانپ بیچ میں مر گیا تھا، مگر خائف ریشا ابھی تک اس کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔ ملاح اس کے بے پناہ حُسن، جوانی اور گداز جسم کی قربت سے دماغی توازن کھو بیٹھا، اس کے دِل میں کچھ ہونے سا لگا اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ اور اسی حالت میں اس کے ساتھ زیبی پرواز ہوگیا۔ آدمی کی ذاتی اور ازلی کمزوری رنگ لے آئی۔ ریشا نے بھی کوئی ردِّ عمل نہیں دکھایا اور نہ ہی اس کو ہٹانے کے لئے کوئی کوشش کی۔ ملاح اپنے مشن میں کامیاب تو ہوگیا مگر اس کے چہرے پر خوشی کے بجائے پشیمانی کھیل رہی تھی۔ ریشا نے یہ عجیب بات دیکھ کر سوال داغا" ایسے موقعوں پر اکثر عورتیں جھینپتی ہیں مگر یہاں آپ شرمندہ ہیں ایسا کیوں؟

' جو محسن اتنی جلدی اپنے احسان کا بدلہ لے لے وہ شرمندہ نہ ہوگا تو کیا خوش ہوگا؟ مَیں نے بُرا کیا ہے، میں انسانیت سے گر گیا ہوں" ہتھیلیاں ملتے ہوئے ملاح نے کہا۔

" ملاح! اپنی غلطی کا خود اعتراف کرنا اور اپنی جان پر کھیل کر بے مطلب ہی کسی کی جان بچانا، یہ دونوں خوبیاں جس انسان میں ہوں گی وہ انسانیت سے گرا ہوا کیسے ہو سکتا ہے، مگر گری ہوئی انسانیت اٹھانے والا ثابت ہوگا۔" ریشا کی معنی خیز باتیں کر ملاح خوش ہوگیا، اس کا سر ہلکا ہوگیا، وہ ہم کلا ' تمہارا حسن اور ہوشیاری تم کو محلوں تک پہنچا کوئی کیسا ہی راجہ ہو مگر ان دو کے آگے ہتھیار ڈالتا ہے۔ ملاح کی دُعا سُن کر وہ مسکرائی۔ اس اپنی تعریف میں کہے گئے الفاظ وزنی محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بولی" پتاجی آتے ہوں گے۔ ایک بات: مَیں سماج کو کیسے مُنہ دکھاؤں گی؟"

ملاح ریشا کے دل کی بات سمجھ گیا اور وچار کر ڈھارس بندھاتے ہوئے بولا۔

میرے پاس ٹھیک تمہارے برابر لڑکی ہے اور اس کے بعد آج تک کوئی بچہ ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجھ میں کوئی نقص واقع ہوگیا ہے اس لئے تمہارے بچہ نہیں ہو سکتا اور یہ راز راز ہی بنا رہے گا

" پاپ اور پُن دامن میں چھپے انگارے چھپ نہیں سکتے۔ دیکھتے ہیں ایشور کہاں تک

دکرتا ہے۔" کہتے ہوئے ریشا نے یہ دیکھنے کے لئے
اہر جھانکا کہ گھاٹ پر کوئی مسافر تو نہیں ہے۔ وہاں
و مسافر کوٹھری کی طرف پیٹھ کئے ہوئے بیٹھے تھے
۔ دیکھتے ہی ریشا اندر ہوگئی اور لاطفا سے بولی "ان
ے کیسے بنا جائے گا۔ یہ تو ابھی پتاجی سے راز
ھلوا دیں گے۔" پریشانی کے وقت میں عقل بہت
یز کام کرتی ہے۔ لاطفا کچھ سوچ سمجھ کر بولا۔

"اگر کبھی ایسا موقع آ بھی جائے تو تم اس
ر کو چھپانے اور آبرو بچانے کے لئے کہہ دینا کہ یہ
یرے باپ کے برابر ہیں اور میں کہہ دوں گا کہ یہ میری
بیٹی کے برابر ہے۔ یہاں میرا منشا قد سے ہے رشتہ
ے نہیں لیکن عوام کا دھیان قد پر نہیں رشتہ پر جائے
ا۔ ہم دونوں سماج کی نظروں میں پارسا ثابت
انیں گے۔ چالاکی ہر دور میں کامیاب ہوتی آئی ہے"

"بالکل ٹھیک ترکیب سوچی ہے۔ سماج کو
بیوقوف بنا کر ہی اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

ریشا نے چین کی سانس لی اور بے فکری سے
ہر چلی گئی۔ باہر بیٹھے دونوں مسافروں نے ان دونوں
ایک ساتھ کوٹھری سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر
پس میں کانا پھوسی کی اور چپ ہو گئے۔ شاید انھوں
ے یہ سوچ لیا ہوگا کہ یہ دونوں باپ بیٹی ہیں۔ تھوڑی
ر میں بیوپاری بھی آ گیا ریشا نے دیکھتے ہی پوچھا۔

"بٹوا مل گیا پتا جی؟"

"ہاں بیٹی! بٹوا مل گیا۔ مالک مکان نے ایمانداری
ت دیا"۔

اس طرح ان دونوں کی باتیں سن کر وہ دونوں
سافر کبھی ملاح اور ریشا کو دیکھتے کبھی ریشا اور
وپاری کو۔ اس انداز سے دیکھنے پر بیوپاری بھی
وٹ ہوگیا اور کہنے لگا۔ "آپ لوگ اس طرح
دیکھ بھال کر رہے ہیں"؟

مسافروں سے خاموش نہ رہا گیا اور انھوں نے
کچا چٹھا کھول دیا۔ اس وقت تک اور بھی کئی
وہاں آ چکے تھے۔ بیوپاری نے غم و غصہ کے انداز
بیٹی کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ اس نے
کہا۔

"پتاجی یہ لوگ دل کے گندے ہیں۔ اسی لئے
ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ملاح بہت اچھا آدمی ہے،
یہ مجھے لطیفے سنا سنا کر خوش کر رہا تھا۔ یہ تو میرے
باپ کے برابر ہے۔"

ملاح نے بھی اسی وقت تپاک سے کہا۔

"جی ہاں! یہ میری بیٹی کے برابر ہے۔"

پانی کے دیوتا (اس زمانے میں بہتے ہوئے
پانی کو بھی دیوتا تصور کیا جاتا تھا) کے سامنے اس
طرح کہنا سچائی کا ثبوت تھا۔ یہ سنتے ہی دونوں کو
سانپ سونگھ گیا اور دلوں میں اچھل کود مچاتا شک
کا مینڈھک کچھ دیر کو خاموش ہوگیا۔ سارے مسافر
ہنسی خوشی پار اتر گئے۔ ان دونوں مسافروں کے
چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک مشکوک تھے
اور اس بات کو جھوٹی اور بناوٹی سمجھ رہے تھے
قسم کھانے والا بھی تصوراتی ہوتا ہے کیونکہ کھائی ہوئی
قسم جھوٹی ہوتی ہے۔ ایک دن انھوں نے ان دونوں
کے راجہ سمدرجیت کے دربار میں لاطفا کی بدچلنی کی شکایت
کی اور خود کو چشم دید گواہوں میں پیش کیا۔ راجہ نے
ریشا اور لاطفا کو طلب کر لیا جب دونوں پیش ہو گئے
تو راجہ نے ملاح سے سوال کیا۔

ان دونوں کو شکایت ہے کہ تم بدچلن ہو۔ تم
نے اس لڑکی کے ساتھ ندی کنارے جل دیوتا کے
سامنے بدسلوکی کی ہے" ملاح کچھ کہنے کے لئے ابھی
سوچ ہی رہا تھا کہ ریشا بول پڑی "حضور! جب ہم
کوٹھری میں تھے تو یہ کہاں تھے؟ ذرا ان سے پوچھا
جائے۔"

راجہ نے سوال مسافروں سے کیا تو انھوں
نے جواب دیا۔ "ہم دونوں ندی کنارے کوٹھری
سے دور بیٹھے تھے۔"

"حضور! جب یہ کوٹھری سے دور بیٹھے ہوئے
تھے تو ان کو کیا پتہ کہ ہم کوٹھری میں کیا کر رہے تھے
ان مسافروں کو صرف ہمیں ایک ساتھ باہر نکلتے دیکھ کر
ہم پر بدچلنی کا شک ہوا ہے، یہ تو کوئی بات نہیں
ہوئی۔ اس طرح تو مندر سے، دھرمشالہ سے، اسکول
سے، راج دربار سے بھی کوئی جوڑا ایک ساتھ باہر نکل
سکتا ہے۔ بدچلنی کا تعلق تو اعمال سے ہوتا ہے، نہ کہ
چال سے۔ ملاح تو نیک شاندار اخلاق والا بھلا آدمی
ہے، میرے باپ کے برابر ہے" کہتے ہوئے ریشا
نے لاطفا کی طرف دیکھا اس نے بھی لگا کر جواب دیا
"جی ہاں! یہ میری بیٹی کے برابر ہے۔"

ان بیانوں کے بعد یہ دونوں راجہ کی نظروں میں
بے قصور اور پاک صاف ثابت ہو گئے لیکن وہ دونوں
مسافر مطمئن نہیں ہوئے اور بولے "حضور! بہت
سے کام سماج کی نظر سے چھپا کر کئے جاتے ہیں۔ اور
حالات دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا جاتا ہے کہ کیا ہوا ہے
اور اکثر اندازہ صحیح بیٹھتا ہے۔"

یہ سن کر راجہ سمجھ گیا کہ یہ مطمئن نہیں ہوئے
ہیں۔ یہ دیکھ کر راجہ نے ان کو مطمئن کرنے کے لئے
لاطفا کی شرافت کا آخری امتحان لینے کے لئے حکم سنا دیا

غزل

نصرۃ ادیب ہاشمی

مرا دل جس نے تڑپایا ہوا ہے
وہ خود بھی سخت گھبرایا ہوا ہے

•

سنا ہے ایک چارہ گر ہمارا
ہمارے شہر میں آیا ہوا ہے

•

وہ آنکھیں ہیں کہ جیسے دھوپ چھاؤں
وہ چہرہ ہے کہ کملایا ہوا ہے

•

وہ اس انداز سے ہنستا ہے جیسے
زمانے بھر کا اکتایا ہوا ہے

•

زیادہ پر کشش ہوتا ہے انساں
وہ جب بھٹکے کہ ٹھکرایا ہوا ہے

•

معطر آرزوؤں کی ہوا سے
دعا کا خون مہکایا ہوا ہے

•

نہیں پرواہ غم کھانے کی نصرۃ
فریب زندگی کھایا ہوا ہے

اور نگروس ندی کے دھارے میں ملّاح کو پھینکنے کی تیاری ہونے لگی۔ ریشا کو یہ بات بہت کھٹکی۔ اس نے نڈر ہوکر راجہ سے کہا" سرکار جب تک ملزم پر لگائے گئے الزام کو ثابت کرنے کے لئے کوئی پکا ثبوت مہیا نہ ہوجائے تب تک اس کو اس طرح کی سخت سزا نہیں دینی چاہیئے۔ ایک دم ایسا قدم اٹھانے سے راجہ کے علم و حکمت اور عدل و انصاف پر حرف آتا ہے"۔

" یہ سزا نہیں ہے بلکہ مجرم ہونے نہ ہونے کی جانچ کا طریقہ ہے جو پیڑھیوں سے اس خاندان کے راجاؤں میں چلا آرہا ہے اور ہم اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنے کو تیار نہیں ہیں ۔ راجہ جو بھی قدم اٹھاتا ہے بہت سوچ کر اٹھاتا ہے اس کے کام میں دخل اندازی کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے اور نہ گنجائش ہوتی ہے"۔

یہ سُن کر ریشا نے بےخوف راجا سے کہا۔

" مہاراج! آپ ایک انسان ہیں اور ہر انسان کے کام میں ہر انسان کو دخل اندازی کا حق بھی ہوتا ہے اور گنجائش بھی ہوتی ہے۔ آپ تو بھگوان کی بھاشا بول رہے ہیں۔ صرف اسی کے کام میں نہ کسی کو دخل اندازی کا حق ہے نہ کوئی گنجائش ہوتی ہے"۔

" ریشا' تم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تم ایک راجہ کے دربار میں کھڑی ہو۔ اس طرح بےخوف اور بےادب ہوکر بولنا مناسب نہیں ہے"۔

" میں ہوش میں ہوں مہاراج! کسی کو بھی اپنے نیک جذبات کا خون کرنے کے لئے قوّتِ اظہار کا گلا نہیں گھونٹنا چاہیئے۔ آپ جو کچھ کرنے جارہے ہیں یہ ایک لکیر کا فقیر ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ عقل و دانش' ہوش و خرد' اچھے راجہ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے"

یہ سُن کر راجہ پل بھر کے لئے کچھ گمبھیر ہوا۔ جیسے وہ ریشا کی باتوں پر غصّہ نہ کر کے اتفاق کرتا نظر آرہا تھا۔ اس نے راجہ کے اندھے یقین کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ دل ہی دل میں بہت سی باتیں سوچ سمجھ کر راجہ نے پھر سنبھل کر کہا" آج ہم بھگوان کو شریک کار کر کے پھر جل دیوتا کے ذمہ اس کام کو سونپتے ہیں وہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ اگر یہ ملاح صحیح ہے تو پار لگ جائے گا ورنہ دوسرے لوگوں کی طرح ڈوب جائے گا۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو سانچ کو آنچ نہیں ہوتی ہے۔ کیا تمھیں جل دیوتا پر یقین نہیں ہے"

" مجھے صرف بھگوان پر یقین ہے اور ہاتھ پیروں پر یقین ہے۔ انسان کے سب سے بڑے یہی دیوتا ہیں۔ اس جل دیوتا پر بالکل یقین نہیں ہے۔ جب آپ کے دادا ظالموں اور غداروں کو ہرا کر جنگ سے واپس آرہے تھے تو انھوں نے خطرناک راستہ چھوڑ کر نیگروس میں گھوڑا ڈال دیا تھا شاید ان کا یہی یقین اُن کو لے بیٹھا اور وہ ڈوب کر مر گئے۔ جل دیوتا نے ان کی کوئی مدد نہیں کی کیا وہ غلط تھے؟"

" ہو سکتا ہے وہ جل دیوتا کی نظر میں غلط ہوں۔ ہزاروں بےخطا لوگوں کا خون بہا کر جنگ جیتنے والا راجہ جل دیوتا کو پسند نہ آیا ہو!"

" ٹھیک ہے مہاراجہ! آپ اپنے طریقے سے کام کریں۔ جل دیوتا ملّاح کو نہیں ڈبو سکے گا' مجھے اس بات کا پکا یقین ہے"۔ ریشا نے خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ملاح تیراک ضرور ہوتا ہے اہلِ دست، پا کی بھگوان بھی مدد کرتا ہے۔

نگروس کی اچھلتی لہروں میں ملاح کو پھینک دیا گیا۔ لاطفا غوطہ کھا کر اُبھرا اور دھار کے سہارے تیرتا ہوا ندی کے دوسرے کنارے پر جا لگا۔ حاضرین نے جل دیوتا کے انصاف اور ملاح کے پاک صاف ثابت ہونے پر خوشی میں تالیاں بجائیں دونوں مسافر دربار سے باہر منہ لٹکائے ہوئے چلے آئے۔ آج اُن کا جل دیوتا پر سے بالکل یقین ہٹ گیا اور یہ دیوتا ناکارہ فرضی اور بےاثر دکھائی دینے لگا۔ ایک مسافر دوسرے مسافر سے جھنجھلا کے بولا" اس دیوتا نے ایک مجرم پاپی کو پار لگا کر اور بھرے دربار میں چشم دید گواہوں کو جھٹلا کر جو بےعزتی کی ہے میں اس کو اس کا جواب دوں گا اور سماج کے دل سے اس کا یقین مٹا کر مانوں گا"۔

یہ مصمّم ارادہ سُن کر دوسرا مسافر متحیر ہوکر بولا۔

" دوست' بہت بڑی بات کہہ گئے ہو' یہ ممکن نہیں ہو سکے گا"۔

وقت نے کروٹ بدلی اور کچھ مہینے بعد ریشا کا پیٹ اُبھر آیا۔ بیوپاری نے اپنے خاندان کی آن بچانے کے لئے ریشا کو جان سے مارنے کی تراکیب سوچنی شروع کر دیں۔ ریشا کو باپ کی سازش کا پتہ چل گیا وہ چھپ کر گھر سے بھاگ گئی اور لاطفا کے پاس جا پہنچی۔ لاطفا اس کو اس عجیب حال میں دیکھ کر بہت ہی حیرت زدہ ہوا لیکن اس نے ریشا کو ٹھکرایا نہیں بلکہ عزت کے ساتھ گھر میں بٹھایا۔ خاطر تواضع کی اور اپنی بیوی کو سارا قصہ صاف صاف سُنا دیا۔ لاطفہ کی بیوی کڑوی دوا کی طرح اپنے شوہر کی ساری غلطیوں کو پی گئی اور ریشا کو یہ خوشی اپنی سوکن مان کر گھر میں رہنے کی اجازت ہی نہیں دے دی بلکہ جائیداد کا نصف حصہ بھی اس کے نام کروا دیا۔ ادھیڑ عمر ملاح کے گھر یہ دوسری حسین اور جوان عورت دیکھ کر سماج میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ ہوتے ہوتے دونوں مسافروں کو بھی پتہ لگ گیا۔ وہ اس حقیقت کا پتہ لگانے یہاں آئے' بات صحیح تھی۔ اب انھوں نے کیس کو دوبارہ اٹھانے کا بیڑا اٹھایا۔" اب دیکھنا ہے بھرے دربار میں کون جل دیوتا کے وجود کی تائید کرتا ہے کون اس فرضی' بےاثر' ناکارہ دیوتا کے یقین کی حمایت کرتا ہے' کون ان مکاروں کو پھانسی سے بچائے گا' کیسے راجہ جھوٹ بولنے والوں کو پھانسی نہ دے گا"

وہ دونوں عرضی لے کر دربار میں پہنچے راجہ اس وقت جیوتشی کو ہاتھ دکھا رہا تھا جیوتشی کہہ رہا تھا" مہاراجہ آپ کا نام چلے گا اور عنقریب ایسا لڑکا حاصل ہوگا جو دُنیا میں بے بی لون کا نام کر دے گا۔ جب جیوتشی چُپ ہوا تو دونوں مسافروں نے اپنی عرضی پیش کی۔ راجہ نے جب یہ بات سُنی تو دم بخود رہ گیا اور دونوں کو بلا بھیجا ابھی لاطفا کا گناہ ریشا کے پیٹ میں پل رہا تھا۔ راجہ دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا اور جل دیوتا کے انصاف

بزطن ہو رہا تھا۔ اب تک اس دیوتا کے انصاف کے سہارے پر بے شمار بے گناہ بے خطا لوگوں کو ڈبو دیا گیا ہے۔ وہ سب ڈوبنے والے گنہگار ہی نہیں تھے بلکہ ہماری بے وقوفی کا شکار تھے۔ اندھے یقین کی تلوار سے قتل ہونے والے بے قصور لوگ تھے۔ راج دربار کے انصاف کا یہ پرانا طریقہ واقعی غلط ہے۔ اگر اسی طرح امتحان میں ڈوب کر مرنے والے ملاح کی طرح تیراک ہوتے تو شاید کوئی بھی نہیں ڈوبتا۔ ملاح کو جل دیوتا نے نہیں اس کے ہاتھ پیروں نے بچایا تھا۔ اس کے لئے ہاتھ پیر اور تیرنے کا ہنر ہی سب سے بڑا دیوتا ثابت ہوا ہے۔

"ہمارے دربار میں جھوٹ بولنے والے کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے، تم جانتے ہوگے۔" راجہ نے لاطفا سے کہا۔

ابھی لاطفا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ریشا نے اس کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور خود راجہ سے ہمکلام ہوئی۔

"سرکار آمور خاندان کے اس غلط قانون کو ہم ہی نہیں، ساری دنیا جانتی ہے۔"

"ریشا ہمارے اس پرانے اچھے قانون کو غلط بتانے کی تم کو ہمت کیسے ہوئی؟"

"سرکار! جس دن لوگوں میں غلط کو غلط، اور صحیح کو صحیح کہنے کی ہمت نہیں رہے گی اس دن پھولوں کے چہرے اُداس ہو جائیں گے۔ مہاراجہ! کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ پھانسی کی سزا جرم کو نہیں، مجرم کو ختم کرتی ہے۔ مجرم کے ختم ہونے سے جرم نہیں گھٹتا۔ سزا ایسی ہونی چاہیئے جو مجرم کے جسم و جان، دل و دماغ کو ایذا پہنچائے اور خود بھی برائی سے بچے اور دوسروں کو بھی بھلائی کی طرف رجوع کرے۔ پھانسی تو دراصل مجرم سے جینے کا حق چھیننا ہے جو قانون قدرت کے خلاف ہے۔ اس میں شخصی سدھار کا نظریہ نظر نہیں آتا۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ پھانسی کا قانون غلط ہے کہ صحیح"

ہمتورجی نے بغور سننے کے بعد مسکرا کر کہا۔

"تمہاری بات قابلِ غور ہے۔ لاطفا! ریشا کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے کچھ مہینے پہلے تم نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔ کیا یہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟ کیا تم پاپی نہیں ہو؟"

"جی ہاں حضور یہ میری بیوی ہے اور یہ اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ بھی میرا ہی ہے۔ آج سے کچھ مہینے پہلے میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا، میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ یہ میری بیٹی کے برابر ہے اگر دو چیزیں قد میں ایک دوسرے کے برابر ہوں اور اُن کو ایک دوسرے کے برابر بتا دیا جائے تو یہ جھوٹ بولنا تو نہیں کہلائے گا۔" چند لمحے ٹھہر کر لاطفا نے آگے کہا۔ "اور نہ میں پاپی ہوں۔ اگر آپ کی نظر میں چند اصولوں کا خون کر کے میں نے ایک کنواری لڑکی کو بے آبرو کیا ہے اس لئے میں پاپی ہوں، تو حضور! یہ الزام بھی مجھ پر عائد نہیں ہوتا۔ جب کسی ایک کام کو دو آدمی ہمخیال ہو کر ہنسی خوشی انجام دیتے ہیں تو اس کو سماج کے اصولوں کا خون کرنا بھی نہیں کہا جاتا۔ دونوں مسافر گواہ ہیں اس بات کے کہ انھوں نے باہر بیٹھے ہوئے کوٹھری میں سے کسی کی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ میں نے وہ کون سا کام ریشا کے ساتھ نہیں کیا جو لوگ ایک بیاہتا کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں نے اس کو عزت دی ہے، پیار دیا ہے، آدھی جائداد کی مالک بنا دی ہے اس طرح میں کسی بھی سزا کے لائق نہیں ہوں۔ اگر میری کسی بھی بات پر شک ہو تو ریشا سے پوچھا جا سکتا ہے"

یہ سنتے ہی ایک خاص ادا کے ساتھ ریشا نے اقرار میں سر جھکایا اور لاطفا کی طرف سرک گئی ہمتورجی ایک جھلک میں پگھل گئے اور اس کے بے پناہ حسن کی تاب نہ لا سکے اور بولے۔

"ریشا! حسن ایسا سر نہیں جھکاتا اور دوسروں کا جھکا دیتا ہے۔ تم دونوں کو باعزت بری کیا جاتا ہے۔ ملاح اپنے گھر جا سکتا ہے اور تم جب تک فارغ نہیں ہو جاتی ہو، شاہی دیکھ ریکھ میں محلوں میں رہو گی۔ یہ دونوں مسافر بھی جا سکتے ہیں تم دونوں اپنے مشن میں سپھل ہو گئے ہو اور ہم نے جل دیوتا پر عدم اعتماد جاری کر دیا ہے آج سے کوئی بھی فیصلہ اس کے ذریعہ نہیں کیا جائے گا۔"

یہ سُن کر مسافر خوش ہو کر آداب بجا لائے اور چلے گئے۔ مگر وزیر اعلیٰ سے چپ نہ رہا گیا وہ بولا۔

"سرکار اس طرح تو ایک ایسا وقت آجائے گا کہ لوگ کسی بھی دیوتا کو نہیں مانیں گے ساری مورتیاں توڑ دی جائیں گی۔ دھرم کی نیو ہی ہل جائے گی۔"

"ہم نے کس دیوتا کو نہیں پوجا، کس کو نہیں منایا مگر چالیس سال سے ہمارے کوئی بھی بچہ نہیں ہوا ہے اور نہ اب کچھ ہونے کی امید اگر کوئی دیوتا وقت کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترے مصیبت میں مددگار ثابت نہ ہو تو اس کو ماننے سے کیا فائدہ۔ جس دھرم کی بنیاد ایسے نکمے ناکارہ اور فرضی دیوتاؤں پر رکھی جائے گی، اس کی بنیاد تو ہلنی ہی چاہیئے۔ وہ دھرم کہاں ہے تماشا ہے۔ دھرم کی بنیاد تو خدا کے سہارے پر اور دھرم کی باتوں پر قائم رہ سکتی ہے۔ اگر لوگ سوچنے کے طریقے اور رہن سہن کا ڈھنگ نہیں بدلیں گے تو زندگی بے لطف و بے معنی ہو کر رہ جائیگی۔ ملاح! تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو گئے نہیں؟"

"حضور سے ایک گزارش کرنی باقی رہ گئی ہے، اجازت ہو تو لب کھولوں"

"حسن اور دولت، محلوں کی چیز ہے وہیں شوبھا دیتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ریشا کو اس کی مناسب جگہ پر چھوڑ کر جا رہا ہوں لیکن اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ تمام ملک کی کنواری ماؤں کو چاہے وہ خوبصورت ہوں، چاہے بدصورت، شاہی خزانے سے اور شاہی دیکھ ریکھ میں پرورش کی جانی چاہیئے اور ان کی اولاد کو عزت کی نظر سے دیکھا جانا چاہیئے"

راجہ یہ سُن کر کچھ سوچنے لگا۔ پاس بیٹھے جیوتشی نے فوراً کہا۔

"مہاراجہ! گذارش مان لیجئے۔ اس میں آپ کی بھی بھلائی چھپی ہے۔"

مکان سے گھر تک

قدسیہ ہما

حد ہے بھئی سر پر پانی پڑتے ہی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گیزر نے بھی اسی وقت دھوکہ دینا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا جلدی میں بجلی جلائے بغیر ہی نہانے بیٹھ گئی تھی۔

"اوہو ___ لائٹ ہی نہیں ہے۔ جانے کیا بنے گا اس ملک کا۔ چالیس برس گزر گئے مگر بجلی کا مسئلہ حل نہیں ہو پایا۔" اب وہ ملک و قوم کے غم میں دُبلی ہونے لگی۔ پھر خیال آیا کہ دیر ہو رہی ہے۔ لشتم پشتم ٹھنڈے یخ پانی سے ہی نہانے لگی صبح بنگی نے نیند میں سارا بستر بھگو دیا۔ جس کی وجہ سے اس کے کپڑے بھی خراب ہو گئے تھے۔ اب یوں باورچی خانہ میں جانا بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ جب اس کی آنکھ کھلی تو پونے سات ہو رہے تھے۔ یعنی وہ پورا ایک گھنٹہ لیٹ اٹھی تھی۔ گھڑی نے الارم ہی نہیں بجایا تھا۔ جانے کیوں، اب وہ گھڑی کو کوسنے لگی۔ نوید پورے سات بجے بیڈ ٹی لینے کے عادی تھے۔ آج تو اتنی دیر ہو چکی تھی کہ چائے تو گول ہی ہو گئی تھی۔ اب تو جلدی سے ناشتہ بنانا تھا، کیوں کہ نوید اور اس کا سات سالہ بیٹا شاہد پورے آٹھ بجے گھر سے نکل جاتے تھے۔ شاہد کا اسکول سوا آٹھ بجے شروع ہوتا تھا جب کہ نوید کے دفتر کا وقت ساڑھے آٹھ بجے تھا۔ وہ جلدی جلدی گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتی ہوئی باہر نکلی۔ ساڑھے سات ہونے والے تھے۔ اس کے نکلتے ہی نوید اخبار لے کر باتھ روم میں گھس گئے۔ شکر ہے بیڈ ٹی والے مسئلہ پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی ورنہ آج صبح صبح جنگ ہو جاتی۔

"آخر یہ الارم کیوں نہیں بجا۔" کمرے سے نکلتے ہوئے اس کو پھر خیال آیا۔ بھلا بجتا کیسے۔ الارم تو میں نے لگایا ہی نہیں تھا۔ لعنت ہے مجھ پر۔ اس نے گھڑی میز پر پٹختے ہوئے گویا اپنا سارا غصہ اس پر نکال دیا۔

باہر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ اور اب بھی یوں بادل گھرے ہوئے تھے جیسے برسنے کو تیار ہوں۔ گویا دھوپ آج بھی نہیں نکلے گی چاروں تو ہو گئے اس انتہائی سرد اور رم جھم برستے موسم کو۔ تو بہت کی انتہا ہے۔ کوئی کام ڈھنگ سے ہو ہی نہیں سکتا یہ سوچتے سوچتے اس نے باورچی خانہ کا دروازہ کھولا ٹھوکر لگتے ہی فرش پر پڑا ہوا پانی کا گلاس الٹ گیا۔ پانی فرش پر پھیل گیا تھا، اور اس پانی میں گھر میں موجود واحد ماچس گیلی لاش کی صورت بکھر گئی تھی

"اب کیا کروں"۔ وہ اندر بھاگی۔ "جانے ماں کو بھی اب ہی شادی کروانا تھی۔ وہ ہوتا تو اتنی مصیبت کیوں پڑتی بھلا؟" اس نے نوید کے تکیہ کے نیچے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ مگر پھر مایوس ہو گئی۔ کیونکہ وہ حسب عادت سگریٹ اور لائیٹر باتھ روم میں لے جا چکے تھے۔ ناچار اسے نوید کے نکلنے کا انتظار کرنا پڑا۔ بنگی ابھی تک سسکیاں بھر رہی تھی۔ حالانکہ بڑی گہری نیند میں تھی۔ اس نے اسے مارا بھی تو بہت زور سے تھا نا۔ نازک سے گال پر انگلیوں کے نشان ابھر آئے تھے۔

"کیوں کھڑی ہو؟ ___ خیریت ___" نوید نے باتھ روم سے نکلتے ہوئے کہا۔

"وہ ــــ وہ ماچس ختم ہوگئی ہے، لائیٹر دے دیں" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"تمہاری بہت بری عادت ہے۔ کبھی وقت سے پہلے کوئی چیز نہیں منگواؤ گی"۔ یہ لو۔ اب پونے آٹھ ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے آج ناشتہ کے بغیر جانا پڑے گا۔ لائٹ بھی نہیں ہے، آج تو۔ اور روشنی کا یہ عالم کہ صبح کے آٹھ شام کے پانچ لگ رہے ہیں" لائیٹر اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے نوید قدرے تیز لہجے میں بولے جا رہے تھے۔ مگر وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ جلدی جلدی چائے بنا کر میز پر رکھی، اور جب وہ ناشتہ بنا کر کمرے میں آئی تو نوید اور شاہد تیار ہو کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ شاہد کے بوٹوں کے تسمے کھلے ہوئے تھے اور اس کے بال بھی ڈھنگ سے نہیں بنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے ایک سات سال کا بچہ [illegible] تیار ہو [illegible]۔ وہ [illegible]۔ وہ جھک [illegible] کے تسمے باندھنے لگی۔ نوید خاموشی سے چائے پی رہے تھے۔ انھیں چائے پیتے دیکھ کر ایک پیالی گرم گرم چائے پینے کی شدید ترین خواہش محسوس ہوئی مگر ابھی وہ چائے پی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ شاہد کا لنچ بکس بھی اسے تیار کرنا تھا" نوبہ، عورتوں کی زندگی بھی کیا زندگی ہے" اسے خود پر ترس آنے لگا اتنی شدید خواہش کے باوجود میں چائے کی ایک پیالی بھی نہیں پی سکتی، اپنے آنسو چھپاتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شاہد کا لنچ بکس اٹھائے اندر آئی۔ نوید ناشتہ کر چکے تھے اور شاہد گرم گرم دودھ کو پھونکیں مار کر جلدی جلدی پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شاہد کے لئے سلائس لگانے لگی۔ بالائی کا پیالہ شاہد کے قریب پڑا تھا اس کی کہنی لگی [illegible] وہ اُلٹ گیا۔ اور اسے گویا غصہ نکالنے کا بہانہ مل گیا۔ ایک زوردار چانٹا شاہد کے گال پر پڑا۔ "اندھے، نظر نہیں آتا"۔

"صبو ــــ یہ کیا حماقت ہے۔ صبح سے دیکھ رہا ہوں تمھیں۔ پہلے پنکی کو مارا اور اب شاہد کو، بچہ ہے وہ۔ اگر اس سے بالائی گر گئی ہے تو اس میں اتنا زیادہ بگڑنے کی بات تو نہ تھی۔ مجھے افسوس ہے کہنا پڑ رہا ہے کہ تم نہ اچھی ماں ثابت ہو رہی ہو۔ نہ اچھی بیوی"۔

نوید غصہ سے بولتے ہوئے بریف کیس اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ شاہد بھی آنسو پونچھتا بستہ سنبھالے اُن کے پیچھے ہو لیا۔ اُن کے نکلتے ہی اس نے دروازہ بند کیا۔ آج اس نے وحشی بن کیا تھا

"ہونہہ ــ اچھی ماں ثابت نہیں ہو رہی ــ نہ اچھی بیوی" وہ بڑبڑائی، عورتوں کو کیا کیا عذاب جھیلنے پڑتے ہیں کبھی سر پر پڑے تو کس بل نکل جائیں حضرت کے۔ لگے ہیں باتیں بنانے، وہ کڑھتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ ناشتہ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ چائے کی دو پیالیاں پی کر برتن سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ باورچی خانہ بھی عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے میلے برتن سنک میں رکھے اور دروازہ بند کر کے اندر چلی آئی۔ برسوں والی مائی دو دن کی [illegible] آ نا کر [illegible]۔

وہ بیڈروم میں آئی۔ پنکی ابھی تک سو رہی تھی اس موقع کو غنیمت جان کر وہ جلدی جلدی چیزیں سمیٹنے میں مصروف ہوگئی۔ رات وہ لوگ دیر سے سوئے تھے۔ اس لئے رات کے کپڑے بھی صوفے پر ڈھیر تھے صبح نوید نے ہی شاہد کو تیار کیا تھا، اس لئے ہر طرف دونوں کے کپڑے، جوتے وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف پنکی کا کھلونا پڑا تھا چیزیں ترتیب سے رکھتے رکھتے لائٹ آ چکی تھی۔ اس نے ہیٹر آن کر کے بستر پھیلا دیا۔ باہر تو بارش تھمی رہنے کو تھی [illegible] وہاں سے [illegible] وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"توبہ ــ یہ ڈرائنگ روم ہے یا جانوروں کا طبیلہ"۔

دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے سر پیٹ لیا۔ نوید کی لمبی چوڑی دوست داری تھی۔ وہ پر مذاق، خوش باش اور دل فریب گفتگو کی وجہ سے اپنے حلقۂ احباب میں بے پناہ مقبول تھا، اور ہر روز رات دس گیارہ بجے تک گپ شپ چلتی رہتی۔ کل رات دیر میں فیصلہ کا کھانا تھا، زیادہ [illegible] اور اب جو دیکھا جو کڑی یہاں بھی ہوئی تھی اس کو دیکھ کر صباحت صنا گئی تھی۔

"مردوں کو کبھی احساس نہیں ہوگا۔ بس شوہروں کی ذات تو ــــ توبہ ہے۔ سارا دن میں چائے کی پیالیوں میں خوش گپیاں کریں اور شام کو آ کر یوں احسان چڑھائیں گے جیسے ہل تو ڈھاتے رہے ہیں سارا دن۔ اِدھر صبح سے شام تک ان کی چاکری میں لگے رہو کہ صاحب خوش رہیں بس۔ زندگی عذاب میں آ گئی میری تو کیا پایا میں نے شادی کے بعد۔ نخرے اٹھاتے رہو خوش رہو درجۂ حرارت خطرہ کے حدود کو پار نظر آتا ہے۔ اس پر یہ بچے۔ زندگی تو سال کی خوشنودی اور بچوں کی جی حضوری میں دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ــــ ظلم ہے یہ سراسر ــ اور پھر بالائے ستم، صاحب کے دوستوں کے ساتھ بھی اخلاقیات کا مظاہرہ بہت ضروری ہے۔ جی نہ چاہے، بس مسکرا مسکرا کر دانت پیش کرو ــ تف ہے ایسی مجبور زندگی پر ـــ" وہ چیزیں جھاڑتی لگاتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی، اسے خود پر ترس آ رہا تھا۔ اتنا کہ آنکھیں بار بار بھر رہی تھیں۔

"توبہ بھی اٹھ گئی"۔ پنکی کی آواز پر وہ بولی اور جلدی سے باورچی خانے میں جا کر اس کے لئے فیڈر میں دودھ ڈالنے لگی۔ کیونکہ پنکی کے رونے کا دورانیہ خاصا طویل اور تکلیف دہ ہوتا تھا۔

"توبہ! میرا تو رنگ روپ ہی اجڑ گیا" ــــ دودھ دے کر پلٹی تو آئینے پر نظر پڑ گئی۔ "کتنی خوبصورت کتنی اچھی ہوا کرتی تھی میں۔ تباہ ہو گیا سارا کچھ ان آٹھ نو برسوں میں۔ نہ سکھ نہ آرام سب کچھ دھواں مٹی میں مل گیا۔" اسے خود پر رحم آنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔ کام کرنے والے ملازمین ابھی تک نہیں آئے تھے۔ وہ اخبار پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد فریج میں سے سبزی نکال کر بنانے بیٹھ گئی۔ شام کو نوید نے اپنے ایک دیرینہ دوست کو کھانے پر بلایا تھا جو عرصے کے بعد امریکہ سے آیا تھا۔ نوید نے کل شام دفتر سے آتے ہوئے بڑی خوشی سے اسے بتایا تھا جیسے

اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے سُنا ان سنا کرتے ہوئے کہا تھا "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، روز روز اہتمام نہیں ہوتا مجھ سے ۔" اس بات کے باوجود اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا نا ۔ بیچاری مظلوم بیوی جو ٹھہری ۔

"امی یہ چپ نہیں ہو رہا۔" بنکی دودھ کی بوتل اٹھائے اٹھائے چلی آئی ۔

"کیا چُپ نہیں ہو رہا" وہ اپنے خیالوں سے چونکی ۔

"یہ آواز امی" وہ سہمی سہمی سی بولی ۔

"ہو جائے گا چُپ تمھیں کیا فکر ہے ۔ دودھ ختم کرو جلدی سے" اس نے اُسے گود میں اٹھا کر کمرے میں لے جاتے ہوئے کہا ۔ سائرن کی آواز سے غالباً بنکی ڈر گئی تھی ۔ اُسے رضائی میں لٹا کر وہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی

"نہیں ہو رہا چپ امی !" بنکی کمرے سے چیخی

"واقعی بڑی دیر سے بج رہا ہے" اس نے سوچا "کیا وجہ ہے ۔ کیا شہری دفاع کی کوئی تربیت ہو رہی ہے ؟" اس نے اخبار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا مگر اسے ایسی کوئی خبر یا ہدایت نظر نہیں آئی جس میں شہریوں کو ہوشیار کیا گیا ہو ۔ اور ہوائی حملہ کا سائرن مسلسل بج رہا تھا ۔

"امی ۔" بنکی پھر چلائی ۔ شاید یہ آواز بچی کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی ۔ اس لئے وہ خوفزدہ ہو رہی تھی ۔ وہ تیز قدموں سے اندر کی طرف چل دی ابھی وہ بنکی کے پاس جا کر بیٹھی ہی تھی کہ زوردار دھماکہ ہوا کہ سارا مکان لرز گیا ۔ شیشے جھنجھنا اُٹھے ۔ فوری احتیاطی تدبیر جو اس کے ذہن میں آئی اس پر عمل کرتے ہوئے وہ بنکی کو گود میں بھرتے ہوئے پلنگ کے نیچے گھس گئی ۔ ابھی وہ ڈھنگ سے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک اور زوردار دھماکہ ہوا ۔" تو کیا دشمن نے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا دیا ؟ جنگ شروع ہو گئی ؟ یا اللہ ! میرے وطن پر آنچ نہ آنے دینا ۔ اپنی اماں میں رکھنا سب کو ۔ دشمن کو ناکام کر دینا میرے مولا ۔ مگر ۔ مگر یہ جو بم ابھی ابھی برسائے گئے ہیں ان سے جانے کتنی جانیں تلف ہوئی ہوں گی

"کیا پتہ ایک بم شاہد کے اسکول پر گر گیا ہو" اس کا دل مٹھی میں آ گیا ۔" ہائے میرا بچہ ۔ صبح سویرا ہی چلا گیا ۔ کیا تھا جو میں ایک سلائس ہی بنا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتی، راستہ میں کھا لیتا رات بھی کتنا مچلا تھا کہ میں اسے کہانی سناؤں، مگر میں نے اسے ڈانٹ کر سلا دیا ۔ اور صبح بھی میں نے کتنی زور سے مارا تھا اُسے ۔ انگلیوں کے نشان ابھر آئے تھے گال پر ۔ پر مجھے ترس نہ آیا تھا ۔ اور اب میرا بچہ میری آنکھوں سے دور دھول مٹی میں مل گیا ۔ میرا چاند سے چہرے والا معصوم بیٹا ۔ کتنی بدنصیب کتنی بری ماں ہوں میں ۔ ہائے گود اجڑ گئی میری ۔ بیٹے تو سہارا ہوتے ہیں ۔ آس ہوتے ہیں ۔ ماں ہوتی ہے ۔ اور میں ۔ میں اب کہاں دیکھ پاؤں گی اس کو ۔ ہائے ۔ روتے روتے اس کی نظر اپنے سونے کی چوڑیوں سے سجے ہاتھوں پر پڑی" یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ ایک بم نوید کے دفتر پر جا گرا ہو" ایک اور منحوس سوچ اس کے ذہن میں در آئی ۔

"صبح جاتے ہوئے میں نے انھیں خدا حافظ بھی نہیں کہا اور اب وہ مجھے کہاں ملیں گے کہاں دیکھ پاؤں گی انھیں ۔ یہ جنگ تو جیسے میری مانگ اور میری گود اجاڑنے کو ہی شروع ہوئی ہے ۔ کتنی بری ہوں میں اور نوید صاحب کتنے اچھے ۔ یہ سارا سکھ چین عیش و آرام انھیں کے دم قدم سے تو ہے ۔ یہ ڈھیروں ریشمی کپڑے، بے شمار زیور، ایک گاڑی، ہر کام کے لئے ملازم، سبھی کچھ انھیں سے تو عبارت ہے ۔ جو چاہتی ہوں کرتی ہوں، جہاں چاہتی ہوں جاتی ہوں، کوئی روک ٹوک نہیں، کوئی پابندی نہیں ۔ پھر بھی میں کسی بات پر خوش نہیں ۔ حالانکہ وہ یہ سب کچھ میری خوشنودی کے لئے ہی تو کرتے ہیں ۔ میں کتنی ناشکری ہوں، کتنی بے مہر ۔ ان کے التفات و محبت کا جواب میں نے ہمیشہ چڑھے ماتھے سے دیا ۔ بے دلی سے کام لیا ۔ اب اس سے زیادہ کیا زیادتی ہوگی میری کہ رات وہ بار بار مجھے جگاتے رہے اور میں جان بوجھ کر سوتی بن گئی ۔ اب ۔ اب تو ترسوں گی میں ان ساری محبتوں کو ۔ ساری عمر روؤں گی ان اپنے پیاروں کو ۔ مگر جو دکھ تکلیف میں نے انھیں دئیے ہیں وہ نہیں دُھل سکتے ۔ نہیں دھل سکیں گے ۔ کیا تھا جو میں رات ان کی بات مان لیتی ۔ محبت ہی کی تو تھی ۔ کوئی زحمت تو نہ تھی ۔ پھر بھی وہ کتنے فراخدل ہیں کہ صبح ان کے ماتھے پر کوئی بل نہیں ۔ میں ہی اکڑے میں رہی ۔ حالانکہ ناراض انھیں ہونا تھا ۔ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے ؟ کالج، یونیورسٹی کے زمانے میں کتنی خوش باش رہا کرتی تھی ۔ کلاس فیلو اور کزن دیوانے تھے، میری باتوں اور مسکراہٹ کے ۔ میں کتنی کم ظرف ہوں میں کہ نوید جن کا سب سے زیادہ میری ہر چیز پر حق تھا انھیں ہی محروم رکھا میں نے حالانکہ وہ میری ہنسی کے دیوانے تھے ۔ ترستے تھے میری ہنسی کو ۔ مگر میں کتنی بخیل نکلی ۔ مسکراہٹ ہنسی، جس پر کوئی مول نہیں لگتا اور انمول ہو جاتی اس کو میں نے اندر ہی اندر کہیں دفن کر دیا ۔ ختم کر دیا ۔ کیوں ۔ کیوں ۔ ؟ آخر کیا تکلیف ہے مجھے ؟ کیوں دکھ کاٹنے لگا ہے مجھے ۔ میرے مولا ۔ میں بڑی گنہگار ہوں ۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ تو مجھے اتنی کڑی سزا دیتا کہ میرا سہاگ چھین لیتا ۔ میرا بچہ مجھ سے جدا کر دیتا ۔ مگر اب اب تو یہ پچھتاوے سارے عمر کے ہیں ۔ میں اور بنکی ۔ ہم بے سہارا ہو گئے امی تو شادی کے دو ۔۔۔ بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں، اباجی پچھلے برس گزر گئے اور دونوں بھائی ملک سے باہر ہیں ۔ رہے سسرال والے تو وہ کب اپنے بنتے ہیں ۔ بیٹا نہ رہا تو کیا رشتہ رہ گیا بھلا اُن سے ۔ بنکی میری بچی ! اب تو بس تو ہی میرا سہارا ہے ۔" اس نے بنکی کو زور سے بازوؤں میں بھینچا ۔ وہ کسمسائی اور جاگ اٹھی، جانے وہ کب سو گئی تھی ۔

"آپ رو رہی ہیں امی ! بنکی توتلی زبان میں بولی

"ہاں بیٹا ۔ مگر اب ان آنسوؤں کا کوئی فائدہ نہیں ہے بیٹا ۔ یہ بے مول پانی ہے حقیقت ہے" گزرے دنوں میں جو کچھ ہو چکا تھا وہ اس طرح ابھر کر سامنے آیا تھا کہ احساسِ جرم نے اس شدت کا احاطہ کر لیا گویا عمل کے بعد ردِ عمل شروع ہو چکا تھا ۔ اسے اپنی سوچ سے خوف آنے لگا ۔

"مجھے نیند آ رہی ہے امی !" وہ پھر گود میں

سمت تھی ۔ صباحت نے غور کیا کہ اب سائرن کی آواز بند ہو چکی تھی ۔ وہ جلدی سے پلنگ کے نیچے سے نکلی بچی کو بستر پر لٹایا اور ٹیلی فون کی طرف لپکی، لرزتی انگلیوں سے نوید کے دفتر کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی مگر کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔ الٰہی۔ میرے صبر کو نہ آزما۔ اس نے شاہد کے اسکول کا نمبر ملایا، مگر وہ انگیج تھا۔ یا اللہ! میں کہاں فون کروں، پھر ایک دم اسے خیال آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ فائر بریگیڈ کا نمبر ملا رہی تھی۔ پانچ منٹ کے بعد رابطہ قائم ہو گیا۔

" نہیں محترمہ! ایسی کوئی خطرے کی بات نہیں تھی ۔ کوئی جنگ وغیرہ نہیں چھڑی ۔ آپ جانتی ہیں ناکہ ہوائی اڈہ یہاں سے بے حد نزدیک ہے اور ایک جہاز کو ضروری پرواز کے لئے جانا تھا، اور گہرے بادلوں کی بنا پر اسے نیچی پرواز کے لئے ساؤنڈ بیریئر توڑنا پڑا۔ وہ دھماکے اسی سلسلے میں تھے آپ فکر نہ کیجئے، شہر میں کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ ہاں کچھ عمارتوں کے شیشوں کو ضرور نقصان پہنچا ہے"۔

" امی!" شاہد آ گیا تھا۔ اس نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ماں کے خوشگوار موڈ پر حیران تھا۔ اتنے اچھے موڈ میں اس نے اپنی خوبصورت ماں کو شاید ہی دیکھا تھا۔

" تم کپڑے بدل لو بیٹا میں کھانا لگاتی ہوں"۔ اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس نے کہا اور جلدی سے فریج میں سے انڈے نکال کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی ۔ شاہد کو کالی مرچوں والا آملیٹ بہت پسند تھا اور وہ اس کے لئے وہی بنانا چاہتی تھی اس نے شاہد کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا پھر برتن سمیٹ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئی ۔

" ہیلو" دوسری طرف نوید تھے ۔

" صباحت بول رہی ہوں"

" جناب! حکم"

" شام کو جلدی گھر آ جائیے گا۔ اور وہ آپنے ... سے بھی کہہ دیجئے گا"۔

" یا اللہ"۔ نوید کی ہنسی کی آواز کانوں میں "گو آج سورج تو نہیں نکلا مگر پھر بھی کہنے ... رج ہے کہ آج یہ طلوع کدھر سے ہوا ہے"

اُن کی بات سن کر صباحت خوش دلی سے ہنسی ۔

" صبو ۔ یہ تم ہو ۔ میں تو تمہاری اس خوبصورت ہنسی کو ترس گیا تھا"۔

" جی ہاں! یہ میں ہی ہوں ۔ بس آج جلدی آ جائیے گا"۔

" بہتر سرکار" ریسیور رکھتے ہوئے صباحت کی نظر ایک بار پھر آئینہ پر جا پڑی کتنا سکون تھا اس کے چہرے پر ۔ اور وہ یوں مسکراتی ہوئی کتنی خوبصورت لگ رہی تھی، اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے گھنیرے بادل چھٹ گئے ہوں ۔ اور سنہری چمکیلی دھوپ سے سارا منظر اور خوبصورت ہو گیا ہو۔ آج کے معمولی سے واقعے نے اس کے اندر کتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی کیسا کتھارسس ہوا تھا آج کہ ہر شے اجلی ہو گئی نکھر گئی تھی۔ سنور گئی تھی ۔ وہ بھی۔ اس کا گھر بھی، اس کی زندگی بھی۔ جن باتوں سے وہ چڑ گئی تھی وہ تو اصل رنگ ہیں زندگی کے جو اسکو ... بناتے ہیں۔ کتنی نادان تھی وہ ۔

غزل

عروج زیدی

جس پہ وہ مہربان ہوتے ہیں
سب بے قیاس وگمان ہوتے ہیں
پردے جو درمیان ہوتے ہیں
رازداری کی جان ہوتے ہیں
شاکی جبرِ زندگی! خاموش
بام و در کے بھی کان ہوتے ہیں
اُن کی دم توڑتی تمنا میں
لوگ جو بے زبان ہوتے ہیں
ہر قدم حادثوں کا ضامن ہے
ہر نفس امتحان ہوتے ہیں
جو ہوا دیں بھڑکتے شعلوں کو
امنِ عالم کی جان ہوتے ہیں
کوششِ احتیاط پیہم سے
ہم خود اک داستان ہوتے ہیں
سحر پرور ہے انقلابِ جہاں
ذرے اب آسمان ہوتے ہیں
سادہ دل اُن کو پوجتے ہیں عروج
جو فقط خوش بیان ہوتے ہیں

حالتِ تذبذب

جان وکٹر کیفی

دلوں میں ذوقِ تمنا نہیں خوشی بھی نہیں
لبوں پہ آج کسی کے ذرا ہنسی بھی نہیں
یہ کیسا ملک میں ایک سبز انقلاب آیا
نہ ساگ سستا نہ سبزی ورا صلی گھی بھی نہیں
یہ کیا سماں ہے کہ بے موت مر رہے ہیں لوگ
کسی کی شہر میں قاتل سے دشمنی بھی نہیں
ہے کون کہتا یہ سالے جہاں سے اچھا ہے
اندھیری راتیں سڑکوں پہ روشنی بھی نہیں
کریں گلہ بھی تو کس سے سنائیں شکوہ کسے
ہمارے حال کی اُن کو کچھ آگہی بھی نہیں
ہیں برق چاند ستارے وطن میں لاکھوں، مگر
غریب خانوں میں تھوڑی سی روشنی بھی نہیں
عجیب حال ہے اِن موسمی بٹیروں کا
عظیم دعوے ہیں دعووں میں پختگی بھی نہیں
ہو سازگار بھی کیوں آج کی ہوا کیفی
نہ وقت پہلے سا پہلے سے آدمی بھی نہیں

ایک دلگداز کہانی

خواجہ احمد عباس

بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر سنہرا تاج تھا، اس کے بدن پر ریشمی پوشاک تھی۔ اس کے پیروں میں زرتار جوتے تھے، تخت کے نیچے شیر کی کھال بچھی ہوئی تھی اور بادشاہ کے پیر مردہ شیر کے سر پر دھرے تھے۔

سپہ سالار، وزیر، امیر اور درباری بادشاہ کے حضور میں ہاتھ باندھے مؤدب اور سرنگوں کھڑے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ حضور ملک معظم کے سامنے سر بھی اٹھا سکے، ہر ایک شاہی حکم کا منتظر تھا۔

دفعتاً بادشاہ نے تالی بجائی اور اس کے دونوں ہاتھوں میں انگوٹھیوں کے سرے چمک اٹھے، بادشاہ نے حکم دیا "رقاصہ!"

یکے بعد دیگرے سات ریشمی پردے کھلتے چلے گئے اور ان میں سے رقاصہ اس طرح نمودار ہوئی جیسے بادلوں میں بجلی کوندتی ہے۔ تخت کے سامنے پہنچ کر رقاصہ نے سات بار جھک جھک کر سلام کیا اور پھر دیوانِ خاص کی مرمریں دیواریں اور سنہری منقش چھت موسیقی کے آہنگ سے گونج اٹھی۔ رقص و سرود کی محفل گرم ہو گئی۔

رقاصہ کی آنکھوں میں جادو تھا۔ اس کے گورے بدن میں جوانی کا خمار تھا۔ اس کی ادائیں زہد شکن تھیں اور آواز میں بلا کا ترنم۔ اس کے رقص میں کبھی ہرنی کی چال تھی تو کبھی ناگن کی لہر، کبھی شعلے کی لپک تھی تو کبھی شاخِ گل کی تھرتھراہٹ، کبھی شرم و حیا کے انداز تھے تو کبھی دعوتِ ہوس، لیکن بھرے دربار میں کسی کی ہمت نہیں تھی کہ رقاصہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ صرف بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا، مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا، اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا ہوا رقاصہ کے کمالِ فن سے محظوظ اور مسرور ہو رہا تھا۔

طبلے کی آخری تھاپ اور گھونگرؤوں کی زوردار جھنکار کے ساتھ ناچ ختم ہو گیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اپنے گلے سے سات لڑیوں والے موتیوں کا ہار اتارا اور رقاصہ کی طرف پھینک دیا۔ رقاصہ نے ہار اٹھا لیا اور سات بار فرشی سلام بجا لائی۔ پھر وہ آگے بڑھی اور بادشاہ کے قدموں کو بوسہ دے کر بولی۔

" عالیجاہ! کنیز اپنی اس قدر افزائی پر پھولی نہیں سماتی۔ خداوندِ تعالیٰ شہنشاہ کا اقبال ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے، حضور پر نور کا اقبال بلند ہو۔"

"کٹ"

دفعتاً روشنیاں گل ہونی شروع ہو گئیں اور ایک پل میں سارا نظام تتر بتر ہو گیا۔ درباری اپنے ریشمی اور مخملی لبادوں کو سنبھالتے اپنی نقلی داڑھیوں اور مونچھوں کو نوچتے میک اپ روم کی طرف بھاگے۔ بادشاہ نے اپنے سر سے تاج اتارا تو نقلی لمبے بالوں کی وگ بھی اتر آئی۔ میک اپ مین نے ڈانٹ کر کہا۔

"ابے کیا کرتا ہے، وگ سنبھال کر، ڈھائی سو روپے میں بنتی ہے۔"

بادشاہ نے گھبرا کر وگ کو اپنے سر پر رکھنا چاہا تو تاج زمین پر گر پڑا۔ ٹین کی جھنکار کے ساتھ کتنے ہی شیشے زمین پر بکھر گئے۔

میک اپ روم میں پہنچ کر بادشاہ نے اپنا مخمل کا بادہ اتارا، ریشمی کرتا اتارا، ساٹن کی شلوار اتاری، زرد ڈوری کا جوتا اتارا اور ساتھ میں روئی سے بھرا ہوا اپنا نقلی پیٹ بھی اتارا۔ میک اپ مین نے اس کے چہرے سے داڑھی اور مونچھیں نوچ لیں اور اب بادشاہ صرف جانگیہ پہنے کھڑا تھا جانگیے میں تین پیوند لگے ہوئے تھے۔

چند منٹ بعد پرانی رفو کی ہوئی پتلون اور ایک میلی بش شرٹ پہنے ایک دبلا پتلا اور پچکے ہوئے گالوں والا اور دھنسی ہوئی آنکھوں والا ایکسٹرا، دن بھر کی اجرت کے پانچ روپے وصول کر رہا کیوں کہ ساڑھے سات روپے میں سے ڈھائی روپے کمیشن کے پہلے ہی کٹ چکے تھے۔ پھر اس نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

" صاحب کل بھی میرا میک اپ ہے نا!"

جواب ملا" نہیں! کل تو ہم ڈاکوؤں کے والا سین لینے والے ہیں۔"

بادشاہ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا" تو صاحب مجھے ڈاکو ہی بنا دیجئے، بڑی مہربانی ہوگی، میں سچ کہتا ہوں، مہینے میں صرف پانچ دن میک اپ کیا ہے"

اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے ڈانٹ کر کہا "پاگل ہو گئے ہو، بادشاہ کو ڈاکو کیسے بنا دیں! پکچر کی کانٹی نیوٹی خراب کر دیں؟"

بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

"تین دن بھی اور کام مل جاتا تو میں کھولی کا کرایہ دے دیتا۔ بال بچوں والا آدمی ہوں صاحب، عین برسات میں مالک مکان گھر سے نکال دے گا، انھیں لے کر کہاں جاؤں گا۔ تھوڑا سا ایڈوانس ہی دلا دیجئے، میرا کام تو ادھر بھی آ لے گا۔"

"نہیں بھائی" اسسٹنٹ نے کہا۔ اس کا لہجہ ہمدردانہ تھا مگر اس کا فیصلہ قطعی تھا" ہم نے اسٹوری بدل دی ہے، بادشاہ کا آج کا کام ختم ہو گیا

وہ جو کہتے ہیں ناکہ آدے کا آوا ہی نرالا ہے یہی اس گھر کا حال تھا۔

ممانی جب مجھے وہاں لے جانے لگیں تو بولیں "دیکھ! وہاں اپنے میاں اور بچوں کا ذکر نہ کریو چپ چاپ سنتی رہیو: اللہ قسم مزا آجائے گا۔ تو نے کاہے کو ایسے لوگ دیکھے ہوں گے"۔

جب ہم ان کے رنگ اترے جھولتے ہوئے پھاٹک سے اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کسی گھر میں نہیں جنگل میں گھس آئے ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کئی جگہ گھٹنوں گھٹنوں گھاس تھی۔ اینٹیں جو کسی زمانے میں کیاریوں کے کنارے خوبصورتی کے لئے لگائی گئی ہونگی ب اکھڑی ہوئی، بکھری ہوئی، مکان کی وحشت میں ل کھول کر اضافہ کر رہی تھیں۔ درختوں کی شاخیں جھک جھک کر گھاس سے گلے مل رہی تھیں۔ اس جنگل نما غ کے آگے میلے زرد رنگ کی ایک عمارت تھی، جس کے رآمدے کے بے شمار در اس کے دقیانوسی ہونے کی ریاد کر رہے تھے۔ مجھے اس قسم کے مکانوں سے ہمیشہ حشت ہوتی ہے اور جب چونا جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہو، چھت سے بارش کے ساتھ آنے والی مٹی کی لکیریں یوں پڑی ہوں جیسے کسی ملی کے چٹے بچے کے چہرے پر آنسوؤں کی دھاریاں، چھت کی کڑیوں کے درمیان لمبے لمبے جالے لٹک رہے ہوں، اور دیواروں پر دنیا کے ہر ملک کے نقشے ابھرے ہوئے ہوں، تو کون کٹر دل ہوگا جس پر وحشت نہ سوار ہوگی۔ میں نے کہا "ممانی' یہ آپ کس کھنڈر میں لے آئی ہیں میں کبھی نہیں مانوں گی کہ اس گھر میں کوئی رہتا ہے"۔

ابھی یہ جملہ بمشکل میری زبان سے ادا ہوا تھا کہ ایک مردانہ آواز آئی "تو صاحب' اب چال چلئے"۔ ہم دونوں نے نظریں گھمائیں تو مکان کے دائیں بازو' نیمو کے درخت کے نیچے دو پیر فرتوت شطرنج کھیلنے میں محو تھے "یہ دیکھو' ــ! ممانی نے سرگوشی کی۔ "یہ جو ادھر بیٹھے ہیں نا' جن کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت" "دونوں ہی کے پیٹ آنتیں نہ ہونے کا شبہ ہے مجھے تو۔"

"ارے نہیں' یہ جواب چال چل رہے ہیں' یہ صاحب خانہ ہیں۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد دن رات کا بس یہی ایک مشغلہ ہے۔ کبھی پنے گھر کبھی اپنے دوستوں کے گھر"

"ہمیں انھوں نے دیکھ تو لیا ہوگا۔ پھر بھی نہیں کہ اٹھ کر آئیں' یا کسی نوکر دوکر کو بھیجیں" میں نے کہا

اماں ـــ یہ امید نہ رکھنا' یہاں کوئی آئے کوئی کوئی جائے' بڑے میاں کو اس سے کوئی سروکار نہیں آؤ' اب اندر چلیں"۔

ممانی نے دروازہ کھولا اور ایسی بے تکلفی سے داخل ہوگئیں' جیسے اپنے ہی گھر میں جارہی ہوں اس کمرے میں گھستے میں ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ ابھی تک میں نے سیکڑوں ہی مکان دیکھے ہوں گے مگر ایسا نقشہ کبھی کاہے کو دیکھا تھا۔ بلا مبالغہ زمین سے چھت تک کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ اتنی تعداد میں یک جا کتابیں میں نے لائبریریوں میں دیکھی ہیں یا یہاں دیکھیں۔ فرق یہ تھا کہ لائبریری میں کتابیں ترتیب سے رکھی ہوتی ہیں اور یہاں بے ترتیبی تو کیا ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ الماریوں میں کتابیں یوں ٹھنسی ہوئی تھیں کہ ان کے پٹ کو اگر ذرا سا چھیڑا جاتا تو اڑا اڑا دھم کر کے ساری کتابیں فرش پر آن گرتیں۔ فرش پر کتابیں اس طرح بکھری ہوئی تھیں کہ ان پر پاؤں رکھ کر صرف وہی کمرہ پار کر سکتا تھا جس نے تاشوں پر چلنے کی مشق

گر رکھی ہو۔ ایک طرف کونے میں مختلف ضخامت کی سال خوردہ کتابوں کا کوئی قدِ آدم ڈھیر اس انداز میں لگا ہوا تھا جیسے کسی چھوٹے سے بچے نے مینار بنانے کی کوشش کی ہو۔ چھت اور کونوں پر لمبے لمبے جالے تھے اور تمام کتابوں پر گرد کے گردپوش چڑھے ہوئے تھے۔ میں ان چیزوں کو گھبرا گھبرا کر دیکھتی رہی ممانی نے قطعی جلدی نہیں کی۔ بلکہ جب میں اپنی دانست میں سب کچھ دیکھ چکی تو انھوں نے ایک طرف اشارہ کیا وہاں فرش پر دائیں بائیں کتابوں کی دیوار کے درمیان کوئی لیٹا تھا۔ اس کا چہرہ اس کتاب میں چھپا ہوا تھا جو وہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن اس کی کنپٹی کے سفید بال نظر آرہے تھے کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی ہوگا ہم اتنی خاموشی اور آہستگی سے داخل نہیں ہوئے تھے کہ کسی کو ہماری آمد کا احساس ہی نہ ہو بلکہ پرانے دروازے نے کھولتے وقت خاصا احتجاج کیا تھا۔ لیکن اس کتابوں کے کیڑے میں ذرہ بھر بھی حرکت نہ ہوئی اور میرا دل یہ سوچ کر دھڑک اٹھا کہ یہ جو لیٹا ہوا ہے شاید زندہ نہیں' بے جان ہے۔ جاسوسی ناولوں ؛ لیسے اس پراسرار مکان اور عجیب و غریب کمرے میں یہ بات کچھ اتنی بعید از قیاس بھی نہ تھی ممانی نے بڑے اطمینان سے کہا" آؤ اندر چلیں" ثاقب! آپا اندر ہی ہوں گی نا؟" انھوں نے کسی تیسرے کو مخاطب کیا' مگر انھیں کوئی جواب نہ ملا' اور وہ اندر جانے والے دروازے میں بلا جھجک داخل ہوگئیں۔ میں بھی اندر چلی گئی۔

اس کمرے کو عجائب گھر کا دوسرا کمرہ سمجھ لیجئے اس میں جگہ جگہ کپڑے کی خوب صورت گڑیاں جھانک رہی تھیں۔ یہ گڑیاں مختلف وضع قطع اور ناپ کی تھیں چند ایک پرانی گڑیاں الماری میں ڈھیر کی طرح پڑی تھیں۔ اور نئی گڑیاں کارنس اور میزوں پر سلیقے سے سجی تھیں۔ مگر یہ کمرہ نسبتاً صاف تھا۔ چھت اور دیواریں بھی جالوں سے پاک تھیں۔ میں اسے بھی مفصل طور پر دیکھنا چاہتی تھی کہ ممانی نے کہا۔

"اب چلی آؤ' یہ کمرہ میں تمہیں پھر کسی دن اچھی طرح دکھاؤں گی۔"

ان کے پیچھے پیچھے میں صحن میں آئی' جہاں ایک ادھیڑ عمر کی موٹی سی عورت چارپائی پر بیٹھی لیٹا؟ ایک دوپٹے میں گوٹا ٹانک رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر ذرا کی ذرا ہاتھ روک کر انھوں نے سلام کا جواب دیا بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر اسی تندہی سے گوٹا ٹانکنے میں مصروف ہوگئیں۔ میں اور ممانی نزدیک بچھی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ممانی نے کہا" یہ ہے میری بھانجی جس کا ایک دفعہ میں نے ذکر کیا تھا"۔

عورت نے ہاتھ روک کر میری طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ میری نگاہیں جھک گئیں۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا ممانی بولیں" ایم۔ اے میں پڑھتی ہے' عادت کی بات نہ پوچھو۔ ایسی سیدھی سادی' بھولی بھالی کہ کوئی دیکھ کر یہ نہیں کہتا کہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیوں میں سے ہے۔ صورت شکل تو تمہارے سامنے ہے' رنگ ذرا جھلک گیا ہے یہاں آکر"

میں ممانی کے جھوٹ کے اس طومار پر غور کرنے لگی کہ وہ صاحبہ بولیں" اللہ کے فضل سے اب کیا کم ہے رنگ' یہاں آتو"

انھوں نے مجھے لاڈ سے بلایا۔ ممانی نے مجھے نزدیک جانے کا اشارہ کیا۔ میں ذرا جھجکتی ہوئی نزدیک پہنچی تو انھوں نے اپنے قریب جگہ بنا کر کہا۔" ادھر میرے پاس بیٹھ" اور قبل اس کے کہ مجھے کچھ پتہ چلے اپنے موٹے موٹے ہونٹ میری پیشانی پر چپکا دیئے۔ ان کے کپڑوں کی پسینہ بھری بو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ ان کے علیحدہ ہوتے ہی میں نے رومال سے اپنی پیشانی صاف کی' مگر وہ جلتے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ اسی طرح میری پیشانی پر دہکتے رہے۔ مجھے اس حرکت پر بے حد غصہ آیا۔ ممانی کی طرف تنکھیوں سے دیکھا تو وہ کچھ اس طرح مسکرائیں کہ میں سرخ ہوگئی۔

" اے بیٹی شبانہ' ذرا اس دروازے سے باہر جا۔ ادھر کے کونے میں ایک شہتوت لگا ہے اس کے پتے توڑ لا۔ سلیم کو کھانسی ہو رہی ہے۔ شہد کے ساتھ چٹاؤں گی" یہ کہہ کر ممانی نے مجھے آنکھ ماری میں حیران و پریشان صحن کے دروازے سے باہر نکلی اور دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو کر ان کی باتیں سننے لگی۔

ممانی بولیں۔" کیوں' پسند آئی؟"

"ہاں۔ میں تو ایسی ہی لڑکی چاہتی ہوں ثاقب کے لئے۔ پڑھی لکھی ہو' کیوں کہ وہ خود کتاب کا کیڑا ہے۔ اور سیدھی سادی ہو کہ مجھ غریب کے ساتھ گزارا ہو سکے"۔

" تو بس دیکھ لو' لڑکی تمہارے سامنے ہے' پیغام بھجوادو"

" پیغام تو شام تک بھجوا دوں گی' تم فکر نہ کرو' مجھے لڑکی کا ناپ بھجوا دینا۔ کل بازار گئی تھی کچھ کپڑے لائی ہوں"

" نئے ڈیزائن ہوں گے ۔۔ مجھے بھی دکھاؤ نا آپا!" ممانی بولیں" اللہ قسم لاؤ یہ دوپٹہ میں کرتی ہوں۔ تم وہ کپڑے لاؤ۔ نہیں تمہیں میری قسم! سارے کپڑے نکال لاؤ۔ ذرا بہانے سے شبانہ کی بھی نظر پڑ جائے تو اچھا ہے۔"

بڑی بی اندر کی طرف بڑھیں تو ممانی نے پکارا" ارے شبو! کدھر رہ گئی۔ چھوڑ نہیں شہتوت تو' میں اپنے پڑوس سے منگالوں گی' آجا تو"

میں چند لمحے انتظار کے بعد اندر چلی گئی تھوڑی دیر بعد بڑی بی ایک گٹھری لئے باہر آئیں۔ ممانی نے لپک کر ہاتھ میں لی اور چارپائی پر ڈال کر کھولی مختلف وضع قطع کی سلی ہوئی قمیصیں' شلواریں' دوپٹے' بلاؤز تھے۔ ممانی نے گھسیٹ کر ایک قمیص نکالی اور بولیں" دیکھ شبو! یہ آپا نے اپنی بہو کے لئے جوڑے بنار کھے ہیں"۔ یہ کہہ کر قمیص کو میرے سامنے اس طرح لٹکایا جیسے کوئی بہت ہی انوکھی چیز ہے۔ پھر وہ قمیص رکھ کر دوسری اسی طرح اٹھا کر دکھائی' اور اس وقت میں نے غور کیا کہ دونوں قمیصوں کی لمبائی چوڑائی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میرے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر ممانی بولیں۔" آپا نے ہر ناپ کے کپڑے سلوا رکھے ہیں کہ جانے بہو لمبی ہو' چھوٹی ہو' موٹی ہو یا دبلی ہو"۔

ان کی معصومیت سے کہی ہوئی اس بات پر میرا ہنسی روکنا دوبھر ہوگیا۔ وہ تو شکر ہے کہ بڑی بی تندہی سے گوٹا لگانے میں مصروف تھیں۔ اس لئے میرا ہنستا چہرہ ان کی نظر سے بچ گیا۔ ممانی نے پھر بھولپن سے پوچھا" آپا' یہ بہو کے دوپٹہ میں گوٹا لگا رہی ہیں؟

"اور کیا۔ اس کے ساتھ کی شلوار قمیص درزی کو دے رکھی ہے۔ آج آدمی بھیج کر کہلوا دوں گی کہ جو ناپ بھیج رکھا ہے اس سے ذرا چھوٹی بنائیے"

"اور آپا زیور نہ دکھاؤ گی جو بہو کے لئے رکھا ہے؟"

"پھر کبھی دیکھ لینا"

"نہ ــ پھر شبو تو چلی جائے گی نا"

بڑی بی پھر اٹھ کر اندر گئیں، اور زیوروں کا ایک بڑا صندوقچہ اٹھا لائیں ــ پرانے فیشن کے بھاری بھاری زیور وہ ایک ایک کر کے دکھاتی رہیں اور ممانی ہر چیز کی طرف میری توجہ خاص طور پر مبذول کرواتی رہیں۔ ڈبہ رکھ کر وہ آئیں تو کہنے لگیں "اب میں جلد سے جلد ثاقب کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔ جیسے جیسے دن گزر رہے ہیں، یہ لڑکا قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے تو شادی نہ کرنے کے لئے طرح طرح کے بہانے تراشا کرتا تھا مگر اب صاف انکار کرنے لگا ہے۔ اس کے ابا نے ایسی ڈھیل دی ہے کہ کچھ کہتے ہی نہیں۔ میں تو اس مہینے کے آخر تک یہ کام کر دوں گی۔ میرا تو سب سامان تیار ہے"

"مگر لڑکی والے تو اتنی جلدی تیار نہیں ہوں گے"

"کیوں نہ ہوں گے؟ میں اُن سے کہہ دوں گی ــ [illegible] کچھ چاہیئے ہی نہیں سوائے لڑکی کے۔ خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ اب کچھ بھی نہیں تو پچیس جوڑے تیار ہوں گے دلہن کے"

ممانی مجھ سے بولیں "اے شبو! دیکھ اندر کیسی اچھی اچھی گڑیاں رکھی ہیں۔ ذرا دیکھ نا ان کو"

میں سمسائی مگر ممانی کے دوبارہ کہنے پر اندر چلی اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ممانی کہہ رہی تھیں۔

"اللہ جانتا ہے آپا! مجھے ثاقب کے رشتے کی اتنی فکر ہے جتنی آپ کو۔ ورنہ کون اس طرح اپنی لڑکی کو کسی کے گھر جاتا ہے۔ مگر اب اس کو کیا کروں کہ میرے بہنوئی بڑے لالچی آدمی ہیں۔ کہتے ہیں جب تک زمین لڑکی کے نام نہیں کرے گا، شادی نہیں ہو گی۔ تو وہ اب تک بیٹھی ہے۔ ورنہ ایسی ہیرا لڑکی کے لئے کوئی کال پڑا ہے؟"

بڑی بی کچھ بجھ سی گئیں، کہنے لگیں "دیکھو ثاقب کے ابا سے بات کروں گی۔ ان کی بھی تو کھوپڑی اوندھ گئی ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ زمین کیا قبر میں لے جائیں گے۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ اسی کے بال بچوں کے کام آئے گی۔ مگر اس بات پر راضی نہیں ہوتے بہن! یقین مانو اگر میرے پاس زمین ہوتی تو اسی وقت ساری کی ساری بہو کے نام لکھ دیتی۔"

ممانی نے کہا "خوش قسمت ہو گی وہ لڑکی جس کو آپ جیسی ساس ملے۔ یہی میں اپنے بہنوئی کو سمجھا دوں گی کہ ایسے لڑکے اور ایسی ساسیں مشکل سے ملتی ہیں۔ مگر وہ ماننے والے نہیں۔ ان مردوں کی ضد نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اچھا، اب ہم چلیں گے۔ اے شبو، سلام کر خالہ کو آکر چلیں"

میں نے باہر نکل کر دور سے ہی سلام کیا۔ مگر انھوں نے مجھے پاس بلایا اور ایک عدد جلتا بھلستا بوسہ پھر میری پیشانی پر چپکا دیا۔ اس کے بعد میرا سر اپنے گلے سے لگا کر دیر تک ہاتھ پھیرتی رہیں۔ میں نے سانس بند کئے رکھا، جب دم گھٹنے لگا تو جھٹکے سے الگ ہو گئی اور ممانی کے ساتھ چل دی۔ بڑی بی نے پھر چارپائی سنبھالی، دوپٹہ ہاتھ میں لے لیا جیسے آج ہی شادی ہے اور شام تک دوپٹہ پورا پورا کرنا ضروری ہو۔ ہم اسی راستے سے لوٹے گڑیوں والے کمرے اور پھر کتابوں کے زینوں کو پھلانگتے ہوئے چلے۔ ایک سفید سر اسی انداز، اسی کروٹ کتابوں کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ باہر باغ میں لیموں کے درخت کے نیچے دونوں پیرِ فرتوت اسی پہلو بیٹھے بساط پر جھکے ہوئے تھے۔

"اللہ! یہ کون سا عجائب گھر تھا؟" میں نے پھاٹک سے باہر نکل کر کہا۔

"دیکھا، کیسی کیسی اللہ کی مخلوق موجود ہے جس کو تم نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا" ممانی فخر سے بولیں۔

"یہ ہیں کون، اور یہ طرح طرح کے پیڑوں کا کیا قصہ ہے؟"

"بس جب 'ساستا' زور کرتی ہے، یہ ان ہی باتوں سے دل بہلاتی ہیں۔" ممانی نے گویا یہ میرے سوال کا جواب دیا۔

"ساستا کیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی ماں کی، اولاد کے لئے محبت کو کہتے ہیں 'مامتا'۔ اور ساس کا اپنی بہو کے لئے جو جذبہ ہوتا ہے وہ ساستا نہیں تو اور کیا کہلائے گا۔ ماں تو بن گئیں مگر ساس نہ بن سکیں۔ اب ان کا ساستا کا جذبہ ہر اس لڑکی پر ٹپکتا ہے جو کنواری ہو۔ دیکھا نہیں تھا، تمہیں چٹ چٹ پیار کر رہی تھیں۔"

"اللہ توبہ ــ" میں نے کہا "ممانی آپ بڑی خراب ہیں"

ممانی قہقہہ لگا کر ہنسیں "یہ تم پہلی تھوڑی ہو بہتیری ان کی ساستا کا شکار ہو چکی ہیں۔ جبھی تو یہ رنگ برنگے نایوں کے کپڑے نظر آتے ہیں بےچاری کے پاس۔ کبھی لمبے کپڑوں کا چھوٹا کرواتی ہیں۔ کبھی چھوٹے کپڑوں میں جوڑ ڈلوا کر لمبا کرواتی ہیں۔ اسی جوڑ توڑ اور ساستا کے پیچھے بیچاری کے دن کٹ رہے ہیں، ورنہ پاگل ہو جاتیں اب تک۔

"گویا ابھی پاگل ہونے میں شبہ ہے کچھ؟"

"بےچاری" ممانی بولیں۔ "مجھے تو ترس آتا ہے کبھی کبھی۔ میاں اپنی الگ دنیا میں رہتا ہے۔ لڑکا ہے تو ساری دنیا کی کتابیں چاٹ گیا ہے، اس کا دل نہیں بھرا۔ سنا ہے بڑے بڑے سائنسدانوں کو خط لکھتا ہے اور ایسی ایسی گتھیاں پوچھتا ہے کہ وہ بھی الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ تمہارے ماموں بتا رہے تھے کہ بڑے بڑے آدمیوں کے خط اس کے پاس ہیں جن میں ایک آئن اسٹائن کا بھی ہے"

"اچھا" میں نے حیران ہو کر کہا "عمر کیا ہو گی ان کی؟"

"کوئی پینتالیس کے پیٹے میں ہیں، مگر اماں کو ابھی تک سہرے کے پھول کھلانے کا ارمان ہے۔"

"ابھی تک شادی کیوں نہیں ہوئی؟"

"بھئی، جس نے ایک بار ان کا گھر اور گھر کا ماحول دیکھ لیا، وہ لوٹ کر نہ آیا۔ اور اب تو بیٹے نے صاف انکار کر دیا ہے، بڑی بی پھر بھی اپنی کوشش کئے جا رہی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک صاحب بیٹی دینے پر راضی ہوئے تھے، مگر وہ اس کے نام کچھ زمین لکھوانے کی فکر میں تھے، اسی وجہ سے معاملہ ختم ہو گیا"

"حد ہے۔ واقعی ایسے کردار تو صرف ناول

ہوئے ہیں۔ ان سے کہا۔

"اچھی ناولوں میں کیا کردار ہوں گے جو اصل زندگی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

"اور وہ گڑیاں؟"

"گڑیوں کے متعلق میں نے بھی کئی مرتبہ پوچھا مگر کچھ صاف جواب نہیں دیا۔ یہی کہتی ہیں کہ میری ایک بھتیجی کا شوق ہے۔ وہ بنا کر بھیج دیتی ہے۔ یہ میں ضرور دیکھتی ہوں کہ ان کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور شاید ایک دن آئے جب بیٹے کے کمرے کی کتابوں کی طرح یہاں فرش سے چھت تک گڑیاں ہی گڑیاں ہوں گی۔"

"کوئی نوکر وکر نہیں ہے ان کے گھر میں؟"

اب مجھے یاد آیا کہ اتنی دیر بیٹھنے پر بھی چائے پانی کو بھی نہ پوچھا گیا۔

"میں نے تو کوئی دیکھا نہیں، خود ہی کھانا پکاتی ہیں، خود ہی کمرے میں جھاڑو دے لیتی ہیں۔ بیٹا تو اپنے کمرے میں ہاتھ نہیں لگانے دیتا، خود ہی مہینے دو مہینے میں جھاڑو دے لیتا ہے۔ جب کوئی کتاب پڑھنی ہوتی ہے تو اس کو جھٹک کر گرد صاف کر لیتا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

"خوب تماشے کی زندگی ہے۔"

"ہاں میں ایک نیا شوشہ چھوڑ آئی ہوں جلد ہی پیغام آجائے گا۔ میں یہاں سے تمہارا ناپ بھیج دوں گی۔ بڑی بی بازار سے کپڑا منگوائیں گی۔ چند دن خوب گہما گہمی میں گزر جائیں گے، پھر ایک دن میں جا کر کہوں گی اس کی بات تو کہیں اور پکی ہو گئی، آپ لوگ تو زمین لکھنے پر راضی نہ ہوئے۔ بس بے چاری صبر کر کے بیٹھ جائیں گی اور پھر جو دوسری لڑکی نظر آئیگی اس کے ناپ کے کپڑے سلوانا شروع کر دیں گی۔"

"سچ، بڑی خراب ہیں آپ ممانی" میں نے کہا۔

"ارے صبیّ یہ کھیل تو بہت لوگ ان کے ساتھ کھیل چکے ہیں مگر انھیں عقل ہی نہیں آتی، اصل میں جو خود بے وقوف بننا چاہے، اسے روک کون سکتا ہے؟"

کئی دن تک ان کے اور ممانی کے درمیان سوال جواب کا سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے ہاں سے جو لڑکا پرچے لاتا تھا، ان کے کوارٹر میں رہتا تھا اور آدھے سے زیادہ

پاس تھا۔ ... دیر ممانی جواب ... میں ماموں اور ہم اس سے باتیں کر کے ہنسا کرتے۔ پھر ایک دن جب یہ لڑکا آیا اور ممانی نے پرچا پڑھا تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی کیوں کہ انھوں نے لکھا تھا کہ ان کے شوہر ہمایوں شبانہ کے نام زمین لکھنے کو تیار ہیں۔ اب ممانی بڑی سٹپٹائیں، لڑکے کو انھوں نے یہ کہہ کر ٹالا کہ بعد میں جواب بھجوائیں گی۔ ماموں اور سلیم نے الگ ممانی کو پریشان کیا اور انھیں خوب چھیڑا۔ آخر ممانی خود تنہا گئیں اور جانے کیا جھوٹ سچ بول کے پیچھا چھڑایا

اس بات کو کئی ماہ ہو گئے۔ لیڈیز کلب گڑیوں کی ایک نمائش منعقد کر رہا تھا۔ دفعتاً مجھے وہ خوبصورت گڑیاں یاد آگئیں جو میں نے اس انوکھے مکان میں دیکھی تھیں۔ ان میں سے دو چار تو ضرور اس قابل تھیں کہ نمائش میں پیش کی جائیں۔ میں نے ممانی سے ذکر کیا تو وہ بولیں" میں تو اس وقت کام کر رہی ہوں، تم ہو آؤ۔ ممکن ہے وہ دے دیں۔ کہہ دینا صرف نمائش کے لئے چاہئیں بعد میں واپس مل جائیں گی۔"

میں سمجھ گئی کہ ممانی جانا نہیں چاہتیں، سوچا اکیلی چلی جاؤں یا نہ جاؤں۔ بالآخر میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر ہی تو تھا، بھوت کا ڈیرا تو نہیں تھا پھر مجھے کسی کی باتوں سے کیا سروکار، اپنا کام کروں گی اور چلی آؤں گی۔ البتہ ان صاحبہ سے ذرا دور ہی دور سے بات کروں گی۔ جس وقت میں چلنے لگی ممانی نے کہا" دیکھو دروازہ کھٹکھٹانے کے چکر میں نہ پڑنا ورنہ صبح سے شام ہو جائیگی کوئی نہیں آئے گا تم میری طرح سیدھی اندر چلی جانا۔"

"مگر۔ ممانی!" میں ٹھٹھک گئی۔ کسی کے گھر میں یوں کیسے چلی جاؤں۔ فرض کیجئے وہ صاحبہ گھر میں ہوں ہی نہ"

اس بات پر ممانی بے تحاشا ہنسنے لگیں۔ پھر بولیں" ارے پگلی، وہ تو کبھی گھر سے قدم باہر نہیں نکالتیں۔ شادی، اور موت میں نہیں جاتیں، تو آج کہاں جائیں گی۔ تم پیچھے صحن کی طرف سے اندر چلی جانا باورچی خانے میں یا کسی کمرے ومرے میں مل جائیں گی۔"

ایک دفعہ دل کو اور کڑا کر کے میں چل پڑی۔ باغ میں، اگر اس کو باغ کہا جا سکتا ہو، بالکل سناٹا تھا۔ آج

... پیچھے ... کوئی نہیں تھا۔ میں دبے پاؤں پچھواڑے کی طرف چلی گئی۔ آہستہ سے صحن کا دروازہ کھٹکھٹایا، مگر کوئی جواب نہ آیا، اور میں ڈرتی جھجکتی اندر داخل ہو گئی۔ چاروں طرف نظر ڈالی، کوئی نہیں تھا۔ اتنے میں اندر کمرے میں سے ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی غصہ میں مختلف چیزیں پھینک رہا ہو، اور بڑبڑا رہا ہو۔ میں صحن میں سن کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ اندر جاؤں، یا واپس چلی جاؤں۔ ایک دفعہ دل کو اور ہمت بندھائی کہ جب آئی ہوں تو اپنا کام کرتی چلوں۔ میں نے کمرے کی طرف قدم بڑھایا، ایک عورت کی بھاری بھرکم طنز میں ڈوبی ہوئی آواز آئی اور میرے قدم وہیں جم گئے

"کیا لائی تھیں اپنے ساتھ، ننگی بوچی آئی تھیں، یہ میرا دم ہے جو عیش کر رہی ہو۔ میں سارا دن چولھے میں جلتی ہوں اور تمہارے آگے دسترخوان سجاتی ہوں۔ اپنی آنکھیں پھوڑ کر تمہیں سی کر پہناتی ہوں۔"

"اللہ۔ یہ صاحبہ کسی سے لڑ رہی ہیں۔ ممانی تو کہہ رہی تھیں ان کے گھر میں کوئی نہیں۔ ممانی بھی ایک فتنہ ہیں۔ گپ اڑانے اور لوگوں کو تماشا بنانے میں ان کا جواب نہیں۔ اتنے میں وہ بھاری بھرکم آواز پھر آئی" اگر رہنا ہے تو سیدھی طرح رہو ورنہ میکے کا ٹکٹ کٹاؤ، میرے لئے کمی نہیں ہے تم جیسیوں کی۔"

مگر اور کسی کی آواز سنائی نہ دی۔ محاذ جنگ کے دوسری طرف سناٹا تھا۔ سسکیوں تک کی آواز نہیں تھی میں نے بھاگنے کی سوچی، پھر میرا تجسس غالب آگیا، میں نے دو قدم بڑھا کر پردے کے پیچھے سے دیکھا۔ وہ پھر چلائیں۔" چل لنگوڑی، زبان چلاتی ہے، شرم نہیں آتی تمہیں ساس کے ساتھ زبان چلاتے۔ حرافہ ابھی تجھے ٹھیک بناتی ہوں" اور میرے دیکھتے دیکھتے انھوں نے کارنس پر سے بڑی سی گڑیا اٹھائی، اس کے بال نوچے دو طمانچے اس کے گالوں پر لگائے اور زمین پر پھینک دی۔" حرامزادی" جو ایک لفظ نکالا گلا گھونٹ دوں گی" انھوں نے جھک کر ایک دفعہ اور اس کی گردن دبائی۔

ساس کا یہ رنگ دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ مجھے یہاں پاکر کہیں اس ساس کا رخ میری طرف نہ ہو جائے یہ سوچ کر میں الٹے پیروں پھری اور صحن سے نکل کر باقاعدہ بھاگنے لگی۔ ●●

شاہ صاحب جودھپوری رح

شخصیات، واقعات، تاثرات،

سلسلہ کیلئے دیکھئے "شانِ ہند" ماہ اکتوبر ۱۹۸۰ء

مگر سول سرجن حیران تھے کہ یہ کیسا علاج ہے۔

چودھری بلدیو راج کے گُردوکن بھڑے وگی (ساکن ناگور) تھے اور حالتِ نزع کو پہنچ چکے تھے، اُن کو شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا اور آپ کی ذرا سی توجہ نے انھیں تندرست و توانا کر دیا۔

پنڈت شنکر لال جی پُشکرنہ، حاکم میل خانہ جودھپور کا بھی ایسا ہی واقعہ ہے۔ اُن کا نچلا حصۂ بدن فالج گرنے سے بیکار ہو گیا تھا، مدتِ دراز تک مختلف علاج کرائے، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر آپ کی خدمت میں لائے گئے۔ آپ نے دو چار منٹ اُن پر توجہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا وہ اپنے پیروں سے چل کر گھر تشریف لے گئے۔

جودھپور کے ایک مشہور جاگیردار کنٹالیہ استسقائے لحمی میں مبتلا ہو کر سراپا مضغۂ گوشت بن گئے تھے۔ وہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر کئے گئے اور چند منٹ کی نظرِ کیمیا اثر نے اُن کو تیز دم نوجوان کی طرح دوڑنے پھرنے کے قابل بنا دیا۔

ٹھاکر صاحب ٹھکانہ نوکرن ہوم ممبر ریاست جودھپور کو جب ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو انھوں نے بھی آپ کی توجہ سے شفا پائی۔

بہ سلسلۂ سیاحت حیدرآباد تشریف لے گئے تو وہاں بھی متعدد مایوس العلاج اشخاص آپ سے مستفیض ہوئے جن میں شہزادہ میر خاں، مہتمم محلاتِ شاہی اور غلام محی الدین جرّاح سرکارِ نظام اور سیٹھ مہتاب الدین کی خطرناک اور مہلک امراض سے شفایابی قابلِ ذکر ہے۔

ایک بار بمبئی میں ممبا دیوی، مارواڑی بازار میں سیٹھ مصری لال چودھری، ساکن ناگور کے یہاں آپ کا قیام تھا۔ سیٹھ جی کے ایک پارسی دوست جو ایک متمول تاجر تھے اپنی لڑکی کی علالت کے باعث سخت پریشان تھے۔ لڑکی کے ہاتھ پاؤں رہ گئے تھے۔ اسے ایک پہیے دار کرسی میں بٹھا کر پھرایا جاتا تھا۔ معالجے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی تھی۔ حتیٰ کہ انگلینڈ اور جرمنی تک لے جایا گیا تھا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ مریضہ کو آپ کی خدمت میں لایا گیا اور اس کی کرسی آپ کے سامنے رکھ دی گئی۔ آپ نے چند منٹ اس پر توجہ فرمائی تو لڑکی کرسی سے از خود اٹھ کھڑی ہوئی اور اسی وقت مرض مفقود ہو گیا۔ آپ بمبئی جاتے تو دو تین تین ماہ قیام فرماتے مگر اس لڑکی کے واقعہ کے بعد فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ حالانکہ سیٹھ مصری لال نے صد اصرار سے روکتے رہے مگر آپ نے ایک نہ مانی۔ کیونکہ اس واقعہ کی شہرتِ عام نے بمبئی کے اعلیٰ اور متمول طبقہ کو آپ کی جانب متوجہ کر دیا تھا۔ پارسی صاحب کی یہ تمنا دل کی دل میں رہی کہ اُن کا نذرانہ صاحب کسی طرح قبول کر لیتے۔

۱۹۵۱ء میں راجہ گوبند سکھ جی پر جو آپ کے معتقدِ خاص تھے، فالج گرا۔ راجہ صاحب کے

ہی خواہوں نے فوری شفا خانہ لے جانا چاہا مگر راجہ جی نے شفا خانے جانے کی بجائے قبلہ شاہ صاحب کے ہاں جانے کے لئے اصرار کیا۔ ایسا ہی کیا گیا۔ آپ نے پانی دم کر کے راجہ صاحب کو پلایا اور شافیٔ مطلق نے انھیں شفا عطا کی۔ راجہ جی دفع مرض کے بعد اجازت لے کر جانے لگے تو آپ نے فرمایا "راجہ جی! آپ کو بھوک لگی ہے کھانا کھا کر جانا"۔ چنانچہ تناول ماحضر سے راجہ جی سیر ہو کر صحیح و تندرست حالت میں تشریف لے گئے۔ راجہ صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ (پندرہ سال ہوئے کہ راجہ صاحب کا بھی انتقال ہو گیا ہے) اُن کا بچپن شاہزادگی کے رنگ میں گزرا، مگر علوم رمل و نجوم میں انھیں کمال حاصل تھا۔ نہایت منکسر المزاج اور ملنسار۔ انھیں جنم پتری دیکھنے اور بنانے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ جے پور کا اعلیٰ طبقہ اور متعدد جوتشی آپ کے معتقد تھے۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں وہ عرصہ ۲۰ سال سے بلا ناغہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں نہایت صدق دلی سے ارادتمندی اور راسخ الاعتقادی کے ساتھ حاضر ہوتے رہے تھے۔ حضور میں پہنچتے ہی وہ شاہ صاحب کے قدم چھوتے اور علوم مذکورہ کے نکات و رموز حضرت شاہ صاحب سے حاصل کرتے رہتے۔ ایک تمغہ آپ کو آپ کے والد ماجد مہاراجہ ادھیراج سر سوائی مادھو سنگھ جی سورگ باشی نے عطا فرمایا تھا۔ اور دوسرا بموقع جشنِ تاجپوشی شہنشاہ جارج پنجم نے عطا کیا تھا۔

منشی پنا لال صاحب ماتھر ایم۔ اے۔ پرنسپل سیکر، قبلہ شاہ صاحب پر پروانہ وار فدا تھے اور شاہ صاحب بھی انھیں اپنا عزیز سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب کا قیام سیکر میں ماتھر صاحب کے ہاں تھا۔ ماتھر صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس خاکسار کے مکان پر ایک مالن پانی بھرا کرتی تھی۔ اس کو تنبیہہ کر دی گئی کہ حضور کے لئے نہا دھو کر اور پاک صاف کپڑے پہن کر پانی لایا کرے۔ لہٰذا وہ اسی احتیاط سے پانی لاتی تھی۔ ایک دن اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ اس کی لڑکی کے ایک پھنسی سینہ پر نکل آئی ہے جس سے مواد جاری رہتا ہے۔ ہر طرح کا علاج کرایا مگر وہ ٹھیک ہی نہیں ہوتی" مالن نے رو رو کر کہا: "حضور ڈر یہ ہے کہ یہ پھنسی بڑھ کر کہیں مہلک صورت اختیار نہ کر لے۔" اس وقت خاکسار کا رسوئیا نتھو رام بھی وہاں موجود تھا قبلہ نے دریافت فرمایا۔ "نتھو رام تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" اُس نے عرض کیا 'ہاتھ چولھے کی راکھ سے بھرے ہوئے ہیں'۔ ارشاد فرمایا۔ "اچھا! یہ راکھ ہی لگا دو"۔ اس نے عرض کیا "راکھ اُڑ جائے گی"۔ ارشاد ہوا، "گھی میں ملا کر لگا دو"۔ اس نے عرض کیا "گرمی کے باعث گھی پگھل جائے گا" شاہ صاحب نے ذرا برہم ہو کر کہا، "جب گھی بہنے لگے تو پونچھ دینا"۔ الغرض اس لڑکی کے جو کنٹھ مالا میں مبتلا تھی، راکھ گھی میں ملا کر لگا دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد حرارتِ بدنی اور موسمِ گرما کے باعث گھی بہنے لگا جب حسب الحکم اس کو پونچھ دیا گیا تو سب کو بے انتہا حیرت ہوئی کہ گھی تو صاف ہو گیا، مگر اس کے ساتھ موذی کنٹھ مالا کی پھنسی بھی غائب ہو گئی۔"

منشی عبدالغفار خاں، خلف منشی احم[د] خاں، سپرنٹنڈنٹ باغات جے پور عجیب مرض [میں] مبتلا تھے۔ جب دورہ پڑتا تھا تو ائمۃ اللہ کے یہ [؟] اور کئی کئی اشخاص کے قابو میں نہ آتے۔ ڈا[کٹر] اطبا اور وید صاحبان تشخیصِ مرض سے قاصر ر[ہے] تو منشی صاحب، قبلہ کی خدمت میں لائے گ[ئے] روز میں ہی مجنونانہ دورے بند ہو گئے۔ پھر ہز [ہائینس] مہاراجہ جے پور کی عنایت کے باعث وہ ولایت [سے] اعلیٰ تعلیم باغبانی حاصل کر کے اس محکمہ کے ا[علیٰ] عہدے پر فائز ہوئے۔

سیٹھ ترلوک چند نبیرہ، سیٹھ مہر چند جو[ہری] جے پور، کی اہلیہ اختناق الرحم میں مبتلا تھیں شدید دورے پڑتے تھے۔ شادی کے بعد بہ[ت] تک کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ڈاکٹروں کا متفقہ ا[ظہار] یہ تھا کہ اولاد ہونا ممکن ہی نہیں۔ سیٹھ جی تین بر[س] تک برابر قبلہ شاہ صاحب کے ہاں بہ تمنائے [اولاد] حاضر ہوتے رہے تو ایک روز آپ نے فر[مایا] "سیٹھ جی گھبراتے کیوں ہو، تمہارے اولاد [ضرور] ہو گی"۔ چنانچہ چند ماہ بعد ہی حمل قرار پا گیا۔ جب [اطمینان] اطمینان ان کے خاندانی معالج ڈاکٹر ہیلک ؟ [؟] نرلیشن جے پور سے معائنہ کرایا گیا اور ایکسر[ے] تو اس مشہور جرمنی ڈاکٹر کا قول یہ تھا "یہ علا[ج] معجزہ ہے"۔ سیٹھ جی کے تین بچے ہوئے اور [خدا] کے فضل سے سب زندہ و سلامت ہیں۔

شیخ عبدالرزاق عرف اچا میاں، جے پور محلہ بساطیان کے جو اولادِ نرینہ پیدا ہ[وتی] وہ ایک خاص مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو جا[تی] قبلہ شاہ صاحب کی توجہ فرمائی سے اُن کے فرزندان ارجمند اس وقت اپنے مرحوم با[پ کا کاروبار] سنبھالے ہوئے ہیں۔

پیش گوئیاں

منشی پنا لال ماتھر، سپرنٹنڈنٹ تعلیم ماسٹر ہائی اسکول سیکر (راجستھان) شا[ہ صاحب] پر اپنی جان تک قربان کرنے کو ہر وقت [تیار] رہتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ماتھر صاح[ب]

ہاں شاہ صاحب سیکر میں قیام فرما تھے۔ سیکر کے راؤ راجہ صاحب کے مصاحبِ خاص لالہ بالابخش، ہیڈ ماسٹر صاحب سے کچھ ناراض تھے، اس لئے انھوں نے سینئر آفیسر کپتان دیپ پر زور ڈالا کہ ماتھر صاحب سے سرکاری مکان خالی کرالیا جائے، جبکہ ایک سال ہی پہلے یہ مکان بڑی کوششوں کے بعد ماتھر صاحب کو الاٹ ہوا تھا۔ مکان خالی کرائے جانے کی خبر ماتھر صاحب نے قبلہ سے گوش گزار کی تو دریائے فیض و کرم اُمڈ آیا۔ آپ نے فرمایا ایسا جابر اپنے ہی مکان سے نکال دیا جائے گا، تمہیں کون نکال سکتا ہے؟ قدرت دیکھئے کہ ماتھر صاحب تو ریٹائر ہونے تک اسی مکان میں مقیم رہے مگر سیاسی مصلحت کی بنا پر چند ہی یوم بعد بالابخش صاحب کو حکم ہوا کہ سیکر سے تین سو میل دور باہر چلے جائیں۔

باقی آئندہ

کُلیاتِ محبوب — محبوب سیالکوٹی

سنہ ۱۹۸۴ء ۔ $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ ۔ ۱۵ روپے

ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ، حیدر آباد۔

مسیحی شاعر جناب محبوب سیالکوٹی، مقیم لندن کا شمار اُردو کے اچھے شعراء میں ہوتا ہے۔ آپ نے لندن کے اردو دانوں میں اپنی رُباعیات کا سکہ اس طرح بٹھا رکھا ہے جیسے حکومتِ انگلینڈ کا سکہ ہر جگہ اپنی ساکھ بنائے ہوئے ہے، آپ "کنگ آف رُباعیات" کہے جاتے ہیں۔

ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ، حیدر آباد دکن کے ڈائریکٹر جناب طالب شاہ آبادی کے زیرِ اہتمام محبوب سیالکوٹی کا مجموعۂ کلام "کلیاتِ محبوب" بڑے اچھے انداز میں شائع ہوا ہے۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی قابلِ تعریف ہیں۔ محبوب صاحب نے اس روایت کو جھٹلایا ہے کہ کسی شاعر کی کلیات اس کی موت کے بعد ہی شائع کی جاتی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ یہ محض مفروضہ ہے ورنہ ایسی کوئی وجہِ جواز نہیں ہے۔ محبوب صاحب کا فرمان ہے کہ پاکستان کے مشہور شاعر منیر نیازی نے بھی "کلیاتِ منیر نیازی" اپنے مجموعہ کا نام رکھا ہے۔ اور انھوں نے اس کی تصدیق فرمائی کہ کسی شاعر کی زندگی میں اُس کی کلیات کا شائع ہونا اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

"کلیاتِ محبوب" میں زیادہ تر غزلیں اور قطعات ہیں، اور کچھ رباعیات اور نظمیں۔ بقول جناب طالب شاہ آبادی محبوب صاحب کے کلام میں بے شمار اشعار ایسے ہیں جو دل پر اثر کرتے ہیں اور ذہن کو جھنجھوڑتے ہیں۔ "شجرۂ اخرب" کی ایک رُباعی ملاحظہ فرمایئے ؎

"ہر پیار کو بازار میں نیلام نہ کر
انسان کو اس طرح تو بے دام نہ کر
ہم رُوح کی آواز نہ پہچان سکیں
گمنام نہ کر۔ اور بھی بدنام نہ کر"

اور "شجرۂ اخرم" کی یہ دو رُباعیات بھی دیکھئے ؎

"کانٹوں میں کچھ پھول بھی پلتے ہیں ساتھ
دُکھ سُکھ سب معلوم یہ سہتے ہیں ساتھ
آپس میں انسان کے جھگڑے کم نہ ہوں
مِل جُل کر ہم لوگ بھی رہتے ہیں ساتھ"

"ہم پر تو الزام بڑے ہیں یارو
مشکل میں ہم لوگ پڑے ہیں یارو
اب جائیں بھی مگر جائیں کس جانب
دوراہے پر آج کھڑے ہیں یارو"

"کنگ آف رُباعیات" کی رُباعیات کے بعد اُن کے دو قطعے بھی پیشِ خدمت ہیں۔

"دوستی میں حساب کیا کرتے
اپنا سینہ کباب کیا کرتے
تیرا وعدہ بھی تیری مرضی ہے
ہم سوال و جواب کیا کرتے"

"عجب رسمیں چلیں سوداگرانہ
محبت آج کل، تاجرانہ
لباسوں میں چمک بس رہ گئی ہے
گیا غیرت بھرا پچھلا زمانہ"

محبوب صاحب غزل بہت اچھی کہتے ہیں۔ ایک غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

ہر کوئی دیوتا نہیں ہوتا — کوئی بندہ خُدا نہیں ہوتا
اپنے دل میں خدا کو رہنے دو — پتھروں میں خدا نہیں ہوتا
آنکھ جلوہ نمائی کرتی ہے — جلوہ جلوہ نما نہیں ہوتا
کام کی ابتدا تو ہوتی ہے — کام خود ابتدا نہیں ہوتا
اپنی اپنی زبان ہوتی ہے — کڑوا، میٹھا مزا نہیں ہوتا
جب ہو محبوب بات بے لذت — گفتگو میں مزا نہیں ہوتا

یہ کتاب دفترِ شانِ ہند میں بھی دستیاب ہے

سرور تونسوی

مزکہ مکتوب الیہ

محترم سرور صاحب، آداب!

کتاب کا شکریہ، بہت ہی دلچسپ ہے۔
جتنے واقعات آپ نے بیان فرمائے ہیں
وہ میری اپنی جانکاری میں رہے ہیں۔ اس لئے
زیادہ مزا دے رہی ہے یہ کتاب۔ میں اور کنور
صاحب اب بھی کبھی کبھی ان واقعات کا ذکر
کر کے ہنستے رہتے ہیں۔

کارِ خدمت ۔ آپ کا
کنھیا لال پوسوال

مکرمی ومحترمی

جے ہند!

شری جمنا داس اختر کا خط مجھے موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے "سرور تونسوی مجاہد ہیں، میں اُن کا معترف اور پرستار ہوں۔ اُن کی تصنیف قابلِ قدر ہے MERIT پر پوری اترتی ہے، وہ بہت اچھا لکھتے ہیں۔"

موجودہ ایڈیشن ختم ہونے پر سستا ایڈیشن شائع کرنے کا ارادہ نیک ہے۔ اس طرح یہ کتاب عوام تک بھی پہنچ سکے گی۔ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ آج کل میں اس کے بعض مضامین دوبارہ پڑھ رہا ہوں "حکیم چھیلا رام"۔ "ایک آنہ" "مندر سے کلیسا تک" ایسے واقعات ہیں جنھیں ہر خاص و عام تک پہنچایا جائے تو قومی یکجہتی میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یہ پُراثر واقعات درسی کتب میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن افسوس اس طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا۔

مخلص، طاؤس
نارنگ اسٹریٹ، فاضلکا (پنجاب)

مکرمی ومحترمی

آداب ونیاز!

"عصری ادب" کے اپریل ۸۰ء کے شمارہ نمبر ۵۸ میں ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے "آڑے ترچھے آئینے" میں اور پھر جولائی تا اکتوبر ۸۰ء شمارہ نمبر ۵۹ میں اسی عنوان کے تحت یکولرازم اور قومی یکجہتی کے نام پر مانگ کی کہ:

۱۔ "ہماری داستانیں" "سنگھاسن بتیسی" "رامائن" وغیرہ برعکس مذہبی تقاریب دُور درشن پر دکھائی جائیں، پیچھے کی طرف مڑ کر نہ دیکھا جائے۔
۲۔ سائنسی باتیں ہوں۔

میں نے انھیں شمارہ نمبر ۵۹ میں ڈاکٹر رکرشن بالی جموں کے خط کا حوالہ دیا ہے، جو انھوں نے اپریل ۸۰ء کے شمارہ نمبر ۵۸ میں "آڑے ترچھے آئینے" میں اٹھائے گئے سوال کے جواب میں ہے، میں نے لکھا ہے:۔

کسی ملک کی کوئی سنسکرتی، کلچر اور مذہب ہوتی ہے۔ ہماری داستانیں "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" "نل دمن" "رامائن" وغیرہ سنسکرت کی ایسی کتابیں ہیں جن کا ترجمہ متعدد زبانوں میں ہوا۔ سنگھاسن بتیسی وغیرہ تو جنوں، پریوں کی ہی باتیں ہیں لیکن رامائن تو ایک آدرش ہے۔

میں نے سخت محنت سے عربی، فارسی، اردو رامائنوں کی لسٹ تیار کی ہے اور مجھے اور بھی رامائنوں کا پتہ چل رہا ہے۔ یہ سب کچھ اگر کسی قابل نہ ہوتا تو ان کے تراجم نہ چھپتے۔ میرے چاہتا ہوں کہ انہیں دُور درشن پر دکھاؤں۔ جن جن ہندوؤں کو اردو کا دشمن بتایا جاتا ہے انہیں اُن کا درشن بھی دکھا دوں۔ کیا آپ ان مخطوطات، چھپی ہوئی، بالتصویر اور اکبر شاہ کے زمانے میں لکھی رامائنوں کو بھی دُور درشن پر دکھانا پسند نہیں کریں گے؟۔

فنونِ لطیفہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟۔

ڈاکٹر محمد حسن صاحب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہنا مشکل ہے کہ وہ کیا جواب دیں گے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے ایک بار اپنے پرچے میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کو فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ انھوں نے کسی مسلمان

مفتوں' اُردو صحافت کے نپولین بونا پارٹ تھے
تو آپ بھی اس میدان کے جنرل طارق ہیں
جنھوں نے اسپین فتح کرنے کے بعد کہا تھا کہ
"ہر ملک مُلکِ ما است کہ مُلکِ خدائے ماست" —
بلا شبہ' بہ کوئے یار...... لکھ کر آپ
نے صحافت کی ہر منزل سر کر لی ہے۔

خدا آپ کو خوش رکھے۔
احقر
وشوناتھ طاؤس

عالم کا پہلے اس موضوع پر چھپے مضمون کا
حوالہ بھی دیا تھا۔ وہ مضمون مجھے نہیں مل سکا
اور چونکہ ڈاکٹر صاحب کے پرچے کی اس کے بعد
کی کوئی کاپی دستیاب نہیں ہو سکی اس لئے
پھر ردِ عمل کا بھی پتہ نہیں چلا۔
میں آپ سے اسی سلسلہ میں رہنمائی
چاہتا ہوں۔

نیاز مند
رام لعل نابھوی

محترم المقام سرور صاحب!
جے ہند!
دلی جانے کا اتفاق ہوا تھا
آپ کے دفتر میں حاضری دی تو پتہ چلا کہ آپ
بمبئی تشریف لے گئے ہیں۔
آپ کی کتاب "بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ
گزر" کا اِن دنوں دلی کے ادبی وصحافتی حلقوں
میں بڑا چرچا ہے اور آپ سے اختلاف رکھنے
والے بھی آپ کی بے باک تحریروں اور پُرجوش
اندازِ فکر کی تعریف کر رہے ہیں "ناقابلِ فراموش"
کی اشاعت کے قریب تیس سال بعد ادبی
حلقوں میں اس قدر ہلچل پیدا کرنے والی کتاب
منظرِ عام پر آئی ہے۔ آپ کی تحریریں پہلے ہی
'شانِ ہند' میں چھپ کر داد وتحسین حاصل کر چکی
ہیں مگر مجموعی کتاب کا تأثر کچھ اور ہے۔ قاری
ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہے جہاں ماضی اور
حال کی کڑیاں ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ مضامین
جو اخلاقیات کا پہلو لئے ہوئے ہیں انھیں درسی
کتابوں میں شامل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ
نئی نسل سبق حاصل کر سکے۔ کتاب کی خوبصورتی
نے ہر کسی کو متأثر کیا ہے۔ میری رائے میں
اس کتاب کی کامیاب تخلیق پر آپ کو صحافت کا
ایک اور بڑا ایوارڈ ملنا چاہئے۔
مجھے بے تکلفی سے لکھنے کی اجازت
دیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر سردار دیوان سنگھ

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 November 1987

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنا لیا ہے، آپ یہاں تشریف لاکر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے

نور محمّدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 183/181 ای۔آر۔روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

دلچسپ تحریروں سے مزین
شانِ ہند
دہلی
دسمبر ۱۹۸۷
اندر کے صفحات میں
پڑھیے
فرد افسانہ نگار ڈاکٹر اودیسرن امان کی
بصورت تحریر
حسّاس عورت
ایک دلگداز کہانی

رجسٹرڈ نمبر (ڈی این) ۳۵۳
ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر
وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقامِ اشاعت دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"
ملت انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی "

قیمت فی شمارہ ـــــ چار روپے
قیمت سالانہ ـــــ چالیس روپے
لائف ممبری ـــــ پانچ سو روپے

ممالک غیر میں بذریعہ سمندری ڈاک Rs. 80.00
بذریعہ ہوائی ڈاک سعودی عرب
متحدہ عرب امارات اور کویت Rs. 150
انگلینڈ، ناروے، سویٹزرلینڈ Rs. 200
کناڈا، امریکہ Rs. 250

غزل

ابرؔ احسنی گنوری

حق کہکے کیوں اٹھاؤں ستمِ روزگار کے ۔۔۔ نقشے مری نظر میں ہیں منصورؔ و دار کے

مُرجھا گئے جو آکے دہن میں مزار کے ۔۔۔ خوش رنگ پھول تھے یہ کسی لالہ زار کے

میری خطائیں سرحدِ بخشش سے جا ملیں ۔۔۔ دامن میں آکے رحمتِ پروردگار کے

اب دیکھنا ہی کیا ہے مریضانِ عشق کا ۔۔۔ دُھندلے سے نقش ہیں ستمِ روزگار کے

تشویشِ برق، خوفِ قفس، فکرِ آشیاں ۔۔۔ دھڑکوں میں ہی گذر گئے دو دن بہار کے

تیری نگاہ اُف تری دیوانہ گر نگاہ، ۔۔۔ ہوش اُڑ رہے ہیں آج ہر اک ہوشیار کے

مہرِ امید گم ہے سیاہی میں یاس کی ۔۔۔ رُخ دیکھتا ہوں گردشِ لیل و نہار کے

ہوتا ہے سازِ روح میں اک حشر سا بپا ۔۔۔ کہتا ہے "پی کہاں" جو پپیہا پکار کے

جاتے ہیں سر جھکائے جو جنت کی قید کو ۔۔۔ مجرم ہیں سب یہ رحمتِ پروردگار کے

کیا شے ہے ابرؔ رازِ محبت بھی الاماں
گم ہو گئے حواس مرے رازدار کے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | کتاب کا خاصہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اداریہ

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا؟

عوام آج ہر سرکاری فرد کی یا غیر سرکاری ناز یبا حرکت کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہی ڈالتے ہیں اور وہ ایسا کرنے میں حق بہ جانب ہیں کیونکہ وہ آپ کو ہی اپنا رہبر اعظم سمجھتے ہیں۔

محترم وزیر اعظم ——!

ملک کے کروڑوں عوام کی اکثریت داس ہے کہ ملک کی وزارت عظمیٰ آپ کے ہاتھوں ے باوجود اس کے کہ آپ اکثر اوقات جلد تجربہ کاری نیز کچھ غلط مشوروں کے باعث ایسے اقدام کے مرتکب ہو جاتے ہیں جن سے آپ پر اں جان تک چھڑکنے والوں کو انتہائی مایوسی ہوتی ہے اور آپ کے یہ جاں نثار صمیم قلب سے خدا سے دعائیں مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو صحیح راستہ دکھائے اور یہ ملک آپ کے ہاتھوں میں ہر طرح محفوظ ہے۔

عوام کی اکثریت ایسا اس لئے چاہتی ہے کہ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اپوزیشن میں اول تو اتحاد ہو ہی نہیں سکتا اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو بھی جائے اور وہ پاور میں آجائے تو بھی کرسیوں

کی بندر بانٹ کے باعث بھی دونوں میں یہ ناپاک اتحاد پاش پاش ہو جائے گا۔ اور پھر عوام کو اس قومی اور ملکی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا جو جنتا پارٹی کی کارستانیوں کے باعث انھیں ایک مدت تک اٹھانا پڑا تھا۔

یہ مت سمجھئے گا کہ کانگریس اور اس کے نام لیواؤں کی اکثریت دودھ کے دھلے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی کانگریس میں ایسے ایسے گھاگ اور گرگ باراں دیدہ موجود ہیں جن کے سامنے اپوزیشن کا بڑے سے بڑا سورما بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ کانگریسیوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کا کیریکٹر اپوزیشن والوں کے مقابلہ میں انتہائی گرا ہوا ہے۔ مگر عوام بڑی برائی اور چھوٹی برائی کا مقابلہ کرتے ہیں اور وہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ ان کا وزیر اعظم راجیو گاندھی ہے اور اپوزیشن میں کوئی بھی ہستی ایسی نہیں جو راجیو گاندھی کا مدِ مقابل ہونے کی اہلیت رکھتی ہو۔

عوام کا وہ اعتماد و یقین جو انہیں آپ پر ہے تبھی قائم رہ سکتا ہے اگر آپ کی مرکزی کیبنٹ کے وزراء، صوبائی کانگریس وزارتوں کے وزراء، کانگریسی نیتا اور کانگریس کے بہی خواہ سب عوام سے رابطہ رکھیں اور ان کے دکھ درد کو ٹھنڈے دل سے سنیں اور جائز شکایات کو فوری طور پر دور کیا جائے۔ جہاں بھی پولیس یا کوئی سرکاری مشینری عوام کے لئے دردِ سر بن گئی ہو، وہاں کے اعلیٰ افسران اور متعلقہ وزراء ایسے انتظامات کریں کہ عوام کو راحت ملے۔

اس کا زندہ ثبوت آپ کے سامنے ہے اور وہ یوں کہ آپ نے حال ہی میں ملک بھر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں سے ذاتی رابطہ قائم کرنے کی جو مہم شروع کی ہے، اس سے اپوزیشن کی نیند حرام ہونے لگی ہے کیونکہ اپوزیشن والے سمجھتے ہیں کہ آپ ان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو عوام کو زیادہ سے زیادہ راحت پہنچانے اور عوام کی جائز شکایات کی فوری شنوائی کے لئے ہدایات دیں گے۔ جس سے عوام کا سرکار پر اعتماد قائم ہوگا اور یہی اپوزیشن والے نہیں چاہتے

ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہر کانگریسی گاندھی جی، پنڈت نہرو اور محترمہ اندرا گاندھی کے قومی اور ملکی تحفظ کے پیغام عوام تک پہنچانے کے لئے راجیو گاندھی کا سفیر بن کے اور گھر گھر جا کر عوام کو سمجھائے کہ گاندھی اور نہرو کا ہندوستان کس طرح محفوظ اور اکھنڈ رہ سکتا ہے۔

مگر۔۔

محترم وزیر اعظم ہند،

ہو یہ رہا ہے کہ آپ کے اکثر کانگریسی حضرات ایسی ایسی کمینہ حرکتیں کر رہے ہیں کہ جن سے بھولے بھالے عوام اور وہ دانشور (جو ابھی بھی) جو ایمان کی حد تک ہندوستان کا تحفظ آپ کے ہاتھوں میں محفوظ سمجھتے ہیں) آپ سے ناامید ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی یہ ناامیدی مایوسی میں بدلتی جا رہی ہے۔

یاد رکھئے جب بھی کوئی کانگریسی وزیر، کانگریسی نیتا، کوئی بڑا سرکاری آفیسر، پولیس، اپنے فرائض کو بھول کر ذاتی مفاد کی خاطر آپ کے احکام کی، کانگریس کے اصولوں کی، ملکی اور قومی مفاد کی یا قومی یک جہتی کے سنہرے اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے تو آپ کی وزارتِ عظمیٰ کو براہ راست تارپیڈو کرتا ہے۔ کیونکہ عوام آج ہر سرکاری فروگذاشت یا غیر سرکاری نازیبا حرکت کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہی ڈالتے ہیں اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں، کیونکہ وہ آپ کو ہی اپنا رہبرِ اعظم سمجھتے ہیں۔

اگر ہماری کمزور آواز آپ تک پہنچے۔۔ ہماری آپ سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ آپ جس طرح ملک بھر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں سے ذاتی رابطہ قائم کر کے عوام کو راحت پہنچانا چاہتے ہیں، اسی طرح ملک کے دانشوروں، اضلاع سے شائع ہونے والے چھوٹے اخبارات کے مدیران کرام، اور عوامی نمائندوں سے بھی ذاتی رابطہ قائم کرنے کے ذرائع اختیار کریں۔ تاکہ آپ کو ملک کے اصل حالات سے کما حقہٗ پوری واقفیت ملتی رہے۔ آپ کی یہ خفیہ ایجنسیاں، سرکاری ذرائع اور ذاتی مفاد کی خاطر آپ کی قربت کے خواہاں جنھیں عوام چمچے کہتے ہیں کسی مصرف کے نہیں ہیں۔

حکومتِ ہند کے کچھ ایسے معزز ارکان کی خدمت میں "شانِ ہند" جاتا ہے جو اردو زبان سے اچھی طرح واقف ہیں، اور وہ "شانِ ہند" کے اداریے پڑھتے بھی ہیں۔ اُن سے التماس ہے کہ جو کچھ مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا گیا ہے، ملک کے عوام کے یہ جذبات وزیر اعظم تک پہنچا کر، ملک اور عوام کی خدمت کریں۔

آپ کی کانگریس میں ایسے ایسے گھاگ اور گرگِ باراں دیدہ موجود ہیں جن کے سامنے اپوزیشن کا بڑے سے بڑا سورما بھی ٹھہر نہیں سکتا۔ کانگریسیوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جن کا کیریکٹر اپوزیشن والوں کے مقابلہ میں انتہائی گرا ہوا ہے۔ مگر عوام بڑی برائی اور چھوٹی برائی کا مقابلہ کرتے ہیں اور وہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ اُن کا وزیر اعظم راجیو گاندھی ہے اور اپوزیشن میں کوئی بھی ہستی ایسی نہیں جو راجیو گاندھی کا ... مدِ مقابل ہونے کی اہلیت رکھتی ہو۔

ترقیٔ اردو بورڈ کا مستحسن قدم

حکومت ہند نے اردو کی ترویج و
ناعت کے لئے جو سرکاری ادارے قائم کر رکھے
، ان میں ترقیٔ اردو بیورو، محترمہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
حبہ ڈائرکٹر بیورو ہٰذا کی دیانتدارانہ نیز ان تھک
ششوں کے طفیل جو خدمات انجام دے رہا
ے، اس کے لئے ہر اردو دوست کو حکومت
ممنون ہونا چاہئے کہ جس نے موجودہ ڈائرکٹر
احبہ کا انتخاب کر کے اس ادارے کو ایک فعّال،
ز اور کارآمد بیورو کی شکل اختیار کرنے کا
قع بہم پہنچایا۔

اس ادارے کا بجٹ لاکھوں روپیہ کا ہے
ہمیں یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ اس روپیہ کا
ح اور دیانتدارانہ مصرف جس قدر محترمہ فہمیدہ
صاحبہ کے عہد میں ہو رہا ہے، اتنا اس سے
، کبھی نہیں ہوا۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا
ا کہ ابو الفیض سحرؔ اور کئی دوسرے حضرات کے
اور دلی تعاون نے ڈائرکٹر صاحبہ کے ہاتھ
وط کئے اور یہ ادارہ اپنے مقاصد میں کامیابی
نزلیں درجہ بدرجہ طے کرتا ہوا اس مقام پر
ہے کہ آج ہمارے وزیر اعظم جناب راجیو
ھی، وزیر دفاع جناب کے سی۔ پنت، نیز
ت فروغ انسانی وسائل کے سربراہ
ب نرسمہا راؤ اس ادارہ کی کارکردگی پر اظہارِ
ردی فرما رہے ہیں۔

ڈائرکٹر صاحبہ ترقیٔ اردو بورڈ نے
ابھی اور اپنے رفقائے کار کی متفقہ رائے سے یہ
تجویز کیا کہ جنوبی ہند میں ترقیٔ اردو بیورو کی شاخ
اگر کھولی جائے تو جنوبی ہند میں اردو زبان کی
ترقی اور تحفظ ہو سکے گا۔ لہٰذا ڈائرکٹر صاحبہ کی یہ
تجویز وزارتِ متعلقہ نے منظور فرماتے ہوئے،
جنوبی ہند میں بورڈ کی شاخ کھولنے کی اجازت
دے دی ہے اور اہل جنوب کو وزارت فروغ
انسانی وسائل کی طرف سے نئے سال کے تحفہ
کے طور پر حیدرآباد میں بورڈ کی شاخ قائم کی جا رہی
ہے۔

ترقیٔ اردو بورڈ کے اس مستحسن قدم سے
اردو حلقوں میں یہ یقین پختہ ہونے لگا ہے کہ ہمارے
وزیر اعظم زبان اردو کے لئے اپنے دل و دماغ
میں نہ صرف نرم گوشہ رکھتے ہیں بلکہ اپنے قول و
فعل کو عملی جامہ پہنانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت
نہیں کرتے۔

خوشتر گرامی کی دلّی واپسی

کیا اردو اکادمی دلّی اپنے فرض کا احساس کریگی؟

اردو پرستوں کے لئے یہ اطلاع یقیناً
باعث مسرت ہوگی کہ جناب خوشتر گرامی بمبئی میں
ایک عرصہ تک علاج معالجہ کرانے کے بعد دہلی
واپس تشریف لے آئے ہیں۔

شدید ہارٹ اٹیک اور دیگر کئی امراض کا
مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بعد ڈاکٹروں نے انھیں
مشورہ دیا کہ اب چونکہ سوائے بڑھاپے کے انھیں
کوئی بیماری نہیں ہے اس لئے انھیں اپنے گھر دہلی
لوٹ جانا چاہئے۔ تاکہ دلی کی آب و ہوا ان کے
لئے ٹانک کا کام دے۔

خوشتر صاحب خدا کے فضل سے اس وقت
تراسی (۸۳) سال کے ہوگئے ہیں اور انھوں نے ڈاڑھی
رکھ لی ہے۔ ٹلگانن اسٹائل ڈاڑھی خوشتر صاحب
کے چہرے پر خوب بہار دے رہی ہے اور یوں
لگتا ہے کہ وہ بمبئی سے نہیں بلکہ لینن گراڈ میں کچھ
عرصہ رہنے کے بعد دلّی واپس آئے ہیں۔

ویسے خوشتر صاحب کہیں آنے جانے
سے معذور ہیں اور طویل علالت کے باعث
خاصے کمزور بھی ہوگئے ہیں۔ انھوں نے اپنے احباب
سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ ان کا اب
مستقل پتہ حسب ذیل ہے۔

سی۔ ۵۰۱۔ شیخ سرائے فیس ۱
(ایس ایف ایس) نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

بمبئی مرکنٹائل بینک کے زیر اہتمام کیمپ کی افتتاحی تقریب میں دائیں سے بائیں شری شمیم کاظم چیئرمین، مرکزی وزیر شہری ترقیات محترمہ محسنہ قدوائی اور بینک کے اگزیکیوٹو ڈائریکٹر مینجنگ ڈائریکٹر آر۔ جی رنگون والا۔

دولت کی دیوی لکشمی

ہندوستانی کلچر کی ہم آہنگی کی مظہر

ہندوستان میں دِشوکرما دِوس ہر دستکار کے لئے پوجا کا دن مانا جاتا ہے۔ اسی طرح لکشمی ہر بیوپاری کے لئے دولت کی دیوی ہے۔ چاہے بیوپاری کا مذہب کوئی بھی ہو۔ ہندوستانی کلچر کی ہم آہنگی کا ثبوت بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک (جسے مسلمانوں کا بینک کہا جاتا ہے) کے وائس چیئرمین پدم شری آر۔ جی رنگون والا نے مرکزی وزیر شہری ترقیات محترمہ محسنہ قدوائی کو چاندی کا سکہ پیش کیا جس پر لکشمی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ موصوف نے لکشمی کو دھن کی دیوی قرار دیا۔ محترمہ قدوائی صاحبہ ۲۸ دسمبر کو وگیان بھون میں نوجیوں کے ترمیمی کیمپ کا ادگھاٹن کر رہی تھیں جس کا اہتمام بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک نے انڈین ڈیولپمنٹ کے تعاون سے کیا۔ یہ کیمپ ۲ جنوری تک جاری رہے گا۔

اُردو اکادمی دہلی کی بددیانتی

ڈاکٹر جاوید وششٹ دِلی کالج سے ریٹائر ہو کر اب ... [illegible]

[illegible] سکریٹری مقرر [illegible]

[illegible]

۲۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی ایک کتاب "بحر المعانی" اسی سال یعنی ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی ہے جسے دلی اردو اکادمی نے مالی امداد دی ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کتاب کا مسودہ ۱۹۸۹ء یا اس سے زیادہ ... ۱۹۹۰ء سے پہلے اکادمی میں برائے حصول مالی امداد جمع کرایا ہوگا اور اس عرصہ میں بھی وہ ہریانہ میں مستقل رہائش رکھتے تھے۔

۳۔ اس تفصیل سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ جب "بحر المعانی" کا مسودہ دلی اردو اکادمی میں جمع کرایا گیا یا اس مسودہ کو منظور کیا گیا یا جس وقت مالی مدد دی گئی تو اس وقت ڈاکٹر جاوید وششٹ دہلی کے مستقل باشندے نہیں تھے اور دہلی کی سکونت عملی طور پر وہ ترک کر چکے تھے۔ بے شک دہلی کالج سے ریٹائرڈ ہونے سے پہلے دہلی میں مدتوں رہائش پذیر رہے۔

۴۔ جبکہ اردو اکادمی دہلی کا یہ دعویٰ ہے کہ جو بھی شخص اردو اکادمی دہلی سے کسی قسم کی بھی مدد کا طالب ہے اسے پچھلے دس سال سے دہلی کا شہری ہونا ضروری ہے اس سلسلہ میں جائز طور پر دریافت کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک شخص نے دہلی کی سکونت کو خیرباد کہہ کر دوسرے صوبہ میں اپنی مستقل رہائش اختیار کر لی ہو اور دوسرے صوبہ کی ایک نیم سرکاری بلکہ سرکاری باڈی کا باتنخواہ سکریٹری بھی مقرر کر دیا گیا ہو تو دلی اکادمی کے قواعد و ضوابط میں کون سی شق ہے جس کی رُو سے ایسے شخص کو اب بھی دلی کا مستقل باشندہ تسلیم کیا جا سکے۔

۵۔ "بحر المعانی" کو مالی مدد دے کر دلی اردو ...

شانِ ہند دہلی نومبر ۱۹۹۰ء

اکادمی نے اپنے قواعد و ضوابط کی محض یہی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ حسب ذیل روایات کو بھی طاقِ بدذوقی پر رکھ دیا۔

الف) اکادمی کی یہ شرط ہے کہ کتاب ڈیمائی سائز پر چھپنی ضروری ہے، مگر یہ کتاب عام کتابی سائز پر چھپی ہے۔ جبکہ اب تک اکادمی نے جتنی بھی کتابوں کو مالی مدد دی ہے وہ سب ڈیمائی سائز پر طبع ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ اکادمی کی اپنی مطبوعات بھی ڈیمائی سائز پر شائع ہوتی ہیں

ب) اکادمی جن کتابوں کو جزوی مالی مدد برائے اشاعت دیتی ہے اُن کو آفسیٹ طریقِ طباعت سے شائع کرنا ضروری ہے، مگر یہ کتاب لیتھو میں چھپی ہے اور ایسی بدزیب اور خراب چھپی ہے کہ اس سے زیادہ خراب کتاب چھپ ہی نہیں سکتی۔ اور تو اور جس پریس نے اسے چھاپا ہے اس نے اپنا نام تک اس کتاب پر دینا پسند نہیں کیا تاکہ اس پریس کا نام بدنام نہ ہو (حالانکہ پریس ایکٹ کی رُو سے یہ جرم ہے اور جس پریس نے یہ کتاب چھاپی ہے "اس پر اور ناشر دونوں پر پریس آفیسر دہلی مقدمہ دائر کرنے کے مجاز ہیں)

۶۔ اور یہ دونوں بے قاعدگیاں محض اس لئے روا رکھی گئیں کہ اس کتاب کی لیتھو کتابت اس وقت سے ہوئی رکھی تھی جب ڈاکٹر علیم ترقی اردو بورڈ کے ڈائریکٹر تھے۔ اس کا اعتراف جناب ڈاکٹر جاوید وششٹ صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ "سازِ انا البحر" میں فرمایا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اتنی بری چھپی ہے۔ اردو اکادمی ڈیمائی سائز کی آفسیٹ کتابت فی صفحہ تقریباً پونے نو روپے مصنف یا مرتب کو دیتی ہے۔ اب یہ بتانا ہمارے لئے مشکل ہے کہ اکادمی نے اس کتاب کی کتابت کی اُجرت کس حساب سے دی ہے۔ یعنی موجودہ وقت کی اُجرتِ کتابت یا اُس وقت کی جبکہ ڈاکٹر علیم (مرحوم) ترقی اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر تھے۔ اور وہ بھی لیتھو کتابت کی اُجرت دی ہے یا آفسیٹ کتابت کی۔ جس وقت ڈاکٹر علیم اُردو ترقی بورڈ کے ڈائریکٹر تھے اُس وقت ہم رسالہ "شانِ ہند" کے ایک صفحہ کی اُجرت تین روپیہ دیتے تھے جبکہ اس کتاب کے سائز سے "شانِ ہند" کے صفحہ کا سائز دوگنا ہے اور کتابت اس کتاب کی کتابت سے زیادہ نہیں تو کئی گنا بہتر ہوتی تھی۔ اسی طرح چھپائی کا کیا نرخ رہا ہوگا اور جلد بندی کی اُجرت کیا دی ہوگی۔ اور یہ بھی اردو اکادمی ہی بتا سکتی ہے کہ کتاب کے آخر میں دس صفحات کے جو اشتہارات ہیں اُن کی کتابت، چھپائی اور کاغذ کی لاگت کا تین چوتھائی روپیہ بھی اُس نے ادا کیا ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہ اشتہارات مسٹر سوبھاش کے ادارے کی مطبوعات کے ہیں۔ مسٹر سوبھاش کے بارے میں ڈاکٹر جاوید وششٹ صاحب نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ فرشتہ آسمان سے اُترا اور اُن کی یہ کتاب محض اسی فرشتہ کے طفیل منصۂ شہود پر آ سکی۔

جاری ہے

غزل

انور جلالپوری

دلوں میں زخم لبوں پر ہنسی زیادہ ہے
ہمارے عہد میں بے چہرگی زیادہ ہے

سبھی لبوں پہ تبسم سجائے ہیں لیکن
جو شہر دل ہے وہاں تیرگی زیادہ ہے

یہیں پہ صبح پتنگوں کی لاش پاؤ گے
اسی گلی میں جہاں روشنی زیادہ ہے

خزاں گر آئی تو پہلے اسی کو چھین لے گی
وہی جو شاخ شجر پر ہری زیادہ ہے

ابھی محاذ پہ جانے کی بات مت کرنا
ابھی تمہاری صفوں میں کجی زیادہ ہے

یہی ہے صبر کا مفہوم جاننے کی گھڑی
کہ دوستوں میں ابھی بددلی زیادہ ہے

آخری برائی

ساحر لدھیانوی

شراب بند کرو اب یہی برائی ہے
کہ جس سے ملک کی عزت پہ حرف آتا ہے

فساد بند ہوا لوٹ مار بند ہوئی
ہر ایک رسم جو تھی ناگوار بند ہوئی
مکان بن گئے بے گھر سپاہیوں کے لئے
لباس مل گئے ننگی گداگیوں کے لئے
وطن میں حسرت بے روزگار کوئی نہیں
وہ منصفی ہے کہ شکوہ گزار کوئی نہیں
کوئی مریض ترستا نہیں دوا کیلئے
کوئی ضعیف بھٹکتا نہیں عصا کے لئے
ستم کا غم کا جہالت کا دور ختم ہوا
تمیز بندہ و آقا مٹی سب ایک ہوئے
وزیر خادم ملت رئیس نیک ہوئے

شراب بند کرو اب یہی برائی ہے
کہ جس سے ملک کی عزت پہ حرف آتا ہے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

اپنے دل سے کدورت نکالو ذرا، میرا دل بھی ادھر صاف ہو جائے گا
ایک آنسو جو سچی ندامت کا ہو، دو دلوں کو بیک وقت دھو جائے گا

راہ تیری یہ تخریب کی راہ تھی، کچھ نہیں تھا یہاں ظلمتوں کے سوا
منسلک جو اجالا ترے دم سے تھا، وہ اجالا یہاں آکے کھو جائے گا

کیا پتہ تھا جو تکیہ کیا آپ پر، بارِ احساس بن جائے گا ایک دن
قتل و غارت سے تر آئیگا اس طرح، آہ و زاری سے دامن بھگو جائے گا

کب تک برہمی کب تک خفگیاں، تابہ کے انحراف وجودِ زیاں
ایک جھونکا جو آنے کو ہے اس طرف، پریم مالا میں سب کو پرو جائے گا

چلتے چلتے یہاں کچھ نہیں دوستو، چلتے چلتے کبھی تو بہار آئیگی
بوجھتے سوجھتے، سوجھتے بوجھتے، دیکھ لیں گے اسے آگے جو آئے گا

کون ہے جو حیاتِ بشر کو یہاں، بخش دے زندگی عمر بھر کے لئے
کون ہے جو محبت کے اخلاص کے، دیدہ دانستہ ہی بیج بو جائے گا

ایک وقت آئیگا، ایک وقت آئیگا، دیکھنا آئیگا کہہ رہے ہیں حقیر
اس تشنہ دکو بھی نیند آجائیگی، دیکھنا یہ تشنہ دبھی سو جائے گا
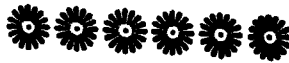
702, Gold Crown
J P Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

مزاح نگاری اور دیانتداری

ممتاز مزاح نگار جناب دلیپ سنگھ سے گفتگو

انٹرویو:- عطا محمد اور غوث الدین
نمائندگان:- روزنامہ "منصف" حیدرآباد

"مزاح" لکھنے کے میرے دو اصول ہیں۔ پہلا تو مکمل دیانتداری سے کام لینا، اور دوسرا، ہمیشہ کوئی نیا پن تلاش کرنا چنانچہ میں اپنی تحریروں میں کسی کا لحاظ کئے بغیر پوری دیانتداری سے اس کے تعلق سے سچ سچ لکھ دیتا ہوں اور نئے پن کے تعلق سے میں یہ کہوں گا کہ گذشتہ دو سال کے دوران میں نے ریڈیو پر ہو یا کسی محفل میں، جو بھی لطیفے سنائے اُن میں سے کوئی کسی کتاب، یا کسی اور شخص کا تیار کردہ نہیں تھا بلکہ وہ صرف میرے اپنے ساتھ اور میرے ارکانِ خاندان کے ساتھ پیش آنیوالے دلچسپ واقعات ہیں جس کے نتیجہ میں کبھی بھی، کوئی بھی، یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ یہ لطیفہ پہلے سُن چکا ہے"

انھوں نے کہا کہ وہ یاروں کے یار ہیں اور وہ بے حد محبت کرنے والا دل رکھتے ہیں لیکن فطرتاً کھری بات کرنے میں کسی کا لحاظ نہیں رکھتے ہیں۔ ان کا بہترین دوست بھی اگر گھٹیا ادیب ہے تو اس کے مُنہ پر کہہ دیتے ہیں کہ وہ اچھا ادیب نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک اس سے دوستی اور محبت کی بات ہے اُن کی جانب سے کوئی فرق نہیں آتا۔ مسٹر دلیپ سنگھ نے کہا کہ وہ تحریریں معیاری بھی قرار نہیں دی جاسکتیں جو دیانتداری سے بالکل سچ پر مبنی نہ ہوں۔ چنانچہ کسی شخصیت پر اُن کے لکھے ہوئے خاکے بھی حقائق اور سچ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ خاکے لکھنے کی طرف مائل نہیں ہیں اور اگر لکھ بھی دیتے ہیں تو اس کے لئے ایسے اشخاص کا انتخاب کرتے ہیں جو دلچسپ ہیں، ایسے لوگوں پر خاکہ لکھنے میں خاکہ نگار کو مزہ بھی آتا ہے۔ وہ خاکے شادیوں میں پڑھے جانے والے 'سہروں' کی طرح لکھنا نہیں چاہتے جس میں دُولھا چاہے کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو، اُس کی تعریف کے پل باندھ دیئے جاتے ہیں۔ طنز و مزاح لکھنے کے لئے موضوعات کی کمی نہیں۔ خود ہمارا سیاسی و سماجی نظام، روزمرہ ہمیں حل کر پریشان کرنیوالے مسائل وغیرہ کی کمی نہیں۔ لیکن وہ موضوع میں نیا پن تلاش کرتے ہیں۔ اُن کے دفتر کے ساتھی ان سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ دفتر کے ماحول پر مضمون لکھیں لیکن انھیں وہاں کی زندگی مشینی دکھلائی دیتی ہے جہاں سب چابی بھرنے سے چلتے ہیں۔ ہاں رشوت لینے کے لئے کوئی نیا طریقہ اپنانے والا ملازم اُن کا موضوع بن سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی نئے انداز سے بھیک مانگنے والا بھکاری بھی اُن کی توجہ کا مرکز بن سکتا ہے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں یہ سب فن کار ہیں کسی مجبوری کے تحت اس کاروبار میں پھنس گئے ہیں۔

جناب دلیپ سنگھ جو گجرانوالہ (پاکستان)
، ایک دیہات "راسکے جیٹھا" میں پیدا ہوئے
چوتھی جماعت تک وہیں تعلیم حاصل کی اور
یم ہند کے موقعہ پر دہلی منتقل ہوئے اور
ں اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور انگریزی
ں سے ایم۔اے کیا۔ انھوں نے بتایا کہ طنز
ح کی جانب راغب کرنے والے ان کے
محترم اور نانا جان سردار بھاگ سنگھ ہیں
کے والد کسان تھے اُن کی بہت بڑی زمینداری
اُن کے نانا سنہ ۱۹۰۰ء کے گریجویٹ تھے اور
۱۹۰ء میں انھوں نے وکالت میں کامیابی حاصل کی تھی
تاید اپنے دیہات کے پہلے گریجویٹ تھے
ں مزاح نظم کرنے کا ملکہ حاصل تھا وہ فطری
یہ زاح کی جانب راغب ہو گئے۔ انھوں نے
ذ یہ جو پہلا خاکہ پڑھا وہ اپنے نانا پر تھا۔ اُن
نانا اور والد دونوں اس خاکے سے بے حد
تس ہوئے اور کہا کہ
ی باتیں خاکے کے لئے موضوع بن سکیں اور
ال ظاہر کیا کہ جو اپنے ماں باپ کی ہنسی اُڑاتا
دنیا میں اسے کسی کی بھی ہنسی اُڑانے کا حق
ل ہے۔ دلیپ سنگھ نے کہا کہ اپنے بزرگوں
باب سے اس ہمت افزائی نے مجھ میں
اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ مسٹر دلیپ سنگھ نے کہا
ن کا لکھنے کا مقصد اوروں سے علیحدہ رہا۔
انے کبھی نام، انعام، یا حسین ساگر پر اپنا
بگولے کے لئے مضامین نہیں لکھے۔ اُن کی
ہش و کوشش رہی کہ اُن کی تحریریں بڑی
یں قارئین تک پہنچیں اور اُردو رسائل و جرائد
راد عام طور پر ہزار تا دو ہزار کے درمیان رہتی
اور ان رسائل کے بڑے نخرے بھی ہوتے
طبوعہ مضامین نہ روانہ کئے جائیں " "یہ مضمون کسی
ج کے لئے نہ روانہ کیا جائے" وغیرہ وغیرہ۔
انھوں نے اپنی تخلیقات کی پیش کش کے
ڈیو کو اپنا ذریعہ بنایا۔ ان کے بعض ساتھی
یڈیو کے لئے لکھنا گھٹیا بات سمجھتے تھے۔
ن کا تذکرہ بھی مضحکہ اڑانے والے انداز میں

"وہ دلیپ سنگھ جو ریڈیو کے لئے لکھتے ہیں"
کہتے ہوئے کیا جاتا تھا
مسٹر دلیپ سنگھ نے کہا کہ وہ اپنے اظہار
کے لئے صرف طنز و مزاح کے مضامین ہی نہیں
بلکہ موضوع کی مناسبت سے کہانی، ڈرامے، حتیٰ
کہ مزاحیہ نظم، کسی بھی صنف کا استعمال کر لیتے
ہیں۔ پھر اپنے کچھ ساتھی ادیبوں کے اصرار
پر کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے تحفظ کا بھی
انتظام ہونا چاہئے تو انھوں نے اس کے بعد
"شاعر" "آج کل" اور "شگوفہ" وغیرہ کے
لئے لکھنا شروع کیا۔

انھیں اپنا عام قاری بہت عزیز ہے
پاکستان میں طنز و مزاح بہت ترقی پا رہا
ہے۔ وہاں اس کا معیار ہندوستان کے
مقابلے میں کافی بلند ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ
بالکل غلط ہے۔ اچھے لکھنے والے، غیر معیاری
لکھنے والے دونوں ملکوں میں موجود ہیں۔ پاکستان
میں مزاح کی ترقی کی باتیں کرنے والوں کے لئے
ایک لطیفہ سنایا جا سکتا ہے وہ یہ کہ کبھی
ریڈیو دہلی سے دہلی اور جالندھر دونوں کے لئے
پروگرام تیار ہوتے تھے اور جالندھر کے لئے بھی
پروگرام دہلی سے ٹیپ کر کے بھیجا جاتا تھا اور
وہ (دلیپ سنگھ) دونوں مقامات کیلئے لکھتے
تھے۔ لیکن ان کے بعض دوست جو اس بات
سے ناواقف تھے ان سے یوں کہا کرتے تھے کہ
یار، ان دنوں ریڈیو جالندھر تو دھوم مچا رہا ہے
اس نے ریڈیو دہلی کو پیچھے چھوڑ دیا وغیرہ"
نئے لکھنے والوں کو مسٹر دلیپ سنگھ نے
کہا کہ انھیں ضرور لکھنا چاہئے خصوصیت
سے حیدر آباد جیسے شہر میں جہاں ادیبوں کی
خوب قدر ہوتی ہے لیکن وسیع مطالعہ کے
ذریعہ ہی قابلیت میں اضافہ کرنا چاہئے۔ مسٹر
دلیپ سنگھ نے کہا کہ اس میدان میں صرف
اقربا پروری، اپنے گروہ، علاقہ کے لوگوں کی ہمت
افزائی کا رجحان نہایت خطرناک ہے اور لکھنے والوں
کا بھی کسی سے دب کر اپنے مفادات کے پیش نظر

سچی بات نہ لکھنا نامناسب ہے اور یہی بات
کسی بھی ادب کو غیر معیاری بناتی ہے۔
مسٹر دلیپ سنگھ جنھیں اپنے ٹی وی
سیریل "تصویر کا دوسرا رُخ" کے ذریعے ملک
گیر شہرت ملی۔ ایسے ٹی۔وی ناظرین جو ادبی
رسائل وغیرہ کا مطالعہ نہیں کرتے وہ بھی اُن
سے اچھی طرح واقف ہو گئے اور ان کے پرستار
ہو گئے۔ انھوں نے بتایا کہ اُن کا ایک اور ٹی۔
وی سیریل "عجیب مصیبت ہے" کے بھی چار
حصے تیار ہیں، کبھی بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایک
اور سیریل "سویرے سویرے" اداکار ٹی۔پی
جین، ڈائریکٹ کر رہے ہیں۔ دلیپ سنگھ نے کہا
کہ اُن کے خیال میں ان کے سیریل کو زبردست
شہرت ملی، خوب پسند کیا گیا۔ اخبار میں ٹی وی
کالم لکھنے والے کالم نگاروں میں چند ایک نے
بہت تعریف کی، چند ایک نے تنقید کی۔ لیکن
انھوں نے کالم نگاروں کو کبھی بھی اہمیت نہیں
دی کیونکہ وہ بخوبی واقف ہیں کہ یہ کالم نگار پروگرام
دیکھے بغیر ہی تنقید کرتے ہیں۔ مضحکہ خیز بات یہ
ہے کہ ایک کالم نگار نے ان کی سیریل کے تعلق
سے لکھا کہ اس میں تمام "سکھ جوکس ہیں" اب
کوئی یہ بتلائے کہ یہ سکھ جوکس کیا ہوتے ہیں کچھ
کچھ نے یہ لکھا کہ تصویر کا دوسرا رُخ، سیریل کے
آغاز پر یہ کہا گیا تھا کہ ٹی وی پر تنقید کی جائے گی
لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اب معلوم نہیں
تنقید کا مطلب انھوں نے صرف گالیاں دیدینا
ہی تو نہیں نکال لیا۔
جناب دلیپ سنگھ نے ٹی وی سیریل
کے لئے نئے اسکرپٹ رائٹرز کو موقع نہ ملنے کے
تعلق سے کہا کہ یہاں نامور رائٹرز کو بھی اسکرپٹ
منظور کروانے کے لئے مسلسل کوشش کرنی
پڑتی ہے کیوں کہ ارباب مجاز کی بھی کچھ مجبوریاں
ہیں۔ ٹی وی فلم کے پروڈیوسر کے ناموں کے
رجسٹریشن کی آخری تاریخ کو انھوں نے دیکھا کہ
کوئی ہر روز ہی (۴ تھیلے) درخواستیں موصول
ہوئی تھیں۔

روح کو سرشار اور ایمان کو تازہ کرنے والے واقعات

گوشۂ تصوف
عقیل صدیقی

اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں کو عجب کمالات سے نوازتا ہے۔ ایسے کمالات جو عام انسانوں کی فہم سے بالاتر ہوں مگر اس کے لئے جو کل عالموں کا مقتدر اعلیٰ ہے کوئی بات ناممکن نہیں

تیسری قسط

ابراہیم الخواصؒ

تاریخ کی روشن ترین ہستیوں ایک بزرگ کی سوانح مبارک

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کشف المحجوب	تذکرۃ الاولیاء	نفحات الانس	سفینۃ الاولیاء	انوار الاولیاء
شیخ علی ہجویری	شیخ فریدالدین عطار	عبدالرحمٰن جامی	داراشکوہ	صبغۃ اللہ شاہ

آپ دبے پاؤں غار میں داخل ہوگئے۔ ظالم ظلم میں منہمک تھا، وہ آپ کے پہنچنے کو محسوس بھی نہ کرسکا۔ آپ نے اُٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کر اس کی کمر پر گھٹنے کی شدید ضرب لگائی۔ اس اچانک حملے سے وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا آپ نے اُسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اور اس وقت تک ٹھوکریں مارتے رہے جب تک وہ بیہوش نہ ہوگیا۔ پھر آپ نے رسّی کھول کر لڑکی کو آزاد کیا اور اسی رسّی سے اس ظالم کو باندھ دیا۔ لڑکی ابھی تک ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ آپ ہی نے اسے مخاطب کیا "تم اس ظالم کے ہاتھ کس طرح آگئیں"؟

لڑکی نے بڑی وضاحت سے مترنم آواز میں جواب دیا "میرا نام نابغہ ہے۔ میرے والد بغداد کے ایک معزز تاجر ہیں۔ یہ ظالم جو بندھا پڑا ہے میرے والد کے دوستوں میں سے ہے۔ ایک زمانے سے اُس کے یہاں ہمارا آنا جانا تھا۔ اس کی سوتیلی بیٹی میری سہیلی ہے۔ آج میں خرید و فروخت کے لئے نکلی تو بازار میں اس سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے اصرار کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ اس کے گھر کچھ دیر کے لئے جاؤں اور شربت پی کر واپس آجاؤں میرے پاس فرصت تھی چلی گئی۔ گھر پہنچے تو اس ظالم کی بیوی گھر پر موجود نہ تھی۔ ہمیں اس نے دیکھا تو اپنی بیٹی کو حکم دیا کہ وہ اپنی ماں کو بلا کر لے آئے وہ مجھے شربت پلا دے گا۔ اس نے مجھے ایک شربت کا گلاس بنا کر دیا جو میں نے پی لیا۔ اس ظالم کو میں بچپن سے چچا کہتی ہوں اور اُس نے بھی مجھے آج سے پہلے بیٹیوں جیسا ہی پیار دیا تھا۔ شربت پی کر میرا سر چکرانے لگا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میں گھوڑے پر تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟ میرے سوال کا اس نے کوئی معقول جواب نہیں دیا تو میں نے چیخنا شروع کر دیا۔ مجھے خاموش کرنے کے لئے اس نے مارا بھی اور چٹکیاں بھی بھریں مگر میں مدد حاصل کرنے کے لئے شور مچاتی رہی۔"

آپ نے لڑکی کی روداد سن کر کہا۔ چلو میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔ سورج غروب ... صاحب آپ لڑکی کو لے کر غار سے نکلے ... رسی کے گھوڑے پر آپ نے لڑکی کو ... کیا اور خود ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ اذان ...

کچھ پہلے آپ نہاوند پہنچے۔ نابغہ کے والد بے حد پریشان تھے۔ بیٹی کی گمشدگی ان کے لئے عزت و آبرو کا مسئلہ بن گئی تھی۔ اور اب وہ خودکشی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ بیٹی کی واپسی سے انھیں دلی مسرت ہوئی لیکن اپنے دوست ربیعی کی بد باطنی کا حال سن کر انھیں اپنے اعتبار کی لاش کاندھوں سے تار کر پھینکنا پڑی۔ آپ کے سامنے اُس نے دولت کا ڈھیر کر دیا اور پھر اصرار کیا کہ اسے قبول کرلیں۔

آپ نے انعام قبول نہ کرتے ہوئے کہا۔

"ایک آبرو یا ایک جان کو بچانا میرے فرائض میں شامل ہے اور اہلِ ایمان پر یہ فرض اللہ تعالیٰ نے عائد کیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ فرض تو اللہ تعالیٰ کا ادا کروں اور اس کی جزا آپ سے وصول کروں' یہ کیسے ممکن ہے؟ اور میں کھانے کا سودا بھی نہیں کرتا۔ آپ جو کچھ دے رہے ہیں یہ آپ کی حیثیت کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی حیثیت سے سرفراز فرمائے گا۔ اللہ کا شکر ادا کیجئے کہ اس نے آپ کو ایک بڑے صدمہ سے بچا لیا۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ اگر میرے پاس فرصت ہوتی میں آپ کے یہاں ضرور قیام کرتا۔ اب آپ حکومت کی انتظامیہ سے رجوع کریں اور ربیعی کو اس کے جرائم کی سزا دلوائیں۔ میں جس غار میں اُسے چھوڑ کر آیا ہوں' اُس کی نشاندہی اور حالات کی گواہی بھی میرے لئے زحمت نہیں ہوگی' مگر میرے سفر ہی میں پڑا ہے۔"

نابغہ کے والد آپ کے ساتھ صاحب شرطہ کے پاس پہنچے اور تمام تفصیلات سے اُسے آگاہ کیا۔ نہاوند میں اب تک اٹھارہ لڑکیوں کی گمشدگی صاحب شرطہ کے لئے دردِ سر بنی ہوئی تھی۔ صاحب شرطہ چند سپاہیوں کے ساتھ فوراً ربیعی کی گرفتاری کے لئے ساتھ ہو لیا۔ شام سے پہلے دن رہتا۔ گھوڑوں پر آپ کی رہنمائی میں سب وہاں تک پہنچ گئے' اور وہاں ایک دل ہلا دینے والا منظر دیکھا۔ گدھ' ربیعی کے مردہ جسم کو اُدھیڑ اُدھیڑ کر کھا رہے تھے۔ اس کے جسم پر برائے نام گوشت باقی تھا۔ اس عبرت انگیز انجام کو دیکھ کر عدلِ الٰہی کا قصیدہ پڑھتے ہوئے سب غار سے نکل آئے۔ آپ سب سے رخصت ہو کر منزل بہ منزل تکریت' حلوان اور جلولا سے گزرتے ہوئے مدائن پہنچے۔ کسی زمانے میں یہ کسریٰ کی سلطنت کا دارالحکومت تھا اور یہیں سے وہ فارس اور عراقِ عجم پر فرمانروائی کرتا تھا۔ یہ شہر وسیع اور کشادہ ہونے کے علاوہ سرسبز و شاداب بھی تھا مسجد الشہداء میں آپ نے اعتکاف کیا۔ یہ مسجد گنجِ شہیداں کے مغربی کنارے پر ہے۔ گنجِ شہیداں میں وہ شہداء مدفون ہیں جو سنہ ۱۶ھ کے پہلے حملہ میں شہید ہوئے تھے۔ اُن میں سے اکثر گروہِ صحابہؓ سے تعلق رکھتے تھے۔

اعتکاف کی وہ گیارہویں شب تھی جب آپ نے دیکھا کہ مسجد نورانی چہرے رکھنے والے افراد سے معمور ہو گئی' فضا منور اور معطر ہو گئی۔ آپ نے حاضرین کو سلام کیا تو جواب صرف ایک نے دیا۔

آپ جا کر انھیں کے پاس بیٹھ گئے اور سوال کیا۔ "آپ کی تعریف؟"

"ابراہیم ہم کون ہیں' یہ بات جاننا سردست تمہارے لئے غیر ضروری ہے۔ آج رات ہم باجماعت عبادت کریں گے۔ جن لوگوں کو تم اس وقت اپنے اطراف دیکھ رہے ہو' یہ اخیار افراد ہیں جن کی معیت تمہیں بامراد کر دے گی۔ تمہاری زندگی میں ایسا انقلاب آجائے گا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان میں ہر فرد کسی نہ کسی اعلیٰ کمال روحانیت سے متصف ہے۔ ان سب میں جو کمالات انفرادی طور پر موجود ہیں' انشاء اللہ' اذانِ فجر تک تم ان تمام کمالات کے جامع ہو جاؤ گے۔ یہ مخصوص رات اللہ کے فضل سے فضل سے عطا ہوئی ہے۔ تم نے محبتِ خلق سے خالق کی محبت کا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔ اب تم اس نعمتِ عظمیٰ کے لئے پہلے تنہا دوگانہ شکرانہ ادا کرو اور پھر بقیہ رات ہمارے ساتھ عبادت میں بسر کرو۔"

آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور شریکِ عبادت ہو گئے۔ آپ کو اتنا ضرور یاد رہا کہ ان حضرات کے ساتھ مصروفِ عبادت ہوئے۔ اس کے بعد آپ پر کیف و سرور اور جذب و کشش کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ یہ پتہ ہی نہ چلا کہ رات کس طرح بیت گئی اور مقدس گروہ کے افراد کب چلے گئے۔ مؤذن نے اذانِ فجر دی تو آپ کے سکر نے منزلِ صحو میں قدم رکھا۔ آپ جھومتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھے تازہ

آپ نے "بسم اللہ" کہہ کر دریا میں قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے دریا کا پانی منجمد ہو گیا ہو۔ آپ بڑھتے چلے گئے۔ متلاطم دریا میں برف کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے آپ نے دریا پار کر لیا۔
اس منظر کو دونوں کناروں سے سینکڑوں افراد نے حیرت سے دیکھا۔ آپ کنارے پر پہنچے تو ہر طرف سے لوگوں نے گھیر لیا۔
آپ نے دل میں سوچا کہ اللہ کی مخلوق سے پیچھا چھڑانا اب اتنا آسان نہیں ہے۔ نادانستگی میں ظہورِ کرامت نے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا ہے۔ کاش میں ان کو نظر ہی نہ آؤں۔ یہ خیال آیا ہی تھا کہ لوگوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ "ہائے بدنصیبی' اللہ کا دلی روپوش ہو گیا' ہم قدم بوسی کی سعادت سے بھی محروم ہو گئے!"

وضو کیا اور نمازِ فجر ادا کی۔ نماز کے بعد پیش امام اور نمازیوں نے بڑھ کر آپ کی دست بوسی کی۔ حالانکہ آپ گیارہ دن سے مسجد میں معتکف تھے مگر اس عرصہ میں کسی نے آپ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا۔ اب آپ کی ذات میں ایسی کشش پیدا ہو گئی تھی کہ آپ کو نظر انداز کر کے گزر جانا کسی کے اختیار میں نہ رہا تھا۔

مسجد الشہدا میں اکیس دن کا اعتکاف پورا کرنا مشکل ہو گیا۔ خلقتِ خدا کا ہجوم ہمہ وقت رہنے لگا۔ کبھی کبھی کوئی حرفِ نصیحت زبان پر لاتے تو لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔ آپ خاموش ہو جاتے تو لوگ دیدار کی دولت ہی دامنِ نظر میں سمیٹتے رہتے۔ آپ کی خلوتیں محفل بن چکی تھیں۔ جہاں آپ کا خیال پہنچتا وہاں کا منظر اس طرح دیکھا کرتے جیسے خود اس منظر میں موجود ہوں۔ اعتکاف کی تکمیل کے بعد جب آپ مدائن سے چلے تو اہلِ مدائن نے رو رو کر وہیں قیام کے لئے اصرار کیا لیکن آپ اُن سے معذرت کر کے دریائے دجلہ کے کنارے پہنچے۔ دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچانے والی کشتیاں ساحل سے بندھی ہوئی تھیں۔ کوئی ملاح اس طوفان میں کشتی لے کر جانے پر آمادہ نہ تھا۔ آپ نے بسم اللہ کہہ کر دریا میں قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے دریا کا پانی منجمد ہو گیا ہو۔ آپ بڑھتے چلے گئے۔ متلاطم دریا میں برف کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے آپ نے دریا پار کر لیا۔ اس منظر کو دونوں کناروں سے سینکڑوں افراد نے حیرت سے دیکھا۔ آپ کنارے پر پہنچے تو ہر طرف سے لوگوں نے گھیر لیا۔ آپ نے دل میں سوچا کہ اللہ کی مخلوق سے پیچھا چھڑانا اب آسان نہیں ہے۔ نادانستگی میں ظہورِ کرامت نے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا ہے۔ کاش میں ان کو نظر ہی نہ آؤں یہ خیال آیا ہی تھا کہ لوگوں نے چیخنا شروع کر دیا "ہائے بدنصیبی! اللہ کا ولی روپوش ہو گیا۔ ہم قدم بوسی کی سعادت سے بھی محروم رہ گئے۔"

آپ ان کے درمیان سے نکلتے چلے گئے کچھ دور جا کر ظاہر ہونے کا ارادہ کیا تو ظاہر ہو گئے اور سجدۂ شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی مقبولیت عطا کی کہ اُن کی خواہش فوری طور پر پوری ہو جاتی ہے۔ سجدہ سے فارغ ہو کر آپ نے اپنی راہ لی اور یہ فیصلہ بھی کیا کہ خواہشوں کی نگہداری کریں گے ورنہ کرامات کا ظہور دردِ سر بن جائے گا، تنہائیاں چھن جائیں گی اور کیفِ عبادت جاتا رہے گا۔

آپ بغداد پہنچے۔ نمازِ عصر مسجد جنیدؒ میں حضرت جنیدؒ بغدادیؒ کی اقتدا میں ادا کی۔ نماز کے بعد مصافحہ کے لئے آپ حضرت جنیدؒ کے سامنے پہنچے تو انھوں نے اٹھ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا "ابراہیمؒ! تم نے تو راستہ ہی میں ساری منزلیں طے کر لیں۔ ماشاء اللہ! کتنا منور ہے تمہارا قلب اور کتنا روشن ہے تمہارا ضمیر! اللہ تعالیٰ یہ علوئے مرتبت قائم و دائم رکھے۔"

معانقہ کے بعد انھوں نے آپ کو محبت سے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ وہ اولیائے وقت کے سرخیل تھے۔ اُن کی زبان معرفتِ حق کی ترجمان تھی۔ اُن کا قرب عرفان کا گہوارہ تھا۔ ابراہیمؒ اُن کی مصاحبت میں پہنچ کر بہت خوش ہوئے۔ اور پانچ سال تک اُن کے پاس قیام رہا۔ اس اثنا میں حضرت ابوالحسنؒ سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ ایک دن مسجد جنیدؒ میں بیٹھے تھے کہ حضورِ اکرمؐ کا روضۂ اقدس نظر افروز ہوا۔ تمام حجابات درمیان سے اٹھ گئے۔ کچھ دیر تک یہی عالم رہا۔ ایک آشنا نے آ کر سلام کیا قائم ہو گئے۔ آپ نے آنے والے کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور اُس کے سوالات کے جوابات دیئے، وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی دیارِ رسولِ کریمؐ میں حاضری کا شوق بے قابو ہو گیا۔ اسی وقت آپ بغداد سے روانہ ہو گئے بغداد کے پانچ سال پُرسکون عبادت میں بسر ہوئے۔ کیونکہ بغداد پہنچتے ہی آپ نے دُعا کی تھی۔ "الٰہ العالمین! میرے باطن کا اظہار میرے ظاہر سے نہ فرما۔"

اگر بغداد میں بھی آپ کا وہی حال ہوتا جو مدائن سے بغداد تک رہا، تو بغداد میں رجوعیتِ خلق آپ کی ریاضتوں میں حارج ہوتی۔

بصرہ کی طرف آپ کا سفر جاری تھا۔ ایک نخلستان کے قریب شیخ قبیلہ نے آپ کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ آپ عربوں کی روایتی مہمان نوازی سے واقف تھے۔ آپ دعوت قبول کر کے اس کے گھر پہنچے۔ دروازہ سے باہر ایک عجیب منظر سامنے آیا۔

ایک حبشی غلام دھوپ میں بندھا ہوا پڑا تھا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر آپ کو بہت رحم آیا۔ دل میں اس کی سفارش کا خیال لئے ہوئے آپ مہمان خانے میں پہنچے۔ دسترخوان بچھا کر کھانا لگایا گیا۔ میزبان نے آ کر مہمان کو اپنے پاس بٹھایا اور استدعا کی "کھانا! کھایئے"

آپ نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

عرب میزبان کی غیرت جاگ اٹھی لیکن اُس نے بڑے ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے پوچھا "اے معزز مہمان! کھانا نہ کھانے کا سبب بتا۔ میں موانعات کو دور کرنے کی ہر امکانی کوشش کروں گا۔"

آپ نے بلا تکلف کہا "میں کھانا اسی شرط پر کھاؤں گا کہ وہ غلام مجھے دے دو جو گھر سے باہر دھوپ میں زنجیروں سے بندھا پڑا ہے۔"

میزبان شیخ نے ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے کھانا کھایئے" کھانے سے فراغت کے بعد شیخ نے کہا "آپ نے غلام کیوں طلب کیا ہے یہ بات میں سمجھ گیا ہوں۔ غلام کو تکلیف میں دیکھ کر آپ کو رحم آ گیا ہے۔ آپ نے مجھ سے یہ کیوں نہیں دریافت کیا کہ آخر اس غلام کو کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔ اصولاً مجھے ان سوالات کا اب حق نہیں پہنچتا، کیونکہ غلام آپ کا ہو چکا، میں آپ کو غلام کے انوکھے جرم کا حال ضرور سناؤں گا۔ یہ غلام بہت ہی خوش حدی خواں ہے اپنے اونٹ دے کر

اسے اپنی زمین پر بھیجا تھا کہ غلّہ لا دلائے۔ اس کے ساتھ میں نے دَس اُونٹ بھیجے تھے۔ اس نے غلّہ کی مقدار کا اندازہ لگا کر سوچا کہ غلّہ یہاں تک لانے کے لئے دو پھیرے کرنے ہوں گے اپنا وقت اور محنت بچانے کے لئے اُس نے ایک اونٹ پر دو اونٹوں کا بوجھ لاد کر حدی خوانی شروع کردی۔ اس کی آواز کے سحر سے اونٹ مست ہوگئے اور بھاگتے ہوئے تھوڑی دیر ہی میں تمام غلّہ یہاں لے آئے۔ غلّہ اونٹوں سے اُتروایا تو ایک ایک کرکے سارے اونٹ مرگئے"۔

یہ قصّہ سن کر آپ نے کہا" اے شیخ یہ بات اس قدر تعجب انگیز ہے کہ میں ثبوت کے بغیر اس بات کو ماننے میں تأمّل کروں گا"۔

ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ صحرا سے نخلستان کی طرف آتے ہوئے کچھ اونٹ نظر آئے شیخ نے اپنے غلام سے پوچھا" بتاؤ یہ اونٹ کتنے دن کے پیاسے معلوم ہوتے ہیں؟"

غلام نے دُور ہی سے اونٹوں کی رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا" یہ اونٹ کم سے کم تین دن کے پیاسے ضرور ہیں"۔

اونٹوں نے جب نخلستان دیکھا تو پیاس کی شدّت عود کر آئی اور تیز تیز دوڑنے لگے۔ پیاسے اونٹ پانی کی طرف بڑھتے ہوئے جب قریب پہنچے تو شیخ نے غلام سے کہا" حدی خوانی شروع کرو تاکہ پیاسے اونٹ پانی کی طرف نہ جانے پائیں"۔

غلام نے حدی خوانی شروع کردی۔ اونٹ پانی کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ اُن کے کانوں میں حدی خوانی کی آواز پہنچی وہ پانی چھوڑ کر آواز کی طرف متوجہ ہوگئے اور پھر مست ہو کر دوڑتے ہوئے صحرا میں پھیل گئے۔

آپ غلام کا یہ کمال دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس کے ساتھ شیخ سے رخصت ہوکر بصرے کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستہ میں آپ نے غلام سے پوچھا" تیرا نام کیا ہے؟"

"جس نام سے آپ پکارلیں" غلام نے جواب دیا۔

آپ نے پوچھا" تجھے کس قسم کا کھانا مرغوب ہے؟"

اُس نے کہا" جو آپ کھلائیں"

آپ نے دریافت کیا" لباس کیسا پسند ہے؟"

اُس نے جواب دیا" جیسا آپ بنادیں"۔

جوابات سُن کر آپ نے کہا" کاش سب انسان اس قدر ہی اپنے حقیقی آقا و مولا کی رضا چاہنے لگیں"۔ آپ نے اسی وقت غلام کو خوش خبری سنائی" آج سے تم آزاد ہو"۔

اُس نے بڑھ کر آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا" میں آپ کی غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہوں"۔

آپ نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا" تم آج سے میرے بھائی ہو اور یاد رکھو بھائی بھائی کا غلام نہیں ہوا کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری آواز کو سوز و گداز کے حُسن سے آراستہ کیا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ حدی خوانی ترک کردو لیکن یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ قرآن کریم حفظ کرو! تمہاری آواز کے حُسن کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں ہوسکتا کہ تم قرآن کی تلاوت کیا کرو"۔

غلام نے ایک آہِ سرد کے ساتھ کہا" میرا حافظہ اب اس قابل کہاں کہ میں تیس پارے یاد کرسکوں"

یہ مایوسی دیکھ کر آپ نے غلام کو اپنے سینے سے لگا کر اُس کے حق میں دُعا کی جس کے نتیجہ میں قرآن کے لئے اس کا سینہ کھُل گیا۔ آپ نے بصرہ پہنچ کر غلام کا نام سالم رکھا اور اُسے ایک حافظِ قرآن کے سپرد کیا۔ پھر سالم سے کہا۔ "میں تم سے پھر ملوں گا، دل لگا کر حفظِ قرآن میں مصروف رہو"۔

آپ بصرہ سے مکّۂ مکرمہ کی طرف جارہے تھے کہ خیال آیا" اگر کوئی اچھا رفیقِ سفر بھی ہوتا تو سفر آسان ہوجاتا۔ ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ حضرت خضرؑ نے نمودار ہوکر سلام کیا اور سینے سے لگا کر کہا" کیا میری رفاقت پسند کروگے؟"

آپ نے کہا" اے خضرِ محترم! آپ کی زیارت و رفاقت کی لوگ تمنا کرتے ہیں مگر میں اس رفاقت کی پیشکش کو قبول نہ کرسکوں گا آپ کے اور میرے معمولات اور معاملات میں یکسانیت نہیں ہے۔ آپ عالمِ اسرار کے نبض شناس ہیں اور حقیقتِ اعمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں شریعتِ مصطفوی کا پیروکار ہوں۔ خدمتِ خلق اور تبلیغ میرا موقف ہے۔ کامل زندگی گزارنا اب میرے فرائض میں داخل ہوچکا ہے۔ آپ عزلت نشینی یا پردۂ اسرار میں مستور رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی خوف ہے کہ کہیں آپ کی مصاحبت مجھے فرائض سے زیادہ نوافل میں نہ الجھادے"

باقی آئندہ

اُردو کا مشاعرہ ایک تہذیبی ورثہ ہے۔
اُردو ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کا نمونہ ہے۔
یہ ایک جمہوری زبان ہے جس میں مختلف فرقوں
کے تہذیبی اور سماجی مسائل کا عکس ہے۔

ضلع اعظم گڈھ (یو۔پی) کا یہ صنعتی قصبہ خیرآباد ہے۔

یہ تاریخی اور یادگار مشاعرہ انصاری لائبریری کے زیرِ اہتمام ۲ر نومبر ۱۹۸۷ء کی شب میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس مشاعرے کی صدارت رحمٰن نیّر، ایڈیٹر 'بیسویں صدی' اور افتتاح انور جلالپوری فرما رہے ہیں۔ مہمانِ خصوصی گلزار زتشی دہلوی ہیں۔ نظامت کے فرائض عُمر قریشی گورکھپوری ادا کر رہے ہیں۔ اس مشاعرہ کا پہلا دور ہی ۴½ بجے صبح تک جاری رہا۔ انور جلالپوری نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا:۔

"اُردو کا مشاعرہ ایک تہذیبی ورثہ ہے۔ اُردو ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کا نمونہ ہے یہ ایک جمہوری زبان ہے جس میں مختلف فرقوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل کا عکس ہے جنگِ آزادی میں اس زبان نے رہنمایانہ کردار ادا کیا" اس کے بعد ہندی دوستوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بھی قومی یکجہتی کی خوبصورت عمارت تعمیر کرنے کے لئے اردو سیکھیں۔

اب اعظم گڈھ کے درگا پرشاد یادو ایم۔ ایل۔ اے نے بھی اردو کی حمایت کا یقین دلایا اور فرمایا:

"میری خواہش ہے کہ ہمارے بچے اس زبان کو سیکھیں"

لیجئے عُمر قریشی، رحمٰن نیّر کی اجازت سے مشاعرہ کا آغاز ظفر جلالپوری کی نعت شریف سے کرا رہے ہیں۔

نعت کے بعد رعنا زیبا گوالیاری آکر فرما رہی ہیں:۔

'کارواں بھی گیا لوگ سارے گئے
رہ گئے تھے جو پیچھے وہ مارے گئے
صرف اتنا ہی رشتہ سمندر سے ہے
دُور تک ہم کنارے کنارے گئے
ہم تو مجرم نہیں تھے گواہوں میں تھے
مجرموں میں ہی ہم بھی پکارے گئے"

رعنا صاحبہ کو ان حسین اشعار پر داد کیسے نہیں ملی ہوگی۔ لہٰذا خوب خوب داد لوٹ کر ایک گیت الاپ رہی ہیں ؎

"کہاں لے کے سپنوں کا درپن پھروں
میں جوگن نہیں ہوں جو بن بن پھروں

جسے دیکھئے وہ طلب گار ہے
یہ دُنیا نہیں یہ تو بازار ہے
کہاں ہے جو میرا خریدار ہے
کہاں لے کے ٹوٹا ہوا من پھروں
میں جوگن نہیں ہوں جو بن بن پھروں

گیت نے محفل کا نقشہ ہی بدل دیا اور اس رنگ و نغمگی کے عالم میں حلیم حاذق فرما رہے ہیں ؎

"داستاں در داستاں لکھتا گیا
میں زمیں کو آسماں لکھتا گیا
جب صدا احساس سے باہر ہوا

ہر یقیں کو ٹیں گماں لکھتا گیا
رات، آنسو، درد، خواہش، زندگی
اک شگفتا درد جاں لکھتا گیا"

حاذق صاحب داد وصول کئے چلتے اور اب آرہے ہیں ماجد دیوبندی۔ ارشاد ہے ؎

"نظر کلی پہ، ہر اک گل پہ باغباں رکھنا
مگن رہا ہے چمن، فکر آشیاں رکھنا
بھڑک گئے تو خدا جانے کیا نتیجہ ہو
عداوتوں کے یہ شعلے نہ درمیاں رکھنا"

ماجد صاحب داد ترنم پاتے ہوئے بیت سنا کر کامراں پلٹ رہے ہیں۔ اور یک غزل، نشاط صدیقی آنادی سے سنئے ؎

"جب کبھی وہ خفا سا لگتا ہے
غم میں کتنا مزا سا لگتا ہے
یہ لبوں پر ہنسی سجائے ہوئے
کوئی ہم آشنا سا لگتا ہے"
آشنا اجنبی سے لگتے ہیں
اجنبی آشنا سا لگتا ہے"

نشاط صاحبہ محفل کو سرور عطا کر کے ہیں اور ادھر جوہر کانپوری یوں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں ؎

لاش کے ہاتھوں میں قاتل اپنا خنجر دے گیا
قتل کا الزام بھی مقتول کے سر دے گیا
اس کے قدموں سے لپٹ کر جا رہا تھا یار میں
چند سکے وہ مجھے مفلس سمجھ کر دے گیا"

داد اس قطعہ کا حق ہے، لہٰذا داد وصول ارشاد ہوا ہے ؎

خوش جمالوں کو نظر میں نہیں رکھا ہم نے
قاتلوں کو کبھی گھر میں نہیں رکھا ہم نے
جب بھی نکلے ہیں ترے گھر کی حفاظت کیلئے
اپنا گھر اپنی نظر میں نہیں رکھا ہم نے
راہ میں کوئی بھی نہیں بیٹھ دکھانے والا
ساتھ بزدل کو سفر میں نہیں رکھا ہم نے"

جوہر صاحب داد پا کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں۔ اور اب آرہی ہیں شاہین ظفر اورنگ آبادی ارشاد ہوا ہے ؎

"حال چمن کا دیکھ کر روتے ہیں زار زار ہم
سیر چمن کے واسطے جاتا ہی اک غضب ہوا
بیٹھے ہیں اب لئے ہوئے دامن تار تار ہم
چہرے بدل بدل کے لوگ ملے ہیں روز دستیاں
کس پر کریں کوئی کہے دنیا میں اعتبار ہم"

شاہین صاحبہ بھی داد وصول کئے مائک سے کھسک رہی ہیں اور اب آرہے ہیں نواز دیوبندی۔ لحن داؤدی میں غزل سرا ہیں ؎

"تم سے بھی ہواؤں کے ابھی رخ نہیں بدلے
ہم نے بھی چراغوں کو بجھا کر نہیں رکھا
میں نے بھی اسے حار سے تشبیہ نہیں دی
اس نے بھی مرا نام گل تر نہیں رکھا"

اب داد کا عالم کچھ اور ہی ہے۔ کئی بار دہرا کر پھر اسی نغمگی سے محفل کو یوں لوٹنے کی ٹھان رہے ہیں ؎

"کیوں ٹھوکریں لگتی ہیں کہ جب ہم نے کبھی بھی
رستے میں کسی کے کوئی پتھر نہیں رکھا"

داد شباب پہ ہے اور آپ مشاعرہ کو عروج پر لا کر شاداں پلٹ رہے ہیں، داد دیجئے عمر صاحب کو کہ انھوں نے نواز کے بعد کسی ایسے ویسے شاعر کو قربانی کا بکرا نہیں بننے دیا اس رنگ کو نکھارنے کے لئے ترنم کانپوری کو دعوت نغمگی دے رہے ہیں۔ ترنم صاحبہ غزل سرا ہیں ؎

"میں ہوں کس قدر پریشاں اسے یہ پتہ نہیں ہے
وہ مری تباہیوں سے ابھی آشنا نہیں ہے
جو غلام مصلحت ہو، وہ مری انا نہیں ہے
کبھی دشمنوں کے آگے مرا سر جھکا نہیں ہے"

آپ دور بیٹھے ہوئے اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس مطلع پر کیا ہنگامہ بپا ہوا ہے۔ سماعت فرمائیے ؎

"میں جہاں اشارہ کر دوں، وہیں کھنچ کے آئے منزل
کوئی ایسا دیسا رہبر مرا رہنما نہیں ہے"

غزل کا بانکپن، ترنم کے تیکھے پن، اور سامعین کی خوش ذوقی نے مشاعرہ کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ لیجئے پھر ترنم صاحبہ یوں سحر کاری کرنے چلی ہیں ؎

"مجھے آپ کی بدولت، ملی عمر بھر کی راحت
کرم آپ کا سلامت مرے پاس کیا نہیں ہے"

"ایک اور" "ایک اور" کا شور ختم ہوا تو ترنم صاحبہ ایک غزل سے اور محفل کو مسحور کر کے کامراں جا رہی ہیں اور ادھر محفل کو معطر کرنے کی ٹھان رہی ہیں حنا تیموری متھرادی۔ حنا صاحبہ روا روی اور عجلت میں بڑی سادہ اور ہلکی پھلکی غزل چھیڑ رہی ہیں۔ سنئے ؎

"آپ کو میں نے نگاہوں میں بسا رکھا ہے
آئینہ چھوڑئیے آئینے میں کیا رکھا ہے
آپ کو یاد کے سائے سے بچا رکھا ہے
اک دیا میں نے سر راہ جلا رکھا ہے
جسکی چھاؤں میں حسیں وعدے کئے تھے تم نے
میں نے اس پیڑ کی شاخوں کو ہرا رکھا ہے"

حنا صاحبہ بھی داد وصول کئے جا رہی ہیں اور اب ڈاکٹر شنی تیواری نے آکر غزل شروع کی ہے ؎

درمیاں فاصلہ نہیں ہوتا
آدمی غمزدہ نہیں ہوتا
لو لگانے کی بات کرتا ہے
آدمی جو جلا نہیں ہوتا
اشک بن کر جو گھر سے نکلا ہو
اس کا کوئی پتہ نہیں ہوتا
وہ غزل بھی ہے کیا غزل جس میں
پیار کا قافیہ نہیں ہوتا"

غالباً شنی صاحبہ بندی سے پلٹ

کرا دھر آئی ہیں۔ غزل کے بعد انھوں نے ایک ہندی گیت سنا کر اور داد سمیٹ کر اپنی جگہ پلٹ رہی ہیں۔ اور اس عالمِ پُربہار میں انوار جلالپوری نہایت اعتماد کے ساتھ عطا کر رہے ہیں ؎

"زندگی سہمے مسافر کی طرح لگتی ہے
یہ کراچی میں مہاجر کی طرح لگتی ہے
اس کی آوارہ مزاجی کو کہاں تک رو لیں
اس کی فطرت کسی شاعر کی طرح لگتی ہے"

داد، ہاؤ ہو، واہ واہ، کا شور خوشگوار کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

"اپنا گھر چھوڑ کے جانے کی سزا پاؤ گے
اپنے پیاروں کو بھلانے کی سزا پاؤ گے
تم کو سمجھایا تھا اجداد کی قبریں ہیں بہت
دیکھو منہ موڑ کے جانے کی سزا پاؤ گے
دل کسی کا ہو مقدس ہے حرم کی مانند
اس عمارت کو گرانے کی سزا پاؤ گے"

انور صاحب نے محفل سوگوار بنا کر رکھ دی ہے۔ اس حقیقت بیانی نے تقسیمِ ملک کا کرب چہروں پر اجاگر کر دیا ہے۔ آج سرحد پار کرنے والوں پر کیا بیت رہی ہے اور وہ کس کس مپرسی اور احساس کمتری کے عالم میں ہیں۔ اس داستان کو کس سے کہا جائے خود کردہ علاجے نیست، اچھا بھی ہے جو بزرگوں کی نہیں سنتا وہ اسی قسم کی سزا کا مستحق ہے۔ لپکے تھے مملکتِ خداداد کو آباد کرنے اور حشر معلوم ؎

'دیارِ غیر میں جن کو سکوں بھی نہ ملا
گئے، تھے لے کے دلوں میں وہ حسرتیں کیا کیا"

لیجئے اب محفل کو چونکانے اور گرمانے کے مشہور منفرد شاعر راحت اندوری آ کر یوں گرج رہے ہیں ؎

"گھروں کے تپتے ہوئے منظروں میں رکھے ہیں
بہت سے لوگ یہاں مقبروں میں رکھے ہیں
ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں"

داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ اسی باغیانہ انداز سے محفل کو رنگ پر لائے ہیں ؎

"جو منصبوں کے پجاری پہن کے آتے ہیں
کلاہ و طوق پہ دھاری پہن کے آتے ہیں
امیرِ شہر تری طرح قیمتی پوشاک
مری گلی میں بھکاری پہن کے آتے ہیں
یہی عقیق تھے شاہوں کے تاج کی زینت
جو انگلیوں میں بھکاری پہن کے آتے ہیں
ہمارے جسم کے داغوں پہ تبصرہ کرنے
قمیصیں لوگ ہماری پہن کے آتے ہیں"

راحت صاحب محفل میں بلّے بازی کر کے فرمائشوں کے شور میں پلٹ رہے ہیں اور اب اُس امتحان گاہ میں معراج فیض آبادی یوں اعتماد سے غزل سرا ہیں ؎

"جاگتی آنکھوں میں صحراؤں کے منظر دیکھنا
پیاس کی قسمت ہے خوابوں میں سمندر دیکھنا
دائرہ میں ہو رہا ہے آدمیت کا سفر
گھوم پھر کر پھر وہی نیزہ وہی سر دیکھنا
مٹھیوں میں یوں سمیٹی اس نے اپنے گھر کی آگ
جیسے اندھے باپ کا بیٹے کو چھو کر دیکھنا"

معراج صاحب داد تو ہر حال میں وصول کر ہی لیتے ہیں لہٰذا داد پا کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں۔ اور اب آ رہی ہیں شمع ہمدانی فرما رہی ہیں ؎

'جو سر کو تیغ کے نیچے جھکا بھی دیتا ہے
وہ نیکیوں پہ ہمیشہ دُعا بھی دیتا ہے
سپاہی بن کے نکل ہے قاتلوں کا گروہ
جو روز شہر کو کچھ حادثہ بھی دیتا ہے"

شمع صاحبہ محفل کو نورانی بنا کر جا رہی ہیں اور اب آ رہی ہیں مشاعرہ لوٹ شاعرہ تسنیم صدیقی۔ لہک رہی ہیں ؎

"جانے یہ کیا ہوا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
دل تیرا ہو گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد"

مطلع نورٌ علیٰ نورٌ، مائک پر خود پیکرِ غزل، اس پر تسنیم صاحبہ کی طرزِ ادائیگی سے زیادہ حاضرِ جوابی پھر نغمگی بکھیر رہی ؎

"اب تو یہ مشغلہ ہے تجھے دیکھنے کے
ہم ہیں اور آئینہ ہے تجھے دیکھنے کے
نیندوں کا سلسلہ مری آنکھوں سے دور
ہر رات رتجگا ہے تجھے دیکھنے کے
تسنیم آج تیری نظر کام کر گئی
اُن کو بھی کچھ ہوا ہے تجھے دیکھنے کے"

تسنیم صاحبہ محفل کی تشنگی بڑھا خراماں پلٹ رہی ہیں اور اس رنگ کرنے کے لئے ڈاکٹر ساغر اعظمی غزل ؎

"اب مجھ سے امانت یہ سنبھالی نہیں، اے وقت! بزرگوں کی یہ دستار لے
جو کہتے ہیں اس شہر میں قاتل نہیں، اُن کے لئے بس صبح کا اخبار لے
اس طرح سے قاتل کو بہانہ نہ ملے، جب سر ہی کٹانا ہے تو تلوار لے"

ساغر صاحب محفل کو سرشار میں ڈوبے مائک سے جدا ہو رہے ہیں جانثی اس ہنگامہ خیز ماحول میں غزل چھیڑ ؎

"امتحاں کے میداں میں گھر سے اب نکلنا ہے
پیار کے مسافر کو دھوپ دھوپ چلنا ہے
دھوپ ہے سیاست کی رہبروں کے چہروں پر
آگ کے جزیرے سے بچ کے اب نکلنا ہے
انقلاب لایا ہے وقت کا نیا سورج
جھوٹ کے اندھیروں کا بڑھ کے سر کچلنا ہے"

کمال صاحب بھی داد و تحسین لوٹنے جگہ آ رہے ہیں اور اب آ رہی ہیں مجسم غزل رہبر۔ غزل الاپ رہی ہیں ؎

'جب آسمان تیر چلانے پہ آئے گا
ہر آدمی کا نام نشانے پہ آئے گا
جس کو بُلا بُلا کے سبھی لوگ تھک گئے
وہ آئے گا تو تیرے بلانے پہ آئے گا
بستی تباہ کرنے میں شامل ہیں سب گر

الزام صرف راج گھرانے پہ آئے گا"

انجم صاحبہ محفل کو نوٹ خراماں شادا ں
بلکہ آرہی ہیں۔
اور اب کلکتہ کے جواں سال، جواں فکر شاعر
... ہاشمی مائک پر آکر یوں محفل کو لوٹنے
ہیں ۔

"محفوظ ترے شہر میں اک گھر نہ ملے گا
ڈھونڈے سے مگر کوئی ستمگر نہ ملے گا
چہروں کی نمائش کی بڑی رسم ہے لیکن
اس عہد میں گردن پہ تمہیں سر نہ ملے گا
دشنام کے پتھر ہی ترا ہوں گے مقدر
دستار اَنا تجھ کو گُلِ تر نہ ملے گا
انسان تو انساں، فرشتوں میں بھی کوئی
اس نور کے پیکر کے برابر نہ ملے گا"

۴ ½ ہوا چاہتے ہیں۔ لیجئے مشاعرہ کے اختتام کا اعلان ہورہا ہے۔
اس مشاعرہ کی نوعیت کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری اپنی قدیم روایت کو ایک بار پھر کچھ اس طرح دہرا رہی تھی کہ شاعرات نے غزلوں کے ساتھ گیت کے نئے آہنگ اور نئے لب و لہجہ سے محفل کو آشنا کرایا۔ اس مشاعرہ میں شاعرات اور شعراء کی تعداد تقریباً برابر ہی تھی۔ اس مصروف ترین اور صنعتی قصبہ میں اس مشاعرہ کو اراکین انصاری لائبریری خصوصاً متین انصاری نے بڑی جدوجہد اور لگن کے ساتھ کامیاب کرایا۔ یہ سبھی حضرات مبارک باد اور داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

دلی اُردو اکادمی کی بددیانتی

دہلی اُردو اکادمی نے اس بار اردو مطبوعات کے ناشرین کیلئے دو انعامات میں سے ایک انعام ایسے ادارے کو دیا ہے جو نہ تو باقاعدہ طور پر ناشر تھا اور نہ ہی اس وقت ہے۔ اس ادارے کی جس کتاب پر انعام دیا گیا ہے اس پر ناشر کا نام ہے ہی نہیں یعنی بجائے ناشر کے یہ انعام پریس کو دیا گیا ہے اور دوسرے انعام کے بارے میں جناب سکریٹری صاحب اُردو اکادمی کا کہنا ہے کہ چونکہ کوئی بھی کتاب دوسرے انعام کی حقدار نہیں تھی اس لئے دوسرے انعام کی رقم بھی کتابوں کے مصنفین کے انعام میں شامل کردی گئی۔ جبکہ ناشرین کے انعامی مقابلہ میں اس بار ایسی ایسی بہترین اور عالمی شہرت۔ کھنے والی کتابیں شامل مقابلہ ہوئی تھیں کہ جس کتاب پر اوّلین انعام دیا گیا ہے وہ اُن کے مقابلہ میں کسی لحاظ سے بھی قابل غور نہ تھی۔

اُردو اکادمی کی ایسی کھلی بددیانتی کے خلاف ہم ہر ماہ اُس وقت تک یہ احتجاج شائع کرتے رہیں گے جب تک کہ لیفٹننٹ گورنر اس دھاندلی کے بارے میں کوئی نوٹس نہیں لیتے

(ایڈیٹر)

حساس عورت

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

کملا، بملا اور نرملا تینوں حقیقی بہنیں تھیں اور حسین تھیں۔ مگر نرملا جو سب سے چھوٹی تھی اُس کی ایک ٹانگ میں کچھ نقص تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ اس طرح لنگڑا کر چلتی جیسے نئے جوتے پہن کر کسان۔ اسی جسمانی نقص کی وجہ سے وہ بینک کے کلرک سے بیاہی گئی تھی۔ باقی دونوں بہنوں کی امیر گھرانوں میں شادیاں ہوئیں۔ ایک طرف اُس کا جسمانی نقص اس میں مسلسل احساسِ کمتری پیدا کرتا رہتا تھا تو دوسری طرف اس کا حسین چہرہ اُسے فخر کے ساتھ جینے کی حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا، مگر آخر میں جیت پہلے جذبہ کی ہوتی تھی۔ اور اسی لئے وہ کسی تقریب میں نہیں جاتی تھی۔ اُس کے شوہر آلوک نے بھی دھیرے دھیرے تقاریب میں آنا جانا بند کر دیا۔ لوگوں کو اُن کا یہ رویہ پسند نہیں آیا اور ایک دوسرے سے شکایت کرنے لگے کہ اگر یہ کسی کی تقریب میں شریک نہیں ہونگے تو ان کے گھر کون آئے گا۔ راہ و رسم کو نبھانا اور سماج کے ساتھ مل کے چلنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کی طرح اُن پر کسی کی بات کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ دھیرے دھیرے یہ بات رشتہ داروں تک بھی پہنچ گئی۔ اور ایک دن نرملا کی ماں آ دھمکی۔ اس نے سوچا تھا کہ دونوں میں کسی وجہ سے من مٹاؤ ہو گیا ہوگا جس کے باعث وہ کسی تقریب، یا رشتہ داروں میں آ جا نہیں رہے ہیں۔

آلوک اس وقت اسٹوو کی صفائی کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ کالک میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ساس، داماد کی جونہی آنکھیں چار ہوئیں، آلوک نے نمستے کی اور انھیں بیٹھنے کو کرسی سرکا دی۔ ساس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:۔

"نرملا کہاں ہے جو تم یہ کام کر رہے ہو؟"

"ماتا جی! جو کام میرے سامنے ہوتا ہے میں یہ کبھی نہیں سوچتا کہ یہ کس کا کام ہے۔ فوراً کرنے لگتا ہوں۔ مجھے نرملا کے بہت سے کاموں میں ہاتھ بٹانا اچھا لگتا ہے۔ وہ پریم سہلے ماتھر کے گھر گئی ہوئی ہے، ابھی آتی ہی ہوگی۔ آپ تھک تھکا کر آئی ہیں، آرام کیجئے!"

"یہ ماتھر صاحب کون ہیں؟" نرملا کی ماں نے ماتھے پر سلوٹیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے بڑے ہمدرد ہیں، اچھے خاصے خوش حال پڑوسی ہیں۔ ریٹائرڈ لیکھ پال بہت ہی اور شریف ہیں۔ اچھی خاصی کھیتی ہے۔ ٹریکٹر ٹرک ہے۔ پیپرمنٹ کی فیکٹری بھی ہے۔ بڑے امیر ہیں اتنے ہی شریف بھی ہیں۔"

"امیر اور شریف، یہ تو پہلی بار سن رہی ہوں۔ بیٹا آلوک! امیر تو شریر ہوتے ہیں۔ پال کی یہ خوش حالی دراصل اس کی ایمانداری، شرافت، دونوں ہی کو مشکوک بناتی ہے۔ پال کی تنخواہ ہوتی ہی کتنی ہے" بھنوں کو آگے سرکاتے ہوئے ساس نے کہا۔

"کچھ بھی ہو ماتا جی ہماری نظر میں تو وہ بھلے آدمی ہیں۔ دراگر آپ کی بات صحیح بھی ہے تو بھی کیا؟ والمیک ڈکیت سے سنت بن گئے تھے۔ آدمی کا کیریکٹر بھی تو بدلتا رہتا ہے۔ انھوں نے ملازمت کے دوران کچھ بھی کیا ہو مگر اب وہ ٹھیک ٹھاک آدمی ہیں۔"

"ٹھیک ہے! چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ تم دونوں نے کہیں آنا جانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ اکثر اڑوسی پڑوسی مجھ سے شکایت کرتے ہیں کسی کے دُکھ میں شریک ہونے سے اُس کا دُکھ

کھلتا ہے اور خوشی میں شریک ہونے سے خوشی بڑھتی ہے۔"

"کیا کروں ماتا جی! نرملا کہیں جاتی ہی نہیں کملا کے لڑکے کی سال گرہ سے لوٹنے کے بعد اس میں یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے وہاں کوئی اہانت جنک بات سامنے آگئی ہو۔" ساس نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

"نہیں ماتا جی، میں ساتھ تھا۔ میری نظر میں ایسی کوئی بات نہیں۔ بیکار کسی کو کیوں دوش دیا جائے۔ بہت اچھی طرح پیش آئے تھے وہ لوگ۔ جا تو وہ یہیں سے نہیں رہی تھی۔ نہ جانے کی وجہ بھی کچھ نہیں بتا رہی تھی مگر میں نے اندازہ لگا لیا اور ماتھر صاحب کے گھر سے چار ساڑیاں اور کچھ گہنے لے آیا تاکہ احساسِ کمتری ختم ہو جائے وہ پہن کر جلدی اور لب تک نہیں ہلائے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی، میرا اندازہ صحیح نکلا۔"

"گئی تو خوش خوش اور آئی اداس؟ بات بھی کچھ ہوئی نہیں؟ اور اس کے بعد سے اس نے ہر جگہ آنا جانا بند کر دیا؟ ساس اسی قسم کے کئی سوال کر کے گم سم بیٹھ گئی جیسے کہ وہ خود ہی جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آلوک نے کہا، "میں نے اس سے گھر آکر اس کا کارن پوچھا تو اس نے کہا، امیروں کے گھر غریب رشتہ دار کو نہیں جانا چاہیئے" بڑے بھولے انداز میں کہہ کر وہ پھر چپ ہو گئی۔ ابھی تک میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ یا تو اس کے مانگے ہوئے کپڑے اور گہنوں کا کا راز فاش ہو گیا ہے جس سے اس کو خجالت اٹھانی پڑی ہے یا کسی نے ایسی بات کہہ کر اس ل بے عزتی کی ہے جو اسے ناگوار گزری ہو۔ مگر ل نے پھر بھی اس کا دل کریدا۔ وہ بولی "شام وجب ساری عورتیں ایک جگہ بیٹھی ہوئی چائے مارہی تھیں تو بملا نے ایک دوسرے کا تعارف رایا۔ تعارف میں ہر عورت کی ہستی پر بھی روشنی الی گئی۔ میں سمجھتی ہوں یہ بدتمیزی بھی ہے اور تہذیبی بھی۔ تعارف میں رشتہ ناتا بتانا تو ٹھیک ہے۔ بہت سے بہت اس شخص کی ذاتی خوبیوں کا بیان بھی مناسب ٹھہرایا جا سکتا ہے، مگر وہاں تعارف کی بنیاد رکھی گئی تھی دولت پر۔ شاید بملا نے بعد کو اس غلطی کا احساس بھی کیا ہوگا۔ جب میرا نمبر آیا تو اس نے کہا۔

'یہ میری چھوٹی بہن نرملا ہے۔ اس کے پتی ایک بینک میں آفیسر ہیں"

وہ کلرک بھی کہہ سکتی تھی، مگر اس نے میری عزت افزائی کے لئے جھوٹ بولا۔ پھر بھی میں اندر سے خوش نہیں ہوئی۔ کیونکہ میرے تن پر مانگے کے کپڑے ہی مجھے شرمندہ کر رہے تھے۔ یہ جھوٹی عزت بھی بارِ گراں محسوس ہونے لگی۔ میں سب کے ساتھ ہنسی خوشی اُٹھی بیٹھی، بات چیت کی مگر میرا ہر انداز بناوٹی بنا رہا۔ وہاں میں نے محسوس کیا کہ امیر عورتیں مغرور ہو جاتی ہیں۔"

آلوک کے منہ سے بیٹی کی یہ باتیں سن کر ساس نے اندازہ لگا لیا کہ نرملا نے اسی وجہ سے کہیں بھی آنا جانا بند کر دیا ہے۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچنے لگیں اور آلوک چائے بنانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد آلوک نے ساس کی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا "ماتا جی! اس کے بعد وہ پھر کہیں بھی نہیں گئی اور نہ میں نے کہیں جانے کے لئے اس پر زور ڈالا۔ وہ جذباتی عورت ہے۔ میں اس کی نیچر کے خلاف اس سے کوئی کام کروا کے اس کے پھول سے نازک دل پر ضرب کاری نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ایک آدرش ناری ہے، ایک دیوی ہے، ہنستی ہے۔ اس میں خودداری ہے، اخلاص ہے، انسانیت ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ ایسی بیوی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ میرے تو پہلے جنم کے کچھ کرم اچھے تھے جو .." آلوک باتوں میں اتنا بے سدھ تھا کہ چائے اُبل کر پتیلی سے نکل آئی اس نے جلدی جلدی اسٹوو بند کیا۔

داماد کے منہ سے بیٹی کی تعریف سن کر ساس پھولی نہیں سما رہی تھی۔" اس نے آلوک سے کہا" بیٹا جب وہ کہیں نہیں جاتی تو تم ہی ہو آیا کرو، سماج کے رسم و رواج کو نبھانا تو بہت ضروری ہے" یہ سن کر آلوک بولا۔

"ماتا جی! میں اس کے بغیر کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔ اور اب تو ہمارے کہیں آنے جانے میں اور بھی اڑچن آگئی ہے۔ کیوں کہ میری ماں موتیا بند کی وجہ سے اچھی طرح دیکھ نہیں پاتیں، اس لئے انھیں تنہا چھوڑ کر ہم کہیں نہیں جا سکتے بیچاری پیراسائٹ ہو کر رہ گئی ہے۔"

'بیٹا تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، ویسے نرملا کی صحت کیسی ہے؟"

"لسے دن" بالکل کشمیری سیب ہو رہی ہے۔ آئی ہی ہوگی، دیکھ لینا اسے کوئی دکھ تھوڑی ہے۔ وہ اپنی گھریلو زندگی سے بالکل مطمئن ہے۔ اگر عورتوں کو کوئی غم نہ ہو تو وہ سوکھی روٹی میں بھی مکھن ملائی بن جاتی ہیں۔ وہ بالکل مست ہے۔ کبھی کبھار جی اچاٹ ہو جاتا ہے تو پکچر کا پروگرام بنا لیتی ہے۔ میں کبھی اس کی رائے میں مخل نہیں ہوتا کیونکہ اس کی ہر بات پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کسی نہ کسی اصول پر مبنی ہوتی ہے اور اکثر وہ کئی باتوں میں مجھے مات دے دیتی ہے۔"

"کیا کہا، تمہیں مات دے دیتی ہے؟ ساس نے قدرے حیرانی سے کہا۔

"جی ہاں! میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ ایک دن وہ ماتا جی کے سامنے کھانے کی تھالی رکھ کر پانی لینے چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو دال کی کٹوری میں مکھی پڑی تھی۔ اس نے ماں کی تھالی میں سے دال کی کٹوری اُٹھا کر اپنے حصے کی دال ماں کو دے دی۔ جب میں باہر سے آیا اور نرملا کو چٹنی سے کھانا کھاتے دیکھا تو پوچھنے پر حقیقت کھلی۔ میں نے کہا مکھی نکال کر پھینک دیتی، دال کا کیا بگڑ گیا تھا۔ ماں کو کونسا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ یہ سن کر اس نے خفگی سے کہا "بیشک ماتا جی کی آنکھیں نہ سہی لیکن بھگوان اندھا نہیں ہے۔ اُسے تو سب کچھ نظر آتا ہے۔" یہ سن کر میں لاجواب ہو گیا ہے نا مات کھانے والی بات۔"

یہ سن کر ساس مسکرانے لگیں اور اپنی بیٹی میں اخلاقی بلندی کا جذبہ دیکھ کر ان کی آنکھوں

ا پانی آگیا۔ ساس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مکان
کے کونے میں ایک اڈہ کھڑا دکھائی دیا جس پر
ربند کا تانا تنا ہوا تھا

"یہ کیا ہے؟" دانستہ ساس نے سوالیہ
ماز میں پوچھا۔

"نرملا اس اڈہ پہ کمربند بنا کرتی ہے۔"
ریہ انداز میں آلوک نے کہا۔

"ہمارے یہاں تو وہ یہ کام نہیں جانتی تھی
اں کس سے سیکھ لیا؟" سر کے بال سہلاتے
سے ساس نے پوچھا۔

"شریمتی ماتھر سے سیکھا ہے نرملا نے یہ
ر، وہ بھی کسی وقت کمربند بُن کر بازار میں بیچا
رتی تھیں۔"

"اتنے مالدار کی بیوی ہو کر بھی اتنا چھوٹا سا
ھندا کرتی رہی ہیں؟"

"ہمارے ملک کی غریبی میں اضافہ کا باعث
ایک خیال بھی ہے۔ جب کوئی مالدار آدمی کوئی
مولی کام کرتا ہے تو دیکھنے والے ٹوکتے ہیں" ارے
پ اتنے بڑے آدمی ہو کر یہ کام کر رہے ہیں!"
لانکہ محنت سے کام کرنا بُرا نہیں ہوتا۔" آلوک
نے لہجہ میں مضبوطی لاتے ہوئے کہا۔ "ہم
ریب کو اپنی غریبی دُور کرنے کے لئے منفقدر کے
ہُرے سے نکل کر عمل کا راستہ اپنانا ہوگا"

"تم ٹھیک کہتے ہو، پُرانے طریقہ سے جینے
والے لوگ ترقی نہیں کر سکتے۔ کتنے روپے روز
بچا لیتی ہے نرملا اس دھندے سے؟"

"یہی کوئی خرچ نکال کر دو تین روپے روز۔"

"بڑی ہشیار اور کفایت شعار ہو گئی ہے"

"جی ہاں! یہی وہ خوبی ہے جو عورت میں ہو
گھر بن جائے اور وزیرِ اعظم میں ہو تو ملک سنور جائے۔
ن کے علاوہ بھی اس میں کئی خوبیاں ہیں جن کو
ن کر آپ حیرت زدہ ہو جائیں گی۔

ایک بار کملا نے ہماری غریبی پر ترس
کھا کر نرملا کو اپنے گھر والوں سے پندرہ ہزار روپے
دِینے کو نکی ٹکلی کا دھندہ کرنے کے لئے دیئے
تھے۔ نرملا نے روپے تو لے لئے مگر کسی بھی دھندے
میں نہ لگا کر اس روپیہ کو پیشگی دے کر دو ٹرکوں کا
پرمٹ ٹھیک کرایا۔ یہ سب ماتھر صاحب کی مہربانی کا
نتیجہ تھا۔ مجھے کسی نے اس امر کی ہوا تک نہ دی
جب پرمٹ آگیا تو ماتھر صاحب نے بلیک میں بیچ
ڈالا جس سے پینتیس ہزار روپے حاصل ہوئے۔
نرملا نے پندرہ ہزار تو فوراً کملا کو واپس کر دیئے
اور بیس ہزار ڈاک خانے میں فکس ڈپازٹ کرا دیئے
جو چھ سال بعد چالیس ہزار ہو گئے۔ کمربندوں کی
آمدنی سال بھر تک جوڑ کر گیہوں کی فصل بازار میں
آنے پر گیہوں خرید لئے، جو گیارہ مہینے بعد اچھے منافع
پر بیچ ڈالے۔ وہ اسی طرح روپے کا لوٹ بدل کرتی
رہتی ہے۔ میں جو کچھ کماتا ہوں اس سے گھر کا کام
چلتا ہے۔"

"کیا وہ تم سے کسی بھی کام میں مشورہ نہیں
لیتی؟"

"ماتھر صاحب جو صلاح مشورہ کیلئے ہیں۔"

"کتنی عمر ہے اُن کی؟" ساس نے ذرا
متجسسانہ انداز میں پوچھا۔

"اکہتر سال کے ہیں"

یہ سنتے ہی ساس کا چہرہ کھِل اُٹھا
آلوک نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا
"اب وہ ایک ٹرک لینے کی اسکیم بنا رہی ہے جس کو
وہ چلوائے گی۔ اب وہ بیوپار کے ٹیلنٹ سیکھ گئی
ہے۔ اگر ماتھر صاحب کچھ دن اور رہ گئے تو اس
کو کاروباری طور پر اور بھی پختہ بنا دیں گے۔ اپنی
بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔ اُن کی بیوی بھی ان ہی کی
طرح نیک عورت ہے۔ وہ ایک بار نرملا کو اپنے
ساتھ شادی میں لے گئی تھی۔ جیسے وہ کملا کے
یہاں سج دھج کر گئی تھی، ویسے ہی اُن کے ساتھ
بھی بن سنور کر گئی۔ فرق یہ تھا کہ اس روز اس
کے جسم پر ہر شے مستعار نہیں، بلکہ اس روز اس
کے جسم پر ہر شے اپنی تھی۔ لیکن گئی تو اسی روز
کی طرح خوش خوش تھی اور جب واپس آئی تو
ایسی ہی اُداسی چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ اس
دن تو میں نے اس کی اُداسی کا کچھ اندازہ لگا بھی
لیا تھا مگر آج میں اس کی اُداسی کا کوئی بھی اندازہ
نہیں لگا سکا۔ میں نے اس اُداسی کا سبب اُس
سے پوچھا تو بولی:۔

"میں جن کے ہاں تقریب میں شریک ہونے
گئی تھی وہ بہت ہی معمولی حیثیت کے لوگ
تھے۔ میرے جیسے کپڑے وہاں آئی ہوئی عورتوں
میں سے کسی نے بھی نہ پہن رکھے تھے۔"......

وہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی کہ میں نے اُسے
ٹوکتے ہوئے کہا "پھر تو بہت بڑھیا بات ہوئی
یہ سُن کر وہ خوش نہیں ہوئی بلکہ اُداسی کے ساتھ
بولی "کسی کی بے عزتی پہ خوش ہونا اچھی بات
ہوتی ہے یا بُری؟" اس کا یہ سوال میرے گال
پر طمانچہ سا لگا۔ میں خاموش ہو گیا کیونکہ اس
کے سوال کا جواب صرف خاموشی ہی تھا
وہ دم بھر ٹھہر کر میری طرف پھر متوجہ ہوئی"
عورت مجھے دیکھتی تھی، جھینپ جاتی تھی۔ جس
معیار کے لوگ دعوت میں ہوں اسی معیار کا
لباس پہن کر شریکِ تقریب ہونا مناسب
رہتا ہے، ورنہ دوسروں کو شرمندگی ہوتی
ہے۔ یعنی امیروں کی چمک دمک غریبوں کی
بے عزتی کا باعث بنتی ہے۔ اگر مجھے پہلے پتہ
چل جاتا تو میں معمولی کپڑے پہن کر جاتی۔"

"بتاؤ ایسی عورت کو کیا کوئی اچھا کھلائے
اور پہنائے۔ لو وہ آگئی"۔ نرملا کی طرف اشارہ
کر کے آلوک نے کہا۔

"اماں جی نمستے! آپ کو آئے ہوئے کتنی
دیر ہو گئی؟"

"آشیرواد بیٹی، خوش رہو، میں ابھی
آئی ہوں، بیٹھو، تم اتنی سادہ کیوں رہتی ہو؟"
اُس کی ماں نے پوچھا۔ حالانکہ انہیں تو
اس سوال کا جواب آلوک نے پہلے ہی دے دیا
تھا، مگر بات کرنے کے لئے بھی کوئی بات چاہئے۔
نرملا نے مسکرا کر جواب دیا:۔

"سادگی ہی ایک ایسا گناہ ہے ماں
جو ہر شریف انسان کی عزت بڑھاتا ہے
اور مجھے یہ گناہ پسند ہے"

ٹوٹے رشتے

عابد نقوی

وہ میری زندگی کا ایک حادثہ بن کر گئی۔ بعض حادثے بھلا دیئے جاتے ہیں اور بعض رستے ذہن میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔

موسم گرما کی شرر باد دھوپ جسم جھلسا رہی تھی دوپہر کے وقت ایک بجے ریڈیو پر خبر سن باہر نکلا کہ حکومتِ پاکستان نے تین لاکھ افغان مہاجروں کو پناہ دے دی ہے۔

قائدِ اعظم کے مقبرے کے سامنے بندر روڈ کے چوراہے پر آگے پیچھے کاریں دوڑ رہی تھیں۔ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا ٹریفک سگنل پر جھنڈا لہراتی ہوئی کار آ کر رکی۔

پچھلی سیٹ پر ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اُن کے چہرے بشرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی جرنل یا وزیر کے بیوی بچے ہیں گے۔

یکایک کھڑکی کی طرف ایک کھلونے بیچنے والا بچے کو دیکھ کر لپکا۔

"بیگم صاحبہ یہ کار بیٹری سے چلتی ہے، لے لیجیے۔" کھلونے بیچنے والے نے کہا۔

دوسری کھڑکی کی طرف ایک بھکارن جس کے چہرے مہرے سے اس کی خاندانی شرافت ٹپک رہی تھی گڑگڑا کر کہہ رہی تھی کہ بہ حالات کے ہاتھوں مجبور بھیک مانگ رہی ہے۔

گود میں معصوم بچہ لئے کہہ رہی تھی "بابا کچھ خیرات زکوٰۃ دے دو" بچہ ایں ایں کر رہا تھا جیسے دودھ مانگ رہا تھا یا حلق تر کرنے کے لئے پانی۔ چلچلاتی دھوپ اس کا نازک سا بدن جلا رہی تھی۔

"بابا ماں جی ننھے پر ترس کھاؤ"

یہ اُس نوجوان بھکارن کی سُریلی آواز تھی میں اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

کار سے آواز آئی "کمبخت کھلانے کو نہیں ہے تو بچہ کیوں پیدا کرتی ہے؟"

بیگم صاحبہ پھر کھلونے والے سے مخاطب ہوئیں "یہ کھلونے ولایتی ہیں نا"

"جی سرکار۔ بھلا ہمارے ملک میں ایسے کھلونے کہاں؟"

"اچھا یہ جہاز بھی دے دو"

بھکارن نے پھر صدا لگائی "اللہ کے نام پر بھوکی پیاسی ہوں۔ ماں جی اللہ تم کو اور دے گا۔ ذرا میرے بچے کی طرف دیکھو!"

"اب جاتی ہے یا نہیں" ڈرائیور نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کار سے دُور کر دیا۔

میرا ننھا صبح سے دُودھ کے لئے سسک رہا ہے، بہن جی" بھکارن برابر دُور ہوتے ہوئے بھی یہی صدا لگاتی کار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگی

"دور ہٹ جا" کار ہوا میں فراٹے بھرنے لگی۔

یہ وہ ہاتھ تھے جنھوں نے ہمیشہ دیا تھا، لیا نہیں تھا لیکن اب یہاں محنت مزدوری کر کے بھی کچھ نہ بنتا۔ رات کو چند ٹکڑے نصیب ہو جاتے۔ ان دونوں بہنوں کو گھروں میں جھاڑو برتن کپڑے دھونے کے سوا کچھ نہ مل سکا۔ اس پر مالکوں کے ظلم بھی سہنا پڑتے تھے۔

بڑی لڑکی عطیہ نے والدین سے اجازت لے کر کراچی کا سفر کیا تاکہ اس بڑے پُررونق اونچی اونچی عمارتوں والے شہر میں کام مل سکے

دہ دور کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر تھا کہیں قسمت آزمائی جائے۔

اسے جلد ہی ایک مل میں کام مل گیا۔ اس کی خوبصورتی اور جوانی خود ایک رشوت تھی ہر سپروائزر چاہتا.... میرے ڈیپارٹمنٹ میں کام کرے۔

ماں باپ اور بیٹی کی زندگی کچھ بہتر گذرنے لگی۔

پانچ چھ ماہ بعد عطیہ کا کام بند ہو گیا تھا۔ کراچی کی جس کپڑے کی مل میں کام کرتی تھی اس میں اسٹرائیک ہو گئی.... ایک ماہ تک کام رکا رہا اس کے بعد جو شروع ہوا تو مزدوروں میں کام کی کمی کی وجہ سے چھانٹی شروع ہو گئی۔

عطیہ ڈرتی تھی کہ کہیں میرا نام اس لسٹ میں نہ آجائے ورنہ پیٹ کے دوزخ کو کس طرح بھروں گی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اسے کچھ لوگوں کو رشوت بھی دینی پڑی، جس کے لئے اس نے اپنی رہی سہی پونجی گلے کی زنجیر جو وہ مشرقی پاکستان سے کسی نہ کسی طرح بچا چھپا کر لے آئی تھی، اسے فروخت کر دی۔

عطیہ زنجیر فروخت ہو جانے کے باعث رنجیدہ رہنے لگی، تاہم جو کچھ اسے ملتا کھانا اور جھونپڑی کا کرایہ ادا کر کے ماں کو بھیج دیتی۔

عطیہ جس مستری کے تحت کام کرتی تھی شروع شروع میں تو اس سے بڑی محبت سے پیش آتا تھا۔ چونکہ وہ نئی نئی تھی، مستری کے اشاروں کو سمجھ نہ سکی۔ مگر اس کے مضبوط رویّہ سے مستری کے حوصلہ اور خواہش میں کمی آنے لگی تو وہ سختی سے پیش آنے لگا۔ جب وہ تنہا نظر آجاتی مستری اسے برا بھلا کہتا اور مالک سے نکلوانے کی دھمکیاں دیتا۔

عطیہ پر اب یہ راز افشا ہوا کہ مستری کے اشاروں کا کیا مطلب تھا اور ان اشاروں کی زبان کو سمجھنا بھی کتنا ضروری تھا۔

یہ زبان ہی کامیابی اور پکّی نوکری کا ذریعہ ہے۔ آہ! مفلسی بھی کتنی بری بلا ہے۔ خاص کر جب عورت حالات اور مجبوری کا شکار ہوتی ہے تو اس کی مجبوری اور بھی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور جب وہ اس صورتِ حال کا سامنا کرتی ہے تو یہ اس کے شاید ضبط کا امتحان ہوتا ہے۔ کچھ دنوں تک وہ سب کچھ برداشت کرتی رہی اس کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ایسے حالات کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ وہ مستری کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کو جب بھی روکنے کی کوشش کرتی تو مفلسی اور غربت آڑے آجاتی کہ اگر نوکری سے نکال دی گئی تو کیا ہو گا؟ کسی سے قرضہ بھی نہیں مل سکے گا

افغانوں کے قرضہ کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ ایسے ہی لوگ آڑے اور برے وقتوں میں کام آتے ہیں اور عطیہ جیسے لوگ زندگی سے مجبور ہو کر انہیں پٹھانوں ہی سے قرضہ لیتے ہیں۔ لیکن ان کے قرضے کبھی نہ ختم ہونے والے ہوتے ہیں جس کا صرف سود در سود ہی ادا ہوتا رہتا ہے دراصل رقم دبیں کی دبیں۔ ان مزدوروں اور پٹھانوں کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس نے اگر قرض لے بھی لیا تو ادا کہاں سے کرے گی؟ یہی سوچتے ہوئے اس کا دماغ جیسے لہروں پر ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح تھپیڑے کھانے لگتا۔

زندگی بھیانک بن رہی تھی مقدّر کیا دکھاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور مسلسل آسمان کی طرف دیکھتی۔ اور سوچتی رہتی۔

مستری نے پیچھے سے آکر کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اب عطیہ کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہونے لگا اور کام کی تعریف بھی۔

چند ماہ اسی طرح گذر گئے۔ اس کی بھوک بھی بڑھ رہی تھی اور اس کا وزن بھی بڑھ رہا تھا۔

اس کے وجود میں اب کسی اور کا وجود پلنے لگا تھا۔ اس راز کو وہ کس سے کہتی سوائے خدا کو یاد کرنے کے — ہر روز خدا کو نئے نام سے یاد کرتی۔ جتنے نام اسے یاد تھے، دہرا دیئے۔

اس کی حالت شکار میں پھنسے ہوئے اس جانور کی سی تھی جو گھبرا گھبرا کر لمبے اور تھکے ہوئے سانس لیتا ہے۔

اس کو اپنے گھر کا خیال آنے لگا۔ لیکن ماں باپ کے پاس جا کر اسے کون سا چین نصیب ہو جائے گا۔ محلّہ والے، پڑوسی، اور جاننے والے کیا کہیں گے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے جو بدنامی ہو اُسے برداشت نہ کرتے ہوئے ماں اور بوڑھا باپ دم توڑ جائیں۔ اور چھوٹی بہن پر کیا اثر پڑے گا۔ اس کی زندگی بھی تباہ و برباد ہو جائے گی۔ یہ خیالات اُسے ستانے لگے اور اس نے لاہور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سے ساری خوشیاں اور مسرتیں چھن چکی تھیں۔ نازو نعم میں پلی بڑھی اب وقت کے ہاتھوں میں اس کا مقدر کھیل رہا تھا۔

ایک دن اچانک خواب سے چونکی اور زور سے بڑبڑانے لگی:۔

"اے خدا! یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا؟ یہ کس جرم کی سزا ہے؟" نہ معلوم کتنے لوگوں کو وقت نے بے وقت کر دیا تھا۔ اس نے اپنی ایک سہیلی سے ذکر کیا۔ اس نے کہا "عطیہ! گھبراتی کیوں ہو؟" یہاں کراچی میں ایسے بہت ڈاکٹر ہیں، نرسیں ہیں جو پیسے لے کر آنے والے جنم سے پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں"۔

"یہ تو پاپ ہے، گناہ ہے"۔

سہیلی ہنسنے لگی" یہاں کیا نہیں ہوتا"

"ہاں پیسے کے سامنے کوئی نہیں سوچتا کیا ثواب ہے، کیا گناہ ہے۔ کیا شیطانیت اور کیا انسانیت ہے۔ یہاں زندگی نہیں پیسہ ہے۔ اس شہر میں لوگ راتوں رات کس طرح دولت مند بن جاتے ہیں؟ یہاں ہر کام ہوتا ہے"

"ہاں میں نے بھی سنا ہے" عطیہ مری ہوئی آواز میں بولی "لیکن... لیکن... اکثر اس میں ماں کی بھی جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ کیا مجھے اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا" اپنی موت کے خوف سے وہ چیخ پڑی۔

"میں کسی بھی حالت میں مرنا نہیں چاہتی" اگر پولیس کو اطلاع ہو گئی تو وہ مجھے پکڑ لے جائے

"اری پریشان کیوں ہوتی ہو؟" سہیلی نے
کیا تجھے نہیں معلوم اس بڑے عالی شان
ن البلاد شہر میں پیسے سے کیا نہیں ہوتا۔ کسی
جان لی جاسکتی ہے۔"

وہ چیخ اٹھی "میرے خدا! میں پیسوں کا
ام کس طرح سے کروں گی۔ کاش اس شہر میں
دہیں بھوکی پیاسی مرجاتی!"

عطیہ موٹے موٹے آنسوؤں سے اپنے
ے کو تر کر رہی تھی لیکن ان آنسوؤں سے
والا طوفان تھوڑی رُک سکتا ہے۔ جب
ریب آ گئے ایک پڑوسی عورت نے رائے
مذہب میں ایک زندگی کو ختم کرنا بڑا گناہ
۔ ایک ایسا گناہ جو کئی پشتوں تک آدمی کا
تاہے۔ جس کو خدا نے زندگی عطا کی ہے
زندہ رہنے کا بھی حق ہے۔ تمھارا وقت بہت
آگیا ہے، اس مشکل کو آسانی سے حل کرادوں"

"اللہ آپ کو خوش رکھے" کہتے ہیں ایسے
بر خدا کو بھی رحم آجاتا ہے۔

عطیہ دیواروں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ بچہ
کل سے پیدا ہوا۔ اس کا جسم ہوا میں لہراتے
جھنڈے کی طرح کانپ رہا تھا۔ لیکن اسے نئی
۔ یہ تو خدا کی دین تھی۔ قصور وار ہی سہی
تو معصوم ہے۔

یہی خیالات عطیہ کے ذہن میں گردش کر
تھے۔ وہ بڑی محبت سے بچہ کو دودھ پلاتی
طرح اپنے غموں کا مداوا کرنے کی کوشش
اب عطیہ کام پر نہیں جاسکتی تھی۔ کچھ دن
ایک عورت کے گھر پر رہی اور سوچتی رہی
۔ لوگ اس دنیا میں موجود ہیں کیوں نہیں"
کی بدحالی اور عورت کی بے بسی کو نے

ں دور سے کھڑا بیگم صاحبہ اور ڈرائیور
طوک سے جو انھوں نے اس بھکارن
کیا تھا دل ہی دل میں شرمسار ہو رہا تھا
اد آیا کرید وتی ہے۔ نوکری کی تلاش
کے چکر لگاتے ہوئے مجھ تک بھی پہنچی

لیکن یہ لڑکی یہاں کراچی میں اور...
بھکارن کے روپ میں؟" اسے اس حال میں دیکھ
کر میں واقعی حیران تھا... حلیہ بدلا ہوا... بدن
پر تار تار ساڑی... بالوں پر سڑکوں کی گرد و غبار،
چہرے پر ڈیزل کا دھواں، آنکھوں کے نیچے حلقے،
بے ترتیب بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

دوسرے دن تک میرے دماغ میں اس
کا خیال آتا رہا اور مسلسل سوچتا رہا۔ اس امید پر
کہ اس سے کچھ دریافت کروں۔

اسی خیال سے ایک دن شام کے وقت
غبار آلود سائے جب پھیلتی ہوئی تاریکی میں مدغم
ہو رہے تھے میں اسی جگہ جاکر کھڑا ہوگیا۔

عالیشان اور ارکنڈیشنڈ مسجدوں کے
میناروں سے "اللہ اکبر" کی صدائیں لاؤڈ اسپیکر
کے ذریعہ بلند ہو رہی تھیں۔

ایک سفید کار اسی ٹریفک لائٹ کے سامنے
آکر رکی اس پر حکمراں پارٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا
پچھلی سیٹ پر بند کالر کے کوٹ میں ملبوس کوئی
وزیر بیٹھا تھا۔

اتفاقیہ میرے کانوں میں وہی رس گھولتی
ہوئی آواز ٹکرائی۔ "اے ایمان والو! اس دکھیاری
کی طرف دیکھو۔"

"بابو جی اللہ کے نام پر!" میری نظریں اس
آواز کے تعاقب میں دوڑنے لگیں۔ ٹریفک رکا ہوا
تھا۔ شاید قائد اعظم کے مزار پر کوئی غیر ملکی صدر
پھولوں کی چادر چڑھانے آیا تھا۔

بھکارن اس سفید کار والے کی طرف نہیں
گئی۔ پاس سے گزر کر موٹر رکشہ میں بیٹھے ہوئے مسافر
سے مخاطب ہوئی "بابا" اور بھیک لے کر تیسرے
اسکوٹر سوار کی طرف بڑھ گئی۔ ہر بار اس نے کار
کی طرف حقارت سے دیکھا لیکن کچھ نہیں مانگا۔
میرا تجسس بڑھ گیا۔ غالباً مانگنے والوں کو بھی
تجربہ ہوتا ہے۔ اب آسے بھی تجربہ ہوچکا تھا۔ اس
سے پوچھتے ہوئے میں اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔
"اس جھنڈے والی کار... کار سے
کیوں نہیں مانگتیں؟"

"ان جھنڈے والی کاروں سے ہم لوگوں کو
کیا ملے گا... دھکے!"

"بابو! مجھے دھکے نہیں روٹی چاہیئے! روٹی۔"

میں عطیہ کے اس طمانچہ کا ارتعاش فضا
میں محسوس کر رہا تھا۔ سنگدل سماج کی ستائی
ہوئی ایک ایسی ایک ایسی زیادتی جو ہمارے
معاشرے پر تازیانے پر تازیانے لگا
رہی تھی۔ کبھی سماج کے متعلق سوچتا کبھی اس
کے ذمہ دار افراد کے متعلق۔

کیا ہم آزاد ہیں؟... قوم آزاد ہے؟...
ملک آزاد ہے؟...

غزل

قتیل شفائی

سنبھالے پھول بند ہونٹوں پہ گفتگو کے
نہ پوچھ کس طرح سے یہ مرحلہ ہوا ہے
جہاں سنائی نہ دے کسی کو کسی کی آہٹ
وہیں سے پیدا ہر ایک آواز ہوا ہے
کھلی سہی ہجروں کی پہلی اڑان میں
پر اپنا انجام چاندنی میں ڈھلا ہوا ہے
ہم آگ میں جل کے بھی تجھے دیکھتے رہیں گے
قتیل ہم نے بدن پہ صندل ملا ہوا ہے

غزل

سمیع جمال

ایک مہتاب سجا آنکھوں میں
پھر کوئی ذات سرا آنکھوں میں

جب وہ دیکھیں سجا چاہے کوئی
پھر کوئی عکس سجا آنکھوں میں

پھر تری یاد کی خوشبو مہکی
پھر کوئی پھول کھلا آنکھوں میں

جب ترا عکس بنو سراب نما
پھر ترا نام لکھا آنکھوں میں

پھر ہوئی شام سی تیرہ حالی
پھر کوئی آن بسا آنکھوں میں

ساہتیہ
کلا پریشد
دہلی انتظامیہ کی کلچرل شاخ
۸۸-۱۹۸۷ء
چوتھا کل ہند، ہندی، اُردو، پنجابی
مقابلۂ ڈرامانویسی
انعام کی رقم بڑھا دی گئی ہے۔
۳۷۰۰۰ روپے کے کُل انعامات
ہر زبان کے لئے پہلا انعام ۷۵۰۰ روپے اور دوسرا انعام ۵۰۰۰ روپے۔
گذشتہ مقابلوں کے انعام یافتگان اِس مقابلہ میں شرکت کے اہل نہ ہو سکیں گے۔
صرف نئے طبع زاد غیر مطبوعہ اور اسٹیج پر پیش نہ کئے گئے ڈرامے ہی داخل کئے جائیں گے۔
موصول ہونے کی آخری تاریخ
۱۵ جنوری ۱۹۸۸ء
قواعد و ضوابط کی کاپی ساہتیہ کلا پریشد کے آفس سے دستی یا ڈاک کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے۔
۴/۶ آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔
ٹیلیفون:- ۲۷۸۲۷۷
سریندر ماتھر
سکریٹری

شاہ صاحب جودھپوری رح

شخصیات، واقعات، تاثرات،

سلسلہ کیلئے دیکھئے "شانِ ہند" ماہ نومبر ۱۹۸۷ء

بازت سیکر میں داخل نہ ہوں"۔ اس کے
بالابخش کو سیکر دیکھنا نصیب نہ ہوا۔
جس زمانے میں درگاہِ حضرت خواجہ
زار رح کی سجادگی کا معاملہ عدالت میں چل
۔ اس سلسلہ میں جناب آلِ رسول کا
یکٹ تھا تو پیرزادہ معین الدین صاحب
جنھوں بھی چاہتے تھے کہ سجادہ نشینے
انہوں نے شاہ صاحب کی خدمتِ اقدس
گیری کی درخواست کی تو شاہ صاحب
"پیرزادہ صاحب جب سجادگی کے
گی تو آپ اس عہدے کو قبول کرنے
ہوں گے"

ب حاضرین کو اس ارشاد سے حیرت
ں طرح ممکن ہے۔ ۱۹۴۷ء کے دور
ں آلِ رسول صاحب اس مقدس
چھوڑ کر پاکستان چلے گئے اور پیرزادہ
شاہ صاحب کے منع کرنے کے باوجود

خاموشی سے پاکستان چلے گئے گویا سجادگی ان
کے لئے خالی تھی اور وہ خود غائب تھے۔ اس کے
بعد حکومت نے حضرت عنایت حسین خاں صاحب
کو درگاہِ معلیٰ کا دیوان مقرر کر دیا۔

نواب محمد سعادت علی خاں مرحوم والیِ
ٹونک جب ہز ہائی نس نہیں تھے تو بارہا حضرت
کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تخت نشینی
کے لئے عرض و معروض کرتے رہے۔ آخری بار جب
حاضر ہوئے تو کہنے لگے کیا مجھے ایسا موقع نہیں
مل سکے گا کہ میں مخلوقِ الٰہی کی کوئی خدمت انجام
دوں!"

آپ نے کوئی جواب نہیں دیا تو انھوں
نے پھر بہ اصرار عرض کر کے یہ بھی کہا۔ حالتِ موجودہ
یہ بہتر ہوگا کہ میں دہلی میں مستقل سکونت اختیار
کر کے ذریعۂ معاش تجارت بنالوں چنانچہ اس
مرتبہ میں یہی ارادہ کر کے جا رہا ہوں اور رات کی
گاڑی سے دہلی جا رہا ہوں"

جب انھوں نے بار بار اصرار کیا تو شاہ
صاحب نے فرمایا "دہلی جانے کا قصد ترک
کر دیجئے اور فوراً ٹونک چلے جائیے۔ چنانچہ موصوف
ٹونک چلے گئے اور ایک عشرہ کے اندر اندر نواب
سعادت علی خاں کا انتقال ہوگیا اور محمد فاروق علی
خاں ہز ہائی نس ٹونک ہوگئے۔

جناب مولوی احترام الدین صاحب شاغل
نے تحریر فرمایا ہے کہ سر مرزا اسماعیل وزیر اعظم
ریاست جے پور نے شاہ صاحب کے حالات و
کمالات سے متاثر ہو کر ان کی معرفت شرف زیارت
کی استدعا کی تو انھوں نے حضرت قبلہ سے بہت کچھ
عرض و معروض اور منت سماجت کر کے اجازت
ملاقات حاصل کر لی۔ وقت مقررہ پر سر مرزا حاضر
ہوئے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کے بعد کہنے لگے
"آپ جیسا یکتائے عصر باکمال شخص ایسے
تنگ و تاریک مکان میں بسر کر رہا ہے۔ میری دلی
خواہش ہے کہ آپ آبادی شہرت اور کسی بہت

بخش مقام پر اقامت پذیر رہیں۔"
آپ نے فرمایا۔
"میرے لئے یہی جگہ فرحت بخش ہے۔"
وقتِ مقررہ ختم ہوتے ہی مرزا صاحب رخصت ہوئے اور باہر آتے ہی حضرت قبلہ کے دولت کدہ کے سامنے جو خام و خس پوش گھر سقوں وغیرہ کے ہیں اُن کے لئے حکم دے دیا کہ اُن سب کو یہاں سے ہٹا دیا جائے اور یہاں ایک خوبصورت پارک بنایا جائے۔ مرزا صاحب کا حکم اٹل اور فوری طور پر واجب التعمیل ہوا کرتا تھا۔ مرزا صاحب تو اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہوگئے اور سقوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ آپ نے فرمایا "تمہیں کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ سر مرزا کے حکم کی تعمیل اُن کے دورِ وزارت کے اختتام تک نہ ہوسکی

مرزا صاحب نے تین دنوں میں ہی کونسل آف اسٹیٹ اور مہاراجہ صاحب بہادر کی منظوری سے تین بیگہ پختہ اراضی متصل درگاہ حضرت مولانا ضیاء الدین کا پٹہ بلا اخذِ معاوضہ و نذرانہ آپ کی خدمت میں بھجوا کر کہلوایا کہ اس زمین پر خانقاہ تیار کرا کر آپ رہیں اور فرمائیں تو میں تیار کرا دوں۔ آپ نے فرمایا "میں نہ کسی کی خانقاہ بنواتا ہوں نہ مجھے کسی زمین کی ضرورت ہے نہ کسی خانقاہ کی۔"

دفعِ بلیات

شاغل صاحب نے لکھا ہے کہ کئی واقعات ایسے بھی سامنے آئے جن کا تعلق خلل آسیب یا باثر بلیات سے تھا مگر جن کا ازالہ شاہ صاحب کی ادنیٰ توجہ سے ہوگیا۔ مثلاً۔

محمد خاں، پہلوان جے پور، محلہ بساطیان اس مصیبت میں مبتلا تھا کہ جب ذرا آنکھ لگتی تھی تو اس کا پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر کوئی ہلا کر اس کو جگا دیتا تھا غریب کے لئے سونا محال ہوگیا تھا۔ بہتیرے جتن کئے مگر نتیجہ صفر۔ آخر شاہ صاحب کے ہاں ڈیرہ ڈال کر دروازے پر بیٹھا رہتا۔ ایک روز شاہ صاحب نے فرمایا "میاں میرا پیچھا چھوڑ دو آرام سے جاکر سوؤ۔ اب تمہیں کوئی نہیں ستائے گا۔"

چنانچہ اس دن سے مرتے دم تک پہلوان کو یہ شکایت نہ ہوئی۔

منشی پنّا لال صاحب نے رقم فرمایا ہے۔
"دورِ حاضر کے مادہ پرداز علوم کی روشنی سے منور دماغ روحانیت کے قائل ہوں یا نہ ہوں، تاہم اس حقیقت کے ضرور معترف ہوں گے کہ انتہائے روشنی ہی کمال تاریکی ہے۔ یا بالاختصار یوں سمجھ لیجئے۔ العلم حجاب الاکبر۔ لہٰذا عدمِ تسلیم ہی عینِ تسلیم ہے"

واقعہ یہ ہے کہ ایک بار جب میں باہر سے حضرت قبلہ کی زیارت کی خاطر جے پور حاضر ہوا تو ایک صاحب مع ایک خورد سال لڑکی کے میرے پاس آئے اور بہ کمالِ انکساری و عاجزی مجھ سے اعانت کے طالب ہوئے۔ اپنی کیفیت یہ بیان کی۔
"دس برس سے رات کو سونا نصیب نہیں ہوتا۔ جب لیٹتا ہوں تو دورہ سا پڑتا ہے اور اچھل اچھل کر چھت سے ٹانگیں جا لگتی ہیں۔ علاج معالجہ، تعویذ گنڈے، جنتر منتر، عمل عملیات، ساری کوششیں بیکار گئیں۔ زندگی وبال ہو رہی ہے۔ آپ کی آمد کا منتظر تھا۔ میری امداد کیجئے اور حضرت قبلہ سے سفارش کر کے اس عذاب سے نجات دلا دیجئے۔"
یہ صاحب منشی گلزاری لال، وکیل جے پور تھے۔ اُن کی بات سن کر میں اور وکیل صاحب حضرت قبلہ کی خدمت میں دست بستہ عرض پرداز ہوئے تو آپ نے فرمایا "کل صبح آیئے"۔ میں تو اسی وقت سمجھ گیا کہ اُن کا کام بن گیا مگر تعمیل حکم ضروری تھی لہٰذا میں نے تاکیداً وکیل صاحب سے کہا کہ صبح کو سات بجے تک ضرور آجائیں۔ دوسرے دن وہ آٹھ بجے تک نہ پہنچے تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ جب ساڑھے آٹھ بجے وکیل صاحب تشریف لائے تو میں نے شکوہ کیا۔ انہوں نے جواب دیا "ایک مدت کے بعد آج ہی رات کو تو آرام کی نیند آئی ہے۔ اہلِ خانہ نے بمشکل جبراً جگا کر بھیجا ہے۔" غرض اُس روز سے تمام عمر وکیل صاحب کو پھر کوئی شکایت نہ ہوئی۔

راست خان، ٹیلر ماسٹر، جوہری بازار، جے پور کی اہلیہ کی بھی عرصہ تیس سال سے عجیب حالت تھی۔ ایک خاص قسم کا دورہ سا اسے پڑتا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ بحالتِ دورہ جب کوئی شخص کسی قسم کی مٹھائی، پھل یا کوئی اور شے حتیٰ کہ تعویذات وغیرہ اس سے طلب کرتا تو ذرا پیچھے کو ہاتھ کیا اور پُراسرار طریقہ سے وہی چیز اس نے نکال کر دے دی وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، مگر شاہ صاحب نے کسی دوا، نقش یا عمل کے بغیر محض یہ فرمایا "جاؤ! اب یہ ٹھیک ہیں"۔ یہ خاتون اب تک تو انا و تندرست موجود ہیں اور ٹیلر ماسٹر صاحب بھی بقیدِ حیات ہیں۔

کمالِ نجوم

قبلہ شاہ صاحب علم جفر اور رمل پر عبور رکھتے تھے۔ منشی پنّا لال صاحب کا ہی فرمودہ سنیئے:
سر مرزا اسماعیل، پرائم منسٹر جے پور کے یہاں اکثر ممالکِ غیر کی سرکردہ ہستیاں مہمان ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار ایک صاحب مسٹر گائی ونٹ انگلستان سے آئے۔ انہوں نے سر مرزا سے کہا "میری والدہ آکسفورڈ میں سخت بیمار ہیں اور میں بڑا فکرمند ہوں۔" اُن دنوں ٹیلی فون، ٹیلیکس وغیرہ کی سہولتیں ایسی نہ تھیں جیسی آج ہیں۔ سر مرزا نے فرمایا "مسٹر گائی ونٹ، آج آپ کو ہندوستان کی روحانی طاقت کا مظاہرہ دکھاتے ہیں"۔ چنانچہ سر مرزا نے منشی پنّا لال صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ کسی طرح شاہ صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر کرا دو" پنّا لال نے کہا "حضور آپ تو جانتے ہیں وہاں صبح سات بجے سے نو بجے تک کا وقت ہر خاص و عام کے لئے مقرر ہے لہٰذا آپ کو بھی اپنے مہمان کے ہمراہ انہی اوقات میں آنا ہوگا"
دوسرے دن سر مرزا اپنے مہمان گائی ونٹ کو لے کر شاہ صاحب کے ہاں گئے اور سر مرزا نے اپنے مہمان کی والدہ کی بابت دریافت کیا، شاہ صاحب نے ایک منٹ کے بعد فرمایا

"وہ آج ... اور ... ہو جائیں
اور اسی وقت ... قریب ... صحت مند
حالت میں ہیں"۔

مسٹر گائی ونٹ نے تاریخ اور وقت نوٹ کیا اور وائرلیس سے آکسفورڈ سے دریافت کیا شاہ صاحب کا ایک ایک لفظ صحیح پایا۔ بعد

میں مسٹر گائی ونٹ کے آکسفورڈ سے خطوط آتے رہے جن میں اس روحانی آفتاب کے کمال کا اعتراف بھی ہوتا اور تشکر کا اظہار بھی۔

سیر و سیاحت

آپ کا مسلک "الاستقامۃ فوق الکرامۃ"

کے عین مطابق تھا۔ آپ اپنے مکان ... کا تھا۔ سے صرف حضرت خواجہ شاہ سلیمان تونسوی کے عرس مبارک کے دنوں میں ہی باہر تشریف لاتے تھے۔

باقی آئندہ

ارمغانِ کُندن — کُندن لال کُندن

سنہ ۱۹۸۷ء ڈمائی سائز -/۳۰ روپے

نعمہ بک سپلائی کمپنی" دہلی۔

جناب کُندن لعل کُندن ایم۔ اے۔ ایم لٹ محکمہ ڈاک میں سب پوسٹ ماسٹر ہیں۔ تقسیمِ ملک کے بعد تحصیل تونسہ شریف سے پنجاب اور ہریانہ کے مختلف مقامات پر دھکے کھانے کے بعد ۱۹۵۴ء میں میٹرک ہندی سے کیا۔ ۱۹۵۵ء میں دہلی میں آ گئے اور سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے تنازع البقا کے لئے ہاتھ پیر مارتے رہے اور جب دس سال بعد حالات نے اجازت دی۔ تو پھر سے سلسلۂ تعلیم جاری کر کے ۱۹۶۴ء میں دہلی کالج سے بی۔ اے اور ۱۹۶۸ء میں دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور ۱۹۸۲ء میں ایم۔ لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اور پی۔ ایچ ڈی کے لئے موضوع چنا "جنوبی اور شمالی ہند میں اُردو کی تاریخی مثنویاں" کوشاں ہیں کہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہو جائیں۔ رضا لائبریری رامپور، خدا بخش لائبریری پٹنہ، سینٹرل لائبریری کلکتہ، اسٹیٹ لائبریری اور سالار جنگ میوزیم حیدر آباد، جامع مسجد لائبریری بمبئی اور دیگر متعدد قابلِ ذکر لائبریریوں کو چھان چکے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر شریف احمد اور ڈاکٹر فضل الحق ایسے نامور اساتذۂ کرام سے تعلیم حاصل کرنے والے جناب کُندن لعل کُندن کا مجموعۂ کلام "ارمغانِ کُندن" زیرِ نظر ہے۔ جو اُردو اکادمی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں غزلیں، قطعے، نظمیں، اور مثنوی شامل ہیں۔ نظموں میں "آزادی ۱۵ اگست، یومِ ولادتِ مسیح، جشنِ جمہوریت، ہولی، جہیز کی لعنت، اظہارِ تمنا، سرزمینِ ہند کے مغان، اور مے نوشی، ایسی نظمیں ہیں جو بہترین کہی جا سکتی ہیں۔

دلّی کے مشہور اور نامور اساتذہ کا یہ ہونہار شاگرد شاعری کے رموز سے بخوبی واقف ہے اور اس پر پروفیسر بخشی اختر امرتسری کے مفید مشوروں اور رہنمائی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

مجموعہ کے ابتدائی صفحات پر دعائیہ از پروفیسر گوپی چند نارنگ، پیرِ دعائیہ پروفیسر بخشی اختر امرتسری، پیش لفظ از ڈاکٹر قمر رئیس، اور ڈاکٹر شریف احمد کی طرف سے "سخنے چند" نے کُندن صاحب کے کلام، بلکہ مجموعۂ کلام "ارمغانِ کُندن" کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔

کتابت و طباعت بہترین کاغذ اور گٹ اپ عمدہ ہے۔

اُردو اکادمی دلّی کا دم غنیمت ہے جو ایسے مجبور بے روزگار شاعروں کے کلام سے اُردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے زرِ کثیر صرف کرتے ہوئے اُردو شاعری کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

سرور تونسوی

افتتاحِ دبستان — حسرت گنگوہی

سنہ ۱۹۸۷ء — ۲۰×۳۰/۱۶

"شمعِ خیال" پبلیکیشنز گنگوہ، سہارنپور۔

جناب ظہیر اختر صاحب گنگوہی، ایڈیٹر "شمعِ خیال" گنگوہ شریف کے فرزندِ ارجمند عزیز القدر میاں مصباح حمید اختر عرف زکی اختر سلمہٗ کے جشنِ مکتب نشینی (تقریبِ بسمیہ خوانی) کے مبارک موقع پر ملک بھر کے شعراء، ادیبوں اور برگزیدہ ہستیوں نے جن منظوم اور نثری دعاؤں سے عزیز موصوف کو نوازا ہے اُن سب کو ایک خوبصورت کتابچہ "افتتاحِ دبستان" (جو تاریخی نام ہے) ۱۴۰۷ھ میں جمع کر دیا گیا ہے یہ کتابچہ کئی لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے۔

سرور تونسوی

من کہ مکتوب الیہ

محترم جناب ودّیا پرکاشس سرور تونسوی صاحب، آداب !

ایک بات کی معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے رسالہ "نشانِ ہند" کے اداریئے بغیر پڑھے بغیر چھوڑ دیتا تھا۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر کے اداریئے پڑھے۔ پردھان منتری بھارت کے لئے جو آپ نے لکھا، بالکل صحیح ہے۔ "وطن کی فکر کر ناداں" بنام وزیر داخلہ ایک یادگار تحریر ہے اور "اُردو والوں کے لئے لمحۂ فکریہ" تو لاجواب چیز ہے۔

آپ اس قدر بے باکی، دلبری اور صاف گوئی سے لکھ سکتے ہیں، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ خدا جانے پہلے کے اداریئے جو میں نے نہیں پڑھے، اُن میں آپ نے کیا غضب ڈھایا ہوگا۔

آپ اور آپ کا قلم، دونوں واقعی قابلِ ستائش و احترام ہیں۔ میری دلی مبارکباد قبول فرما کر مشکور کریں۔

اُردو والوں کو جس صاف بیانی اور بے خوفی سے آپ نے بتایا ہے، وہ نہایت ضروری تھا اس میں اُن کا ہی فائدہ ہے۔ میں آپ کے خیالات سے سو فیصدی متفق ہوں اور آپ کی پُرزور تائید کرتا ہوں۔ جب تک سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید نہیں کہا جائے گا تو کبھی مُلک میں نیشنل انٹیگریشن ہو نہیں سکتی۔ اور اس کی سخت ضرورت ہے۔

مالک آپ کو ایک لمبا عرصہ زندہ رکھے اور آپ کا قلم مُلک کے مفاد کے لئے چلتا رہے۔ آمین!

آپ کا۔ ہربنس لعل سبھروال

محترم ایڈیٹر نشانِ ہند نئی دہلی

تسلیم !

نشانِ ہند، کی سابقہ دو اشاعتوں کے اداریئے "وطن کی فکر کر ناداں" ... سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے" ... ساختہ زبان سے نکلا کہ ابھی اُردو ... میں ایسے لوگ ہیں جو سچائی کے ... خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ جناب ... س اختر صاحب نے بھی آپ کے ... وطن کی فکر کر ناداں" کا حوالہ دے کر ... ں اداریہ لکھا ہے۔ اور انھوں نے ... اور آپ کی خدمات کو سراہا ہے۔ کاش ... ، وزیر داخلہ سردار بوٹا سنگھ تک آپ ... یہ پہنچ سکتا۔

... یا کیا جائے کہ اب سرکاری خفیہ ... میں بھی ایسے کرمچاری نہیں ہیں جو اُردو ... سکتے ہوں اور ایسی تحریریں پڑھ کر ... کے متعلقہ وزیروں کو تراشے کے ساتھ ترجمہ بھی بھجوا سکیں۔ انگریز کے زمانے ... ں ہوتا تھا کہ ہر ورنیکلر اخبار میں چھپی ہوئی ... ں، یا اس کے اداریئے، جن سے حکومت ... ا ضروری ہوتا تھا، پریس آفیسر اور دیگر ... ں ایسے تراشے معہ انگریزی ترجمہ کے ... کو بھجوایا کرتی تھیں۔ اب اپنا راج ہے ... ت اور صرف انگریزی زبان کے ... کے اداریئے اور خاص خاص ... اختصار متعلقہ وزیروں کو بھجوایا ... ورنیکلر اخبارات کی تو اب ... رہی نہیں رہی ہے۔

چنانچہ میں نے آپ کے ان دونوں اداریوں کا انگریزی ترجمہ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کی خدمت میں معہ نشانِ ہند کے تراشوں کے بھجوایا ہے۔ کیونکہ میں اسے بھی "مُلک کی خدمت" ہی سمجھتا ہوں کہ ہمارے حکمرانوں کو اس کا علم ہو سکے کہ ہمارے مُلک میں کیا ہو رہا ہے۔

امید ہے کہ آپ نے بھی وزیر اعظم صاحب اور وزیر داخلہ کو "نشانِ ہند" کے ان اداریوں کے تراشے بھجوائے ہونگے۔ اُمید ہے کہ آپ اسی طرح سچائی کا بول بالا کرتے رہیں گے۔

رام سرن داس

پھرتھاول

ضلع مظفر نگر۔

سرور صاحب تسلیم !

چار پانچ دن ہوئے ریڈیو پر ایک خبر میں بتایا گیا کہ ساہتیہ اکادمی نے اس بار اُردو زبان کا انعام شہریار صاحب کی تصنیف پر دیا ہے۔ ویسے تو یہ اطلاع کانوں کان آٹھ، دس مہینے سے سُننے میں آ رہی تھی

تھی کہ اس بار ساہتیہ اکادمی کا انعام شہریار صاحب کو دیا جا رہا ہے۔ اسی طرح جناب شمس الرحمان فاروقی اور جناب بلراج کومل کو ساہتیہ اکادمی انعامات دیئے جانے کی اطلاع سرکاری اعلان سے مہینوں پہلے عوام کو ہو چکی تھی۔

یہ تو ایک مسلّمہ امر ہے کہ اُردو کے انعامات کا فیصلہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے انھیں اُردو کی نسبت اپنے من چاہے ادیبوں یا شاعروں کا خیال ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر انعامات اصل حقداروں کی بجائے سفارشی لوگوں کو دیئے جاتے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ سرکاری اعلان سے مہینوں پہلے یہ مشہور ہو جاتا ہے کہ اب کے برس انعام کس کو ملے گا۔ ساہتیہ اکادمی ایک مقتدر ادارہ ہے اگر اس کے انعامات کی تقسیم میں دست درازی ہو سکتی ہے، تو پھر معمولی اداروں کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ کاش اُردو کے ذمہ دار لوگ اُردو کی حالت پر رحم کھائیں اور اس اجڑی ہوئی زبان کو مزید بیوگی کا احساس نہ ہونے دیں۔ آپ خود گواہ ہیں کہ انجمن ترقی اُردو کے دفتر اُردو گھر میں آپ کی موجودگی میں کئی ماہ ہوئے ایک صاحب نے فرمایا تھا کہ سرکاری اعلان تو نہ معلوم کب ہوگا، ہم آپ کو ابھی بتائے دیتے ہیں کہ "اب کی بار انعام شہریار صاحب کو ملے گا"

نیاز مند

محمد طارق صدیقی

لوہا منڈی

آگرہ

محترم سرور صاحب۔

آداب و نیاز!

آپ کی کتاب کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ سب سے بڑی خوبی تو اس کتاب کی یہ ہے کہ کوئی بھی مضمون ختم کئے بغیر قاری کو چین نہیں آتا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب شاعروں... اور ادیبوں کے لئے بھی بیحد مفید ہے۔ اس کتاب کا مصنف ان تمام مراحل سے گذرا ہے جو کسی ادیب و شاعر کو اکثر و بیشتر پیش آتے رہتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ کی یہ کتاب ایک تجرباتی کتاب ہے۔

اثر اندوری۔

جھابوہ

(ایم۔پی)

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 December 198

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں